فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ الآية

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ الآية

نَجْمُ الفَتَاویٰ

جلد دوم

کتاب الطہارۃ والصلاۃ

طہارت اور نماز سے متعلق تقریباً سات سو سے زائد اہم فتاویٰ جات کا مدلل ومفصل مجموعہ

تالیف

شیخ الحدیث مفتی سیّد نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم

مہتمم ورئیس دارالافتاء جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن

جدید ترتیب وتبویب

مفتی وقار احمد

استاذ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ الاية
وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ الاية

نُجُمُ الفَتَاوٰی

جلد دوم

کتاب الطهارة والصلاة

طہارت اور نماز سے متعلق تقریباً سات سو سے زائد
اہم فتاویٰ جات کا مدلل و مفصل مجموعہ

تالیف

شیخ الحدیث مفتی سیّد نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم
مہتمم و رئیس دار الافتاء جامعہ دار العلوم یاسین القرآن

جدید ترتیب و تبویب

مفتی وقار احمد
استاذ جامعہ دار العلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

کتاب کا نام	نجم الفتاویٰ (جلد دوم) ''کتاب الطهارة والصلوٰة''
مؤلف	حضرت شیخ الحدیث مفتی سیّد نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم
ترتیب وتبویب	مولانا مفتی وقار احمد صاحب (استاذ جامعہ دار العلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی)
کمپوزنگ، سیٹنگ	بھائی شکیل احمد صدیقی صاحب
سن اشاعت	۱۴۳۱ھ بمطابق ۲۰۱۰ء
مطبع	پرنٹ مارک 0321-3939101, 0321-9270048
ناشر	شعبہ نشر واشاعت دار العلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی

حاصل کرنے کیلئے رابطہ کیجئے

شعبۂ نشر واشاعت، جامعہ دار العلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی

0301-3452678 021-32064664021-38302662

مکتبہ المعارف، سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی

0333-2833755

نیز ملک کے تمام مشہور کتب خانوں پر بھی دستیاب ہے

فہرست کتاب الطہارۃ

﴿فصل فی الوضو﴾

(وضو کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

﴿فصل فی الغسل﴾

(غسل کے مسائل کا بیان)

فصل فی التیمم

(تیمم کے مسائل کا بیان)

﴿فصل فی النجاسات واحکام التطہیر﴾

(نجاسات کے احکام اور پاکی کا طریقہ)

﴿فصل فی احکام الماء﴾

(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق احکام کا بیان)

فصل فی احکام الجنب والمعذور

(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی الحیض والنفاس

(حیض ونفاس سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المسح الخفین والجبیرة﴾

(موزوں اور پٹی وغیرہ پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المسائل الجدیدة والمتفرقة المتعلق بالطهارة﴾

(طہارت سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

فہرست کتاب الصلوٰۃ

فصل فی المواقیت

(اوقات نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی الاذان

(اذان و اقامت سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی شروط الصلاة وارکانها وواجباتها وسننها وآدابها﴾

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کا بیان)

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾

(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المسبوق واللاحق﴾

(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

﴿فصل فی القراءة﴾

(نماز میں قرأت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

فصل فی السنن والنوافل

(سنن اور نفل نمازوں کا بیان)

﴿فصل فی التراویح﴾

(تراویح سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی الوتر﴾

(وتر سے متعلق مسائل)

﴿فصل فی سجود السهو والتلاوة﴾

(سجدۂ سہو اور سجدہ تلاوت کے مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المریض والمسافر﴾

(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

فصل فی الجمعة والعیدین

(جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا بیان)

﴿باب فی تقدیر الاوزان الشرعیة بالمساحة الجدیدة﴾

(شرعی اوزان کی مقدار کا ازسرنو تحقیق کے ساتھ بیان)

فصل فی المسائل المتفرقة المتعلقة بالصلاة

(نماز کے متفرق مسائل کا بیان)

احکام المساجد

﴿کتاب الجنائز والشهيد﴾

(نمازِ جنازہ، تجہیز وتکفین اور شہید سے متعلق مسائل کا بیان)

کتاب الطہارۃ

(طہارت کا بیان)

﴿فصل فی الوضوء﴾

(وضو کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

(۱) مسواک کی مقدار اور برش کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسواک کرنا مسنون ہے، لیکن کیا ہر چھوٹی بڑی شاخ کے استعمال سے مسواک کی سنت ادا ہو جائے گی؟ یا اس کی لمبائی وموٹائی متعین ہے؟ اگر اس میں اس طرح کی تعیین ہو تو تفصیل سے بتلادیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسواک کی مقدار متعین ہے یعنی ایک بالشت لمبی اور ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے بقدر موٹی ہونی چاہیے، اسی طرح سب سے افضل مسواک پیلو کے درخت کی ہے اس کے بعد زیتون کے درخت کی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر درخت کی شاخ کے علاوہ کوئی اور چیز استعمال کی جائے جیسے برش، کپڑا یا انگلی وغیرہ تو اس سے صفائی کی سنت تو ادا ہو جائے گی لیکن مسواک کی سنت ادا نہ ہوگی۔

لمافی الکبیری (ص ۳۱-۳۲): ثم المستحب ان یکون السواک من شجرة مرة لزیادة ازالة تغیر الفم قالوا ویستاک بکل عود الا الرمان والقصب وافضله الاراک ثم الزیتون وان یکون طول شبر فی غلظ الخنصر......

وفی الهندیة (۱/۷): ومنها السواک وینبغی ان یکون السواک من اشجار مرة لانه یطیب نکهة الفم ویشد الاسنان ویقوی المعدة ولیکن رطبا فی غلظ الخنصر وطول الشبر ولا یقوم الاصبع مقام الخشبة فان لم توجد الخشبة فحینئذ یقوم الاصبع من یمینه مقام الخشبة.

وفی الدر المختار (۱/۱۱۴، ۱۱۵): (و) ندب امساکه (بیمناه) وکونه لینا مستویا بلاعقد فی غلظ الخنصر وطول شبر ......وعند فقده او فقد اسنانه تقوم الخرقة الخشنة او الاصبع مقامه کما یقوم العلک مقامه للمرأة مع القدرة علیه.

(۲) ٹوتھ برش سے مسواک کی سنت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس مسواک نہ ہو اور اس کے پاس ٹوتھ برش ہو

تو کیا وہ مسواک کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور اس سے مسواک کی سنت ادا ہوجاتی ہے از راہِ کرم تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... مسواک کا استعمال سنت موکدہ ہے شرعی نقطۂ نظر سے مسواک کا اطلاق اس لکڑی پر ہوتا ہے جس کو دانتوں کی صفائی کیلئے استعمال کیا جائے اور مستحب یہ ہے کہ مسواک کسی کڑوے درخت مثلاً زیتون، پیلو وغیرہ کی ہو، البتہ اگر مسواک دستیاب نہ ہو تو انگلی سے بھی یہ سنت ادا ہوسکتی ہے اور یہی حکم ٹوتھ پیسٹ کا بھی ہے البتہ مسواک شرعی میں دو مستقل سنتیں ہیں (۱) لکڑی کا استعمال (۲) انقاء (منہ کی صفائی) تو ٹوتھ برش کے استعمال سے صرف انقاء کی سنت ادا ہوجائے گی البتہ لکڑی کی سنت اس سے ادا نہیں ہوگی۔

لمافی الهندية(۱/۷): (منها السواک) وينبغي ان يكون السواک من اشجار مرة لانه يطيب نكهة الفم ويشد الاسنان ويقوی المعدة وليكن رطبا في غلظ الخنصر وطول الشبر ولا يقوم الاصبع مقام الخشبة فان لم توجد الخشبة فحينئذ يقوم الاصبع من يمينه مقام الخشبة.

وفی المغنی(۱/۷۹): ويستحب ان يكون السواک عودا لينا ينقي الفم ولايجرحه ولايضره ولا يتفتت فيه كالاراک والعرجون ولايستاک بعود الرمان ولا الآس ولا الاعواد الذكية.....

وان استاک باصبعه او خرقة فقد قيل لايصيب السنة لان الشرع لم يرد به ولا يحصل الانقاء به حصوله بالعود والصحيح انه يصيب بقدر مايحصل من الانقاء ولا يترک القليل من السنة للعجز عن كثيرها.

(۳) ٹوتھ برش یا انگلی کا مسواک کے قائم مقام ہونے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ٹوتھ برش سے مسواک کی سنت ادا نہیں ہوتی لیکن میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ اگر کسی کے پاس مسواک نہ ہو تو وہ انگلی کو ہی دانتوں پر مل لے یہ مسواک کے قائم مقام ہوجائے گی۔ آیا یہ صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو پھر ٹوتھ برش کو مسواک کے قائم مقام کیوں نہیں بنایا جاسکتا؟ حالانکہ اس سے دانتوں کی صفائی وغیرہ انگلی کے مقابلے میں بہرحال زیادہ اچھی ہوتی ہے؟ براہ کرم جواب آسان الفاظ میں لکھ کر عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... مسواک کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو صورت ثابت ہے وہ یہی ہے کہ لکڑی سے مسواک کی جائے اور لکڑیوں میں بھی پیلو کے درخت کی لکڑی زیادہ پسندیدہ ہے لیکن اگر لکڑی کی مسواک اتفاقاً موجود نہ ہو، تو انگلی وغیرہ سے دانت صاف کرلینا مسواک کے قائم مقام ہوسکتا ہے اور برش کا اصل حکم بھی یہی ہے کہ اگر اتفاقاً مسواک موجود نہ ہو تو اس کا استعمال قائم مقام مسواک کے ہوجائے گا۔ اور لکڑی کی مسواک کی موجودگی میں انگلی اور برش وغیرہ مسواک کے قائم مقام نہیں بنیں گے۔

لمافی سنن النسائی(۱/۳): سمعت عائشةؓ عن النبی ﷺ قال السواک مطهرة للفم مرضاة للرب.

وفی كنز العمال(۹/۱۱۳): الاصابع تجری مجری السواک اذا لم يكن مسواک (ابو نعيم فی كتاب السواک عن عمرو بن عوف المزنی).

وفی اعلاء السنن(۱/۷۳): ثم اعلم ان الاصابع تقوم مقام السواک عند فقدانه..... الخ.

وفی الفقه علی المذاهب الاربعة(۱/۶۸): ومن السنن المؤکدة السواک ولا یشترط ان یکون من شجر الاراک المعروف بل الافضل ان یکون من اشجار مرة لانه یساعد علی تطییب الفم وله فوائد معروفة فهو یقوی اللثة..... فاذا لم یجد سواکاً فان. الفرشة. تقوم مقامه واذا لم یجدها استاک باصبعه ویقوم مقام السواک العلک. اللبان..... واذا کان لا یطیقه فانه یترکه للضرورة......

وفی المفصل فی احکام المرأة والبیت المسلم(۱/۵۴): یستحب أن یستاک المسلم او المسلمة بعود من اراک فان لم یوجد او وجده واستعمل شیئاً آخر غیره جاز ذالک بشرط ان یکون هذا الشیئ تحصل به تنقیة فمه وتنظیف أسنانه کالخرقة الخشنة والاشنان وقیاساً علی هذا القول یجوز استعمال فرشة تنظیف الاسنان مع المعجون الخاص للتنظیف..... واذا لم یجد مایستاک به من عود السواک وغیره استعمل اصابعه فی استیاکه للحدیث الذی رواه البیهقی عن رسول الله ﷺ تجزی فی السواک الأصابع.

وفی الشامیة(۲/۱۶۸): (واستیاکه) لانه مندوب الیه فی سائر الصلوات اختیار، ومفاده ان المراد به الاستیاک عند القیام الی الصلوة فانه مستحب کما قدمناه فی سنن الوضوء وکذا عند الاجتماع بالناس وعلیه فیستحب قبل التوجه الیها ایضاً واما السواک فی الوضوء فانه سنة موکدة ولا خصوصیة للعید فیه.

(۴) مسواک سنتِ صلوٰۃ ہے یا سنتِ وضو؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ہر وضو کے وقت مسواک کرنا چاہیے اور بعض کہتے ہیں کہ نماز کے وقت مسواک کرنا مسنون ہے ان میں سے صحیح اور افضل بات کون سی ہے؟ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول کیا تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ہمارے نزدیک وضو کے ساتھ مسواک کرنا مسنون ہے۔ اور جن احادیث میں یہ آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے وقت مسواک فرماتے تھے تو ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے وقت جب وضو فرماتے تھے اس میں مسواک فرمایا کرتے تھے۔ تاہم اگر کوئی شخص اتباع کی نیت سے نماز کے وقت بھی مسواک کرلے تو درست ہے۔ بشرطیکہ اس کے مسوڑھے مضبوط ہوں اور مسواک کی وجہ سے خون وغیرہ نہ نکلے۔

لمافی فتح الملهم (۲/۲۸۸): وقد صرح کثیر من الشافعیة والحنفیة باستحباب السواک عند

الوضوء وعند القيام الى الصلوة كليهما. فمن نقل الخلاف في انه من سنن الوضوء او من سنن الصلوة فلعل مراده ان الكلام في تعيين الموضع الذي كان قصد النبي ﷺ ايجاب السواک فيه لولا ان يشق على امته فان ذلک الموضع ينبغي ان يكون محلا لمزيد تاكد الاستياک بالنسبة الى سائر المواضع وهذا البحث انما يدور على الفاظ حديث الباب. ......

.... وقد صرح العلامة الرضى في شرح الكافية "ان معنى "عند" القرب حسا او معنى وأما لفظة (مع) فيقال جئنا معاً اى في زمان واحد وكنامعاً، اى في مكان واحد على الظرفية

.... فعلى هذا "عند" اعم من "مع" فالمعية تستلزم العندية ولا عكس. فالذى يظهر من مجموع الروايات المعروفة انه كان قصد النبي ايجاب السواک عند كل صلوة اى قريبا منها مشروعا لاجلها كالوضوء مع كل وضوء متصلا وملتصقا بها واقعا في زمان يقع فيه الوضوء. واصرح شئ في هذا المعنى ماروى ابن حبان في صحيحه من حديث عائشة أن رسول الله ﷺ قال "لولا ان اشق على امتي لامرتهم بالسواک مع الوضوء عند كل صلوة"

وفي البحر الرائق(۱/۴۳): واما ماورد من افضلية الصلوة التي بسواک على غيرها فيدل على الاستحباب وهو الحق ....

لكن قولهم يستحب عند القيام الى الصلوة ينافي مانقلوه من انه عندنا للوضوء لا للصلاة خلافا للشافعیؒ.

وفي الشامية(۱/۱۱۳): ...... يظهر لى التوفيق بان معنى قولهم هو للوضوء عندنا بيان ماتحصل به الفضيلة الواردة فيما رواه احمد من قوله صلى الله عليه وسلم صلاة بسواک افضل من سبعين صلاة بغير سواک اى انها تحصل بالاتيان به عند الوضوء وعند الشافعیؒ لاتحصل الابا لاتيان به عند الصلوة فعندنا كل صلوٰة صلاها بذلک الوضوء لها هذه الفضيلة خلافا له ولا يلزم من هذا نفى استحبابه عندنا لكل صلوٰة.

(۵) کس درخت کی مسواک مسنون ہے؟ نیز مسواک کی لمبائی اور چوڑائی

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کس درخت کی مسواک مسنون ہے؟ نیز مسواک کی لمبائی اور چوڑائی کیا ہونی چاہیے؟ اگر اس بارے میں کوئی حدیث ہو تو حوالہ ضرور دیجئے۔

الجواب حامداًومصلیاً...... ہر نرم لکڑی سے مسواک کرنا سنت ہے۔ البتہ کنز العمال اور المعجم الاوسط کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر پیلو اور زیتون کی مسواک ہے۔ نیز مسواک کی لمبائی ایک بالشت اور چوڑائی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے برابر ہو۔ جیسے روایت سے معلوم ہوتا ہے

کہ زید بن خالد جب مسجد میں تشریف لاتے تو مسواک ان کے کان پر ایسے ہوتی جیسے قلم کاتب کے کان پر ہوتا ہے اور قلم کی لمبائی تقریباً ایک بالشت اور چوڑائی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے برابر ہوتی ہے۔

لما فی جامع الترمذی (۱/۱۲): عن زید بن خالد الجهنی قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول: لولا ان اشق علی امتی لامرتهم بالسواک عند کل صلوة ولأخرت صلوة العشاء الی ثلث اللیل قال: فکان زید بن خالد یشهد الصلوات فی المسجد وسواکه علی اذنه موضع القلم من أذن الکاتب لا یقوم الی الصلوة الا استن ثم رده الی موضعه.

وفی کنز العمال(۹/۳۲۱): ۲۶۲۲۷. الاسوکة ثلاثة اراک فان لم یکن فعنمٌ أو بطم [فعنم العنمة بفتحتین شجرة لطیفة الاغصان یشبه بها بنات العذاری والجمع عنم (النهایه ،۳/۳۱۳) بطم: البطم الجنة الخضراء]

وفی المعجم الاوسط(۱/۳۹۰): رقم ۶۸۲، عن ابراهیم بن أبی عبلة عن عبدالرحمن بن غنم الاشعری عن معاذ بن جبل رضی الله عنه قال سمت رسول الله ﷺ یقول نعم السواک الزیتون من شجرة مبارکة یطیب الفم ویذهب بالحفر وهو سواکی وسواک الانبیاء من قبلی.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۷-۴۵۹): والافضل ان یکون من اراک ثم من النخل ثم ذوالریح الطیب ثم الیابس المندی بالماء. ویکره ان یزید طول السواک علی شبر، فی البیهقی عن جابر رضی الله عنه قال "کان موضع سواک رسول الله ﷺ موضع القلم من اذن الکاتب"......

(۶) مسوڑھوں پر مسواک پھیرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے دانت نہ ہوں تو مسوڑھوں پر مسواک کرنا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کسی کے دانت نہ ہوں، تو اس کو چاہئے کہ مسواک کے بجائے انگلی یا کسی اور نرم چیز کو سنت کی نیت سے اپنے مسوڑھوں پر پھیر لے تاکہ ثواب سے محروم نہ ہو۔

لما فی البحر الرائق (۱/۴۳): وتقوم الاصبع او الخرقة الخشنة مقامه عند فقده اوعدم اسنانه فی تحصیل الثواب الخ.

وفی الدر المختار(۱/۱۱۵): وعند فقده او فقد اسنانه تقوم الخرقة الخشنة او الاصبع مقامه کما یقوم العلک مقامه للمرأة مع القدرة علیه.

(۷) مسواک کو پکڑنے کا طریقہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ مسواک کو پکڑنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے اسی طریقہ سے مسواک پکڑ کر استعمال کرنا چاہئے اگر کوئی مخصوص طریقہ ہے تو اس کو مدلل بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....مسواک کو دائیں ہاتھ میں پکڑنا مستحب ہے اور پکڑنے کا طریقہ فقہاء کرام نے یہ بتایا ہے کہ مسواک کو ہاتھ کی انگلیوں اور انگوٹھے کے پوروں سے اس طرح پکڑا جائے کہ چھوٹی انگلی (چھنگلی) اور انگوٹھا نیچے کی جانب رہے اور بقیہ انگلیاں اُوپر کی طرف ہوں، اور انگوٹھے کو مسواک کے برش والے حصے کی جانب رکھے اور چھنگلی کی پشت کو دوسری جانب کے آخر میں اور دوسری انگلیاں ان کے درمیان میں اُوپر کی جانب رہیں۔

لمافی الهندية (۱/۷): ويندب امساكه بيمينه بأن يجعل الخنصر أسفله والإبهام أسفل رأسه وباقي الأصابع فوقه.

وفي الشامية (۱/۱۱۴): والسنة في كيفية أخذه أن يجعل الخنصر أسفله والإبهام أسفل رأسه وباقي الأصابع فوقه.

(۸) دورانِ وضو اذکار کا ثبوت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران وضو جو مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھنا ثابت ہیں، بحوالہ نقل کریں، میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ دعائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں بلکہ بعد کے فقہاء نے یہ تجویز کیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کی عبارتوں میں تو ان کا ذکر ملتا ہے، احادیث میں نہیں ملتا، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....وضو میں دو طرح کی دعائیں پڑھی جاتی ہیں، اول جو دعائیں دوران وضو پڑھی جاتی ہیں، دوم جو وضو کے بعد پڑھی جاتی ہیں، وضو کے بعد پڑھی جانے والی دعائیں شہادتین وغیرہ تو احادیث کثیرہ صحیحہ سے ثابت ہیں، البتہ جو دعائیں یا اذکار دوران وضو پڑھے جاتے ہیں، یہ روایات سے ثابت تو ہیں لیکن یہ روایات ضعیف ہیں اسی ضعف کی وجہ سے بعض حضرات جیسے علامہ نوویؒ وغیرہ ان کا سرے سے انکار کرتے ہیں کہ ان اذکار کا کوئی ثبوت نہیں ہے، جبکہ شوافع ہی کے دوسرے فقہاء جیسے علامہ رملیؒ وغیرہ اور خاص طور پر فقہاء احناف نے ان کا استحباب نقل کیا ہے، لہٰذا ان اذکار کا پڑھ لینا بہتر ہے۔

لمافی الهندية (۱/۹): وتسمية الله تعالى عند غسل كل عضو وليقل عند المضمضة اللهم اعنى على تلاوة القرآن وذكرك وشكرك وحسن عبادتك وعند الاستنشاق اللهم ارحني رائحة

الجنة ولا ترحني رائحة النار وعند غسل الوجه اللهم بيض وجهي يوم تبيض وجوه وتسود وجوه وعند غسل يده اليمنى اللهم اعطني كتابي بيميني وحاسبني حسابا يسيرا وعند غسل اليسرى اللهم لا تعطني كتابي بشمالي ولا من وراء ظهري وعند مسح رأسه اللهم اظلني تحت ظل عرشك يوم لا ظل الا ظل عرشك وعند مسح اذنيه اللهم اجعلني من الذين يستمعون القول فيتبعون احسنه وعند مسح عنقه اللهم اعتق رقبتي من النار وعند غسل رجله اليمنى اللهم ثبت قدمي على الصراط يوم تزل الاقدام وعند غسل رجله اليسرى اللهم اجعل ذنبي مغفورا وسعي مشكورا وتجارتي لن تبور ويصلي على النبي ﷺ بعد غسل كل عضو.

وفي تنوير الأبصار مع الدرالمختار (۱/۱۲۴): (ومن آدابه اسقبال القبلة) ......وفي (صـ۱۲۷) (والدعاء بالوارد عنده) اى عند كل عضو وقد رواه ابن حبان وغيره عنه عليه الصلاة والسلام من طرق قال محقق الشافعية الرملي فيعمل به في فضائل الاعمال وان انكره النووي

وفي (صـ۱۲۸) (فائدة) شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدة ضعفه وان يدخل تحت أصل عام وان لا يعتقد سنية ذلك الحديث.

(۹) وضواور غسل کیلئے پانی کی شرعی مقدار

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضواور غسل میں کتنا پانی استعمال کرنا چاہئے نیز صاع اور مد کی موجودہ مقدار کتنی بنتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....لوگوں کے احوال اور طبیعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے وضواور غسل کیلئے پانی کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں کہ جسے معیار بنایا جائے، البتہ وضواور غسل میں پانی کا استعمال اس قدر ہو کہ نہ تو اتنی کمی کی جائے کہ اعضاءِ وضو سے پانی کا تقاطر ہی نہ ہو، اور نہ ہی اتنی زیادتی کی جائے کہ اسراف لازم آئے جو کہ حرام ہے۔لہٰذا راہِ اعتدال کو اپنانا چاہئے جو کہ شرعاً محمود ومطلوب ہے۔

البتہ روایات میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ منقول ہے کہ آپ وضوایک مداور غسل ایک صاع پانی سے فرماتے ہیں۔ ایک مد کا وزن آدھ سیر ساڑھے پانچ چھٹانک ہے جو کہ عام طور پر ایک لوٹا پانی کے برابر ہوتا ہے، اور ایک صاع کا وزن تین سیر چھ چھٹانک جو کہ عام طور پر ایک درمیانی بالٹی کے پانی کے برابر ہوتا ہے جو معتدل طبیعت وجسم والے شخص کے وضواور غسل کیلئے آسانی کافی ہوجاتا ہے، اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت اعتدال پر مبنی ہے۔بصورت دیگر زائد پانی بھی استعمال کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اسراف کی حد تک نہ پہنچے، البتہ پانی کی مذکورہ مقدار سے کمی نہ کرنا اولیٰ ہے۔

لمافي الهندية (۱/۹): ولا ينقص ماء وضوئه عن مد كذا في التبيين.

وفيه ايضاً(١/١٦): ذكر في ظاهر الرواية وادنى مايكفي من الماء للاغتسال صاع وللتوضؤ مد قال بعض مشايخنا رحمهم الله كفاه صاع اذا ترك الوضوء واما اذا جمع بين الوضوء والغسل فانه يتوضأ بالمد من غير الصاع ويغتسل بالصاع وقال عامة مشايخنا رحمهم الله الصاع كاف للغسل والوضوء جميعا وهو الاصح قال مشايخنا هذا بيان مقدار ادنى الكفاية وليس بتقدير لازم بل ان كفاه اقل من ذلك نقص سنه وان لم يكفه زاد عليه بقدر مالا اسراف ولا تقتير كذا في محيط السرخسي وكذلك لوتوضأ بدون المد واسبغ وضوء ه جاز هكذا في شرح الطحاوی...... وكل هذا غير لازم لاختلاف طباع الناس كذا في شرح المبسوط.

وفي رد المحتار (١/١٥٨): (قوله وقيل المقصود) الاصوب حذف قيل لما في الحلية انه نقل غير واحد اجماع المسلمين على ان ما يجزئ في الوضوء والغسل غير مقدر بمقدار وما في ظاهر الرواية من أن أدنى مايكفي في الغسل صاع وفي الوضوء مد للحديث المتفق عليه، كان ﷺ يتوضأ بالمد ويغتسل بالصاع الى خمسة امداد ليس بتقدير لازم بل هو بيان أدنى القدر المسنون اهـ قال في البحر حتى أن من أسبغ بدون ذلك اجزأه وان لم يكفه زاد عليه لان طباع الناس وأحوالهم مختلفة كذا في البدائع اهـ وبه جزم في الامداد وغيره.

وفي الفقه الاسلامي(١/٢٤٣): وعند ابي حنيفة وفقهاء العراق ثمانية ارطال باعتبار ان المد رطلان، فيكون (٣٨٠٠ غم) وفي تقرير آخر وهو الشائع ان الصاع (٢٧٥١ غم)

(١٠) ہاتھ کی انگلیوں کا خلال ہاتھ دھونے سے پہلے ہوگا یا بعد میں؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو میں ہاتھ کی انگلیوں کا خلال سنت ہے یہ کس وقت ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....ہاتھ کی انگلیوں کا خلال وضو کے اندر ہاتھوں کو دھونے کے بعد ہوگا اس لئے کہ ہاتھوں کا دھونا فرض ہے اور تخلیل یدین سنت ہے اور سنت تکمیل فرض کے لئے ہوتی ہے اس لئے انگلیوں کا خلال فرض کے بعد ہوگا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہشتی زیور میں تحریر فرماتے ہیں: پھر تین بار داہنا ہاتھ کہنی سمیت دھوئے پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت تین دفعہ دھوئے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر خلال کرے اور انگوٹھے چھلا چوڑی جو کچھ ہاتھ میں پہنے ہوئے ہلا لیوے کہ کہیں سوکھا نہ رہ جاوے۔ پھر ایک مرتبہ سارے سر کا مسح کرے پھر کان کا مسح کرے۔

لمافي البناية(١/١١٣،١١٢): (ولانه) اى ولأن تخليل الأصابع (اكمال الفرض في محله) اى في محل الفرض......وهذا ايضاً فيه نظر لأن في حديث وائل بن حجر رواه البزار في مسنده قال شهدت

النبی ﷺ واتی بماءٍ فاکفأ علی یمینہٖ ثلاثا الحدیث وفیہ ثم غسل بیدہ الیمنیٰ قدمہ الیمنیٰ وفصل بین اصابعہ أوقال خلل بین اصابعہ اھ۔

وفی الشامی(۱/۱۱۷): اقول قدعلمت من الحدیث المار التقیید فی تخلیل اللحیۃ بأخذ کف من ماء وفی البحر ویقوم مقامہ أی تخلیل الأصابع الادخال فی الماء ولو لم یکن جاریا، وفیہ عن الظھیریۃ ان التخلیل انما یکون بعد التثلیث لانہ سنۃ التثلیث۔ واللہ اعلم

(۱۱) بیت الخلاء میں وضو کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے مدرسے میں غسل خانے موجود ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر کہ لیٹرین اور غسل خانہ ساتھ ہیں ہمارے طلباء اسی میں فراغت حاصل کرتے ہیں اور غسل بھی کرتے ہیں اب بعض طلباء اسی کے اندر جاکر وضو کرتے ہیں تو کیا ان کا وضو صحیح ہوجائے گا یا دوبارہ باہر وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں وضوء درست ہے دوبارہ وضوء کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ چونکہ عام طور پر ایسی جگہوں پر صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا لہٰذا وضو کی دعائیں جہراً نہ پڑھی جائیں۔

لما فی بذل المجھود فی حل ابی داؤد(۱/۳): اذا دخل الخلاء أی اذا اراد دخول مکان الخلوۃ عند قضاء الحاجۃ الخ إلی ان قال وھذا مذھب الجمھور وقالوا من نسی یستعیذ بقلبہ لابلسانہ الخ.

وفی الھندیۃ(۱/۶): ویسمی قبل استنجاء...... ولا یسمی فی حال الانکشاف ولافی محل النجاسۃ ھکذا فی فتح القدیر.

وفی الشامیۃ(۱/۱۰۹): الظاھر أن المراد أنہ یسمی قبل رفع ثیابہ إن کان فی غیر المکان المعد لقضاء الحاجۃ والا فقبل دخولہ فلو نسی فیھما سمی بقلبہ ولا یحرک لسانہ تعظیماً لاسم اللہ تعالیٰ.

وفی الدرالمختار(۱/۱۳۳): ومن منھیاتہ التوضوء...... فی موضع نجس، لان لماءِ الوضوء حرمۃ.

(۱۲) آبِ زم زم سے وضو کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسے مقام پر ہو جہاں پانی نہ ہو اور اس کے پاس آبِ زم زم موجود ہو، اور نماز کا وقت ہوجائے تو کیا یہ شخص آبِ زم زم سے وضو کرسکتا ہے یا تیمم کرکے نماز پڑھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورتِ مسئولہ میں اس شخص کیلئے آبِ زم زم سے ہی وضو کرنا ضروری ہے، تیمم کرنا جائز نہیں البتہ اگر آبِ زم زم کم ہے اور پانی پینے کی بھی شدید ضرورت ہو، تو اس کو پینے کیلئے رکھ لے اور نماز کیلئے تیمم کرلے۔

لمافی الخانية(۱/۲۷): ولو كان فی رحله ماء زمزم و قد رصّص رأس القمقمة يحمله للهدية أوما أشبه ذلک وهو لايخاف علی نفسه العطش لايجوز له التيمم.

وفی الدّر المختار (۱/۱۷۹): (يرفع الحدث)مطلقا(بماء مطلق)......(وماء زمزم) بلاكراهة.

(۱۳) آبِ زم زم سے وضوو غسل کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آبِ زم زم کواگر استنجاء، وضو یا غسل کیلئے استعمال کیا جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ کیونکہ ہمارے ہاں ایک صاحب حج کر کے آئے اور اپنے ساتھ آبِ زم زم بھی لائے، اب جو آبِ زم زم لائے تھے اس کو کنویں میں ڈال دیا تاکہ یہ پانی ہمیشہ کے لئے آبِ زم زم بن جائے، اب استعمال کیلئے یہی کنواں ہے تو کیا اس پانی سے استنجاء کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورتِ مسئولہ میں زم زم کے پانی سے وضواور غسل کرنا جائز ہے، البتہ زم زم کے پانی سے استنجاء کرنا مکروہ ہے۔ نیز کنویں میں آبِ زم زم ڈالنے سے کنویں کا پانی آبِ زم زم کے حکم میں نہیں ہوگا بلکہ ماءِ مطلق کے حکم میں ہوگا۔

لمافی الهندية (۱/۳۱): رجل فی البادية معه ماء زمزم فی القمقمة وقد رصص رأسها لا يجوز التيمم كذا فی الخلاصة.

وفی الدرالمختار (۱/۱۷۹، ۱۸۰): (يرفع الحدث)مطلقا(بماء مطلق......وماء زمزم) بلا كراهة.

وفی الشامية (۲/۶۲۵): (قوله يكره الاستنجاء بماء زمزم) وكذا ازالة النجاسة الحقيقية من ثوبه أو بدنه، حتی ذكر بعض العلماء تحريم ذلک.

(۱۴) سبیل وغیرہ کے پانی سے وضو کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض جگہوں پر لوگوں کے پینے کیلئے جو پانی رکھا ہوتا ہے، جیسے سبیل وغیرہ کیا اس سے وضواور غسل کرنا درست ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......اگر سبیل وغیرہ میں رکھا ہوا پانی کم ہو تو وضو کرنا درست نہیں ہے، وہ پانی صرف پینے کیلئے ہوتا ہے۔ ہاں اگر پانی زیادہ ہو تو اس سے وضو کرنا بھی درست ہے۔ البتہ ایسے پانی سے غسل کرنا درست نہیں ہے۔

لمافی رد المحتار (۱/۲۵۳) (قوله المسبل) ای الموضوع فی الحباب لأبناء السبيل. (قوله لايمنع التيمم.) لانه لم يوضع للوضوء بل للشرب فلا يجوز الوضوء به وان صح. (قوله مالم يكن كثيرا.) قال فی شرح المنية. الاولیٰ الاعتبار بالعرف لابالكثرة، الا اذا اشتبه،

(۱۵) بارش کے قطرات سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص راستے میں جارہا ہو اور وہاں بارش ہونے لگ جائے اور بارش کے پانی سے اس کے اعضائے وضو بھیگ جائیں تو کیا اس سے وضو ہو جائے گا یا نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......بارش کے قطرات سے اگر اعضائے وضو مکمل بھیگ جائیں تو اس سے وضو ہو جائے گا نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔

لما فی الدر المختار (۱/۱۵٦): لو مكث فی ماء جار او حوض كبير او مطر قدر الوضوء والغسل فقد اكمل السنة.

وفی الشامية تحته: (قوله قدر الوضوء والغسل) انظر هل المراد قدر زمنهما لو كان يصيب الماء عليه بنفسه او مقدار مايتحقق فيه جريان الماء على الاعضاء بلحظات يسيرة. يتحقق فيها غسل اعضاء الوضوء مرتبة ثلاثا مع غسل باقی الجسد كذالک؟ لم اره لائمتنا.

(۱٦) بارش میں بھیگنے سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص بارش میں بھیگ جائے تو وضو ہو جاتا ہے۔کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ بعض دفعہ گرمی کی شدت میں برف جسم کے مختلف اعضاء پر ملی جاتی ہے تو اگر وضو کے اعضاء پر برف مل لی جائے تو وضو ہو جانا چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کوئی شخص بارش میں اس طرح بھیگ جائے کہ اعضاء وضو میں کوئی جگہ خشک نہ رہے تو وضو ہو جائے گا۔اسی طرح اگر برف اعضاء وضو پر اس طرح مل لی جائے کہ اعضاء سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگیں اور کوئی جگہ خشک بھی نہ رہے تو وضو ہو جائے گا، ورنہ نہیں۔

لمافی الدر المختار (۱/۱۵٦): ولو مكث فی ماءٍ جار أو حوض كبير او مطر قدر الوضوء والغسل فقد أكمل السنة.

وفی الهندية (۱/۳): ففی مسئلة الثلج اذا توضأ به ان قطر قطرتان فصاعداً يجوز اجماعا وان كان بخلافه فهو على قول ابی حنيفةؒ ومحمدؒ لايجوز وعلى قول ابی يوسفؒ يجوز كذا فی الذخيرة والصحيح قولهما كذا فی المضمرات.

(۱۷) برف سے وضو کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی کبھی سفر کے دوران بعض ایسے علاقوں میں جانا ہوتا ہے کہ وہاں برف ہی برف ہوتی ہے۔ پانی بالکل نہیں ملتا تو ایسی صورت حال میں وضو کا کیا حکم ہے؟ آیا تیمم کرے یا برف سے وضو کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اس صورت میں اگر برف پگھلانے کا آلہ موجود ہو (مثلاً چولہا، برتن وغیرہ) تو اس سے برف کو پگھلا کر وضو کرے اگر یہ سہولت میسر ہو تو تیمم کرنا جائز نہیں، بلکہ اس پانی سے وضو کرنا واجب ہے۔ اور اگر میسر نہ ہو تو تیمم کرنا جائز ہے۔ اور اگر مٹی وغیرہ بھی دستیاب نہ ہو تو پھر تشبہ بالمصلین کرے۔

لمافي الهندية(۱/۲۸): وفي جمد أو ثلج ومعه آلة الذوب لايتيمم وقيل يتيمم والظاهر الاوّل منهما كما لايخفى.

وفي الدر المختار(۱/۲۵۲): (والمحصور فاقد) الماء والتراب (الطهورين) بأن حبس في مكان نجس لايمكنه اخراج تراب مطهر وكذا العاجز عنهما لمرض (يؤخرها عنده وقالا يتشبّه) بالمصلين وجوبا.

(۱۸) گرم پانی سے اور دھوپ کی شدت سے گرم ہونے والے پانی سے وضو وغسل کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر پانی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گرم ہو جائے تو اس سے وضو اور غسل کرنا کیسا ہے؟ نیز آگ سے گرم کئے ہوئے پانی سے غسل اور وضو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اگر پانی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گرم ہو جائے تو اس سے وضو وغسل کرنا کراہت تنزیہی کے ساتھ جائز ہے، البتہ آگ سے گرم کئے ہوئے پانی سے وضو اور غسل بلا کراہت جائز ہے۔

لمافي الشامية(۱/۱۷۹):(قوله مطلقا) اى سواء كان اكبر او اصغر (قوله هو ما يتبادر عند الاطلاق) اى ما يسبق الى الفهم بمطلق قولنا ماء، ولم يقم به خبث ولامعنى يمنع جواز الصلاة فخرج الماء المقيد والماء المتنجس والماء المستعمل ....ولذا قيد بعض العلماء التبادر بقوله بالنسبة للعالم بحاله. وفيه ايضاً(۱/۱۸۰) منها ان لايكون بماء مشمس وبه صرح في الحلية مستدلا بما صح عن عمر من النهي عنه ولذا صرّح في الفتح بكراهته، ومثله في البحر، وقال في معراج الدراية وفي القنية، وتكره الطهارة بالمشمس لقوله ﷺ لعائشة رضی اللہ عنہا حين سخنت الماء بالشمس ((لاتفعلي يا حميراء، فانه يورث البرص)) وعن عمر مثله.....فقد علمت ان المعتمد الكراهة عندنا لصحة الاثر

وأن عدمها رواية، والظاهر انها تنزيهية عندنا أيضا.

(۱۹) بلّی کے جھوٹے پانی سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص وضو کیلئے پانی کا لوٹا بھر کر رکھ دے اور بلی آ کر اس سے پی لے تو کیا باقی پانی سے وضو کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر اس پانی کے علاوہ پاک پانی موجود ہو تو پاک پانی سے وضو کرنا بہتر ہے اور اگر اس پانی کے علاوہ دوسرا پانی موجود نہیں تو پھر اس پانی سے وضو کرنا بلا کراہت درست ہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۴): فان اكلت فارة وشربت الماء في فورها يتنجس وان مكثت ساعة اوساعتين ثم شربت لايتنجس هو الصحيح كذا في الظهيرية.

وفي الشامية (۱/۲۲۴): (قوله طاهر للضرورة) بيان ذلك ان القياس في الهرة نجاسة سؤرها لانه مختلط بلعابها المتولد من لحمها النجس لكن سقط حكم النجاسة اتفاقاً بعلة الطواف المنصوصة بقوله ﷺ انها ليست بنجسة انها من الطوافين عليكم والطوافات اخرجه اصحاب السنن الاربعة وغيرهم.

(۲۰) پرنالے کے پانی سے وضو کا حکم

سوال...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن سخت بارش ہو رہی تھی اور ہمارے گھر کا پانی ختم ہو چکا تھا تو نماز کے وقت میں نے پرنالے والے پانی سے وضو کر لیا اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ پرنالے والے پانی سے وضو یا غسل کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پرنالے سے آنے والے پانی کا رنگ، بو، مزہ کسی نجاست وغیرہ سے بدلا نہ ہو تو اس سے وضو وغسل درست ہے۔

وفي الهندية (۱/۱۷): وفي بعض الفتاوىٰ قال مشائخنا المطر مادام يمطر فله حكم الجريان حتى لو أصاب العذرات على السطح ثم أصاب ثوبا لايتنجس الا أن يتغير.

وفي الشامية (۱/۱۸۸، ۱۸۹): وعلى هذا ماء المطر اذا جرى في الميزاب وعلى السطح عذرات فالماء طاهر وان كانت العذرة عند الميزاب أو كان الماء كله أو نصفه أكثره يلاقي العذرة فهو نجس والا فطاهر وعلى مارجحه الكمال قال في الحلية ينبغي أن لايعتبر في مسألة السطح سوى

تغير أحد الاوصاف اهـ.

(۲۱) حقے کے پانی سے وضو اور غسل کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک دن میں وضو کر رہا تھا کہ پانی ختم ہو گیا اور کوئی پانی نہیں تھا صرف حقے میں پانی موجود تھا تو باقی وضو میں نے اس پانی سے کر لیا تو کیا حقے والے پانی سے وضو یا غسل کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حقے کے پانی سے وضو اور غسل جائز ہے۔ کیونکہ حقے کا پانی ماء مطلق کی طبیعت پر برقرار رہتا ہے۔ اگرچہ حقے کے پانی کے اوصاف دھوئیں کی وجہ سے تبدیل ہو جاتے ہیں، چونکہ دھواں پاک ہے اور پاک چیز کی آمیزش پانی کی طہارت پر اس وقت تک اثر انداز نہیں ہوتی جب تک پانی اپنی طبیعت (رقت اور سیلان) پر باقی ہو۔

لمافي مراقي الفلاح(صـ۱۹): (ولا) يجوز الوضوء (بما زال طبعه) وهو الرقة والسيلان والارواء والانبات (بالطبخ ......أو بغلبة غيره)...... (عليه...... والغلبة...... في مخالطة) الماء لشئ من (الجامدات) الطاهرات (باخراج الماء عن رقته) فلا ينعصر عن الثوب (و) إخراجه عن (سيلانه) فلا يسيل علي الأعضاء سيلان الماء (و) أما اذا بقي علي رقته وسيلانه فانه (لايضر)...... تغير أوصافه كلها بجامد) خالطه بدون طبخ (كزعفران وفاكهة وورق شجرة).

وفي الفقه الاسلامي(۱/۲۶۷): والخلاصة ان خالط الماء شئي طاهر ولم يغير لونه أوطعمه أو ريحه فهو ماء مطلق طهور وان غير احد هذه الاوصاف الثلاثه ......عند الحنفية طاهر مطهر، مالم يطبخ أويغلب علي أجزائه.

(۲۲) گنے کے رس سے وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسے مقام پر ہو جہاں پانی کا نام ونشان نہ ہو اور اسکے پاس گنے کا رس موجود ہو اور نماز کا وقت ہونے پر یہ شخص اس رس سے وضو کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... گنے کے رس سے وضو جائز نہیں، اس لئے کہ وضو کیلئے ماء مطلق شرط ہے اور یہ ماء مطلق نہیں ہے۔ لہٰذا یہ شخص تیمم کر کے نماز ادا کرے۔

لمافي الهندية(۱/۲۱): لايجوز التوضؤ بماء البطيخ والقثاء والقتد ولا بماء الورد ولابشئ من الاشربة ولا بغيرها من المائعات نحو الخل.

وفي الدرالمختار(۱/۱۸۰): (و) لا(بعصير نبات) أى معتصر من شجر اوثمر لانه مقيد.

(۲۳) گندگی والے جوہڑ اور ڈیم سے وضو کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دیہاتوں میں بارش کے موسم میں بڑے بڑے ڈیموں یا جوہڑ میں بارش کا پانی جمع ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کچرا اور گندی چیزیں بھی جمع ہوجاتی ہیں تو کیا اس پانی سے وضو کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر جوہڑ اتنے بڑے ہوں جو شرعاً ''غدیر عظیم'' کے حکم میں آتے ہوں یعنی دہ دردہ ہوں اور ان میں بارش کا پانی جمع ہوجاتا ہو تو چونکہ یہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہے اس لئے ان جوہڑوں اور ڈیموں کے ان اطراف سے وضو کرنا جائز ہے جہاں نجاست اور گندی چیزیں نہیں ہیں بشرطیکہ پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہوا ہو۔

لمافی الهندية (۱/۱۸): الماء الراكد اذا كان كثيرا فهو بمنزلة الجاری لايتنجس جميعه بوقوع النجاسة فی طرف منه الا ان يتغير لونه أو طعمه أو ريحه وعلى هذا اتفق العلماء وبه اخذ عامة المشايخ رحمهم الله كذا فی المحيط.

وفی الدرالمختار (۱/۱۹۰): (وكذا) يجوز (براكد) كثير (كذلك) أی وقع فيه نجس لم ير أثره ولو فی موضع وقوع المرئية، به يفتی بحر.

وفی الشامية (۱/۱۹۱): (قوله به يفتی) أی بعدم الفرق بين المرئية وغيرها.

(۲۴) ناپاک ٹینک سے کئے گئے وضو اور طہارت کا حکم

سوال .... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فائزہ ہائیٹس میں ایک پانی کا بہت بڑا ٹینک ہے۔ جو دہ دردہ سے بڑا ہے۔ حالیہ بارشوں میں گٹر اور سڑک کا پانی ٹینک میں چلا گیا۔ جس کے بعد پانی میں بدبو آ گئی اور رنگ بھی بدل گیا پھر تقریباً تین دن تک اسی پانی کی سپلائی کی گئی۔ اور پانی میں حسب معمول بدبو تھی۔ پھر تین دن کے بعد بدبو تو ختم ہوگئی لیکن پانی پھر بھی گدلا ہی آ رہا تھا اور اب کیفیت یہ ہے کہ پانی آہستہ آہستہ صاف ہوتا جا رہا ہے۔ مگر بالکل صاف بھی نہیں اور ٹینک کو اب تک صاف نہیں کیا گیا ہے بعض لوگ اسی پانی کو استعمال کر رہے ہیں اور بعض نہیں استعمال کر رہے ہیں تو جن لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا اور کپڑے وغیرہ دھوئے ان کا کیا حکم ہے؟ اور ٹینک کا پانی پاک ہوگیا یا ٹینک کی صفائی کرنی پڑے گی؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... جب پانی کے اوصاف ثلثہ (رنگ، بو، ذائقہ) میں سے کوئی ایک کسی نجاست وغیرہ کے گرنے سے متغیر ہوجائے تو یہ پانی ناپاک ہوجاتا ہے۔ خواہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ صورت مسئولہ میں جب گٹر یا سڑک وغیرہ کا پانی ٹینک میں داخل ہوگیا اور پانی میں بدبو وغیرہ پیدا ہوگئی اور اس کا رنگ بھی بدل گیا تو یہ پانی ناپاک ہوگیا ہے۔ اس سے جن حضرات نے وضو وغیرہ کر کے نماز ادا کی وہ

اپنی نمازوں کا اعادہ کریں گے یا اسی طرح اگر کپڑے وغیرہ دھوئے ہوں تو وہ انہیں دوبارہ دھوئیں گے اور جب تک ٹینک کے پانی سے بدبو ختم نہ ہوجائے اور اس کا رنگ صاف نہ ہو، اس وقت تک یہ پانی طہارت کیلئے استعمال کرنا درست نہیں۔ البتہ اگر ٹینک سے پانی نکال کرا سے دھولیا گیا اور خوب صاف کرنے کے باوجود کچھ بدبو وغیرہ باقی ہے یا رنگت متغیر ہے تو وہ طہارت کیلئے مضر نہ ہوگا۔

لما في الهندية(۱/۱۸): الماء الجاری بعد ما تغير أحد أو صافه وحكم بنجاسته لايحكم بطهارته مالم يزل ذلك التغير بأن يرد عليه ماء طاهر حتى يزيل ذلك التغير.

وفي الدر المختار(۱/۱۸۵): (وبتغير احد اوصافه) من لون اوطعم او ريح (ينجس) الكثير ولو جارياً اجماعاً.

وفي الفقه الاسلامی(۱/۲۸۸): واتفق الحنفية مع الجمهور على أن الماء الكثير (وهو عشر فی عشر) لا ينجس الابظهور اثر النجاسة فيه.

(۲۵) سیاہ خضاب لگائے ہوئے شخص کے وضو وغسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سفید بالوں میں سیاہ خضاب لگانا کیسا ہے؟ اور اگر لگایا: تو وضو اور غسل جنابت صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سفید بالوں میں سیاہ خضاب لگانا مطلقاً ناجائز ہے۔ اور ہر وہ خضاب جس سے سر کے بالوں کو یا داڑھی کو رنگوایا ہوا گر وہ ذی جسم ہو اور ذی جسم ہونے کی وجہ سے پانی بالوں تک اور بالوں کی جڑوں تک نہ پہنچتا ہو تو وضو اور غسل جنابت صحیح نہیں ہوگا۔ اگر وہ ذی جسم نہ ہو یا ذی جسم تو ہو لیکن پانی بالوں تک اور ان کی جڑوں تک پہنچتا ہو تو وضو اور غسل جنابت دونوں صحیح ہوں گے۔

لمافي الهندية(۵/۳۵۹): واتفق المشايخ ان الخضاب فی حق الرجال بالحمرة سنة وانه من سيماء المسلمين وعلاماتهم وأما الخضاب بالسواد فمن فعل ذلك من الغزاة ليكون أهيب فی عين العدوّ فهو محمود منه اتفق عليه المشايخ ومن فعل ذلك ليزين نفسه للنسآء وليحبب نفسه اليهن فذلك مكروه وعليه عامة المشايخ.

وفي الدر المختار(۶/۷۵۶): (اختضب لاجل التزين للنساء والجواری جاز) فی الأصح ويكره بالسواد.

وفي الهندية (۱/۴): والخضاب اذا تجسد ويبس يمنع تمام الوضوء والغسل كذا فی السراج الوهاج.

(۲۶) ناخن میں خشک آٹے کے ہوتے ہوئے وضو کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے ناخن میں آٹا لگ کر سوکھ گیا ہو، اور دورانِ وضو آٹے کی نیچے والی جگہ پر پانی نہ پہنچا ہو لیکن اس نے دس پندرہ منٹ کے بعد دیکھا کہ آٹا لگا ہوا ہے جو کہ خشک ہے تو کیا اس صورت میں دوبارہ پورا وضو کرے یا صرف آٹا کھرچ کر اس جگہ تک پانی پہنچائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....وضو کے اندر موالاۃ یعنی (اعضاء کو پے در پے دھونا) اور ترتیب کی رعایت رکھنا سنت ہے اور صورت مسئولہ میں صرف موالاۃ اور ترتیب کی رعایت باقی نہیں رہی لہٰذا آٹا کھرچ کر صرف اس جگہ میں پانی پہنچا دینا کافی ہے۔

لمافی قاضی خان(۱/۱۷): ولو کان علی یدیه خبز ممضوغ قد جف و یبس واغتسل لایخرج من الجنابة حتی یدلک ذالک الموضع ویجری الماء تحته لانه لاحرج فیه.

وفی الطحطاوی علی الدرالمختار(۱/۸۷): (قوله حتی ماتحت الدرن) قال فی البحر والدرن الیابس فی الانف کالخبز الممضوغ والعجین یمنع تمام الاغتسال.

(۲۷) ناخنوں کے اندر میل وضو اور غسل میں حائل نہیں ہوتا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے ناخن بڑے بڑے ہوتے ہیں اور ان کے اندر میل خوب ہوتا ہے بظاہر اس میل کے اندر پانی کا جانا بھی مشکل ہے جب یہ لوگ وضو یا غسل کریں گے تو ان کے وضو اور غسل کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....ناخنوں کے اندر صرف میل کا ہونا وضو اور غسل میں حائل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا وضو وغسل درست ہو جائے گا۔ البتہ بڑے بڑے ناخن رکھنا خلافِ سنت ہے۔

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۲): وما تحت الاظافیر من اعضاء الوضوء حتی لو کان فیه عجین یجب ایصال الماء الی ما تحته وفی الوسخ لا، وکذا الطین القروی المصریّ سواء.

وفی التاتارخانیة(۱/۱۵۱): وفی الخانیة وما یکون علی البدن یقال بالفارسیة فلماخ (کذا) لا یمنع عن تمام الغسل لانه یتولد من البدن بمنزلة الدرن.

وفی الهندیة(۱/۴): وفی الجامع الصغیر سئل ابو القاسم عن وافر الظفر الذی یبقی فی اظفاره الدرن او الذی یعمل عمل الطین اوالمرأة التی صبغت اصبعها بالحناء او الصرام او الصباغ قال کل ذلک سواء یجزیهم وضوء هم اذلا یستطاع الامتناع عنه الابحرج والفتوی علی الجواز من غیر

فصل بين المدني والقروي.

وفي الشامية(۱/۱۵۴): (ولا يمنع) الطهارة (ونيم) اى خرء ذباب وبرغوث لم يصل الماء تحته (وحناء) ولو جرمه به يفتي (ودرن ووسخ) عطف تفسير، وكذا دهن و دسومة (وتراب) وطين ولوفي ظفر مطلقاً) اى قروياً او مدنياً في الاصح بخلاف نحو عجين.

وفي الهندية (۵/۳۵۷): وقلم الاظفار سنة الا في دارالحرب فان تركها مندوب اليه كذا في محيط السرخسي.

(۲۸) ناخن پالش اور مہندی لگا کر وضو اور غسل کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ناخنوں پر مہندی یا ناخن پالش لگی ہوئی ہو تو وضو اور غسل کا کیا حکم ہوگا؟ نیز اگر کسی کے سر پر مہندی لگی ہو تو غسل میں اس کو اتارنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً　مذکورہ بالا صورت میں اگر ناخنوں پر ناخن پالش لگی ہوئی ہو، یا ان اعضاء پر جن کا دھونا وضو میں فرض ہے کوئی ایسی چیز لگی ہوئی ہو جس کی وجہ سے بدن تک پانی نہیں پہنچتا ہو تو وضو صحیح نہیں ہوگا یا بدن کے کسی حصے پر بھی ایسی چیز لگی ہو تو غسل صحیح نہیں ہوگا۔ اور اگر ہاتھ یا سر پر مہندی لگی ہو اور وہ پانی کو بدن تک پہنچنے سے نہیں روکتی تو وضو اور غسل دونوں صحیح ہوں گے۔

لمافي الطحطاوي على الدر(۱/۸۸): (قوله ولو جرمه) الحناء لكن لابد ان يصل الماء تحته واما اذا لم يصل لاتصح الطهارة و لذا قال في البحر ولو الزقت المرأة راسها بالطيب بحيث لايصل الماء الى اصول الشعر وجب عليها ازالته.....(قوله بخلاف نحو عجين) من خبز ممضوغ ودرن يابس في الأنف وجلد سمك كما في البحر(قوله ولا يمنع ماعلى ظفر صباغ) للضرورة قال في المضمرات وعليه الفتوىٰ والقول الثاني انه يمنع وبه صدر في البحر والظاهر ان هذا الخلاف يجرى في الحناء.

وفي الدر المختار(۱/۱۵۴): (ولا يمنع) الطهارة (ونيم) أى خرء ذباب وبر غوث لم يصل الماء تحته (وحناء) ولو جرمه به يفتي (ودرن ووسخ)......وكذا دهن ودسومة (وتراب) وطين ولو(في الظفر مطلقا) ...... في الاصح بخلاف نحو عجين (و)لا يمنع (ماعلى ظفر صباغ).

وفي ردالمحتار(۱/۱۵۴): (قوله لم يصل الماء تحته) لان الاحتراز عنه غير ممكن حلية،(قوله به يفتي)صرح به في المنية عن الذخيرة في مسألة الحناء والطين والدرن معللاً بالضرورة قال في شرحها ولان الماء ينفذه لتخلله وعدم لزوجته وصلابته والمعتبر في جميع ذالك نفوذ الماء و وصوله الى البدن .... (قوله وكذادهن) أى كزيت وشيرج بخلاف نحوشحم وسمن جامد...... (قوله بخلاف

نحو عجین) ای کعلک وشمع وقشر سمک وخبز ممضوغ متلبد ......(قولہ ان صلباً)......ای ان کان ممضوغاً مضغاً متأکدا بحیث تداخلت اجزاءہ وصار لہ لزوجۃ وعلاکۃ کالعجین الخ.

(۲۹) ہاتھوں پر رنگ لگ جانے کی صورت میں وضواور غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں رنگ سازی کا کام کرتا ہوں تو میرے ہاتھوں پر رنگ لگ جاتا ہے جب نماز کا وقت آجاتا ہے تو میں وضو کر کے نماز پڑھ لیتا ہوں تو کیا رنگ کے لگ جانے کی صورت میں وضواور غسل ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر رنگ ایسا ہے کہ اعضاء وضوء یا جسم پر اس کی تہہ جم جاتی ہے۔ جیسے گوندھے ہوئے آٹے کی تہہ اور اس کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچ پاتا تو وضواور غسل کی صحت کیلئے ایسے رنگ کا ہر حال میں جسم سے صاف کرنا ضروری ہوگا اور اگر رنگ پانی کے ساتھ مل جاتا ہے اور وہ پانی کو جسم تک پہنچنے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تو ایسے رنگ کو اگر صاف نہ بھی کیا جائے تو بھی وضواور غسل درست ہو جائے گا۔ اور اگر رنگ ناخن میں سرایت کر چکا ہے اور اس کو صاف کرنا اذیت سے خالی نہیں اور اچھی طرح صفائی کے باوجود بھی رنگ ناخنوں میں برقرار ہے، تو حرج واذیت کی وجہ سے وضواور غسل درست ہو جائیں گے اور اگر ناخن طویل ہیں تو ان کو لازمی طور پر کاٹ لیا جائے۔

لما فی الهندیة(۱/۴): وما تحت الاظافیر من اعضاء الوضوء حتی لو کان فیه عجین یجب ایصال الماء الی ماتحته کذا فی الخلاصة واکثر المعتبرات...... سئل ابوالقاسم عن وافر الظفر الذی یبقی فی اظفاره الدرن او الذی یعمل عمل الطین والمرأة التی صبغت اصبعها بالحناء أو الصرام أو الصباغ قال کل ذالک سواء یجزیهم وضوء هم اذ لایستطاع الامتناع عنه الابحرج والفتوی علی الجواز من غیر فصل بین المدنی والقروی کذا فی الذخیره.

وفی الدرالمختار(۱/۱۵۴): (ولایمنع) الطهارة...... (وتراب) وطین ولو(فی ظفر مطلقاً) ای قرویاً او مدنیا فی الاصح بخلاف نحو عجین

(وفی الشامیة تحته): (قوله بخلاف نحو عجین)ای کعلک وشمع وقشر وسمک وخبز ممضوغ متلبد جوهرة .... نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیه فی العجین واستظهر المنع لان فیه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء.

(۳۰) پاؤں کی پھٹن پر دوا لگانے کے بعد وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سردیوں میں عام طور پر پاؤں پھٹ جاتے ہیں اگر ان پر

کوئی کریم یا کوئی اور ایسی چیز لگادی جائے کہ اسکی تہہ جم جائے جسکی وجہ سے پانی بظاہر نیچے نہیں پہنچتا، اب ایسی صورت میں پریشانی یہ ہے کہ ہر نماز کے وقت ایسی کسی بھی چیز کا ہٹانا مشکل ہوتا ہے تو کیا ایسی صورت میں اس کریم لگے رہنے کے ساتھ وضو کرنا جائز ہے یا پھر چند دن تیمم کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں جب پاؤں پر کوئی ایسی دوا لگادی جائے جس کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچ سکے تو حرج کی بناء پر صرف پانی بہادینا کافی ہے، اور اگر دوا ایسی ہے کہ پانی بہانے میں بھی تکلیف ہو تو صرف مسح کرنا کافی ہے، اور اگر مسح کرنے میں بھی تکلیف ہو تو مسح بھی چھوڑ دیا جائے اور صرف آس پاس کی جگہ دھودی جائے، البتہ ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی الدر المختار (۱/۱۰۲): فی اعضائه شقاق غسله ان قدر والا مسحه والا ترکه.

وفی الشامیة (والا ترکه) أی وان لم یمسحه بأن لم یقدر علی المسح ترکه..... ولو کان فی رجله فجعل فیه الدواء یکفیه امرار الماء فوقه ولا یکفیه المسح.

(۳۱) ہونٹ بند ہونے کے بعد جو حصہ دکھائی دے، وضو میں اس کے دھونے کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہونٹ کا وہ حصہ جو ہونٹ بند ہونے کے بعد دکھائی دیتا ہے کیا اس کا دھونا بھی فرض ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ہونٹ کا جو حصہ بند ہونے کے بعد دکھائی دیتا ہے وضو اور غسل میں اس کا دھونا بھی فرض ہے۔

لمافی الھندیة (۱/۴): واما الشفة فما یظهر منها عند الانضمام فهو من الوجه وما ینکتم عند الانضمام فهو تبع الفم هو الصحیح کذا فی الخلاصة.

وفی الدر المختار مع ردالمحتار (۱/۹۷): (یجب غسل المیاقی) وما یظهر من الشفة عند انضمامها قال فی الشامیة تحت (قوله عند انضمامها) اشار بصیغة الانفعال الی ان المراد ما یظهر عند انضمامها الطبیعی لاعند انضمامها بشدة وتکلف.

(۳۲) دانت پر سونے یا چاندی کا خول چڑھانے یا دوا بھروانے کے بعد وضو و غسل کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنے دانتوں میں دوا وغیرہ بھروالے، یا سونے یا چاندی کا خول چڑھالے تو اس کے وضو یا غسل کی صورت کیا ہوگی؟ اسی طرح سونے یا چاندی کا خول چڑھانا جائز بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض لوگ صرف خوبصورتی کیلئے ایسا کرتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اگر دانتوں پر سونے یا چاندی کا خول صرف خوبصورتی کیلئے چڑھایا جارہا ہے تو یہ جائز نہیں

لیکن اگر ضرورت کی بناء پر ہو تو جائز ہے۔

اب اگر دانت میں دوا وغیرہ بھری ہے تو اس پر پانی کا گزر جانا کافی ہے اسی سے وضو وغسل میں سنت وفرض ادا ہو جائے گا۔ اور سونے یا چاندی کا خول ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اس خول کو بلا مشقت نکالا جا سکتا ہے یا نہیں اگر نکالا جا سکتا ہے تو نکالنا ضروری ہوگا بغیر نکالے وضو تو ہو جائے گا لیکن غسل درست نہ ہوگا اور اگر بلا مشقت نہیں نکالا جا سکتا تو پھر نکالنا ضروری نہیں بلکہ اوپر سے پانی کا گزر جانا کافی ہے۔

لما في الهندية (۱/۳۵): ولو انكسر ظفره فجعل عليه دواء او علكا فان كان يضره نزعه مسح عليه وان ضره المسح تركه.

وفيها ايضاً (۵/۳۳۶): قال محمد في الجامع الصغير ولا يشد الأسنان بالذهب ويشدها بالفضة يريد به اذا تحركت الاسنان وخيف سقوطها فاراد صاحبها ان يشدها يشدها بالفضة ولا يشدها بالذهب وهذا قول أبي حنيفة وقال محمد يشدها بالذهب ايضا،

وفي الدر المختار (۶/۳۶۱): (ولا يشد سنه)المتحرك (بذهب بل بفضة)وجوزهما محمد (ويتخذ انفاً منه)لان الفضة تنتنه.

وفي الشامية (لان الفضة تنتنه)الاولى تنتن بلا ضمير واشار الى الفرق للامام بين شد السن واتخاذ الانف فجوز الانف من الذهب لضرورة نتن الفضة لان المحرم لا يباح الا لضرورة وقد اندفعت في السن بالفضة فلا حاجة الى الاعلى وهو الذهب......

(۳۴۳) وضو میں زائد انگلیوں کے دھونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کے ہاتھ میں پانچ سے زائد انگلیاں ہوتی ہیں، اسی طرح بعض لوگوں کے پاؤں کے ساتھ چھوٹے سے پاؤں کی شکل ہوتی ہے، کیا وضو کے فرائض میں ان زائد اعضاء کا دھونا ضروری ہوگا یا نہیں؟ اگر کسی نے ان اعضاء کو نہیں دھویا تو اسکی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر زائد انگلی یا پیر وغیرہ میں عضو اصلی کی طرح حرکت کرنے یا کسی چیز کو پکڑنے کی قوت موجود ہو تو اس کا دھونا لازمی ہے اور اگر اس میں حرکت کرنے یا کسی چیز کو پکڑنے کی قوت نہ ہو تو یہ زائد عضو شمار ہوگا، اب یہ عضو اگر محل فرض وضو میں نکل آیا تو اس کا دھونا لازمی ہے اور اگر غیر محل فرض وضو میں نکل آیا تو پھر دیکھا جائے گا کہ عضو اصلی کے محاذات میں ہے یا نہیں اگر عضو اصلی کے محاذات میں ہو تو دھونا لازم ہے، اور اگر عضو اصلی کے محاذات میں نہ ہو تو دھونا لازم نہیں البتہ مستحب ضرور ہے۔

لما في الهندية (۱/۴): ويجب غسل كل ما كان مركبًا على اعضاء الوضو من الاصبع الزائدة والكف الزائدة كذا في السراج الوهاج.

وفي الدرالمختار (۱/۱۰۲): ولو خلق له يدان ورجلان فلو يبطش بهما غسلهما ولو باحداهما فهي الاصلية فيغسلها وكذا الزائدة إن نبتت من محل الفرض كاصبع وكف زائدين والا فما حاذى منهما محل الفرض غسله ومالا فلا لكن يندب مجتبى.

وفي الشامية (ولو خلق له) اى من جانب واحد ...... (ولو باحداهما) اى ولو يبطش باحداهما فهي الاصلية والاخرى زائدة لا يجب غسلها وظاهره ولوكانت تامة وفي النهرولم ار حكم مالو كانتا تامتين متصلتين اومنفصلتين والظاهر وجوب غسلهمافي الاول وغسل واحدة في الثاني فلم يعتبر البطش والظاهر انه يعتبر البطش اولا فان بطش بهما وجب غسلهما والا فان كانتا تامتين متصلتين وجب غسلهما وان كانتا منفصلتين لا يجب الا غسل الاصلية التي يبطش بها وهو حسن جمعابين العبارتين .

(۳۴) مہندی لگے بالوں کے ساتھ وضواور غسل کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے سر کے بال سفید ہوگئے ہیں میں نے ان پر مہندی لگادی تا کہ زیادہ عمر معلوم نہ ہو، ہمارے ایک عزیز نے دیکھا تو فرمانے لگے اگر جسم پر رنگ وغیرہ لگا ہوتو وضواور غسل صحیح نہیں ہوتا آپ فوراً یہ مہندی کا رنگ اتار دیں، کیاان کی یہ بات صحیح ہے؟ مہندی کے رنگ کے ہوتے ہوئے غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً..... سُرخ مہندی کا بالوں پر لگانا مردوں کیلئے سنت ہے۔اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دینااور صحابہؓ کا عمل کرنا احادیث سے ثابت ہے اس لئے آپ کا یہ عمل درست ہے۔اس کے رنگ کے ہوتے ہوئے وضواور غسل صحیح ہوجائے گا۔ کیونکہ اس کا رنگ پانی کو بدن تک پہنچنے سے نہیں روکتا۔البتہ اگر کوئی شخص مہندی لگائے اوراس کا جرم بدن یا بالوں پر جما ہوا ہو،اس حال میں وضو یاغسل کرے تو پانی کا اس جرم سے گزر کر بدن تک پہنچ جانا ضروری ہے۔اگر پانی بدن تک نہ پہنچے اور بال برابر جگہ بھی خشک رہ جائے تو وضو اور غسل صحیح نہیں ہوگا۔

لمافي المسلم (۲/۱۹۹): عن جابر بن عبدالله قال اتى بابي قحافة يوم فتح مكة وراسه ولحيته كالثغامة بياضا فقال رسول الله ﷺ غيروا هذا بشيء واجتنبوا السواد.

وفي ردالمحتار(۱/۱۵۱،۱۵۲): (وفرض الغسل)...... (غسل) كل (فمه)...... (وانفه) حتى ماتحت الدرن (وبدنه) (الدر المختار).

(قوله حتى ماتحت الدرن) قال في الفتح والدرن اليابس في الانف كالخبز الممضوغ والعجين يمنع اهـ وهذا غير الدرن الآتي متنا، وقيد باليابس لما في شرح الشيخ اسمعيل ان في الرطب اختلاف

المشایخ کمافی القنیة عن المحیط. (الشامی ،صـ۱۵۲)

(قوله لم یصل الماء تحته) لان الاحتراز عنه غیر ممکن حلیة.

(قوله به یفتی) صرح به فی المنیة عن الذخیرة فی مسألة الحناء والطین والدرن معللا بالضرورة. قال فی شرحها ولان الماء ینفذه لتخلله وعدم لزوجته وصلابته، والمعتبر فی جمیع ذلک نفوذ الماء ووصوله الی البدن اهـ. لکن یرد علیه ان الواجب الغسل وهو اسالة الماء مع التقاطر کمامر فی ارکان الوضوء والظاهر ان هذه الاشیاء تمنع الاسالة فالاظهر التعلیل بالضرورة، ولکن قد یقال ایضاً ان الضرورة فی درن الانف اشد منها فی الحناء والطین لندورهما بالنسبة الیه مع انه تقدم انه یجب غسل ((۱)) ماتحته فینبغی عدم الوجوب فیه ایضا تامل...... الدرن الوسخ، واشار بهذا الی ان المراد بالدرن هنا المتولد من الجسد وهو ما یذهب بالدلک فی الحمام بخلاف الدرن الذی یکون من مخاط الانف فانه لو یابسا یجب ایصال الماء الی ماتحته کمامر...... (قوله بخلاف نحو عجین) ای کعلک وشمع وقشر سمک وخبز ممضوغ متلبد جوهرة، لکن فی النهر ولو فی اظفاره طین او عجین فالفتوی علی انه مغتفر قرویا کان او مدنیا اهـ نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیة فی العجین واستظهر المنع لان فیه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء (قوله به یفتی) صرح به فی الخلاصة وقال لان الماء شئ لطیف یصل تحته غالبا اهـ ویرد علیه ماقد مناه آنفا ومفاده عدم الجواز اذا علم انه لم یصل الماء تحته، قال فی الحلیة وهو اثبت. (الشامی صـ۱۵۴)

((۱)) (قوله انه یجب غسل الخ) فیه انه لا یقال ذلک مع وجود النص بخلافه وانما یلزم التامل فی وجه الفرق، ویظهر ان علة عدم منع الطهارة فی هده الاشیاء الضرورة مع وجود وصول الماء ولو بغیر التقاطر، بخلاف درن الانف فان الضرورة وجدت فیه الا ان الوصول لم یوجد، وهذا هو الفرق، ویؤیده اکتفاؤهم بتحریک الخاتم الضیق مع انه یمنع الاسالة تامل اهـ.

(۳۵) وضو اور غسل میں مصنوعی ٹانگ کے دھونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جہاد افغانستان میں شریک ہوا پانچ چھ ماہ لڑائی کے بعد میرے پاؤں میں گولی لگ گئی جس کی وجہ سے کینسر ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے میری ٹانگ گھٹنے سے نیچے کاٹ دی، اب میں نے اس کی جگہ مصنوعی ٹانگ لگوالی ہے تو آیا وضو اور غسل میں مصنوعی ٹانگ اور پیر کا دھونا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وضو اور غسل میں مصنوعی ٹانگ اور پیر کا دھونا ضروری نہیں۔ البتہ غسل میں مصنوعی ٹانگ کو نکال کر باقی بدن کا دھونا

فرض ہے۔

لمافی البحر الرائق (۱/۸۷): الا ما يتعذر ايصال الماء اليه خارج من قضية النص وكذا ما يتعسر لان المتعسر منفي كالمتعذر كداخل العينين فان في غسلهما من الحرج مالا يخفى.

وفي الهندية (۱/۱۳، ۱۴): والصرام والصباغ مافي ظفرهما يمنع تمام الاغتسال وقيل كل ذلك يجزيهم للحرج والضرورة ومواضع الضرورة مستثناة عن قواعد الشرع كذا في الظهيرية. وجب تحريك القرط والخاتم الضيقين ولو لم يكن قرط فدخل الماء الثقب عند مروره أجزأه والا أدخله ولا يتكلف في ادخال شئ سوى الماء من خشب ونجو. كذا في البحر الرائق.

وفي الدر المختار مع ردالمحتار (۱/۱۵۲، ۱۵۳): (لا) يجب (غسل مافيه حرج كعين) وان اكتحل بكحل نجس (وثقب انضم و) لا (داخل قلفة) يندب هو الاصح قاله الكمال وعلله بالحرج فسقط الاشكال.

قال الشامي تحت (قوله وثقب انضم) قال في شرح المنية وإن انضم الثقب بعد نزع القرط وصار بحال إن امر عليه الماء يدخله وإن غفل لا فلا بد من امراره ولا يتكلف لغير الامرار من ادخال عود ونحوه فان الحرج مدفوع (قوله وداخل قلفة...... وفيه ايضاً (قوله فسقط الاشكال) ...... ووجه السقوط أن علة عدم وجوب غسلها الحرج.

(۳۶) ناخنوں پرمہندی لگی ہوتو وضووغسل کاحکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہاتھ میں اور ناخنوں میں مہندی لگا کر وضووغسل کرنے سے وضووغسل ہوجائے گا یانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر کسی کے ہاتھ یا ناخنوں پرمہندی لگی ہوتو یہ وضووغسل کے صحیح ہونے سے مانع نہیں ہوگی۔ مہندی کے ہوتے ہوئے وضواورغسل ہوجائے گا جبکہ یقین ہوکہ پانی نیچے تک پہنچ گیا ہے۔

لمافي الدر المختار (۱/۱۵۴): (ولا يمنع) الطهارة (ونيم) اى خرء ذباب وبرغوث لم يصل المآء تحته (وحناء) ولو جرمه، وبه يفتى.

وفي الهندية (۱/۴): اوالمرأة صبغت اصبعها بالحنآء اوالصباغ قال كل ذالك سواء يجزيهم وضؤهم.

(۳۷) ریل کے دوسرے درجے کے مسافر کیلئے پہلے درجے میں جا کر وضو وغسل کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بذریعہ ریل سفر کرتے ہوئے: اکانومی درجے میں سفر کرنے والے مسافر کیلئے اکانومی ڈبے میں پانی ختم ہونے کی صورت میں وضو کرنے کیلئے یا بوقت حاجت غسل کرنے کیلئے: اے سی، لوئر بس، ریل کار وغیرہ میں جا کر وضو یا غسل کرنا شرعاً کیسا ہے؟ واضح رہے کہ (۱)۔ اکانومی ڈبے کی ٹکٹ اور دوسرے درجات کی ٹکٹوں میں فرق ہوتا ہے، (۲)۔ ایک درجے والا دوسرے درجے میں سفر نہیں کرسکتا۔ نیز اس صورت میں اگر اجازت نہیں ہے تو نماز کیلئے تیمم کرنا درست ہوگا؟ اس حال میں کہ وقت کے اندر اندر گاڑی رکنے کا امکان نہیں یا پھر اگر رکے تو اسٹیشن پر غسل کا انتظام نہیں اور اگر ہو بھی تو گاڑی رکنے کا وقت اتنا قلیل ہے کہ غسل ممکن نہیں۔ اور اندر بھی کسی اکانومی ڈبے میں پانی نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اگر ریلوے انتظامیہ والوں کی طرف سے ہر خاص وعام ڈبے کو برابر طور پر پانی پہنچانا اُن کی ذمہ داری ہو چاہے اکانومی درجے کے ڈبے ہوں یا اے سی کے ڈبے ہوں، اُن کی طرف سے پانی وغیرہ کے استعمال پر کوئی پابندی نہ ہو، اکانومی درجے کے ڈبے میں پانی ختم ہوگیا، تو اس صورت میں اے سی والے ڈبے میں جا کر وہاں وضو بنانا یا وہاں سے پانی لانا یہ جائز ہوگا، تیمم کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر ہر خاص وعام ڈبے میں انتظامیہ والوں کی طرف سے جانے پر یا پانی کے استعمال پر پابندی ہو، تو اس صورت میں یہ مسافر اکانومی درجے کے ڈبے میں حتی الامکان پانی تلاش کرے، اگرچہ مناسب پیسوں پر کیوں نہ ہو، اگر پانی اکانومی درجے کے ڈبے میں نہ ہو اور گاڑی کے رُکنے کا امکان بھی نہ ہو یا گاڑی اسٹیشن پر رُکتی ہو لیکن وہاں پانی موجود نہ ہو تو یہ شخص تیمم کرسکتا ہے چاہے وضو کیلئے ہو یا جنابت کیلئے ہو۔ اس شخص کیلئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اے سی یا لوئر بس وغیرہ میں جا کر بغیر اجازت کے وہاں کے پانی سے وضو بنائے یا غسل کرے۔ کیونکہ کسی مسلمان کے مال کو بغیر اُس کی رضامندی کے استعمال کرنا یہ غصب میں آتا ہے، اور مغصوبہ چیز کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافي الشامية (۱/۲۳۲): (قوله من عجز) العجز على نوعين: عجز من حيث الصورة والمعنى، وعجز من حيث المعنى فقط، فأشار الى الاول بقوله لبعده، وإلى الثاني بقوله (أو المرض)...... وأيضاً (صـ۲۳۳) (قوله ولو مقيما) لأن الشرط هو العدم فأينما تحقق جاز التيمم، نص عليه في الأسرار بحر...... وأيضاً في تنوير الابصار مع شرحه (صـ۲۴۶، ۲۴۷) (ويجب) أي يفترض (طلبه) ولو برسوله (قدر غلوة) ثلثمائة ذراع من كل جانب، ذكره الحلبي، وفي البدائع: الأصح طلبه قدر مالايضر بنفسه ورفقته بالانتظار (إن ظن) ظنا قوياً (قربه) دون ميل بأمارة أو اخبار عدل (وإلا) يغلب على ظنه قربه (لا) يجب بل يندب إن رجا وإلا لا، ولو صلى بتيمم وثمه من يسأله ثم اخبره بالماء أعاد وإلا لا.

وفی الفقه الاسلامی(۱/۵۹۵) ویلزمه شراء الماء بثمن معتاد لم یحتج له، نقداً أو دیناً فی الذمة، فإن زاد علی الثمن المعتاد، ولو درهماً علی الراجح، فی ذلک المحل وما قاربه، فلا یلزمه الشراء.

(۳۸) غسل سے پہلے یا غسل کے بعد وضو کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ غسل کرتے ہیں تو غسل کے بعد مکمل وضو کرتے ہیں کیا ان کا یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص غسل سے پہلے وضو نہ کرے تو اس کیلئے غسل کے بعد وضو کرنا ضروری ہوگا یا غسل ہی کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......غسل سے پہلے وضو کرنا سنت ہے۔ غسل کے بعد وضو کرنا حدیث پاک کی رُو سے مکروہ ہے۔ اگر کوئی غسل سے پہلے وضو نہ کرے تو غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ غسل کرنا کافی ہوگا۔ البتہ غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ضروری ہے۔

لمافی فتاویٰ سراجیة(ص۲): اذا اصاب الرجل المطر اووقع فی نهر جاز وضوءهٗ وغسله ایضاً ان اصاب جمیع بدنه وعلیه المضمضة والإستنشاق.

وفی التاتارخانیة(۱/۱۵۱): وتقدیم الوضوء علی الإغتسال فی الجنابة سنة ولیس بفرض عند علمائنا رحمهم الله. حتی انّه لولم یتوضأ وافاض الماء علی رأسه وسائر جسده ثلاثا أجزاه اذا کان قد تمضمض وا ستنشق.

وفی الدر المختار(۱/۱۵۸): لو توضأ أوّلاً لا یاتی به ثانیاً

لأنّه لا یستحب وضوء ان للغسل اتفاقاً، اما لو توضأ بعد الغسل واختلف المجلس علی مذهبنا الخ.

وقال الشامی رحمه الله تحته: (قوله لانه لا یستحب) .... أخرج الطبرانی فی الأوسط عن ابن عباس رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من توضا بعد الغسل فلیس منا والظاهر أن عدم استحباب لو بقی متوضا الی فراغ الغسل فلو أحدث قبله ینبغی اعادته.

(۳۹) اعضاءِ وضو کٹے ہوئے ہوں تو وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں جسکی وجہ سے وضو نہ کر سکتا ہو یا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو کہ وضو کرنا مشکل ہو تو ایسی صورت میں وضو ساقط ہوگا یا نہیں، اسی طرح نماز پڑھنی ضروری ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جس شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں اور وضو پر قادر نہ ہوتو اس صورت میں اگر خادم وغیرہ ہوتو وہی وضو کرائے، اگر خادم وغیرہ نہ ہوتو کسی کو اجرت پر مزدور رکھ لیں، لیکن اگر نہ تو خادم وغیرہ ہو، اور نہ ہی مزدور رکھنے کی استطاعت ہوتو ایسے شخص سے وضو ساقط ہو جائے گا، لہٰذا تیمم کر کے نماز پڑھ لے، اور تیمم کی صورت یہ ہوگی کہ اپنے چہرے اور کٹے ہوئے ہاتھوں سے جو حصہ باقی ہوا سے دیوار سے مل لے۔

اور جس شخص کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہوتو وہ عام طور پر وضو پر قادر ہوتا ہے، لہٰذا اس سے وضو ساقط نہیں ہوگا، البتہ جو ہاتھ کٹا ہوا ہے اگر وہ کہنی سے اوپر تک کٹا ہوا ہوتو اس ہاتھ کو نہیں دھوئے گا اور اگر وہ کہنی کے نیچے سے کٹا ہوا ہوتو باقی ماندہ ہاتھ کو دھونا لازم ہوگا۔

لمافی الھندیہ (۱/۲۸): أو کان لایجد من یوضیه ولایقدر بنفسه فان وجد خادماًاوما یستأجر به اجیراًاو عنده من لواستعان به اعانه فعلیٰ ظاهر المذهب انه لا یتیمم لانه قادر.

وفیها ایضاً(۱/۵): ولوقطعت یده اورجله فلم یبق من المرفق والکعب شئی سقط الغسل ولوبقی وجب وکذا غسل موضع القطع.

وفی ردالمحتار (۲/۱۰۲):وقیل لاصلوٰة علیه اختاره صاحب الدرر فی متنه وشرحه فقال قطعت یداه ورجلاه من المرفق والکعب لا صلوة علیه کذافی الکافی وقیل ان وجد من یوضیه یامره لیغسل وجهه وموضع القطع ویمسح راسه والاوضع وجهه ورأسه فی الماء اویمسح وجهه وموضع القطع علیٰ جدار فیصلی کذا فی التاتارخانیة.

(۴۰) وضو میں اکثر شک ہوتو نیا وضو کرے یا نہ کرے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو اکثر وضو میں شک ہوتا ہوتو کیا وہ ہر نماز کیلئے وضو کرے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا اس لئے ایسے شخص کو ہر نماز کے لئے نئے سرے سے وضو کرنا ضروری نہیں، اور اگر کسی کو اس طرح کے شک کی عادت ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اس کو چاہئے کہ اس کی طرف بالکل التفات نہ کرے کیونکہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور حدیث شریف میں اس سے بچنے کی تلقین آئی ہے۔

لمافی الھندیة(۱/۱۳): فی الاصل من شک فی بعض وضوئه وهو اول ماشک غسل الموضع الذی شک فیه فان وقع ذلک کثیراً لم یلتفت الیه هذا اذا کان الشک فی خلال الوضوء فان کان بعد الفراغ من الوضوء لم یلتفت الی ذلک ومن شک فی الحدث فهو علی وضوئه ولو کان محدثا فشک فی الطهارة فهو علی حدثه ولا یعمل بالتحری کذا فی الخلاصة.

وفی الدر المختار (١/١٥٠): شک فی بعض وضوئه أعادماشک فیه لوفی خلاله ولم یکن الشک عادة له والا لا.

وفی الشامیة تحته: (قوله والالا) أی وان لم یکن فی خلاله بل کان بعد الفراغ منه وان کان أول ماعرض له الشک أو کان الشک عادة له وان کان فی خلاله فلا یعید شیئا للوسوسة عنه کما فی التاتارخانیه.

(۴۱) وضو کے بعد اگر وضو میں شک پڑ گیا تو......

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی گھر سے وضو کر کے مسجد جائے اور وہاں جا کر کسی عضو کے بارے میں شک پڑ جائے کہ یہ بھی دھویا ہے یا نہیں؟ ایسی صورت میں وضو دوبارہ کرے یا کوئی اور صورت اختیار کرے؟ نیز اگر یہی شک نماز کے بعد ہو جائے تو پھر کیا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں وضو سے فراغت کے بعد اگر شک ہو جائے، چاہے یہ شک وضو کے بعد ہو یا نماز کے بعد تو ایسے شک کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا ایسے وضو سے نماز کی ادائیگی صحیح ہے، دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں۔

لمافی الهندیة (١/١٣): من شک فی بعض وضوئه......فان وقع ذلک کثیرا لم یلتفت الیه هذا اذا کان الشک فی خلال الوضوء فان کان بعد الفراغ من الوضوء لم یلتفت الی ذلک.

(۴۲) گرمی دانوں کے پانی سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے بدن پر گرمی دانے ہوں اور ان سے پانی نکل آئے تو کیا وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں صرف گرمی دانوں سے پانی نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ جب پانی نکل کر بہہ جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

وفی الهندیة (١/١٠): مایخرج من غیر السبیلین ویسیل الی مایظهر من الدم والقیح والصدید والماء لعلة وحد السیلان أن یعلو فینحدر عن رأس الجرح.

وفی الدر المختار (١/١٣٤): (وینقضه خروج) کل خارج (نجس) بالفتح وبکسر (منه) أی من المتوضئ الحی معتادا أولا من السبیلین أولا (إلی مایطهر) بالبناء للمفعول أی یلحقه حکم التطهیر ثم المراد بالخروج من السبیلین مجرد الظهور وفی غیرهما عین السیلان ولو بالقوة لماقالوا.

(۴۳) کلّی کرتے وقت دانتوں سے خون آنے کی صورت میں وضو کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب کلّی کرتا ہوں تو میرے دانتوں سے تھوڑا بہت خون نکل آتا ہے۔ایسی صورت میں میرا وضو صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....دوران وضو کلی کرتے ہوئے اگر منہ سے تھوڑا بہت خون نکلتا ہو، تو اس صورت میں وضو جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں البتہ وضو کر لینے کے بعد یا ویسے ہی کلی کرتے وقت اگر منہ سے خون نکلے اور خون تھوک پر غالب یا مساوی ہو (اس طور پر کہ تھوک میں سرخی آ گئی ہو) تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر تھوک غالب اور خون مغلوب ہو، اس طور پر کہ تھوک زردی مائل ہے تو پھر وضو نہیں ٹوٹے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۱): ان خرج من نفس الفم تعتبر الغلبة بينه وبين الريق فان تسا ويا انتقض الوضوء ويعتبر ذالک من حيث اللون فان كان احمر انتقض وان كان اصفر لا ينتقض كذا فى التبيين المتوضئ اذا عض شيئاً فوجد فيه اثر الدم او استاک بسواک فوجد فيه اثر الدم لاينتقض مالم يعرف السيلان.

وفى الدر المختار (۱/۱۳۸،۱۳۹): (و)ينقضه (دم) مائع من جوف اوفم (غلب على بزاق) حكماً للغالب (اوساواه) احتياطاً (لا) ينقضه (المغلوب بالبزاق).

وفى الشامية تحته: (قوله غلب على بزاق)....... وعلامة كون الدم غالباً او مساوياً ان يكون البزاق احمر وعلامة كونه مغلوباً ان يكون اصفر.

(۴۴) دوران وضو کوئی ناقض وضو پایا جائے

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کو وضو کرتے ہوئے کوئی ایسی ضرورت پیش آ جائے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو دوبارہ از سر نو وضو کرنا پڑے گا یا جو ہو چکا وہی کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اس صورت میں از سر نو وضو کرنا ضروری ہے۔

لمافى الهندية (۱/۲۶): لو ضرب يديه فقبل أن يمسح أحدث لا يجوز المسح بتلک الضربة كمالو أحدث فى الوضوء بعد غسل بعض الأعضاء.

(۴۵) اگر دانتوں سے خون آ جائے تو وضو کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ باوضو ہوتے ہوئے جب دوسری نماز کا وقت

آ جائے تو میں صرف مسواک استعمال کرتا ہوں، اب اس میں بعض دفعہ خون کے اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں، کیا منہ سے تھوڑا سا بھی خون نکل آئے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اگر خون کے بارے میں معلوم ہو کہ کہاں سے نکل رہا ہے تو دیکھا جائے گا، اگر بہہ رہا ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر نہ بہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کہاں سے نکل رہا ہے تو تھوک کو دیکھیں گے اگر خون کی سرخی تھوک کے برابر ہو یا تھوک سے زیادہ ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا لیکن اگر خون کی سرخی تھوک سے کم ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

لما فی الهندية (١/١١): المتوضئ اذا عض شيئاًفوجد فيه أثر الدم او استاک بسواک فوجد فيه أثر الدم لا ينتقض مالم يعرف السيلان كذا فی الظهيرية.

وفی الشامية (١/١٣٩): (غلب علی البزاق)..... علامة كون الدم غالباً او مساوياً ان يكون البزاق احمر وعلامة كونه مغلوباًان يكون اصفر بحر ط.

(احتياطاً)ای لاحتمال السيلان وعدمه فرجح الوجود احتياطا بخلاف ما اذا شک فی الحدث لانه لم يوجد الا مجردالشک ولا عبرة له مع اليقين .

(٤٦) کیا تھوڑا سا خون نکلنا بھی ناقض وضو ہے؟

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے جسم پر پھوڑا نکل آئے اور وہ اسے دبادے جس سے کچھ خون بھی نکل آئے تو کیا اس طرح تھوڑا سا خون نکلنے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اگر خون اتنا نکلا کہ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھا تو وضو نہیں ٹوٹا اور اگر اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا یعنی بہنا شروع کر دیا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

لمافی الهندية (١/١١): خرج دم من القرحة بالعصر ولولاه ماخرج نقض فی المختار كذا فی الوجيز لكردری.

وفی الدرالمختار (١/١٣٥): المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفی غيرهما عين السيلان ولو بالقوة .

وفی الشامية (عين السيلان)اختلف فی تفسيره،ففی المحيط عن ابی يوسف ان يعلو وينحدر،وعن محمد اذا انتفخ علی رأس الجرح وصار اكثر من رأسه نقض،والصحيح لا ينقض .قال فی الفتح بعد نقله ذلک وفی الدراية جعل قول محمد أصح ومختار السرخسی الاول وهوالاولی اقول كذا صححه قاضی خان وغيره.

(۴۷) دودھ پلانے سے وضو کا نہ ٹوٹنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی کو دو سال ہونے والے ہیں اللہ پاک نے اپنے کرم سے ایک بیٹا دیا ہے جو مجھے بہت ہی پیارا ہے ایک دن میں نے نماز کیلئے وضو کیا وضو کے بعد میرا بیٹا رونے لگا تو میں نے اس کو دودھ پلانا شروع کیا اس وقت مجھے شوہر نے منع کیا کہ وضو کے بعد نماز سے پہلے دودھ نہ پلایا کرو بچہ کو دودھ پلانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیا میرے شوہر کی بات صحیح ہے؟ یا اس سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....جو چیزیں وضوء کو توڑتی ہیں ان میں یہ بات ہے کہ نجس چیز کا خروج پایا جائے یا اگر کوئی پاک چیز بھی موضع نجاست یعنی سبیلین سے نکلے تو وضوء ٹوٹ جاتا ہے چونکہ دودھ بذات خود پاک ہے اور اس کا خروج بھی موضع نجاست سے نہیں ہے اس لئے وضوء نہیں ٹوٹے گا کیونکہ نجس چیز کے نکلنے سے وضوء ٹوٹتا ہے اور دودھ پاک ہے نجس نہیں ہے، اس لئے آپ کے دودھ پلانے سے وضوء پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

لمافی تبیین الحقائق(۱/۴۷۵،۴۸): (وينقضه خروج نجس منه) ای وینقض الوضوء خروج نجس فدخل تحت هذه الكلمة جميع النواقض الحقيقية وان كان طاهرا في نفسه كالدودة من الدبر لانها تستصحب شياء من النجاسة وتلك هي الناقضة للوضوء فصدق قوله خروج نجس وهو مجمل فيحتاج فيه الى التفاصيل من بيان المخرج وما يخرج منه اعلم ان المخرج على نوعين سبيلين وغيرهما اما السبيلان فخروج كل شئ منهما ناقض للوضوء...... وأما غيرهما ای غير السبيلين اذا خرج منه شئ ووصل الى موضع يجب تطهيره في الجنابة ونحوه ينقض الوضوء ...... ولا فرق بين الصديد والدم والقيح والماء خلافا للحسن في غير الدم هو يجعله كالعرق واللبن والمخاط.

وفي الشامية مع الدر(۱/۱۳۴): (وينقضه خروج) كل خارج (نجس)...... (منه) ای من المتوضیٔ حاصله ان الطهارة ترتفع بضدها وهي النجاسة القائمة بالخارج لان الضد هو المؤثر في رفع ضده.

وفي الدر مع الشامية(۱/۱۳۵): وخروج غير نجس مثل ريح(قوله مثل ريح) فانها تنقض لانها منبعثة عن محل النجاسة لا لان عينها نجسة لان الصحيح ان عينها طاهرة حتى لو لبس سراويل مبتلة او ابتل من اليتيه الموضع الذی تمر به الريح فخرج الريح لا يتنجس.

وفي الدر المختار(۱/۱۴۷): (كما) لا ينقض (لو خرج من اذنه) ونحوها كعينه وثديه (قيح) ونحوه كصديد وماء سرة وعين (لا بوجع) وان خرج به ای بوجع نقض.

(۴۸) متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی قے آنے سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی مقدار میں اتنی قے کرنا اگر اس کو جمع کیا جائے تو منہ بھر کر ہو، کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی مقدار میں اتنی قے ہوئی ہو جو منہ بھر کر ہو اور اس کا سبب (متلی وغیرہ) ایک ہی ہو اگرچہ یہ قے وقفہ کے ساتھ مختلف مجالس میں ہو تو اصح قول کے مطابق اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۱): وان قاء قليلا قليلا لو جمع يبلغ ملٔ الفم قال محمد رحمه الله تعالىٰ ان اتحد السبب جمع والا فلا وهذا اصح.

وفي الدرالمختار (۱/۱۴۰): (ويجمع متفرق القئ) ويجعل كقئ واحد(لاتحاد السبب) وهو الغثيان عند محمد وهو الاصح.

(۴۹) بیٹھے بیٹھے سو جانے سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عادت یہ ہے کہ میں فجر کے بعد اشراق تک مسجد میں بیٹھا رہتا ہوں البتہ کبھی کبھی سو جاتا ہوں جس میں، میں نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھا ہوتا ہے، اس طرح بعض دفعہ گر بھی جاتا ہوں، کیا اس طرح سونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر بیٹھے بیٹھے سو جائیں یا سونے کی وجہ سے گر جائیں اور گرتے ہی فوراً جاگ جائیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا لیکن اگر گرنے کے بعد فوراً نہ جاگیں بلکہ کچھ دیر بعد جاگیں تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

لمافي الهندية (۱/۱۲): ولو نام قاعداً فسقط على وجهه أو جنبه ان انتبه قبل سقوطه أو حالة سقوطه أو سقط نائماً وانتبه من ساعته لا ينتقض وان استقر نائماً ثم انتبه ينتقض.

لمافي الدر المختار (۱/۱۴۲): ولو نام قاعداً يتمايل فسقط، ان انتبه حين سقط فلا نقض به يفتىٰ.

وفي الشامية (حين سقط) اى عند اصابة الارض بلا فصل شرح منية، وكذا قبل السقوط او فى حال السقوط، اما لو استقر ثم انتبه نقض لأنه وجد النوم مضطجعاً حلية.

(۵۰) حالت نماز میں نیند آجانے سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز کی حالت میں تھا کہ اس کو نیند آگئی تو کیا

نماز کی حالت میں سو جانے سے وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نیند کی ہر وہ حالت جو استرخائے مفاصل (اعضاء کے ڈھیلے ہو جانے) کا سبب بنے وہ ناقض وضو ہے خواہ نماز کی حالت میں ہو یا خارج از صلوۃ ہو۔ لہٰذا نماز میں مطلقاً نیند آ جانے سے وضو نہیں ٹوٹے گا خواہ قیام کی حالت میں ہو یا رکوع وسجود کی حالت میں، چاہے جان بوجھ کر سو جائے۔ لیکن اگر سجدہ کو غیر مسنون طریقہ سے ادا کرتے ہوئے سو گیا تو چونکہ اس صورت میں استرخائے مفاصل ہو جاتا ہے اس لئے اس صورت میں وضو ٹوٹ جائے گا اور نماز فاسد ہو جائے گی۔

لمافی الهندية (۱/۱۲): (ومنها النوم) ينقضه النوم مضطجعا فی الصلوة وفی غيرها بلاخلاف بين الفقهاء...... ولا ينقض نوم القائم والقاعد ولوفی السرج او المحمل ولا الراكع ولا الساجد مطلقا ان كان فی الصلوة وان كان خارجها فكذالک الافی السجود فانه يشترط ان يكون علی الهيئة المسنونة له بان يكون رافعا بطنه عن فخذيه مجافيا عضديه عن جنبيه و ان سجد علی غير هذه الهيئة انتقض وضوءه.

وفی الدرالمختار (۱/۱۴۱): (و) ينقضه حكماً (نوم يزيل مسكته) ای قوته الماسكة بحيث تزول مقعدته من الارض وهو نوم علی احد جنبيه أو وركيه أو قفاه أو وجهه (والا) يزل مسكته (لا) ينقض وان تعمده فی الصلوة أو غيرها علی المختار كالنوم.

وفی الشامية تحته: ظاهر الرواية ان النوم فی الصلوة قائما أو قاعدا او ساجدا لايكون حدثا سواء غلبه النوم أو تعمده.

(۵۱) انجکشن کے ذریعے خون نکالنے سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص انجکشن کے ذریعے سے خون نکلوائے جیسے کہ کسی ٹیسٹ وغیرہ کیلئے نکالتے ہیں، تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں انجکشن کے ذریعے خون نکلوانے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ خون سے وضو کے ٹوٹ جانے کیلئے ''بہنا'' ضروری ہے، وہ اگرچہ یہاں بالفعل نہیں پایا جا رہا لیکن بالقوۃ پایا جا رہا ہے یعنی اس میں بہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۱): القراد اذا مص عضو انسان فامتلأ دماً ان كان صغيراً لا ينقض وضوئه كما لو مصت الذباب او البعوض وان كان كبيراً ينقض.

وفی الدرالمختار (۱/۱۳۵): ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفی غيرهما عين

السیلان ولو بالقوۃ لما قالوالو مسح الدم کلما خرج ولو ترکہ لسال نقض والا لا.

وفی الشامیۃ (۱/۱۳۴): فالاحسن ما فی النھر عن بعض المتاخرین من ان المراد السیلان ولو بالقوۃ ای فان دم الفصد ونحوہ سائل الی ما یلحقہ حکم التطہیر حکما.....

(۵۲) انجکشن کے ذریعہ مریض کے پیٹ سے پیشاب نکالنے پر وضوٹوٹنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص بیمار ہے ہسپتال میں پڑا ہوا ہے دونوں راستوں سے پیشاب بند ہے ڈاکٹروں نے اس کا پیشاب انجکشن کے ذریعے پیٹ میں سوراخ کر کے نکال دیا۔ مطلوبہ امر یہ ہے کہ اس مریض کا وضوٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ کیونکہ فقہاء نے صرف احد السبلین کی شرط لگائی ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر انجکشن کے ذریعے ڈاکٹروں نے پیشاب نکالا ہے تو مریض کا وضوٹوٹ جائے گا کیونکہ احناف کے ہاں احد السبلین (پیشاب و پاخانہ کے مقام) کے علاوہ سے بھی اگر نجاست نکل آئے تو وضوٹوٹ جاتا ہے نیز اگر چہ یہاں خروج نجس نہیں ہے بلکہ اخراج (نکالنا) ہے لیکن اخراج سے بھی وضوٹوٹ جاتا ہے۔

لمافی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ (۱۲/۴): خرج دم من القرحۃ بالعصر ولولاہ ماخرج نقض فی المختار لان فی الاخراج خروجاً.

وفی الدر المختار (۱/۱۳۶،۱۳۷): (والخارج) بنفسہ (سیان) فی حکم النقض علی المختار کمافی البزازیۃ: قال لان فی الاخراج خروجاً فصار کالفصد وفی الفتح عن الکافی انہ الاصح، واعتمد القھستانی، وفی القنیۃ وجامع الفتاوی إنہ الاشبہ ومعناہ انہ الاشبہ بالنصوص روایۃ والراجح درایۃ فیکون الفتوی علیہ.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ لان فی الاخراج خروجاً).....وفیہ انہ لاتأثیر یظھر للاخراج وعدمہ بل لکونہ خارجاً نجسا وذلک یتحقق مع الاخراج کما یتحقق مع عدمہ فصار کالفصد الخ.

(۵۳) کھانسی میں بلغم کے ساتھ خون آئے تو وضوٹوٹنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے بعض اوقات جب اس کو کھانسی آتی ہے تو بلغم کے ساتھ خون بھی نکلتا ہے، تو کیا اس سے وضو پر کچھ فرق پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....کھانسی کے ساتھ جو بلغم آئے وہ فی نفسہ پاک ہے۔ لیکن اگر اس بلغم میں خون کی آمیزش ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ خون غالب ہے یا بلغم، اگر خون غالب ہے تو وضوٹوٹ جائیگا اور اگر بلغم غالب ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا البتہ خون اور بلغم کے برابر ہونے

کی صورت میں احتیاط اسی میں ہے کہ دوبارہ وضو کرے۔

لمافي الطحطاوي على الدر (١/٨٠): (قوله على بزاق) هو بالزاي والسين والصاد كما في شرح المنيه. (قوله حكما للغالب) علة للنقض (قوله او ساواه) علامة كون الدم غالبا او مساوياً أن يكون البزاق احمر و علامة كونه مغلوبا أن يكون اصفر (قوله احتياطاً) علة للنقض حال المساواة وذلك لانه يحتمل أن يكون سيلانه بنفسه او أساله غيره فوجد الحدث من وجه فرجحنا جانب الوجود احتياطاً ......(قوله لاينقضه المغلوب) لان الغالب البزاق والحكم له فكأن كله بزاق.

وفي الدر المختار (١/١٣٨): (و)ينقضه (دم) مائع من جوف اوفم (غلب على بزاق) حكما للغالب (اوساواه) احتياطاً (لا) ينقضه (المغلوب بالبزاق) والقيح كالدم والاختلاط بالمخاط كالبزاق.

(۵۴) آنکھوں سے بہنے والے پانی سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کی آنکھوں میں تکلیف ہو اور اس تکلیف کی بناء پر آنکھوں سے مسلسل پانی بہتا ہو تو کیا اس پانی کے نکلنے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا یا اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر پانی چندھیا، پھنسی یا آشوب چشم کی وجہ سے ہو اور اس قدر مسلسل بہتا ہو کہ ایک نماز کے وقت میں صرف فرض کی ادائیگی بھی دشوار ہو (کہ وضو کے بعد پانی بہنے سے پہلے پہلے نماز ادا نہ کی جاسکتی ہو) تو وہ معذور ہے، ہر نماز کیلئے وضو کرلیا کرے، اور اگر اس قدر مسلسل نہ ہو بلکہ کبھی کبھار نکل آتا ہو تو چونکہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لہٰذا وہ دوبارہ وضو کیا کرے اور یہ پانی کسی بیماری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ صرف آنسوں بہہ جائیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا لہٰذا دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں۔

لمافي الهندية (١/١١): والغرب في العين بمنزلة الجرح فما يسيل منه ينقض الوضوء كذا في فتاوى قاضيخان، ولو كان في عينيه رمد أو عمش يسيل منهما الدموع قالوا يؤمر بالوضوء لوقت كل صلاة لاحتمال أن يكون صديداً او قيحاً.

وفي رد المحتار (١/١٤٨): وعن محمد اذا كان في عينيه رمد و تسيل الدموع منها امره بالوضوء لوقت كل صلاة لاني اخاف أن يكون مايسيل منها صديداً فيكون صاحب العذر.

(۵۵) سوزشی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا ہو تو وضو و نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی آدمی کی آنکھ میں سوزش ہو رہی ہو، اور اس کی وجہ سے آنکھ سے پانی نکل رہا ہو، کیا از روئے شرع وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ اگر ٹوٹ جاتا ہے تو نماز پڑھنے کا کیا طریقہ ہوگا، جبکہ پانی مسلسل

بہہ رہا ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں ذکر کردہ مرض میں مبتلا آدمی کا وضو ٹوٹ جاتا ہے اگر ایک وقت نماز کے بقدر بھی پانی بہنے کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا ہو تو اس کو شرعاً معذور شمار کیا جاتا ہے جس کے لئے نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرض نماز کیلئے علیحدہ وضو کرے جس سے وہ فرض اور نوافل اس وقت کے اندر اندر جتنا ہو سکے پڑھتا رہے پھر دوسرے وقت کے فرض کے لئے دوسرا وضو کرے۔

لـمـافـي الهندية(۱/۱۱): والغرب في العين بمنزلة الجرح فما يسيل منه ينقض الوضو..... ولو كان في عينه رمد او عمش يسيل منهما الدموع قالوا يؤمر بالوضوء لوقت كل صلاة لاحتمال ان يكون صديدا او قيحا. كذا في التبيين.

وفي الدر المختار (۱/۱۴۸،۱۴۷): فدمع من بعينه رمد او عمش ناقض فان استمر صار ذا عذر "مجتبى" والناس عنه غافلون.

وفي الدر المختار (۱/۳۰۵):(صاحب عذر من به سلس) بول لايمكنه امساكه..... او بعينه رمد او عمش او غرب وكذا كل مايخرج بوجع ..... (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) الى ان قال..... (وحكمه، الوضؤ)...... (لكل فرض) ثم يصلى فيه فرضا ونفلا فاذاخرج الوقت بطل) الخ.

(۵۶) شرمگاہ سے رطوبت خارج ہونے سے وضو وغسل کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو بیٹھے بیٹھے کسی لڑکی کا خیال آیا، یا اس نے کسی لڑکی کو دیکھا اور اسی وقت شرمگاہ سے رطوبت خارج ہوئی تو اس سے غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....مذکورہ بالا صورت میں جب رطوبت شرمگاہ سے خارج ہوئی تو یہ چار حال سے خالی نہیں ہوگی پیشاب ہوگا، یا مذی ہوگی، یا ودی ہوگی یا منی ہوگی۔ پہلی تین صورتوں میں غسل واجب نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف وضو کرے گا اور اگر منی ہو تو اگر دفق یعنی کود کر شہوت کے ساتھ نکلی ہو تو غسل کرنا واجب ہے اور اگر دفق وشہوت کے ساتھ نہ ہو تو غسل واجب نہ ہوگا اور اگر منی کے اپنی جگہ سے جدا ہوتے وقت شہوت موجود تھی اگر چہ شرمگاہ سے نکلتے وقت شہوت نہ ہو پھر بھی غسل کرنا واجب ہے۔ منی.....وہ گاڑھا پانی ہے جو شدت شہوت کے وقت کود کر نکلتا ہے اور اس میں چکناہٹ ہوتی ہے اور اس سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے نکلنے کے بعد ذکر منتشر نہیں رہتا ہے اور شہوت ختم ہوجاتی ہے۔ مذی.....وہ سفید گاڑھا پانی ہے جو شہوت کے وقت نکلتا ہے اور عام طور پر اپنی بیوی کے ساتھ ملاعبت کے وقت نکلتا ہے۔ ودی.....وہ گاڑھا پانی ہے جو دودھ کی طرح سفید ہوتا ہے اور پیشاب کے بعد نکلتا ہے جو ایک طرح سے گاڑھا پیشاب ہوتا ہے۔

لمافي الشامية (۱/۱۶۰):(قوله بشهوة)متعلق بقوله منفصل احترز به عمالو انفصل بضرب اوحمل

ثقيل على ظهره فلا غسل عندنا...... (قوله وشرطه ابويوسف) اى شرط الدفق واثره الخلاف يظهر فيما لو احتلم أو نظر بشهوة فامسك ذكره حتى سكنت شهوته ثم ارسله فانزل وجب عندهما لاعنده ...... (قوله وبقول ابى يوسف نأخذ) اى فى الضيف وغيره...... (قوله قلت الخ) ظاهره الميل الى اختيار مافى النوازل ولكن اكثر الكتب على خلافه حتى البحر والنهر ولاسيما قد ذكروا ان قوله قياس وقولهما استحسان وانه الاحوط. فينبغى الافتاء بقوله فى مواضع الضرورة فقط تأمل......

وفى الدر المختار(۱۶۵/۱):(لا)عند (مذى اوودى) بل الوضوء منه ومن البول جميعاً على الظاهر

وفى رد المحتار(۱۶۵/۱):(قوله لاعند مذى) اى لايفرض الغسل عند خروج مذى...... ماء رقيق ابيض يخرج عند الشهوة لابها وهو فى النساء اغلب ...... (قوله او ودى)...... ماء ثخين ابيض كدر يخرج عقب البول نهر (قوله بل الوضوء منه الخ) اى بل يجب الوضوء منه اى من الودى ومن البول جميعاً. وهذا جواب عما يقال ان الوجوب بالبول السابق...... وبيان الجواب ان وجوبه بالبول لاينافى الوجوب بالودى بعده ......الخ.

(۵۷) خون دینے سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص مریض کو خون دے تو کیا خون دینے سے وضو ٹوٹ جائے گا؟ جبکہ خون نکالتے وقت سوائے سرنج کے اِدھر اُدھر نہ پھیلے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......خون دینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ خون بدن پر بالکل نہ پھیلے۔

لمافى الهندية (۱۱/۱):القراد إذا مص عضو إنسان فامتلأ دما إن كان صغيرا لا ينقض وضوءه كما لو مصت الذباب أو البعوض، وإن كان كبيرا ينقض وكذا العلقة إذا مصت عضو إنسان حتى امتلأت من دمه انتقض وضوءه.

وفى الدر المختار(۱۳۴/۱): (و ينقضه خروج)كل خارج (نجس)......(إلى مايطهر.

وفى الشامية تحته: والمراد بالتطهير مايعم الغسل والمسح فى الغسل أو فى الوضوء كما ذكره ابن الكمال...... زاد فى "شرح المنية الكبير" بعد قوله "فى الغسل أو فى الوضوء قوله أو فى إزالة النجاسة الحقيقية لئلا يرد مالو افتصد وخرج منه دم كثير ولم يتلطخ رأس الجرح فانه ناقض مع أنه لم يسل إلى ما يلحقه حكم التطهير لأنه سال إلى المكان دون البدن..........

أقول: يرد عليه مالو سال إلى نهر ونحوه ممالا يصلى عليه ومالومص العلق أو القراد الكبير وامتلأ

دما فانه ناقض...... فالأحسن مافي النهر عن بعض المتأخرين من أن المراد السيلان ولو بالقوة، أي فإن دم الفصد ونحوه سائل إلى مايلحقه حكم التطهير حكما. تأمل. والله اعلم بالصواب

(۵۸) ناخن کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کے ناخن بڑے ہو جائیں وہ وضو کی حالت میں کاٹ لے تو کیا ناخن کاٹنے سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ناخنوں کے کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ انگلیوں کے پوروں پر پانی بہا دینا بہتر ہے۔

لمافي الهندية (۴/۱) وان امر الماء على شعر الذقن ثم حلقه لايجب عليه غسل الذقن وكذالو حلق الحاجب والشارب اومسح رأسه ثم حلق او قلم اظافيره لاتلزمه الاعادة كذا في فتاوىٰ قاضي خان.

وفي الدر المختار (۱۰۱/۱): (ولا يعاد الوضوء)......(بحلق رأسه ولحيته كما لا يعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء (بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره) وكشط جلده.

(۵۹) ناخن یا بال کاٹنے سے وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناخن یا بال کاٹنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیا واقعی یہ بات درست ہے؟ یا ناخن اور بال کاٹنے سے وضو برقرار رہتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ناخن یا بال کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا بلکہ برقرار رہتا ہے۔

وفي البزازية على الهندية (۱۳/۴): حلق لحيته أو رأسه أوشاربه، أوقلم أظافره بعد الوضوء لايعيد ولا يجب امرار الماء أيضاً.

وفي الدر المختار (۱۰۱/۱): (ولا يعاد الوضوء) بل ولا بل المحل (بحلق رأسه ولحيته كمالا يعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء(بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره)

(۶۰) اگر ستر کھل جائے یا ناخن کاٹ لے تو دوبارہ وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی باوضو شخص کسی ضرورت سے کپڑے اتار دے اور بالکل برہنہ ہو جائے یا پھر ناخن یا بال کٹوا دے تو ان صورتوں میں وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... باوضو ہونے کی حالت میں کپڑے اتار دینے یا ناخن یا بال کٹوانے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اسی وضو سے

نماز وغیرہ کی ادائیگی صحیح ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۱۰۱):(ولا یعاد الوضوء)بل ولا بل المحل(بحلق رأسه ولحيته كمالا يعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء (بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره).

(۶۱) مچھر اگر زیادہ مقدار میں خون چوس لے تو وضو کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی کبھار مچھر اس طرح کاٹتا ہے کہ سارا مچھر خون سے بھر جاتا ہے، اور ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اگر اس پر ہاتھ لگ جائے تو وہیں مرجاتا ہے اور اس کا سارا خون جسم پر لگ جاتا ہے، اب بعض دفعہ یہ خون کافی زیادہ ہوتا ہے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اس طرح مچھر کے کاٹنے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح وہ مقدار جو مچھر کے مرنے سے جسم یا کپڑوں پر لگتی ہے، وہ معاف ہے۔

لمافی الحلبی (ص۱۳۶):(واما الذباب أو البعوض) أو البراغيث ونحوها(فانه اذا مص وامتلأ دما (لا ينقض) لانه غير سائل .

وفی الدرالمختار (۱/۱۳۹):(والا)..... (لا) ينقض (كبعوض وذباب) كما فی الخانية لعدم الدم المسفوح.

(۶۲) کھانے پینے سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی سنتوں کے بعد کچھ کھانے پینے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں، اس وضو سے فرائض پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... کچھ کھانے پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا، وضو اس وقت ٹوٹتا ہے جب نواقض وضو میں سے کوئی سبب پایا جائے جیسا کہ سبیلین سے کسی چیز کا خارج ہونا یا خون کا نکل کر بہہ جانا وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ظہر اور عصر کی سنتوں کے بعد یا اسی طرح کسی نماز کے بعد یا پہلے کچھ کھانے پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں اگرچہ درمیان میں کچھ کھا پی لیں۔ البتہ مستحب طریقہ یہ ہے کہ اگر کچھ کھا پی لے تو نماز شروع کرنے سے پہلے کلی کرلی جائے۔

لمافی المشکوۃ(۱/۴۱): عن ابی رافع قال اشهد لقد كنت أشوى لرسول الله ﷺ بطن الشاة ثم صلى ولم يتوضأ، رواه مسلم.

وفی عمدة القاری(۳/۱۰۶): قوله فمضمض)) ای قبل الدخول فی الصلاة.

بیان استنباط الاحکام: الاول ان فیه استحباب المضمضة بعد الطعام...... وقال بعضهم استدل به البخاری علی جواز صلاتین فاکثر بوضوء واحد...... الثانی فیه دلالة علی عدم وجوب الوضوء مما مسته النار.

وفي الدر المختار (۱/۱۳۴): (وينقضه خروج) كل خارج (نجس)...... (منه) أى من المتوضئ الحی معتاداً أولا من السبيلين أولا (إلى ما يطهر)...... أی يلحقه حكم التطهير (ص۱۳۵-۱۳۶) (وريح او دودة او حصاة من دبر لا)...... (ريح من قبل) غير مفضاة اما هی فيندب لها الوضوء وقيل يجب (و) (ص۱۳۷-۱۳۸) ينقضه (قئی ملأ فاه) بان يضبط بتكلف (من مرة)...... (او علق)...... (او طعام او ماء) اذا وصل الى معدته وان لم يستقر وهو نجس مغلّظ.

(۶۳) معصیت اور گناہ سے وضو یا تیمّم ٹوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شان صحابہؓ میں گستاخی کرنا بہت بڑا جرم ہے، اگر کوئی شخص شان صحابہؓ میں گستاخی کرے تو کیا اس سے وضو یا تیمّم ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں گستاخی کرنا واقعی بہت بڑا جرم ہے، لیکن اس سے وضو یا تیمّم نہیں ٹوٹتا۔

لما فی رد المحتار (۱/۲۵۶): (قوله لاتنقضه ردة) ای فیصلی به اذا أسلم، لانّ الحاصل بالتیمم صفة الطهارة والكفر لاينافيها كالوضوء والردة تبطل ثواب العمل لازوال الحدث شرح النقاية.

(۶۴) مرتد ہونے کی وجہ سے وضو اور تیمّم کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص (العیاذ باللہ) مرتد ہوجائے تو ارتداد کی وجہ سے اس کا وضو یا تیمّم ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی شخص نعوذ باللہ مرتد ہوجائے اور اس نے اس سے پہلے وضو کرلیا ہو، پھر اسلام لے آئے تو اس کا وضو بالاتفاق باقی رہے گا لیکن اگر کسی نے پہلے تیمّم کیا ہو پھر ارتداد کے بعد اسلام لے آیا تو ائمہ ثلاثہ (امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین) کے نزدیک تیمّم باقی رہے گا لیکن امام زفرؒ کے نزدیک اس کا تیمّم باطل ہوجائے گا۔

لما فی رد المحتار (۱/۲۵۶): (قوله لاتنقضه ردة) أی فیصلی به إذا أسلم، لأن الحاصل بالتیمم صفة الطهارة والكفر لاينافيها كالوضوء.

(٦٥) غیر تحریف شدہ آسمانی کتابوں کو بے وضو چھونے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن مجید کے سوا اور آسمانی کتابیں مثلاً تورات، انجیل اور زبور کو بے وضو چھونا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....قرآن مجید کے سوا بقیہ آسمانی کتابیں مثلاً تورات، انجیل اور زبور کو اگر غیر محرف (یعنی تحریف شدہ نہ) ہوں تو بے وضو چھونا مکروہ ہے۔

وفی حاشية الطحطاوی علی الدر (١/١٥١): یکره مس کتب التفسیر والفقه والسنن لانها لاتخلو عن آیات القران وهذا التعلیل یفید کراهة..... مثل القران مالم یبدل من التوراة والانجیل والزبور نهر.

وفی الهندية (١/٣٨): ویکره للحائض والجنب قراءة التوراة والانجیل والزبور.

(٦٦) بغیر طہارت اخبارات میں لکھی آیات کو ہاتھ لگانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اخبارات میں بعض دفعہ آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ لکھی ہوتی ہیں، کیا اخبارات میں ان کا شائع کرنا صحیح ہے؟ جبکہ اس میں بے حرمتی کا شائبہ ہے نیز ایسے اخبار کو بغیر وضو چھونا جائز ہوگا یا نہیں، جس میں آیات لکھی ہوئی ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اس بات میں کوئی شک نہیں کہ الیکٹرانک میڈیا اور پریس کے عام رواج کی بناء پر قرآنی آیات وغیرہ کا احترام باقی نہیں رہا، اور آیات واحادیث لکھے ہوئے اوراق ردی اور کوڑے میں پھینک دیے جاتے ہیں، ایسی صورت میں اخبارات واشتہارات میں آیات واحادیث لکھنا جائز نہیں کیونکہ یہ آیات واحادیث کی بے حرمتی ہے اور اگر یہ مفاسد نہ ہوں بایں طور کہ تعظیم کو ملحوظ رکھا جائے تو پھر جائز ہوگا۔ نیز جہاں اخبارات وغیرہ میں آیات قرآنیہ لکھی ہوئی ہوں بغیر وضو صرف اس جگہ پر ہاتھ لگانا منع ہے اس کے علاوہ اخبار کے باقی حصہ میں ہاتھ لگا سکتے ہیں۔

لمافی الهندية (٥/٣٢٢): ویکره ان یجعل شیئاً فی کاغذة فیها اسم الله تعالی کانت الکتابة علی ظاهرها او باطنها بخلاف الکیس علیه اسم الله تعالی فانه لایکره......

وفی الدرالمختار (١/١٧٦): (والتفسیر کمصحف لا الکتب الشرعية) فانه رخص مسها بالید لا التفسیر کما فی الدر عن مجمع الفتاوی.

وفی الشامية (والتفسیر کمصحف) ظاهره حرمة المس کما هو مقتضی التشبیه وفیه نظر اذ لا نص

فيه بخلاف المصحف فالمناسب التعبير بالكراهة.....والحاصل انه لا فرق بين التفسير وغيره من الكتب الشرعية على القول بالكراهة وعدمه ولهذا قال في النهر ولايخفى ان مقتضى ما في الخلاصة عدم الكراهة مطلقا لان من أثبتها حتى في التفسير نظر الى ما فيها من الايات ومن نفاها نظر الى ان الاكثر ليس كذلك وهذا يعم التفسير ايضا الا ان يقال ان القران فيه اكثر من غيره اى فيكره مسه دون غيره من الكتب الشرعية ......

اقول: الاظهر والاحوط القول الثالث اى كراهته في التفسير دون غيره لظهور الفرق فان القران في التفسير اكثر منه في غيره وذكره فيه مقصود استقلالا لا تبعا فشبهه بالمصحف اقرب من شبهه ببقية الكتب.

(٦٧) اخبار کے قرآنی آیت والے صفحے کو بے وضو چھونے کا حکم

سوال .....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اخبار کے جس صفحہ پر قرآنی آیت لکھی ہو، اس کو بے وضو چھونا جائز ہے یا ناجائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اخبار کا وہ صفحہ جس پر قرآنی آیات لکھی ہوں اس کو چھونا جائز ہے۔البتہ قرآنی آیت کو بلاوضو چھونا جائز نہیں۔

لمافي الشامية (١/١٧٦،١٧٧): (قوله لا الكتب الشرعية) قال في الخلاصة ويكره مس المحدث المصحف كما يكره للجنب وكذا كتب الأحاديث والفقه عندهما والأصح أنه لا يكره عنده اهـ قال في شرح المنية: وجه قوله أنه لايسمى ماساللقرآن لأن مافيها منه بمنزلة التابع. ومشى في الفتح على الكراهة فقال: قالوا يكره مس كتب التفسير والفقه والسنن لأنها لا تخلو عن ايات القرآن وهذا التعليل يمنع من شروح النحو اهـ الى ان قال اقول: الأظهر والأحوط القول الثالث أى كراهته في التفسير دون غيره لظهور الفرق الخ. هكذا في حاشية الطحطاوى على مراقي الفلاح (صـ٦٦) وفي مجمع الانهر (١/٣٠) وفي حلبي كبير (صـ٥٩) والله اعلم.

(٦٨) ائمہ اربعہ کے نزدیک قرآن کریم کو بغیر وضو چھونے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا بغیر وضو قرآن کریم کو ہاتھ لگانا ائمہ میں سے کسی کے نزدیک جائز ہے۔اگر ہے تو کیا وجوہات ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ بغیر وضو کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔البتہ داؤد ظاہری کے ہاں بغیر وضو کے ہاتھ لگانا درست ہے۔

لمافی الهندية (۱/۳۸): لا يجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف.

وفي الفقه الحنفي وادلته (۱/۱۰۶): لايجوزلمحدث مس المصحف.

وفي الفقه الاسلامي (۱/۳۵۰): واتفق الفقهاء على أن غير المتوضي يجوز له تلاوة القرآن او النظر اليه دون لمسه ....وفي (صـ۳۵۳) والخلاصة انه وقع الاجماع ماعدا داؤد أنه لايجوز المحدث حدثا اكبر أن يمس المصحف وأما المحدث حدثا اصغر فلم تدل الأدلة قطعا على منعه من مس القرآن لكن اكثر الفقهاء على انه لا يجوز له.

(۶۹) تین انگلیوں سے سر کا مسح کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تین انگلیاں سر پر رکھنے سے سر کا مسح ہو جاتا ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز اگر تین انگلیوں کے بجائے صرف انگلیوں کے تین پورے رکھے جائیں تو بھی مسح ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسئولہ صورتوں کی پہلی صورت میں اگر تین انگلیوں سے چوتھائی سر کا مسح کر لیا تو مسح ہو جائے گا اور تین انگلیوں سے کم سے مسح نہیں ہوگا۔

(۲) انگلیوں کے پوروں سے پانی ٹپک رہا ہو اور پورے سر کے چوتھائی کے بقدر مسح کیا جائے تو مسح ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

لمافي الهندية (۱/۵): المفروض في مسح الرأس مقدار الناصية كذا في الهداية والمختار في مقدار الناصية ربع الرأس كذا في الاختيار شرح المختار الواجب أن يستعمل فيه ثلاث أصابع اليد على الأصح كذافي الكفاية.

وفي الدر المختار (۱/۹۹): ولو مد أصبعًا أو أصبعين لم يجز الا ان يكون مع الكف أو بالابهام والسبابة.

وفي الشامية (۱/۱۰۰): (قوله الا ان يكون مع الكف الخ) لانهما مع الكف او مع مابين الأبهام والسبابة يصيران مقدار ثلاث أصابع او اكثر فاذامدهما وبلغ قدر الربع جاز.

وفي الهندية (۱/۵): اذا مسح رأسه برؤس اصابعه فان كان الماء متقاطرا يجوز وان لم يكن متقاطرًا لا يجوز كذا في الذخيرة.

وفي رد المحتار (۱/۹۹): لو مسح بأطراف أصابعه والماء متقاطر جاز والا فلا لأنه اذاكان متقاطرا فالماء ينزل من أصابعه الى اطرافها فاذا مده صار كأنه أخذ ماءً جديداً.

(۷۰) سر کے مسح کی ایک صورت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماءکرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک صاحب ہیں جنہوں نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے ہیں، آجکل سردی کا زمانہ ہے جسمیں وہ گرم ٹوپی پہنتے ہیں جو پیچھے سے کانوں سے ذرا نیچے تک یا کانوں تک ہوتی ہے، اب اگر وہ ٹوپی اتارے بغیر صرف پیچھے کے بالوں پر وضو میں مسح کر لیں تو جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً.....اگر مسح سر پر ہو تو جائز ہے، اور اگر مسح سر پر نہ ہو بلکہ صرف سر سے نیچے کی طرف لٹکے ہوئے بالوں پر ہو تو ناجائز ہے۔

لمافي الدر المختار (۱/۹۹): (ومسح ربع الرأس مرةً) فوق الاذنين ولو باصابة مطر.

وفي الشامية (فوق الاذنين) فلو مسح على طرف ذؤابة شدت على راسه لم يجز.

(۷۱) مسح کیلئے نیا پانی لینے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماءکرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سر پر صرف مسح کیا جاتا ہے تو کیا اس مسح کیلئے نیا پانی لینا ضروری ہے؟ اگر کوئی شخص نیا پانی نہ لے اور بازو یا داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مسح کر لے تو مسح ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں سر پر مسح کیلئے نیا پانی لینا ضروری نہیں ہے بلکہ ہتھیلیوں کی تری سے ہی مسح کر سکتے ہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ بازو یا داڑھی کی تری سے مسح کرنا جائز ہے یا نہیں تو اس سے پہلے یہ سمجھئے کہ فقہاء کے ہاں پانی مستعمل کب بنتا ہے (جو پانی ایک مرتبہ استعمال ہو گیا ہو اور اسے دوبارہ استعمال کرنا درست نہ ہو) اکثر فقہاء کے ہاں پانی مستعمل اس وقت بنتا ہے جب استعمال کے بعد پانی بدن سے جدا ہو جائے اور بعض فقہاء کے نزدیک جب بدن سے جدا ہو کر کسی جگہ یا برتن میں جمع ہو جائے اس وقت مستعمل بنے گا،

اب اس کے بعد سمجھئے کہ جن فقہاء کے ہاں پانی بدن سے جدا ہوتے ہی مستعمل ہو جاتا ہے ان کے ہاں داڑھی یا دوسرے اعضاء کی تری پر ہاتھ پھیر کر مسح کرنا درست نہیں ہوگا البتہ اگر ایک ہی عضو میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پانی لے جائیں (مثلاً سر کے مسح میں ہتھیلیوں پر جو تری ہوتی ہے اس کو سر کے آگے والے حصہ سے پیچھے اور پیچھے سے آگے لیکر آنا) درست ہوگا، اور جن فقہاء کرام کے ہاں پانی مستعمل بننے کیلئے کسی جگہ یا برتن میں جمع ہونا ضروری ہے ان کے نزدیک داڑھی کی تری سے سر کا مسح کرنا درست ہوگا۔ احتیاط اکثر حضرات کے قول میں ہے، اور آسانی دوسرے قول میں ہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۲): الماء الذي أزيل به حدث او استعمل على وجه القربة فالصحيح أنه كما زايل العضو صار مستعملا هكذا في الهداية.

وفي ردالمحتار (۱/۹۹): (قوله او ببلل باق الخ) هذا اذا لم ياخذه من عضو آخر مقدسي، فلو اخذه من عضو آخر لم يجز مطلقابحر اى سواء كان ذلك العضومغسولًا او ممسوحاً.

وفيها ايضاً(۱/۲۰۰): (قوله وقيل اذااستقر)اى بشرط ان يستقر فى مكان من ارض او كف او ثوب ويسكن عن التحرك وحذفه لانه اراد بالاستقرار التام منه وهذا قول طائفة من مشايخ بلخ واختاره فخر الاسلام وغيره وفى الـ لاصة وغيرهاانه المختار الا ان العامة على الاول وهو الاصح واثر الخلاف يظهر فيمالو انفصل فسقط على انسان فأجراه عليه صح على الثانى لا الاول نهر. قلت وقد مرّأن اعضاء الغسل كعضو واحد فلوانفصل منه فسقط على عضو آخر من اعضاء المغتسل فأجراه عليه صح على القولين. (قوله ورجح للحرج)لانه لوقيل باستعماله بالانفصال فقط لتنجس ثوب المتوضئ على القول بنجاسة الماء المستعمل وفيه حرج عظيم كما فى غاية البيان.

(۷۲) مصنوعی بالوں پرمسح اور غسل کاحکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی عرصہ پہلے میرے سر کے بال گر گئے تھے لوگ مجھے گنجا کہتے تھے جس کی وجہ سے مجھے پریشانی ہوتی ،تو مجبوراً میں نے مصنوعی بال لگوا لئے ہیں جو کافی خوبصورت لگتے ہیں اب ان بالوں کا وضواور غسل میں کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر مصنوعی بال وگ کی شکل میں لگائے گئے ہوں،تو وضو میں اس پرمسح کرنا اور غسل میں اس کا دھونا جائز نہیں ہوگا۔ بلکہ اس وگ کو اُتارنا ضروری ہوگا۔اوراگر مصنوعی بال آپریشن کے ذریعے لگائے گئے ہوں تو ایسا کرنا اگرچہ ناجائز اور گناہ ہے۔ایسا کرنے والا توبہ واستغفار کرے۔البتہ اگرکسی نے لگوالئے تو جسم کا جزء بننے کی وجہ سے اس پرمسح کرنا اور غسل میں دھونا کافی ہوگا۔

لمافى الخانية (۴/۳۷۱): ووصل الشعر بشعر الآدمى حرام سواءٌ كان شعرها أو شعر غيرها، ولا بأس للمرأة أن يجعل فى قرونها وذوائبها شيئا من الوبر ويكره ان تصل شعرها غيرها. ولا بأس للتاجر حلق شهر جبهة الغلام لانه يزيد فى الثمن فان كان العبد للخدمة ولا يريد به التجارة لايستحب ان يفعل ذلك.

وفى فتح القدير مع شرح العناية (۱/۱۵۷،۱۵۸): (ويجوز المسح على الجبائر الخ) قال قاضيخان: هذا إذا كان يضره المسح على الجراحة، وأما إذا لم يضره فلا يمسح على الجبائر، والجبائر جمع جبيرة وهى العيدان التى تجبر بها العظام، وإنما قال (وإن شدها على غير وضوء) لأنها إنما تربط حالة الضرورة، واشتراط الطهارة فى تلك الحالة يفضى إلى الحرج فلا يعتبر.

وفى المبسوط السرخسى (۱/۶): قال لأن البشرة التى نبت عليها الشعر لايجب ايصال الماء اليها

فما هو أبعد أولیٰ لكن الصحيح من المذهب أنه يجب امرار الماء على ذلك الموضع لأن الموضع الذى نبت عليه الشعر قد استتر بالشعر فانتقل الفرض منه الى ظاهر الشعر الخ.......... وأيضاً (ص۴۵) فالحاصل أن امرار الماء على جميع البدن فرض لقوله ﷺ تحت كل شعرة جنابة الافبلوا الشعر وأنقوا البشرة.......... وأيضاً (ص۶۴) لان المسح على الشعر بمنزلة المسح على البشرة التى تحته الخ...... وأيضاً (ص۶۵، ۶۶) قال (ثم المسح على الشعر مثل المسح على البشرة التى تحته) لأنه بدل عنه بدليل أن الاصبع اذا مسح على الشعر جاز ولا يجوز المصير الى البدل مع القدرة على الأصل فكان جز الشعر بعد المسح كتقشير الجلد عن العضو المغسول بعد الغسل فكما لا يلزمه امرار الماء ثمة فكذلك هنا. ...... وأيضاً (ص۶۷) فأما اذا سقط عن غير برء فالمسح على الجبائر كالغسل لما تحته مادامت العلة باقية ولهذا لا يتوقف بخلاف المسح بالخف.

(۷۳) دوپٹہ پر مسح کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ سفر میں گھر کی خواتین ساتھ ہوتی ہیں اور نماز کے اوقات میں ایک طرف بیٹھ کر وضو کیا جاسکتا ہے لیکن مسح کیلئے دوپٹہ یا چادر اتارنا مشکل ہوتا ہے لہٰذا اگر کوئی عورت دوپٹے کے اوپر سے مسح کرے تو اس ضرورت کی بناء پر جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کوئی عورت ایسے دوپٹے پر مسح کرے کہ جس سے تری بالوں تک پہنچ جاتی ہو تو ایسے دوپٹے پر مسح کرنا جائز ہے، اور اگر دوپٹے پر مسح کرنے سے تری بالوں تک نہ پہنچتی ہو تو مسح کرنا جائز نہیں بلکہ اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر مسح کرنا ضروری ہوگا۔

لمافى الخلاصة (۱/۲۶): ولا يجوز المسح على القلنسوة والعمامة وكذالو مسحت المرأة على الخمار الا اذا كان الماء متقاطراً بحيث يصل الى الشعر فحينئذ جاز.

وفى الهندية (۱/۶): ولا يجوز المسح على القلنسوة والعمامة وكذا لو مسحت المرأة على الخمار الا انه اذا كان الماء متقاطراً بحيث يصل الى الشعر فحينئذ يجوز ذلك عن الشعر كذا فى الخلاصة هذا اذا لم يتلون الماء هكذا فى الظهيرية والأفضل أن تمسح تحت الخمار كذا فى فتاوى قاضى خان.

(۷۴) کان کے نیچے لمبے بالوں پر مسح کرنے سے مسح کی ادائیگی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وہ لمبے بال جو کان کے نیچے تک ہوتے ہیں اگر ان پر کوئی

شخص کان کے نیچے حصہ پر مسح کرلے تو مسح ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مسح ادا نہ ہوگا۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی المراقی(ص۷۴): قال فی الخانیة: فلو مسح علی شعره ان وقع علی شعر تحته رأس جاز وان وقع علی شعر تحته جبهة او رقبة لایجوز.

وفی الهندیة(۱/۵): ان وقع علی شعر تحته رأس یجوز عن مسح الرأس و ان وقع علی شعر تحته جبهة او رقبة لایجوز.

(۷۵) کنپٹی پر لگے پلاسٹر پر مسح کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے سر میں شدید درد رہتا تھا جس کی وجہ سے مجھے کافی تکلیف محسوس ہوتی تھی ڈاکٹر نے مجھے ایسا پلاسٹر تجویز کیا کہ جس کے لگانے کے بعد مجھے کافی آرام محسوس ہوتا ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ میں نے پلاسٹر کو پیشانی سے ذرا سائڈ میں لگایا ہوا ہے یعنی کنپٹی پر تو آیا وضو کرتے وقت مجھے اس پلاسٹر کو ہٹانا پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وضو میں پورے چہرے کا دھونا فرض ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر پلاسٹر ایسا ہو کہ اس کے ہٹانے سے تکلیف کے بڑھنے کا خوف ہو یا ہٹانے کے بعد خود لگا نہ سکتا ہو، تو ایسی صورت میں پلاسٹر پر مسح کرنا درست ہے اور اگر تکلیف کے بڑھنے کا خوف نہ ہو، اور ہٹانے کے بعد خود لگا سکتا ہو، تو ایسی صورت میں پلاسٹر پر مسح کرنا درست نہیں۔ بلکہ وضو کرتے وقت اس کو اتارنا ضروری ہوگا۔

لمافی سنن ابن ماجه (۱/۴۸): عن علی بن ابی طالب قال انکسرت احدی زندی فسالت النبی ﷺ فامرنی ان امسح علی الجبائر.

وفی الدر المختار(۱/۲۸۰-۲۸۱): (ویمسح) نحو (مفتصد وجریح علی کل عصابة) مع فرجتها فی الاصح (ان ضره) الماء (او حلها) ومنه أن لا یمکنه ربطها بنفسه ولا یجد من یربطها،

وفی الشامیة تحته: (قوله علی کل عصابة) ای علی کل فرد من أفرادها سواء کانت عصابة تحتها جراحة وهی بقدرها او زائدة علیها کعصابة المفتصد، او لم یکن تحتهاجراحة اصلا بل کسر او کی، وهذا معنی قول الکنز کان تحتها جراحة اولا لکن اذا کانت زائدة علی قدر الجراحة فإن ضره الحل والغسل مسح الکل تبعا والافلا. بل یغسل ماحول الجراحة ویمسح علیها لاعلی الخرقة.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۵۰۲):شرائط المسح علی الجبیرة...... ألا یمکن نزع الجبیرة او یخاف من نزعها بسبب الغسل حدوث مرض او زیادته او تأخر البرء.

(۷۶) گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گردن کا مسح مسنون ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں ایک غیر مقلد کا کہنا ہے کہ گردن کا مسح احادیث سے ثابت نہیں بلکہ یہ صرف احناف کی من گھڑت سنت ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ براہ کرم احادیث کا حوالہ ضرور دیں اور یہ بتائیں کہ یہ احادیث کس درجہ کی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... گردن کا مسح حضرات احناف کے ہاں مستحب ہے اور ایسی احادیث اور آثار صحابہ سے ثابت ہے جن کو حسن کا درجہ حاصل ہے، لہٰذا اسے احناف کی من گھڑت سنت کہنا محض تعصب اور عناد ہے، جبکہ بعض دوسرے علماء نے انہی احادیث وآثار کی وجہ سے اسے سنت کہا ہے۔ چنانچہ علامہ رویانیؒ (جو اصحاب شوافع میں سے ہیں) نے اپنی کتاب میں صراحت کی ہے کہ گردن کا مسح ہمارے اصحاب کے نزدیک سنت ہے،'' علامہ بغویؒ'' (جو ائمہ احادیث میں سے ہیں) نے اسکے'' استحباب'' کا قول کیا ہے، اسی طرح علامہ شوکانی نے'' نیل الاوطار'' (یہ کتاب غیر مقلدین کے ہاں معتبر ہے اور انکے مدارس میں داخل درس ہے) میں گردن کے مسح پر کافی وشافی بحث کی ہے، اور ایسے افراد (جنہوں نے گردن کے مسح کو بدعت اور اسکی احادیث کو موضوع کہا ہے) پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایسی روایات کی موجودگی میں انہوں نے اس کو کیسے بدعت کہا۔

لما في الصحيح للبخاري (۱/ ۳۱): حدثنا عبد الله بن يوسف ......ان رجلاً قال لعبد الله بن زيد وهو جد عمرو بن يحيىٰ أتستطيع أن تريني كيف كان رسول الله ﷺ يتوضأ فقال عبدالله بن زيد نعم فدعا بماء فأفرغ على يده ..... ثم مسح رأسه بيديه فاقبل بهما وأدبر بدأ بمقدم رأسه حتى ذهب بهما الى قفاه ثم ردهما إلى المكان الذي بدأ منه.

وفي الهندية (۱/ ۸): الفصل الثالث في المستحبات... والثاني مسح الرقبة هو بظهر اليدين.

وفي الدرالمختار (۱/ ۴،۱۲۳): (ومستحبه) ...... (مسح الرقبة)...... (لا الحلقوم).

وفي الشامية (قوله مسح الرقبة) هو الصحيح وقيل انه سنة كما في البحر.

وفي نيل الاوطار (۱/ ۱۹۵): وبجميع هذا تعلم أن قول النووي مسح الرقبة بدعة وأن حديثه موضوع مجازفة، وأعجب من هذا قوله ولم يذكره الشافعي ولا جمهور الأصحاب وإنما قاله ابن القاص وطائفة يسيرة، فإنه قال الروياني من أصحاب الشافعي في كتابه المعروف بالبحر مالفظه: قال أصحابنا هو سنة، وتعقب النووي أيضاً ابن الرفعة بأن البغوي وهو من ائمة الحديث قد قال باستحبابه قال: ولا مأخذ لاستحبابه الا خبر أو أثر لأن هذا لا مجال للقياس فيه. قال الحافظ: ولعل مستند البغوي في استحباب مسح القفا ما رواه أحمد وأبو داؤد وذكر حديث الباب الخ.

(۷۷) داڑھی کے خلال اور گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱)۔ داڑھی کو وضو میں دھونا ضروری ہے یا اسکا خلال کیا جائے گا چاہے داڑھی چھوٹی ہو یا بڑی اور گھنی ہو یا نہ ہو؟ برائے مہربانی تمام صورتیں مفصل بیان کریں۔

(۲)۔ مسح الرقبہ کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہے یا نہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ کرامؓ نے مسح الرقبہ کیا ہے یا نہیں؟ بعض علماء اس کا انکار کرتے ہیں کہ مسح الرقبہ کرنا درست نہیں ہے۔ مسح الرقبہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر کوئی نہ کرے تو اس کا وضو ہو جائے گا یا نہیں؟ نیز رقبہ کا اطلاق کہاں تک ہوتا ہے؟۔

الجواب حامداً ومصلیاً......داڑھی کا وہ حصہ جو کہ چہرے کے ساتھ ملا ہوا ہے، اس کا دھونا وضو میں فرض ہے۔ البتہ اگر داڑھی اتنی گھنی ہو کہ چہرے کی جلد کو بالکل ڈھانپ لیتی ہو تو اس صورت میں بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔ اگر داڑھی گھنی نہیں ہے اور چہرے کی جلد اس میں سے نظر آتی ہے۔ تو اس صورت میں اس کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔ جبکہ داڑھی کا وہ حصہ جو چہرے کی حدود سے باہر ہو۔ اس کا خلال کرنا سنت ہے۔

(۲)۔ اور رہی بات مسح الرقبہ (گردن کے مسح) کی تو یہ مستحب ہے۔ اس کا ثبوت روایات میں موجود ہے۔ اس لئے اس کا انکار کرنا درست نہیں۔ ہاں البتہ گلے کا مسح بدعت ہے۔ اور رقبہ کا اطلاق گردن کے پچھلے حصے (گدی) پر ہوتا ہے۔

لما فی الدر المختار (۱/۱۰۰، ۱۰۱): (وغسل جميع اللحية فرض) يعني عملياً (ايضا) على المذهب الصحيح المفتي به المرجوع اليه، وما عدا هذه الرواية مرجوع عنه كما في البدائع. ثم لا خلاف أن المسترسل لايجب غسله ولا مسحه بل يسن، وان الخفيفة التي ترى بشرتها يجب غسل ماتحتها كذا في النهر.

وفيه ايضاً (۱/۱۲۴): (ومسح الرقبة) بظهر يديه (لاالحلقوم) لانه بدعة.

وفي الشامية تحته: (قوله ومسح الرقبة) هو الصحيح. وقيل انه سنة كما في البحر وغيره. اعلاء السنن (۱/۱۲۱): تحقيق معنى الرقبة والحلقوم...... والذى ظهرلنا من تتبع اللغة والاحاديث. ان مقدم العنق وموخره كلاهما في جانب الرأس. فمقدمه اى مبتداء هو ما يلي القذال اى موخر الراس...... فجعل مقدم العنق بياناً للقذال وهو موخر الراس كما في القاموس.

وفي اعلاء السنن (۱/۱۲۰): باب استحباب مسح الرقبة. عن فليح بن سليمان عن نافع عن ابن عمر أن النبي ﷺ قال: "من توضأ و مسح بيديه على عنقه وقي الغل يوم القيامة" رواه ابوا لحسن ابن فارس بإسناد وقال: هذا ان شاء الله. حديث صحيح. (التلخيص الحبير ۱/۳۴)

(۷۸) اعضاءِ وضو کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے خشک کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو کرنے کے بعد اعضاءِ وضو کو تولیہ یا رومال سے خشک کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کا ثبوت قرآن وسنت سے ملتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... وضو کرنے کے بعد اعضاءِ وضو کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے خشک کرنا جائز ہے اور اسکا ثبوت احادیث طیبہ سے ملتا ہے۔

لمافی الترمذی (۱/۱۸): عن عائشة قالت كانت لرسول الله ﷺ خرقة يتنشف بها بعد الوضوء.

وفی الشامية (۱/۱۳۱): (قوله والتمسح بمنديل)...... ففي الخانية: ولا بأس للمتوضئ والمغتسل روى عن رسول الله ﷺ انه كان يفعله.

وفی الفقه الاسلامی (۱/۲۰۷): وقال المالكية المسح بالمنديل جائز لحديث قيس بن سعد قال "زارنا رسول الله ﷺ فی منزلنا فأمر له سعد بغسل فوضع له فاغتسل ثم ناوله ملحفة مصبوغة بزعفران او ورس فاشتمل بها"

(۷۹) وضو کے استعمال شدہ پانی کو کھانے پینے وغیرہ کے استعمال میں لینے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس صرف تھوڑا سا پانی ہو اور وہ اس امید پر کہ بعد میں پانی مل جائے گا اس سے وضو کرلے اور بعد میں پانی نہ ملے تو کیا اس پانی کو دوبارہ استعمال کرسکتا ہے، جیسے پینے کیلئے یا کھانا پکانے وغیرہ کے لئے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... وضو میں استعمال شدہ پانی ضرورت کے موقع پر کھانے یا پینے وغیرہ میں استعمال کرسکتے ہیں لیکن بلاضرورت یہ استعمال کراہت سے خالی نہیں، اس لئے احتیاط بہتر ہے۔

لما فی الدر المختار (۱/۲۰۰، ۲۰۱): (اذا انفصل عن عضو وان لم يستقر ...... وهو طاهر) ولو من جنب وهو الظاهر لكن يكره شربه والعجن به تنزيها للاستقذار وعلى رواية نجاسته تحريما.

وفی الشامية (تحريما) قال فی البحر ولا يخفى ان الكراهة على رواية الطهارة أما على رواية النجاسة فحرام لقوله تعالى ويحرم عليهم الخبائث والنجس منها.

(۸۰) اٹیچ باتھ روم میں ادعیۂ وضو پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک ایسی جگہ وضو بناتا ہے جہاں غسل خانے کے

ساتھ بیت الخلاء بھی ہے۔اب زید وضو کے دوران کچھ دعائیں پڑھنا چاہتا ہے تو کیا زید ایسی جگہ میں دورانِ وضو دعاؤں کا اہتمام کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں چونکہ عام طور پر ایسی جگہوں پر صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا۔لہٰذا اللہ کے نام کی تعظیم کی وجہ سے زید ایسی جگہ پر وضو کرتے وقت وضو کی دعائیں جہراً یعنی زبان سے نہ پڑھے بلکہ دل میں پڑھنے کا اہتمام کرے۔

لـمـافـي الهـنـدية(۱/۲): ويسمى قبل الاستنجاء وبعده هو الصحيح كذا في الهداية، ولا يسمى في حال الانكشاف ولا في محل النجاسة.

وفـي الـدر الـمختار (۱/۱۰۹): (قبل الاستنجاء وبعده) الاحال انكشاف وفي محل نجاسة فيسمى بـقـلـبـه. (الشامية) (قوله الاحال انكشاف الخ) الظاهر ان المراد أنه يسمى قبل رفع ثيابه ان كان في غيـر الـمكان المعدّ لقضاء الحاجة، والافقبل دخوله، فلو نسي فيهما سمى بقلبه، ولا يحرك لسانه تعظيماً لاسم الله تعالىٰ.

(۸۱) عورتوں کا ننگے سر وضو کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض خواتین جب وضو کرتی ہیں تو اپنے سر سے دوپٹہ اتار لیتی ہیں وضو کے بعد پھر پہن لیتی ہیں آیا یہ فعل خواتین کا صحیح ہے یا نہیں؟ نیز عورتوں کیلئے ننگے سر وضو کرنا کیسا ہے اور ان کا وضو درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....عورتوں کا دوران وضو سر سے دوپٹہ اتارنا جائز ہے جبکہ وہاں پر کوئی نامحرم موجود نہ ہو کیونکہ سر کے بالوں کا نامحرم سے چھپانا ضروری ہے۔نیز ننگے سر وضو کرنے سے وضو پر کوئی اثر نہ پڑے گا وضو درست ہو جائے گا۔

لـمـافـي الـدرالـمختار(۶/۳۶۷): (ومن محرمه) هي لا يحل له نكاحها ابداً بنسب اوسبب ولوبزناً (الى الرأس والوجه والصدر والساق والعضد ان أمن شهوته.

وفي فتاویٰ اللجنة(۵/۲۳۵): س: عورة الرجل من السرة الى الركبة فما حكم وضوئه عارياً؟ لابساً سروالاً قصيراً لا يستر ركبته؟

ج: الـحـمـد لله وحـده والـصـلـوة والسلام على رسوله وآله وصحبه وبعد يصح وضوءه لان كشف الـعـورة ولبس السروال القصير لايمنعان من صحة الوضوء ولكن يحرم عليه كشف عورته بحضرة غير زوجته او سريته وهي الامة المملوكة له التي يباح له الاستمتاع بها.

(۸۲) وضو کے بعد شہادتین پڑھنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا وضو کرنے کے بعد شہادتین پڑھنا اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرنا مسنون ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....وضو کے بعد شہادتین پڑھنے کو تمام فقہاء کرام نے سنت وآداب میں سے شمار کیا ہے۔اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو بعض فقہاء نے ادب قرار دیا ہے۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی المراقی (ص۷۷):(والاتیان بالشهادتین بعده) وذکر الغزنوی انه یشیر بسبابته حین النظر الی السمآء.

وفی الهندية (۸/۱):وان یقول بعد الفراغ من الوضوء سبحانک اللهم وبحمدک اشهد ان لا اله الا أنت أستغفرک وأتوب إلیک وأشهد أن لا إله الا الله واشهد أن محمداً عبده ورسوله ......

﴿فصل فی الغسل﴾

(غسل کے مسائل کا بیان)

(۸۳) کن کن صورتوں میں غسل کرنا فرض ہوجاتا ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن صورتوں میں غسل کرنا فرض ہوتا ہے اگر کوئی شخص عورت سے ہمبستری کرے لیکن منی خارج نہ ہو تو کیا اس پر غسل فرض ہوجائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....مندرجہ ذیل صورتوں میں غسل فرض ہوجاتا ہے۔

(۱).....جوش کے ساتھ منی کا نکلنا۔ (۲).....مرد کی سپاری کا اندر چلا جانا چاہے انزال ہو یا نہ ہو۔

(۳).....حیض کے خون کا بند ہوجانا۔ (۴).....نفاس کے خون کا بند ہوجانا۔

لمافی الفتاویٰ التاتارخانیة (۱/۱۵۲): أسباب الغسل ثلاثة الجنابة والحيض والنفاس.

وفی الهندية (۱/۱۵): الإيلاج فی أحد السبيلين اذا تواترت الحشفة يوجب الغسل على الفاعل والمفعول به أنزل أولم ينزل.

(۸۴) جنّ (ناری مخلوق) کے جماع سے غسل کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت پر جن عاشق ہوگیا ہے اور وہ اس عورت سے جماع بھی کرتا ہے آیا جن کا عورت سے جماع کرنے کی وجہ سے عورت پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر جن کے جماع کرنے کی وجہ سے عورت کو انزال ہوجائے تو پھر انزال کی وجہ سے غسل فرض ہوگا ورنہ محض جن کے جماع کرنے سے غسل واجب نہیں ہوگا البتہ اگر جن آدمی کی صورت میں آکر جماع کرتا ہو تو پھر بغیر انزال کے بھی غسل واجب ہوجائے گا۔

لسمافی الهندية:(۱/۱۵): لوقالت امرأة معی جنی يأتينی وأجد فی نفسی ماأجد اذا جامعنی زوجی لاغسل عليها.

وفی الدر المختار(۱/۱۶۱): احتراز عن الجنی يعنی اذا لم تنزل واذا لم يظهر لها فی صورة

الآدمی.

وفی الشامیة تحته : ففی المحیط لو قالت معی جنی یأتینی مرارا وأجد ماأجد اذا جا معنی زوجی لاغسل علیها لانعدام سببه وهو الایلاج أو الاحتلام..... أما اذا ظهر فی صورة آدمی وکذ اذا ظهر للرجل جنیة فی صورة آدمیة فو طئها وجب الغسل لوجود المجانسة الصوریة .

(۸۵) جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے سے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرد نے جانور کے ساتھ بدفعلی کی صرف دخول ہوا، منی خارج نہیں ہوئی تو آیا اس پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جانور کے ساتھ بدفعلی کرنا ایک گھناؤنی اور قبیح حرکت ہے، تاہم اگر کوئی شخص اس طرح کی حرکت کرتا ہے اور اس کی منی خارج نہیں ہوئی تو پھر اس پر غسل فرض نہیں۔

لمافی الهندیة: (۱/۱۵):والایلاج فی البهیمة والمیتة والصغیرة التی لایجامع مثلها لایوجب الغسل بدون الانزال.

وفی الدر المختار(۱/۱۶۶): (و) لا عند (وطء بهیمة أومیتة أوصغیرة غیر مشتهاة).....(بلا انزال).

(۸۶) احتلام میں غسل کب واجب ہوگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی نیند سے بیدار ہونے پر کپڑوں پر احتلام کے اثرات محسوس کرے، حالانکہ نہ تو اسے احتلام یاد ہے اور نہ ہی خواب یاد ہے کیا ایسی صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں غسل واجب ہوگا۔

لمافی الدرالمختار (۱/۱۶۳):عند(رؤیة مستیقظ) ......(وان لم یتذکر الاحتلام)

وفی الشامیة: ای والحال أنه ان لم یتذکر الاحتلام یجب الغسل ......

(۸۷) احتلام کے بعد خواب یاد نہ ہو تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ کے ساتھ ایک عرصہ سے یہ مسئلہ پیش آرہا ہے کہ جب بھی سوتا ہے تو بے خبری میں احتلام ہوتا ہے۔ خواب وغیرہ کچھ بھی یاد نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے ہر وقت شلوار دھونا اور غسل کرنا بہت تنگی کا باعث ہے۔ آیا اس کو بیماری شمار کیا جائے گا یا احتلام ہی ہے۔ جو بھی صورت ہو میرے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟ جبکہ ہر وقت

غسل کرنا بعض اوقات بہت مشکل ہوجاتا ہے۔حکم تحریر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....اگر سونے کی حالت میں کسی کو احتلام ہوجائے اور جاگنے کے بعد تری دیکھے اور اس کو یقین ہو یا ظن غالب ہو کہ یہ منی ہے تو اس پر غسل واجب ہوگا اگر چہ خواب یاد نہ ہو۔پس صورت مسئولہ میں اگر یقین یا ظن غالب ہو کہ یہ منی ہے تو غسل واجب ہوگا اگر چہ خواب یاد نہ ہو۔

لـمافـي الهـنـدية(۱/۱۴،۱۵): وان استيـقـظ الـرجـل ووجد على فراشه او فخذه بللا وهو يتذكر احتلامـا ان تيـقـن انه منى أو تيقن أنه مذى أو شك انه منى أو مذى فعليه الغسل وان تيقن انه ودى لاغسـل عـليه وان رأى بللا الا انه لم يتذكر الاحتلام فان تيقن انه ودى لا يجب الغسل وان تيقن أنه منى يجب الغسل.

وفـي الـدر الـمـخـتـار مـع الـشـامـية(۱/۱۶۳): فى الدر المختار(و)عند (رؤية مستيقظ) ...... وإن لم يتـذكـر الاحتـلام وفـي الشامية فيجب الغسل اتفاقا فى سبع صور منها.....(إلى قوله) او علم انه منى مطلقا.

(۸۸) بدفعلی کی وجہ سے غسل کتنی بار کیا جائے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں کہیں سفر پر جارہا تھا تو ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو شکل وصورت سے عالم لگ رہا تھا ان سے مختلف باتیں ہوتی رہیں،ایک بات انہوں نے بیان کی جس پر میرا دل مطمئن نہیں ہوا،وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی لڑکے کے ساتھ بدفعلی کرے تو اس کو ہر نماز کے وقت غسل کرنا ضروری ہوگا بغیر غسل کئے اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی کیا یہ بات قرآن وحدیث یا فقہ وغیرہ میں ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... بدفعلی کرنا بہت بڑا گناہ ہے،اس فعل بد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر پتھروں کی بارش برسائی اور ان کو نشان عبرت بنادیا اور شریعتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) میں بھی اس فعل سے روکا گیا ہے اگر خوانخواستہ کسی مکلف سے یہ فعل صادر ہوجائے تو ایک ہی دفعہ غسل کرنے سے پاکی حاصل ہوجائے گی کیونکہ جو حدیثیں بدفعلی کرنے والے کی عدم طہارت کے بارے میں آئی ہیں،ان کو علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے باطل اور من گھڑت کہا ہے۔

لما فى المقاصد الحسنة (/۳۴۵): ۸۸۷ حديث: لو اغتسل اللوطى بماء البحر لم يجئ يوم القيامة الاجنبـا اسـنـده الـديـلـمـى عـن انس به مرفوعا، وهو عنده ايضا من حديث ابى هريرة رفعه بلفظ: الـمتـلـوط لـواغتسل بكل قطرة تنزل من السماء على وجه الارض الى ان تقوم الساعة لما طهره الله من نجاسته او يتوب، وكل مافى معناه باطل.

وفی الولوالجیة(۱/۵۰):الایلاج فی الآدمی یوجب الغسل علی الفاعل والمفعول انزل اولم ینزل لانه ایلاج فی الفرج.

وفی الدرالمختار(۱/۱۶۲):(فی أحد سبیلی آدمی) حی (یجامع مثله) سیجئ محترزه (علیهما) أی الفاعل والمفعول (لو) کانا (مکلفین) ولو أحد هما مکلفا فعلیه فقط دون المراهق.

(۸۹) بدفعلی سے فاعل ومفعول پر غسل کا حکم نیز جس جانور کے ساتھ بدفعلی ہوئی ہو اسکا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وطی فی الدبر سے فاعل ومفعول دونوں پر غسل واجب ہوگا یا صرف فاعل پر؟ نیز کیا جانور کے ساتھ وطی سے غسل واجب ہوگا جبکہ انزال نہ ہوا ہو، اور ایسے جانور کا کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......وطی فی الدبر حرام ہے اور اس فعل خبیث پر قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں صورت مسئولہ میں فاعل ومفعول دونوں پر غسل واجب ہوجائے گا خواہ انزال ہوا ہو، یا نہ ہوا ہو۔ جانور کے ساتھ وطی کی صورت میں فاعل پر انزال کی صورت میں غسل واجب ہوجائے گا جبکہ عدم انزال کی صورت میں غسل واجب نہیں ہوگا، پھر اگر جانور اپنا ہے اور غیر ماکول اللحم ہے (ایسا جانور ہے کہ جس کا گوشت نہیں کھایا جاتا ہو) تو اس کو ذبح کر کے جلا دیا جائے گا اور اگر ماکول اللحم ہے (جس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے) تو اس کا گوشت کھانا جائز ہے۔ اگر جانور کسی دوسرے شخص کا ہو تو ایسی صورت میں واطی پر مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا مستحب ہے، لازم نہیں لہٰذا اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

لما فی الشامیة(۱/۱۶۱): (قوله وعند ایلاج) ای ادخال وهذا أعم من التعبیر بالتقاء الختانین لشموله الدبر أیضاً(قوله هی مافوق الختان) کذا فی القاموس زاد الزیلعی من رأس الذکر

وفیه ایضاً(۱/۱۶۲) (قوله آدمی) احتراز عن البهیمة کما یأتی وعن الجنیة کمامر...... (قوله بالاجماع) لما فی الصحیحین من حدیث ابی هریره قال قال رسول الله ﷺ اذا جلس بین شعبها الاربع ثم جهدها فقدوجب الغسل انزل او لم ینزل ......ووجوبه علی المفعول به فی الدبر بالقیاس احتیاطاً.

وفیه ایضاً(۱/۱۶۶): (قوله ولاعندوطء بهیمة الخ) محترزات قوله فی أحد سبیلی آدمی حی یجامع مثله وفی القنیة برمز اجناس الناطفی فرج البهیمة کفیها لاغسل فیه بغیر انزال ویعزر وتذبح البهیمة وتحرق علی وجه الاستحباب ولایحرم اکل لحمها به.

وفیه ایضاً(۴/۲۶):(قوله وتذبح ثم تحرق) أی لقطع امتداد التحدث به کلما رؤیت ولیس بواجب کما فی الهدایة وغیرها وهذا اذا کانت مما لا یؤکل فإن کانت توکل جاز أکلها عنده وقالا: تحرق

أيضاً فان كانت الدابة لغير الواطئ يطالب صاحبها أن يدفعها اليه بالقيمة ثم تذبح هكذا قالوا ولا يعرف ذلک الاسماعاً فيحمل عليه زيلعي ونهر (قوله الظاهر أنه يطالب ندبا الخ) أي قولهم يطالب صاحبها أن يدفعها الى الواطئ ليس على طريق الجبر وعبارة النهر: والظاهر أنه يطالب على وجه الندب ولذا قال في الخانية كان لصاحبها أن يدفعها اليه بالقيمة وعبارة البحر: والظاهر لايجبر على دفعها.

(۹۰) غسل کے دوران ناف میں پانی پہنچانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ ماہ میرا سہ روزہ کی جماعت میں جانا ہوا، وہاں اتفاق سے مجھے احتلام ہوگیا، چونکہ نماز میں وقت کم تھا اس لئے میں جلد از جلد نہا کر نکل آیا اور نماز پڑھ لی، لیکن نماز کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے نہاتے وقت ناف میں انگلی نہیں ڈالی، اور صرف ویسے ہی پورے بدن پر پانی بہا کر باہر آ گیا۔ کیا اب مجھے اس نماز کا اعادہ کرنا ہوگا؟ اور کیا دورانِ غسل ناف میں پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......غسل میں پورے بدن پر پانی بہانا فرض ہے دورانِ غسل ناف میں انگلی ڈالنا فرض نہیں البتہ ناف میں پانی پہنچانے کا مناسب طریقہ انگلی ڈالنا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں اگر یقین ہے کہ ناف میں بھی پانی پہنچ گیا ہے تو غسل ہو جائے گا ورنہ غسل نہیں ہوگا اور نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافي التاتارخانية (۱/۱۵۰): ويجب ايصال الماء الى داخل السرة وينبغي ان يدخل اصبعه فيها للمبالغة وفي الخانيه وان علم انه يصل الماء اليه من غير إدخال الاصبع أجزاه.

وفي الهندية(۱/۱۴): ويجب ايصال الماء الى داخل السرة وينبغي أن يدخل اصبعه فيها للمبالغة.

وفي الدر المختار: (۱/۱۵۲): (ويجب) أي يفرض (غسل) كل يمكن من البدن بلا حرج مرة كاذن (وسرة وشارب وحاجب) واثناء (لحية).

(۹۱) غسل میں غرغرہ کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج رات میرے اوپر غسل فرض ہوگیا صبح اٹھ کر میں نے غسل کیا اس میں کلی وغیرہ تو کی لیکن غرغرہ کرنا بھول گیا تو کیا میرا غسل صحیح ہوا یا دوبارہ غسل کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......غسل میں مضمضہ اور استنشاق فرض ہیں اور غرغرہ سنت ہے اور صورت مسئولہ میں چونکہ مضمضہ اور استنشاق ہوا ہے۔ لہٰذا آپ کا غسل صحیح ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لمافي الفتاویٰ التاتارخانية(۱/۱۵۱): فالفرض ان يغسل جميع بدنه ...... ويتمضمض ويستنشق

فالمضمضة والاستنشاق فرضان في الغسل نفلان في الوضوء.

وفي البزازية (۱/۱۱): ترک المضمضة في الغسل ثم شرب الماء عى وجه السنة لا ينوب ولو على غير وجهها ينوب لانه مص في الاول وعب في الثاني والاحوط ان لا يخرج مالم يمج الماء.

وفي الشامية(۱/۱۵۱): (وفرض الغسل) ...... الفرض بمعنى المفروض......(مايعم العملى) اى ليشمل المضمضمة والاستنشاق...... (وغسل كله فمه) عبرعن المضمضة والاستنشاق بالغسل لافادة الاستيعاب او للاختصار.

(۹۲) فِلنگ شدہ (بھرائی کئے ہوئے) دانت کے ساتھ وضواور غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے دانت میں کیڑا لگ جائے اور وہ اس دانت میں بھرائی کرالے تو وضواور غسل کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً......کیڑا لگنے کی وجہ سے دانت کی بھرائی کودانت کا حصہ تصور کیا جائے گا لہٰذا وضو میں تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ وضو میں کلی سنت ہے فرض نہیں۔البتہ غسل میں کلی فرض تو ہے لیکن بھرائی کے نیچے تک پانی کا پہنچانا ناممکن ہے اوراس میں حرج عظیم لازم آتا ہے لہٰذا صرف کلی کر لینے سے وضوء میں سنت اور غسل میں فرض ادا ہو جائے گا۔

لمافي الهندية (۱/۵): وفي مجموع النوازل اذا كان برجله شقاق فجعل فيه الشحم وغسل الرجلين ولم يصل الماء الى ماتحته ينظر ان كان يضره ايصال الماء الى ماتحته يجوز وان كان لايضره لايجوز...... اذا كان في اعضائه شقاق وقد عجز عن غسله سقط عنه فرض الغسل ويلزم امرار الماء عليه فان عجز عن امرار الماء يكفيه المسح فان عجز عن المسح سقط عن المسح ايضاً فيغسل ماحوله ويترک ذالک الموضع.

وفي الدر المختار(۱/۱۵۲):(ويجب) اى يفرض (غسل) كل مايمكن من البدن بلاحرج مرة كأذن و(سرة وشارب وحاجب و) اثناء (لحية) وشعر الرأس ولو متلبداً......(وفرج خارج)......(لا) يجب (غسل مافيه حرج كعين)وان اكتحل بكحل نجس (وثقب انضم و)لا(داخل قلفة)بل يندب وهو الاصح.

وفي ردالمحتار (۱/۱۵۲):(قوله وثقب انضم) قال في شرح المنية:وان انضم الثقب بعد نزع القرط وصار بحال ان امرّ عليه الماء يدخل وان غفل لافلابدمن امراره ولا يتكلف لغير الامرار من ادخال عودونحوه فان الحرج مدفوع.

(۹۳) رنگے ہوئے بالوں کے ساتھ غسل وغیرہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں سر کے بال مختلف قسم کے رنگ سے رنگنے کا فیشن ہے تو ایسی حالت میں فرض غسل ان کا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر وہ رنگ جس سے بالوں کو رنگوایا گیا ہے ذی جسم ہو اور پانی بالوں تک نہ پہنچتا ہو تو فرض غسل صحیح نہیں ہوگا اور اگر ذی جسم نہ ہو یا ذی جسم تو ہو لیکن پانی بالوں تک پہنچتا ہو تو فرض غسل صحیح ہوگا۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۸۱): ولا بدمن زوال مایمنع وصول الماء للجسد کشمع وعجین لاصبغ بظفر صباغ ولامابین الاظفار.

وفی الدرالمختار (۱/۱۵۴): (ولایمنع) الطهارة (ونیم...... وحناء) ولو جرمه وبه یفتي.

وفی الشامية تحته: (قوله وبه یفتی) صرح به في المنية عن الذخيرة فی مسألة الحناء والطين والدرن معللاً بالضرورة. قال في شرحها ولان الماء ينفذه لتخلله وعدم لزوجته و صلابته. والمعتبر في جميع ذالک نفوذ الماء ووصوله الی البدن.

(۹۴) نابالغ پر جماع کے سبب غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نابالغ لڑکا و لڑکی اور مراہق ومراہقہ پر جماع کی وجہ سے غسل کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نابالغ یا قریب البلوغ لڑکا یا لڑکی پر جماع کی وجہ سے شرعاً غسل واجب نہیں البتہ عادت ڈالنے کیلئے غسل کا حکم دیا جائے گا اور بغیر غسل وطہارت کے نماز سے بھی روکا جائے گا، غفلت کی صورت میں تھوڑی بہت مار پیٹ کی بھی گنجائش ہے۔ البتہ اگر نابالغ بہت چھوٹا بچہ یا بچی ہے تو اس پر اس معاملے میں سختی نہیں کی جائے گی۔

لمافی الهندية (۱/۱۵): غلام ابن عشر سنين جامع امرأة بالغة فعليها الغسل ولاغسل على الغلام إلا أنه يؤمر بالغسل تخلقا واعتياداً كما يؤمر بالصلوة تخلقا واعتياداً ولو كان الرجل بالغا والمرأة صغيرة يجامع مثلها فعلى الرجل الفسل ولا غسل عليها.

وفی الدر المختار (۱/۱۶۲): أي الفاعل والمفعول(لو) كانا(مكلفين) ولو أحدهما مكلفاً فعليه فقط دون المراهق لكن يمنع من الصلوة حتى يغتسل ويؤمربه ابن عشرتا ديباً.

وفی الشامية تحته: (قوله تاديبا) فی الخانية وغيرها يؤمر به اعتيادا وتخلقا كما يؤمر بالصلوة

والطهارة وفي القنية: قال محمد وطی صبية يجامع مثلها يستحب لها أن تغتسل كانّه لم يرجبرها وتأديبها على ذلک: وقال أبو علی الرازی: تضرب علی الاغتسال وبه نقول وكذا الغلام المراهق يضرب علی الصلوة والطهارة.

(٩٥) عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج میں انگلی داخل کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج میں انگلی داخل کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج کے ظاہری حصے کا دھونا ضروری ہے اس میں انگلی داخل کرنا ضروری نہیں۔

لـمافي الهندية(١/١٤): ويجب على المرأة غسل فرجها الخارج في الجنابة والحيض والنفاس...... لاتدخل المرأة اصبعها في فرجها عند الغسل.

وفي الدر المختار مع تنوير الابصار(١/١٥٢): (ويجب) اى يفرض(غسل) كل مايمكن من البدن بلا حرج مرة كأذن و(سرة وشارب وحاجب...... وفرج خارج) لانه كالفم لاداخل لأنه باطن. ولاتدخل اصبعها في قبلها به يفتي.

وفي الشامية تحته:(قوله لاداخل) اى لايجب غسل فرج داخل (قوله ولاتدخل اصبعها) اى لايجب ذلک كما في الشرنبلالية..... لايجب ادخالها الأصبع في قبلها وبه يفتي فافهم.

(٩٦) دورانِ غسل عورت کا سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت کیلئے دورانِ غسل سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....جی ہاں! عورت کیلئے دورانِ غسل سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔

لـمافي الهندية(١/١٣): وليس على المرأة ان تنقض ضفائرها في الغسل اذا بلغ الماء اصول الشعر ......ولو الزقت المرأة رأسها بطيب، بحيث لايصل الماء الى اصول الشعر وجب عليها ازالته ليصل الماء الى اصوله.

وفي الشامية(١/١٥٣): لكن في المبسوط: وانما شرط تبليغ الماء اصول الشعر لحديث حذيفة فانه كان يجلس الى جنب امرأته اذا اغتسلت فيقول ياهذه ابلغي الماء اصول شعرک وشئوون رأسک.

(۹۷) غسل جنابت میں اگر کلی بھول جائیں تو پانی پینے سے ادائیگی فرض کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب نے صبح غسل جنابت کیا، وہ کلی کرنا بھول گئے، اسی حالت میں نماز پڑھ لی، انہوں نے دوسنتوں کے بعد پانی پیا تھا، ہمارے محلے میں ایک صاحب کا کہنا ہے، اس طرح کلی ہو جاتی ہے کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ کلی میں منہ کے تمام اطراف میں پانی پہنچانا ضروری ہے، اگر کوئی ایک حصہ بھی خشک رہ گیا تو اس صورت میں غسل نہیں ہوگا، اب اگر ان صاحب نے فرض کی ادائیگی سے پہلے جو پانی پیا اگر وہ پانی انہوں نے ایک ہی سانس میں غیر مسنون طریقے سے (منہ بھر کر) پیا تو ان کی نماز ہو جائے گی اور اگر مسنون طریقے سے ایک ایک گھونٹ پیا تو غسل نہیں ہوا، بذا نماز بھی نہیں ہوئی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ منہ بھر کر پینے سے پانی منہ کے تمام اطراف میں پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک گھونٹ پینے سے پانی منہ کے تمام اطراف میں نہیں پہنچتا۔

لمافی الهندية (۱/۱۳): الجنب اذا شرب الماء ولم يمجه لم يضره ويجزيه عن المضمضة اذا أصاب جميع فمه.

وفي الدر المختار (۱/۱۵۱): (فرض الغسل)......(غسل) كل (فمه) ويكفي الشرب عباً.

وفي الشامية: (ويكفي الشرب عبا)......والمراد به هنا الشرب بجميع الفم وهذا هو المراد بما في الخلاصة ان شرب على غير وجه السنة يخرج عن الجنابة والا فلا، وبما قيل ان كان جاهلا جاز وان كان عالماً فلا "اى لان الجاهل يعب والعالم يشرب مصاً كما هو السنة".

(۹۸) غسل جنابت سے پہلے پانی میں ہاتھ ڈالنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کو رات میں احتلام ہو جائے، اب صبح غسل کے وقت یہ دیکھنے کیلئے کہ پانی زیادہ گرم تو نہیں وہ بالٹی میں ہاتھ ڈال دے تو کیا اس سے وہ پانی ناپاک ہو جائے گا جبکہ اس نے وہ ہاتھ ابھی تک دھوئے نہیں تھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر اس کے پاس پانی نکالنے کیلئے کوئی دوسرا برتن نہیں تھا اور ہاتھ پر کوئی نجاست بھی لگی ہوئی نہیں تھی تو ایسی صورت میں یہ پانی ناپاک نہیں ہوا بلکہ اس سے غسل کرنا بالکل صحیح ہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۲): اذا ادخل المحدث او الجنب او الحائض التي طهرت يده في الماء للاغتراف لا يصير مستعملا.

وفي ردالمحتار (۱/۲۰۰): (لغير اغتراف)...... فلو قصد الاغتراف ونحوه كاستخراج كوز لم يصر مستعملا للضرورة.

(۹۹) غسل کرتے ہوئے جسم کا کچھ حصہ خشک رہ جائے تو غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی پر غسل واجب ہوا جب اس نے غسل کیا تو بدن کا کچھ حصہ پانی کے ختم ہونے کی وجہ سے خشک رہ گیا اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا وہ غسل اس کا پورا سمجھا جائے گا کیونکہ اکثر حصہ دھل چکا ہے یا اس کو کچھ اور کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... غسل فرض ہونے کے بعد ضروری ہے کہ تمام بدن کے ہر حصے کو دھویا جائے اگر بال برابر بھی کوئی جگہ خشک رہ گئی تو غسل صحیح نہیں ہوگا۔ ہاں اگر غسل کرتے ہوئے پانی ختم ہوگیا اور پانی تک رسائی بھی ممکن نہیں تو پھر باقی ماندہ غسل کے لئے تیمم کرلے اور اگر پانی تک رسائی ممکن ہو تو پھر باقی ماندہ اعضاء کو دھولے۔

لمافي الهندية (۱/۲۹): جنبٌ اغتسل وبقي لمعة وفني ماءه يتيمم لبقاء الجنابة فان أحدث تيمم للحدث فان وجد ماء يكفيهما صرفه اليهما.

وفي الشامية (۱/۲۵۶): (قوله ولمعة و جنابة) أى لواغتسل وبقيت على بدنه لمعة لم يصبها الماء فتيمم لها.

(۱۰۰) غسل کے بعد منی نکلنے سے غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے خاص حصے سے کچھ منی نکلی اور اس نے غسل کرلیا، بعد غسل کے دوبارہ کچھ بغیر شہوت کے نکلی تو کیا دوبارہ پھر غسل کرنا فرض ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر سونے، پیشاب کرنے اور کچھ قدم چلنے سے پہلے غسل کیا گیا اور پھر منی نکلی ہو تو راجح قول کے مطابق احتیاطاً غسل کرنا ضروری ہے اور اگر سونے یا پیشاب کرنے یا کچھ قدم چلنے کے بعد غسل کیا گیا اور پھر بقایا منی کا خروج ہوا تو بالاتفاق غسل کرنا ضروری نہیں۔

لمافي الهندية (۱/۱۴): ولو خرج بعدما بال أو نام أو مشى لايجب عليه الغسل اتفاقا.

وفي رد المحتار (۱/۱۶۰): وكذا لوخرج منه بقية المني بعد الغسل قبل النوم أو البول أو المشي الكثير نهر أى لابعده لان النوم والبول والمشي يقطع مادة الزائل عن مكانه بشهوة فيكون الثاني زائلا عن مكانه بلا شهوة فلا يجب الغسل اتفاقا.

(۱۰۱) غسل کے بعد اگر منی کے قطرے آجائیں تو غسل کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے وظیفہ زوجیت ادا کیا، صبح غسل کرنے کے بعد چند قطرے منی کے آگئے، کیا ایسی صورت میں دوبارہ غسل واجب ہوتا ہے، جبکہ ان قطروں کے وقت شہوت بالکل نہ تھی؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص ہمبستری سے فارغ ہونے کے بعد سو گیا تھا یا اس نے پیشاب کیا اس کے بعد غسل کیا تھا تو اب جو قطرات بغیر شہوت کے نکل گئے ان سے غسل واجب نہیں ہوتا، اور اگر فراغت کے فوراً بعد غسل کر لیا اور غسل کے بعد چند قطرے آگئے تو اس سے دوبارہ غسل واجب ہو جائے گا۔

لـمـا فـي الهندية (۱/۱۴): لو اغتسل من الجنابة قبل أن يبول أو ينام وصلى ثم خرج بقية المني فعليه أن يغتسل عندهما خلافا لأبي يوسف رحمه الله تعالىٰ .....ولو خرج بعد ما بال أو نام أو مشى لا يجب عليه الغسل اتفاقاً.

وفي ردالمحتار (۱/۱۶۰): لو خرج منه بقية المني بعد الغسل قبل النوم أو البول أو المشي الكثير نهر اى لا بعده لان النوم والبول والمشي يقطع مادة الزائل عن مكانه بشهوة فيكون الثاني زائلاً عن مكانه بلا شهوة فلا يجب الغسل اتفاقاً.....

(۱۰۲) انجکشن کے ذریعے سے مادۂ منویہ رحم میں پہنچانے سے غسل کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جدید دور ہے ہر کام جدید طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جانوروں کو انجکشن کے ذریعے حاملہ کیا جاتا، اسی طرح عورتوں کے رحم میں انجکشن کے ذریعے مادہ منویہ پہنچایا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب عورتوں کے رحم میں انجکشن کے ذریعہ مادۂ منویہ پہنچایا گیا تو عورت پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....انجکشن کے ذریعے مادہ منویہ پہنچانے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ غسل خروج منی بالدفق سے یا دخول حشفہ سے واجب ہوتا ہے اور یہاں ایک بھی نہیں پایا جاتا۔

لمافي المحيط البرهاني (۱/۲۲۷): وقال محمدؒ في البكر: إذا جو معت فيما دون الفرج فدخل من ماءه فرجها فلا غسل عليها. لأن الغسل إنما يجب بالتقاء الختانين أو بنزول الماء ولم يوجد واحد منهما. حتى لو حبلت يجب الغسل عليها لنزول ماء ها.

وفي الخانية (۱/۲۱): الجناية تثبت بسببين احدهما انفصال المني عن شهوة والثاني الايلاج في الأدمي الخ.

(۱۰۳) "غیر معتاد راستے سے خروج منی" کے متعلق ایک فتویٰ پر استدراک

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احتلام کے بعد کسی خرابی کی بنا پر منی مثانے سے ہوکر پیشاب کے ساتھ نکلے تو غسل وغیرہ کا کیا حکم ہوگا؟ اس سے متعلق فتویٰ میرے ایک عزیز نے ایک مفتی صاحب سے لیا تھا، لیکن ان کے جواب سے مجھے کچھ بے اطمینانی ہے۔ براہ کرم آنجناب اس سوال کا مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ: وہ فتویٰ مع سوال وجواب کے اس سوالنامے کے ساتھ منسلک ہے۔

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کو احتلام ہوتا ہے اور بوقت احتلام لذت بھی محسوس کرتا ہے مگر منی باہر نہیں نکلتی اور یہ آپریشن کے بعد ہوا پہلے ایسا نہ تھا اور ڈاکٹر کہتا ہے آپریشن کے دوران گوشت کا ٹکڑا لاپرواہی یا کوتاہی سے کٹ گیا ہے، جس کی وجہ سے منی معتاد راستے سے آنے کے بجائے پہلے مثانے میں جاتی ہے پھر پیشاب کے ساتھ نکلتی ہے، کیا اس آدمی پر غسل واجب ہے یا نہیں؟ جواب سے نواز کر مشکور فرمائیں۔

سائل: محمد اسماعیل ڈیروی

جواب.....صورت مسئولہ میں لذت شہوت کا قرینہ قویہ ہے اور منی کا اپنی جگہ سے شہوت کے ساتھ جدا ہونے کا بھی اور خروج منی شہوت کے ساتھ متحقق اس وجہ سے نہ ہوسکا کہ آپریشن میں غلطی سے گوشت کا ٹکڑا کٹ گیا جس کی وجہ سے منی پہلے مثانے میں چلی جاتی ہے پھر پیشاب کے ساتھ معتاد راستے سے نکلتی ہے اور آپریشن کے باب میں سرجن کا قول معتمد ہے چنانچہ صورت مسئولہ میں اس آدمی پر غسل واجب ہوگا۔ قال فی الهداية يقال اجنب الرجل اذ اقضیٰ شهوته من المرأته والحديث (ای الماء من الماء) محمول على الخروج عن شهوة ثم المعتبر عند ابی حنيفةؒ ومحمدؒ انفصاله عن مكانه على وجه الشهوة وعند ابی يوسفؒ ظهوره ايضاً اعتبار للخروج بالمزايلة اذاالغسل يتعلق بهما ولهما (ای طرفين) انه متى وجب من وجه فالاحتياط فی الايجاب، (ج ا ص ۳۱) اور مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سوال نمبر ۱۱۷ کے جواب میں چند سطور لکھنے کے بعد لکھتے ہیں وجوب غسل کیلئے انفصال بشہوۃ شرط ہے، اگرچہ خروج بشہوۃ نہ ہو مگر مواقع ضرورت میں خروج بشہوۃ پر فتویٰ ہے جو امام ابویوسفؒ کا قول ہے پس ماسوائے ضرورت کے انفصال بشہوۃ پر فتویٰ ہے كذا فی الدر المختار والشامی وغيرهما۔ فتویٰ دارالعلوم دیوبند جلد اول صفحہ ۱۳۹، فصل فی موجبات غسل۔

بندہ نور محمد عفی عنہ

اصل اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں۔ آخری صورت چونکہ نزاعی ہے اور وہ انفصال کے وقت شہوت ہو، اور ظہور کے

وقت نہ ہو۔تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غسل واجب نہیں طرفین کے نزدیک واجب ہے، عدم وجوب منی پر قیاس ہے اور وجوب منی پر احتیاط ہے لہٰذا احتیاطاً غسل کرے واجب نہیں ہے۔ معدن الحقائق شرح کنز الدقائق (کتاب الطہارۃ،صفحہ ۱۰۰)

المجیب

حسین عرفان ابن شیخ الحدیث مولانا علاؤ الدین صاحب

الجواب حامداً ومصلیاً......اصحاب المذہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب منی اپنے مقر سے شہوت کے ساتھ جدا ہو جائے تو جب تک اس کا خروج وظہور من الذکر نہ ہوگا اس وقت تک اس پر غسل واجب نہیں ہوگا، خروج من الذکر شہوت کے ساتھ ہونا امام ابو یوسفؒ رحمہ اللہ کے نزدیک شرط ہے جبکہ طرفین رحمہما اللہ کے نزدیک شرط نہیں بغیر شہوت کے خروج ہو جائے تب بھی غسل واجب ہوگا اور اسی قول کو اکثر فقہاء نے ترجیح دی ہے، البتہ مہمان کے حق میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو لیا ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ شخص پر احتیاطاً غسل واجب ہوگا اور سوالنامے کے ساتھ منسلکہ فتویٰ میں مذکورہ جواب میں جو معدن الحقائق کی عبارت نقل کی گئی ہے اسی عبارت کے آگے یہ عبارت بھی مذکور ہے۔

تنبیہ: فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ تاج الشریعۃ وغیرہ محققین نے جو طرفین کے مذہب کو متون میں ذکر کیا ہے وہی ظاہر، اصح اور احوط ہے اس بارے میں درمختار کا قول (جو انہوں نے بحوالہ قہستانی وفتاوی تاتارخانیہ، نوازل سے نقل کیا ہے کہ ''وبقول ابی یوسف ناخذ لانہ ایسر علی المسلمین'' قلت ولا سیمافی الشتاء والسفر) لائق التفات نہیں اور نہ اس پر فتویٰ دینا جائز ہے الا یہ کہ حرج اور ضرورت ہو۔

منسلکہ فتویٰ کے مجیب سے دو غلطیاں ہوگئی ہیں، پہلی غلطی یہ کہ اردو شرح سے فتویٰ دیا ہے، دوسری غلطی یہ کہ شارح اور فقہاء کی عبارت میں تحریف کر کے ان کی طرف غلط نسبت کی ہے، اصل عبارت چھوڑ دی ہے جس کو وہ احتیاطاً واجب کہہ رہے ہیں یہ اس کو واجب نہیں سمجھتے، شارح جس پر فتویٰ دینے کو ناجائز کہہ رہے ہیں یہ اس کو جائز اور اس پر فتویٰ دے رہے ہیں۔

لمافی البحر الرائق(۱/۱۰۳،۱۰۴): والاحتیاط واجب وھو العمل بالاقوی من الوجھین فوجب ...... وفی المستصفی یعمل بقول ابی یوسف اذا کان فی بیت انسان واحتلم مثلا ویستحی من اھل البیت او خاف ان یقع فی قلبھم ریبۃ بان طاف حول اھل بیتھم وفی السراج الوھاج والفتوی علی قول ابی یوسف فی الضیف وعلی قولھما فی غیرہ .

وفی البنایۃ(۱/۱۸۸): (فی الایجاب)أی الاحتیاط واجب فی ایجاب الغسل ترجیحاًلجانبہ وقال الاترازی قال بعض الشارحین الخروج علی وجہ الشھوۃ قد وجد وانما عدم الدفق لاغیر فباعتبار ماوجد یجب الاغتسال وباعتبار ماعدم لا یجب فیرجع حال الوجود احتیاطاً.

وفي بدائع الصنائع(۱/۳۷):(ومنها) ان ينفصل المنى عن شهوة ويخرج لا عن شهوة وانه يوجب الغسل في قول ابي حنيفة ومحمد وعند ابي يوسف لايوجب فالمعتبر عندهما الانفصال عن شهوة و عنده المعتبر هو الانفصال مع الخروج عن شهوة وفائدته تظهر في موضعين احدهما اذا احتلم الرجل فانتبه وقبض على عورته حتى سكنت شهوته ثم خرج المنى بلا شهوة والثانى اذا جامع فاغتسل قبل ان يبول ثم خرج منه بقية المنى وجه قول ابي يوسف ان جانب الانفصال يوجب الغسل وجانب الخروج ينفيه فلا يجب مع الشك ولهما انه اذا احتمل الوجوب والعدم فالقول بالوجوب اولى احتياطاً.

وفي الشامية(۱/۱۶۰):(قوله وبقول ابي يوسف ناخذ) أى في الضيف وغيره وفي الذخيرة ان الفقيه ابا الليث وخلف بن ايوب اخذا بقول ابي يوسف وفي جامع الفتاوى ان الفتوى على قوله اسماعيل: (قوله قلت الخ) ظاهره الميل الى اختيار مافي النوازل ولكن اكثر الكتب على خلافه حتى البحر والنهر ولا سيما قد ذكروا ان قوله قياس وقولهما استحسان وانه الاحوط فينبغي الافتاء بقوله في مواضع الضرورة فقط تأمل.

وفي الفقه الاسلامي(۱/۵۱۵): واتفق أئمة الحنفية على انه لا يجب الغسل اذا انفصل المنى عن مقره من الصلب بشهوة الا اذا خرج على راس الذكر وهناك خلاف بينهم في انه هل تشترط مقانة الشهوة للخروج؟ فعندابي حنيفة ومحمد: لاتشترط وعند ابي يوسف تشترط وثمرة الخلاف تظهر فيما لو احتلم فوجد اللذة ولم ينزل حتى توضا وصلى ثم انزل. اغتسل ولا يعيد الصلاة في رأيهما ولا يغتسل في رأيه ولو اغتسل بعد الجماع قبل النوم او البول او المشى ثم خرج منه المنى بلا شهوة يجب اعادة الغسل عندهما لا عنده وقولهما احوط لان الجنابة قضاء الشهوة فاذا وجدت مع الانفصال تحقق اسمها.

(۱۰۴) ضرورت کی وجہ سے غسلِ جنابت کو مؤخر کرنے کا حکم

سوال کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غسل جنابت کوضرورت کی بناپر مؤخر کرنے کا شرعاً کیاحکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......جنبی کیلئے غسل کرنافی الفورضروری نہیں،تاخیر کی گنجائش ہے،البتہ اتنی تاخیر کرنا کہ جس سے نماز کاوقت نکل جائے باعثِ گناہ ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۶): الجنب إذا أخر الاغتسال إلى وقت الصلاة لايأثم كذا في المحيط قد نقل

الشیخ سراج الدین الهندی الاجماع علی انه لایجب الوضوء علی المحدث والغسل علی الجنب والحائض والنفساء قبل وجوب الصلاة أو ارادة مالا یحل إلا به.

وفی رد المحتار(۱/۱۶۵): قال فی الشرنبلالیة: واختلف فی سبب وجوب الغسل. وعند عامة المشایخ ارادة فعل ما لایحل فعله مع الجنابة وقیل وجوب مالا یحل معها، والذی یظهر انه ارادة فعل مالا یحل إلا به عند عدم ضیق الوقت أو عند وجوب مالا یصح معها، وذلک عند ضیق الوقت لما قال فی الکافی ان سبب وجوب الغسل الصلاة أو ارادة مالا یحل فعله مع الجنابة والانزال والالتقاء شرط اهـ.

(۱۰۵) مرتد کا دوبارہ اسلام قبول کرنے کیلئے غسل کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص پہلے کافر ہو بعد میں اسلام لائے تو اس کو غسل کرنا چاہیے۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص نعوذ باللہ مرتد ہو جائے اور بعد میں پھر اسلام لائے تو اس پر غسل کرنا لازم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کافر کا اسلام قبول کرنے کیلئے غسل کرنا مستحب ہے بشرطیکہ حالت کفر میں جنابت لاحق نہ ہوئی ہو۔اگر حالت کفر میں جنابت لاحق ہوئی تھی۔اور غسل نہیں کیا تھا۔تو اب غسل کرنا واجب ہوگا۔مرتد کے لیے بھی یہی حکم ہے۔یعنی مرتد کا دوبارہ اسلام لانے کیلئے غسل کرنا مستحب ہے۔لیکن اگر حالت ارتداد میں جنابت لاحق ہوئی تھی اور غسل نہیں کیا تھا تو اب غسل کرنا واجب ہوگا۔

لمافی بدائع الصنائع(۱/۲۷۲): أما المستحب فهو غسل الکافر اذا اسلم لما روی ان رسول الله ﷺ کان یأمر بالغسل من جاءه یرید الاسلام، وادنی درجات الامر الندب والاستحباب، هذا اذا لم یعرف انه جنب فاسلم، فأما اذا علم کونه جنبا فاسلم قبل الاغتسال. اختلف المشایخ فیه قال بعضهم: لا یلزمه الاغتسال أیضا لان الکفار غیر مخاطبین بشرائع هی من القربات والغسل یصیر قربة بالنیة فلا یلزمه وقال بعضهم: یلزمه لان الاسلام لاینافی بقاء الجنابة بدلیل انه لا ینافی بقاء الحدث حتی یلزمه الوضوء بعد الاسلام کذا الجنابة، الخ.

وفی المحیط البرهانی(۱/۲۲۸): والکافر اذا أجنب ثم اسلم ففی وجوب الغسل علیه اختلاف المشایخ قال بعضهم یجب، والیه أشار محمد رحمه الله فی السیر الکبیر.

وفی الهندیة(۱/۱۶): الکافر اذا أجنب ثم اسلم یجب علیه الغسل فی ظاهر الروایة(إلی قوله) وواحد مستحب وهو غسل الکافر اذا أسلم ولم یکن جنبا کذا فی محیط السرخسی.

(۱۰۶) غسل خانے میں باتیں کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص غسل کررہا تھا کہ باہر سے دوسرے آدمی نے آواز دی تو وہ غسل خانے میں بولنا شروع ہوگیا جب اس کو کہا گیا کہ غسل خانے میں باتیں کرنا منع ہے تو اس نے کہا بیت الخلاء میں باتیں کرنا منع ہے غسل خانے میں اجازت ہے تو کیا اس کی بات درست ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... چونکہ بیت الخلاء میں گندگی اور ستر کے کھلے ہونے کی حالت ہوتی ہے۔ اس لئے وہاں پر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور دیگر دنیاوی باتیں کرنا مکروہ ہے۔ لہٰذا غسل خانے میں بھی اگر دورانِ غسل ستر کھلا ہوا ہو تو باتیں کرنا مکروہ ہوگا، تاہم اگر ستر کھلا ہوا نہیں ہے، تب بھی غیر ضروری باتیں کرنا ادب کے خلاف ہے۔

مافی الھندیة (۱/۱۴): ویستحب أن لایتکلم بکلام قط.

وفی الشامیة (۱/۱۵۶): قال الشر نبلالی. ویستحب أن لایتکلم بکلام مطلقا أما کلام الناس فلکراھته حال الکشف . وأما الدعاء فلأنه فی مصبّ المستعمل ومحل الأقذار والأوحال.

(۱۰۷) غسل مسنون کی اقسام اور جمعہ کے غسل کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن صورتوں میں غسل کرنا سنت ہے؟ اگر کوئی شخص جمعہ کے دن غسل نہ کرے تو کیا وہ گنہگار ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... چار صورتوں میں غسل کرنا مسنون ہے۔ (۱)..... جمعہ کے دن، (۲)..... عید الفطر وعید الاضحیٰ کے دن (۳)..... حج وعمرہ کا احرام باندھنے سے پہلے، (۴)..... عرفہ کے دن زوال کے بعد۔

چونکہ جمعہ کے دن غسل کرنا مسنون ومستحب ہے اس لئے اگر کبھی کسی عذر یا مجبوری کی وجہ سے جمعہ کا غسل نہ کرسکے تو کوئی حرج نہیں لیکن بغیر کسی عذر کے اس کی عادت بنا لینے میں گناہ کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ بغیر عذر کے جمعہ کے دن کا غسل ترک کرنے سے بچنا چاہئے۔

لمافی الھندیة (۱/۱۶): واربعة سنة وھی غسل یوم الجمعة ویوم العیدین ویوم عرفة وعند الاحرام.

وفی الدر المختار (۱/۱۶۸): (وسن لصلوٰة جمعة و)لصلوٰة (عید) ھو الصحیح کما فی غرر الاذکار وغیرہ.....(و) لاجل (احرام و) وفی جبل (عرفة) بعد الزوال.

وفی الشامیة تحته: (قوله وسن الخ) ھو من سنن الزوائد، فلا عتاب بترکه کما فی القھستانی .

﴿فصل فی التیمم﴾

(تیمّم کے مسائل کا بیان)

(۱۰۸) تیمّم کی حکمت و مصلحت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ ایک خطیب صاحب مسئلہ بیان فرمار ہے تھے کہ اگر کسی کو پانی نہ ملے یا کوئی عذر ہو تو وہ تیمم کر کے نماز ادا کرے نماز معاف نہیں ہے مسئلہ تو میں نے سمجھ لیا لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تیمم کرنے میں کیا مصلحت ہے جبکہ ظاہری کوئی فائدہ بھی نظر نہیں آرہا، براہ کرم آپ حضرات تیمم کی مصلحت اور فوائد بیان فرما کر میری الجھن دور فرمادیں؟

الجواب حامداًومصلیاً..... حکیم ذات کا کوئی حکم، حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا چاہے کسی کو بظاہر اس کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔لیکن ہر حکم کی حکمت ومصلحت ڈھونڈنا بندے کیلئے مناسب نہیں کہ حکمت سمجھے بغیر عمل پیرا ہونا کامل اطاعت ہے۔ہاں! کوئی اس درجہ پر پہنچا ہو کہ مصلحت معلوم کرنے سے اطاعت میں مزید اضافہ ہو تو اس وجہ سے اس کیلئے حکمت ومصلحت معلوم کرنا الگ بات ہے۔

تیمم کی مشروعیت، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان خصوصیات میں سے ہے۔ جو آپ سے پہلے دوسرے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو عطاء نہیں ہوئیں اور اس میں مصلحت لوگوں کے لئے آسانی کا پیدا کرنا اور تنگی کو دفع کرنا ہے کہ جہاں پانی موجود نہ ہو یا پانی موجود ہو لیکن استعمال کرنے میں کوئی عذر ہو تو تیمم کیا جائے۔اور جس طرح تمام مائعات میں سے پانی کو طہارت کیلئے خاص کیا گیا ہے۔اسی طرح تیمم کیلئے مٹی کو خاص کیا گیا اور اس میں بنی آدم کی کرامت کا اظہار ہے کہ اس کی تخلیق بھی مٹی اور پانی سے ہوئی ہے۔تو ان دونوں کو اس کی پاکی کیلئے خاص کر دیا گیا۔

لمافی القرآن الکریم (المائدہ:٦): وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝

وفی التفسیر المنیر (١١١/٦): ثم ذکر تعالیٰ حکمة مشروعیة التیمم وھی التیسیر علی الناس ودفع الحرج عنھم، فابان انه تعالیٰ ما یرید لیجعل علیکم فیما شرعه من احکام الوضوء والغسل والتیمم فی ھذہ الایة وغیرھا حرجا ای ادنی ضیق واقل مشقة، لانه تعالیٰ غنی عنکم، رحیم بکم،

فلا یشرع لکم الاما فیه الخیر والنفع لکم، ولکن یرید لیطهرکم من الدنس والرجس المادی بازالة الاقذار، والرجس المعنوی بطرد الکسل والفتور الحاصل عقب الجنابة، وبعث النشاط، لتکون النفس صافیة مرتاحة فی مناجاة ربها، ویرید ایضا ان یتم نعمته علیکم بالجمع بین طهارة الا بدان وطهارة الارواح، وتبیان طریق العبادة الافضل، لتؤد و الشکر الواجب علیکم، ولتداوموا شکر النعم التی انعمها الله علیکم.

وفی مبسوط السرخسیؒ(۱/۱۰۸): وما شرع التیمم الا لدفع الحرج قال الله تعالیٰ ما یرید الله لیجعل علیکم من حرج......... فکما یختص الوضوء بالماء دون سائر المائعات فکذلک التیمم وفیه اظهار کرامة الادمی فانه مخلوق من التراب والماء فخصا بکونهما طهورا لهذا.

(۱۰۹) کیا ہر وہ چیز جو جلانے سے خاک نہ ہو اس سے تیمّم درست ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے پوچھا کہ تیمم کس کس چیز سے جائز ہے تو وہ کہنے لگے کہ ہر وہ چیز جو جلانے سے خاک میں تبدیل نہ ہو تو اس اعتبار سے کافی چیزیں اس میں داخل ہو جاتی ہیں کیا سب سے تیمم کرنا جائز ہوگا جیسے نمک، مرچ اور گھر میں دیواروں پر لگا ہوا چونا وغیرہ؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں یہ جواب مکمل نہیں بلکہ اس کے دو جز ہیں، اول زمین کی جنس میں سے ہر اس چیز سے تیمم جائز ہے جو جلانے سے نہ جلے، دوم پگھلانے سے نہ پگھلے، لہٰذا دونوں اصولوں کی روشنی میں گھر کی دیواروں کے چونے سے تیمم درست ہے، اور جہاں تک نمک کا تعلق ہے تو نمک کی دو قسمیں ہوتی ہیں اول سمندری، دوم پہاڑی، اگر نمک سمندری ہے تو اس سے تیمم درست نہیں کیونکہ یہ جنس ارض میں سے نہیں اور اگر نمک پہاڑی ہے تو اس سے تیمم درست ہے کیونکہ یہ جنس ارض میں سے ہے۔

اور مرچ چونکہ جلانے سے جل جاتی ہے لہٰذا اس سے بھی تیمم درست نہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۲۶): وکل مایحترق فیصیر رماداً کالحطب والحشیش ونحوهما أو ماینطبع ویلین کالحدید والصفر ......فلیس من جنس الارض وما کان بخلاف ذلک فهو من جنسها ......

وفیها ایضاً (ص۲۷): أماالملح فان کان مائیاً فلا یجوز به اتفاقاًوان کان جبلیاً ففیه روایتان وصحح کل منهما ولکن الفتوی علی الجواز.

وفی رد المحتار (۱/۲۳۹): الفارق بین جنس الارض وغیره أن کل ما یحترق بالنار فیصیر رماداًکالشجر والحشیش أو ینطبع ویلین کالحدید والصفر والذهب والزجاج ونحوها فلیس من جنس الارض ابن کمال عن التحفة.

(۱۱۰) تیمّم کن کن چیزوں سے جائز ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن چیزوں پر تیمّم کرنا صحیح ہے؟ اگر پاک کپڑے پر گردہو تو اس پر تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ہر وہ چیز جو پاک ہو اور جنس الارض سے ہو یعنی جلانے سے راکھ نہ ہو، اور پگھلانے سے پگھلتی نہ ہو تو اس پر تیمّم کرنا صحیح ہے۔ مثلاً مٹی، پتھر، چونا اور گچ وغیرہ۔ اگر پاک کپڑے پر گرد وغبار ہو تو اس پر تیمّم کرنا درست ہے۔

لمافی الهندية (۱/۲۶، ۲۷): (ومنها الصعيد الطيب) يتيمم بطاهر من جنس الأرض..... فيجوز التيمم بالتراب والرمل و السبخة المنعقدة من الأرض دون الماء والجص والنورة والكحل والزرنيخ والمغرة والكبريت والفيروزج والعقيق والبلخش والزمرد والزبرجد ...... وصورة التيمم بالغبار أن يضرب بيديه ثوباً أو لبدا أو وسادة أوما اشبهها من الأعيان الطهارة التى عليها غبار فإذا وقع الغبار على يديه تيمم.

وفي الشامية (۱/۲۳۹): (قوله من جنس الارض) الفارق بين جنس الارض وغيره ان كل ما يحترق بالنار فيصير رماداً كالشجر والحشيش أو ينطبع ويلين كالحديد والصفر والذهب والزجاج ونحوها فليس من جنس الارض.

(۱۱۱) مسجد کے فرش ودیواروں سے تیمّم کرنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں گرمیوں میں چلہ لگانے گیا تو میری تشکیل ایسی جماعت کے ساتھ ہوئی جس میں تین عالم حضرات تھے رات کے وقت ہم سونے لگے تو ایک عالم صاحب نے کہا اگر کسی کو احتلام ہو جائے تو مسجد کی دیوار یا فرش پر ہاتھ مار کر تیمّم کرلے اس کے بعد مسجد سے باہر جائے دوسرے نے کہا کہ مسجد کی مٹی سے تیمّم کرنا جائز نہیں کافی بحث ومباحثہ ہوا لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا، میرے دل میں خیال آیا کہ کسی دارالافتاء سے معلوم کیا جائے اب میں آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مسجد کی مٹی سے تیمّم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... مسجد کی حرمت کے پیش نظر عام حالات میں مسجد کے درودیوار سے تیمّم کرنا مکروہ ہے البتہ موجودہ دور میں چونکہ مساجد پختہ ہوتی ہیں اس لئے مسجد کے اندر حالت جنابت میں مسجد کی درودیوار سے تیمّم کرنے کی گنجائش ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمل مستحب ہے اس کی وجہ سے بحث ومباحثہ کرنا مناسب نہیں۔

لمافي الولوالجية (۱/۵۳): النائم اذا احتلم وهو في المسجد ان امكنه ان يخرج من ساعته واغتسل

حتى لا يبقى في المسجد جنبا وان لم يمكن بان كان في وسط الليل ولم يقدر على الخروج يستحب له التيمم حتى لا يبقى في المسجد جنبا.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۱/۵۴۶): لو احتلم في المسجد، وجب عليه الخروج منه الا ان يعجز عن الخروج لإغلاق المسجد ونحوه، أوخاف على نفسه أو ماله، فان عجز او خاف حاز ان يقيم للضرورة ولا يتيمم بتراب المسجد فيحرم ذالک فان خالف وتيمم صح الخ .

وفي البحر الرائق(۵/۴۱۹): لاحرمة لتراب المسجد اذا جمع وله حرمة اذا بسط.

وفي الشامية(۱/۲۴۳): لكن لقائل ان يقول: ان مراد المبتغي ان الجنب اذا وجد ماء في المسجد واراد دخوله للاغتسال يتيمم ويدخل، ولو كان نائما فيه فاحتلم والماء خارجه وخشي من الخروج يتيمم وينام فيه الى ان يمكنه الخروج

قال في المنية: وان احتلم في المسجد تيمم للخروج اذا لم يخف، وان خاف يجلس مع التيمم ولا يصلي ولا يقرأ اهـ.

ويؤيد ما قلناه ان نفس النوم من المسجد ليس عبادة حتى يتيمم له وانما هو لأجل مكثه في المسجد او لأجل مشيه فيه للخروج.

(۱۱۲) تیمّم اور وضو کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جاسکتا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چہرے سے داڑھی کے بال تھوڑی سی جگہ سے یکدم سے گرنے لگے اور وہ جگہ خالی ہوگئی، ایک ڈاکٹر نے علاج کی حامی بھری ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تقریباً ایک ہفتہ تک اس جگہ کو پانی نہیں لگنا چاہیے، یہاں تک کہ اس پر مسح بھی نہیں کر سکتے، اب آپ بتائیں کہ میں تیمم کر کے نماز پڑھ لوں یا باقی اعضاء کو دھولوں اور چہرے کا تیمم کر لوں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جو بات ہو آپ مجھے بتلادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورتِ مسئولہ میں اگر ڈاکٹر مسلمان اور شریعت کا پابند ہے، تو آپ کیلئے اس کا قول معتبر ہے، لہٰذا آپ کیلئے تیمم کرنا درست ہے البتہ یہ تیمم صرف چہرے کا نہیں ہوگا بلکہ پورے اعضاء کا ہوگا اور اس کے ساتھ وضو نہیں ہوگا کیونکہ تیمم اور وضو دونوں کو جمع نہیں کر سکتے بلکہ دونوں میں سے صرف ایک پر عمل کر سکتے ہیں۔

لمافي الهندية (۱/۲۸):ويعرف ذلک الخوف اما بغلبة الظن عن امارة او تجربة او اخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق ......يغسل الصحيح ويمسح على الجريح ان امكنه وان لم يمكنه المسح يمسح على الجبائر او فوق الخرقة ولا يجمع بين الغسل والتيمم.

وفی الشامیة (۱/۲۳۲): (اوقول حاذق مسلم)ای اخبار طبیب حاذق مسلم غیر ظاهر الفسق ......

وفی البحر ولا فرق عندنا بین ان یشتد بالتحرک کالمبطون او بالاستعمال کالجدری.

(۱۱۴) وضو کی اجازت نہ ہونے پر تیمّم جائز ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ ہے جہاں پانی نہیں یا پانی تو ہے لیکن وضو کیلئے جگہ نہیں اور وضو کی اجازت بھی نہیں تو کیا ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے؟ نیز ایسی جگہ اگر تیمم کیلئے بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر پانی نہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ ایک میل شرعی (جو کلومیٹر کے حساب سے 1.609 ہوتا ہے) کی مسافت تک پانی ہے یا نہیں اگر ایک میل تک پانی مل سکتا ہو تو پانی حاصل کر کے وضو کرے گا، اور اگر ایک میل تک پانی نہیں یا اسے پانی کا ہونا یا نہ ہونا معلوم نہ ہو تو اگر ظن غالب یہی ہے کہ پانی نہیں ہوگا، تو بھی تیمم کرنا جائز ہوگا لیکن اگر پانی کے موجود ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو تو تلاش کرنا ضروری ہوگا، تلاش کے بعد اگر مل جائے تو ٹھیک ورنہ تیمم کرلے۔ اور اگر پانی تو ہے لیکن وضو کی جگہ نہیں تو تیمم جائز نہیں وضو کرنا ہی ضروری ہوگا۔ اور اگر پانی موجود ہے لیکن وضو کی اجازت نہیں تو دیکھا جائے گا کہ اگر وضو کرنے سے شدید مشقت کا اندیشہ ہے مثلاً منع کرنے والا قید میں ڈال دے گا یا قتل کردے گا تو بھی تیمم کرنا جائز ہوگا، ورنہ نہیں اور ایسے نماز پڑھنے کی صورت میں بعد میں جب یہ عذر ختم ہو جائے تو اس نماز کو دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا۔ اور اگر پانی اور تیمم کیلئے کوئی چیز نہ پائے تو اگر نماز کا وقت فوت ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں تشبہ بالمصلین کرے گا یعنی جیسے نماز میں حرکات وسکنات ہوتی ہیں خاموشی (بغیر قراءت کے) کے ساتھ ویسے ہی کرے گا اور بعد میں جب پانی وغیرہ مل جائے تو دوبارہ ان نمازوں کی قضاء کرلے۔

لمافی الهندیة (۱/۲۷): یجوز التیمم لمن کان بعیداً من الماء میلاً هو المختار فی المقدار سواء کان خارج المصر أو فیه وهو الصحیح.

وفی الدر المختار (۱/۲۵۲): (والمحصور فاقد) الماء والتراب (الطهورین) بان حبس فی مکان نجس ولا یمکنه اخراج تراب مطهر ...... (یؤخرها عنده: وقالا یتشبه) بالمصلین وجوباً

وفی الشامیة تحته (وقالا یتشبه بالمصلین) ای احتراما للوقت. قال ط ولا یقرأ کما فی أبی مسعود سواء کان حدثه أصغر أو أکبر اهـ قلت: وظاهره أنه لاینوی أیضاً لأنه تشبه لاصلاة حقیقیة تأمل.

وفی الشامیة (۱/۲۳۵): اعلم ان المانع من الوضوء ان کان من قبل العباد کأسیر منعه الکفار من الوضوء ومحبوس فی السجن ومن قیل له ان توضأت قتلتک جاز له التیمم ویعید الصلاة اذا زال المانع.

(۱۱۴) معذوری میں تیمّم کی مشروعیت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جو سخت بیمار ہے اور بستر پر پڑا ہوا ہے، طہارت وغیرہ کا انتظام مشکل ہے، بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتا لہٰذا وضو بھی نہیں کرایا جا سکتا نہ ہی خود کر سکتا ہے کیونکہ سارا پانی بستر پر گرتا ہے، جس کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے، تو کیا ایسی حالت میں نماز معاف نہیں ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جب مریض خود وضو نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے کرایا جا سکتا ہے تو ایسی صورت میں تیمم کر کے نماز پڑھے گا، نماز معاف نہیں ہوگی۔

لمافي الدر المختار (۱/۲۳۲،۲۳۳): (من عجز)..... (عن استعمال الماء)..... (لبعده)..... (او لمرض) يشتد او يمتد بغلبة ظن او قول حاذق مسلم ولو بتحرك، او لم يجد من توضئه فان وجد ولو بأجرة مثل وله ذلك لايتيمم في ظاهر المذهب كما في البحر.

(۱۱۵) نزلے کے مریض کیلئے حالت جنابت میں تیمّم کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نزلے کا مریض ہوں جب سردی آجاتی ہے تو میری حالت مزید خراب ہو جاتی ہے جب غسل کرتا ہوں تو سخت سردی لگتی ہے اور مرض بڑھ جانے کا یقین ہوتا ہے تو اگر مجھے غسل جنابت کی حاجت ہو تو کیا تیمم کر کے میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....مریض اس وقت تیمم کر سکتا ہے جب اس کو خود ظن غالب ہو یا کوئی ماہر ڈاکٹر یا طبیب اس کو یہ بتائے کہ پانی کے استعمال سے مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہے۔ اور صورت مسئولہ میں اگر گرم پانی کے استعمال پر بھی قدرت نہ ہو یا اس سے بھی مرض بڑھنے کا ظن غالب یا یقین ہو تو ایسی صورت میں تیمم کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۸): ولو كان يجد الماء الا انه مريض يخاف ان استعمل الماء إشتد مرضه أو أبطأبرؤه يتيمم ...... ويعرف ذلك الخوف اما بغلبة الظن عن امارة أو تجربة أو اخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق.

وفي الدر المختار (۱/۲۳۳): (أولمرض) يشتد أو يمتد بغلبة ظن أوقول حاذق مسلم ولو بتحرك أو لم يجد من توضئه .

(۱۱۶) ٹرین میں پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کا حکم نیز کپڑوں پر تیمّم کرنا کیسا ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ٹرین میں سفر کر رہا ہو، ٹرین میں پانی نہ ہو،

اورنماز کے وقت میں رکنے کا امکان بھی نہ ہو، یہ شخص ٹرین میں تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے؟ نیز یہ شخص تیمّم کپڑے پر کرسکتا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر پانی ایک میل سے زیادہ دور ہو، اور ٹرین میں نہ ہی کسی سے اتنا پانی ملنے کی امید ہو، جس سے وضو ہوسکے تو یہ شخص ٹرین میں تیمّم کر کے نماز پڑھ لے، پھر اگر کھڑے ہو کر پڑھ سکتا ہے تو کھڑے ہو کر پڑھے ورنہ بیٹھ کر پڑھ لے۔ لیکن پانی اگر ایک میل سے کم دور ہو، اور ٹرین کا وہاں پہنچنے تک نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، تو پھر بھی تیمّم کر کے نماز پڑھ لے۔ البتہ اس صورت میں نماز کی قضاء بھی ضروری ہے۔ نیز کپڑے پر اگر تھوڑا بہت غبار ہو تو اس پر تیمّم کرنا درست ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۷): وصورة التيمم بالغبار ان يضرب بيديه ثوبا أو لبدا او وسادة او ما اشبهها من الاعيان الطاهرة التی عليها غبار فاذا وقع الغبار علی يديه تيمم أو ينفض ثوبه حتی يرتفع غباره فيرفع يديه فی الغبار فی الهواء فاذا وقع الغبار علی يديه تيمم كذا فی المحيط...... ومنها عدم القدرة علی الماء......

وفيه ايضاً(۱/۱۴۳): أما الصلاة فی السفينة فالمستحب أن يخرج من السفينة للفريضة اذا قدر عليه كذا فی المحيط السرخسی.

وفی الدر المختار(۱/۲۴۱): (و) جاز (لخوف فوت صلاة جنازة)...... (أو) فوت (عيد) ......

(صـ۲۴۶) (لا) يتيمم (لفوت جمعة ووقت)...... وقيل يتيمم لفوات الوقت قال الحلبی: فالأحوط ان يتيمم ويصلی ثم يعيده.

وفی الشامية تحته: (قوله وجاز لخوف فوت صلاة جنازة) ای ولو كان الماء قريبا.

وتحت(قوله قال الحلبی)...... ثم قال ماحاصله: ولعل هذا من هؤلاء المشايخ اختيار لقول زفر لقوة دليله وهو ان التيمم انما شرع للحاجة الی اداء الصلاة فی الوقت فيتيمم عند خوف فوته......

قلت: وهذا قول متوسط بين القولين، وفيه الخروج عن العهدة بيقين فلذا اقره الشارح......

بل قد علمت من كلام القنية انه رواية عن مشايخنا الثلاثة. ونظير هذا مسألة الضيف الذی خاف ريبة فانهم قالوا يصلی ثم يعيد والله تعالیٰ اعلم.

(۱۱۷) ٹریننگ کے دوران تیمّم کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں پاکستان آرمی میں ہوں، ہماری ٹریننگ بعض دفعہ ایسے صحراؤں میں ہوتی ہے جہاں پانی کا نام ونشان نہیں ہوتا اور ہمیں کئی کئی دن وہاں گزارنے پڑتے ہیں، تھوڑا سا پانی صرف پینے کیلئے ملتا ہے اس کے علاوہ پانی موجود تو ہوتا ہے لیکن افسران بالا کے قبضے میں ہوتا ہے سوائے پینے کے نہیں ملتا، ایسی صورت میں تیمّم کرنا جائز ہے یا

نہیں؟اگر تیمم جائز نہ ہوتو پھر کیا کیا جائے؟قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جو پانی آپ کو ملتا ہے وہ اتنا کم ہو کہ اگر وضو میں استعمال کیا جائے تو ختم ہو جائے گا اور شدت پیاس کی وجہ سے ہلاکت کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں افسران بالا سے وضو کیلئے پانی مانگنا ضروری ہے، اگر وہ دینے سے انکار کردیں تو پھر تیمم کرنا جائز ہے۔

لمافی الهندية (۲۸/۱):وكذا اذا خاف العطش على نفسه أو رفيقه المخالط له أو آخر من اهل القافلة......

وفي الدر المختار (۲۳۲/۱):(من عجز)...... (عن استعمال الماء)...... (لبعده) ......صـ۲۳۴(او خوف عدو) (اوعطش) ......صـ۲۳۶(تيمم)

وفي الشامية (اوعطش)معطوف على عدو.اى لانه مشغول بحاجته والمشغول بالحاجة كالمعدوم.

وفي الدرالمختار (۲۵۰/۱): (ويطلبه) وجوبا على الظاهر من رفيقه (ممن هو معه فان منعه) ولو دلالة بأن إستهلكه (تيمم) لتحقق عجزه.

وفي الشامية (صـ۲۵۱):(من رفيقه)......ذكر الرفيق جرى مجرى العادة،والا فكل من حضر وقت الصلاة فحكمه كذلك رفيقا كان او غيره.

(۱۱۸) سردی کی وجہ سے تیمّم کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو غسل کی ضرورت ہے لیکن پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے غسل کرنا دشوار ہے جبکہ وہ وضو کرسکتا ہے تو کیا اس کیلئے شرعاً جائز ہے کہ وہ غسل کیلئے تیمم کرے اور وضو کر کے نماز پڑھ لے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر غسل کی ضرورت کے وقت سخت سردی کی وجہ سے غسل کرنا دشوار ہو بایں معنی کہ بیمار ہو جانے یا سخت نقصان کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔اور جائز ہونے کی صورت میں صرف تیمم کرے گا بعد میں وضو کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وضو اور تیمم دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

لمافي خلاصة الفتاوى (۳۸/۱):في الأصل الجنب والحائض والمحدث في التيمم سوآء ويجوز للمريض ان يتيمم في المصر اذا لم يستطع الوضوء او الغسل للمرض او يخاف على نفسه الهلاك بسبب استعمال الماء او يخاف تلف عضو من اعضائه وان كان لا يخاف الهلاك ولا تلف العضو ولكن يخاف زيادة المرض او ابطاء البرء يجوز التيمم عندنا ولو كان الماء لايضره ولكن لايمكنه استعمال الماء جاز له التيمم عندنا.

فی الهندية (۱/۲۸):ويجوز التيمم اذا خاف الجنب اذا اغتسل بالماء ان يقتله البرد او يمرضه هذا اذا كان خارج المصر اجماعاًفان كان في المصر فكذا عند ابي حنيفة خلافاًلهما والخلاف فيما اذا لم يجد ما يدخل به الحمام فان وجد لم يجز اجماعاًوفيما اذا لم يقدر على تسخين الماء فان قدر لم يجز .....

وفي الدر المختار (۱/۲۳۲):(من عجز)..... (عن استعمال الماء)..... (لبعده)..... (أو برد) يهلك الجنب أو يمرضه ولو في المصر اذا لم تكن له اجرة حمام ولا مايدفئه

وفي الشامية (ولا ما يدفئه).....قال في البحر:فصار الأصل أنه متى قدر على الاغتسال بوجه من الوجوه لا يباح له التيمم اجماعا.

(۱۱۹) سخت سردی کی حالت میں تیمّم کا شرعی حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایسی سخت سردی ہو جس میں پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو اس میں تیمم کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....سخت سردی کی حالت میں اگر ہلاکت یا عضو کے تلف ہونے کا، یا بیماری کی زیادتی کا قوی اندیشہ ہو اور گرم پانی یا ایسی کوئی چیز جس سے گرمی حاصل کر سکے بھی نہ ملے، تو تیمم کرنا جائز ہے۔

لمافي الهندية(۱/۲۸): ويجوز التيمم اذا خاف الجنب اذا اغتسل بالماء ان يقتله البرد أو يمرضه.

وفي الدر المختار (۱/۲۳۴) : أوبرد يهلك الجنب اويمرضه ولو في المصر اذا لم تكن له اجرة حمام ولا مايدفئه.

وفي الشامية (۱/۲۳۴): نعم مفاد التعليل بعدم تحقق الضرر في الوضوء عادة أنه لو تحقق جاز فيه ايضاً اتفاقاً ، ولذا مشى عليه في الامداد لان الحرج مد فوع بالنص.

(۱۲۰) نمازِ جنازہ کے فوت ہونے کے خوف سے تیمّم کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ ہو رہا ہے اگر وضو کرے تو نماز جنازہ نہ ملنے کا اندیشہ ہے اب وضو کرے یا تیمم؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں نماز جنازہ نہ ملنے کے خوف سے وہ تیمم کر سکتا ہے جبکہ امام یا ولی نہ ہو۔

لمافي الهندية(۱/۳۱): ويجوز التيمم اذا حضرته جنازة والولي غيره فخاف ان اشتغل بالطهارة ان

تفوته الصلاة ولا يجوز للولي وهو الصحيح هكذا في الهداية.

وفي الشامية(۱/۲۴۵): قوله بخلاف صلاة جنازة اى فان تيمما تجوزبه سائر الصلوات لكن عند فقد الماء وا ما عند وجوده اذا خاف فوتها فانما تجوزبه الصلاة على جنازة اخرى اذا لم يكن بينهما فاصل كمامر ولا يجوز به غيرها من الصلوات أفاده ح.

(۱۲۱) نمازِ جنازہ کیلئے تیمّم کرنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک دم سے جنازہ سامنے آجائے یا کہیں جنازہ کیلئے جانا ہواور وضو کی فرصت نہ ہو یعنی وضو میں مشغولیت کی وجہ سے نماز جنازہ نکل جانے کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں اگر بلا وضو جنازہ پڑھ لیں تو کیسا ہے؟ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ بلا وضو اگر کوئی سجدہ کرے تو کافر ہو جاتا ہے جبکہ نماز جنازہ میں سجدہ نہیں ہوتا، یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... بغیر وضو نماز جنازہ پڑھنا درست نہیں، جس طرح اور نمازوں کیلئے طہارت شرط ہے اسی طرح نماز جنازہ کیلئے بھی طہارت شرط ہے۔ البتہ اگر اچانک جنازہ سامنے آجائے یا جنازہ کیلئے جانا ہو اور وضو میں مشغول ہونے سے نماز جنازہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو تیمم کر کے نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں، بشرطیکہ تیمم کرنے والا امام یا میت کا ولی نہ ہو کیونکہ ان دونوں کیلئے ہر صورت میں وضو کرنا ہی ضروری ہوگا۔ اور اگر کسی نے بغیر وضو نماز (چاہے پنج وقتی نماز ہو، نفل ہوں یا نماز جنازہ) کی ادائیگی کی تو اگر مسئلے کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کیا یا لوگوں سے شرم کی وجہ سے تو ایسا شخص سخت گناہ گار ہوگا جس پر اسے توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے اور اگر کسی نے یہ فعل جان بوجھ کر اسے جائز وحلال سمجھتے ہوئے کیا تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

لمافي الروض الازهر(صـ۴٦٨):وفي الفتاوى الصغرى والجواهر :ومن صلى مع الإمام بجماعة بغير طهارة عمدا كفر ،وفيه ان قيدالجماعة مع الامام لا يظهر وجهه ثم الصلوة بغير طهارة معصية فلا ينبغي ان يقال بكفره الا إذا استحلها.....(وفي صـ۴٦٩) وفي التتمة من سجد أو صلى محدثا رياء كفر ، قيد أن قيد الرياء يفيد أنه إن صلى حياء لا يكفر واما اذا جمع بين الرياء وترك الطهارة فكانه غلظ المعصية ومع هذا لا يخلوا عن الشبهة لا سيما في السجدة المفردة حيث يتوهم كثيرون أنها تجوز من غير طهارة ......كذا إذا صلى بغير طهارة أو مع الثوب النجس يعني مع القدرة على الثوب الطاهر كفر يعني اذا استحل والا فلا شك انها معصية وانه كأنه ترك تلك الصلوة وبمجرد تركها لا يكفر.

وفي الهندية (۱/۳۱):ويجوز التيمم اذا حضرته جنازة والولي غيره فخاف ان اشتغل بالطهارة أن

تفوته الصلاة ولایجوز للولی هو الصحیح.

وفی الدر المختار (۱/۲۴۱): (و) جاز (لخوف فوت صلاة جنازة)

وفی الشامیة تحته ولو کان الماء قریبا.

(۱۲۲) عید کی نماز کیلئے تیمّم کی ایک صورت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب عید کی نماز پڑھنے عیدگاہ گئے نماز سے ذرا پہلے ان کا وضو ٹوٹ گیا، وہاں وضو کا کوئی انتظام نہیں، اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ تیمم کر کے نماز پڑھ لیں یا وضو کرنے کیلئے گھر جائیں، گھر جانے کی صورت میں نماز نکلنے کا اندیشہ ہے، یا عیدگاہ کے قریب جو گھر ہیں وہاں سے پانی مانگ کر وضو کر لے لیکن اس صورت میں غیر محرم سے بات چیت کرنی پڑتی ہے اور اس سے پانی لینا پڑتا ہے کیونکہ سب لوگ یہاں تک کہ بچے بھی نماز کیلئے عیدگاہ جاتے ہیں اور عیدگاہ میں یہ پوچھنا کہ قریب میں کس کا گھر ہے، جو وضو کیلئے پانی دے دے، یہ مشکل ہے؟ اب ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلی جواب عنایت فرمائیں؟۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں جب عیدگاہ میں پانی موجود نہ ہو تو اگر نماز میں اتنا وقت باقی ہو کہ پانی کے انتظام اور وضو سے فراغت تک نماز ملنے کی اُمید ہو تو پانی کے انتظام کی کوشش کرنی ضروری ہے، اور اگر پانی کا انتظام کر کے وضو کرنے میں نماز فوت ہونے یا نہ ملنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لیں۔

لمافی الدرالمختار (۱/۲۴۱): (و) جاز (لخوف فوت صلاة الجنازة) ...... (أو) فوت (عید) بفراغ امام اوزوال شمس (ولو) کان یبنی (بناء) بعد شروعه متوضأ وسبق حدثه (بلا فرق بین کونه اماما اولا) فی الاصح لان المناط خوف الفوت لا الی بدل.

وفی الشامیة: (لان المناط) ای الذی تعلق به الحکم المذکور و هو التیمم لخوف فوت الصلاة بلا بعد عن الماء.

وفی الخیریة (ص۵): فلا یجوز التیمم له مع وجود الماء الا فی موضع یخشی الفوات لا إلی خلف کصلوٰۃ الجنازۃ والعید.

(۱۲۳) پانی کی موجودگی میں تلاوت کیلئے تیمّم کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پانی کی موجودگی میں قرآن کریم کی تلاوت کیلئے تیمم کرنے سے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... بے وضو ہونے کی حالت میں قرآن کریم کو چھوئے بغیر صرف تلاوت کیلئے تیمم کرنا جائز ہے، اگرچہ پانی موجود ہو کیونکہ قرآن کریم کو ہاتھ لگائے بغیر تلاوت کرنا ان عبادات میں سے ہے کہ جن کیلئے اگر جنابت نہ ہو تو طہارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر، چھو کر تلاوت کیلئے باوضو ہونا ضروری ہے۔

لما فی الهندية(۱/۲۶):و لو تيمم لقراءة القرآن عن ظهر القلب أو عن المصحف أو لزيارة القبور أو لدفن الميت أو للأذان أو للإقامة أو لدخول المسجد أو لخروجه بأن دخل المسجد وهو متوضئ ثم أحدث أو لمس المصحف وصلى بذلك التيمم قال عامة العلماء لايجوز.

وفی الدر المختار(۱/۲۴۵): أنه يجوز لكل مالا تشترط الطهارة له ولو مع وجود الماء وأما ماتشترط له فيشترط فقد الماء كتيمم لمس مصحف فلا يجوز لواجد الماء وأما للقراءة فان محدثا فكالأول أو جنبا فكالثانی.

(۱۲۴) ٹرین میں پانی ختم ہوجائے تو تیمّم کرکے نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بسا اوقات دوران سفر ٹرین میں پانی نہیں ہوتا اور نماز کا وقت ختم ہو رہا ہوتا ہے اور اسٹیشن پر بھی بسا اوقات ٹرین بہت کم وقت کیلئے رکتی ہے جس میں پانی حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے اور بعض اوقات بڑے اسٹیشن بہت دور دور ہوتے ہیں اور عام پانی میسر نہیں ہوتا البتہ بوتل والا گھوم رہا ہوتا ہے، تو کیا ایسی حالت میں بوتل (پیپسی وغیرہ) سے وضو کرنا جائز ہوگا یا تیمم کرنا چاہئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں جب ٹرین کے کسی بھی ڈبے میں بالکل پانی نہ مل رہا ہو اور نماز کا وقت ختم ہو رہا ہو تو تیمم کرکے نماز ادا کی جائے گی اسی طرح جب پانی کے ایک میل تک ملنے کی امید نہ ہو تو اس وقت بھی تیمم کرکے نماز ادا کی جائے گی۔ باقی پیپسی وغیرہ جو مشروبات فروخت ہوتے ہیں یہ چونکہ ماء مطلق نہیں ہیں اس لئے ان سے وضو نہیں کیا جائے گا بلکہ تیمم کیا جائے گا ہاں اگر یہ امید ہو کہ مستحب وقت کے اندر اندر کسی اسٹیشن پر پہنچ کر پانی مل جائے تو اس وقت تک تاخیر کر لینا مستحب ہے۔

لما فی الدرالمختار (۱/۲۳۲): (من عجز) مبتداء خبره تيمم(عن استعمال الماء) المطلق الكافی لطهارته لصلاة تفوت الی خلف (لبعده) ولو مقيما فی المصر(ميلاً)...... (أو لمرض)

وفی الشامية (۱/۲۴۹): والحاصل انه اذا رجا الماء يؤخر الی آخر الوقت المستحب بحيث لايقع فی كراهة وان كان لايرجو الماء يصلی فی الوقت المستحب كوقت الاسفار فی الفجر والابراد فی ظهر الصيف ونحو ذلك.

(۱۲۵) چلتی ہوئی ریل سے چشمے تالاب وغیرہ دکھائی دینے سے تیمّم نہیں ٹوٹتا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ریل میں سفر کررہا ہو، اور اس نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمّم کیا ہو اور اثناء راہ میں چلتی ہوئی ریل سے اُسے پانی کا چشمہ یا تالاب وغیرہ دکھائی دیں تو کیا اس کا تیمم باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں چلتی ہوئی ریل سے چشمہ یا تالاب وغیرہ صرف دکھائی دینے سے تیمّم نہیں ٹوٹے گا، جب تک کہ اس پانی کے استعمال پر قدرت حاصل نہ ہو۔

لما في الهندية (١/٣٠): وان مر على الماء وهو في موضع لايستطيع النزول اليه لخوف عدو أوسبع لم ينتقض هكذا في السراج الوهاج...... المسافر اذا مر في الفلاة بماء موضوع في حب أونحوه لا ينتقض تيممه.

وفي الدر المختار (١/٢٥٦): والحاصل أن كل مايمنع وجوده التيمم نقض وجوده التيمم (ومالا) يمنع وجوده التيمم في الابتداء (فلا) ينقض وجوده بعد ذلك التيمم

وفي الشامية تحته: (قوله والحاصل) اراد به التنبيه على أن ذلك قاعدة كلية تغني عن ذكر قدرة الماء الكافي فافهم.

(۱۲۶) مقتدیوں کا امام سے بغیر کسی عذر شرعی کے ناراض ہونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کا ایک امام ہے جس کی عمر تقریباً پچاس سال ہے وہ اکثر بیمار رہتا ہے اس کی اولاد بھی صحیح نہیں ہے لوگ اس کو کہتے ہیں اپنی اولاد کو سمجھاؤ تو وہ کہتا ہے میرے سے زیادہ ہیں لوگ اس کو امامت سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ امامت چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہے اب بعض لوگ اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے آیا ایسے امام کی امامت صحیح ہے؟ اور اس کا روکنے کے باوجود امامت کرانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......امامت ایک عظیم الشان منصب ہے اس کی رعایت کرتے ہوئے امام کو ہر اس کام سے اجتناب کرنا چاہیے جو فتنہ وفساد اور مقتدیوں کی ناراضگی کا سبب بنے لہٰذا اپنے گھر والوں اور اولاد کی بھی نگرانی رکھے اور ان کی اصلاح کرتا رہے کہیں وہ گناہوں میں مبتلا اور نافرمان نہ ہوجائیں، لقوله تعالىٰ "قوا انفسكم واهليكم نارا" یعنی خود بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی جہنم سے بچاؤ، صورت مسئولہ میں امام صاحب کو اپنی اولاد کی فکر کرنی چاہیے اگر وہ سمجھانے کے باوجود نہ سمجھیں تو ان سے قطع تعلق کرنا (بشرطیکہ ان کے اس طرح سدھرنے کی امید ہو) بھی جائز ہے لیکن امام صاحب کا اکثر بیمار رہنا اور ان کی اولاد کا صحیح نہ ہونا، اگرچہ اس سے ان کی ذات میں شرعاً

قباحت لازم نہیں آتی جس کی وجہ سے ان کو امامت سے ہٹایا جائے اگر مقتدی ان افعال کی وجہ سے امام کو ہٹانا چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ان کیلئے ناجائز ہے اجتناب کرنا چاہیے البتہ امام کو اس منصب کا لحاظ کرتے ہوئے خود استعفیٰ دیدینا چاہیے کیونکہ وہ اکثر بیمار رہتے ہیں اگر وہ امامت سے استعفیٰ نہ دیں پھر بھی ان کے پیچھے نماز درست ہے۔

لمافي مرقاة المفاتيح (۳/۸۴): (وامام قوم) أى الامامة الكبرىٰ أو امامة الصلاة (وهم له) وفى نسخة لها أى الإمامة(كارهون) أى لمعنى مذموم فى الشرع وإن كرهوا لخلاف ذلك فالعيب عليهم ولا كراهته قال ابن الملك أى كارهون لبدعته أو فسقه أو جهله اما اذا كان بينه وبينهم كراهة وعداوة بسبب أمر دنيوى فلا يكون له هذا الحكم.

وفى التجنيس والمزيد (۲/۷): رجل أمّ قوماً وهم له كارهون فهذا على ثلاثة أوجه اما اذا كانت الكراهية لفساد فيه أو كانوا احق بالامامة منه أو هواحق بالامامة منهم ولا فساد فيه ومع هذا كرهوا فالاول والثانى مكروه هكذا روى الحسن البصريؒ عن اصحاب رسول الله ﷺ والثالث لا، لأن الجاهل والفاسق يكره العالم والصحيح، وهو الصحيح.

وفى الدر المختار(۱/۵۵۹): (ولو أمّ قوماً وهم له كارهون، إن) الكراهة (لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره) له ذلك تحريماً لحديث أبى داؤد "لايقبل الله صلاة من تقدم قوماً وهم له كارهون" (وإن هو أحق لا) والكراهة عليهم.

وفى فتح الملهم (۳/۵۲۸): تأديب الرجل ولده وإن كان كبيراً اذا تكلم بما لا ينبغى له وجواز التأديب بالهجران.

(۱۲۷) غسل خانے کی عدم موجودگی میں تیمّم کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کو غسل کی حاجت ہو اور وہ ایسے مقام پر ہو جہاں غسل کرنے کیلئے غسل خانے کا انتظام نہ ہو تو کیا وہ تیمم کر سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مذکورہ خاتون پر غسل واجب رہے گا لہٰذا اس کو چاہئے کہ پردہ لٹکا کر یا انہی کپڑوں میں یا کوئی اور مناسب طریقہ استعمال کرتے ہوئے غسل کرلے اور اگر غسل کرنے کی صورت میں بدن ضروری طور پر دوسرے کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور پردے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تو اگر اس خاتون کے اردگرد خواتین ہیں تو غسل کرلے اور اگر اس کے اردگرد صرف مرد یا مرد او خواتین دونوں ہیں تو مناسب انتظام نہ ہونے تک غسل میں تاخیر کرے۔

نیز غسل نہ کرنے کی صورت میں مناسب یہ ہے کہ تیمّم کرکے نماز ادا کرلے اور غسل کرنے کے بعد احتیاطاً نماز لوٹالے۔

لما فی سنن النسائی(۱/۴۶): عن يعلى ان رسول الله ﷺ رای رجلا يغتسل بالبراز فصعد المنبر فحمد الله واثنى عليه وقال ان الله عزوجل حليم حيى ستير يحب الحياء والستر فاذا اغتسل احدكم فليستتر.

وفی الدر المختار(۱/۱۵۵): والمرأة بين رجال أو رجال ونساء تؤخره لا بين نساء فقط...... وينبغی لها أن تتيمم وتصلی لعجزها شرعا عن الماء.

وفی الشامية (۱/۱۵۵): والأشبه الإعادة تفريعا على ظاهر المذهب فی الممنوع من إزالة الحدث بصنع العباد إذا تيمم وصلی اهـ.......... واستظهر الرحمتی عدم الإعادة، قال لأن العذر لم يأت من قبل المخلوق، فإن المانع لها الشرع والحياء وهما من الله تعالى.

﴿فصل فی النجاسات واحکام التطهیر﴾

(نجاسات کے احکام اور پاکی کا طریقہ)

(۱۲۸) چوتھائی کپڑے کے بقدر نجاست کا حکم اور چوتھائی سے مراد کیا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مفتی صاحب سے سنا ہے کہ اگر کسی جانور کے پیشاب کی چھینٹیں کپڑوں پر لگ جائیں تو اگر وہ نجاست ایک چوتھائی حصہ سے کم ہو تو وہ کپڑا ناپاک نہیں ہوگا اور ان کپڑوں میں پڑھی گئی نماز درست سمجھی جائیگی۔ اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک چوتھائی کی مقدار کیا ہے؟ اگر جانوروں کے بیچ میں کوئی شخص کھڑا ہو، اس دوران کسی جانور نے پیشاب کیا اور چھینٹیں اس کے پائنچوں پر لگ گئیں تو کیا وہ پاک ہے جبکہ وہ کم بھی ہیں؟ اور اگر وہ پاک ہے تو پھر اس حدیث کا کیا مفہوم ہوگا جس میں جانوروں کے پیشاب سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ((عن ابی هریرۃؓ ان رسول الله ﷺ قال استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه)) (دار قطنی ۱/۱۳۶)۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزاء خیر دے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب کسی حلال جانور کے پیشاب کی چھینٹیں چوتھائی کپڑوں سے کم پر لگ جائیں۔ (اور وہ کسی عذر کی بنا پر دھوئی نہ جاسکتی ہوں یا پھر نماز شروع کرنے کے بعد اس پر نظر پڑی ہو اور باجماعت نماز ملنے کی کہیں بھی امید نہ ہو۔ یا اسی طرح نماز کا وقت نکل رہا ہو) تو ان کپڑوں میں نماز ہو جائے گی۔ (اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی عذر نہ ہو اور مقدار ربع سے کم ہو تو اس کو دھونا افضل ہے۔ چاہے نماز توڑ کر ہی کیوں نہ ہو) (۲) چوتھائی کپڑے سے وہ حصہ مراد ہوگا کہ جہاں پر یہ نجاست لگی ہوئی ہو۔ مثلاً آستین پر اگر لگی ہوگی تو اسی کا چوتھائی مراد ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں پائنچے کا چوتھائی مراد ہے۔ (۳) قابل معافی سے مراد پاک ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ہے تو یہ نجاست ہی، مگر مذکورہ مسئلے میں نجاست وطہارت دونوں طرح کی احادیث آنے سے اس میں خفت پیدا ہوگئی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ سوال مذکور میں اس کی نجاست کی حدیث پیش کی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح دوسری جگہ اس کے (حلال جانور کا پیشاب) پینے تک کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا فقہائے کرام کے قاعدے کے مطابق جب کسی شئی کی نجاست اور طہارت دونوں پر احادیث وارد ہوں تو پھر اس صورت میں اس شئی کی نجاست میں تخفیف آجاتی ہے، جیسا کہ مذکورہ مسئلے میں ہوا۔

لما فی الصحیح للبخاری (۱/۳۵): (باب ماجاء فی غسل البول وقال النبی ﷺ لصاحب القبر کان لا یستتر من بوله ولم یذکر سوی بول الناس) ..... عن ابن عباس قال مر النبی ﷺ بقبرین فقال انهما لیعذبان وما یعذبان فی کبیر. اما أحدهما فکان لایستتر من البول.

وفيه ايضاً (۱/۳۶): (باب أبوال الإبل والدواب والغنم ومرابضها، وصلى ابو موسىٰ في دار البريد والسرقين والبرية إلى جنبه. فقال ههنا وثم سواءٌ)...... عن انسؓ قال قدم اناس من عكل أوعرينة فاجتوو المدينة، فأمرهم النبي ﷺ بلقاح وان يشربوا من ابوالها والبانها. الخ

وفي البحر الرائق (۱/۳۹۶): ومراده من العفو صحة الصلوة بدون ازالته لاعدم الكراهة..... وإن كانت اقل وقد دخل في الصلوة نظر ان كان في الوقت سعة فالأفضل ازالتها..... وان كان في آخر الوقت ..... يمضي على صلاته ولا يقطعها.

وفيه ايضاً (۱/۳۹۸): قال في الكافي ولا يظهر الاختلاف في غير الروث والخثي لثبوت الخلاف المذكور مع فقد تعارض النصين ثم على طرد أنه يثبت التخفيف عندهما بالتعارض، كما باختلاف المجتهدين تقع الحاجة الى الاعتذار لمحمدؒ عن قوله بطهارة بول الحيوان الماكول، ثم لايخفى أن المراد باختلاف العلماء المقتضي للتخفيف.

وفيه ايضاً (۱/۳۹۷): وحاصله، انه ان وردنص واحد بنجاسة شئ فهومغلظ. وان تعارض نصان في طهارته ونجاسته فهو مخفف عنده. و عندهما. ان اتفق العلماء على النجاسة فهو مغلظ، وإن اختلفوا فهو مخفف.

وفي الدرالمختار (۱/۳۲۱): (وعفي دون ربع) جميع بدن و(ثوب) ولو كبيرا هو المختار ذكر الحلبي، ورجحه في النهر على التقدير بربع المصاب كيد وكم، وان قال في الحقائق وعليه الفتوىٰ. (من) نجاسة (مخففة كبول مأكول) ومنه الفرس وطهره محمدؒ.

(۱۲۹) نجاست کتنی مقدار میں معاف ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں بھینسوں کے باڑے میں ملازمت کرتا ہوں چونکہ ہمیں ہروقت باڑے میں آنا جانا ہوتا ہے بعض اوقات کوئی بھینس پیشاب کردیتی ہے جس کے چھینٹے میرے کپڑوں پر بھی پڑجاتے ہیں تو کیا میں انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہوں جبکہ بار بار کپڑے تبدیل کرنے میں دشواری ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... حلال جانوروں کا پیشاب نجاست خفیفہ ہے اور نجاست خفیفہ اگر جسم یا کپڑے کے کسی حصے پر چوتھائی یا اس سے کم مقدار میں لگ جائے تو وہ معاف ہے اگر اس سے بڑھ جائے تو پھر معاف نہیں ہے تو اسی اصول کے تحت صورت مسئولہ میں دیکھا جائیگا کہ اگر چھینٹے کپڑوں کے چوتھائی حصے یا اس سے کم پر ہیں تو پھر گنجائش ہوگی کہ انہی کپڑوں میں نماز پڑھ لیں، لیکن اگر چھینٹے اتنی کثیر مقدار میں ہوں کہ چوتھائی حصے سے بڑھ جائیں تو پھر اس صورت میں ان کپڑوں میں نماز جائز نہیں ہے۔

لمافي السراجية(ص ۱۲): اذا اصابت النجاسة الغليظة الثوب أو البدن اكثر من قدر الدرهم الذى هو مثل الكف لايجوز وقدر الدرهم لا يضره بول ما يوكل لحمه لايضر مالم يفحش.

وفي الهندية(۱/۴٦):والثاني المخففة وعفي منها مادون ربع الثوب......وبول كبول مايوكل لحمه والفرس وخرء طير لايوكل مخفف هكذا في الكنز.

وفي الدر المختار(۱/۲۱۰): (وبول ماكول) اللحم (نجس) اى نجاسة مخففة وطهره عند محمد (ولايشرب) بوله (اصلا).

(۱۳۰) سوئے ہوئے آدمی کے لعاب کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سونے کی حالت میں جو لعاب منہ سے نکلتا ہے وہ پاک ہے یا ناپاک؟ اگر وہ لعاب کپڑوں کو لگ جائے تو کیا کپڑے اس سے ناپاک ہو جائیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سونے کی حالت میں جو منہ سے لعاب نکلتا ہے وہ پاک ہے، اگر وہ لعاب کپڑوں کو لگ جائے تو کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے۔

وفي الهندية(۱/۴٦): لعاب النائم طاهر سواء كان من الفم اومنبعثا من الجوف عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله وعليه الفتوىٰ.

وفي الدرالمختار مع رد المحتار(۱/۱۳۸): كماء فم النائم فانه طاهر مطلقاً به يفتى.

وفي الشامية تحته(۱/۱۳۸): (قوله مطلقاً) سواء كان من الرأس او من الجوف أصفر منتناً أو لا.

(۱۳۱) پرندوں کی بیٹ، مکھی اور مچھر کے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پرندے کی بیٹ، مکھی ومچھر کا خون کپڑوں پر لگ جائے تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......مکھی اور مچھر اور اس طرح ہر وہ چیز جس میں دم سائل (بہنے والا خون) نہ ہو، اس کا خون پاک ہے اگر کپڑوں پر لگ جائے تو اس سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے، اور وہ پرندے جو ماکول اللحم ہیں ان کی بیٹ پاک ہے سوائے مرغی، بطخ، مرغابی کی بیٹ کے کیونکہ وہ ناپاک ہے اور جو پرندے غیر ماکول اللحم ہیں اصح قول کے مطابق ان کی بیٹ نجاست خفیفہ ہے۔ لہٰذا اگر ربعِ ثوب (چوتھائی کپڑے) سے کم مقدار میں ہو تو معاف ہے اور اگر ربعِ ثوب سے زائد مقدار میں ہو تو اس کا دھونا ضروری ہے۔

وفي الخانية على هامش الهندية (۱/۱۹): (خرء) مايؤكل لحمه من الطيور طاهر الاماله رائحة

كريهة كخرء الدجاج والبط والاوزفهو نجس نجاسة غليظة.

وفي الهندية(۱/۴۶): وبول مايوكل لحمه والفرس وخرء طير لايوكل مخفف.......... وذرق مايوكل لحمه من الطير طاهر عندنا مثل الحمام والعصافير......ودم البق والبراغيث والقمل والكتان طاهر وان كثر.

وفي الدر المختار(۱/۳۱۹،۳۲۰): ودم سمک وقمل وبرغوث وبق وزادفي السراج وكتان.

(۱۳۲) چمگادڑ کے بول وبراز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چمگادڑ کے بول وبراز کا کیا حکم ہے؟ ہمارے محلے میں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ چمگادڑ کا بول وبراز پاک ہے۔

الجواب حامداًومصلیاً......مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے کہ چمگادڑ کا بول وبراز ضرورت کی وجہ سے پاک ہے۔

وفي التاتارخانية(۱/۲۹۰): وبول الخفاش وخرء ه ليس بشئي لانه لايستطاع الامتناع عنه.

وفي الدر على هامش الطحطاوي (۱/۱۵۹): بول الخفاش وخرء ه فطاهر.

وفي الشامية(۱/۳۱۸): بول الخفافيش وخرء هاليس بنجس لتعذر صيانة الثوب والاواني عنها.

(۱۳۳) پرندوں کی بیٹ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند دن قبل میں گلی سے گزر رہا تھا، کہ بجلی کے تار پر بیٹھے کوے نے میرے کپڑوں پر بیٹ کردی جس کا کچھ حصہ میرے سر پر بھی آیا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا میرے کپڑے اور سرنا پاک ہو گئے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......کوے کی بیٹ نجاست خفیفہ میں سے ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر چوتھائی کپڑے یا جس عضو پر لگی ہے اس کے چوتھائی سے کم ہواور اسی حالت میں نماز پڑھ لی جائے تو یہ نماز صحیح ہو جائے گی، اور اگر چوتھائی سے زیادہ ہو تو ان کپڑوں میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے چونکہ بیٹ وغیرہ عام طور پر ایک چوتھائی سے کم ہی ہوتی ہے لہٰذا اگر آپ نے اسی حالت میں نماز پڑھ لی تو لوٹانے کی ضرورت نہیں، البتہ نماز سے پہلے موقع ملنے کی صورت میں چوتھائی سے کم ہونے کے باوجود دھولینا چاہیے۔

لمافي الهندية (۱/۴۶):(والثاني المخففة)وعفي منها مادون ربع الثوب كذافي اكثر المتون، اختلفوا في كيفية اعتبار الربع قيل المعتبر ربع طرف اصابته النجاسة كالذيل والكم والدخريص ان كان المصاب ثوباًوربع العضو المصاب كاليد والرجل ان كان بدناًوصححه صاحب التحفة والمحيط والبدائع والمجتبى والسراج الوهاج وفي الحقائق وعليه الفتوى كذا في البحر الرائق.

وبول مایو کل لحمہ والفرس وخرء طیر لایوکل مخفف ھکذا فی الکنز.

(۱۳۴) مکھی نجاست پر بیٹھ کر کپڑوں پر بیٹھے تو کپڑے ناپاک ہوں گے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب انسان بیت الخلاء جاتا ہے تو وہاں پر موجود مکھیاں غلاظت پر بیٹھ کر انسان پر بیٹھتی ہیں اور میں نے سنا ہے کہ اس غلاظت کی تھوڑی سی مقدار بھی معاف نہیں اب کیا کیا جائے، میں تو اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی مکھی بیٹھ ہی جاتی ہے، تو کیا اس سے میرے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو بچنے کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جس نجاست کا آپ نے ذکر کیا یہ نجاست غلیظہ کہلاتی ہے، اور اس کی تھوڑی سی مقدار جو درہم کے برابر ہو (ہتھیلی کے درمیانی حصہ کے برابر) معاف ہے، اس سے زائد معاف نہیں، اور مکھیوں کے ذریعے جو نجاست انسان کے جسم پر لگتی ہے وہ اس سے کم ہوتی ہے لہٰذا اس سے کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے۔

لمافی الھندیۃ (۱/۴۷): ذباب المستراح اذا جلس علی ثوب لایفسدہ الا ان یغلب ویکثر.

(۱۳۵) ناپاک صابن کے استعمال کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل مشہور ہے کہ بعض وہ صابن جو غیر ملکی کمپنیاں بناتی ہیں، ان میں خنزیر کی چربی ملی ہوتی ہے تو کیا ایسے صابن کا استعمال کرنا جائز ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں عام استعمال کی اشیاء میں صرف سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے، البتہ اگر واقعی یہ بات تحقیق سے ثابت ہو تو بھی صابن میں انقلاب حقیقت کی بناء پر اس کا استعمال جائز لیکن خلاف اولیٰ ہے لہٰذا اگر کوئی ضرورت شدیدہ نہ ہو تو استعمال سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

وفی الدرالمختار (۱/۳۱۵): (و)یطھر (زیت)تنجس (بجعلہ صابونا)بہ یفتی للبلوی کتنور رش بماء نجس لا بأس بالخبز فیہ.

وفی الشامیۃ(۱/۳۱۶) :جعل الدھن النجس فی صابون یفتی بطھارتہ لانہ تغیر والتغیر یطھر عند محمد ویفتی بہ للبلوی.

(۱۳۶) ٹینکی میں مینڈک گرنے سے ٹینکی ناپاک نہیں ہوگی

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گھروں میں جو ٹینکی وغیرہ بنائی جاتی ہے، اس میں بعض دفعہ

مینڈک وغیرہ گرجاتے ہیں اوراس پانی میں زندہ رہتے ہیں، کیااس سے پانی ناپاک ہوجاتا ہے؟اوراگرناپاک ہوجائے تو پاکی کی صورت کیاہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....ٹینکی میں مینڈک گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔بشرطیکہ اس پرکوئی نجاست وغیرہ نہ لگی ہو۔

لمافی الهندیة (۲۴/۱):وموت مایعیش فی الماء فیه لا یفسده کا لسمک والضفدع والسرطان وفی غیر الماء قیل غیر السمک یفسده وقیل لا وهوالاصح والضفدع البحری والبری سواء کذا فی الهدایة ..... ولا فرق فی الصحیح بین ان یموت فی الماء اوخارج الماء ثم یلقی فیه کذا فی التبیین ویستوی الجواب بین المتفسخ وغیره الاانه یکره شرب الماء لانه لا یخلو عن اجزائه وهو غیر ماکول کذا فی محیط السرخسی.

وفی الدرالمختار (۱۸۴/۱، ۱۸۵): (ومائی مولد) ولو کلب الماء وخنزیره (کسمک وسرطان) وضفدع الا بریا له دم سائل وهو مالا سترة له بین اصابعه فیفسد فی الاصح کحیة بریة ان لها دم والا لا.

وفی الشامیة (فیفسد فی الاصح)وعلیه فما جزم به فی الهدایة من عدم الافساد بالضفدع البری وصححه فی السراج محمول علی ما لادم له سائل کما فی البحر والنهر.

(۱۳۷) قربانی کی کھالوں پر لگے خون کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کے بعد کھالوں پر جوخون لگا ہوا ہوتا ہے اس میں بعض تو گوشت کا خون ہوتا ہے اور بعض دم مسفوح ہوتا ہے ان دونوں کا حکم ایک ہے یا الگ الگ، برتقدیرِ ثانی وجہ فرق کیا ہے؟ حالانکہ خون تو نجس ہوتا ہے، اور علماء کرام دم مسفوح کے علاوہ مثلاً گوشت کے خون کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر کپڑوں کو لگ جائے تو اسی میں نماز ادا کرلو نماز ہوجاتی ہے اور یہ قول بقرعید کے موقع پر فرمایا جاتا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ لہٰذا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....ان دونوں خونوں کا حکم الگ الگ ہے ہر خون نجس نہیں، نجس خون صرف دم مسفوح ہے جیسا کہ منصوص ہے دما مسفوحا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو دم مسفوح نہیں وہ نجس نہیں۔حدیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "احلّت لنا میتتان ودمان المیتتان الحوت والجراد والدمان الکبد والطحال " کہ ہمارے لئے دو مردہ اور دو خون حلال کئے گئے ہیں، مچھلی اور ٹڈی، جگر اور تلی۔یہ دونوں خون جامد ہیں، دم مسفوح نہیں ہیں۔ان کو جائز قرار دیا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر خون نجس نہیں بلکہ دم مسفوح نجس ہے لہٰذا جو گوشت کا خون ہے یا ذبح کے بعد رگوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ نجس نہیں لیکن احتراز اس سے بھی بہتر ہے۔

لمافی الکلام المجید(الانعام:۱۴۵): قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمه الا ان

يكون ميتة او دما مسفوحا او لحم خنزير فانه رجس او فسقا اهل لغير الله به فمن اضطر غير باغ ولا عاد فان ربك غفور رحيم.

وفي مشكاة المصابيح (صـ ۳۶۱) : عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله ﷺ احلت لنا ميتتان ودمان الميتتان، الحوت والجراد والدمان الكبد والطحال.

وفي الهندية (۴۶/۱): وما يبقى من الدم في عروق المذكاة بعد الذبح لا يفسد الثوب وان فحش كذا في فتاوى قاضيخان، وكذا الدم الذي يبقى في اللحم لانه ليس بمسفوح هكذا في محيط السرخسي.

وفي الدر المختار (۳۱۹/۱): (ودم) مسفوح من سائر الحيوانات الادم شهيد مادام عليه وما بقي في لحم مهزول وعروق وكبد وطحال وقلب ومالم يسل ودم سمك.

(۱۳۸) کھانے پینے کی چیز میں ناک کا پانی گر جائے تو اس کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل سردی کا زمانہ ہے نزلہ کھانسی معمول بن چکا ہے مجھے بھی تین چار روز سے زکام ہے آج صبح میں ناشتہ کررہا تھا چائے کا کپ میرے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ناک سے پانی بہہ رہا تھا تو ایک قطرہ کپ میں گر گیا، میں نے وہ چائے گرادی تو بھائی نے کہا اس سے چائے ناپاک نہیں ہوتی تو کیا ناک سے نکلنے والا پانی پاک ہے اگر یہ کسی چیز میں شامل ہو جائے تو اس کا پینا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ناک سے نکلنے والا پانی پاک ہے۔ اگر کسی کھانے یا پینے والی چیز میں گر جائے تو اس سے کھانے یا پینے کی چیز ناپاک نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے بھائی کا پاک بتلانا درست ہے۔ البتہ طبعاً ناپسند ہونے کی وجہ سے اس کا نہ پینا علیحدہ بات ہے۔

لما في الهندية (۳۳۹/۵): ويجوز اكل مرقة يقع فيها عرق الادمي او نخامته او دمعه وكذا الماء اذا غلب وصار مستقذرا طبعا. كذا في القنية.

وفي الشامية (۳۰۵/۱): (قوله وكذا كل ما يخرج لوجع الخ) ظاهره يعم الانف اذا زكم لكن صرحوا بأن ماء فم النائم طاهر ولو منتنا فتأمل.

(۱۳۹) بلی کا کسی برتن وغیرہ میں پاؤں ڈالنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر میں ایک دن بالٹی میں دودھ رکھا ہوا تھا بلی

نے پینے کی کوشش کی لیکن منہ دودھ تک نہیں پہنچ رہا تھا تو اس نے ایک تدبیر اختیار کی کہ اپنا پاؤں دودھ میں ڈبو کر اس کو چاٹ لیتی پھر دوبارہ داخل کر کے چاٹ لیتی اب اس دودھ کا کیا حکم ہوگا اس کو پینے یا کسی دوسرے استعمال میں لانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ مسئلہ میں اگر کسی کو یقینی طور پر یہ بات معلوم ہے کہ بلی کے منہ میں یا پاؤں پر ظاہری نجاست لگی ہوئی ہے، اور وہ اپنے پاؤں کو دودھ کی بالٹی میں ڈبو کر پھر اپنے پاؤں کو چاٹتی ہے تو اس سے بالٹی میں موجود دودھ سب نجس اور ناپاک ہو جاتا ہے، اُس کا استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی کو نجاست کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہیں ہے، بلکہ شک ہو، اگر اس دودھ کے مقابلے میں کوئی اور دودھ موجود ہو، تو اُس کا استعمال نہ کرنا افضل ہے۔ اگر کسی نے استعمال کرلیا تو یہ جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں ہے۔

لمافي الفقه الاسلامي وادلته(۲۸۲/۱): سور طاهر مكروه تنزيهاً استعماله مع وجود غيره. وهو سؤر الهرة والدجاجة المخلاة الخ. مالم تر النجاسة في فمها، لأنها تلازم التطواف في المنازل، أو للضرورة وعدم إمكان الاحتراز منها.

وفيه ايضاً(۲۸۵/۱): وسؤر ما يستعمل النجاسة: كالهرة والفأرة، فإن رئي في أفواهها نجاسة كان كالماء الذي خالطته النجاسة، فإن تحقق طهارة أفواهها، فطاهر.

وإن لم يعلم فيغتفر ما يعسر التحرز عنه، لكنه مكروه، وفي تنجيس مايتحرز منه قولان ارجحهما: القول بالطهارة.

(۱۴۰) وضو کے پانی میں چیونٹی کا مر جانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے وضو کرنے کیلئے لوٹا بھر کر رکھا اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی میں ادھر چلا گیا واپس آیا تو اس پانی میں چیونٹیاں مری ہوئی تھیں میں نے ان کو نکال کر اسی پانی سے وضو کر لیا بعد میں ایک صاحب سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ فرمانے لگے جس پانی میں کوئی چیز مر جائے وہ ناپاک ہو جاتا ہے اس سے وضو کرنا جائز نہیں۔ تو کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟ اور کیا میرا وضو صحیح ہو گیا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... پانی یا دیگر مائعات میں اگر کوئی ایسی چیز گر کر مر جائے جس میں بہنے والا خون نہ ہو تو اس سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ اس سے وضو وغیرہ کرنا صحیح ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کا وضو درست ہے۔

لمافي حاشية الطحطاوي على الدر(۱۰۴/۱): اذ ثبت الحكم في الذباب ثبت في غيره مما هو بمعناه كالبق والزنابير...... والنمل.

وفي الدر المختار(۱۸۳/۱): (ويجوز) رفع الحدث (بما ذكر وان مات فيه) اى الماء ولو قليلا (غير دموي كزنبور) وعقرب.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/ ۲۸۹): لاینجس البئر بموت حیوان لادم له سائل کذباب وصرصور ونحوه.

(۱۴۱) گھی میں مینگنیاں گر جانے سے گھی کی ناپاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک دن گھی کا ڈبہ کمرے میں رکھا لیکن ڈھکن بند کرنا بھول گیا ایک دودن بعد میں نے دیکھا تو اس میں چوہے کی دوتین مینگنیاں گری ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو اسی وقت نکال دیا۔ آیا یہ گھی نجس ہے یا نہیں؟ اس کا کھانا اور دیگر ضروریات کیلئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اگر گھی جامد تھا تو مینگنیاں نکال کر اور اس کے اردگرد موجود گھی نکال لینے کے بعد اس بقیہ گھی کا استعمال درست ہے۔ اور اگر گھی سیال (بہنے والا) تھا تو بہتر یہ ہے کہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ البتہ بعض اہل فتویٰ نے ضرورت کی بنا پر اس کے استعمال کی اجازت بھی دی ہے۔ بشرطیکہ گھی کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہو۔

لمافی الدر (۱/ ۳۱۸، ۳۱۹):وبول غیر مأکول ولو من صغیر لم یطعم إلا بول الخفاش وخرأه فطاهر وکذا بول الفأرة لتعذر التحرز عنه وعلیه الفتویٰ، فی الرد: قوله وکذا بول الفأرة: إعلم: أنه ذکر فی الخانیة أن بول الهرة والفأرة وخرأها نجس فی أظهر الروایات یفسد الماء والثوب ولو طحن بعر الفأرة مع الحنطة ولم یظهر أثره یعفی عنه للضرورة. وفی الخلاصة: اذا بالت الهرة فی الإناء أو علی الثوب تنجس وکذا بول الفأرة، وقال الفقیه أبو جعفر: ینجس الإناء دون الثوب. قال فی الفتح وهو حسن لعادة تخمیر الأوانی وبول الفأرة فی روایة لا بأس به، والمشائخ علی أنه نجس لخفة الحاجة بخلاف خرأها فان فیه ضرورة فی الحنطة: والحاصل : أن ظاهر الروایة نجاسة الکل، لکن الضرورة متحققة فی بول الهرة فی غیر المائعات کالثیاب وکذا فی خرء الفأرة فی نحو الحنطة دون الثیاب والمائعات) وأما بول الفأرة فالضرورة فیه غیر متحققة الاعلی تلک الروایة المارة التی ذکرها الشارح أن علیها الفتوی، لکن عبارة التاتارخانیة بول الفأرة وخرءها نجس وقیل بولها معفوعنه وعلیه الفتوی. وفی الحجة الصحیح أنه نجس، ولفظ الفتوی وإن کان آکد من لفظ الصحیح إلا ان القول الثانی هنا تأید بکونه ظاهر الروایة فافهم، ولکن تقدم فی فصل البئر ان الاصح أنه لا ینجسه.

وفیه ایضاً(ص ۲۲۰) فی فصل البئر:فی الدر: ولا نزح فی بول الفأرة فی الاصح فیض،

فی الرد: قوله فی بول الفأرة فی الاصح وسیذکر فی الانجاس أن علیه الفتوی، وأن خرأها لا یفسد

مالم يظهر أثره...... أقول وفي الخانية أن بول الهرة والفأرة وخرأهما نجس في أظهر الروايات يفسد الماء والثوب ولعلهم رجحوا القول بالعفو للضرورة.

(۱۴۲) خنزیر کی چربی سے بنے ہوئے صابن کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو صابن یورپ سے آتے ہیں تو ان میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہوتی ہے تو ایسے صابن سے غسل کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایسے صابن جن میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، ان کا استعمال غسل میں جائز ہے، کیونکہ جب ایک چیز کی حقیقت بدل جائے تو اُس کا حکم بھی بدل جاتا ہے۔ تاہم ایسے صابن جن میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، استعمال نہ کرنا بہتر ہے۔

وفي رد المحتار (۳۱٦/۱): جعل الدهن النجس في الصابون يفتى بطهارته لانه تغير والتغير يطهر عند محمدؒ ويفتى به للبلوى. وظاهره أن دهن الميتة كذلك...... ثم اعلم ان العلة عند محمدؒ هي التغير وانقلاب الحقيقة وأنه يفتى به للبلوى.

وفي الدر المختار (۳۲٦/۱): (و) لا (ملح كان حمارا) أو خنزيرا ولا قذر وقع في بئر فصار حمأة لانقلاب العين، به يفتى.

وفي الشامية تحته: (قوله لانقلاب العين) علة للكل وهذا قول محمد...... وكثير من المشايخ اختاروه، وهو المختار لأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة وتنتفي الحقيقة بانتفاء بعض أجزاء مفهومها فكيف بالكل؟ فان الملح غير العظم واللحم، فاذا صار ملحا ترتب حكم الملح، ونظيره في الشرع النطفة نجسة وتصير علقة وهي نجسة وتصير مضغة فتطهر، والعصير طاهر، فيصير خمراً فينجس ويصير خلا فيطهر، فعرفنا أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها.

(۱۴۳) نجاست کے اوپر پڑی گرد وغبار اگر کپڑوں پر لگ جائے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نجاست کے اوپر جو گرد وغبار ہے اگر وہ بدن یا کپڑے پر لگ جائے تو کیا اس سے بدن اور کپڑے ناپاک ہوتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر اس گرد وغبار کے کپڑوں پر لگنے سے کپڑوں میں اس نجاست کا اثر وغیرہ ظاہر ہو جائے تو پھر کپڑے ناپاک ہوں گے ورنہ نہیں۔

لمافي قاضي خان(۱۳/۱): السرقين الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوبا لايتنجس مالم ير فيه أثر النجاسة ولو مرّ الريح على النجاسات وثمه ثوب مبلول معلق يصيبه الريح قيل بأنه يتنجس.

وفي الهندية(۱/۴۷): السرقين الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوبا لايتنجس مالم يرفيه اثر النجاسة هكذا في فتاویٰ قاضي خان: إذا مرت الريح بالعذرات وأصابت الثوب المبلول يتنجس إن وجدت رائحة النجاسة وما يصيب الثوب من بخارات النجاسات لايتنجس بها وهو الصحيح.

(۱۴۴) غلہ گاہتے وقت بیلوں کے پیشاب کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلہ گاہنے کے وقت یعنی جب اس پر بیلوں کو چلاتے ہیں اگر بیل غلہ پر پیشاب کردے تو کیا وہ معاف ہے یعنی غلہ اس سے ناپاک ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......دیکھا جائے گا کہ اگر گندم کو تقسیم کرلیا گیا یا گندم کسی کو ہبہ کردی گئی یا گندم کی بیع کردی گئی یا اس کو کھالیا گیا ہو، ان تمام صورتوں میں گندم کی پاکی کا حکم لگایا جائے گا اور اگر گندم کے بعض حصہ کو اندازے سے دھولیا گیا تو بھی کل گندم کی طہارت کا حکم لگایا جائے گا ضرورت اور رفع حاجت کو ملحوظ رکھتے ہوئے البتہ احوط یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو تمام گندم کو دھولیا جائے یا معین جگہ پر پیشاب نظر آئے تو اس کو دھولیا جائے۔

وفي التاتارخانية(۱/۳۲۱،۳۲۲): ونقل عن الشيخ المعروف بخواهرزاده اذا غسل موضعا بلا تحري يطهر وفي الخلاصة والنصاب هو المختار وفي الذخيره ونظير هذه المسئلة الحنطة التي تداس بالحمر فتبول وتروث ويصب بعض الحنطة ويختلط ماأصيب منها بغيرها. قالوا: لوعزل بعضها وغسل ثم خلط الكل ابيح تناولها وكذالك لوعزل بعضها ووهبها من انسان اوتصدق به حل له تناول البقية.

وفي الدر المختار(۱/۳۲۸):(كمالوبال حمر)خصها لتغليظ بولها اتفاقا(على)نحو (حنطة تدوسهافقسم وغسل بعضه) او ذهب بهبة اواكل اوبيع (حيث يطهر الباقي وكذا الذاهب لاحتمال وقوع النجاسةفي كل طرف.

(۱۴۵) ناپاک چیز پانی میں گرنے کے بعد اس پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ناپاک چیز پانی میں گرے اور اس کے گرنے سے

چھینٹیں اُڑ کر کسی پر جا پڑیں تو کیا وہ پاک ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر نجاست کا اثر چھینٹوں میں ظاہر ہو جائے، تو وہ ناپاک ہو جائیں گی ورنہ پاک رہیں گی۔

لمافي الهندية(۱/۴۷): حمار بال في الماء فأصاب من ذلك الرشاش ثوب انسان لا يمنع جواز الصلاة وان كثر حتىٰ يستيقن انه بول وكذا لو رميت العذرة في الماء فخرج منها رشاش فأصاب ثوبا ان ظهر أثرها فيه يتنجس والا فلا هذا هو المختار وبه أخذ الفقيه ابو الليث سواء كان الماء جاريا أو راكداً.

وفي ردالمحتار(۱/۳۲۵): وفي الخانية ماء الطابق نجس قياساً لا استحسانا: وصورته: اذا أحرقت العذرة في بيت فأصاب ماء الطابق ثوب انسان لا يفسده استحسانا مالم يظهر أثر النجاسة فيه.

(۱۴۶) راستوں کی کیچڑ اور ناپاک پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ راستوں کی کیچڑ اور ناپاک پانی کی چھینٹوں کا کپڑے اور بدن پر لگنے سے بدن اور کپڑے ناپاک ہوتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....راستوں میں چلتے ہوئے عموماً جو ناپاک پانی کے چھینٹے اور کیچڑ وغیرہ کپڑوں یا بدن پر لگ جاتے ہیں اس میں بوجہ عموم بلوی اور دفع حرج کے حضرات فقہاء کرام نے گنجائش لکھی ہے کہ ان سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے البتہ اگر کوئی ایسی نجاست لگ جائے جو نظر آ رہی ہو یا ظن غالب ہو کہ اس کو نجاست لگی ہے تو ایسی صورت میں دھونا ضروری ہوگا۔ نیز یاد رہے کہ یہ جواز کی صورت اس وقت ہے جب ضرورت شدیدہ ہو ورنہ عدم ضرورت شدیدہ کے وقت ایسا نہ کرنا چاہئے بلکہ احتیاط کرنی چاہئے۔

لمافي التاتارخانية(۱/۲۸۸): روى المعلى عن محمد رحمه الله انه قال الروث لايمنع جواز الصلوٰة وان كان كثيرا فاحشا قيل هذا آخر أقواله ورجع الى هذا القول حين جاء مع الخليفة الى الرى ورأى اسواقهم وسككهم مملوءة من الأوراث فرجع الى هذا القول دفعا للبلوى قال مشايخنا على قياس هذه الرواية طين بخارا لايمنع جواز الصلوٰة وان كان كثيرا فاحشا مع أن التراب مخلوطا بالعذرات دفعا للبلوى وفي الفتاوىٰ العتابيه مالم يرعين النجاسة.

وفي الشامية(۱/۳۲۴) (قوله وطين شارع) مبتدأخبره قوله عفو والشارع الطريق ط وفي الفيض: طين الشوارع عفو وان ملأ الثوب للضرورة ولو مختلطا بالعذرات وتجوز الصلاة معه وقدمنا ان هذا قاسه المشايخ على قول محمد آخر بطهارة الروث والخثي ومقتضاه انه طاهر لكن لم يقبله الامام الحلواني كما في الخلاصة، قال في الحلية اى لايقبل كونه طاهراً وهومتجه بل اشبه المنع

بالقدر الفاحش منه الالمن ابتلی به بحیث یجئ ویذهب فی ایام الأوحال فی بلادنا الشامیة لعدم انفکاک طرقها من النجاسة غالبا مع عسر الاحتراز بخلاف من لایمربها اصلا فی هذه الحالة فلا یعفی فی حقه حتی ان هذا لایصلی فی ثوب ذاک اهـ أقول والعفو مقید بما اذا لم یظهر فیه أثر النجاسة کما نقله فی الفتح عن التجنیس ...... (والحاصل ان الذی ینبغی انه حیث کان العفو للضرورة وعدم امکان الاحتراز ان یقال بالعفو ان غلبت فیها النجاسة مالم یر عینها لو اصابها بلا قصد وکان من یذهب ویجئ والافلاضرورة) وقد حکی فی القنیة ایضا قولین فیما لو ابتلت قدماه ممارش فی الاسواق الغالبة النجاسة ثم نقل انه لو أصاب توبه طین السوق أو السکة ثم وقع الثوب فی الماء تنجس.

(۱۴۷) شیرخوار بچے کی قے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چھوٹے شیرخوار بچے کی قے پاک ہے یا ناپاک؟ اگر ناپاک ہے تو غلیظہ ہے یا خفیفہ؟

الجواب حامداًومصلیاً......اگر شیرخوار بچہ قے منہ بھر کر کرے تو وہ ناپاک ہوگی اور نجاست غلیظہ ہوگی اور اگر منہ بھر کر نہ ہو تو ناپاک نہیں ہوگی۔

وفی الهندیة(۱/۴۵): الصبی اذا قاء علی ثدی الام ثم مص الثدی مراراً یطهر.

وفی تنویر الابصار مع الدر(۱/۱۳۷): (و) ینقضه (قیء ملأ فاه) ...... (من مرة أو علق أو طعام أو ماء) اذا وصل الی معدته وإن لم یستقر وهو نجس مغلظ ولو من صبی ساعة ارتضاعه هو الصحیح لمخالطة النجاسة. ذکره الحلبی.

(۱۴۸) نجس گوشت کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کلو گوشت لے کر آیا کہ رات کے وقت پکا کر کھائیں گے میں نے اس کو چارپائی کے نیچے رکھ دیا تاکہ خراب نہ ہو جائے، ہوا لگتی رہے چارپائی کے اوپر میرا ایک چھوٹا بچہ سورہا تھا اس نے پیشاب کر دیا وہ نیچے گوشت میں گرا جس کی وجہ سے گوشت نجس ہو گیا اب اس گوشت کو پاک کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر پاک ہو سکتا ہے تو پاک کرنے کا طریقہ بیان فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......نجاست جو خشک ہونے کے بعد نظر نہ آتی ہو، جیسے پیشاب وغیرہ وہ نجاست غیر مرئی کہلاتی ہے اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو دھویا جائے یہاں تک کہ دھونے والے کا دل مطمئن ہو جائے اور یہ عموماً تین مرتبہ دھونے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا

صورت مسئولہ میں گوشت کو تین مرتبہ دھولیا جائے اور ہر مرتبہ اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ گوشت سے پانی کے قطرات ٹپکنا بند ہو جائیں تو گوشت پاک ہو جائے گا۔

لمافی الفتاویٰ الولوالجیة(۱/۴۳): رجل علی یده نجاسة رطبة فجعل یضع یده علی عروة القمقمة کلماصبت الماء علی الید فاذا غسل ثلاث مرات طهرت العروة مع طهارة الید لان نجاستها بنجاسة الید فطهارتها بطهارة الید.

وفی التاتارخانیة(۱/۳۰۶): (وان کانت غیر مرئیة) کالبول والخمر ذکر فی الاصل وقال: یغسلها ثلاث مرات ویعصر فی کل مرة فقد شرط الغسل ثلاث مرات وشرط العصر فی کل مرة...... وفی القدوری ومالم یکن مرئیة فالطهارة موکولة الی غلبة الظن وقدرنا بالثلاث ...... الا قوله ثم التقدیر لیس بلازم عندنا بالثلاث بل هو مفوض الی اجتهاده ان کان غالب ظنه انها تزول بما دون الثلاث یحکم بطهارته.

وفی الدر المختار(۱/۳۳۴): ویطهر لبن وعسل ودبس ودهن یغلی ثلاثا ولحم طبخ بخمر یغلی وتبرید ثلاثا.

(قوله ولحم طبخ الخ) فی الظهیریة ولو صبت الخمرة فی قدر فیها لحم ان کان قبل الغلیان یطهر اللحم بالغسل ثلاثا وان بعده فلا.

(۱۴۹) بچوں کے پیشاب کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ چھوٹے بچوں کا پیشاب پاک ہے اگر کپڑوں کو لگ جائے تو کپڑے ناپاک نہیں ہوتے انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے تو کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... پیشاب علی الاطلاق نجاست مغلظہ میں سے ہے، چاہے بچوں کا ہو یا بڑوں کا ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ بقدر ایک درہم (ہتھیلی کی گہرائی کے بقدر) یا اس سے کم کپڑوں پر لگ جائے اور اس کے ساتھ نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی البتہ معلوم ہو جانے پر اس کو بھی دھو کر نماز پڑھی جائے اور بقدر ایک درہم سے زیادہ کپڑوں پر لگ جائے تو اس کے ساتھ نماز پڑھ لینے سے نماز ہی درست نہ ہوگی۔

لمافی الهندیة (۱/۴۶): کل مایخرج من بدن الانسان مما یوجب خروجه الوضوء أو الغسل فهو مغلظ کالغائط والبول والمنی والمذی والودی والقیح والصدید والقی اذا ملأ الفم کذا فی البحر

الرائق ......وكذلك بول الصغير والصغيرة أكلا أو لا كذا في الاختيار.

وفي المراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي(۱۲۳/۱): (قوله وبول مالا يؤكل لحمه) شمل بول الحية فانه مغلظ...... (قوله ولو رضيعا) ولو رضيعاً لم يطعم سواء كان ذكراً أو انثى.

(۱۵۰) ٹینکی میں چھپکلی گرجائے تو پانی کا کیا حکم ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گھر کی ٹینکی میں چھپکلی گرجائے تو کیا پانی ناپاک ہوجائے گا؟ نیز اگر گرکر مر بھی جائے تو پھر صفائی کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں چھپکلی کے ٹینکی میں گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔یہی حکم مرنے کی صورت میں بھی ہے۔

لما في الهندية (۲۴/۱): وموت ما ليس له نفس سائلة في الماء لا ينجسه كالبق والذباب والزنابير والعقارب ونحوها.

وفي الدر المختار (۱۸۳/۱): (ويجوز) رفع الحدث (بما ذكر وان مات فيه) اى الماء ولو قليلا (غير دموى كزنبور) وعقرب وبق

وفي الشامية (غير دموى) المراد مالا دم له سائل لما في القهستاني ان المعتبر عدم السيلان لا عدم اصله حتى لو وجد حيوان له دم جامد لا ينجس.

(۱۵۱) اچار میں چوہیا مرجانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ گھروں میں اچار بناتے ہیں میرے گھر میں اچار کا ایک ڈبہ رکھا ہوا تھا اس میں کسی طرح چوہیا چلی گئی وہ اس ڈبے کے اندر مرچکی ہے اب اس اچار کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ ہم نے اس پر کافی خرچہ کیا ہوا ہے اور محنت بھی خوب کی ہے اس کے کھانے کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... سیال چیز میں اگر کوئی نجاست گرجائے تو وہ پورا کا پورا نجس ہوجاتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اچار بھی سیال چیز ہے اور اس میں چوہیا گرجانے کی صورت میں سارا اچار نجس ہوجائے گا۔

لما في فتح القدير مع شرح العناية (۸۴/۱): (ولانه لادم فيها) اى في هذه الحيوانات اذا لدموى لا يسكن الماء والدم هو المنجس) واذا مات (في غير الماء) كالخل والعصير والحليب ونحوها.

وفي فتح القدير (۸۳/۱): وموت ماليس له نفس سائلة في الماء لا ينجسه كالبق الخ ولان المنجس هو اختلاط الدم المسفوح باجزائه عند الموت الخ، كل طعام وشراب وقعت فيه دابة ليس لهادم

فماتت فيه فهو حلال اكله وشربه ووضوءه.

وفي الهندية (۱/۲۵): في جامع الجوامع اذا تنجس الماء القليل بوقوع النجاسة فيه ان تغيرت اوصافه لا ينتفع به من كل وجه.

وفي الدر المختار (۱/۱۸۵): (وينجس) الماء القليل (بموت مائي معاش بري مولد) في الاصح (كبط واوز) الخ.

(۱۵۲) گھی میں چوہا گرجائے تو گھی کی ناپاکی کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں گھی کا ڈبہ پڑا ہوا تھا کہ رات کو کہیں سے چوہا آ کر اس میں گر گیا اور چوہا بھی خاصا بڑا ہے اور گرنے کے بعد صبح کے وقت اس میں مرا ہوا تھا، اس نے اپنے طور پر نکلنے کی کوشش کی ہوگی جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوا لہٰذا کچھ خون بھی گھی پر لگا ہوا ہے، کیا یہ سارا گھی ناپاک ہوگیا؟! اگر یہ ناپاک ہوگیا ہو تو اس کو کہاں استعمال کر سکتے ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اگر گھی جامد ہو تو چوہے کے اردگرد اور جہاں خون لگا ہوا ہو، اسے ہٹا کر باقی گھی کا استعمال جائز ہے، ہاں اگر گھی مائع (پگھلا ہوا) ہو تو پھر سارا گھی ناپاک ہوگیا، اور ایسے گھی کو کھانے کے علاوہ دیگر استعمالات میں لا سکتے ہیں جیسے چراغ جلانے کے لئے وغیرہ وغیرہ، الغرض کھانے کے علاوہ دیگر استعمالات جائز ہیں۔

لمافي الهندية (۱/۴۵): الفارة لوماتت في السمن ان كان جامدا قور ماحوله ورمى به والباقي طاهر يوكل وان كان مائعا لم يوكل وينتفع به من غير جهة الاكل مثل الاستصباح ودبغ الجلد ......

(۱۵۳) حلال جانوروں کے پیشاب کی کتنی مقدار معفو عنہ ہے

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حلال جانور کا پیشاب کپڑوں پر لگ جائے تو کتنی مقدار سے کپڑے ناپاک شمار ہوں گے؟ نیز اسی صورت میں حرام جانوروں کے پیشاب کا حکم بھی بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... حلال جانوروں کا پیشاب (نجاست خفیفہ) کپڑوں پر لگ جائے تو اگر نجاست کی مقدار کپڑے کے چوتھائی حصہ سے کم ہو تو کپڑا ناپاک شمار نہیں ہوگا اور اس سے زیادہ ہو تو کپڑا ناپاک شمار ہوگا، اور اگر حرام جانوروں کا پیشاب (نجاست غلیظہ) کپڑے پر لگ جائے تو اگر درہم کی مقدار (ہتھیلی کے درمیانی حصہ کے برابر مقدار) سے کم ہو تو کپڑا ناپاک شمار نہیں ہوگا اور اگر اس سے زیادہ ہو تو کپڑا ناپاک ہو جائے گا۔ نیز سوئی کے سرے (ناکے) کے برابر چھوٹی چھوٹی چھینٹیں کپڑے پر لگ جائیں تو اس سے کپڑا ناپاک نہیں ہوگا چاہے وہ چھینٹیں حرام جانور کے پیشاب کی ہوں یا حلال جانور کے پیشاب کی۔

لما في الهندية (۱/۴۵، ۴۶): الاول المغلظة وعفي منها قدر الدرهم ......وكذلك الخمر والدم المسفوح ولحم الميتة وبول مالا يؤكل والروث......نجاسة غليظة ......(والثاني المخففة) وعفي منها مادون ربع الثوب ......وفي الحقائق وعليه الفتوى......وبول ما يؤكل لحمه والفرس وخرء طير لا يوكل مخفف.

وفي الدر المختار (۱/۳۱۶، ۳۱۸): (وعفا) الشارع (عن قدر درهم)...... (وهو مثقال)...... (في) ...... (كثيف) له جرم (وعرض مقعر الكف)...... (في رقيق من مغلظة كعذرة)...... (وبول غير ماكول ولو من صغير لم يطعم) الا بول خفاش وخرأه.

(۱۵۴) دورانِ غسل پانی کی چھینٹیں بالٹی میں گر جائیں تو پانی کا کیا حکم ہوگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ غسل کرتے ہوئے پانی کی چھینٹیں بالٹی میں گر جاتی ہیں، اب اگر یہ غسل جنابت ہو تو کیا ایسی صورت میں یہ پانی ناپاک ہو جائے گا؟ اگر مقدار کے اعتبار سے کوئی فرق پڑتا ہو تو وہ بھی بیان فرمادیں، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں بالٹی میں صرف چھینٹیں گرنے سے بالٹی کا پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

لما في اعلاء السنن (۱/۲۵۲): ان ابن عمر والبراء بن عازب ادخل يده في الطهور ولم يغسلها ثم توضأ ولم ير ابن عباس بأسابما ينتضح من غسل الجنابة.

وفيها ايضاً (ص۲۵۳): عن ابن عباس في الرجل يغتسل من الجنابة فينتضح في انائه من غسله فقال لا بأس به اخرجه ابن ابي شيبة في المصنف.

وفي الهندية (۱/۲۳): جنب اغتسل فانتضح من غسله شيء في انائه لم يفسد عليه الماء اما اذا كان يسيل منه سيلانا افسده وكذا حوض الحمام على قول محمد لايفسده مالم يغلب عليه يعني لا يخرجه من الطهورية كذا في الخلاصة.

(۱۵۵) چائے یا پانی وغیرہ میں مکھی گرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چائے کے کپ میں مکھی گر جائے تو اس چائے کا پینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگوں سے سنا ہے کہ مکھی کو غوطہ دے کر نکال دے اور چائے پی لے تو کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر چائے میں مکھی گر جائے اور اسے نکال کر پھینک دیا جائے تو چائے کا پینا درست ہے کیونکہ اس سے چائے

ناپاک نہیں ہوتی اس لئے کہ اس کے اندر دم مسفوح (بہنے والا خون) نہیں ہوتا اور جن اشیاء میں دم مسفوح نہیں ہو وہ ناپاک نہیں تو دوسری چیزوں میں گرنے سے ان کو ناپاک نہیں کرتیں، البتہ مکھی کو چائے، سالن، پانی وغیرہ کے اندر ڈبو کر نکالنا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اَمر ارشادی ہے، اَمر وجوبی نہیں یعنی بطور ترحم کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لئے کہ کسی غریب آدمی کو دودھ ہر وقت میسر نہیں ہوتا کہیں وہ حرج میں مبتلا نہ ہو جائے، لیکن اگر کسی کی طبیعت متنفر ہو رہی ہو تو وہ نہ پیئے اس لئے کہ یہ اَمر وجوبی نہیں اور نہ پینے سے وہ گنہگار نہ ہوگا اور یہی حکم تمام مشروبات کا ہے۔

وفي الهندية(۱/۲۴): وموت ماليس له نفس سائلة في الماء لاينجسه كالبق والذباب والزنابير والعقارب ونحوها.

وفي رد المحتار (۱/۲۲۲): (قوله ومثله ماء لادم له) اى سائل سواء كان يعيش في الماء أو في غيره عن البحر: (قوله قيد للكل) أى للأدمي ومأكول اللحم ولادم له (قوله طاهر) أى في ذاته طهور أى مطهر لغيره من الأحداث والأخباث.

وفي أصول الشاشي(ص۲۷): وعلىٰ هذا قلنا في قوله عليه السلام اذا وقع الذباب في طعام أحدكم فامقلوه ثم انقلوه فان في احدى جناحيه داءً وفي الأخرى دواءً وإنه ليقدم الداء على الدواء دل سياق الكلام على أن المقل لدفع الأذى عنا، لاللأمر تعبدى حقا للشرع فلايكون للإيجاب.

(۱۵۶) ناپاک فرش کو خشک ہونے کے بعد پانی سے دھونا ضروری ہے؟ پکے فرش کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر پکے فرش کے اوپر نجاست گر جائے تو کیا خشک ہونے سے وہ پاک ہو جائے گا یا پانی سے دھونا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر پکے فرش کے اوپر نجاست گر جائے تو اس کو پاک کرنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ خشک ہونے سے وہ پاک ہو جائے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس پر پانی ڈال کر ملیں اور کپڑے سے خشک کیا جائے اس طرح تین مرتبہ کرنے سے وہ پاک ہو جائے گا، تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بہت زیادہ پانی ڈال کر چھوڑ دیں یہاں تک کہ نجاست کی بو اور رنگ باقی نہ رہے پانی خشک ہو جائے تو زمین پاک ہو جائے گی۔

البتہ پہلے طریقے میں اس پر نماز پڑھنا تو جائز ہے لیکن تیمم کرنا جائز نہیں، اور خشک ہونے کے بعد اس پر دوبارہ پانی آنے کی صورت میں بھی نجاست لوٹ کر نہیں آئے گی۔

وفی الهندية(۱/۴۳) : الارض اذا تنجست ببول واحتاج الناس الى غسلها فان كانت رخوة يصب الماء عليها ثلاثا فتطهر وان كانت صلبة قالوا يصب الماء عليها وتدلک ثم تنشف بصوف أو خرقة يفعل كذالک ثلاث مرات فتطهر وان صب عليها ماء كثير حتى تفرقت النجاسة ولم يبق ريحها ولا لونها وتركت حتى جفت تطهر كذا فی فتاویٰ قاضی خان.

وفی الشامية (۱/۳۱۱) : (قوله وله الطهورية) لأن الصعيد علم قبل التنجس طاهراً وطهوراً وبالتنجس علم زوال الوصفين ثم ثبت بالجفاف شرعاً أحدهما أعنی التطهير فيبقى الآخر على ماعلم من زواله واذا لم يكن طهوراً لا يتيمم به اهـ

وفی الدرالمختار(۱/۳۱۱) : (وحكم آجر) ونحوه كلبن (مفروش وخص) بالخاء تحجيرة سطح (وشجر وكلاء قائمين فی أرض كذلک). أی كأرض فيطهر بجفاف وكذا كل ما كان ثابتا فيها لأخذه حكمها باتصاله بها فالمنفصل يغسل لاغير الاحجراً خشنا كرحی فكأرض.

وفی الشامية (۱/۳۱۱): (قوله بيبسها) لما فی سنن أبی داؤد باب طهور الارض اذا يبست وساق بسنده عن ابن عمرؓ " قال كنت أبيت فی المسجد فی عهد رسول الله ﷺ وكنت شابا عزبا وكانت الكلاب تبول وتقبل وتدبر فی المسجد ولم يكونوا يرشون شيئا من ذلک" ولو أريد تطهيرها عاجلا يصب عليها الماء ثلاث مرات وتجفف فی كل مرة بخرقة طاهرة وكذا لو صب عليها الماء بكثرة حتى لا يظهر أثر النجاسة....... يفهم من قول البحر صب عليها الماء كثيراً ثم تركها حتى نشفت طهرت أنه نجس.

وفی الدر المختار(۱/۳۱۴):ثم هل يعود نجسا ببله بعد فركه؟ المعتمد لا، وكذا كل ما حكم بطهارته بغير مائع.

وقال الشامی رحمه الله تحته: (قوله بغير مائع) ای كالدلک فی الخف، والجفاف فی الارض...... ...... ومقتضاه أن الخف لووقع فی ماء قليل لا ينجسه...... وقدمنا أن الآجرة اذا تنجست فجفت ثم قلعت فالمختار عدم العود.

(۱۵۷) کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں ہمارے گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوتے اور گھروں کے اردگرد فصلیں ہوتی ہیں ہم ان میں جا کر پیشاب کرتے ہیں ایک دن ایک مولانا صاحب ہمارے

ہاں تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ کھیتوں میں پیشاب کرنا جائز نہیں ہے۔تو اب پوچھنا یہ ہے کہ کھیتوں میں پیشاب کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......قضاء حاجت کیلئے ایسی جگہ تلاش کرنی چاہئے جس میں ستر کا مکمل اہتمام ہو،اور کسی کی ایذا رسانی نہ ہوتی ہو،اور نہ ہی کسی محترم چیز کی بے حرمتی ہو،کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے،لیکن اگر کھیتوں میں کسی ایسی جگہ پر قضاء حاجت کی جائے جس میں ستر کا اہتمام ہو،اور فصل کی تلویث کا اندیشہ نہ ہو،اور نہ ہی کسی کی ایذا رسانی کا سبب بنے تو اس صورت میں کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافي الهندية (۱/۵۰): ويكره على طرف نهر أو بئر أو حوض أو عين أو تحت شجرة مثمرة أو في ذرع.

وفي الدر المختار (۱/۳۴۳): وعلى طرف نهر أو بئر أو حوض أو عين او تحت شجرة مثمرة أو في ذرع.

(۱۵۸) استعمال شدہ کمبل،کپڑے وغیرہ کو بغیر دھوئے استعمال کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل لائٹ ہاؤس وغیرہ پر گرم کمبل سوئیٹر،جرسیاں وغیرہ جو ملتی ہیں انہیں بغیر دھوئے استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......استعمال شدہ اشیاء (مثلاً گرم کمبل،سوئیٹر،جرسیاں اور کپڑے وغیرہ) جو مختلف جگہوں پر سستے داموں ملتی ہیں اگر یہ کفار کی استعمال کردہ ہوں تو جب تک ان کے ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب نہ ہو،انہیں بغیر دھوئے استعمال کرنا درست ہے تاہم دھو کر استعمال کرنا بہر حال اولیٰ اور بہتر ہے۔

لمافي الولوالجية (۱/۴۶): لابأس بلبس ثياب اهل الذمّة والصلوٰة فيها واما الازار والسراويل فانها تكره الصلوٰة فيهما مالم يغسلا في قول ابي حنيفة و محمد وقال ابو يوسف اجزاه بلاكراهة امّا الجواز في الكل فلان الطهارة في الثياب اصل وليس في حالة الكفر ما يوهم نجاسة ثيابهم فلهذه العلة لم يكره ابو يوسف في الازار والسراويل وهما كرها.

وفي الدر المختار (۱/۳۵۰): ثياب الفسقة واهل الذمة طاهرة

(وفي الشامية تحته) :الاصح انه لايكره لانه لم يكره من ثياب اهل الذمة الاالسراويل مع استحلالهم الخمر، فهذا اولىٰ اهـ.

(۱۵۹) نجاست سے کپڑے کو پاک کرنے کے بعد اگر داغ رہ جائے تو کپڑے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو احتلام ہوا صبح اٹھ کر اس نے غسل کیا اور شلوار

کو تین بار دھویا لیکن اس سے منی کے داغ نہیں اترے آیا یہ شلوار پاک ہوگی؟ اس کے ساتھ نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... کپڑوں پر اگر نجاست لگ جائے اور وہ نجاست ٹھوس ہو تو دھونے سے اگر اس کی عین زائل ہو جائے کپڑے پاک ہوں گے اگر چہ اس کا اثر (بو، رنگ) باقی رہ جائے جس کے دور کرنے میں مشقت ہو، اور بغیر صابن یا گرم پانی کے دور نہ ہو سکتا ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کپڑوں سے منی دھونے کے بعد اگر اس کا کوئی داغ یا اثر رہ جائے تو بھی کپڑے پاک ہوں گے اور اس میں نماز پڑھنا درست ہے۔

لما في البحر الرائق (١/ ٤١٠): والمراد بالأثر اللون والريح فان شق إزالتهما سقطت وتفسير المشقة أن يحتاج في إزالته إلى استعمال غير الماء كالصابون والأشنان أو الماء المغلي بالنار كذا في السراج.

وفي الدر المختار (١/ ٣١٢): (ويطهر مني) أي محله (يابس بفرك) ولا يضر بقاء اثره...... (والا) يكن يابسا ...... (فيغسل)

وفي الشامية تحته: (قوله ولا يضر بقاء اثره) أي كبقائه بعد الغسل بحر.

(١٦٠) ناپاک کپڑوں کو بالٹی وغیرہ میں ڈال کر ٹونٹی سے پانی جاری کر دینے سے کپڑوں کی پاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ اکثر اوقات گھر سے باہر سفر میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے کپڑے وغیرہ بندے کو خود دھونے پڑتے ہیں۔ تو ایک دن میں کپڑے دھو رہا تھا میری عادت یہ ہے کہ جو کپڑے ناپاک ہوں تو میں ان کو تین مرتبہ دھوتا ہوں اور ہر مرتبہ اچھی طرح نچوڑتا ہوں، میرا ایک طالبعلم ساتھی میرے پاس آیا، تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ خواہ مخواہ میں تین مرتبہ کپڑے دھونے میں اور ہر مرتبہ کپڑے نچوڑنے میں اپنے کو تھکاتے ہیں، ایسا کریں کہ کپڑے بالٹی میں ڈال کر اس پر ٹونٹی کھول دیا کریں۔ جب بالٹی بھر جائے اور پانی اس سے چھلکنے لگ جائے اور کچھ نہ کچھ پانی بہہ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے۔ مجھے ان کی یہ تجویز اچھی لگی۔ لیکن میں نے کہا اگر چہ میرا یہ ساتھی دین پڑھ رہا ہے لیکن ہے تو طالبعلم کوئی عالم مفتی تو نہیں، کیوں نہ میں تھوڑی تکلیف اٹھا کر مفتی صاحب سے معلوم کر لوں، تا کہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ تو مفتی صاحب آپ بتائیں کہ واقعتاً جب پانی تھوڑا سا بالٹی کے سائیڈوں (اطراف) سے گرنے لگ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے یا جو بھی صحیح صورتحال ہو اس کو واضح بیان فرمائیں، آپ کو اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

الجواب حامداًومصلیاً...... کپڑوں کو نجاست سے پاک کرنے کا طریقہ شرعاً یہ ہے کہ اگر نجاست مرئیہ ہو یعنی نظر آنے والی اور ذی جرم

ہو (جس کا ٹھوس وجود ہو) تو اس عین نجاست کو زائل کرنے سے کپڑے پاک ہو جاتے ہیں۔ خواہ ایک مرتبہ پانی بہانے سے زائل ہو جائے۔ کیونکہ پاکی سے مراد نجاست کو دور کرنا ہوتا ہے اور اس صورت میں یہ پایا جاتا ہے، اور اگر نجاست غیر مرئیہ ہو یعنی نظر نہ آنے والی ہو جیسے مائعات کی نجاستیں تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کپڑوں کو کسی برتن میں دھویا جائے تو یہ ضروری ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے اور نچوڑا جائے۔ البتہ اگر کپڑوں کو ماء جاری جیسے نہر وغیرہ کے پانی میں یا وہ پانی جو ماء جاری کے حکم میں ہو میں دھویا جائے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے کہ بالٹی یا کسی اور برتن میں کپڑوں کو ڈال دیا جائے اور پھر یہاں تک پانی ڈالا جائے اور اتنا پانی بہہ جائے کہ دھونے والے کو غالب گمان ہو کہ اب نجاست نکل چکی ہے۔ اس صورت میں یہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہو جائے گا۔ اور کپڑوں کو نچوڑنا بھی ضروری نہ ہوگا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے طالبعلم ساتھی کا یہ کہنا تو درست ہے کہ جب بالٹی وغیرہ سے پانی بہنے لگ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے اور نچوڑنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن یہ ضروری ہے کہ اتنا پانی بہہ جائے کہ نجاست نکل جانے کا ظن غالب ہو جائے۔

لما في مراقي الفلاح (ص۱۲۹): (ويطهر) محل النجاسة (غير المرئية بغسلها ثلاثا) وجوبا وسبعاً مع التتريب ندباً في نجاسة الكلب خروجاً من الخلاف (والعصر كل مرة) تقديراً لغلبة الظن في استخراجها في ظاهر الرواية وفي رواية يكتفي بالعصر مرة وهو أرفق ووضعه في الماء الجاري يغني عن التثليث والعصر كالاناء اذا وضعه فيه فامتلأ وخرج منه طهر.

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: قوله ووضعه في الماء الجاري الخ يعني اشتراط الغسل والعصر ثلاثا انما هو اذا غمسه في إجانة، اما اذا غمسه في ماء جار حتى جرى عليه الماء او صب عليه ماء كثيراً بحيث يخرج ما أصابه من الماء ويخلفه غيره ثلاثا فقد طهر مطلقاً بلا اشتراط عصر وتجفيف، وتكرار غمس هو المختار والمعتبر فيه غلبة الظن هو الصحيح.

وفي الشامية (۱/۳۳۳): تحت قوله اما لو غسل الخ. أن المعتبر في تطهير النجاسة المرئية زوال عينها ولو بغسلة واحدة ولو في اجانة كمامر فلا يشترط فيها تثليث غسل ولا عصر، وأن المعتبر غلبة الظن في تطهير غير المرئية بلا عدد على المفتىٰ به...... ولا شك ان الغسل بالماء الجاري وما في حكمه من الغدير أو الصب الكثير الذي يذهب بالنجاسة اصلاً ويخلفه غيره مراراً بالجريات اقوى من الغسل في الاجانة التي على خلاف القياس، لأن النجاسة فيها تلاقي الماء وتسري معه في جميع اجزاء الثوب فيبعد كل البعد التسوية بينهما في اشتراط التثليث.

(قوله في غدير) اي ماء كثير له حكم الجاري (قوله أو صب عليه ماء كثير) اي بحيث يخرج الماء ويخلفه غيره ثلاثاً لان الجريان بمنزلة التكرار والعصر، هو الصحيح.

(۱۶۱) نجس کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ نیز نجس کپڑے کو دھوپ سے خشک کرنے کے بعد پاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا، نیز اگر نجس کپڑے کو دھوپ میں سکھا دیا جائے تو کیا وہ پاک ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کپڑے کو نجاست سے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کپڑے کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ نچوڑا جائے اس طور پر کہ پانی کے قطرات ٹپکنا بند ہو جائیں نجس کپڑا دھوئے بغیر محض دھوپ میں سکھانے سے پاک نہیں ہوگا۔

لمافي البدائع الصنائع(۱/۴۳۹): واما سائر النجاسات اذا اصابت الثوب أو البدن و نحوهما فانها لا تزول الا بالغسل سواء كانت رطبة اويابسة وسواء كانت سائلة او لها جرم.

وفي الهندية(۱/۴۲): ان غسل ثلاثا فعصر في كل مرة ثم تقاطرت منه قطرة فأصابت شيأ ان عصره في المرة الثالثة وبالغ فيه بحيث لو عصره لايسيل منه الماء فالثوب واليد وما تقاطر طاهر والا فالكل نجس.

(۱۶۲) ناپاک جوتا پاک کرنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر راستے میں چلتے ہوئے کسی کے جوتے پر نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کیلئے دھونا ضروری ہے یا کپڑے سے صاف کر دینا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جوتے پر لگنے والی نجاست خواہ جسم رکھنے والی ہو (مثلاً پاخانہ، خون، لید وغیرہ) یا جسم رکھنے والی نہ ہو (مثلاً شراب، پیشاب وغیرہ) اگر اسے زمین سے رگڑ دیا جائے یا کسی کپڑے وغیرہ سے صاف کر لیا جائے اس طرح کہ نجاست کا اثر اور بدبو باقی نہ رہے تو وہ جوتا اصح قول کے مطابق پاک ہو جائے گا پھر اسے دھونا ضروری نہیں۔

لمافي الهندية(۱/۴۴): الخف إذا أصابته النجاسة إن كانت متجسدة ......إذا مسحه علي وجه المبالغة بحيث لايبقى لها أثر يطهر وعليه الفتوىٰ لعموم البلوىٰ كذا في فتاوى قاضيخان وإن لم تكن النجاسة متجسدة ...... إذا التصق بها مثل التراب أو ألقي عليها فمسحها يطهر وهو الصحيح هكذا في التبيين وعليه الفتوىٰ للضرورة كذا في معراج الدراية.

وفي الدر المختار(۱/۳۰۹،۳۱۰): (ويطهر خف ونحوه) كنعل (تنجس بذي جرم) هو كل مايرى بعد الجفاف ولو من غيرها كخمر وبول أصابه تراب به يفتي بدلك يزول به أثرها.

(۱۶۳) اسٹیل یا پلاسٹک کے نجس برتن پاک کرنے کا طریقہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل گھروں میں عام طور پر اسٹیل یا پلاسٹک کے برتن استعمال ہوتے ہیں بسا اوقات ان پر کوئی نجاست لگ جاتی ہے اور یہ ناپاک ہوجاتے ہیں تو ان کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اسٹیل اور پلاسٹک کے برتن اگر چکنے ہوں اور کھردرے نہ ہوں ان پر نجاست لگ جائے تو وہ پانی، مٹی یا صاف کپڑے سے پونچھنے سے بھی پاک ہوجائیں گے جبکہ نجاست زائل ہوجائے اگر وہ برتن کھردرے یا اُبھرے ہوئے ہوں تو پانی سے دھوئے بغیر وہ پاک نہ ہوں گے۔

لمافی البحر الرائق(۱/۳۹۰،۳۹۱): (ونحو السيف بالمسح) اى يطهر كل جسم صقيل لامسام له بالمسح جديد اكان أو غيره فخرج الحديد إذا كان عليه صدأ أو منقوشا فانه لا يطهر الا بالغسل ...... وزاد فى السراج الوهاج العظم والآبنوس وصفائح الذهب والفضة اذا لم تكن منقوشة ....الخ.

وفى الهندية(۱/۴۳): (ومنها المسح) اذا وقع على الحديد الصقيل الغير الخشن كالسيف والسكين والمرآة ونحوها نجاسة من غير أن يموه بها فكما يطهر بالغسل يطهر بالمسح بخرقة طاهرة...... ولا فرق بين الرطب واليابس ولا بين ماله جرم وما لا جرم له ...... الخ.

وفى الدر المختار(۱/۳۱۰): ويطهر (صقيل) لامسام له (كمرآة) وظفر وعظم وزجاج وآنية مدهونة أو خرّاطى وصفائح فضة غير منقوشة بمسح يزول به اثرها مطلقا وبه يفتى.

(۱۶۴) کتاب کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دن گھر میں مطالعہ کر رہا تھا اچانک کسی کام کیلئے جانا ہوا تو کتاب تپائی پر چھوڑ کر چلا گیا ادھر کہیں سے گھومتا پھرتا میرا بیٹا اس کمرے میں آپہنچا اس نے کتاب اٹھالی اس سے کھیلتا رہا آخر میں اس پر پیشاب کر دیا اب اس کتاب کو کس طرح پاک کریں گے جبکہ دھونے کی صورت میں کتاب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں چونکہ پانی سے دھونے سے کتاب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے کسی اور ایسی پاک مائع چیز سے دھولیں جو نجاست کو دور کردے اور اس سے کتاب خراب نہ ہو، جیسے پیٹرول وغیرہ۔

وفى اعلاء السنن(طبع ادارة القرآن والعلوم)(۱/۴۰۶): كانت إحدانا تغسل دم الحيضة بريقها تقرضه بظفرها

وفى اعلاء السنن (۱/۴۰۵): قوله عن عائشة رضى الله عنها قلت يستنبط منه جواز ازالة النجاسة

بغير الماء فان الدم نجس وهو اجماع المسلمين ويستنبط منه أن إزالة النجاسة لا يشترط فيها العدد بل المراد الإنقاء قاله العيني......

وأصرح منه مافي رواية عبدالرزاق.......... جعلت رضي الله عنها ذالک غسلاً.

وفي المختصر المقدوري(ص-٢٦): يجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر يمكن ازالتها به كالخل وماء الورد.

وفي ملتقى الابحر(١/٤٦): يطهر بدن المصلي...... وبكل مائع طاهر مزيل كالخل وماء الورد......

وقال في الحاشية المسماة بالتعليق الميسر ومثله البنزين والكازلا نهما مزيلان الخ.

وفي الشامية(١/٣٠٩): وبكل مائع) أي سائل فخرج الجامد الخ (قوله طاهر) فبول ما يوكل لا يطهر الخ قالع) أي مزيل الخ (قوله ينعصر بالعصر) تفسير لقالع الخ.

(۱۶۵) ناپاک روئی کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر میں روئی رکھی ہوئی تھی کہ اس کے اوپر میرے بچے نے پیشاب کردیا تو اب روئی کو کس طرح پاک کیا جائے جبکہ دھونے سے وہ خراب ہوجائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نجس چیزوں کو پاک کرنے کا افضل طریقہ تو یہ ہے کہ ان کو پانی سے دھویا جائے، اور دھونے سے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، تو فقہاء کرام نے جو متبادل طریقے بتائے ہیں ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے، جیسا کہ روئی کے پاک کرنے میں فقہاء کرام نے متبادل طریقہ بتایا ہے کہ اس کو دھنوایا جائے۔ البتہ روئی کی اگر کل مقدار کا نصف یا نصف سے زیادہ حصہ ناپاک ہوجائے تو دھننے سے پاک نہیں ہوگا، اور اگر نصف سے کم حصہ ناپاک ہے تو دھننے سے پاک ہوجائے گا۔

لمافي الهندية(١/٤٥): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجسالا يطهر وان كان يسيرا بحيث يحتمل ان يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارة كالكدس اذا تنجس فقسم بين الدهقان والعامل يحكم بطهارته.

وفي الشامية (١/٣١٤): وانما يجوز الانتفاع لو قوع الشك في بقاء النجاسة في الموجود، وكذا الندف ومن عده شرط كون النجس مقدارا قليلا يذهب بالندف والا فلا يطهر.

(۱۶۶) روئی کے دھنوانے سے پاک ہونے کی علت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم صاحب سے سنا ہے کہ روئی دھنوانے

سے پاک ہوجاتی ہے؟ مجھے آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا اس میں کچھ شرائط بھی ہیں یا بس مطلق دھنوانے سے پاک ہوجائے گی۔ اصل میں ہمارے گھر میں بھی کچھ روئی لحاف بنوانے کیلئے رکھی ہوئی تھی، اس پر میرے بھتیجے نے پیشاب کردیا ہے۔ اب ہم پریشان ہیں کیا کریں؟ نیز ایک بات اپنی معلومات میں اضافے کیلئے پوچھنا ہے کہ آخر روئی کے دھنوانے سے پاک ہونے کی کیا علت ہے؟ براہ کرم مدلل ومفصل جواب عنایت فرماکر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... ناپاک روئی کا حصہ اگر کل روئی کا آدھا یا اس سے زیادہ ہے تو دھنوانے سے پاک نہیں ہوگا البتہ اگر آدھے سے کم ہے اور یہ احتمال ہے کہ دھنوانے سے ناپاک حصہ اڑ جائے گا تو وہ روئی دھنوانے سے پاک ہوجائے گی لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے بھتیجے کے پیشاب کی وجہ سے روئی اگر آدھی سے کم ناپاک ہوئی ہے تو وہ دھنوانے سے پاک ہوجائے گی۔

فقہاء کرامؒ نے صراحتاً اس کی کوئی علت بیان نہیں فرمائی کہ روئی دھنوانے سے پاک کیوں ہوتی ہے البتہ ان کے اس قول کہ ''اگر نجاست تھوڑی ہو، اور دھنوانے سے اس کے چلے جانے کا احتمال ہو، تو پاکی کا حکم لگایا جائے گا'' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روئی کو جب دھنوایا جائے گا تو اس کا کچھ حصہ اڑ جائے گا اور جو حصہ اڑا ہے احتمال ہے کہ اس میں نجاست ہو اور بقیہ روئی پاک ہو اسی احتمال کی بناء پر پاکی کا حکم لگایا جائے گا آجکل بھی روئی والوں سے معلوم کرنے پر یہ بات علم میں آئی کہ روئی دھنوانے سے اس کا کچھ حصہ اڑ جاتا ہے اور اس کو دھوکر پاک کرنے کی بھی صورت نہیں کیونکہ یہ دھونے سے خراب ہوجاتی ہے اس کی نظیر فقہاء کرامؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر گندم کا ڈھیر نجس ہوجائے اور اس کو زمیندار اور کسان میں تقسیم کردیا جائے تو سارے ڈھیر پر پاکی کا حکم لگایا جائے گا کیونکہ تقسیم کی بناء پر ہر حصہ میں یہ احتمال ہے کہ نجاست اس حصہ میں نہ ہو بلکہ دوسرے حصہ میں ہو، اسی احتمال کی وجہ سے ہر حصہ کی طہارت میں شک واقع ہوگیا لیکن چونکہ اشیاء میں اصل طہارت ہے اس لئے سارے ڈھیر پر طہارت کا حکم لگایا جائے گا۔ اسی طرح ناپاک روئی کو جب دھنوایا گیا تو بعض روئی کے اڑ جانے کی وجہ سے یہ احتمال واقع ہوگیا کہ بقیہ روئی پاک ہے یا نہیں کیونکہ احتمال ہے کہ ناپاک روئی اڑی ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ پاک روئی اڑی ہو، اسی احتمال کی وجہ سے بقیہ روئی کی طہارت میں شک واقع ہوگیا لیکن چونکہ اکثر روئی پاک ہے اس لئے بقیہ روئی پر بھی پاکی کا حکم لگایا جائے گا۔

لما في النهر الفائق(۱/۱۴۶): وأما القسمة وما بعدها فلأن النجاسة باقية ايضاً وانما جاز الانتفاع لوقوع الشك في الموجود ابقيت النجاسة فيه أم لا ألا ترى أن الذاهب لو عاد عادت النجاسة وعلى هذا فلا ينبغي عد الندف ايضا ومن عده شرط ان يكون النجس مقداراً قليلاً يذهب بالندف أما لو كان كالنصف ونحوه فلا يطهربه.

وفي خلاصة الفتاوى(۱/۴۳): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجساً لا يطهر امنا اذا كان النجس شيأ يسيراً بحيث يحتمل ان يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارته كالكدس اذا تنجس فقسم بين الدهاقين والعامل يحكم بطهارته.

وفي الهندية(۱/۴۵): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجساً لا يطهر وإن كان

يسيراً بحيث يحتمل ان يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارته كالكدس اذا تنجس فقسم بين الدهقان والعامل يحكم بطهارته كذا في الخلاصة.

(۱۶۷) ڈبلیوسی کے اندر گھڑی گرنے کی صورت میں پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری گھڑی بیت الخلاء کے ڈبلیوسی میں گر گئی تھی جسے میں نے تھیلی پہن کر نکال لیا ہے، اب میں اسے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔اس کے پاک کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ برائے کرم جلد از جلد رہنمائی فرماویں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......ڈبلیوسی کے اندر عام طور پر ناپاک پانی ہوتا ہے اسلئے چین والی گھڑی یا چمڑے کے پٹے والی گھڑی اس میں گرنے کی صورت میں صرف نجاست اور اس کے اثر کو دور کرنا کافی ہوگا اگر گھڑی ایسے پٹے والی ہے کہ جس میں نجاست کے اثرات بیٹھ جاتے ہیں تو اسے تین مرتبہ دھونا ضروری ہوگا اور دونوں صورتوں میں اگر دھونے کی وجہ سے گھڑی کے خراب ہونے یا زنگ وغیرہ لگ جانے کا احتمال ہو تو کسی ایسی پاک مائع چیز جو نجاست کے اثر کو دور کردے اور اس سے یہ خرابی پیدا نہ ہو، مثلاً پٹرول وغیرہ سے بھی دھو لینا کافی ہوگا۔

وفي الهندية (۱/۱۴): يجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر يمكن ازالتها به......... وان كانت مرئية بازالة عينها وأثرها ان كانت شيأ يزول اثره ولايعتبر فيه العدد كذا في المحيط فلو زالت عينها بمرة اكتفى بها.(وفي صـ۴۲): وإن كانت غير مرئية يغسلها ثلاث مرات.

وفي الشامية (۱/۳۰۹): (قوله وبه يفتى) أى خلافا لمحمدؒ لانه لايجيز ازالة النجاسة الحقيقية الابالماء المطلق. بحر

(۱۶۸) روئی اور فوم کے ناپاک گدے پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر گھروں میں لوگ روئی یا فوم والے گدے استعمال کرتے ہیں ہر گھر میں بچے بھی موجود ہوتے ہیں وہ ان کے اوپر پیشاب وغیرہ کرتے رہتے ہیں اگر یہ گدے ناپاک ہو جائیں تو ان کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جن چیزوں میں نجاست جذب ہو جاتی ہے ان کی دو صورتیں ہیں، ان کو نچوڑا جاسکتا ہوگا یا نہیں، اگر نچوڑا جاسکتا ہے تو اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ اچھی طرح نچوڑا جائے اور جن چیزوں کو نچوڑا نہیں جاسکتا ان کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو بھی تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ دھونے کے بعد ڈال دیا جائے یہاں تک کہ اس سے قطرے ٹپکنا بند ہو جائیں، مذکورہ دونوں صورتوں میں اگر وہ چیز جس پر نجاست لگی ہوئی ہے، اگر اس کو بہتے ہوئے پانی میں ڈال دیا جائے یہاں

تک کہ غالب گمان اس کے پاک ہونے کا ہوجائے تو اس سے بھی وہ چیز پاک ہوجاتی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں روئی اور فوم کے گدوں کا نچوڑنا اگر ممکن نہیں تو ان کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ دھونے کے بعد ڈالدیا جائے یہاں تک کہ قطرے ٹپکنا بند ہوجائیں یا پائپ وغیرہ سے ان پر اتنا پانی بہادیا جائے کہ پاک ہونے کا غالب گمان حاصل ہوجائے تو پاک ہوجائیں گے۔

لمافي البحر الرائق(۱/۴۱۳): قوله (وبتثليث الجفاف فيما لا ينعصر) اى مالا ينعصر فطهارته غسله ثلاثا وتجفيفه في كل مرة لان للتجفيف اثرا في استخراج النجاسة وهو ان يتركه حتى ينقطع التقاطر ولا يشترط فيه اليبس.

وفي الشامية(۱/۳۳۲): حاصله كما في البدائع ان المتنجس اما ان لا يتشرب فيه اجزاء النجاسة اصلا...... او يتشرب فيه قليلا...... او يتشرب كثيرا ففي الاول طهارته بزوال عين النجاسة المرئية او بالعدد على ما مر وفي الثاني كذالك...... واما في الثالث، فان كان مما يمكن عصره كالثياب فطهارته بالغسل والعصر الى زوال المرئية وفي غيرها بتثليثها وان كان مما لا ينعصر كالحصير المتخذ من البردي ونحوه ان علم أنه لم يتشرب فيه بل اصاب ظاهره يطهر بازالة العين او بالغسل ثلاثا بلا عصروان علم تشربه...... فعند محمد لا يطهر ابدا وعند ابي يوسف ينقع في الماء ثلاثا ويجفف كل مرة والاول اقيس والثاني اوسع اهـ وبه يفتي درر.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۱/۳۳۵): واما ان كان مما لايعصر كالحصير والسجاد والخشب: فينقع في الماء ثلاث مرات ويجفف في كل مرة وهو قول ابي يوسف وهو الرأي الراجح وقال محمد لا يطهر ابداً.

وفيه ايضاً(۱/۳۳۷): وقد اتفق الحنفية مع غيرهم على ان المتنجس اذا غسل في ماء جار او غدير (اى ماء كثير له حكم الجاري) او صب عليه ماء كثير او جرى عليه الماء طهر مطلقا بلا شرط عصر وتجفيف وتكرار غمس لان الجريان بمنزلة التكرار والعصر.

(۱۶۹) ناپاک قالین کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو سلسل بول کی بیماری ہے ایک روز وہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ قالین پر پیشاب کے قطرات گر گئے تو اس نے اس پر گیلا کپڑا لگا کر صاف کردیا تو کیا اس طرح کرنے سے قالین پاک ہوگیا یا دھونا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قالین چونکہ ایسی چیز ہے جو کہ نجاست کے اثرات کو جذب کر لیتی ہے اور اس کو عام طور پر نچوڑنا بھی ممکن نہیں ہوتا

اس لئے یہ گیلا کپڑا پھیر دینے سے پاک نہ ہوگا بلکہ اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اتنے وقفے وقفے سے تین مرتبہ اسے اس طرح دھویا جائے گا کہ ہر مرتبہ اس سے قطرے گرنا بند ہو جائیں اور جب تین مرتبہ مذکورہ طریقے سے دھولیا جائے گا تو پھر وہ پاک ہو جائے گا۔

وفی الهندية(۱/۴۲): مالاينعصر يطهر بالغسل ثلاث مرات والتجفيف فی كل مرة لان للتجفيف أثرا فی استخراج النجاسة.

وفی الدر المختار (۱/۳۳۱): (غيرها) أی غير مرئية(بغلبة ظن غاسل)...... (طهارة محلها)بلا عدد به يفتیٰ (وقدر)...... (بغسل وعصر ثلاثاً)أو سبعا(فيما ينعصر)..... (و) قدر (بتثليث جفاف) أی انقطاع تقاطر(فی غيره) ای غير منعصر.

(۱۷۰) دریائی مینڈک کے کنویں میں گرنے سے کنویں کی طہارت کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دریائی مینڈک کنویں میں گر جائے تو طہارت کا کیا حکم ہے؟ کیا دریائی مینڈک کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک ہوجاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....دریائی مینڈک کے کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ اس پر ظاہری نجاست نہ لگی ہو، اور اگر اس پر نجاست لگی ہو تو کنواں ناپاک ہوجائے گا اور سارے پانی کا نکالنا ضروری ہوگا اور کنویں کے چشمہ دار ہونے کی صورت میں جب سارا پانی نکالنا ناممکن ہو، تو تین سو ڈول نکال لیے جائیں تو وہ کنواں پاک ہوجائے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۹): واذا وجب نزح جميع الماء ولم يمكن فراغها لكونها معينا ينزح مائتا دلو كذا فی التبيين وهذا أيسر كذا فی الاختيار شرح المختار والأصح أن يؤخذ بقول رجلين لهما بصارة فی أمر الماء فای مقدار قالا انه فی البئر ينزح ذلک القدر وهو أشبه بالفقه.

وفی الدر المختار(۱/۲۱۱): (اذا وقعت نجاسة)ليست بحيوان ولو مخففة أو قطرة بول اودم ......(ينزح كل مائها).

وفی الدر المختار(۱/۲۱۴): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر مافيها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبی (يؤخذ ذلک بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتی. وقيل يفتی بمائة الی ثلاث مائة وهذا أيسر وذاک أحوط.

(۱۷۱) دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑوں کی پاکی کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں دھوبی سے کپڑے دھلواتا ہوں، کیا دھوبی کے دھلے

ہوئے کپڑے پاک ہوتے ہیں؟ اور اگر کپڑے گھر میں دھوئے جائیں تو ان میں سے بعض پاک اور بعض ناپاک ہوتے ہیں اب جب انہیں ایک ساتھ دھویا جائے گا تو دھونے کے بعد ہر کپڑے کو تین دفعہ دھونا ضروری ہے؟ اگر تین دفعہ دھونا ضروری ہو تو جب ایک کپڑے کو پانی میں ڈال دیا تو اسے نکالنے کے بعد دوسرے کپڑے کو اسی پانی میں دھو سکتے ہیں یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... کپڑے دھونے کی دو صورتیں ہیں، پہلی یہ کہ کپڑے کسی بڑے حوض یا بہتے ہوئے پانی میں دھوئے جائیں یا ان کے اوپر سے پانی بہایا جائے تو ایسی صورت میں اگر نجاست دکھائی دینے والی ہے تو نجاست کے زائل ہونے سے کپڑا پاک ہو جائے گا چاہے ایک مرتبہ دھونے سے ہو یا ایک سے زیادہ مرتبہ دھونے سے، اور اگر نجاست دکھائی دینے والی نہیں ہے تو تین دفعہ دھونے سے کپڑا پاک ہو جائے گا، ہاں اگر تین دفعہ سے پہلے پاکی کا ظن غالب ہو جائے تو بھی کپڑا پاک ہو جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کپڑے بالٹی ٹب یا واشنگ مشین وغیرہ میں دھوئے جائیں تو اس میں پاک کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ ایک دفعہ نکال کر انہیں نچوڑ لیا جائے اور جو پانی بالٹی یا مشین وغیرہ میں ہو وہ گرا دیا جائے اور مشین وغیرہ کو کھنگال لیا جائے، اسی طرح دوسری اور تیسری مرتبہ یہ عمل کیا جائے یا مشین وغیرہ سے نکال کر صاف پانی میں تین دفعہ ڈال کر نچوڑ لیے جائیں تو کپڑے پاک ہو جائیں گے۔

یاد رہے کہ جب پاک اور ناپاک کپڑوں کو ایک ساتھ پانی میں ڈال دیا تو اب کپڑوں کو پاک کرنے کیلئے سب کو تین دفعہ دھونا پڑے گا کیونکہ ایک ساتھ دھونے سے سب ہی ناپاک ہو گئے۔ دھوبی اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرتا ہے تو کپڑے پاک ہوں گے ورنہ نہیں۔ نیز مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ اگر ناپاک کپڑے کسی بالٹی وغیرہ میں ڈالے جائیں گے تو وہ پانی بھی ناپاک ہو جائے گا لہٰذا دوسرے کپڑے اس میں نہیں ڈال سکتے البتہ اگر تین دفعہ دھونے کے بعد ڈالے جائیں تو کپڑے پاک ہونے کی وجہ سے پانی ناپاک نہیں ہوگا لہٰذا اس میں دوسرے کپڑے ڈال سکتے ہیں۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۲۸): (وكذا يطهر محل نجاسة ......مرئية) بعد جفاف كدم (بقلعها) اى بزوال عينها واثرها ولو بمرة او بما فوق ثلاث فى الاصح.

وفی الشامية (۱/۳۲۸): (ولو بمرة) يعنى ان زال عين النجاسة بمرة واحدة تطهر سواء كانت تلك الغسلة الواحدة فى ماء جار او راكد كثير او بالصب او فى اجانة اما الثلاثة الاول فظاهر واما الاجانة فقد نص عليها فى الدرر حيث قال غسل المرئية عن الثوب فى اجانة حتى زالت طهر.

(۱۷۲) ٹوائلٹ پیپر کے استعمال کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل جو ٹوائلٹ پیپر استعمال ہوتے ہیں انہیں استعمال کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ پانی کے قائم مقام ہوں گے کہ اگر کوئی یہ استعمال کرلے تو پانی استعمال کیے بغیر اس کی نماز درست ہو جائے گی؟ نیز عذر اور غیر عذر کی صورت میں کوئی فرق ہوگا یا دونوں صورتیں برابر ہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں پیپر کا استعمال جائز ہے، اگر نجاست اپنے مخرج سے تجاوز نہ کرے تو یہ پانی کے قائم مقام ہوں گے لہٰذا اگر پانی نہ بھی استعمال کیا جائے تو بھی نماز صحیح ہو جائے گی، البتہ اگر نجاست اپنے مخرج سے تجاوز کرگئی ہو تو پانی کا استعمال ضروری ہوگا صرف پیپر کا استعمال کافی نہ ہوگا۔ نیز عذر اور غیر عذر میں کوئی فرق نہیں ہوگا، بلکہ دونوں صورتیں برابر ہیں۔

لمافی الهندية (۱/۴۸):يجوز الاستنجاء بنحو حجر منق كالمدر والتراب والعود والخرقة والجلد وماأشبهها.....ثم الاستنجاء بالاحجار انما يجوز اذا اقتصرت النجاسة على موضع الحدث فاما اذا تعدت موضعها بان جاوزت الشرج اجمعوا على ان ما جاوز موضع الشرج من النجاسة اذاكانت اكثر من قدرالدرهم يفترض غسلها بالماء.

وفي الدرالمختار (۱/۳۳۸،۳۴۰):(ويجب) اى يفرض غسله (ان جاوز المخرج نجس) مائع ويعتبر القدرالمانع لصلاة (فيما وراء موضع الاستنجاء .....وكره) تحريما (بعظم وطعام وروث .....و) شئی محترم.....

(۱۷۳) مردہ جانور کی کھال کے استعمال کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی مردہ جانور کی کھال اتار کر فروخت کرنا کیسا ہے کیونکہ گوشت وغیرہ تو استعمال نہیں کر سکتے، لیکن میں نے سنا ہے کہ کھال استعمال کر سکتے ہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....مردہ جانور کی کھال کو دباغت (دھوپ، مٹی یا نمک وغیرہ سے بدبو اور خون وغیرہ دور کرنا) کے بعد فروخت کر سکتے ہیں اور استعمال بھی کر سکتے ہیں البتہ دباغت سے پہلے فروخت نہیں کر سکتے۔

لمافي الهندية (۳/۱۱۵):واما جلود السباع والحمر والبغال فما كانت مذبوحة او مدبوغة جاز بيعها ومالا فلا وهذا بناء على ان الجلود كلها تطهر بالذكاة او بالدباغ الا جلد الانسان والخنزير واذاطهرت بالذكاة جاز الانتفاع بها فتكون محلا للبيع.

وفي الدرالمختار (۱/۲۰۳): (وكل اهاب)..... (دبغ) ولو بشمس .....(طهر).

وفيها ايضاً (۵/۷۳):(وجلد الميتة قبل الدبغ) لو بالعرض ولو بالثمن فباطل .....(وبعده)اى الدبغ (يباع)الا جلد الانسان وخنزير وحية (وينتفع به)لطهارته حينئذ.

(۱۷۴) اُکھڑے ہوئے بالوں کی طہارت کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور بکر کا اس بات میں اختلاف ہوا کہ داڑھی کے وہ

بال پاک ہیں یا نہیں جو داڑھی سے الگ ہوجائیں؟ زید کا کہنا ہے کہ بال کا وہ سرا جو گال سے ملا ہوتا ہے وہ ناپاک ہے اس لئے کہ انسان کا جسم اور گوشت ناپاک ہے۔ لہٰذا بال کا وہ حصہ جو گال سے ملا ہوتا ہے ناپاک ہے۔ جبکہ بکر کا کہنا اس کے خلاف ہے کہ بال پاک ہیں اگر یہ مسجد میں گر جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ درست مدلل جواب عنایت فرما کر دونوں کے اختلاف کو ختم فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع کے موقع پر حلق فرما کر اپنے بال مبارک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیم فرمانا بالوں کے پاک ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اسی طرح فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق ہر وہ عضوِ حیوانی جس میں خون نہ ہو پاک ہے، بالوں میں بھی خون نہیں ہوتا اس لئے یہ بھی پاک ہیں البتہ وہ بال جن کو اکھیڑا جائے اور ان کے سروں پر جسم کی رطوبت پائی جائے تو ان بالوں کے سرے رطوبت کی وجہ سے ناپاک ہوں گے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں داڑھی کے وہ بال جن کو اکھیڑا گیا ہو، اور ان کے ساتھ جسم کی رطوبت بھی موجود ہو تو ان کے رطوبت والے سرے ناپاک ہوں گے اور ان کو مسجد میں گرنے سے بچایا جائے اگر گر جائیں تو ان کو اٹھا کر کسی محترم جگہ ڈال دیا جائے تاکہ انسان کے بالوں کی بے احترامی لازم نہ آئے۔

لمافي ابی داؤد(۱/۲۷۲): عن انس بن مالکؓ قال ان رسول الله ﷺ رمی جمرة العقبة يوم النحر ثم رجع الى منزله بمنى فدعا بذبح فذبح ثم دعا بالحلاق فأخذ بشق رأسه الايمن فحلقه فجعل يقسم بين من يليه الشعرة والشعرتين ثم أخذ بشق رأسه الأيسر فحلقه ثم قال ههنا ابو طلحة فدفعه إلى أبي طلحة.

وفي الهداية(۱/۴۰): وشعر الإنسان وعظمه طاهر وقال الشافعيؒ نجس لأنه لا ينتفع به ولا يجوز بيعه ولنا أن عدم الانتفاع والبيع لكرامته فلا يدل على نجاسته.

وفي قاضي خان(۱/۳۲):وان كان في المسجد عش خطاف لا بأس بأن يرمى بها تنزيهاً للمسجد.

وفي الشامية(۱/۲۰۷):(قوله وشعر الانسان) المراد به ما أبين منه حياً والإفطهارة ما على الانسان مستغنية عن البيان..... والأولىٰ اسقاط حياً وعن محمد في نجاسة شعر الأدمي وظفره وعظمه روايتان والصحيح الطهارة سراج (قوله غير المنتوف) أما المنتوف فنجس بحر والمراد رؤوسه التي فيها الدسومة. اقول وعليه فما يبقى بين اسنان المشط ينجس الماء القليل اذا بل فيه وقت التسريح لكن يؤخذ من المسألة الاتية كما قال ط ان ماخرج من الجلدمع الشعر ان لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء تأمل.

(۱۷۵) بالوں کے ساتھ نکلنے والی دسومت کے ناپاک ہونے کی علت اور مقدار ظفر کی تعیین

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہاء کل ما ليس بحدث ليس بنجس کا قاعدہ

ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ کی رُو سے وہ خون جو بدن سے نکلا تو ہو لیکن اس میں سیلان نہ ہو، وہ پاک ہے۔ لہٰذا اس قاعدہ کے تحت بدن سے بال اکھیڑنے کی صورت میں جو دسومت بال کیساتھ نکلتی ہے اس کو بھی پاک ہونا چاہیے حالانکہ فقہاء کرام نے اس کو ناپاک قرار دیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے پانی کو ناپاک قرار دینے کیلئے مقدار ظفر بیان فرماتے ہیں۔ مہربانی فرما کر دسومت کے ناپاک ہونے کی علت اور مقدار ظفر کی تعیین کی وجہ عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... بالوں کے ساتھ نکلی ہوئی دسومت بھی اس قاعدہ ''کل ما لیس بحدث لیس بنجس'' کے تحت داخل ہے کیونکہ اس قاعدہ کی رُو سے جس طرح خون کے نجس ہونے کیلئے سیلان ضروری ہے اسی طرح دسومت کے نجس ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ حد سیلان کو پہنچ جائے۔ اور اس دسومت سے پانی نجس ہونے کیلئے فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے مقدار ظفر بیان فرمائی ہے کیونکہ جب یہ مقدار ظفر کے برابر ہوگی تو اس میں کثیر ہونے کی وجہ سے سیلان بھی متحقق ہو جائے گا اور جب یہ سیلان کی صورت میں پانی میں گرے گی تو پانی نجس کر دے گی۔ نیز فقہاء کرامؒ نے اس مسئلہ میں مقدار ظفر کو کثیر کا معیار قرار دیا ہے یہ معیار صرف اس مسئلہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر کھال اور گوشت بھی مقدار ظفر کے برابر پانی میں گر جائیں تو بھی پانی ناپاک ہو جائے گا۔

لما في الشامية (۱/۲۰۷): (قوله وشعر الانسان) المراد به ما أبين منه حياً والا فطهارة ماعلى الانسان مستغنية عن البيان...... والأولىٰ اسقاط حياً وعن محمدؒ في نجاسة شعر الأدمي وظفره وعظمه روايتان والصحيح الطهارة سراج (قوله غير المنتوف) أما المنتوف فنجس بحر والمراد رؤوسه التي فيها الدسومة ...... قال ط أن ما خرج من الجلد مع الشعر إن لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء.

وفي تقريرات الرافعي (۱/۲۶): (قوله وظاهره أنه لو كان فيه دسومة الخ) وقال السندي نقلا عن الرحمتي ولم يحترز عن رطوبة في الظفر لأنها اذا لم تبلغ حد السيلان فليس بنجس على الأصح، ويظهر أن ما افسد الماء من الشعر المنتوف ونحوه لابد أن يكون ما فيه من النجاسة يبلغ حد السيلان ولذا قالوا إن الذي مع الشعر المنتوف إن لم يبلغ قدر الظفر لا يفسد الماء تأمل.

وفي طحطاوي على الدر (۱/۱۱۴): (قوله بوقوع قدر الظفر من جلده) أي قشره ويعدّ كثيراً لأن الجلد والقشر من جملة لحم الأدمي ويفهم منه أن الذي خرج من الجلد مع الشعر المنتوف منه إن لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء.

(۱۷۶) برساتی پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بارش کی وجہ سے سڑکوں پر جو کیچڑ ہوتی ہے اگر وہ کپڑوں کو لگ جائے اور اسی کے ساتھ نماز ادا کر لی جائے تو اس نماز کا کیا حکم ہوگا؟ کیچڑ کے مرئی اور غیر مرئی ہونے میں فرق ہے یا دونوں مساوی

حکم رکھتی ہیں؟ لہٰذا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... بارش وغیرہ کے پانی کی وجہ سے سڑکوں پر جو کیچڑ پیدا ہو جاتی ہے اگر نجاست کا اثر اس میں محسوس نہ ہو تو ضرورت اور عموم بلویٰ کی وجہ سے پاک ہے، لہٰذا ایسے کپڑوں کے ساتھ پڑھی گئی نماز درست ہے، البتہ احتیاطاً ایسے کپڑوں کو دھو کر نماز پڑھنا چاہئے۔

لمافي الطحطاوي علی الدر (۱/۱۶۱): وطين شارع...... لو اصاب الثوب ما سئل من الكنيف فالاحب ان يغسله ولا يجب مالم يكن اكبر رايه انه نجس (الى ان قال) والطين المسرقن والردغة فى الطريق فيها نجاسة طاهرة الا اذا راى عين النجاسة. بحر.

(۱۷۷) خروج ریح سے کپڑے ناپاک نہ ہونے کی وجہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احناف کے ہاں جو چیز ناقض وضو ہو وہ نجس بھی ہوتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ خروج ریح سے وضو تو ٹوٹ جاتا ہے لیکن شلوار وغیرہ کے پاک کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا، اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ وضاحت سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ یہ ضابطہ کہ جو چیز ناقض وضو ہے وہ نجس بھی ہے سبیلین کے علاوہ میں ہے اور سبیلین میں عموم ہے چاہے خارج نجس ہو یا پاک ہر صورت میں خروج ناقض وضو ہے، لہٰذا ریح کے خارج ہونے میں اصل علت خروج نجس نہیں ہے بلکہ ریح فی نفسہ پاک ہے، لیکن خروج چونکہ سبیلین سے پایا جا رہا ہے اس لئے ناقض وضو ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اگر سبیلین سے کنکری کا خروج ہو تو یہ ناقض وضو ہے حالانکہ یہ نجس نہیں ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا مرور نجاست سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس نجاست کے کچھ نہ کچھ اثرات پائے جاتے ہیں لیکن ان اثرات کا اعتبار اگر کپڑے کی طہارت وعدم طہارت کے اعتبار سے کیا جائے تو اس میں حرج بھی ہے لہٰذا ان اثرات کا اعتبار نقض وضو اور عدم نقض وضو میں تو کیا جاتا ہے لیکن کپڑوں کی طہارت وعدم طہارت میں نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے خروج ریح اگرچہ ناقض وضو ہے لیکن اس کی وجہ سے کپڑوں کی پاکی کا حکم نہیں دیا جاتا۔

لمافي التاتارخانية (۱/۱۱۴): وكذلك الريح الخارجة من الدبر واختلف المشايخ رحمهم الله أن عين الريح نجسة أوهي طاهرة الا انها تتنجس بمرورها على النجاسة قالوا: وفائدة هذاالخلاف فيما اذا خرج منه الريح وعليه سراويل مبتلة هل يتنجس سراويله؟ فمن قال عينها نجسة يقول يتنجس و من قال عينها ليست بنجسة يقول لايتنجس.

وفي الدر المختار (۱/۱۴۰): (و) كل (ماليس بحدث) أصلا بقرينة زيادة الباء كقيء قليل ودم لو ترك لم يسل (ليس بنجس)

وقال الشامي رحمه الله تعالیٰ تحته: (قوله ليس بنجس) أى لا يعرض له وصف النجاسة بسبب

خروجه بخلاف القليل من قيئ عين الخمر أو البول فإنه وان لم يكن حدثاً لقلته لكنه نجس بالإصالة لا بالخروج هذا ما ظهر لي تأمل.

وفي الشامية (۱/۱۳۵): (مثل ريح)فانها تنقض لانها منبعثة عن محل النجاسة لا لأن عينها نجسة لأن الصحيح أن عينها طاهرة حتى لو لبس سراويل مبتلة أو ابتل من أليتيه الموضع الذى تمر به الريح فخروج الريح لايتنجس وهو قول العامة وما نقل عن الحلوانى من أنه كان لا يصلى بسراويله فورع منه بحر.

﴿فصل فی الحکام الماء﴾

(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق احکام کا بیان)

(۱۷۸) مروجہ ٹینکیوں کا پانی ماء جاری شمار ہوگا؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے جامعہ کے پانی کی ٹینکی جبکہ اس میں پانی ایک طرف سے آرہا ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل رہا ہوتا ہے۔ نجاست گرنے کی صورت میں اس کا حکم ماء جاری کا ہوگا یا نہیں؟ جبکہ فتاویٰ عثمانی میں ٹینکی کو ماء جاری میں شمار کیا گیا ہے۔ کیا وہ اس طرح کی ٹینکی ہوگی جو ہمارے جامعہ کی ہے یا کسی اور نوعیت کی ٹینکی مراد ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... پانی کی ٹینکی ایسی ہو کہ ایک طرف سے پانی کی آمد اور دوسری طرف سے نکاسی کا سلسلہ ہو تو یہ ماء جاری کے حکم میں ہے نجاست گرنے کی صورت میں رنگ، بو اور مزہ میں تغیر نہ آئے تو ہر طرح اس کا استعمال درست ہے۔ اگر ٹینکی ایسی نہ ہو بلکہ ایک طرف سے بند ہو، صرف پانی کی آمد یا صرف نکاسی کا سلسلہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ ''دہ دردہ'' ہے یا عرض میں تو ''دہ دردہ'' نہیں ہے لیکن طول (لمبائی) اتنی ہے کہ اگر اس کے پانی کو پھیلایا جائے تو وہ دہ دردہ ہوسکتا ہے تو یہ ماء کثیر ہے، نجاست گرنے کی صورت میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو پاک ہے، اگر نجاست کا اثر ظاہر ہو جائے تو ناپاک۔ وله طول لا عرض لكنه يبلغ عشرا في عشر، جاز تيسيرا (الدر المختار، ۱۹۳/۱)

اگر ٹینکی مقدار میں چھوٹی ہو اور پانی کی آمد ورفت کا تسلسل بھی نہ ہو اور لمبائی بھی اتنی نہیں ہے کہ اگر اس کے پانی کو پھیلایا جائے تو دہ دردہ ہوسکے تو تھوڑی سی نجاست گرنے سے بھی ناپاک ہو جائے گی۔

نظیران ساری صورتوں کی حوض صغیر اور حوض الحمام ہے، حوض صغیر کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ حوض صغیر میں پانی ایک طرف سے آرہا ہو اور دوسری طرف سے نکل رہا ہو تو اس میں ہر طرف سے وضو جائز ہے۔ اذا كان الحوض صغيراً يدخل فيه الماء من جانب. ويخرج من جانب آخر يجوز الوضوء في جميع جوانبه وعليه الفتوىٰ. من غير تفصيل بين ان يكون اربعاً في اربع او اقل يجوز او اكثر فلا يجوز. (شرح الوقاية اولين ص ۷۸)

حوض کا پانی ساکن ہو پائپ وغیرہ کے ذریعے داخل نہ ہو رہا ہے نہ کوئی آدمی چلو بھر رہا ہے اس میں کوئی شخص اپنا ہاتھ ڈالے جبکہ ہاتھوں میں نجاست لگی ہو، تو وہ پانی ناپاک ہو جائے گا۔

فان ادخل رجل يده في الحوض وعليها نجاسة وان كان الماء ساكنا لايدخل فيه شئى من انبوبه ولايغترف منه

انسان بالقصعة يتنجس. (هنديه ١/١٨)

اگر لوگ چلو بھر بھر کر لے رہے ہوں لیکن پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل نہیں ہو رہا ہو یا اس کا عکس ہو کہ پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل ہو رہا ہے لیکن لوگ چلو بھر بھر کر نہیں لے رہے ہیں تو اس صورت میں اکثر فقہاء کے نزدیک نجس ہاتھ ڈالنے سے ناپاک ہو جائے گا۔

وان كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ولايدخل من الانبوب ماء او على العكس فاكثرهم على انه يتنجس. (هندية ١/١٨)

اگر لوگ چلو بھر بھر کر لے رہے ہوں اور پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی بھی داخل ہو رہا ہے تو اس صورت میں اکثر فقہاء کے نزدیک نجس ہاتھ ڈالنے سے پانی ناپاک نہ ہوگا۔

وان كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ويدخل الماء من الانبوب فاكثرهم على انه لايتنجس هكذا في فتاوىٰ قاضي خان و عليه الفتوىٰ. (هنديه ١/١٨)

حمام کے حوض کے بارے میں بعض متاخرین احناف فرماتے ہیں کہ ماء حمام امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر حال میں ماء جاری کی طرح ہے چاہے لوگ چلو بھر بھر کر لے رہے ہوں یا نہ لے رہے ہوں جبکہ پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل ہو رہا ہو۔

(ومنهم) اى من المتاخرين (من قال هو) اى ماء الحمام (عنده) أى عند ابى يوسف (بمنزلة الماء الجارى على كل حال تدارك) الاغتراف مع دخول الماء من الانبوب (اولا لاجل الضرورة). (كبيرى ص ١٠٠)

مذکورہ عبارات کی رو سے اگر آپ کے جامعہ کی ٹینکی ایسی ہو جیسا کہ سوال میں مذکور ہے یعنی ایک طرف سے پانی کی آمد اور دوسری طرف نکاسی کا تسلسل ہو تو ماء جاری کے حکم میں ہے، اگر نکاسی کا سلسلہ نہیں ہے تو دیکھیں گے کہ وہ دہ در دہ یا اس کے حکم میں ہے یا نہیں، اگر ہے تو بھی ماء کثیر شمار ہوگا نجاست گرنے کی صورت میں ناپاک نہ ہوگا بشرطیکہ نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو، اگر دہ در دہ نہیں تو نجاست گرنے سے ناپاک ہو جائے گا کیونکہ وہ ماء قلیل ہوگا۔

لمافي الهندية (١/١٧): اذا كان الحوض صغيراً يدخل فيه الماء من جانب ويخرج من جانب يجوز فيه الوضؤ من جميع جوانبه وعليه الفتوىٰ من غير تفصيل.

وفي الدر المختار (١/١٨٧): (و) يجوز (بجار وقعت فيه نجاسة و) الجارى (هو مايعد جارياً) عرفا وقيل مايذهب بتبنة والاول اظهر والثانى اشهر،

وفي الشامية تحته: العرف الان انه متى كان الماء داخلاً من جانب وخارجاً من جانب آخر يسمى جاريا وان قل الداخل.

وفيه ايضاً (١/١٩٠): والحقوا بالجارى حوض الحمام لوالماء نازلاً والغرف متدارك كحوض صغيريد خله الماء من جانب ويخرج من آخر يجوز التوضى من كل الجوانب مطلقاً به يفتى.

وفی الشامیة تحت : (قوله والحقوا بالجاری حوض الحمام) ای فی انه لاینجس الا بظهور اثر النجاسة، أقول: وکذا حوض غیر الحمام لانه فی الظهیریة ذکر هذا الحکم فی حوض اقل من عشر فی عشر ثم قال وکذالک حوض الحمام...... (قوله ویخرج من آخر) أی بنفسه او بغیره لما فی التاتارخانیة لوکان یدخله الماء ولایخرج منه لکن فیه انسان یغتسل ویخرج الماء باغتساله من الجانب الاخر متدارکاً لاینجس.

وفی الدر المختار (۱/۱۹۵): ثم المختار طهارة المتنجس بمجرد جریانه وکذا البئر وحوض الحمام

وفی الشامیة تحت : (قوله بمجرد جریانه)ای بأن یدخل من جانب ویخرج من آخر حال دخوله وان قل الخارج، بحر. قال ابن الشحنة لانه صار جاریاً حقیقةً وبخروج بعضه رفع الشک فی بقاء النجاسة فلا تبقی مع الشک.

وفی الشامیة(۱/۱۹۳): لم یذکر مقدار العمق إشارة إلی أنه لاتقدیر فیه فی ظاهرالروایة وهو الصحیح بدائع وصحح فی الهدایة أن یکون بحال لا ینحسر بالاغتراف أی لا ینکشف وعلیه الفتوی.

(۱۷۹) مخصوص وقت میں ٹینک میں پانی ایک جانب سے آ کر دوسری طرف جاتا ہو تو اس کے ماء جاری ہونے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ٹینک جس میں نل وغیرہ کے ذریعے سے پانی آتا ہے۔اور پھر آگے سپلائی بھی ہوتا ہے لیکن ہروقت ایسا نہیں ہوتا کہ پانی ایک طرف سے آرہا ہو،اوردوسری طرف سے جارہا ہو، بلکہ مخصوص وقت میں پانی آتا ہے۔اور مخصوص وقت کیلئے ہی پانی کی آگے سپلائی بھی کی جاتی ہے۔دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ پانی ماءجاری کے حکم میں ہوگا یا نہیں؟ نیز اگر دہ دردہ ٹینک میں نجاست وغیرہ گرجائے اوراوصاف ثلاثہ میں سے کوئی ایک متغیر ہوجائے تو اس ٹینک کی صفائی کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً......جس وقت ٹینک میں پانی داخل ہورہا ہے اگراسی وقت آگے سپلائی بھی ہورہا ہے پھر تو یہ ماءجاری کے حکم میں ہے لیکن اگر پانی ایک خاص وقت میں ٹینک میں داخل ہوتا ہے پھر بعد میں کسی وقت پانی آگے سپلائی ہوتا ہے جیسا کہ اوپر سوال میں مذکور ہے پھر یہ ماءجاری کے حکم میں نہیں ہے۔دہ دردہ ٹینک میں نجاست گرنے سے پانی کے اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف متغیر ہوجائے تو پانی

نجس ہوجاتا ہے۔ اور اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُس ٹینک کے تمام پانی کو نکال دیا جائے لہٰذا تمام پانی نکالنے کے بعد ٹینک پاک ہوجائے گا۔

لما في الشامية(۱/۱۸۹): واذا وصل إلى الحياض في البيوت متغيرا ونزل في حوض صغير أو كبير فهو نجس وإن زال تغيره بنفسه لان الماء النجس لا يطهر بتغيره بنفسه إلا اذا جرى بعد ذالك بماء صاف فانه حينئذ يطهر.

وفي الدرالمختار (۱/۱۹۵): ثم المختار طهارة المتنجس بمجرد جريانه وكذا البئر وحوض الحمام.

وفي الشامية تحته: (قوله بمجرد جريانه) اى بأن يدخل من جانب ويخرج من اخر حال دخوله وان قل الخارج بحر: قال ابن الشحنة: لانه صار جاريا حقيقةً، وبخروج بعضه رفع الشك في بقاء النجاسة فلاتبقى مع الشك اهـ وقيل لايطهر حتى يخرج قدر مافيه، وقيل ثلاثة أمثاله بحر، فلو خرج بلا دخول كأن ثقب منه ثقب فليس بجار.

وفي الشامية (۱/۲۱۶): (قوله بخلاف نحو صهريج وحب الخ) الصهريج الحوض الكبير يجتمع فيه الماء قاموس...... واراد بذالك الرد على من أفتى بنزح عشرين في فأرة وقعت في صهريج...... إن الفأرة لووقعت في الحب يهراق الماء كله، قال: ووجهه أن الاكتفاء بنزح البعض في الابار على خلاف القياس باالاثار فلا يلحق بها غيرها.

(۱۸۰) چھوٹی ٹینکی میں چڑیا کے گرنے سے پانی نجس ہوجاتا ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک ٹینکی ہے جس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی وگہرائی چار فٹ ہے، اس کے اندر ایک چڑیا گر کر مرگئی ہے معلوم نہیں کہ کب سے گری ہے تو اب اس پانی کا کیا حکم ہے اور ہماری نمازوں کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہوگا نیز اس ٹینکی کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مذکورہ ٹینکی کا پانی نجس ہوگیا ہے چڑیا کے مرنے کی وجہ سے۔ اور اگر یہ چڑیا پھول گئی یا پھٹ گئی ہے تو تین دن وتین راتوں کی نمازوں کو لوٹانا بھی ضروری ہوگا۔ اور اگر چڑیا پھولی یا پھٹی نہیں ہے تو صرف ایک دن وایک رات کی نمازیں لوٹانا ضروری ہوں گی۔ ٹینکی کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اس کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ اس کے پانی کو نکالا جائے گا۔

لما في نور الايضاح(ص۲۸۔۳۰): الرابع. ماء نجس وهو الذى حلت فيه نجاسة وكان راكداً قليلا والقليل مادون عشر في عشر. فينجس ووجود حيوان ميت فيها ينجسها من يوم وليلة ومنتفخ من

ثلاثة ايام ولياليها ان لم يعلم وقت وقوعه.

وفي البحر الرائق(۱/۲۱۴): وفي الكافي، والمستصفى، والبدائع ان الفارة اذا وقعت في الحب بالحاء المهملة، يهراق الماء كله ولم يعلل له، ووجهه ان الاكتفاء بنزح البعض مخصوص بالآبار ثبت بالآثار على خلاف القياس فلا يلحق به غيره فعلى هذا اذا وقعت الفارة في الصهريج او في الفسقية ولم يكونا عشراً في عشر فان الماء كله يهراق كمالا يخفى.

وفي الشامية(۱/۲۱۶): (قوله بخلاف نحو الصهريج وحب الخ) الصهريج الحوض الكبير يجتمع فيه الماء قاموس...... واراد بذالک الرد على من افتى بنزح عشرين في فأرة وقعت في صهريج ...... ان الفارة لو وقعت في الحب يهراق الماء كله قال ووجهه ان الاكتفاء بنزح البعض في الابار على خلاف القياس بالاثار فلا يلحق بها غيرها. انتهى قوله.

(قوله يهراق الماء كله) اقول وهل يطهر بمجرد ذالک ام لابد من غسله بعده ثلاثا والظاهر الثاني ثم رايتهٔ في التاتارخانية قال مانصه وفي فتاوى الحجة سئل عبدالله بن المبارک عن الحب المركب في الارض تنجس قال يغسل ثلاثا ويخرج الماء منه كل مرة فيطهر.

(۱۸۱) کیا ٹینک میں جوتا گرنے سے پانی نجس ہو جاتا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک زمین دوز ٹینک ہے جس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی چار فٹ اور گہرائی آٹھ فٹ ہے ایک دن بچے کھیل رہے تھے تو ایک نے دوسرے کو جوتا مارا اور وہ جوتا ٹینکی میں گر گیا اب اس پانی کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جوتا اگر پاک ہے تو پانی نجس نہیں ہوگا اور اگر جوتا ناپاک ہے تو اس صورت میں پانی ناپاک ہو جائے گا اور اگر جوتے کا پتہ نہیں پاک ہے یا ناپاک تو باقاعدہ الأصل في الأشياء الاباحة کے تحت اس کو پاک سمجھا جائے گا اور پانی پاک ہوگا۔

لمافي بدائع الصنائع(۱/۲۰۴،۲۰۵،۲۰۴): وقال عامة العلماء: ان كان الماء قليلا ينجس وان كان كثيراً لا ينجس لكنهم اختلفوا في الحد الفاصل بين القليل والكثير...... وقال اصحابنا ان كان بحال يخلص بعضه الى بعض فهو قليل وان كان لا يخلص فهو كثير...... فاتفقت الروايات عن اصحابنا انه يعتبر الخلوص بالتحريک وهو انه ان كان بحال لو حرک طرف منه يتحرک الطرف الاخر فهو مما يخلص وان كان لا يتحرک فهو ممالا يخلص ...... وروي عن محمدؒ انه قدره بمسجده فكان

مسجده ثمانياً في ثمان وبه اخذ محمد بن سلمة وقيل كان مسجده عشراً في عشر: وقيل مسح مسجده فوجد داخله ثمانياً في ثمان وخارجه عشرا في عشر.

وفي الدرالمختار (۱/۱۹۲): وانت خبير بأن اعتبار العشر اضبط ولا سيما في حق من لا رأى له من العوام فلذا افتى به المتاخرون الأعلام.

وفي الدر المختار مع الشامية (۱/۱۰۵): (قاعده) الأصل في الأشياء الإباحة.

(۱۸۲) کنویں میں اگر گمراہ عقائد رکھنے والا شخص اتر جائے تو پانی کا کیا حکم ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کنویں کے کنارے بچے کھیل رہے تھے ایک بچے نے قیمتی گھڑی پہنی ہوئی تھی اس نے اتار کر رکھ دی تاکہ کھیل میں خراب نہ ہوجائے دوسرے بچے نے اٹھا کر گھڑی کنویں میں ڈال دی، گھڑی نکالنے کیلئے کوئی شخص کنویں میں نہیں اتر رہا تھا اتنے میں ایک شخص آ گیا جو اہل تشیع میں سے تھا اس نے کنویں میں جا کر گھڑی نکال لی اب بعض لوگ کہہ رہے ہیں چونکہ شیعہ بدترین کافر ہیں ان کا پانی میں جانا خنزیر کے جانے کے برابر ہے یہ سارا پانی نجس ہے جب تک نکالا نہ جائے کنواں پاک نہیں ہوگا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی شیعہ عقائد والے شخص کے پانی میں داخل ہونے سے پانی ناپاک ہوجائے گا؟ اب اس کنویں کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....نجاست کی دو قسمیں ہیں: ۱۔نجاست حقیقیہ (جیسے پیشاب پائخانہ خون وغیرہ)، ۲۔نجاست حکمیہ (جیسے بے وضو ہونا یا حالت جنابت میں ہونا)۔ نجاست حقیقیہ کے گرنے سے کنواں ناپاک ہوجاتا ہے، نجاست حکمیہ سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کنویں میں اترنے والے شخص کے بدن یا کپڑوں پر اگر نجاست لگی ہوئی تھی تو کنویں کا پانی نجس ہوگیا ہے، اگر اس کے بدن یا کپڑوں میں نجاست لگی ہوئی نہ تھی تو کنویں کا پانی پاک ہے البتہ احتیاطاً بیس ڈول پانی نکال دیا جائے۔

لما في البحرالرائق (۱/۱۷۷): ثم رأيت بعد هذا العلامة ابن امير حاج في شرح منية المصلي صرح بما ذكرته وقال: الماء المستعمل هو الماء الذي لاقى الرجل الذي زال حدثه فيجب نزح جميع الماء على رواية نجاسة الماء المستعمل ولا يجب نزح شئي منها على رواية طهارته بل هو باق على طهوريته، وقد عرفت ان رواية الطهارة هي المختارة اهـ. فعلى هذا قولهم صار الماء مستعملا معناه صار الماء الملاقي للبدن مستعملا لا أن جميع ماء البئر صار مستعملا.

وفي الشامية (۱/۲۱۳): (قوله كآدمي محدث) اى انه ينزح فيه أربعون كما عزاه في التتارخانية إلى فتاوى الحجة ...... وفي شرح الوهبانية: والتحقيق النزح للجميع عند الامام والثاني على القول بنجاسة الماء المستعمل، وقيل أربعون عنده، ومذهب محمد أنه يسلبه الطهورية، وهو الصحيح

عند الشيخين فينزح منه عشرون ليصير طهوراً وتمامه فيه، والمراد بالمحدث مايشمل الجنب.

وفيه ايضاً(۲۱۴/۱): واستشكل في البدائع نزح العشرين بأن الماء المستعمل طاهر فلم يضر مالم يغلب على المطلق كسائر المائعات، ثم قال: ويحتمل ان يقال طهارته غير مقطوع بها للخلاف فيها، بخلاف سائر المائعات، فينزح أدنى ماورد به الشرع وذالک عشرون احتياطاً.

(۱۸۳) کبوتر وغیرہ کے کنویں میں گرنے کے بعد نہ ملنے پر کنویں کی پاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا ایک کنواں ہے جس سے ہم پانی لیتے رہتے ہیں اس کنویں میں دو کبوتر گر گئے باوجود تلاش کرنے کے وہ نہیں ملے تو اس کنویں سے پانی پینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کنویں کو کس طرح پاک کریں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کنویں میں اگر حیوان گر کر پھول جائے یا پھٹ جائے خواہ حیوان چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گری پڑی نجس چیز کو پہلے نکال لیا جائے پھر اس کے بعد کنویں میں موجود سارا پانی نکال لیا جائے اور اگر کنواں چشمے دار ہو تو دوسو ڈول وجوباً اور تین سو ڈول استحباباً نکال لئے جائیں اب مذکورہ بالا صورت میں یہ بات تو ظاہر ہے کہ کبوتر پھول و پھٹ گئے ہوں گے لیکن چونکہ تلاش کرنے کے بعد نہیں ملے جبکہ پاکی کیلئے نجس چیز کا پہلے، نکالنا ضروری ہے اس لئے فی الحال اس کنویں کو چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ پانی میں حلول کر کے کیچڑ بن گئے ہوں گے بعض فقہاء کرام نے اس مدت کا اندازہ چھ ماہ سے لگایا ہے لہٰذا اتنی مدت گزر جانے کے بعد اس کنویں کا سارا پانی اور اگر کنواں چشمے دار ہو تو تین سو ڈول نکال لئے جائیں تو وہ کنواں پاک ہو جائے گا اس سے قبل اس کنویں سے پانی پینا جائز نہیں ہے۔

لمافي الشامية (۲۱۲/۱): أنه لابد من إخراج عين النجاسة كلحم ميتة وخنزير اهـ ح قلت فلو تعذر ايضاً ففي القهستاني عن الجواهر. لووقع عصفور فيها فعجزوا عن اخراجه فما دام فيها فنجسة فتترک البئر مدة يعلم انه استحال وصار حمأة وقبل مدة ستة اشهر.

وفي الفقه الأسلامي(۲۹۱/۱): وينزح مابين اربعين دلواً الى ستين دلواً اذا كان الحيوان ذا حجم متوسط مثل الحمامة والدجاجة ......وفي الاثنين من هذه الحيوانات ينزح الماء كله.

وفي الدر المختار (۲۱۴/۱،۲۱۵): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبي (يؤخذ ذلک بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتي وقيل يفتى بمائة إلى ثلثمائة وهذا ايسرو ذاک احوط.

(۱۸۴) جوتے کنویں میں گرنے سے کنویں کی ناپاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے جوتے کنویں میں گر گئے جن کے پاک یا ناپاک ہونے کے بارے میں معلوم نہیں، تو ایسی صورت میں یہ کنواں ناپاک ہوگیا یا نہیں؟ کیا اس سے وضو وغیرہ کیلئے پانی لے سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر جوتوں کے بارے میں ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کنواں ناپاک شمار ہوگا، اور اگر ان کے پاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کنواں پاک شمار ہوگا، اور اگر دونوں جانب کسی بارے میں یقین یا ظن غالب نہ ہو تو یہ کنواں پاک شمار ہوگا اس کا پانی استعمال کرنا صحیح ہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۵): ويجوز للرجل ان يتوضأ من الحوض الذي يخاف ان يكون فيه قذر ولا يتقين به وليس عليه ان يسأل عنه ولا يدع التوضؤ منه حتى يتقين ان فيه قذراً للاثر.

وفي ردالمحتار (۱/۱۵۱): في التاتارخانية من شك في انائه او ثوبه او بدنه اصابته نجاسة اولا فهو طاهر مالم يستيقن، وكذا الآبار والحياض والحباب الموضوعة في الطرقات ويستقي منها الصغار والكبار والمسلمون والكفار.

(۱۸۵) کنویں میں نجاست گرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے قریب ایک کنواں ہے جس سے گاؤں کے لوگ پانی لیتے ہیں ایک دن اس کنویں میں ایک بکری گر گئی اس کو تو ہم نے زندہ نکال لیا لیکن نکالتے وقت اس نے کنویں میں پیشاب کر دیا اب لوگ اس سے پانی نہیں لیتے اور دوسری جگہ سے پانی لانے میں دشواری بہت ہے سارے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ مفتی صاحب سے مسئلہ معلوم کرلیں جیسے وہ فرمائیں گے ویسے عمل کریں آپ بتائیں کہ یہ کنواں ناپاک ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ناپاک ہے تو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا جبکہ پانی نکالنا بہت ہی مشکل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱)۔ بکری کا پیشاب نجس ہے، کنویں میں نجاست گرنے سے سارا پانی ناپاک ہوگا لہٰذا صورت مسئولہ میں کنواں ناپاک ہو چکا ہے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا سارا پانی نکالا جائے۔

(۲)۔ اگر سارا پانی نہ نکل سکے تو پھر دو عادل آدمی جو پانی کے معاملے میں مہارت رکھتے ہوں، ان کو بلایا جائے، وہ جتنا اندازہ لگائیں اسی مقدار میں پانی نکالا جائے۔

(۳)۔ البتہ اگر اس پر بھی عمل درآمد مشکل ہے مثلاً ماہرین ملتے نہیں یا ان کے قول پر عمل کرنے سے پانی نکلوانے پر زرِ کثیر لازم آئے گا تو ایسی صورت میں تین سو ڈول تک نکالنے سے کنواں پاک ہوگا۔ لیکن احتیاط بہرحال دو ماہر عادل آدمیوں کے قول پر عمل کرنے کی صورت

میں ہے۔

لمافي البحر الرائق(۱/۱۰۲): قوله (وبول مايوكل نجس) انما ذكرها هنا وان كان محلها باب الانجاس لبيان أنّه اذا وقع في البئر نجس ماء ها، وهذا عند ابي حنيفة وابي يوسف، و قال محمدٌ طاهر، فلا ينزح الماء من وقوعه الا اذا غلب على الماء فيخرج من أن يكون طهوراً.

وفيه ايضاً (۱/۲۱۲):وقوله (ومائتان لولم يمكن نزحها)............... وعن أبي نصر أنه يوتى برجلين لهما بصارة بأمر الماء فاذا قدراه بشئ وجب نزح ذالك القدر وهو الاصح والاشبه بالفقه...... والافتاء بما عن محمد اسهل على الناس والعمل بما عن أبي نصر أحوط.

وفي الدرالمختار(۱/۲۱۱): اذا وقعت نجاسة...... ولو مخففة او قطرة بول...... ينزح كل مائها.

وفي الشامية تحته:(قوله او قطرة بول) أي ولو بول مأكول اللحم.

وفي الدرالمختار(۱/۲۱۴): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معيناً (فيقدر ما فيها) وقت النزح قاله الحلبي (يؤخذ ذالك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتي وقيل يفتي بمائة الىٰ ثلثمائة وهذا أيسر وذاك احوط:

وفي الشامية تحته: (قوله به يفتي) وهو الاصح، كافي ودرر. وهو الصحيح، وعليه الفتوى. ابن كمال: وهو المختار: معراج. وهو الاشبه بالفقه: هداية:

.........علىٰ انهم قالوا ان محمداً أفتي بما شاهد في ابار بغداد فانها كثيرة الماء وكذا ماروى عن الامام من نزح مائة في مثل آبار الكوفة لقلة مائها فيرجع الى القول الأول لأنه تقدير ممن له بصارة وخبرة بالماء في تلك النواحي لالكون ذالك لازماً في ابار كل جهة.

(۱۸۶) پاکی حاصل کرنے سے جھیل ناپاک نہیں ہوتی

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک بڑی سی جھیل ہے جس میں ہم لوگ گرمیوں میں ظہر سے پہلے غسل کرتے ہیں اور پھر نماز پڑھتے ہیں، چندن پہلے ایک صاحب ہمارے علاقے میں آئے اور ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ لوگوں کا اس طرح غسل کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ لوگ مٹی سے استنجاء کرتے ہیں جس کے بعد جھیل پر جاکر غسل کرتے ہیں جس سے سارا پانی ناپاک ہوجاتا ہے لہٰذا آپ لوگوں کی نماز بھی نہیں ہوتی، کیا یہ بات صحیح ہے اگر صحیح ہے تو ہمیں کافی عرصہ ہوگیا اسی طرح نمازیں پڑھتے ہوئے، ہماری پہلی نمازوں کا کیا بنے گا؟ کیا انہیں دوبارہ ادا کرنا چاہیے؟ جلد از جلد جواب دے کر ہماری اس پریشانی کو دور فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں مٹی سے استنجاء کرنے کے بعد اگر دہ دردہ سے کم مقدار پانی میں غسل کیا جائے تو وہ پانی ناپاک ہوجاتا ہے لیکن اگر پانی کی مقدار دہ دردہ سے زیادہ ہو جیسا کہ آپ کے سوال سے ظاہر ہورہا ہے تو ایسا پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ جھیل میں غسل کرنے کے بعد آپ لوگوں کی نماز کی ادائیگی صحیح ہے لہٰذا نمازوں کے دوبارہ لوٹانے کی بھی ضرورت نہیں۔

لمافي الهندية (۱/۴۸): ثم الاستنجاء بالاحجار انما يجوز اذا اقتصرت النجاسة على موضع الحدث فاما اذا تعدت موضعها بان جاوزت الشرج اجمعوا على ان ماجاوز موضع الشرج من النجاسة اذاكانت اكثر من قدر الدرهم يفترض غسلها.

وفي ردالمحتار (۱/۳۳۷): السنة هو الاستنجاء بالاشياء الطاهرة من الاحجار والامداد والتراب والخرق البوالي..... قال في السراج ولم يرد به حقيقة الانقاء بل تقليل النجاسة اهـ ولذا يتنجس الماء القليل اذا دخله المستنجي.

(۱۸۷) تالاب کا گندا پانی صاف کرنے کے بعد بھی ناپاک رہے گا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے قریب ایک بڑا تالاب ہے جس میں پورے گاؤں کا گندا پانی جمع ہوتا ہے۔ اب حکومت نے اس پر مشینیں لگائی ہیں جو پانی کو صاف کرتی ہیں۔ پھر اس پانی کو ٹینکروں کے ذریعے دوسرے مقامات پر منتقل کیا جاتا ہے وہاں کے لوگ اس پانی کو استعمال کرتے ہیں آیا یہ پانی پاک ہے یا ناپاک اس کا استعمال کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....نجاست کی ماہیت اگر تبدیل ہوجائے تو انقلاب ماہیت کی وجہ سے وہ پاک ہوجاتی ہے انقلاب ماہیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلی والی حقیقت معدوم ہوکر نئی حقیقت بن جائے، نہ پہلی حقیقت و ماہیت باقی رہے نہ اس کا نام باقی رہے نہ اس کی صورت وکیفیت اور نہ اس کے خواص وآثار باقی رہیں بلکہ سب چیزیں نئی ہوجائیں۔ جیسے گدھا وغیرہ نمک کی کان میں گر کر نمک بن جائے، اور شراب سے سرکہ بنالیا جائے۔

صورت مسئولہ میں چونکہ انقلاب ماہیت کی کوئی صورت نہیں ہے بلکہ گندے پانی کے متعفن اور ضرر رساں اجزاء کو نکال کر پانی کو صاف کیا گیا ہے اور جو اجزاء بچے ہیں وہ اسی پانی کے اجزاء ہیں لہٰذا وہ بھی نجس اور ناپاک رہیں گے۔

لمافي الشامية (۱/۳۱۵): (و) يطهر (زيت) تنجس (بجعله صابونا) به يفتى للبلوى الخ الدر المختار وقال الشامي تحته: (قوله ويطهر زيت الخ) قد ذكر هذه المسئلة العلامة قاسم في فتاواه ...... ثم هذه المسئلة قد فرعوها على قول محمد بالطهارة بانقلاب العين الذي عليه الفتوى واختاره اكثر المشائخ خلافا لابي يوسف كمافي شرح المنية والفتح وغيرهما. وعبارة المجتبى: جعل الدهن النجس في

صابون یفتی بطهارته لانه تغیر والتغیر یطهر عند محمد، ویفتی به للبلوی اهـ وظاهره ان دهن المیتة کذلک لتعبیره بالنجس دون المتنجس الا ان یقال هو خاص بالنجس لان العادة فی الصابون وضع الزیت دون بقیة الادهان تأمل ثم رایت فی شرح المنیة مایؤید الاول حیث قال: وعلیه یتفرع مالو وقع انسان او کلب فی قدر الصابون فصار صابونا یکون طاهرالتبدل الحقیقة اهـ.

ثم اعلم ان العلة عند محمد هی التغیر وانقلاب الحقیقة وانه یفتی به للبلوی کماعلم ممامرّ، ومقتضاه عدم اختصاص ذلک الحکم بالصابون، فیدخل فیه کل ما کان فیه تغیر وانقلاب حقیقة وکان فیه بلوی عامة ....

قلت: لکن قد یقال: ان الدبس لیس فیه انقلاب حقیقة لانه عصیر جمد بالطبخ، وکذا السمسم اذا درس واختلط دهنه باجزائه ففیه تغیر وصف فقط، کلبن صارجبنا، وبرصار طحینا، وطحین صار خبزا، بخلاف نحو خمر صارخلا، وحمار وقع فی مملحة فصار ملحا، وکذا دردی خمر صار طرطیرا، وعذرة صارت رمادا او حمأة، فان ذلک کله انقلاب حقیقة الی حقیقة اخری لامجرد انقلاب وصف کما سیاتی، والله اعلم.

وایضا فی الدر المختار (۱/۳۲۶): (لا) یکون نجسا (رما دقذر) والالزم نجاسة الخبز فی سائر الامصار (و) لا (ملح کان حمارا) او خنزیرا ولا قذر وقع فی بئر فصار حمأة لانقلاب العین، به یفتی. وقال ابن عابدین الشامی رحمه الله تحته: (قوله کان حمارا او خنزیرا) افاد ان الحمار مثال لا قیداحترازی، واشار باطلاقه الی انه لا یلزم وقوعه وهو حی، فانه لو وقع فی المملحة بعد موته فهو کذلک کمافی شرح المنیة الخ.

وفی الدر المختار (۱/۱۸۰): (و) یرفع (بماء ینعقد به ملح لا بماء) حاصل بزوبان (ملح) لبقاء الاول علی طبیعته الاصلیة، وانقلاب الثانی الی طبیعة الملحیة. وقال الشامی رحمه الله تحته (قوله لبقاء الاول الخ)...... وقال الزیلعی: ولا یجوز بماء الملح، وهو ما یجمد فی الصیف ویذوب فی الشتاء عکس الماء، و اقره صاحب البحر والعلامة المقدسی، ومقتضاه انه لا یجوز بماء الملح مطلقا: ای سواء انعقد ملحا ثم ذاب ام لا؟ وهو الصواب عندی اهـ ملخصا.

(۱۸۸) نالے کے ذریعے نہر سے آنے والے صاف پانی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے قریب ایک نالہ ہے جس میں شہر کا

گندہ پانی آتا رہتا ہے اب کبھی کبھی اس کے ذریعے لوگ نہر کا پانی اپنے کھیتوں تک لے جاتے ہیں جب نہر والا پانی اس نالے میں آجاتا ہے تو یہ پانی بالکل صاف ہوتا ہے حالانکہ اس میں گٹروں والا پانی بھی مل رہا ہوتا ہے تو بعض لوگ اس پانی کو پیتے اور وضو کرتے ہیں تو کیا ایسے پانی سے وضو کرنا اور اس کو پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جس پانی کا ذکر ہے وہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہے ماء جاری کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ جب تک اس کے اوصاف ثلاثہ یعنی رنگ، بو اور مزہ میں سے کوئی ایک تبدیل نہ ہو جائے تو وہ پاک ہے۔اس سے وضو کرنا اور اس کو استعمال میں لانا جائز ہے۔جیسا کہ عالمگیری میں اس کی صراحت ہے"ماء النهر او القناة اذا احتمل عذرة فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر مالم يتغير طعمه أو لونه أو ريحه"(عالمگیری، ۱/۱۷)

لـمافي مجمع الانهر (۱/۴۸): فأمّا أن يكون الماء جارياً أو راكداً فان كان جارياً إن كانت النجاسة غير مرئية فإنه لا يتنجس مالم يتغير طعمه الخ.

وفـي قـاضيخـان (۱/۳): (مـاء الـنهـر أو القناة) اذا احتمل عذرةً فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر مالم يتغير طعمه أو لونه أو ريحه بالنجاسة.

وفـي عالمگيرى (۱/۱۷): وفي النصاب والفتوىٰ في الماء الجارى أنه لا يتنجس مالم يتغير طعمه أو لونه أو ريحه من النجاسة.

وإن كانت العذرة عـلـى الـسـطـح فـي مـواضـع متفرقة ولم تكن على رأس الميزاب لا يكون نجسا وحكمه حكم الماء الجارى......

مـاء النهر أو القناة اذا احتمل عذرة فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر مالم يتغير طعمه أو لونه او ريحه......

(۱۸۹) ایسے تالاب سے وضو کرنا جس میں گندگی کے اثرات ظاہر ہوں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک تالاب ہے جس میں لوگ جانوروں کو پانی پلاتے ہیں، پانی پیتے وقت جانور اس میں پیشاب وغیرہ بھی کرتے ہیں لیکن یہ سب ایک طرف ہوتا ہے دوسری طرف سے کوئی جانور نہ تو پانی پیتا ہے اور نہ پیشاب وغیرہ کرتا ہے البتہ اس طرف بھی گندگی کے اثرات پائے جاتے ہیں مثلاً پانی میں بدبو وغیرہ کیا ایسے تالاب سے وضو کرنا جائز ہے؟ اس تالاب کی لمبائی تقریباً چالیس فٹ اور چوڑائی بیس فٹ ہے۔قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پانی کے تین اوصاف (رنگ، بو، ذائقہ) میں سے کوئی ایک وصف نجاست کی وجہ سے تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ناپاک شمار ہوتا ہے اگرچہ اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، لہٰذا مذکورہ تالاب کا پانی ناپاک ہے اس سے وضو

کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۸): الماء الراكد اذا كان كثيرا فهو بمنزلة الجاری لا يتنجس جميعه بوقوع النجاسة فی طرف منه الا ان يتغير لونه او طعمه اوريحه و علی هذا اتفق العلماء وبه اخذ عامة المشائخ كذا فی المحيط.

وفی الدرالمختار (۱/۱۸۵): (وبتغير احد اوصافه) من لون او طعم او ريح (ينجس) الكثير ولو جارياً اجماعاً، اما القليل فينجس وان لم يتغير.

(۱۹۰) اگر لائن کے پانی میں سخت بدبو آ رہی ہو، تو کیا حکم ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ روز ہمارے گھر جو لائن کا پانی آیا وہ دیکھنے میں تو صاف ہے لیکن اس میں سے گٹر کے پانی کی سخت بو آ رہی ہے، ہمارے گھر گزشتہ ایک ہفتہ سے میٹھا پانی بالکل نہیں ہے، آیا اب ہم اس پانی کو کسی اور استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر اس پانی کے بارے میں آپ کا غالب گمان یہ ہے کہ اس پانی میں گٹر کا پانی مل گیا ہے، جبکہ گٹر کے پانی کا پینے کے پانی کی لائن کے ساتھ مل جانا ممکن بھی ہو اور اس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں تو پھر یہ پانی ناپاک ہے اس کا استعمال درست نہیں ہے، اور اگر اس پانی کے ساتھ گٹر کے پانی کے مل جانے کا غالب گمان نہیں ہے محض شک ہے تو پھر یہ پانی پاک ہے اور اس پانی کا استعمال کرنا ہر طرح سے درست ہے اور اس شک کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ پانی میں اصل طہارت ہے لہٰذا جب تک اس کے ناپاک ہونے کا یقین یا غالب گمان نہ ہو اسے ناپاک نہیں کہا جائے گا اور اس پانی کے بارے میں مزید تحقیق وجستجو کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

لمافی الولوالجية (۱/۳۹): الماء اذا انتن وهو كثير ان علم بوقوع النجاسة او جيفة فيه يتنجس الماء

وفی ردالمحتار (۱/۱۸۶): (قوله لالو تغير الخ) أی لاينجس لو تغير فهو عطف علی قوله وينجس لاعلی قوله بموت فتامل ممعنا. (قوله فلو علم الخ) صرح به لزيادة التوضيح والافهو داخل تحت قول المصنف وبتغير احد اوصافه بنجس. (قوله ولو شک الخ) ای ولايلزم السوال بحر، وفيه عن المبتغی بالغين وبرؤية آثار اقدام الوحوش عند الماء القليل لايتوضاء به ولو مرسبع بالركية وغلب علی ظنه شربه منها تنجس والافلا اهـ، وينبغی حمل الاول علی ما اذا غلب علی ظنه ان الوحوش شربت منه بدليل الفرع الثانی والافمجرد الشک لايمنع لما فيه الاصل انه يتوضأ من الحوض الذی يخاف قذرا ولا يتيقنه وينبغی حمل التيقن المذكور علی غلبة الظن و الخوف علی الشک أو الوهم كما لا يخفی اهـ.

﴿فصل فی احکام الجنب والمعذور﴾

(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۹۱) حالت جنابت میں کھانے پینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو غسل جنابت کی حاجت ہو اور وہ غسل کو مؤخر کر کے اسی حالت میں کھاتا پیتا رہے تو کیا ایسی حالت میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جنابت کی حالت میں کھانا پینا جائز ہے۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ پہلے ہاتھ دھوئے اور کلی کر لے۔

لمافي الهندية (۱/۱٦): وان أراد أن يأكل اويشرب فينبغي أن يتمضمض ويغسل يديه.

وفي رد المحتار (۱/۱۷۵): (قوله بعد غسل يد وفم) اما قبله فلا ينبغي لانه يصير شاربا للماء المستعمل وهو مكروه تنزيها ويده لاتخلو عن النجاسة فينبغي غسلها ثم يأكل. بدائع وفي الخزانة وان ترك لايضره.

(۱۹۲) حالت جنابت یا ہمبستری میں بچے کو دودھ پلانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص عورت سے ہمبستری کر رہا تھا کہ اچانک بچے نے رونا شروع کر دیا عورت نے اسی حالت میں بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا، تو کیا شرعاً جماع کی حالت میں بچے کو دودھ پلانا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... درست ہے۔

لمافي المبسوط للسرخسي (۱/۷۰): (واذا عرق الجنب أو الحائض في ثوب لم يضره)...... لانه ليس على بدن الانسان الجنب والحائض نجاسة عينية فهو واعضاء المحدث سواءٌ.

وفي ردالمحتار (۱/۲۹۲): ولايكره طبخها ولااستعمال مامسته من عجين أو ماء أو نحوهما.

(۱۹۳) جنبی کیلئے بال اور ناخن کاٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ جس کے اوپر غسل فرض

ہو، اس کو حالت جنابت میں ناخن اور بال نہیں کاٹنے چاہئیں، کیا یہ بات صحیح ہے یا اس حالت میں ناخن بال کاٹنے کی گنجائش ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جس آدمی پر غسل واجب ہو اس کیلئے ناخن اور بال کاٹنا جائز ہے، البتہ اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ طہارت کی حالت میں ان امور سے فارغ ہو جانا چاہیے۔

لمافي البخاري (۱/۴۲): قال عطاء: يحتجم الجنب ويقلم أظفاره ويحلق رأسه و ان لم يتوضأ

وفي الهندية (۵/۳۵۸): حلق الشعر حالة الجنابة مكروه وكذا قص الاظافير كذا في الغرائب.

وفي معارف السنن (۱/۴۰۰): ويجوز للجنب جميع المعاملات اللتي يفعلها الطاهر الغير الجنب ...... ماعدا دخول المسجد و الطواف وقرأة القرآن.

(۱۹۴) ناپاکی کی حالت میں دعا و تسبیح کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو احتلام ہو جائے تو ناپاکی کی حالت میں نیند سے بیدار ہونے کی دعا، بیت الخلاء میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حالت جنابت (خواہ وہ احتلام کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے) میں ہر طرح کی دعا پڑھنا، ذکر کرنا تسبیح پڑھنا جائز ہے، البتہ باوضوء ہو کر ذکر وتسبیح کرنا افضل ہے خواہ حالت جنابت ہو یا نہ ہو۔

لمافي الطحطاوي على الدر (۱/۱۵۰): قال في البحر وأما الاذكار فالمنقول اباحتها مطلقا ويدخل فيها اللهم اهدنا واللهم انا نستعينك على ماعليه الفتوى وفي الهداية وغيرها استحباب الوضوء لذكر الله تعالىٰ وتركه خلاف الاولى وهو مرجع كراهة التنزيه.

وفي الدر المختار (۱/۲۹۳): (ولاباس) لحائض وجنب (بقراءة ادعية و مسها وحملها وذكر الله تعالىٰ و تسبيح).

(۱۹۵) ناپاکی کی حالت میں قرآن مجید کو چھونا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ ایک امام صاحب سے ناپاکی کی حالت میں قرآن مجید کو ہاتھ لگانے کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ناپاکی کی حالت میں قرآن پاک کے الفاظ کو ہاتھ لگانا جائز نہیں لیکن خالی جگہ اور جلد کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ کیا امام صاحب کی بات صحیح ہے؟ بصورت دیگر صحیح مسئلہ بتا کر میری رہنمائی فرمائیں میں کافی الجھن میں مبتلا ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ناپاکی کی حالت میں، چاہے انسان حالت جنابت میں ہو یا حالت حدث اصغر میں یا حالت حیض میں ہو، ناپاکی کی ان تمام صورتوں میں مصحف قرآن کو یعنی قرآن مجید کے نسخے کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے چاہے اس کے الفاظ ہوں یا اس کی جلد یا وہ حصہ جہاں کچھ نہیں لکھا ہے ہاں اگر قرآن کی آیات کسی دوسری چیز پر لکھی ہوئی ہیں مثلاً کاغذ وغیرہ پر، تو اس صورت میں الفاظ قرآن کو ہاتھ لگانا منع ہے باقی کاغذ وغیرہ کا وہ حصہ جہاں کچھ نہیں لکھا ہوا ہے۔ وہاں ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ناپاکی کی حالت میں مصحف قرآن کو بھی غلاف یا کسی کپڑے سے ہاتھ لگانا جائز ہے مگر غلاف یا کپڑا ایسا ہونا چاہیے جو کہ اس قرآن سے بالکل جدا ہو، اگر کوئی کپڑا وغیرہ قرآن کے ساتھ لگا ہوا ہے اور وہ جدا نہیں ہوتا تو اس کو بھی ہاتھ لگانا جائز نہیں جہاں تک رہی اس مسئلہ میں آپ کے امام صاحب کی بات تو ممکن ہے ان کی مراد مصحف قرآن نہ ہو بلکہ کاغذ وغیرہ پر لکھا ہوا مراد ہو، اور اگر ان کی مراد مصحف قرآن ہے تو ان کی بات ٹھیک نہیں ہے۔

لما فی فتح القدیر (۱/۱۶۹): (قوله وغلافه ما یکون متجافیا عنه) ای منفصلا وهو الخریطة خلافا لمن قال هو الجلد او الکم لان الجلد الملصق تابع له حتی یدخل فی بیعه بغیر شرط فلمسه حکم مسه.

وفی الهندیة (۱/۳۹،۳۸): (ومنها) حرمة مس المصحف لا یجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف الا بغلافٍ متجاف عنه کالخریطة والجلد الغیر المشرز لا بما هو متصل به هو الصحیح هکذا فی الهدایة وعلیه الفتوی کذا فی الجوهرة النیرة والصحیح منع مس حواشی المصحف والبیاض الذی لا کتابة علیه هکذا فی التبیین.

وفی الشامیة مع الدر (۱/۲۹۳): (ومسه) ولو مکتوبا بالفارسیة فی الاصح (الا بغلافه) المنفصل کما مر (قوله ومسه) أی القران ولو فی لوح او درهم او حائط لکن لا یمنع الامن مس المکتوب، بخلاف المصحف فلا یجوز مس الجلد وموضع البیاض منه وقال بعضهم یجوز وهذا اقرب الی القیاس، والمنع اقرب الی التعظیم کما فی البحر أی والصحیح المنع کما نذکره.......... (قوله الا بغلافه) المنفصل ای کالجراب والخریطة دون المتصل کالجلد المشرز هو الصحیح وعلیه الفتوی، لان الجلد تبع له سراج، وقدمنا ان الخریطة الکیس.

(۱۹۶) جنبی میت کو غسل کتنی بار دیا جائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت اگر جنبی ہو تو اس کو دو مرتبہ غسل دیا جائے گا یا ایک ہی غسل کافی ہے عام میت کی طرح۔ براہ مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... زندگی کی تمام عبادات ومعاملات موت کے آنے پر ساقط ہو جاتے ہیں۔ اور میت اپنی بقاء والی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے میت کو تکریم وتعظیم دینے کیلئے غسل اور صاف لباس دیا جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں جنبی میت

سے وجوب کا حکم ساقط ہوکر ایک یعنی میت والا غسل دیا جائے گا۔

لما فی المحیط البرهانی (۵۵/۳): هما یقولان: الغسل الواجب بالجنابة سقط بالموت، لأن الغسل کان واجب علیه. فسقط بالموت لعجزه.

وفی الدر المختار(۱۹۷/۲): (وان زاد علیها أو نقص جاز) اذ الواجب مرة (ولایعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه) لأن غسله ماوجب لرفع الحدث لبقائه بالموت بل لتنجسه بالموت کسائر الحیوانات الدمویة الا ان المسلم یطهر بالغسل کرامة.

وفی الشامیة تحته: (قوله وان زاد) أی عند الحاجة لکن ینبغی ان یکون وتراً. ذکره فی شرح مختصر...... (قوله جاز) أی صح و کره بلاحاجة لانه اسراف او تقتیر.

(۱۹۷) طہارت وغیرہ سے معذور شخص کے وضو اور نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک جاننے والے بہت زیادہ بیمار ہیں انہیں ہر وقت پیمپر لگا ہوا ہوتا ہے اور پیشاب کیلئے تھیلی لگی ہوئی ہوتی ہے۔کئی بیٹے ہیں جو کہ مالی لحاظ سے بہت بہتر ہیں، مگر خاص خیال نہیں رکھتے انہیں نماز پڑھنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ براہ کرم اس حالت میں ان کیلئے نماز پڑھنے کا طریقہ بتلا دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورتِ مسئولہ میں دو شقیں ہیں:

پہلی شق معذور شخص کی نماز پڑھنے کے بیان میں ہے......ایسا شخص جسے پیشاب کے قطرے تسلسل کے ساتھ آتے ہوں کہ فرض نماز کا پورا وقت اس میں گزر جائے یا جس کا پیٹ جاری ہو جائے یا کوئی اور زخم جو مستقل رستا رہے۔شریعت کی اصطلاح میں معذور کہلاتا ہے۔اور صورت مسئولہ میں مریض شخص جسے پیشاب کی تھیلی لگی ہوئی ہے۔شرعاً یہ بھی معذور ہی کے حکم میں ہے اور اس قسم کے معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر وقت کی نماز کیلئے ابتداء دخول وقت میں وضو کرا دیا جائے اور اسی حالت میں نماز پڑھ لیں۔ کپڑے وغیرہ دھونے کی کوئی ضرورت نہیں، اسی طرح اگر پیمپر دور کرنے میں مشقت زیادہ ہو تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے۔

دوسری شق نماز پڑھنے کے طریقے کے بیان میں ہے......اگر مریض وضو کرنے پر قادر ہو یا کوئی اور شخص معاونت کرنے والا موجود ہو جیسے خادم اور اس کی اولاد وغیرہ تو یہ لوگ مریض کو وضو کرائیں اور پھر مریض قبلہ رُخ بیٹھ کر کہ اس کے پاؤں قبلہ رُخ ہوں سر کے اشارے سے نماز پڑھ لے۔اگر بیٹھنا ممکن نہ ہو تو کم از کم تکیہ رکھ کر تھوڑا سا اونچا کر دیں۔اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دائیں کروٹ پر لیٹ کر کہ چہرہ قبلہ کی طرف ہو نماز پڑھ لے۔اور اگر زیادتی مرض کی وجہ سے مریض وضو پر قادر نہ ہو تو تیمم کرا کے نماز اسی مذکورہ بالا طریقے پر پڑھ لے۔اور تیمم کی نیت مریض پر لازم ہوگی۔

لمافی الهندیة(۱۳۶/۱):وان تعذر القعود أومأ بالرکوع والسجود مستلقیا علی ظهره وجعل رجلیه

الى القبلة، وينبغى ان يوضع تحت راسه وسادة حتى يكون شبيه القاعد ليتمكن من الايماء بالركوع والسجود، وان اضطجع على جنبه ووجهه الى القبلة وأو ما جاز والأول اولىٰ.

وفى الشامية مع الدر(۱/۲۳۳): من عجز عن استعمال الماء...... او لمرض يشتد او يمتد بغلبة ظن او قول حاذق مسلم ولو بتحرك اولم يجد من توضئه فان وجد ولو بأجرة مثل وله ذلك لايتيمم فى ظاهر المذهب كمافى البحر.

وفى الشاميه قوله ولو بتحرك الخ...... ولا فرق عندنا بين ان يشتد بالتحرك كالمبطون او بالاستعمال كالجدرى قوله او لم يجد الخ اى او كان لا يخاف الاشتداد ولا الامتداد لكنه لا يقدر بنفسه ولم يجد من يوضئه قوله كمافى البحر حاصل مافيه انه ان وجد خادماً اى من تلزمه طاعته كعبده وولده واجيره لايتيمم اتفاقاً، وان وجد غيره ممن لو استعان به اعانه ولو زوجته فظاهر المذهب انه لا يتيمم ايضاً بلا خلاف الخ.

وفى الهندية(۱/۴۱):المستحاضة ومن به سلس البول او استطلاق البطن او انفلات الريح او رعاف دائم او جرح لا يرقأ يتوضأون لوقت كل صلاة ويصلون بذلك الوضوء فى الوقت ما شاؤوا من الفرائض والنوافل...... ويبطل الوضوء عندخروج وقت المفروضة بالحدث السابق هكذافى الهداية وهوالصحيح.

(۱۹۸) آپریشن کے بعد پیشاب کے قطرات کا آنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا پیشاب رک گیا تھا لہٰذا اس کا آپریشن کروایا ہے، آپریشن کو تقریباً پانچ چھ دن ہوگئے ہیں، اب میری حالت یہ ہے کہ پیشاب سے فارغ ہونے کے بعد بستر پر بیٹھتا ہوں یا پھر لیٹتا ہوں تو ایک دو قطرے نکل جاتے ہیں یا پھر سونے کی حالت میں نکل جاتے ہیں جس کا مجھے احساس نہیں ہوتا ابھی غبارہ بھی استعمال نہیں کرسکتا کیونکہ ابھی زخم ہیں، لہٰذا آنجناب سے عرض ہے کہ بیٹھ کر نماز ادا کرنے اور کپڑوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ آپ معذور کب شمار ہوسکتے ہیں تو اس کیلئے ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ آپ کو وضو سے فراغت کے بعد پیشاب کے قطرات آنے کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ آپ فرض نماز پڑھ سکیں تو آپ معذور سمجھے جائیں گے، اور اس وقت تک معذور شمار کیے جائیں گے جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی آپ کا عذر پایا جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر آپ فی الحال معذور کے حکم میں نہیں ہیں، لہٰذا ان کپڑوں میں نماز کی ادائیگی صحیح نہیں بلکہ پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھنا ضروری ہے، البتہ اگر کھڑے ہونے سے قطرات آتے ہوں یا کسی اور وجہ سے کھڑے نہ ہوسکتے ہوں تو بیٹھ کر

نماز پڑھنا جائز ہے۔

لمافي الدر المختار (۱/۳۰۶): (وان سال على ثوبه)فوق الدرهم (جاز له ان لا يغسله ان كان لو غسله تنجّس قبل الفراغ منها) أي الصلاة (وإلا) يتنجس قبل فراغه (فلا) يجوز ترک غسله هوالمختار للفتوى.

وفي الدر المختار (۱/۳۰۵): (ان استوعب عذره تمام وقت صلوة مفروضة) .... (ولو حكما) لأن الانقطاع اليسير ملحق بالعدم (وهذا شرط) العذر (في حق الإبتداء وفي)حق (البقاء كفى وجوده في جزء من الوقت) ولو مرة(وفي) حق الزوال يشترط (إستيعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقيقة) لأنه الانقطاع الكامل......

وفي الدر المختار (۱/۳۰۷،۳۰۸):يجب رد عذره او تقليله بقدر قدرته ولو بصلاته موميا وبرده لا يبقى ذاعذر.

(۱۹۹) سجدہ کرنے سے اگر خون نکلے تو کیا ایسا شخص معذور ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے گھٹنے میں پھوڑا ہے وہ جب بھی سجدے کیلئے گھٹنہ نیچے لگاتا ہے اس پھوڑے سے خون نکلنا شروع ہوجاتا ہے ایسی حالت میں نماز پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے، کیا ایسا شخص معذور کے حکم میں داخل ہے کہ ایک وضو سے مکمل نماز پڑھ لے ورنہ تو نماز پڑھنا بہت مشکل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....جیسا کہ سوال سے معلوم ہورہا ہے کہ خون صرف سجدے میں گھٹنا ٹیکنے سے نکلتا ہے ایسا شخص معذور کے حکم میں داخل نہیں ہوتا بلکہ آپ بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھیں اور اگر دوران نماز کسی وجہ سے خون جاری ہوگیا تو دوبارہ نئے سرے سے وضو کرنا ہوگا۔

لمافي الدر المختار (۱/۳۰۷،۳۰۸):يجب رد عذره او تقليله بقدر قدرته ولو بصلاته موميا وبرده لا يبقى ذاعذر.

(۲۰۰) سلس البول (پیشاب کے قطرے) والے مریض کیلئے طہارت کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصے سے پیشاب کرنے کے بعد وقفے وقفے سے قطرے آتے ہیں کیا میں ہر مرتبہ وضو کیا کروں اور کپڑوں کو پاک کروں یا شریعت کی طرف سے اس میں کچھ چھوٹ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اگر آپ کو یہ قطرے اس تسلسل سے آرہے ہیں کہ درمیان میں اتنا وقفہ بھی نہیں ملتا کہ ایک وقت کی فرض نماز ادا کرسکیں۔تو اس صورت میں آپ معذورین میں شامل ہیں۔جن کا حکم یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے وقت وضو کرلیا کریں۔اور پھر اس وضو سے

اس ایک وقت میں جتنے چاہیں فرائض اور نوافل ادا کریں اور تلاوت قرآن کریم کرلیں۔ (اس ایک وقت کے درمیان میں جتنے بھی قطرے آجائیں آپ پاک ہی رہیں گے۔ بشرطیکہ کوئی اور سبب وضو کو توڑنے کا نہ پایا جائے) یہاں تک کہ وقت ختم ہوجائے یعنی جیسے ہی اس فرض نماز کا وقت ختم ہوگا تو آپ کا وضو بھی ختم ہوجائے گا۔ اور پھر اگلی نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔

اور اگر یہ قطرے کپڑوں پر گرے ہوئے ہوں تو اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کس تسلسل سے نکل رہے ہیں۔ اگر اتنا بھی وقت نہ ملے کہ، اگر بالفرض نماز شروع کرنے سے پہلے کپڑے کو دھویا۔ مگر دورانِ نماز، وہ قطرے اسی طرح کپڑوں میں نکل آئیں۔ تو اس صورت میں آپ پر ان قطروں کا دھونا واجب نہ ہوگا، اگرچہ یہ قطرے مقدارِ درہم سے تجاوز ہی کیوں نہ کرجائیں۔ اور اگر آپ کو یہ گمان ہے کہ ان قطروں کو دھونے کے بعد، یہ دورانِ نماز مزید نہ نکلیں گے۔ تو اس صورت میں ان کا دھونا واجب ہے۔ اور اگر ان قطروں میں مقدار نماز کے برابر تسلسل نہیں ہے تو آپ معذورین میں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کا وضو اِن قطروں سے ٹوٹ جائے گا۔ اور کپڑے بھی ناپاک ہوجائیں گے اور ان کا دھونا (جبکہ وہ مقدار درہم سے تجاوز کرجائیں) واجب ہوگا۔

وفی تنویر الابصار مع الدر (۱/۳۰۵): (وصاحب عذر من به سلس البول) بول لایمکنه امساكه ....(وان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) بأن لایجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث (ولوحکماً) لان الانقطاع الیسیر ملحق بالعدم........ (وحکمه الوضوء) لاغسل ثوبه ونحوه (لکل فرض) اللام للوقت کمافی لدلوک الشمس (ثم یصلی) به (فیه فرضا ونفلا) فدخل الواجب بالأولیٰ (فاذاخرج الوقت بطل) أی ظهر حدثه السابق ....

(وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جازله أن لایغسله ان کان لوغسله تنجس قبل الفراغ منها) أی الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترک غسله هو المختار للفتویٰ.

وفی الهندیة (۱/۴۱): المستحاضة ومن به سلس البول...... یتوضؤن لوقت کل صلاة، ویصلون بذالک الوضوء فی الوقت ماشاؤا من الفرائض و النوافل...... ویبطل الوضوء عند خروج وقت المفروضة بالحدث السابق ......إذا کان به جرح سائل وقد شد علیه خرقة فأصابها الدم أکثر من قدر الدرهم أو أصاب ثوبه ان کان بحال لوغسله یتنجس ثانیاً قبل الفراغ من الصلاة، جاز أن لا یغسله وصلی قبل أن یغسله وإلا فلا هذا هو المختار.

(۲۰۱) پیشاب کرنے کے آدھے گھنٹے بعد تک قطرے آنے والے مریض کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو پیشاب کے بعد آدھا پونا گھنٹہ قطرے آتے ہیں بسا اوقات نماز جماعت سے نکل جاتی ہے اور بسا اوقات نماز کا وقت بھی نکل جاتا ہے اس کیلئے کیا حکم ہے؟

(۲)......اسی طرح ایک دوسرے شخص کو ہر وقت پیشاب کے قطرے آتے ہیں جس کی وجہ سے شلوار وغیرہ خراب رہتی ہے اس کیلئے کیا حکم ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)......اگر پیشاب کے قطرے اتنے وقفے سے آتے رہتے ہیں کہ آدمی کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وضو کر کے فرض نماز پڑھ لے تو پھر یہ شخص معذور ہے، اور معذور ہر فرض نماز کے وقت نیا وضو کرے گا اور وقت نکلتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ اور بعد میں ہر فرض نماز کے وقت میں ایک دفعہ عذر کا پایا جانا ضروری ہے اگر مکمل وقت بغیر عذر کے گزر گیا تو پھر اس کا عذر بھی ختم ہو گیا۔ صورت مسئولہ میں یہ شخص آخری وقت تک انتظار کرے اگر پھر بھی قطرے ختم نہیں ہوئے تو وقت نکلنے سے پہلے وضو کرے اور نماز پڑھے اگر دوسرا پورا وقت بغیر عذر کے گزر گیا یعنی اس کو دوسرے پورے وقت میں قطرے نہیں آئے تو یہ شخص پڑھی ہوئی نماز اور وضو کا اعادہ کرے گا اور اگر دوسرے وقت میں بھی اس کو قطرے آ گئے تو نماز صحیح ہو گئی اعادہ لازم نہیں۔

(۲)......اگر کسی شخص نے پیشاب کے قطروں سے ناپاک شلوار وغیرہ اس لئے نہیں دھوئی کہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دوبارہ ناپاک ہو جائے گی تو اگر اسی کپڑے/شلوار وغیرہ میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح ہو گی۔ اور اگر شلوار وغیرہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دوبارہ ناپاک نہ ہوتی ہو تو اس کو ہر نماز کیلئے دھونا ضروری ہے اور اگر نہیں دھوئی اور اسی ناپاک کپڑے میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح نہیں ہو گی، بشرطیکہ نجاست درہم کی مقدار سے زیادہ ہو۔

وفی الدر المختار (۱/۳۰۵،۳۰۶): (وصاحب عذر من به سلس) بول لایمكنه امساكه...... (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) بأن لایجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث ...... (وهذا شرط) العذر (فی حق الابتداء وفی) حق (البقاء كفی وجوده فی جزء من الوقت) ولومرة (وفی) حق الزوال یشترط (استیعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقیقة) لانه الانقطاع الكامل. (وحكمه الوضوء) لاغسل ثوبه ونحوه (لكل فرض)...... (ثم یصلی) به (فیه فرضا و نفلا) ...... (فاذا خرج الوقت بطل) ای ظهر حدثه السابق، حتی لوتوضأ علی الانقطاع ودام الی خروجه لم یبطل بالخروج مالم یطرأ حدث آخر اویسیل (وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جاز له ان لایغسله ان كان لوغسله تنجس قبل الفراغ منها) ای الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترک غسله، هو المختار.

وفی الشامیة (۱/۳۰۵): (قوله فی حق الابتداء) ای فی حق ثبوته ابتداء (قوله فی جزء من الوقت) ای من كل وقت بعد ذالک الاستیعاب...... (قوله وفی حق الزوال) أی زوال العذر وخروج صاحبه عن كونه معذوراً (قوله تمام الوقت حقیقة) ای بأن لایوجد العذر فی جزء منه اصلا فیسقط العذر من اول الانقطاع، حتی لو انقطع فی اثناء الوضوء او الصلاة ودام الانقطاع الی آخر الوقت الثانی یعید، ولو عرض بعد دخول وقت فرض انتظر الی آخره. فان لم ینقطع یتوضأ ویصلی ثم ان انقطع فی اثناء

الوقت الثانی یعید تلک الصلاۃ، وان استوعب الوقت الثانی لایعید لثبوت العذر حینئذ من وقت العروض اھ ...... وذکر فی البحر عن السراج انہ لوانقطع بعد الفراغ من الصلاۃ او بعد القعود قدر التشہد لایعید لزوال العذر بعد الفراغ.

(۲۰۲) پیشاب کے بعد کچھ دیر تک قطرے آنے سے معذور شمار نہیں ہوتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھ کو پیشاب کے بعد قطرے آتے ہیں تقریباً آدھا گھنٹہ اُٹھوں یا بیٹھوں تو قطرے خارج ہوجاتے ہیں، علاج بھی کرایا ایک سال لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لہٰذا شریعت میں میرے لئے اب کیا حکم ہے؟ یا کوئی وظیفہ وغیرہ بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جس شخص کو پیشاب کے قطرے آتے ہوں چاہے پیشاب کرنے سے پہلے ہوں یا پیشاب کے بعد ہوں، یہ پیشاب کی بیماری تصور کی جاتی ہے۔ لیکن یہ شخص شرعاً معذور اس وقت شمار ہوگا جبکہ ایک مرتبہ فرض نماز پڑھنے کا وقت بھی اس عذر کے بغیر نہ گزرے۔ اور صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کو تقریباً پیشاب کے بعد آدھا گھنٹے تک پیشاب کے قطرے آتے ہیں، اس کے بعد بند ہوجاتے ہیں، لہٰذا آپ شرعاً معذور نہیں ہیں۔ آپ نماز سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے پیشاب کے قطروں کے خارج ہونے تک انتظار کریں، جب قطرے بند ہوجائیں اور آپ کو اطمینان حاصل ہوجائے تو پھر اس کے بعد وضو کرکے نماز ادا کریں۔

لمافی الھندیۃ(۱/۴۰): شرط ثبوت العذر ابتداء ان یستوعب استمرارہ وقت الصلوۃ کاملا وھو الاظہر کالانقطاع لایثبت مالم یستوعب الوقت کلہ.

وفیہ ایضاً(۱/۴۱): المستحاضۃ ومن بہ سلس البول او استطلاق البطن او انفلات الریح او رعاف دائم او جرح لایرقاء یتوضؤن لوقت کل صلوۃ ویصلون بذالک الوضوء فی الوقت ماشاؤا من الفرائض والنوافل ھکذا فی البحر الرائق.

وإن توضا علی السیلان وصلی علی الانقطاع وتم الانقطاع باستیعاب الوقت الثانی اعاد کذا فی شرح منیۃ المصلی لابراھیم الحلبی وکذا اذا انقطع فی خلال الصلوۃ وتم الانقطاع ھکذا فی المضمرات.

ویبطل الوضوء عند خروج وقت المفروضۃ بالحدث السابق ھکذا فی الھدایۃ وھو الصحیح ھکذا فی المحیط فی نواقض الوضوء...... متی قدر المعذور علی ردّ السیلان برباط أو حشوأو کان لو جلس لا یسیل ولو قام سال وجب ردہ ویخرج بردہ عن ان یکون صاحب العذر بخلاف الحائض اذا منعت الدرور فانھا حائض کما فی البحر الرائق.

﴿فصل فی الحیض و النفاس﴾

(حیض ونفاس سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۰۳) عادت سے پہلے ماہواری آنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عادت ہے کہ مجھے ہر ماہ چھ دن خون آتا ہے جو بارہ تاریخ سے شروع ہو کر اٹھارہ تاریخ تک عام طور پر رہتا ہے لیکن اس مرتبہ آٹھ تاریخ سے شروع ہو گیا ہے تو کیا یہ ماہواری خون ہوگا اور ان دنوں میں نماز وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... یہ ماہواری خون ہی شمار کیا جائے گا بشرطیکہ وہ تین دن سے کم نہ ہو، کیونکہ ان دونوں ماہواری کے درمیان پندرہ دن سے زائد کا فاصلہ ہے، اور پاکی کی اقل مدت پندرہ دن ہے تو آٹھ تاریخ سے شروع ہونے والا خون بھی حیض کا خون ہی شمار کیا جائے گا ان دنوں میں نماز وغیرہ ذمہ سے ساقط ہو جائے گی۔

لما فی الهندية(۱/۳۷): اذا كان الطهر خمسة عشر يوماً أو أكثر يعتبر فاصلا فيجعل كل واحد من الدمين او احدهما بانفراده حيضا حسب ما امكن من ذلك.(ص۳۸): (منها) ان يسقط عن الحائض والنفساء.الصلوة فلا تقضى هكذا فى الكفاية ....ومنها ان يحرم عليهما الصوم فتقضيانه هكذا فى الكفاية.

وفى الدر المختار(۱/۲۸۵): (واقل الطهر) بين الحيضتين أو النفاس والحيض (خمسة عشر يوماً) ولياليها اجماعا. (ص۲۸۴):فبه تترك الصلوٰة ولو مبتدأة فى الأصح، لان الاصل الصحة والحيض دم صحة شمنى.

وفى الشامية (۱/۲۸۴): (قوله فبه) اى فبا لبروز تترك الصلوة وتثبت بقية الأحكام، ولكن هذا مادام مستمرا لما سيأتى من انه لو انقطع لدون أقله تتوضأ وتصلى.

(۲۰۴) ”بلوغت کے بعد صرف ڈیڑھ دن خون آیا“ ایسی خاتون کی ماہواری کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ابھی تک صرف ایک دو دفعہ ایک ڈیڑھ دن تک کیلئے

ماہواری کا خون آیا ہے جبکہ میری عمر تیس سال ہے، میرے لئے ماہواری کا کیا حکم ہے؟ اور جو دو دفعہ خون آیا تھا وہ ماہواری شمار ہوگا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر ماہواری کا خون تین دن سے کم ہو تو وہ حیض شمار نہیں ہوتا، لہٰذا آپ کو جو ایک دو دفعہ خون آیا ہے وہ تین دن سے کم ہے وہ حیض شمار نہیں ہوگا، اور جب تک خون نہ آئے آپ پاک ہیں اور پاکی کی حالت کے جو احکامات ہیں وہی سب آپ کے لئے ہوں گے۔

وفی ردالمحتار (۲۸۵/۱): الأولی ان تبلغ بالسن وتبقی بلا دم طول عمرها فتصوم وتصلی ویاتیها زوجها وغیر ذلک ابداً..... الثانیة ان تری الدم عند البلوغ او بعده أقل من ثلاثة ایام ثم یستمر إنقطاعه وحکمها کالأولی.

(۲۰۵) تین دن سے کم خون آنا حیض شمار نہیں ہوگا بلکہ وہ استحاضہ ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت جسکی عمر تقریباً پینتیس (۳۵) سال ہے اور اسے ہر ماہ صرف دو دن خون آتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ خون حیض شمار ہوگا یا نہیں؟ اور جن دنوں میں یہ خون آتا ہو، ان دنوں میں عورت کیلئے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح دیگر احکامات مثلاً تلاوت وغیرہ کرنا، قرآن پاک چھونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شریعت میں حیض کی کم سے کم مدت تین دن تین رات اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن دس رات ہے۔ جو خون تین دن تین رات سے کم یا دس دن دس رات سے زیادہ آئے تو وہ خون حیض کا شمار نہیں ہوگا وہ استحاضہ کا خون ہے اور استحاضہ کا حکم پاکی کا ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ عورت جس کو ہر ماہ صرف دو دن خون آتا ہے یہ خون حیض کا شمار نہیں ہوگا لہٰذا یہ عورت جس طرح پاکی کے ایام میں فرائض (نماز، روزہ وغیرہ) ادا کرتی ہے اسی طرح ان دنوں میں بھی فرائض ادا کرے گی اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا یا باوضو اسے چھونا سب اس کے لیے جائز ہوگا۔ البتہ اس پر معذور کے احکامات آئیں گے۔

لمافی بدائع الصنائع (۲۸۸/۱): ولنا ماروی ابو امامة الباهلی. رضی الله عنه. عن النبی ﷺ انه قال "اقل ما یکون الحیض للجاریة الثیب والبکر جمیعا ثلاثة ایام، واکثر واما یکون من الحیض عشرة ایام وما زاد علی العشرة فهو استحاضة" وهذا حدیث مشهور، وروی عن جماعة من الصحابة رضی الله عنهم...... واما الثانی فذکر ظاهر الروایة ان اقل الحیض ثلاثة ایام ولیالیها.

وفی الدر المختار (۲۸۴/۱): و(اقله ثلاثة ایام ولیالیها) الثلاث، فالاضافة لبیان العدد المقدر بالساعات الفلکیة لا للاختصاص، فلا یلزم کونها لیالی تلک الایام وکذا قوله (واکثره عشرة) بعشر لیال کذا رواه الدار قطنی وغیره.

(۲۰۶) ماہواری کے دنوں میں خون رکنے کا حکم اور اس وقت میں اعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اٹھارہ تاریخ سے خون شروع ہوکر پچیس تاریخ تک جاری رہتا ہے لیکن درمیان میں کبھی ایک گھنٹے کیلئے کبھی دو گھنٹے اور کبھی ایک آدھ دن کیلئے رک کر پھر جاری ہوجاتا ہے جس وقت خون بند ہوجاتا ہے اتنا وقت پاک شمار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس وقت نماز پڑھنا اور تلاوت کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایام ماہواری کے جن اوقات میں خون آنا رک جاتا ہے وہ ایام ماہواری ہی کے شمار ہوتے ہیں اس لئے آپ کا ماہواری کے دنوں میں ان اوقات میں بھی نماز پڑھنا تلاوت کرنا درست نہیں۔

لما فی البحر الرائق(۱/۳۵۸): وقال محمد رحمه الله: الطهر المتخلل ان نقص عن ثلاثة ايام ولو بساعة لا يفصل اعتباراً بالحيض فان كان ثلاثة فصاعداً فان كان مثل الدمين أو أقل فكذلك تغليباً للمحرمات لان اعتبار الدم يوجب حرمتها واعتبار الطهر يوجب حلها فغلب الحرام الحلال وان كان اكثر فصل ثم ينظر ان كان فى احد الجانبين مايمكن أن يجعل حيضا فهو حيض والاخر استحاضة وان لم يكن فالكل استحاضة......

وفى الشامية(۱/۲۸۹): ثم اعلم ان الطهر المتخلل بين الدمين اذا كان خمسة عشر يوماً فأكثر يكون فاصلا بين الدمين فى الحيض اتفاقا فما بلغ من كل من الدمين نصابا جعل حيضا.

وانه اذا كان أقل من ثلاثة أيام لايكون فاصلاً وان كان اكثر من الدمين اتفاقا.

فلو رأت مبتدأة يوما دماً ويومين طهرا ويوما دما فالأربعة حيض لان الطهر المتخلل دون ثلاث وهو لا يفصل اتفاقا.

(۲۰۷) تین دن ماہواری آکر دس دن کے بعد پھر آنے والے خون کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کو رمضان المبارک میں حیض تین دن تک رہا پھر وہ پاک ہوگئی پھر اس نے دس روزے رکھے پھر حیض شروع ہوگیا اور ایک دن رہا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ حیض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ایک مہینے میں دو مرتبہ حیض کس طرح آیا؟ اگر استحاضہ ہے تو پھر جو روزے رکھے ہیں وہ ہوگئے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ عورت کو جب مکمل تین دن درات خون (حیض) آیا پھر وہ پاک ہوگئی تو اس کا حیض ختم ہوگیا۔ دس روزے رکھنے کے بعد جو خون آیا وہ حیض نہیں بلکہ استحاضہ ہے اور جو دس روزے اس نے رکھے ہیں وہ بھی ہوگئے ہیں لہٰذا عورت نے اگر استحاضہ کے دوران نمازیں نہیں پڑھیں تو روزہ کی قضا کے ساتھ ساتھ نمازوں کی قضا بھی کرے۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۳۳): الفاصل بين الدمين الطهر اذا كان اقل من خمسة عشر يوما لا يعتبر ولا يصير فاصلا بين الدمين ويصير كالدم المتوالي عند ابي يوسفؒ واذا كان خمسة عشر يوما او اكثر يعتبر فاصلا۔

وفی الهندية(۱/۳۶): اقل الحيض ثلاثة ايام وثلاث ليال فی ظاهر الرواية هكذا فی التبيين واكثره عشرة ايام و لياليها كذا فی الخلاصة...... (۱/۳۷)روی ابو يوسف عن ابی حنيفة ان الطهر المتخلل بين الدمين اذا كان اقل من خمسة عشر يوما لم يفصل و كثير من المتاخرين أفتوا بهذه الرواية لانها اسهل على المفتي والمستفتي...... والاخذ بهذا ايسر كذا فی الهداية وعليه استقر رأی الصدر الشهيد حسام الدين وبه يفتی كذا فی المحيط.

وفی الدر المختار(۱/۲۸۴۔۲۸۵): والحيض دم صحة شمني و(اقله ثلاثة ايام بلياليها)...... (واكثره عشرة) بعشر ليال ...... (والناقص) عن اقله (والزائد) على اكثره...... (استحاضة واقل الطهر) بين الحيضتين او النفاس والحيض (خمسة عشر يوما) ولياليها اجماعا (ولا حدلاكثره).

وفی كتاب الفقه(۱/۱۲۹): فلو حاضت المرأة ثم انقطع حيضها بعد ثلاثة ايام مثلا واستمر منقطعا الی اربعة عشر يوما او اقل ثم رأت الدم لا يكون حيضا.

وفيه ايضاً(۱/۱۳۰): وحكم الاستحاضة انها لا تمنع شيئاً من الاشياء التی يمنعها الحيض والنفاس الخ.

(۲۰۸) ماہواری کے بعد سفیدی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاتون کو جب ماہواری آتی ہے تو سات دن سرخ کالے رنگ کا خون آتا ہے اس کے بعد سفیدی آتی ہے، آیا یہ سفیدی حیض شمار ہوگی اس کے ہوتے ہوئے نماز روزے کا کیا حکم ہوگا۔ نیز اگر یہ سفیدی کپڑوں پر لگ جائے یا بدن پر لگ جائے تو کپڑے یا بدن نجس ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... سات دن جو سرخ کالے رنگ کا خون آتا ہے یہ حیض ہے اس کے بعد جو سفیدی آتی ہے یہ حیض شمار نہیں ہوگی بلکہ یہ حیض ختم ہونے کی علامت ہے اس کے اندر نماز روزہ لازم ہے۔ البتہ اس سفیدی کے کپڑوں یا بدن پر لگ جانے سے کپڑے یا بدن ناپاک ہوجاتے ہیں ان کا دھونا ضروری ہے۔

لمافی المحيط البرهانی(۱/۴۰۱): واذا وضعت الكرسف فی اول الليل وهی حائض، ونامت فنظرت الی الكرسف حين اصبحت، فرأت البياض الخالص فعليها قضاء العشاء للتيقن بطهرها من حيث وضعت الكرسف ......

وفی الفقه الاسلامية وادلته(۱/۶۱۳،۶۱۸): ورأى الحنفية: ان الوان دم الحيض ستة: السواد، والحمرة والصفرة، والكدرة، والخضرة، والتربية(اى على لون التراب) على الأصح: فكل ما يرى في ايام الحيض من هذه الدماء فهو حيض، حتى ترى البياض الخالص: وهو شيئ يشبه المخاط يخرج عند انتهاء الحيض أوهو القطن الذى تختبر به المرأة نفسها، اذا خرج أبيض، فقد طهرت وفيه ايضاً(۱/۶۱۸): والمراد بالطهر: هو زمان نقاء المرأة من دم الحيض والنفاس وللطهر علامتان: جفاف الدم أو جفوفه والقصة البيضاء: هى ماء ابيض رقيق يأتى فى آخر الحيض.

(۲۰۹) کافی عرصہ کے بعد خون کا قطرہ دیکھنے پر ماہواری کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج سے چند سال پہلے میرے یہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی تھی۔اس کے بعد سے مجھے ماہواری آنا بند ہوگئی۔ میں نے اس کا علاج کروایا تو مجھے ایک روز خون کا قطرہ دکھائی دیا،آیا یہ میری ماہواری شمار ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... حیض کی کم سے کم مدت تین دن ہے اگر تین دن سے کم خون نظر آئے تو یہ حیض کا خون نہیں ہوتا بلکہ یہ استحاضہ کا خون ہوتا ہے لہٰذا جو آپ کو ایک روز خون کا قطرہ نظر آیا ہے یہ آپ کی ماہواری یعنی حیض کا خون نہیں ہے بلکہ استحاضہ کا خون ہے پس اس بناء پر اگر آپ نے فرض نماز چھوڑ دی ہے تو آپ پر اس کی قضاء لازم ہوگی۔

لمافى سنن الدار قطنى (۱/۲۱۷): عن أنس رضى الله عنه قال "أدنى الحيض ثلاثة واقصاه عشرة، قال وكيع: ((الحيض ثلاث إلى عشر فما زاد فهى مستحاضة))."

وفى سنن الدار قطنى (۱/۲۱۷): عن سفيان رضى الله عنه قال: ((اقل الحيض ثلاث واكثره عشرة)).

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۱/۶۱۵):...... ان اقل الحيض: ثلاثة ايام ولياليها وما نقص عن ذالك فليس بحيض وانما هو استحاضة.

(۲۱۰) طہر متخلل کا مسئلہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ہر ماہ دس تاریخ سے سولہ تک ماہواری کا لگاتار خون آتا ہے لیکن اس مرتبہ دس گیارہ کو خون آیا پھر چار دن نہیں آیا اس کے بعد مسلسل چار دن خون آیا تو یہ درمیان میں جو دن گزرے ہیں ان میں نمازوں کا کیا حکم ہوگا اور بعد میں جو چار دن خون آیا ہے یہ حیض کا شمار ہوگا یا استحاضہ ہوگا۔اس مسئلے میں میری رہنمائی فرمائیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آپ کی ذکر کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ معتادہ ہیں آپ کو ہر ماہ چھ دن خون آتا ہے لیکن اس مرتبہ جو دو دن خون آیا اور چار دن نہیں آیا اور پھر چار دن خون آیا تو یہ تمام دن حیض کے شمار ہوں گے کیونکہ جو چار دن بیچ میں خون نہیں آیا یہ طہر متخلل ہے اور جب طہر متخلل پندرہ دن سے کم ہو تو وہ دم جاری کے حکم میں ہوتا ہے لہٰذا یہ تمام دس دن حیض کے شمار ہوں گے جن میں نماز معاف ہے۔

لمافی الهندیة(۱/ ۳۶-۳۷): الطهر المتخلل بين الدمين والدماء في مدة الحيض يكون حيضاً......

وروى ابو يوسف عن ابى حنيفة ان الطهر المتخلل بين الدمين اذا كان اقل من خمسة عشر يوماً لم يفصل وكثير من المتأخرين أفتوا بهذه الرواية لانها اسهل على المفتى والمستفتى.

وفي الهندية(۱/ ۳۷): فان لم يجاوز العشرة فالطهر والدم كلاهما حيض سواء كانت مبتدأة او معتادة وان جاوز العشرة ففي المبتدأة حيضها عشرة ايام وفي المعتادة معروفتها في الحيض حيض والطهر طهر.

وفي الهندية(۱/ ۳۸): (الاحكام التي يشترك فيها الحيض والنفاس ثمانية) (منها) ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلا تقضى.

وفي الشامية(۱/ ۲۸۵): اما المعتادة فما زاد على عادتها ويجاوز العشرة في الحيض والاربعين في النفاس يكون استحاضة كما اشار اليه بقوله او على العادة الخ. اما اذا لم يتجاوز الأكثر فيهما فهو انتقال للعادة فيهما فيكون حيضا ونفاسا.

(۲۱۱) دورانِ حمل آنے والے خون کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے پانچ سال کے بعد دوبارہ حمل ٹھہرا ہے ایک بیٹی ہے چار سال کی، رسولی بھی ہے اور خون کی شکایت بھی ہو جاتی ہے، درد بھی ہوتا ہے، تو میں ایسی صورت میں نماز اور قرآن پڑھ سکتی ہوں؟ اور کوئی دعا یا کچھ پڑھنے کو بتا دیں، اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ میرے بچے کے اعضاء پورے بنائے اور نیک بیٹا عطا کرے آپ بھی دعا کروا دیں۔ کسی حضرت نے بتایا ہے کہ دن میں کسی بھی وقت پانچ تسبیحات ''لاحول ولاقوۃ'' کی آدھے گلاس پانی پر دم کر کے پیو رسولی وہیں ٹھہر جائے گی۔ آپ بھی کچھ وظائف بتا دیں اور دعاؤں میں بھی یاد رکھیے۔ اور مجھے چلنے پھرنے سے خون کی شکایت ہو جاتی ہے؟ کوئی دعا بتائیں تاکہ یہ بند ہو جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حمل کی حالت میں نکلنے والا خون استحاضہ یعنی بیماری کا خون کہلاتا ہے لہٰذا آپ کو خون حمل ٹھہرنے کے بعد آ رہا ہے اس لئے یہ استحاضہ ہے استحاضہ والی عورت پاک ہوتی ہے لہٰذا آپ وضو کر کے اور خون سے صفائی حاصل کر کے نماز بھی پڑھ سکتی ہیں

اور تلاوت بھی کرسکتی ہیں، لیکن اگر وضو کے بعد دوبارہ خون نکل آیا تو وضو ٹوٹ جائے گا اس لئے اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وضو کر کے آپ زیادہ نہ چلیں اور اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی وجہ سے بھی خون جاری ہو جاتا ہے تو پھر بیٹھ کر نماز پڑھیں۔

سات مرتبہ سورۃ الفاتحہ، اس کے اوّل وآخر سات سات مرتبہ درود شریف پڑھ کر پانی پر دم کر کے پئیں اور شفایابی کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر رکھیں، انشاء اللہ تعالیٰ جلد صحت یابی عطا فرمائیں گے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نیک صالح نرینہ اولاد عطا فرمائے، آمین۔

لـمـا في مشكوة المصابيح(۱/۵۷): عن النبي ﷺ أنه قال في المستحاضة تدع الصلوة أيام اقرائها التي كانت تحيض فيها ثم تغتسل وتتوضأ عند كل صلوة وتصوم وتصلي.

وفـي تـرمذي(۲/۲۶): عن ابي سعيدؓ قال بعثنا رسول الله ﷺ في سرية فنزلنا بقوم فسالناهم القرى فلم يقرونا فلدغ سيدهم فاتونا فقالوا هل فيكم من يرقي من العقرب قلت نعم انا ولكن لا ارقيه حتى تعطونا غنماً قالوا فانا نعطيكم ثلاثين شاة فقبلنا فقرأت عليه الحمد سبع مرات فبرأ وقبضنا الغنم قال فعرض في انفسنا منها شئ فقلنا لا تعجلوا حتى تاتوا رسول الله ﷺ قال فلما قدمنا عليه ذكرت له الذي صنعت قال وما علمت أنها رقية اقبضوا الغنم واضربوا لي معكم بسهم.

وفـي الـفتـاوى الهندية(۱/۳۷۔۳۸): لو رأت الدم بعد اكثر الحيض والنفاس في أقل مدة الطهر فما رأت بعد الاكثر إن كانت مبتداة وبعد العادة ان كانت معتادة استحاضة...... وكذا ما تراه الحامل ابتداءً أو حال ولادتها قبل خروج الولد كذا في الهداية...... (صـ۳۹) (ودم الاستحاضة) كالرعاف الدائم لايمنع الصلاة ولا الصوم ولا الوطئ.

وفـي الشـامية(۱/۲۹۸): (قوله وقتاً كاملاً) ظرف لقوله دائم، الأولى عدم ذكر هذا القيد: أي قيد الدوام لأنه في حكمه في الدوام وعدمه (قوله لا يمنع صوماً الخ) أي ولا قراءة ومس مصحف ودخول مسجد، وكذا لا تمنع عن الطواف اذا امنت من اللوث.

(۲۱۲) دوران حمل آنے والے خون اور اس حالت میں پڑھی جانے والی نمازوں کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ڈیڑھ ماہ کا حمل ساقط ہو گیا ہے۔ بچے کے عضو نہیں بنے تھے، بس گوشت ہی گوشت تھا۔ اب چالیس دن تک یا اس سے کم جو خون آئے گا اس میں نماز اور قرآن کی تلاوت کا کیا حکم ہے، اس مسئلے کا جواب لکھ دیں۔ اور جب میرا حمل ساقط نہیں ہوا تھا لیکن خون آرہا تھا تو اس میں نماز اور قرآن کی تلاوت کا کیا حکم ہے، دونوں کے جواب الگ الگ لکھ دیں، جب میرا حمل ساقط نہیں ہوا تھا لیکن خون آنے لگا تھا تو میں نے لیٹے لیٹے نمازیں ادا کیں تھیں میری وہ نمازیں ہوئیں یا نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔صورت مسئولہ میں اگر خون ماہواری کی مقدار تک آیا ہو تو یہ ماہواری کا خون شمار ہوگا، اس دوران نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور قرآن کی تلاوت وغیرہ کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر خون مقدار حیض سے کم یا زیادہ آنے لگے، اسی طرح دوران حمل جو خون آتا رہا تو یہ سب خون استحاضہ کے حکم میں ہے، یعنی اس دوران آپ کو نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا ضروری ہے اور قرآن کی تلاوت وغیرہ اعمال بھی آپ کرسکتی ہیں۔

(۲)۔ جو نمازیں آپ نے لیٹے لیٹے ادا کیں ہیں اگر آپ کھڑے ہوکر اور بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہیں تھیں تو وہ نمازیں ہوگئیں، ورنہ ان کا اعادہ کرنا آپ پر لازم ہے۔

لما فی الهداية (۱/۶۷): (والدم الذی تراه الحامل ابتداء او حال ولادتها قبل خروج الولد استحاضة) وان کان ممتدا.

وفی الهندية (۱/۳۷): والسقط ان ظهر بعض خلقه من اصبع أو ظفر او شعر ولد فتصير به نفساء هكذا فی التبيين، وان لم يظهر شیئ من خلقه فلا نفاس لها فان أمكن جعل المرئی حيضا يجعل حيضا وإلا فهو استحاضة.

وفی الشامية (۲/۹۷): لو قدر علی بعض القيام دون تمامه أو كان يقدر علی القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرأ ماقدر عليه ثم يقعد إن عجز وهو مذهب الصحيح لايروی خلافه عن أصحابنا، ولو ترک هذا خفت ان لاتجوز صلاته.

(۲۱۳) تین ماہ کا حمل ضائع ہونے کے بعد آنے والے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی خاتون کا حمل تین مہینے کے بعد ضائع ہوجائے یا ضائع کردیا جائے تو آیا اس کے بعد آنے والا خون حیض سے شمار ہوگا یا نفاس سے شمار کیا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کسی عورت کا حمل تین ماہ کے بعد ضائع ہوجائے یا ضائع کردیا جائے تو اگر اس حمل کے اعضاء (مثلاً ہاتھ، پیر وغیرہ) ظاہر ہوگئے ہوں تو پھر اس کے بعد آنے والا خون نفاس شمار ہوگا اور اگر اس حمل کے اعضاء وغیرہ کچھ ظاہر نہ ہوئے ہوں تو پھر اس کے بعد آنے والا خون اگر کم از کم تین روز تک آیا ہو، اور اس سے پہلے ایک طہر تام (پندرہ دن کا دورانیہ) گزرا ہو تو پھر یہ حیض (ماہواری) ہے اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو پھر یہ خون نہ نفاس ہے اور نہ حیض بلکہ استحاضہ (بیماری) کا خون ہوگا۔

لمافی الهندية(۱/۳۷): والسقط ان ظهر بعض خلقه من اصبع أو ظفر أو شعر ولد فتصيربه نفساء هكذا فی التبيين.

و فی الدرالمختار (۱/۳۰۲):(وسقط) مثلث السين أی مسقوط (ظهر بعض خلقه كيد أورجل) أو

أصبع أوظفر أو شعر ولا يستبين خلقه الابعد مائة وعشرين يوما(ولد) حكما (فتصير) المرأة (به نفساء والامة ام ولد ويحنث به) في تعليقه وتنقضي به العدة فان لم يظهر له شئ فليس بشئ والمرئي حيض ان دام ثلا ثا وتقدمه طهر تام والا استحاضة.

وفي الفقه الاسلامي (۱/۱۲۱): ويعد الدم عند هؤلاء دم النفاس بخروج اكثر الولد ولو متقطعاً عضواً عضواً ولو سقطاً استبان فيه بعض خلقة الانسان كاصبع أوظفر...... فان رأت دما بعد القاء نطفة او علقة فليس بنفاس.

(۲۱۴) ماہواری میں تعلیم قرآن کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت اپنی ماہواری کے ایام میں قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں؟ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بچوں کو قرآن پڑھاتی ہوں اگر میں ماہواری کے ایام کی چھٹی کرتی ہوں تو بچوں کے سبق کا حرج ہوتا ہے اور اگر چھٹی نہ کروں تو دوران ماہواری تلاوت کا مسئلہ ہے ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا حل بتائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......عورت کا ماہواری کے ایام میں تلاوت کرنا ناجائز ہے، البتہ معلمہ ہونے کی صورت میں اس قدر گنجائش ہے کہ ہر آیت کے کلمات کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھائے، مثلاً ''الحمد للہ'' میں ''الحمد'' کو علیحدہ اور ''للہ'' کو علیحدہ پڑھائے تو پھر جائز ہے۔ البتہ قرآن مجید کو یاد رکھنے کے لئے دوسرے سے سننا جائز ہے۔

وفي الدر المختار (۱/۱۷۲،۱۷۳):(و) يحرم به (تلاوة قرآن) ولو دون آية على المختار (بقصده) فلو قصد الدعاء أو الثناء أو إفتتاح أمر أو التعليم ولقن كلمة كلمة حل في الأصح.

(۲۱۵) ماہواری میں خواتین کیلئے تلاوت قرآن کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میری چھوٹی بیٹی ماشاء اللہ اب سن بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔ وہ پہلے آپ کے مدرسہ میں ہی حفظ کر رہی تھی، اب گھر کے قریب ایک مدرسہ میں پڑھ رہی ہے۔ اس کے متعلق مسئلہ یہ دریافت کرنا تھا کہ ماہواری کے دنوں میں وہ قرآن کریم کی تلاوت اور اسباق کی پابندی کیسے کرے گی؟ نیز کیا ان دنوں میں خواتین دل ہی دل میں قرآن پاک کی تلاوت کر سکتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......عورتوں کا حالت حیض میں قرآن کریم کو چھونا اور زبان سے اس کی تلاوت کرنا جائز نہیں۔ اور حدیث شریف میں حائضہ عورتوں کے لیے جو ممانعت وارد ہوئی ہے وہ قرآن کریم کی تلاوت کے متعلق ہے کہ حائضہ عورت قرآن کریم نہ پڑھے اور چونکہ

پڑھنے کا تعلق زبان سے ہے۔اس لئے اگر کوئی دل کے اندر پڑھنے کا تصور کرے تو اس کو تلاوت نہیں کہا جائے گا لہٰذا اگر کوئی عورت ماہواری کے دنوں میں قرآن کریم کی تلاوت کا دل ہی دل میں تصور کرے تو جائز ہے۔ نیز اشد ضرورت کی بناء پر فقہاء کرام نے جواز کی یہ صورت بیان کی ہے کہ کلمات کو توڑ توڑ کر پڑھ سکتی ہے۔ پوری آیت نہ پڑھے جیسا کہ معلمہ وغیرہ۔

لہٰذا آپ کی بیٹی کے لیے ماہواری کے ایام میں قرآن کریم کی تلاوت زبان سے جائز نہیں ہے البتہ اسباق کی پابندی اس طور پر کرے کہ کلمات کو توڑ توڑ کر پڑھے یا کسی دوسرے سے سن لے۔ یا پھر دل ہی دل میں تلاوت کا خیال کرلیا کرے۔

لمافی جامع الترمذی(١/٣٤): عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئا من القرآن.

وفی بدائع الصنائع(١/١٨٥): أن القراءة فعل اللسان وذلک بتحصيل الحروف ونظمها على وجه مخصوص.

وفی الهداية(١/٣٥٢، جزء اوّل)مکتبة ادارة القرآن: وقال الكرخی أدنى الجهر ان يسمع نفسه وأدنى المخافتة تصحيح الحروف لان القراءة فعل اللسان.

وفی الدر المختار (١/١٧٢): (و)يحرم به (تلاوة القرآن) ولو دون آية على المختار (بقصده) فلو قصد الدعاء أو الثناء أو افتتاح أمر او التعليم ولقن كلمة كلمة حل فی الأصح.

وفی الشامية تحته: (قوله او التعليم) فرق بعضهم بين الحائض والجنب بأن الحائض مضطرة لأنها لا تقدر على رفع حدثها بخلاف الجنب والمختار انه لا فرق (قوله ولقن كلمة كلمة) هو المراد بقول المنية حرفا حرفا كما فسره به فی شرحها، والمراد مع القطع بين كل كلمتين.

(٢١٦) حالت حیض میں وطی کرنے سے صرف توبہ واستغفار لازم ہے کوئی کفارہ واجب نہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کراچی کے ایک مدرسے میں پڑھتا ہوں ہمارے مہتمم صاحب چھٹی کے معاملے میں بہت سخت ہیں سوائے عید کے ایام کے باقی ایام میں چھٹی کو گناہ کبیرہ تصور کرتے ہیں میری نئی شادی ہوئی ہے بیوی کے بغیر چارہ نہیں ہوتا میں نے مشکل سے مہتمم صاحب سے ششماہی امتحان کے موقعہ پر ایک ہفتہ چھٹی لی، جب گھر آیا تو بیوی کے حیض کے ایام چل رہے تھے میرے سے برداشت نہ ہوسکا میں حیض کی حالت میں ہمبستری کرتا رہا چونکہ مجھے معلوم تھا کہ بعد میں چھٹی نہیں ملے گی۔ یہ موقع بھی غنیمت ہے جب واپس آیا تو میں کافی پریشان رہا کہ میں نے حالت حیض میں ہمبستری کرکے غلط کام کیا ہے اب آپ حضرات میری رہنمائی کریں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور میرے اوپر کیا کفارہ ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً...... حالت حیض میں وطی کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے اگر کسی سے غلطی سے یہ فعل سرزد ہوجائے تو اس پر توبہ واستغفار لازم ہے اس کے علاوہ کوئی کفارہ واجب نہیں۔ جب آپ سے یہ غلطی ہوگئی ہے تو اللہ کے حضور توبہ واستغفار کریں اور آئندہ نہ کرنے کا

عزم کریں اللہ بخشنے والا مہربان ہے البتہ مستحب یہ ہے کہ اگر شروع ایام میں وطی کی ہو تو ایک دینار اور آخر ایام میں کی ہو تو نصف دینار کی بقدر قیمت صدقہ بھی کر دیں۔

لمافي الدر المختار مع الشامية (۱/۲۹۷،۲۹۸): (و) طؤها (يكفر مستحله) كما جزم به غير واحد وكذا مستحل وطء الدبر عند الجمهور (وقيل لا يكفر) في المسألتين وهو الصحيح خلاصة (وعليه المعول) لانه حرام لغيره (قوله ووطؤها) اى الحائض قال في الشرنبلالية ولم ارحكم وطء النفساء من حيث التكفير اما الحرمة فمصرح بها...... ثم هو كبيرة لو عامداً مختاراً عالماً بالحرمة لا جاهلاً او مكرهاً او ناسياً فتلزمه التوبة. ويندب تصدقه بدينار او نصفه، ومصرفه كزكاة وهل على المرأة تصدق قال في الضياء: الظاهر لا. (قوله ثم هو) اى وطء الحائض (قوله لا جاهلاً الخ) هو على سبيل اللف والنشر...... والظاهر ان الجهل انما ينفي كونه كبيرة لا اصل الحرمة اذ لا عذر بالجهل بالأحكام في دار الاسلام ......(قوله ويندب الخ) لما رواه احمد وابو داؤد والترمذي والنسائي عن ابن عباس مرفوعاً، في الذي ياتي امراته وهي حائض قال: يتصدق بدينار او نصف دينار" ثم قيل ان كان الوطء في اول الحيض فبدينار أو اخره فبنصفه.

وفي سنن النسائي (۱/۴۳): عن ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم في الرجل ياتي امراته وهي حائض يتصدق بدينار او بنصف دينار.

(۲۱۷) ماہواری کے دوران فضائل اعمال پڑھنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت اپنے مخصوص ایام میں فضائل اعمال ہاتھ میں لیکر پڑھ سکتی ہے جبکہ اس میں بعض اوقات قرآن کی آیات یا ان کا ترجمہ اور عام طور پر احادیث مقدسہ ہوتی ہیں، ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں عورت کا ماہواری کے ایام میں فضائل اعمال یا اس جیسی دوسری ایسی کتابوں کا ہاتھ میں لینا یا پڑھنا جائز ہے جن میں دوسرے کلام کے ساتھ قرآن کی آیات بھی ملی ہوئی ہوں، بشرطیکہ قرآن کی آیات پر ہاتھ نہ لگایا جائے۔

لمافي الدر المختار (۱/۲۹۱): (و) يمنع حل (دخول مسجد)......(۱/۲۹۳) (وقراءة قرآن) بقصده (ومسه) ولو مكتوبا بالفارسية في الأصح (الا بغلافه) المنفصل.

وفي الشامية (۱/۲۹۳): (ومسه) اى القران ولو في لوح أو درهم أو حائط لكن لايمنع الامن مس المكتوب بخلاف المصحف فلا يجوز مس الجلد وموضع البياض منه.

(۲۱۸) گولیاں کھا کر ماہواری کا خون بند کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بیوی کو ہر ماہ آٹھ تاریخ سے سترہ (۱۷) تاریخ تک خون آتا ہے اور میں گھر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک اسکول میں ملازم ہوں ہفتے کے بعد گھر آتا ہوں دوراتیں ٹھہر کر واپس چلا جاتا ہوں اس مرتبہ جب آیا تو بیوی کو ماہواری کا خون آرہا تھا میں نے کہا چلو اگلے ہفتے ہمبستری کرلیں گے اس نے کہا معمول کو ترک کرنا اچھا نہیں ہے خواہ مخواہ یہ جمعرات بددعا دے گی میں ابھی بندوبست کرلیتی ہوں اس نے گولیاں کھالیں جن سے خون بند ہوگیا اب حیض کے ایام میں خون کو گولیوں کے ذریعے بند کرکے ہمبستری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......خون بند کرنے والی گولیاں اگر حیض شروع ہونے سے پہلے کھائی جائیں اور پھر مقررہ ایام میں خون جاری نہ ہو تو عورت کیلئے مقررہ ایام پاکی کے شمار ہوں گے اور اگر حیض ہونے کے بعد کھائی جائیں تو اگر تین دن سے پہلے پہلے خون بند ہوگیا ہے اور اس کے بعد دس دن تک دوبارہ خون نہیں آیا تو پاکی کے احکام جاری ہوں گے اور جماع کرنا بھی جائز ہوگا اور اگر تین دن کے بعد خون بند ہوا ہے تو عورت کی جو عادت ہوگی اس وقت تک جماع کرنا جائز نہیں ہوگا اور عادت کے بعد بھی اس وقت جائز ہوگا جب عورت غسل کرلے۔ بس صورت مسئولہ میں عورت نے حیض شروع ہونے کے بعد گولیاں کھائی تھیں پھر اگر تین دن خون جاری رہنے کے بعد کھائی تھیں تو اس پر خون بند ہونے کے باوجود پاکی کے احکام جاری نہیں ہوئے تھے اور جماع کرنا بھی جائز نہیں تھا لہٰذا آپ دونوں نے جماع کرکے گناہ کا ارتکاب کیا، توبہ واستغفار لازم ہے۔

لمافی فتاوی اللجنة الدائمة(۵/ ۴۰۰): یجوز أن تستعمل المرأة أدویة فی رمضان لمنع الحیض اذا قرر أهل الخبرة الأمناء من الدکاترة ومن فی حکمهم أن ذلک لا یضرها ولا یؤثر علی جهاز حملها وخیر لها أن تکف عن ذلک وقد جعل الله لها رخصة فی الفطر اذا جاء ها الحیض فی رمضان.

وفی اعلاء السنن(طبع بیروت)(۱/ ۳۴۰): وفی الثالث: وهو ما اذا انقطع لدون العادة لا یقربها وان اغتسلت مالم تمض عادتها...... وفی الثالثة لا یجوز قربانها قبل الغسل وبعده مالم تمض عادتها وهذا باجماع.

وفی عالمگیری(۱/ ۳۹): لو انقطع دمها دون عادتها یکره قربانها وإن اغتسلت حتی تمضی عادتها وعلیها أن تصلی وتصوم للاحتیاط هکذا فی التبیین.

(۲۱۹) اسقاطِ حمل کے بعد آنے والے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک عزیزہ کا پانچ ماہ کا حمل خود بخود ساقط ہوگیا، ڈاکٹر نے

حمل ساقط ہونے کے بعد صفائی وغیرہ کی اس کے بعد صرف دو دن خون آیا، اب یہ دو دن آنے والا خون نفاس شمار ہوگا؟ اور اس کی نماز معاف ہوگی یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں یہ خون نفاس کا ہے لہٰذا آپ کی عزیزہ پر ان دنوں کی نماز معاف ہے۔

وفی الدر المختار(۱/۳۰۲):(وسقط) مثلث السین ای مسقوط(ظهر بعض خلقه کید او رجل) او إصبع او ظفر او شعر ولا يستبين خلقه الا بعد مائة وعشرين يوماً (ولد) حكماً(فتصير) المرأة(به نفساء والأمة ام ولد)

(۲۲۰) بذریعہ آپریشن ولادت ہوتو بعد میں آنے والے خون کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر آپریشن کے ذریعے بچہ پیدا ہوتو بعد میں آنے والے خون کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں آپریشن کے بعد آنے والا خون، اگر زخم سے نہ رس رہا ہو۔ بلکہ رحم سے آ رہا ہوتو نفاس کا ہوگا، ورنہ نہیں۔

وفی الهندية(۱/۳۷): ولو ولدت من قبل سرتها بأن كان ببطنها جرح فانشقت وخرج الولد منها، تكون صاحبة جرح سائل لانفساء هكذا في الظهيرية والتبيين : إلا إذا خرج من الفرج دم عقيب خروج الولد من السرة فانه حينئذ يكون نفاساً هكذا في التبيين.

وفی الدر المختار(۱/۲۹۹): فلو ولدته من سرتها، إن سال الدم من الرحم فنفساء، والا فذات جرح، وإن ثبت له احكام الولد...... وحكمه، كالحيض في كل شيئ الا في سبعة ذكرتها في الخزائن .

وفی اللجنة الدائمة (۵/۴۱۹): سوال: بعض النسوة تعسر عليهن الولادة فيضطر إلى توليدهن بطريقة العملية، الجراحية، ولربما يحصل من جراء ذالک خروج الولد عن طريق غير الفرج. فما حكم أمثال هولاء النسوة في الشرع من ناحية دم النفاس؟ وما حكم غسلهن شرعاً؟

جواب: حكمها. حكم النفساء، ان رأت دماً جلست حتى تطهر، وإن لم تردماً فانها تصوم وتصلی كسائر الطاهرات.

(۲۲۱) معتادہ کا خون نفاس میں عادت سے تجاوز کر جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کی عادت ہو کہ اس کو نفاس کا خون پانچ دن

آتا ہے لیکن اب اس کو بیس دن تک خون جاری رہا تو کیا یہ سارا خون نفاس کا شمار ہوگا یا پانچ دن نفاس کا شمار ہوگا اور باقی استحاضہ کا خون سمجھا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اگر عورت معتادہ (جس کی عادت مقرر) ہو اس کا خون عادت (مثلاً پانچ دن) سے تجاوز کر کے چالیس دن کے اندر (مثلاً بیس دن پر) بند ہو جائے تو وہ نفاس کا خون شمار ہوگا اور سمجھا جائے گا کہ اس کی عادت بدل گئی ہے پہلے پانچ دن تھی اور اب بیس دن ہوگئی ہے۔ اور اگر چالیس دن سے بھی تجاوز کر جائے تو اس کی عادت برقرار رہے گی اور اس کی عادت کے بعد جو خون آئے گا وہ استحاضہ کا شمار ہوگا۔ یعنی پہلے پانچ دن صرف نفاس اور باقی دن استحاضہ کے ہوں گے۔

وفی التاتارخانیة(۱/۳۹۱): ولو كانت المرأة لها عادة معروفة في النفاس وهي التي ولدت غير مرة فكلما رأت من الدم ولم يجاوز الأربعين فذلك كله نفاس بالإجماع.

وفی الهندية(۱/۴۰): وكذا النفاس فان رأت لاعلى العادة ولم يجاوز الاربعين انتقلت.هكذا فی المحيط.

وفی الشامية(۱/۳۰۱): فان جاوز الدم الأربعين فالعادة باقية ترد اليها والباقي استحاضة وان لم يجاوز انتقلت العادة الى مارأته والكل نفاس.

(۲۲۲) جس عورت کے چھ مہینے سے کم مدت میں دو بچے پیدا ہوئے اس کے نفاس کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زبیدہ خاتون کے پیٹ میں دو بچے تھے اس نے ایک کو جنم دیا ہے دوسرا پیٹ میں موجود ہے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک ماہ بعد پیدا ہوگا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کا نفاس کب سے سمجھا جائے گا؟ اگر پہلے بچے سے شروع ہے تو دوسرے بچے کے بعد آنے والا خون نفاس ہوگا یا استحاضہ؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اگر کسی عورت کو چھ مہینے سے کم مدت میں دو بچے پیدا ہوں تو شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عورت کا نفاس پہلے بچے کے پیدا ہونے کے بعد شمار ہوگا۔ یہی قول راجح ہے پس اگر دوسرا بچہ چالیس دن کے اندر مثلاً تیس دن بعد ہوا تو اس کے بعد دس دن تو نفاس کے شمار ہوں گے تاکہ نفاس کی مدت چالیس دن پوری ہو جائے اور اگر دوسرا بچہ چالیس دن کے بعد پیدا ہوا تو اس کے بعد آنے والا خون استحاضہ کا ہوگا۔ لہٰذا زبیدہ خاتون کا نفاس پہلے بچے سے شروع ہو گیا ہے اگر دوسرا بچہ ایک ماہ بعد پیدا ہوا تو اس کے بعد دس دن تو نفاس کے شمار ہوں گے اور اس کے بعد والا خون استحاضہ ہوگا۔ فقط، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

لمافي الطحطاوي على الدر(۱/۱۵۳،۱۵۴): قوله من الاوّل لانه بالولد الاول ظهر انفتاح الرحم فكان المرئ عقبه نفاساً وهو المعتمد وافاد المصنف ان ماتراه عقب الثاني ان كان قبل الاربعين فهو نفاس للاول لتمامها واستحاضة بعد تمامها فتغتسل وتصلي كما وضعت الثاني وهو الصحيح كذا في البحر.

وفی الدر المختار مع شرحه (۱/۳۰۱): (والنفاس لام توأمين من الاول) هما ولدان بينهما دون نصف حول وكذا الثلاثة ولو بين الاول والثالث اكثر منه فی الاصح (و) انقضاء (العدة من الاخير وفاقاً) لتعلقه بالفراغ......

وفی الشامية تحته: قوله من الاول والمرئی عقيب الثانی ان كان فی الاربعين فمن نفاس الاول والا فاستحاضة وقيل اذا كان بينهما اربعون يجب عليها نفاس من الثانی والصحيح هو الاول عناية وبحر ثم ما ذكره المصنف قولهما وعند محمد وزفر النفاس من الثانی قوله لتعلقه بالفراغ)ای لتعلق انقضاء العدة بفراغ الرحم وهو لا يفرغ الابخروج كل مافيه......

(۲۲۳) نفاس کے بعد کب تک نماز معاف ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد جوخون آتا ہے اس میں کتنے دن تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے؟ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ چالیس دن تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز اگر خون چالیس دن کے بعد بھی بند نہ ہو تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر خون چالیس دن تک بند نہ ہو تو چالیس دن تک نماز کی ادائیگی معاف ہے اور اگر چالیس دن سے پہلے بند ہو جائے، تو اسی دن سے نماز پڑھنی لازم ہو جاتی ہے چالیس دن کا انتظار نہیں کیا جائے گا، مثلاً پندرہ دن کے بعد ظہر کی ابتداء میں خون بند ہو گیا تو ظہر کے آخر وقت تک انتظار کر لیں اگر خون نہ آئے تو غسل کر کے نماز پڑھنی واجب ہوگی۔ اور اگر خون چالیس دن کے بعد بھی جاری رہے تو اس میں دو صورتیں ہیں، اول اس عورت کی پہلے سے کوئی عادت ہے یا نہیں اگر پہلے سے کوئی عادت ہے تو وہی نفاس ہوگا باقی استحاضہ (استحاضہ کے معنی یہ ہیں کہ یہ خون کسی بیماری کی وجہ سے ہے، اس حالت کے سارے احکام ایسے ہوں گے جیسے پاکی کے ہوتے ہیں) شمار ہوگا، اور اگر پہلے سے کوئی عادت نہیں ہے تو چالیس روز تک نفاس ہوگا باقی استحاضہ شمار ہوگا۔

لمافی الدرالمختار (۱/۳۰۰،۳۰۱): (واكثره اربعون يوما) ...... (والزائد) علی أكثره(استحاضة) لو مبتدأة أما المعتادة فترد لعادتها وكذا الحيض فان انقطع علی اكثرهماأو قبله فالكل نفاس.

(۲۲۴) حیض ونفاس سے پاکی کب شمار ہوتی ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حیض ونفاس سے عورتیں کب پاک ہوتی ہیں، وہ کب سے نماز روزہ اور حقوق زوجیت کے قابل ہوتی ہیں؟ خاص طور پر وہ عورتیں جن کے ہاں بچے کی ولادت ہوتی ہے، وہ کب سے نماز روزہ شروع کریں گی؟ عام رواج کے اعتبار سے چالیس دن تک ایسی عورتیں ناپاک شمار ہوتی ہیں۔ نیز ان ایام کے روزے اور نمازیں

قضاء ہوں گی، یا معاف ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں حیض کا حکم یہ ہے کہ جب عورت کی ماہواری رک جائے، یا دس دن پورے ہو جائیں تو عورت پاک ہو جاتی ہے، اور اس پر نماز وروزہ کی ادائیگی فرض ہو جاتی ہے۔ اور حقوق زوجیت کے قابل ہونے کیلئے دیکھا جائے گا کہ اگر ماہواری دس دن سے پہلے ختم ہوگئی تھی تو عورت غسل کرلے یا ایک نماز کا وقت گزر جائے، اور اگر ماہواری دس دن تک رہے تو خون کے بند ہوتے ہی حقوق زوجیت ادا کرسکتی ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ پہلے غسل کرلیا جائے۔

اور نفاس کا حکم یہ ہے کہ جب اس کا خون عادت پر بند ہو جائے، یا چالیس دن پورے ہو جائیں تو عورت پاک ہو جائے گی اس پر تمام حقوق وفرائض لازم ہوں گے، یاد رہے کہ نفاس میں چالیس دن پورے کرنا لازم نہیں بلکہ اگر چالیس دن سے پہلے خون بند ہو جائے تو بھی اسی دن سے وہ پاک ہو جائے گی اس پر فرائض کی ادائیگی لازم ہوگی، ہاں اگر چالیس دن یا چالیس دن کے بعد بھی جاری ہو تو پھر چالیس دن کے بعد سے فرائض کی ادائیگی لازم ہوگی، ہمارے ہاں جو مشہور ہے کہ نفاس سے پاکی چالیس دن کے بعد ہوتی ہے چاہے خون پہلے ہی کیوں نہ بند ہو جائے یہ صحیح نہیں ہے۔

اور نفاس کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی کیلئے دیکھا جائے گا کہ نفاس کا خون اس کی عادت کے موافق اور چالیس دنوں سے پہلے بند ہوا ہے یعنی عام طور پر جتنے دنوں میں خون بند ہوتا ہے اتنے ہی دنوں میں بند ہوا ہے، تو غسل کے بعد یا ایک نماز کا وقت گزر جانے کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح ہوگی، اور اگر اس کی عادت سے پہلے خون بند ہو جائے تو جب تک عادت کے دن پورے نہ ہو جائیں اس وقت تک حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح نہیں، اور اگر خون چالیس دن پورے ہونے کے بعد بند ہوا ہے تو پھر بغیر غسل کے حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح ہے البتہ غسل کرلینا بہتر ہے۔

وفي الهندية (۳۸/۱): (منها) ...... ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلاتقضى هكذا في الكفاية ...... (ومنها) ان يحرم عليهما الصوم فتقضيانه هكذا في الكفاية.

وفي الدر المختار (۲۹۴/۱،۲۹۵): (ويحل وطؤها اذاانقطع حيضها لأكثره) بلا غسل وجوباً بل ندباً (وان)انقطع لدون اقله تتوضأ وتصلي في آخر الوقت وان (لأقله) فان لدون عادتها لم يحل، وتغتسل وتصلي وتصوم احتياطا وان لعادتها فان كتابية حل في الحال والا (لا)يحل (حتى تغتسل) ......(أو يمضي عليها زمن يسع الغسل)ولبس الثياب(والتحريمة)يعني من آخر وقت الصلاة وفي الشامية(ص۲۹۴) :(اذا انقطع حيضها لأكثره) مثله النفاس.

(۲۲۵) مستحاضہ کے کپڑوں اور بدن کی پاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ماہواری کے ایام سات ہیں جونو (۹) تاریخ سے

شروع ہوکر سولہ (۱۶) تاریخ تک رہتے ہیں اب میرے ساتھ یہ مسئلہ ہوگیا ہے کہ عام ایام میں بھی آگے کے راستہ سے پانی کی طرح ایک رطوبت بہتی رہتی ہے، اس رطوبت کا کیا حکم ہوگا اگر یہ کپڑے یا جسم پر لگ جائے تو ان کو دھونا لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر وہ عورت جس کو ایام مخصوصہ کے علاوہ بھی جریان اور سیلان الدم اور رطوبت کا سلسلہ لاحق ہو۔ وہ عورت مستحاضہ کہلاتی ہے اور مستحاضہ معذور کے حکم میں ہوتی ہے اور معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر نماز کیلئے وضوء کرے گا اور جب نماز کا وقت نکل جائے تو خروج وقت سے خود بخود اس کا وضوٹوٹ جائے گا البتہ اس کے بدن اور کپڑوں کی طہارت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ زخم اس طرح ہے کہ اگر اس کی نجاست کو دھولیا جائے اور پوری نماز طہارت کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہو، تو اس صورت میں اس خون اور رطوبت کو دھونا ضروری ہے اور اگر پوری نماز طہارت کے ساتھ نہ پڑھی جاسکتی ہو (یعنی دورانِ نماز دوبارہ وہ خون وغیرہ کپڑوں اور بدن کو لگے گا) تو اس صورت میں اس نجاست کو دھونا ضروری نہیں لہٰذا آپ مستحاضہ ہیں۔ اور نماز آپ کے اوپر فرض ہے البتہ بہنے والی رطوبت کو کسی روئی یا کپڑے کے ذریعے روک دیں تاکہ دوران نماز آپ کے بدن اور کپڑے پاک رہیں اور اگر علاج اور تدبیر کے باوجود بھی رطوبت کپڑوں یا بدن کو لگ جائے تو پھر اس کا دھونا ضروری نہیں۔

لمافی فتاویٰ الولوالجية (۱/۴۲): کل ما یخرج من بدن الحیوان (الانسان) فهو نجس.

وفی الشامیة (۱/۲۹۸): بان رطوبة الفرج نجسة

وفیه ایضاًمع الدر (۱/۳۰۵): (وحکمه الوضوء) لاغسل ثوبه ونحوه (لکل فرض) اللام للوقت...... (الی ان قال) (وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جازله ان لایغسله ان کان لو غسله تنجس قبل الفراغ منها) ای الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترک غسله، هو المختار للفتوی، (قوله وحکمه) ای العذرا وصاحبه (قوله الوضوء) ای مع القدرة علیه والافالتیمم (قوله لاغسل ثوبه) ای ان لم یفد کما یاتی متنا (قوله ونحوه) کالبدن والمکان ط...... (الی ان قال) (قوله هو المختار للفتوی) وقیل لایجب غسله اصلا، وقیل ان کان مقیدا بان لا یصیبه مرة اخری یجب، وان کان یصیبه المرة بعد الاخری فلا واختاره السرخسی بحر

قلت بل فی البدائع انه اختیار مشائخنا وهو الصحیح اهـ فان لم یمکن التوفیق بحمله علی مافی المتن فهو اوسع علی المعذورین ویؤید التوفیق مافی الحلیة عن الزاهدی عن البقالی لو علمت المستحاضة انها لو غسلته یبقی طاهراً الی ان تصلی یجب بالاجماع وان علمت انه یعود نجساً غسلته عند ابی یوسف دون محمد ...... (الی ان قال) لکن هذا قول ابن مقاتل الرازی فانه یقول یجب غسله فی وقت کل صلاة قیاسا علی الوضوء.

﴿فصل في المسح الخفين والجبيرة﴾

(موزوں اور پٹی وغیرہ پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۲۶) موزے پہننے کی حالت میں دونوں پیروں میں سے ہر ایک پر کم از کم مسح کی مقدار کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص مسح علی الخفین میں دائیں پیر پر دو انگلیوں کے بقدر اور بائیں پر پانچ انگلیوں کے بقدر مسح کرے۔ کیا اس طرح مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسح علی الخفین میں ہر پیر پر کم از کم تین انگلیوں کے بقدر مسح کرنا ضروری ہے اگر کوئی شخص مسح علی الخفین میں دائیں پیر پر دو انگلیوں کے بقدر اور بائیں پیر پر پانچ انگلیوں کے بقدر مسح کرے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اسکا مسح درست نہ ہوگا۔

لمافي الهندية(۱/۳۲): ولو مسح على رجل قدر أصبعين وعلى أخرى قدر خمسة لم يجز.

وفي الدر المختار(۱/۲۷۲): (وفرضه) عملا (قدر ثلاث أصابع اليد) أصغرها طولاً وعرضاً من كل رجل.

وفي الشامية تحته: (قوله من كل رجل) أي فرضه هذا القدر كائنا من كل رجل على حدة قال في الدرر: حتى لو مسح على احدى رجليه مقدار أصبعين وعلى الاخرى مقدار خمس أصابع لم يجز.

(۲۲۷) عذر شرعی کی صورت میں موزوں پر مسح کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کے سلسلے میں ایک سال کیلئے نکلا ہوں۔ ہماری جماعت میں ایک بوڑھا شخص ہے جس کی ہر وقت ہوا خارج ہوتی رہتی ہے اور وہ موزوں پر مسح کرنا چاہتا ہے حالانکہ موزوں پر مسح کرنے کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ کامل وضو پر پہنے ہوئے ہوں، لیکن یہ شخص اس شرط کو پورا نہیں کرسکتا کیونکہ چند سیکنڈ کے بعد فوراً ہوا خارج ہوتی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ شخص ایسی حالت میں موزوں پر مسح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بصحت واقعہ یہ بوڑھا شخص نمازوں کے اوقات کے اندر تو موزوں پر مسح کرسکتا ہے وقت کے نکلنے کے بعد مسح نہیں کرسکتا۔ مثلاً ظہر کی نماز کیلئے وضو کرکے موزے پہن لیے، اب ظہر کے وقت کے اندر اس کو حدث (اس حدث کے علاوہ جس میں یہ مبتلا ہے) لاحق ہوتا ہے تو یہ وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کرسکتا ہے، ظہر کے وقت کے نکلنے کے بعد مسح نہیں کرسکتا چنانچہ عصر کی نماز کیلئے وضو

کرتے وقت پاؤں دھوئے گا۔

لمافی الهندية (۱/۳۴): المعذور اذا كان عذره غير موجود وقت الوضوء ولبس الخفين يجوز له المسح الى المدّة كالاصحاء بخلاف ما اذا وجد العذر مقارنا للوضوء اوللبس احدهما يجوز المسح في الوقت لاخارجه هكذا في البحر الرائق.

وفي الشامية(۱/۲۷۱): ثم انه لا يخلواما ان يكون العذر منقطعاً وقت الوضوء واللبس معاً او موجوداً فيهما، او منقطعاً وقت الوضوء موجوداً وقت اللبس او بالعكس فهي رباعية، ففي الاوّل حكمه كالاصحاء لوجود اللبس على طهارة كاملة فمنع سراية الحدث للقدمين، وفي الثلاثة الباقية يمسح في الوقت فقط، فاذا خرج نزع وغسل كمافي البحر.

(۲۲۸) جوتوں اور نائیلون کے موزوں پر مسح کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل موزہ زیادہ تر نائیلون کا ہوتا ہے کیا اس پر مسح جائز ہے؟ نیز کیا جوتے کے اوپر سے بھی مسح ہوسکتا ہے اگر اجازت ہے تو کن شرائط کے ساتھ؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... شریعت مطہرہ میں جن موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اُن میں مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ٹخنوں سمیت پاؤں کوڈھانپنے والے ہوں۔ اُن میں مسلسل چلا جا سکے، بغیر رکاوٹ کے پاؤں پر رُکے رہیں۔ اور اُن میں سے پاؤں تک پانی نہ پہنچے۔ لہٰذا مروجہ نائیلون کے موزوں پر ان شرائط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے مسح کرنا درست نہیں۔ نیز جوتوں میں بھی اگر یہ شرائط پائی جائیں تو ان پر بھی مسح کرنا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

لمافي المحيط البرهاني(۱/۳۴۳): واما المسح على الجوارب فلا يخلو: إما ان كان الجوارب رقيقا غير منعل، وفي هذا الوجه لا يجوز المسح بلا خلاف، واما ان كان ثخينا منعلاً ففي هذا الوجه يجوز المسح بلا خلاف، لانه يمكن قطع السفر، وتتابع المشي عليه، فكان بمعنى الخف. والمراد من الثخين: أن يستمسک على الساق من غير أن يشد بشيء، ولا يسقط، فأما اذا كان لا يستمسک ويسترخي، فهذا ليس بثخين، ولا يجوز المسح عليه.

وفي الشامية (۱/۲۶۱): (قوله شرط مسحه) اى مسح الخف المفهوم من الخفين، وأل فيه للجنس الصادق بالواحد والاثنين، ولم يقل مسحهما لانه قد يكون واحد الذى رجل واحدة (قوله ثلاثه امور الخ) زاد الشر نبلالي: لبسهما على طهارة، وخلو كل منهما عن الخرق المانع، واستمساكهما على الرجلين من غيرشد، ومنعهما وصول الماء الى الرجل، وأن يبقى من القدم قدر ثلا ثة أصابع.

(۲۲۹) کون سی جراب پر مسح کرنا جائز ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس بہت موٹی جرابیں ہیں جن میں ٹھنڈک بالکل محسوس نہیں ہوتی، تو کیا میں ان جرابوں پر مسح کرسکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر جرابیں ایسی ہوں کہ بغیر کسی چیز کے سہارے پنڈلی پر ٹھہری رہیں اور ان کو پہن کر لگاتار چلا جا سکتا ہو، اور وہ اتنی موٹی ہوں کہ پانی قدم تک تجاوز نہ کرسکتا ہو تو ان جرابوں پر مسح کرنا درست ہے ورنہ نہیں۔

لمافی الهندية(۱/۳۲): ويمسح على الجورب المجلد وهو الذى وضع الجلد على اعلاه واسفله هكذا فى الكافى والمنعل وهو الذى وضع الجلد على اسفله كالنعل للقدم هكذا فى السراج الوهاج. والثخين الذى ليس مجلدا ولامنعلا بشرط أن يستمسك على الساق بلاربط ولايرى ماتحته وعليه الفتوى كذا فى النهر الفائق.

وفى الشامية (۱/۲۶۹): (قوله على الثخينين) أى اللذين ليسامجلدين ولا منعلين نهر وهذا التقييد مستفاد من عطف ما بعده عليه وبه يعلم أنه نعت للجوربين فقط كما هو صريح عبارة الكنز......(قوله بحيث يمشى فرسخا) أى فأكثر كمامر وفاعل يمشى ضمير يعود على الجورب والاسناد اليه مجازى......(قوله بنفسه)أى من غير شدط (قوله ولا يشف) من شف الثوب رق ....(قوله الا ان ينفذ) أى من البلل.

(۲۳۰) گرم موسم میں موزوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موزوں پر مسح کرنا پہلے زمانے میں سخت حالات کیوجہ سے جائز تھا کہ سردی کے موسم میں گرم پانی نہیں ملتا تھا، وغیرہ وغیرہ لیکن آجکل یہ مشکلات ختم ہوگئی ہیں تو کیا آجکل بھی موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟ نیز اگر کوئی شخص کسی بیماری یا کسی اور وجہ سے گرم موسم میں بھی موزے استعمال کرے تو کیا اس وقت بھی اس کے لیے مسح کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قیامت تک کیلئے ضابطہ حیات بنا کر بھیجا ہے، لہٰذا احکامات بھی ایسے نازل کیے جو قیامت تک کیلئے نافذ العمل اور قابل عمل ہوں، صرف اس زمانے کے مخصوص حالات کے پیش نظر احکامات نازل نہیں کیے جو تھوڑے بہت ایسے احکامات نازل بھی ہوئے وہ بعد میں منسوخ کردیے گئے، اسی طرح مسح بھی انہی احکامات میں سے ہے جن کی مشروعیت قیامت تک کیلئے ہے لہٰذا موزوں پر مسح نہ صرف اس زمانے میں جائز تھا بلکہ اس کا جواز ابھی بھی باقی ہے۔ نیز موزوں پر مسح کرنا مطلقاً جائز ہے چاہے سردی

کا موسم ہو یا گرمی کا، چاہے بیماری کی حالت میں ہو یا عام صحت کی حالت میں۔

لما فی الصحیح للبخاری (۱/۳۳): عن عروة بن المغیرة عن ابیه المغیرة بن شعبة (رضی الله عنه) عن رسول الله ﷺ انه خرج لحاجته فاتبعه المغیرة بإداوة فیها ماء فصب علیه حین فرغ من حاجته فتوضأ ومسح علی الخفین.

وفی الهندیة (۱/۳۲): المسح علیٰ الخفین رخصة ولو اتی بالعزیمة بعد ما رأی جواز المسح کان اولیٰ.

(۲۳۱) تیمّم کی حالت میں پہنے گئے موزوں پر مسح کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے تیمم کی حالت میں موزے پہنے ہوں بعد میں جب وہ وضو کرے تو کیا اُن موزوں پر مسح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جس نے تیمّم کی حالت میں موزے پہنے ہوں بعد میں پانی مل جائے اور پانی کے استعمال پر قدرت بھی ہو، تو اس کیلئے وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں بلکہ پاؤں دھونا ضروری ہے۔

لمافی الخانیة علی الهندیة (۱/۵۰): المحدث اذا تیمم عند عدم الماء ولبس الخف ثم وجد ماء فانه ینزع خفیه ویغسل رجلیه لان المتیمم عند وجود الماء یصیر محدثا بالحدث السابق.

وفی الدر المختار (۱/۲۷۰): (ملبوسین علی طهر) فلو أحدث ومسح بخفیه أولم یمسح فلبس موقه لایمسح علیه (تام) خرج الناقص حقیقة کلمعة ،أومعنی کتیمم ومعذور.

وفی الشامیة تحت: (قوله کتیمم) ای أن اللبس لو کان بعد التیمم فوجد بعده الماء لایجوز المسح علی الخف بل یجب الغسل.

(۲۳۲) پھٹے ہوئے موزوں اور موٹی جرابوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس موزے ہیں جو کچھ پھٹے ہوئے ہیں میں ان پر مسح کر سکتا ہوں یا نہیں؟ نیز آج کل جو موٹی جرابیں آتی ہیں ان پر مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر موزے پاؤں کی تین چھوٹی انگلیوں کے بقدر پھٹے ہوں تو ایسی صورت میں ان پر مسح کرنا جائز نہیں۔ اگر اس سے کم پھٹے ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔

نیز یاد رہے کہ یہ مقدار ایک موزے کے اعتبار سے ہے یعنی اگر ایک موزہ اتنی مقدار میں پھٹا ہوا ہو تو مسح جائز نہیں ورنہ ان پر مسح کرنا

جائز ہے۔

آج کل جو موٹی جرابیں آتی ہیں ان پر مسح کرنا جائز نہیں اس لئے کہ ان میں پانی سرایت کر جاتا ہے۔

لمافي التاتارخانية(۱/۲۷۱): واذا كان في الخف خرق فان كان يسيرا لايمنع جواز المسح، وان كان كثيراً يمنع..... والحدالفاصل بين اليسيرو الكثير أن الخرق اذا كان قدر اصبع او اصبعين فهو يسير وان كان قدر ثلاث أصابع فهو كثير...... ثم على روايات الزيادات اعتبر ثلاث اصابع من اصغر اصابع الرجل وفي الهداية هو الصحيح.....(في صـ۲۷۲) ويجمع الخروق في خف واحد ولا يجمع في خفين.

وفي الشامية (۱/۲۶۹): (قوله أوجوربيه) الجورب لفافة الرجل..... (قوله ولو من غزل أوشعر) دخل فيه الجوخ كما حققه في شرح المنية وقال وخرج عنه ماكان من كرباس بالكسر وهو الثوب من القطن الأبيض ويلحق بالكرباس كل ما كان من نوع الخيط كالكتان والا بريسم ونحوهما وتوقف ح في وجه عدم جواز المسح عليه اذا وجد فيه الشروط الاربعة التي ذكر ها الشارح..... يدل عليه مافي كافي النسفي حيث علل عدم جواز المسح على الجورب من كرباس بأنه لايمكن تتابع المشي عليه فإنه يفيد انه لو أمكن جاز ويدل عليه أيضاً مافي ط عن الخانية ان كل ماكان في معنى الخف في ادمان المشي عليه وقطع السفر به ولو من لبد رومي يجوز المسح عليه (قوله على الثخينين) اى اللذين ليسا مجلدين ولامنعلين..... (قوله بنفسه) أى من غير شد (قوله ولايشف)بتشديد الفاء من شف الثوب رق.....(قوله الا ان ينفذ) أى من البلل.....(وفي صـ۲۷۰) واما الثخين فهوقولهما وعنه انه رجع اليه وعليها الفتوىٰ.

وفيه أيضا(صـ۲۷۳): (وتجمع الخروق)..... (قوله لافيهما) اى لو كان في كل واحد من الخفين خروق غير مانعة لكن اذا جمعتها تكون مثل القدر المانع لا تمنع ويصح المسح.

(۲۲۳۳) موزوں میں پانی چلے جانے سے مسح ٹوٹنے اور تھوڑی پھٹن سے مسح نہ ٹوٹنے میں فرق

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی موزے کے اندر پانی چلا جائے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہوتو اس سے مسح ٹوٹ جاتا ہے، اور علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ جن موزوں میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم یا دو انگلیوں کی مقدار کے برابر پھٹن ہوتو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا ہے، اور اسی طرح اگر کم مقدار میں موزہ پاؤں سے نکل جائے تو اس میں بھی مسح نہیں ٹوٹتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں صورتوں میں پانی داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت کی روشنی میں ان دونوں کے مابین فرق

اور تطبیق کو واضح فرمایئے، کہ موزے کے اندر پانی کے داخل ہونے سے مسح ٹوٹتا ہے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہو۔ اور موزے میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہو یا موزے کی کم مقدار پاؤں سے نکل جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا ہے۔ حالانکہ ان صورتوں میں بھی پانی داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے چاہے کم ہو یا زیادہ۔ لہٰذا واضح فرمایئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جو مسئلہ آپ نے ذکر کیا ہے کہ اگر کسی موزے کے اندر پانی چلا جائے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں تو اس سے مسح ٹوٹ جاتا ہے یہ بات آپ کی درست نہیں ہے کیونکہ اکثر فقہاء کرام نے اس بات کو صراحتاً ذکر فرمایا ہے کہ اگر موزے میں پانی تین انگلیوں کی مقدار یا اس سے کم مقدار میں چلا جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا۔ جیسا کہ اگر موزوں میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہو تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا اور اسی طرح اگر اکثر قدم سے کم موزہ پاؤں سے نکل جائے تو اس سے بھی مسح نہیں ٹوٹتا۔ پہلی دونوں صورتوں میں کم مقدار کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے البتہ تیسری صورت میں قدم کے اکثر حصے سے کم کا اعتبار کیا گیا ہے یعنی اگر موزہ پاؤں کے اکثر حصے سے کم مقدار میں نکلتا ہے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹے گا۔ اب اگر موزے میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہے یا موزہ پاؤں سے کم مقدار میں نکل گیا تو اس میں اگر پانی چلا جائے تو کم مقدار میں ہی جائے گا جو کہ ناقضِ مسح نہیں ہے۔ بلکہ بعض فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ جب تک اتنا پانی موزے میں نہ چلا جائے کہ اس سے ایک پاؤں کا اکثر حصہ تر نہ ہو جائے تب تک مسح نہیں ٹوٹتا۔ لہٰذا تین انگلیوں سے کم مقدار کی پھٹن اور کم مقدار میں موزے کا پاؤں سے نکلنے کی صورت میں اگرچہ پانی کے جانے کا امکان ہے لیکن وہ کم مقدار میں ہی جانے کا امکان ہے اور کم مقدار میں اگر پانی موزوں میں چلا جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹے گا۔

لمافی الشامية(۲۷۲/۱): فلو اصاب موضع المسح ماء او مطر قدر ثلاث اصابع جاز، وكذا لو مشى فى حشيش مبتل بالمطر وكذا بالطل فى الأصح.....

وفيه ايضاً(۲۷۳/۱): (قوله وهو قدر ثلاث اصابع) يعنى طولا وعرضا، بأن سقطت جلدة مقدار ثلاث اصابع وعرضها كذا فى حاشية يعقوب باشاعلى صدر الشريعة فليحفظ

(قوله اصابع القدم الاصاغر) صححه فى الهداية وغيرها واعتبر الاصاغر للاحتياط..... (قوله بكمالها) هو الصحيح خلافاً لما رجحه السرخسيؒ من المنع بظهور الانامل وحدها. شرح المنية. والانامل: رؤوس الاصابع، وهو صادق بما اذا كانت الاصابع تخرج منه بتمامها لكن لا يبلغ هو قدرها طولا وعرضا..... (قوله اعتبرا لثلاث) اى التى وقعت فى مقابلة الخرق لأن كل اصبع اصل فى موضعها فلا تعتبر بغيرها، حتى لو انكشف الابهام مع جارتها وهما قدر ثلاث اصابع من اصغرها يجوز المسح وان كان مع جارتيها لايجوز.

وفى الشامية(۲۷۶/۱): (وخروج اكثر قدميه) من الخف الشرعى..... (قوله وكذا اخراجه) تصريح بما فهم من الخروج بالاولىٰ، لانّ فى الاخراج خروجا مع زيادة وهى القصد (قوله فى الاصح)

صححه في الهداية وغيرها، وبه جزم في الكنز والمنتقى.

(۲۳۴) کیا عورتوں کیلئے موزوں پرمسح کرنا جائز ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مردوں کیلئے تو موزوں پر مسح کرنا جائز ہے لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے کچھ عزیز اسلام آباد اور مری میں رہتے ہیں جہاں ہمیں ابھی جانا ہے اور وہاں آج کل سخت سردی ہے، اگر میری اہلیہ موزے پہن لے تو اس کیلئے موزوں پر مسح جائز ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے لئے اسلام آباد اور مری کی سردی برداشت کرنا کافی مشکل ہے؟ آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری اس مشکل کو حل فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... جس طرح مردوں کیلئے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اسی طرح عورتوں کیلئے بھی جائز ہے، لہٰذا آپ کی اہلیہ موزوں پر مسح کرسکتی ہیں۔

لمافي الهندية (۳۶/۱): المرأة في المسح على الخفين بمنزلة الرجل لاستوائهما في المعنى المجوّز للمسح.

(۲۳۵) موزوں پر برائے تعلیم مسح کرنے سے مسح کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا، بوقت مسح علی الخفین اس کی نیت موزوں پر مسح کی تعلیم دینا مقصود تھی نا کہ طہارت حاصل کرنا، آیا اس طرح مسح علی الخفین درست ہوگیا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں جب وضو کیا اور موزوں پر مسح کرلیا اور نیت تعلیم کی تھی نا کہ طہارت کی تب بھی مسح درست ہوگیا۔

لمافي الهندية(۳۳/۱): فلو توضأ ومسح على الخفين ونوى التعليم دون الطهارة يصح الخ.

وفي الخلاصة الفتاویٰ(۲۸/۱): ولو توضأ ومسح على الخف ونوى به التعليم دون الطهارة يصح بناء على مسئلة النية في الوضوء اھ.

(۲۳۶) زخم کی پٹی پرمسح کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر جسم کا کوئی حصہ زخمی ہو جائے تو اس پر باندھی جانے والی پٹی عام طور پر زخم سے زائد ہوتی ہے، کیا اس ساری پٹی پر مسح کرنا صحیح ہے، یا پھر پٹی کھول کر زخمی حصہ پر مسح کرنا اور باقی حصہ کو دھونا ضروری ہے؟ نیز یہ مسح غسل کی ضرورت کے وقت بھی کافی ہوگا یا غسل میں پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پٹی زخم سے زائد ہو، اور زخم کا دھونا اور پٹی کا کھولنا زخم کیلئے نقصان دہ ہوتو اس صورت میں تمام پٹی پر مسح کرنا جائز ہے، اور اگر پٹی کا کھولنا اور زخم پر مسح کرنا زخم کیلئے نقصان دہ نہ ہوتو ایسی صورت میں پٹی پر مسح کافی نہ ہوگا بلکہ پٹی کھول کر زخم پر مسح کیا جائے گا اور ارد گرد کے حصے کو دھویا جائے گا۔ نیز مسح کے اعتبار سے وضو اور غسل میں کوئی فرق نہیں بلکہ ضرورت کے وقت دونوں صورتوں میں مسح کافی ہوگا۔

لمافی رد المحتار (۱/۲۸۰): اذا كانت زائدة على قدر الجراحة فان ضره الحل والغسل مسح الكل تبعاً والا فلا، بل يغسل ما حول الجراحة ويمسح عليها لا على الخرقة ما لم يضره مسحها فيمسح على الخرقةالتي عليها ويغسل حواليها وما تحت الخرقة الزائدة لان الثابت بالضرورة يتقدر بقدرها.

وفي الدرالمختار (۱/۲۸۱): والمحدث والجنب في المسح عليهاوعلى توابعها سواء.

وفي الشامية تحته: (عليها) اى الجبيرة، وعلى توابعها: كخرقة القرحة، وموضع الفصدوالكي.

(۲۳۷) کیا وضوء میں ٹوٹے ہوئے ہاتھ سے پٹی کھولنا ضروری ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے جراح نے اس کو مضبوط باندھ کر اس پر پٹی چڑھادی ہے تو آیا وضو کے وقت اس پٹی کو کھولنا ہوگا یا اوپر سے دھولینا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں وضو کے وقت نہ پٹی کو کھولا جائے اور نہ اوپر سے دھویا جائے بلکہ پٹی پر مسح کر لینا کافی ہے۔ اور پٹی کھولنے اور دھونے کی ضرورت نہیں۔

لمافي التاتارخانية(۱/۲۸۶): واذا انكسر عضو من اعضائه وهو محدث فشد عليه العصابة ثم توضأومسح على العصابة جاز.

وفي الدرالمختار (۱/۲۸۰): (ويجوز) أي يصح مسحها (ولوشدت بلاوضوء) وغسل دفعاً للحرج (ويترك) المسح كالغسل (إن ضروإلا لا).

فصل فی المسائل الجدیدة والمتفرقة المتعلقة بالطهارة

(طہارت سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

(۲۳۸) بیت الخلاء میں ایسی چیز لے جانا جس پر اللہ پاک کا اسم مبارک یا قرآن مجید لکھا ہو

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیت الخلاء میں ایسی چیز ساتھ لے جانا جس پر اللہ پاک کا اسم مبارک یا قرآن مجید لکھا ہو۔ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... بیت الخلاء جاتے وقت افضل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس پر اللہ تعالیٰ یا انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کا نام ہو، یا کوئی قرآنی آیت وغیرہ لکھی ہوئی ہو تو اس کو باہر رکھ کر اندر داخل ہو، تاہم اگر ایسی کوئی چیز کسی کپڑے وغیرہ میں چھپی ہوئی ہو تو اس کے اندر لے جانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر کوئی ایسی چیز جس پر اللہ تعالیٰ یا کسی نبی یا قرآنی آیت یا اور کوئی معظم نام جیسے احمد، عزیز وغیرہ لکھا ہو، اور وہ کسی کپڑے وغیرہ میں چھپی ہوئی نہ ہو بلکہ ظاہر ہو تو اس کا بیت الخلاء وغیرہ کے اندر لے جانا مکروہ ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۵۰): ویکره ان یدخل فی الخلاء ومعه خاتم علیه اسم الله تعالیٰ أو شیئ من القرآن.

وفی رد المحتار(۱/۳۴۵): (تتمه) إذا أراد أن یدخل الخلاء ینبغی أن یقوم قبل ان یغلبه الخارج ولا یصحبه شیئ علیه اسم معظم ولا حاسر الرأس.

(۲۳۹) قضائے حاجت کے وقت دعاء (تعوّذ) کا محل

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیت الخلاء میں جانے سے پہلے جو تعوذ پڑھا جاتا ہے کیا وہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے پڑھا جاتا ہے یا بیت الخلاء میں داخل ہونے کے بعد پڑھا جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... بیت الخلاء میں جاتے وقت جو دعا (تعوذ) پڑھی جاتی ہے وہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے پڑھنی چاہیے اگر صحراء یا کھلے میدان میں آبادی سے باہر قضائے حاجت کر رہا ہے تو ستر (شرمگاہ) کھولنے سے پہلے دعا پڑھے اور بھول جانے کی صورت میں صرف دل میں پڑھے زبان سے نہ کہے۔

وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص ۴۰): (قبل دخوله) الأولیٰ التفصیل وهو ان کان المکان معدًا لذلک یقول قبل الدخول وان کان غیر معد کالصحراء ففی أو ان الشروع کتشمیر

الثیاب مثلاً قبل کشف العورة وان نسی ذلک أتی به فی نفسه لا بلسانه.

(۲۴۰) وضو کے بعد انگلی اٹھا کر شہادت پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو کرنے والا جب وضو سے فارغ ہو جاتا ہے تو اپنی انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور پھر دعا کرتا ہے۔ کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....وضو سے فارغ ہو کر اس طرح اشارہ کرتے ہوئے دعا پڑھنے کا جواز ثابت ہے۔

لمافی المسلم(۱/۱۲۲): مامنکم من احد یتوضأ فیبلغ او فیسبغ الوضوء ثم یقول اشهد ان لا اله الا الله وان محمد اعبده ورسوله الافتحت له ابواب الجنة الثمانية يدخل من ایهاشاء.

وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص۱۲):ذکر العزنوی انه یشیر بسبابته حین النظر الی السماء.

(۲۴۱) استنجاء کے پانی کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب ہم لوگ استنجاء کرتے ہیں تو بعد میں استنجے والا پانی شلوار کو لگ جاتا ہے تو کیا اس سے شلوار ناپاک نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....استنجاء کا پانی شلوار پر لگ گیا۔ تو دیکھا جائے گا، اگر یہ پانی پہلی، دوسری یا تیسری مرتبہ کے دھونے کا ہو (نجاست کے پاک ہونے کا ہے) تو شلوار ناپاک ہوگی۔ اور اگر یہ پانی جو شلوار پر لگا ہے، چوتھی بار دھونے کا ہے، (یعنی پاکی کے بعد کا پانی لگا ہے) تو شلوار نجس نہ ہوگی۔

لمافی التاتارخانية(۱/۲۱۶): والمحدث اذا استنجی فاصاب الماء ذیله او کمه ان اصابه الماء الاول او الثانی او الثالث یتنجس بنجاسة غلیظة وان اصابه الماء الرابع یتنجس بنجاسة الماء المستعمل.

(۲۴۲) استنجاء کے وقت ضرورت سے زائد ستر کھولنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ ایک آدمی لوگوں کے مجمع کی وجہ سے پانی سے استنجاء چھوڑ دیتا ہے صرف ڈھیلہ اور کاغذ (ٹشو پیپر) پر اکتفاء کر لیتا ہے اور پھر وضو کر کے نماز پڑھ لیتا ہے۔ آیا اس کی نماز درست ہوگئی یا نہیں؟

(۲)۔ نیز ایک شخص اپنی شرم گاہ کو بوقت استنجاء بقدر ضرورت سے زائد مقدار کھولتا ہے تو آیا یہ گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص کی نماز درست ہوگئی۔

(۲)۔کسی عذر کی وجہ سے استنجاء کے وقت اپنی شرم گاہ کو ضرورت سے زائد کھولنے میں کوئی حرج نہیں۔البتہ بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

وفی الھندیة (۱/۴۸): یجوز الاستنجاء بنحو حجر منق کالمدر والتراب والعود والخرقة والجلد وما اشبھھا............ والاستنجاء بالماء أفضل إن أمکنه ذلک من غیر کشف العورة وان احتاج إلی کشف العورة یستنجي بالحجر ولا یستنجي بالماء کذا فی فتاوی قاضیخان.

وفیه ایضاً (۱/۵۰): ویکره ان یبول ..... او متجردا عن ثوبه من غیر عذر فان کان بعذر فلا باس به.

(۲۴۳) کشف عورۃ کا خطرہ ہو تو استنجاء بالماء افضل ہے یا استنجاء بالاحجار

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ استنجاء بالماء افضل ہے یا استنجاء بالحجر افضل ہے، نیز اگر کشف عورۃ کا خطرہ ہو، تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کشف عورۃ کا خطرہ نہ ہو تو استنجاء بالماء افضل ہے اور اگر کشف عورۃ کا خطرہ ہو تو استنجاء بالحجر کرنا چاہئے۔

لمافی الھندیة (۱/۴۸): والاستنجاء بالماء أفضل إن أمکنه ذلک من غیر کشف العورة وان احتاج إلی کشف العورة یستنجي بالحجر ولا یستنجي بالماء کذا فی فتاویٰ قاضیخان.

وفی الشامیة (۱/۳۳۸): ثم إعلم أن الجمع بین الماء والحجر افضل ویلیه فی الفضل الاقتصار علی الماء اھ.

(۲۴۴) رکعت چھوٹنے کا امکان ہو تو وضو میں مسواک کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص وضو شروع کرے اسی وقت جماعت کھڑی ہوجائے تو اب وہ مسواک کرے یا مسواک کو چھوڑ کر نماز میں داخل ہوجائے اگر تکبیر اولیٰ چھوٹ جانے کا خطرہ ہو یا نماز کی ایک یا دو رکعت چھوٹ جانے کا خوف ہو۔مسئلہ ہذا کی مکمل وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......وضو میں مسواک کرنا سنت ہے اور اس کے استعمال سے نماز کے ثواب میں زیادتی ہوتی ہے اور تکبیر اولیٰ اور رکعت کا حصول اولیٰ یا مستحب ہے اور دونوں میں فی نفسہ فضیلت موجود ہے اور جب دو فضیلتوں کا حصول ممکن ہو تو اس میں جو راجح ہو وہ مقدم ہوگا۔لہٰذا صورت مسئولہ میں مسواک کو ادا کرے گا اگرچہ تکبیر اولیٰ یا رکعت نکل جائے کیونکہ رکعت کے نکلنے سے جماعت کی فضیلت سے محروم نہیں ہوتا کیونکہ وہ قعدہ اخیرہ کے ملنے سے بھی حاصل ہوجاتی ہے اور تکبیر اولیٰ کے ترک سے سنت کا ترک ہونا لازم نہیں آتا۔

البتہ مسواک کے ترک سے مسواک کا ثواب نہیں ملتا اور سنت کا ترک ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے فعل مسواک کو حصول تکبیر اولی اور رکعت پر مقدم کیا جائے گا البتہ کوشش یہ کرنا چاہئے کہ مسواک کے ساتھ وضوذرا پہلے کرلیا جائے اور مسواک کرنے میں زیادہ دیر نہ لگائی جائے تاکہ دونوں فضیلتوں کا پانے والا ہوجائے۔

لمافی جامع الترمذی(۵٦/۱): عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ من صلی لله اربعین یوما فی جماعة یدرک التکبیرة الاولی کتب له براء تان براء ة من النار وبراء ة من النفاق.

وفی اعلاء السنن(۴۴/۱، ۴۵، ۴٦): عن ابی هریرة رضی الله عنه عن رسول الله ﷺ انه قال "لولا ان اشق علی امتی لامرتهم بالسواک مع کل وضوء" اخرجه مالک واحمد والنسائی وصححه ابن خزیمة وذکره البخاری تعلیقاً.

قوله عن ابی هریرة الخ، قال المؤلف: دلالته علی تاکید السواک ظاهرة. نعم :لا یدل علی السنة الاصطلاحیة، لانه لیس فیه لفظ دال علی مواظبته ﷺ علی السواک والحدیث الذی بعده صریح فیه فان فیه لفظ"کان" الدال علی المواظبة فصح قول صاحب الهدایة (ص٦،۵) وسنن الطهارة۔ الی ان قال۔ والسواک، لانه علیه السلام کان یواظب علیه.

وفی الطحطاوی علی الدر (۳۰۰/۱): (قوله وقیل فی التشهد) قال فی الشرنبلالیة الذی تحرر عندی انه یاتی بالسنة اذا کان یدرکه ولو فی التشهد باتفاق بین محمد وشیخیه ولا یتقید بادراک رکعة وتفریع الخلاف هنا علی خلافهم فی مدرک تشهد الجمعة غیر ظاهر لان المدارهنا علی ادراک فضل الجماعة وهو یحصل بادراک التشهد بالاتفاق کما نص علیه الکمال فماظنه بعضهم من انه لم یحرز فضلها عند محمد......غیر ظاهر الخ.

وفی الشامیة(۱٦۸/۲):(قوله واستیاکه) لانه مندوب الیه فی سائر الصلوات اختیار ومفاده ان المراد به الاستیاک عند القیام الی الصلاة فانه مستحب...... واما السواک فی الوضوء فانه سنة مؤکدة...... الخ.

(۲۴۵) وضومیں واجبات کے نہ ہونے کی وجہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں "آسان نماز" کتاب دیکھ رہا تھا اس میں نماز کے واجبات تو لکھے ہیں لیکن وضو کے واجبات ذکر نہیں کیے گئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ نیز اگر وضو میں واجبات ہیں تو کتنے ہیں اور کیا کیا ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......وضو کے اندر واجبات نہیں ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وضو عبادت مقصودہ نہیں ہے اگر اس میں بھی واجبات

ہوتے تو پھر تابع اصل کے مساوی ہوجاتا جو کہ نماز ہے۔ نیز کسی چیز کے ثبوت یا وجود پر حکم اس کی دلیل کے اعتبار سے ہوتا ہے اور جو دلیل واجب کو ثابت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ظنی الثبوت وقطعی الدلالۃ ہو، یا اس کے مرتبے اور قوت میں ہو جیسے وہ اخبار احاد جن کے مفہوم قطعی الدلالۃ ہوں۔ اب وضو کے احکامات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو کہ ظنی الثبوت وقطعی الدلالۃ ہو اس لئے وضو میں واجبات نہیں پائے جاتے۔

لمافی حلبی کبیر (ص۱۴): ولیس للغسل ولا للوضوء واجب فلذالم یذکرہ قیل لانہ لوکان لساوی التبع الاصل ای الوضوء او الغسل الصلوۃ واعترض علیہ بعدم لزوم المساواۃ لثبوت التفاوت بوجہ آخر وھو انہ لایلزم بالنذر بخلاف الصلاۃ.

لمافی البحر الرائق (۱/۳۴): ان الوضوء لاواجب فیہ لما ان ثبوت الحکم بقدر دلیلہ والدلیل المثبت وھو ماکان ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ وما کان بمنزلتہ کأخبار الأحاد التی مفھومھا قطعی الدلالۃ ولم یوجد فی الوضوء.

(۲۴۶) الفَرَق کی موجودہ پیمانوں کے اعتبار سے تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست نے کسی کتاب میں الفَـرَق کا لفظ پڑھا اس نے تحقیق کی تو معلوم نہ کرسکا تنگ آ کر میرے پاس آیا میں بھی اس کو موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے مطمئن نہ کرسکا اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں کہ الفرق موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے یہ کتنا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... الفَرَق را کے فتح کے ساتھ اور الفَرْق را کے سکون کے ساتھ دو الگ الگ پیمانوں کے نام ہیں۔ الفرق را کے فتح کے ساتھ قدیم پیمانوں کے حساب سے اس میں ۱۶ رطل آتے ہیں اور رطل میں ۱۳۰ درہم آتے ہیں اور فی درہم ۳٫۰۶۱۸ گرام کا ہوتا ہے تو اب رطل کا وزن ۱۳۰ درہم کو جب ۳٫۰۶۱۸ گرام سے ضرب دیا گیا تو ۳۹۸٫۰۳۴ گرام جواب آیا پھر ۱۶ رطل کا وزن معلوم کرنے کیلئے ۱۶ کو ۳۹۸٫۰۳۴ سے ضرب دی گئی تو ۶۳۶۸٫۵۴۴ گرام جواب آیا۔ جو ۶ کلوگرام، ۳۶۸ گرام اور ۵۴۴ ملی گرام بنتے ہیں۔

الفرق را کے سکون کے ساتھ قدیم پیمانوں کے اعتبار سے اس میں ۱۲۰ رطل آتے ہیں۔ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق ۱۲۰ کو ۳۹۸٫۰۳۴ سے ضرب دی گئی تو ۴۷۷۶۴٫۰۸ گرام جواب آیا۔ جس کا ایک من ۷ کلوگرام، ۷۶۴ گرام اور ۰۸۰ ملی گرام بنتے ہیں۔ لہٰذا الفرق را کے سکون کے ساتھ جدید پیمانوں کے مطابق ایک من ۷ کلوگرام، ۷۶۴ گرام اور ۰۸۰ ملی گرام بنتا ہے۔

لمافی الصحیح المسلم (۱/۱۴۸): عن عائشۃ قالت کان رسول اللہ ﷺ یغتسل فی القدح وھو الفرق وکنت اغتسل انا وھو فی الاناء الواحد وفی حدیث سفیان من اناء واحد قال قتیبۃ قال سفیان والفرق ثلاثۃ اصع.

[illegible] (۱/۲۶۵): اعلم ان الصاع اربعۃ امداد والمد رطلان والرطل نصف من والمن

بالدراهم مائتان وستون درهما...... ثم اعلم ان الدرهم الشرعي اربعة عشر قيراطا والمتعارف الآن ستة عشر فاذا كان الصاع الفا واربعين درهما شرعيا يكون بالدراهم المتعارف تسعمائة وعشرة

وفي مجمع بحار الانوار (۴/۱۳۱): (فرق) فيه: كان يغتسل من الفرق، هو بالحركة مكيال يسع ستة عشر رطلا وهو اثنا عشر مدا وثلاثة اصع في الحجاز، وقيل: الفرق خمسة اقساط، والقسط نصف صاع وهو بالسكون: مائة وعشرون رطلا.

(۲۴۷) جس ''فرق'' سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرمایا کرتے تھے اس کی تعیین

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے بارے میں روایت مختلف ہیں۔ بعض میں ہے کہ آپ علیہ السلام صاع سے جو کچھ اوپر تین کلوگرام بنتا ہے غسل فرمایا کرتے تھے اور بعض میں ہے کہ فرق سے غسل فرمایا کرتے تھے پھر فرق کے بارے میں کتابوں میں یہ ملتا ہے کہ فرق ۱۶ رطل کا ہوتا ہے اور یہ بھی ملتا ہے کہ ۱۲۰ رطل کا ہوتا ہے۔ ۱۶ رطل کے اعتبار سے کچھ اوپر ۶ کلوگرام اور ۱۲۰ رطل کے اعتبار سے کچھ اوپر ۴۷ کلوگرام بنتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے تو بہت بڑا تفاوت پیدا ہو جاتا ہے اس مسئلہ کا کیا حل ہے فرق سے مراد (جس سے آپ علیہ السلام غسل فرماتے تھے) ۱۶ رطل والا ہے یا ۱۲۰ رطل والا؟ مہربانی فرما کر تفصیلی ومدلل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرق کی دو قسمیں ہیں، ایک فرق بفتح الراء اور دوسرا بسکون الراء۔ اول بفتح الراء ۱۶ رطل اور دوسرا بسکون الراء ایک سو بیس رطل کا ہوتا ہے لیکن جس فرق سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرماتے تھے وہ محدثین عظام وفقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق فرق بفتح الراء ۳ صاع جو ۱۶ رطل کا ہوتا تھا اور اسی پر علامہ ابو عبیدؒ نے اتفاق نقل فرمایا ہے پھر چونکہ جمہور علماء کے نزدیک ایک صاع پانچ رطل اور ثلث رطل اور احنافؒ کے نزدیک ایک صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے اس لئے جمہور کے نزدیک ایک فرق تین صاع کے برابر ہوا اور احنافؒ کے نزدیک ایک فرق ۲ صاع کے برابر ہوا، لہٰذا اس اعتبار سے اس کے مفہوم اور اس حدیث کے مفہوم جس میں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع سے غسل فرمایا کرتے تھے کوئی تضاد نہیں کیونکہ ایک صاع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صاع سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرمایا کرتی تھیں۔

اسی طرح امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں صرف ''فرق'' کا ذکر ہے پانی کی مقدار مذکور نہیں کہ وہ بھرا ہوا ہوتا تھا یا کم لہٰذا ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ بھرا ہوا ہوتا ہو تو تین صاع پانی ہوتا ہو، اور جب کم ہوتا ہو تو ۲ صاع پانی ہوتا ہو، اور اس دوسری صورت میں ایک صاع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صاع سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرمایا کرتی ہوں لہٰذا یہ مفہوم اس حدیث کے مفہوم کے موافق ہے جس میں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع سے غسل فرماتے تھے۔

نیز جس فَرق کو فقہاء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ وہ ۳ صاع جو کہ ۱۶ رطل کے برابر ہوتا تھا اس فرق سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا عرب میں پانی کی قلت کی وجہ سے عام حالات میں غسل فرمایا کرتے تھے البتہ فرق بسکون الراء جو ۱۲۰ رطل کا ہوتا ہے اور جس کی مقدار ایک بڑے ٹب کے برابر ہوتی ہے اس سے بھی کبھی پانی کی وافر مقدار موجود ہونے کی صورت میں غسل فرماتے ہوں تو کوئی بعید نہیں کیونکہ ایک صاع پانی کی مقدار کی کوئی تحدید نہیں لہٰذا اسراف سے بچتے ہوئے جتنے پانی سے بھی غسل کیا جائے جائز ہے۔

لمافی أبی داؤد(۱/۳۱): قال ابو داؤد وروی ابن عیینه نحو حدیث مالک قال ابو داؤد سمعت احمد بن حنبل یقول الفرق ستة عشر رطلاً.

وفی بذل المجهود(۱/۱۴۲): قال الطحاوی قالوا فلما ثبت بهذا الحدیث الذی روی عن عائشة أن رسول الله ﷺ کان یغتسل هو وهی من الفرق والفرق ثلثة اصع کأنّ مایغتسل به کل واحد منهما صاعاً ونصفاً فإذا کان ذلک ثمانیة ارطال کان الصاع ثلثیها وهو خمسة ارطال وثلث رطل وهذا قول اهل المدینة ثم اجاب الطحاوی عن هذا الاستدلال بأن حدیث عروة عن عائشة انما فیه ذکر الفرق الذی کان یغتسل منه رسول الله ﷺ وهی لم تذکر مقدار الماء الذی یکون فیه هل هو مملؤه أو اقل من ذلک فقد یجوز أن یکون یغتسل هو وهی بملئه ویجوز أن یکون کان یغتسل هو وهی بأقل من ملئه مما هو صاعان فیکون کل واحد منهما مغتسلاً بصاع من ماء ویکون معنی هذا الحدیث موافقاً لمعنی الاحادیث التی رویت عن رسول الله ﷺ أنه کان یغتسل بصاع.

وفی مجمع بحار الانوار(۴/۱۳۱): (فرق) فیه: کان یغتسل من الفرق، هو بالحرکة مکیال یسع ستة عشر رطلاً وهو اثنا عشر مداً وثلاثة اصع فی الحجاز...... وهو بالسکون: مائة وعشرون رطلاً.

(۲۴۸) ''مکوک'' کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتابوں میں ایک لفظ آتا ہے اس کی صحیح مقدار بتادیں وہ لفظ مکوک ہے چونکہ موجودہ دور میں اس نام کا کوئی پیمانہ نہیں ہے تو موجودہ پیمانوں کلو، تولے اور گرام وغیرہ کے لحاظ سے ایک مکوک میں کتنے کلو، کتنے گرام اور کتنے تولے آئیں گے؟ لمافی السنن للنسائی(ص۱۱): انس بن مالک یقول کان رسول الله ﷺ یتوضا بمکوک ویغتسل بخمسة مکاکی.

الجواب حامداً ومصلیاً...... چونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک مکوک سے وضو فرماتے تھے۔ اور یہ بات بھی مصرح ہے کہ مکوک سے مراد مد ہے۔ جبکہ ایک مد دو رطل کا ہوتا ہے۔ اور ایک رطل ۱۳۰ درہم کا ہوتا ہے۔ اور ایک درہم ۱۴ قیراط کا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک مکوک میں ۸۱۸،۹۶۶ گرام، ۸۱۹ ماشے اور ۶۸،۲۵ تولے ہوتے ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

گرام کی تفصیل ۵ جو = ۲۱۲ء۷ ملی گرام.... قیراط = ۱ء۰۸ رتی

درہم=۱۴ قیراط لہٰذا ۱۴ x ٫۲۱۸۷ = ۳٫۰۶۱۸

درہم=۳٫۰۶۱۸ گرام لہٰذا ۲۶۰ درہم= ۳٫۰۶۱۸x۲۶۰=۷۹۶٫۰۶۸

مکوک=۷۹۶٫۰۶۸ گرام

تولے و ماشے کی تفصیل......

ایک قیراط=۱٫۸ رتی= ۱٫۸x۱۴=۲۵٫۲

ایک درہم میں رتی= ۲۵٫۲ = ۳٫۱۵ = ۲۵٫۲÷۸

ایک درہم میں ماشہ=۳٫۱۵ ۳٫۱۵x۲۶۰=۸۱۹

ایک مکوک میں ماشے=۸۱۹ ۸۱۹÷۱۲=۶۸٫۲۵

ایک مکوک میں تولے=۶۸٫۲۵

لما في معارف السنن المكتبة البنورية (۱/۲۰۲): اختلف الائمة في مقدار مايسعه المد والصاع: فذهب ابو حنيفة ومحمد وكذا ابو يوسف في قوله القديم المرجوع عنه: إلى ان المدمايسعه الرطلان والصاع: ثمانية ارطال وهو مذهب فقهاء العراق. وذهب مالك والشافعي واحمد وابو يوسف وفقهاء الحجاز: الى ان المد رطل وثلثه، والصاع: خمسة ارطال وثلث رطل بعد اتفاقهم جميعا على ان الصاع اربعة امداد وقال الفيروز آبادی فی القاموس: المد مكيال وهو رطلان او رطل وثلث او ملؤ كفي الانسان المعتدل إذا ملا هما ومد يده بهما وبه سمى مداً اهـ.

وفي فتح القدير (۲/۲۹۷): ولنا ماروى انه عليه الصلوة والسلام كان يتوضأ بالمدرطلين ويغتسل بالصاع ثمانية ارطال هكذا وقع مفسرا عن انس وعائشة في ثلاثة طرق.

وفي الشامية (۱/۱۵۸): (قوله وهو ثمانية ارطال) اى بالبغدادى وهى صاع عراقى وهو اربعة امداد كل مد رطلان وبه اخذ ابو حنيفة. والصاع الحجازى خمسة ارطال وثلث، وبه اخذ الصاحبان والائمة الثلاثة فالمد حينئذ رطل وثلث والرطل مائة وثلاثون درهما وقيل مائة وثمانية وعشرون درهما واربعة اسباع درهم وتمامه فى الحلية.

قلت والصاع العراقى نحو نصف مد دمشقى فاذا توضأ واغتسل به فقد حصل السنة.

(۲۴۹) ''الباع'' کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ میرے مطالعہ میں ''الباع'' کا لفظ آیا جس کی موجودہ دور کے پیمانوں کے لحاظ سے کچھ تطبیق بھی دی تھی لیکن وہ میرے سے کہیں گم ہوگئی آپ حضرات میری رہنمائی فرمائیں کہ الباع

کس پیمانے کا نام ہے؟ اس میں کتنے میٹر اور کتنے سینٹی میٹر آئیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایک باع میں چار ذراع ہوتے ہیں اور ایک ذراع میں ۱۸/ انچ ہوتے ہیں اور ایک انچ میں ۵ء۲ سینٹی میٹر ہوتے ہیں لہٰذا ۱۸/ انچ میں ۴۵ سینٹی میٹر ہوئے، لہٰذا ایک باع میں ۱۸۰/ سینٹی میٹر ہوئے اور چونکہ ایک میٹر میں تقریباً ۹۷ء۵ سینٹی میٹر ہوتے ہیں لہٰذا ایک باع میں ۸۴ء۱ میٹر ہوئے۔

لما في فتح القدير (۱/۱۲۳): إن البريد من الفراسخ أربع　ولفرسخ فثلاث أميال ضعوا

والميل ألف اى من الباعات قل　والباع أربع أذرع فتبعوا

ثم الذراع من الاصابع أربع　من بعدها عشرون ثم الاصبع

ست شعيرات فظهر شعيرة　منها الى بطن لاخرى توضع

ثم الشعيرة ست شعرات فقل　من شعر بغل ليس فيها مدفع

وفي الهندية (۱/۱۸): والمعتبر ذراع الكرباس كذا في الظهيرية وعليه الفتوى كذا في الهداية وهو ذراع العامة ست قبضات أربع وعشرون اصبعاً.

وفي الشامية (۱/۱۹۶): (قوله والمختار ذراع الكرباس) وفي الهداية أن عليه الفتوى واختاره في الدرر والظهيرية والخلاصة والخزانة...... (قوله وهو سبع قبضات فقط) اى بلا أصبع قائمة وهذا ما في الولوالجية وفي البحر أن في كثير من الكتب انه ست قبضات ليس فوق كل قبضة أصبع قائمة فهو اربع وعشرون أصبعاً بعدد حروف "لا اله الا الله محمد رسول الله" ...... والمراد بالقبضة أربع أصابع مضمومة...... أقول وهو قريب من ذراع اليد لانه ست قبضات وشي وذالك شبران.

(۲۵۰) گرام اور تولے کے اعتبار سے مُد کا وزن

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد سے وضو فرماتے تھے آجکل مدتو مفقود ہو چکے ہیں تو موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے مد میں کتنے کلو کتنے گرام اور کتنے تولے وغیرہ ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مد کی مقدار موجودہ پیمانے کے لحاظ سے ۷۹۶ء۰۶۸ گرام ہے اور تولہ کے حساب سے ۶۸ء۲۵ تولہ ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(گرام)

ایک مد...... دو رطل

ایک رطل...... ۱۳۰ درہم

ایک درہم...... ۱۴ قیراط

ایک قیراط...... ۵ جو (۲۱۸۷ء۰ ملی گرام)

(ایک درہم) چودہ قیراط...... ۳ء۰۶۱۸ گرام

۲۶۰ درہم x ۳ء۰۶۱۸ = ۷۹۶ء۰۶۸ گرام۔ ایک مد کا وزن

(تولہ)

ایک درہم...... چودہ قیراط

ایک قیراط...... ۱ء۸ رتی

۱ء۸ رتی x ۱۴ قیراط = ۲۵ء۲ رتی

۲۵ء۲ x ۲۶۰ (درہم) = ۶۵۵۲ رتی (ایک مد)

ایک ماشہ...... ۸ رتی

(رتی) ۶۵۵۲ ÷ ۸ = ۸۱۹ (ماشہ)

ایک تولہ......۱۲ ماشہ

(ماشہ) ۸۱۹ ÷ ۱۲ = ۶۸ء۲۵ تولہ ایک مد میں

ایک مد	۲ رطل	۸۱۹ ماشہ	۶۵۵۲ رتی	۶۸ء۲۵ تولہ	۷۹۶ء۰۶۸ گرام

لمافی فتح الملہم (۳/۱۵۴): انّ المدّین الحجازی والعراقی. وکذا الصاعین کانا مستعملین فی عہد النبی ﷺ الا ان الشائع الغالب فی الاستعمال فی عہدہ ﷺ کان العراقی من الامداد وہو رطلان.

وفی عمدۃ القاری (۳/۹۴): والمدّ اختلفوا فیہ ...... وقیل ہو رطلان وبہ یقول ابو حنیفۃ وفقہاء العراق.

وفی الشامیۃ (۲/۳۶۵): اعلم ان الصاع اربعۃ امداد و المدّ رطلان والرطل نصف من والمنّ بالدراہم مائتان وستون درہماً وبالاستار اربعون والاستار بکسر الہمزۃ بالدراہم ستۃ ونصف بالمثاقیل قیل اربعۃ ونصف ...... فالمد والمنّ سواء کلّ منہما ربع صاع مائۃ و ثلاثون درہماً وفی الزیلعی والفتح اختلف فی الصاع فقال الطرفان ثمانیۃ ارطال بالعراقی وقال الثانی خمسۃ ارطال وثلث قیل لاخلاف لانّ الثانی قدرہ برطل المدینۃ لانہ ثلاثون استاراً والعراقی عشرون واذا قابلت ثمانیۃ بالعراقی بخمسۃ وثلث بالمدینی وجدتہما سواء وہذا ہو الاشبہ......

ثم اعلم ان الدرہم الشرعی اربعۃ عشر قیراطاً.

(۲۵۱) ''مرکن'' جو کہ غسل کا برتن ہے یہ کیسا اور کتنا بڑا تھا؟

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام اکٹھے ایک مرکن سے غسل فرماتے تھے۔ پوچھنا یہ ہے کہ مرکن کسے کہتے ہیں؟ نیز موجودہ دور میں اس کا اطلاق کس برتن و پیمانے پر ہوتا ہے اور اس کی کتنی مقدار ہے؟ یعنی اس میں کتنی مقدار پانی سما جاتا ہے۔ جواب مع حوالہ جات تحریر فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱)۔المعجم الوسیط (صفحہ ۳۷۱) پر اور دیگر شروحات حدیث کی کتابوں میں ''مرکن'' کے معنی یوں لکھے ہیں ''المرکن: وعاء تغسل فیھا الثیاب'' یعنی ''مرکن'' وہ برتن ہے جس میں کپڑے وغیرہ دھوئے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں اس کا اطلاق فارسی زبان میں ''لگن'' جبکہ اردو زبان میں ''ٹب'' پر ہوتا ہے۔

(۲)۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اکیلے غسل فرماتے تھے تو عام عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ ایک صاع (یعنی 3.184272 کلوگرام) کی مقدار کے برتن سے غسل فرماتے تھے، اور جب کسی زوجۂ محترمہ کے ساتھ اکٹھے غسل فرماتے تھے تو ایک ''فرق'' یعنی تین صاع (9.52816 کلوگرام) کی مقدار کے برتن سے غسل فرماتے تھے۔

جن احادیث طیبہ میں ''مرکن'' (ٹب) یا ''اناء واحد'' (ایک برتن) سے کسی زوجۂ محترمہ کے ساتھ اکٹھے غسل فرمانا آیا ہے تو ان دونوں برتنوں کی مقدار معلوم اور متعین نہیں ہے۔ اب یہ ''مرکن'' یا تو ''فرق'' کے برابر تھا یا ''فرق'' سے بڑا تھا، بظاہر بڑا ہی معلوم ہوتا ہے، اب بڑا ہونے کی صورت میں یہ لازم نہیں آرہا کہ پانی سے بھی بھرا ہوا ہو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ پانی ''فرق'' ہی کی مقدار ہوتا ہوگا بوجہ عام عادتِ مبارکہ اور مدینہ طیبہ میں عموماً پانی کی قلت کے، ہاں اگر پانی وافر مقدار میں کبھی دستیاب ہوتا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ ''مرکن'' پانی سے بھی بھرا ہوا دیتا ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وافر مقدار پانی سے غسل فرمایا کرتے ہوں گے۔ اور یہی تفصیل ''اناء واحد'' میں بھی ہے۔

لمافی صحیح البخاری (۱۰۹۰/۲): ان عائشة قالت: قد کان یوضع لی ولرسول اللہ ﷺ ھذا المرکن فنشرع فیه جمیعاً.

وفی المعجم الوسیط (ص ۳۷۱): المرکن: وعاء تغسل فیه الثیاب (ج) مراکن.

وفی فتح الملھم (۱۸۱/۳): قوله "فی مرکن" الخ: ھو الاجانة التی تغسل فیھا الثیاب أی "لگن".

وفی الدیباج علی صحیح مسلم للسیوطی (۳۰۲/۱): مرکن: بکسر المیم وفتح الکاف، الاجانة التی یغسل فیھا الثیاب.

وفی صحیح البخاری (۳۹/۱): عن عائشة قالت کنت اغتسل أنا والنبی ﷺ من اناء واحد من قدح یقال له الفرق

......سمعت اباسلمة يقول: دخلت أنا واخو عائشة على عائشة فسألها إخوها عن غسل رسول الله ﷺ فدعت بانآء نحو من صاع فاغتسلت وافاضت على رأسها وبيننا وبينها حجاب...... عن شعبة قدر صاع.

وفي فتح الباري (۲۹۲/۱): وادعى بعض الشارحين ان حديث ميمونة هذا لا مناسبة له بالترجمة لانه لم يذكر فيه قدر الاناء والجواب ان ذالک يستفاد من مقدمة اخرى وهي أن اوانيهم كانت صغاراً...... فيدخل هذا الحديث تحت قوله ونحوه اى نحو الصاع. او يحمل المطلق فيه على المقيد في حديث عائشة وهو الفرق لكون كل منهما زوجة له.

وفي فيض الباري(۳۴۸/۱): قوله: "الفرق" اناء يسع ثلاثة اصع فان كان ملأن يصير لكل منهما صاع ونصف والمعروف في عادته في الغسل صاع وقد مرّ انه لا تحديد فيه والامر تقريبي. وان كان خالياً فالامر تحقيقي...... فانه لا يلزم بكون الفرق هذا القدر ان يكون الماء فيه ايضاً كذالک فيمكن أن يكون الماء على قدر عادته.

کتاب الصلوٰۃ

(نماز کا بیان)

فصل فی المواقیت

(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱) تہجد اور ظہر کا وقت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ ظہر کی نماز سردیوں میں جلدی اور گرمیوں میں تاخیر سے پڑھنی چاہئے جبکہ آجکل یہاں کراچی میں یہ معمول ہے کہ ظہر کی نماز ڈیڑھ یا پونے دو بجے پڑھی جاتی ہے کیا اسطرح کرنا درست ہے؟ نیز تہجد کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ظہر کی نماز کا وقت سورج ڈھلنے سے لے کر ہر چیز کے سایہ اصلی کے علاوہ جب اسکا سایہ دگنا ہو جائے اسوقت تک باقی رہتا ہے یہی احناف کا مشہور اور معمول بہا مذہب ہے۔ اس اعتبار سے اس وقت میں جو بھی نماز ادا کر لے نماز ادا ہو جائیگی اگرچہ مستحب یہ ہے کہ سردیوں میں جلدی اور گرمیوں میں تاخیر سے ادا کی جائے لیکن اگر ایک متعین وقت میں پڑھنے کی وجہ سے جماعت میں زیادہ افراد کی شرکت کا گمان ہو تو ایک وقت میں پڑھنا بھی بہتر ہے۔

نیز تہجد کا وقت عشاء کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے البتہ افضل وقت آخری حصہ میں سو کر اٹھنے کے بعد کا ہے۔

لمافی الشامیة (۱/۳۵۹): (قوله وعليه عمل الناس اليوم) أی فی كثير من البلاد والاحسن مافی السراج عن شيخ الاسلام ان الاحتياط ان لايؤخر الظهر الی المثل وان لايصلی العصر حتی يبلغ المثلين ليكون مؤديا للصلاتين فی وقتهما بالاجماع.

(۲) قرآن پاک سے پانچ وقت کی نمازوں کا ثبوت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن پاک سے پانچ وقت کی نمازوں کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟ میرا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ کوئی ثبوت نہیں ہے صرف احادیث میں ذکر ملتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو پانچوں نمازوں کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ قرآن کریم میں نمازوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یہ ان کی قرآن کریم سے لاعلمی ہے۔ جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(البقرہ: ۴۳): اقیموا الصلاة. (الآیة) (ترجمہ) ''اور قائم کرو نماز کو'' (تفسیر طبری ۲:۷۷)

(النساء:۱۰۳): ان الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتاً.

(ترجمہ)''یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔''

مذکورہ دونوں آیات کریمہ پانچوں نمازوں کے ثبوت پر اجمالاً دلالت کرتی ہیں۔(طبری ۱:۱۶۹)

(الروم:۱۷): فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون.

(ترجمہ)''سو تم اللہ کی تسبیح کیا کرو شام کے وقت اور صبح کے وقت۔''

مذکورہ آیت کریمہ فسبحان اللہ حین تمسون سے مغرب کی نماز اور وحین تصبحون سے فجر کی نماز ثابت ہوتی ہے۔(تفسیر طبری ۲:۱۷۹)

(الروم: ۱۸): ولہ الحمد فی السموات والارض وعشیا وحین تظھرون.

(ترجمہ)''تمام آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے اور بعد زوال اور ظہر کے وقت''۔ مذکورہ آیت کریمہ میں وعشیا سے عصر کی نماز وحین تظھرون سے ظہر کی نماز ثابت ہوتی ہے۔(تفسیر طبری ۲:۱۷۹)

(الاسراء:۷۸): اقم الصلاۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل وقرآن الفجر

(ترجمہ)''آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک نمازیں ادا کیا کیجئے اور صبح کی نماز بھی۔

مذکورہ آیت کریمہ پانچوں نمازوں کے ثبوت پر تفصیلاً دلالت کرتی ہے۔

لمافی البدائع الصنائع(۱/۳۵۵): أما فرضیتھا فثابتۃ بالکتاب، والسنۃ، والاجماع، والمعقول، أما الکتاب فقولہ تعالیٰ فی غیر موضع من القرآن ''اقیموا الصلاۃ'' وقولہ ''ان الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتا..........'' وقولہ تعالیٰ ''حافظو علی الصلوات والصلاۃ الوسطی''.

ومطلق اسم الصلاۃ: ینصرف الی الصلوات المعھودۃ وھی التی تؤدی فی کل یوم و لیلۃ (وقولہ تعالیٰ اقم الصلوۃ طرفی النھار الایۃ یجمع الصلوات الخمس لان صلاۃ الفجر تؤدی فی احد طرفی النھار، وصلاۃ الظھر والعصر یؤدیان فی الطرف الآخر، اذالنھار قسمان، غداۃ وعشی والغداء اسم لاول النھار الی وقت الزوال، وما بعدہ العشی، حتی إن حلف لایأکل العشی فاکل بعد الزوال یحنث، فدخل فی طرفی النھار ثلاث صلوات ودخل فی قولہ وزلفا من اللیل المغرب والعشاء لانھا یؤدیان فی زلف من اللیل وھی ساعتہ.

وفیہ ایضاً(ص۳۵۶) وقولہ تعالیٰ ''اقم الصلاۃ لدلوک الشمس..........'' قیل دلوک الشمس زوالھا، '' غسق اللیل'' اوّل ظلمتہ فیدخل فیہ صلاۃ الظھر والعصر وقولہ تعالیٰ وقرآن الفجر وھو صلاۃ الفجر، فثبتت فرضیۃ ثلاث صلوات بھذہ الایۃ وفرضیۃ صلاۃ المغرب والعشاء ثبتت بدلیل

اخر ...... روی عن ابن عباسؓ انه قال حين تمسون المغرب والعشاء وحين تصبحون الفجر وعشيا العصر، وحين تظهرون الظهر، ذكر التسبيح واراد به الصلاة اى صلوا لله: إما لان التسبيح من لوازم الصلاة: اولانه تنزيه: والصلاة من اولها الى اخرها تنزيه الرب عزوجل لما فيها من اظهار الحاجات اليه، واظهار العجز والضعف وفيه وصف له بالجلال والعظمة والرفعة والتعالى عن الحاجة ......قوله تعالىٰ وسبح بحمد ربك الخ قيل فى تأويل قوله تعالىٰ فسبح اى فصل قبل طلوع الشمس هو صلاة الصبح، وقبل غروبها هو صلاة الظهر والعصر، ومن اناء الليل صلاة المغرب والعشاء، قوله واطراف النهار على التكرار والاعادة تاكيداً كما فى قوله تعالىٰ حافظوا على الصلوات والصلاة الوسطى الأيه ان ذكر الصلاة الوسطى على التاكيد لدخولها تحت اسم الصلوات كذا ههنا.

وقوله تعالىٰ فى بيوت اذن الله الخ قيل الذكر التسبيح ههناهما الصلاة وقيل الذكر سائر الاذكار والتسبيح الصلاة، وقوله تعالىٰ بالغدو صلاة الغداة وقوله تعالىٰ الأصال صلاة الظهر والعصر والمغرب و العشاء وقيل الآصال هو صلاة العصر ويحتمل العصر والظهر لانهما يؤديان فى الاصيل وهو العشى وفرضية المغرب والعشاء عرفت بدليل اٰخر.

(۳) صبح کاذب کیا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ صبح کاذب جس کا احادیث میں ذکر ہے بروجی روشنی ہی ہے (جو سال بھر میں صرف دو ماہ وسط اگست سے وسط اکتوبر میں ہی نظر آ سکتی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں رمضان المبارک میں آئی ہی نہیں) جبکہ دوسرا شخص اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ صبح کاذب شامیؒ کے حوالہ کے مطابق وہ روشنی ہے جو صبح صادق شروع ہونے سے تین درجہ پہلے نمودار ہوتی ہے۔ شرعی نقطہ نگاہ سے ان دونوں اقوال میں سے کون سا قول درست ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور درست قول ہے تو اس کو بتلا دیا جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... واضح رہنا چاہئے کہ شرعی احکامات کا تعلق مشاہدے سے ہے۔ کسی سائنس یا ریاضی کے حسابات سے نہیں ہے۔ اور چونکہ روزے کی ابتداء نماز فجر وغیرہ کے تمام شرعی احکامات کا تعلق صبح صادق سے ہے جو کہ ہر جگہ پورے سال نظر آتی ہے۔ جبکہ صبح کاذب سے کوئی بھی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی کھوج میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس جگہ یہ نظر آ جائے، اس کی وجہ سے صبح صادق کا دھوکہ نہ ہو جائے، اس لئے حدیث میں اس کی مخصوص نشانیاں بتلا دی گئی ہیں، مثلاً

(۱)۔ یہ صبح صادق سے کچھ پہلے طلوع ہوتی ہے۔

(۲)۔ اس کی روشنی صبح صادق کی طرح عرضاً نہیں بلکہ عموداً ہوتی ہے۔

(۳)۔اس کی مشابہت بھیڑیئے کی دم کی طرح ہوتی ہے۔

(۴)۔اوراس کے بعد صبح صادق سے قبل دوبارہ اندھیرا چھا جاتا ہے۔

(۵)۔اس کے طلوع ہونے کا وقت علامہ شامیؒ کے مطابق صبح صادق سے تین درجے پہلے کا ہے۔

لما فی الشامية (۱/۳۵۹): (قوله من أول طلوع الخ) زاد لفظ أول اختياراً لمادل عليه الحديث كما قد مناه. (قوله. وهو البياض الخ) لحديث مسلم والترمذي. واللفظ له "لايمنعكم من سحوركم اذان بلال ولا الفجر المستطيل ولكن الفجر المستطير" فالمعتبر الفجر الصادق وهو الفجر المستطير في الافق. أي الذي ينتشر ضوئه في اطراف السماء، لا الكاذب. وهو المستطيل الذي يبدو طويلاً في السماء كذنب السرحان. أي الذنب ثم يعقبه ظلمة.

(فائدة)...... ذكر العلامة المرحوم الشيخ خليل الكاملي في حاشيته على رسالة الاسطرلاب لشيخ مشايخنا العلامة المحقق على آفندى الداغستاني، أن التفاوت بين الفجرين وكذا بين الشفقين الأحمر والأبيض، إنما هو بثلاث درج. (قوله إلى قبيل) كذا أقحمه في النهر، والظاهر أنه مبنى على دخول الغاية،لكن التحقيق عدمه لكونها غاية مد كما سبق.

وفي المعجم الوسيط(صـ ۶۷۵):(الفجر) انكشاف ظلمة الليل عن نور الصبح وهما فجران. أحدهما المستطيل، وهو الكاذب ،والآخر، المستطير المنتشر في الافق.

(۴) طلوع آفتاب کے بعد اشراق کا صحیح وقت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ طلوعِ آفتاب سے کتنے منٹ بعد اشراق کا وقت شروع ہوتا ہے اور کتنے منٹ بعد پڑھنا افضل ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......طلوعِ آفتاب کے وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب ایک نیزہ کے برابر اوپر آجائے۔تو نماز پڑھنا جائز ہے جس کی مقدار 10 سے 20 منٹ ہیں۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اشراق کے نفل پڑھنے کا وقت طلوعِ آفتاب کے 10 منٹ بعد سے شروع ہوتا ہے اور افضل یہ ہے کہ 20 منٹ بعد ادا کی جائے۔

لمافي البحر الرائق(۱/۴۴۳): وذكر في الأصل مالم ترتفع الشمس قدر رمح فهي في حكم الطلوع واختار الفضليؒ ان الانسان مادام يقدر على النظر الى قرص الشمس في الطلوع فلا تحل الصلوة فاذا عجز عن النظر حلت.

وفي الشامية(۱/۳۷۱): (قوله مع شروق) ومادامت العين لاتحار فيها فهي في حكم الشروق كما

تقدم في الغروب انه الأصح كمافي البحر، أقول ينبغي تصحيح ما نقلوه عن الأصل للامام محمد من انه مالم ترتفع الشمس قدر رمح فهي في حكم الطلوع لان اصحاب المتون مشوا عليه في صلوة العيد حيث جعلوا أول وقتها من الارتفاع ولذا جزم به هنا في الفيض ونور الايضاح.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۱/۶۷۷): فالاوقات الخمسة هي مايأتي: (۱) مابعد صلوة الصبح حتى ترتفع الشمس كرمح في رأى العين (۲) ووقت طلوع الشمس حتى ترتفع قدر رمح اى بعد طلوعها بمقدار ثلث ساعة.

(۵) وہ اوقات جن میں نفل پڑھنا مکروہ ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بزرگ نے مجھے صبح کی نماز کے وقت دو رکعت نفل پڑھنے کیلئے بتائے ہیں وہ میں دو سال سے برابر پڑھ رہا ہوں۔ پچھلے رمضان میں تبلیغ کیلئے عشرہ پر گیا چنانچہ وہاں جب میں نے معمول کے مطابق فجر کی سنتوں سے پہلے دو رکعت نفل پڑھی تو امیر صاحب نے بتایا کہ فجر میں دو رکعت سنت کے علاوہ نفل پڑھنا جائز نہیں۔ کیا امیر صاحب کی یہ بات درست ہے نیز کونسے اوقات میں نفل جائز نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں امیر صاحب کی بات درست ہے کہ طلوع فجر کے بعد سے لے کر سورج بلند ہونے تک فجر کی چار رکعتوں کے علاوہ کوئی دوسری نماز پڑھنا مکروہ ہے باقی جن اوقات میں نفل پڑھنا مکروہ ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)۔طلوع فجر یعنی فجر کا وقت داخل ہونے کے بعد سورج نکلنے تک۔ (۲)۔زوال کے وقت (۳)۔عصر کی نماز کے بعد سے لے کر مغرب کی نماز تک۔ (۴)۔اور جب فرض نماز کھڑی ہو جائے یا فرض نماز کا وقت تنگ ہو۔ (۵)۔اور جب امام جمعہ کا خطبہ دینے کیلئے کھڑا ہو۔ (۶)۔عید کی نماز سے پہلے مطلقاً یعنی گھر میں بھی اور مسجد میں بھی اور عید کی نماز کے بعد مسجد میں نفل پڑھنا مکروہ ہے نہ کہ گھر میں۔

لمافي الهندية(۱/۵۲): تسعة أوقات يكره فيها النوافل وما في معناها لا الفرائض هكذا في النهاية والكفاية...... منها ما بعد طلوع الفجر قبل صلاة الفجر كذا في النهاية والكفاية، يكره فيه التطوع بأكثر من سنة الفجر...... ومنها مابعد صلاة الفجر قبل طلوع الشمس هكذا في النهاية والكفاية ومنها ما بعد صلاة العصر قبل التغير...... ومنها ما بعد غروب الشمس قبل صلاة المغرب وعند الاقامة يوم الجمعة وعند خطبة الجمعة والعيدين والكسوف والاستسقاء...... ويكره التنفل عند خطبة الحج وخطبة النكاح...... ويكره التطوع اذا خرج الامام للخطبة يوم الجمعة...... ويكره التنفل اذا أقيمت الصلاة الا سنة الفجر ان لم يخف فوت الجماعة وقبل صلاة العيد مطلقا وبعدها في

المسجد لافی البیت وبین صلاتہ الجمع بعرفۃ ومزدلفۃ.....ویکرہ جمیع الصلوۃ سوی الوقتیۃ اذا ضاق وقت المکتوبۃ ...... ویکرہ الصلاۃ وقت مدافعۃ البول أو الغائط ووقت حضور الطعام اذا کانت النفس تائقۃ الیہ والوقت الذی یوجد فیہ ما یشغل البال من افعال الصلاۃ ویخل بالخشوع کائنا ما کان الشاغل ویکرہ اداء العشاء ما بعد نصف اللیل ھکذا فی البحر الرائق.

وفی الدر المختار (۱/۳۷۵): وکذا الحکم من کراھۃ نفل...... بعد طلوع فجر سوی سنتہ.

(۶) اوقاتِ مکروہہ میں تحیۃ المسجد ادا کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے ان اوقات میں اگر کوئی مسجد میں آجائے تو تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے کہ نہیں؟ ہمارے ہاں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ پڑھ سکتا ہے اور یہ حضرات دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مفہوم ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعات پڑھے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کونسی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اوقاتِ مکروہہ (طلوع، غروب اور زوالِ آفتاب) میں نماز پڑھنا چاہے فرض ہو یا واجب، سنت ہو یا نفل ممنوع ہے۔ اسی طرح صبح صادق سے طلوعِ آفتاب تک اور عصر کی فرض نماز کے بعد سے مغرب تک صرف نوافل مکروہ ہیں فرائض ادا کئے جاسکتے ہیں۔ اب ان پانچ اوقات میں مسجد میں آنیوالوں کیلئے تحیۃ المسجد جو نوافل کے قبیل سے ہے پڑھنا مکروہ ہے۔ سوال میں ذکر کردہ روایت صحیح وثابت ہے چنانچہ بخاری، مسلم اور ابوداؤد وغیرہ میں معمولی اختلاف کیساتھ موجود ہے اور اسی روایت سے استدلال کرتے ہوئے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر وقت تحیۃ المسجد کے نفل پڑھے جاسکتے ہیں جبکہ دوسری روایات سے استدلال کرتے ہوئے احناف فرماتے ہیں کہ یہ روایات ان اوقات کیساتھ خاص ہیں جن میں نوافل پڑھنا جائز ہے۔ نیز احناف کے مذہب پر عمل کرنے میں احتیاط بھی زیادہ ہے کیونکہ تحیۃ المسجد پڑھنا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے جبکہ ان اوقاتِ مکروہہ میں نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔

لمافی الشامیۃ (۱/۳۷۵): (قولہ ولو تحیۃ المسجد) اشاربہ الی انہ لافرق بین مالہ سبب اولا کمافی البحر خلافاللشافعی فیمالہ سبب کالرواتب وتحیۃ المسجد.

(۷) مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیان کتنی دیر کا وقفہ ضروری ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں صوبہ سرحد ضلع چترال کا رہنے والا ہوں، چترال شہر میں نمازوں کے اوقات کے لئے اور رمضان میں افطاری کے اوقات کی تعیین کے لئے کراچی سے ایک چارٹ بن کر آگیا ہے اس میں مغرب اور عشاء کے درمیان کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ بتایا ہے اس ڈیڑھ گھنٹے کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہم لوگ نمازیں پڑھتے ہیں اور ہم

چونکہ دیہات میں رہتے ہیں وہاں غروب آفتاب جلدی ہوتا ہے، غروب آفتاب کے بعد اذان دے کر ہم مغرب کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن جون جولائی کے مہینے میں مغرب کے بعد عشاء کے لئے ڈیڑھ گھنٹے کا اعتبار کرنے سے پونے دو گھنٹہ یعنی ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ تک انتظار کرنا پڑتا ہے اور اس طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنے سے کافی رات گزر جاتی ہے اور لوگ حرج میں مبتلا ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چارٹ شہر کے لئے ہے دیہات والوں کے لئے یہ نہیں ہے۔

(۱)۔اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہم جون جولائی کے مہینے میں بھی دوسرے مہینوں کی طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کر کے نماز عشاء ادا کریں گے یا مغرب کی نماز کے بعد سے حساب کر کے جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے عشاء کی نماز ادا کریں گے۔

(۲)۔مغرب اور عشاء کے درمیان کتنی دیر وقفہ کرنا ضروری ہے۔

(۳)۔آیا اس شہر والے نقشہ کی اتباع کرنا ہمارے لئے ضروری ہے یا دیہات کیلئے کوئی الگ حکم ہے۔

اس بارے میں ہمارے علاقے کے لوگوں میں بہت اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اس کشیدگی کی وجہ سے اکثر لوگ گھروں میں نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ براہ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں مفصل اور تسلی بخش جواب دے کر لوگوں میں اس نزاع کو ختم فرما کر عند اللہ اجر عظیم کا مستحق ہو جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......عشاء کی نماز کا ابتدائی وقت شفق ابیض کے غروب سے شروع ہوتا ہے یعنی جب افق پر موجود سرخی ختم ہو جائے اور پھر اس کے بعد پھیلنے والی سفیدی بھی ختم ہو جائے تو عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔صورت مسئولہ میں جس چارٹ کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں عشاء کا ذکر کردہ وقت اگر غروب شفق ابیض کے موافق ہے تو دیہات میں بھی اس چارٹ کا لحاظ کرنا ضروری ہے کیونکہ شہر کے مضافات میں بھی شہر کے اوقات کا اعتبار ہوتا ہے چونکہ عشاء کی نماز میں معیار غروب شفقِ ابیض ہے اور اس کی مقدار اہل تجربہ ڈیڑھ گھنٹہ بتاتے ہیں اور یہ مقدار بعض موسموں میں ۴، ۵ منٹ زیادہ یا کم ہوتی رہتی ہے۔لہٰذا مغرب اور عشاء کے درمیان ڈیڑھ گھنٹہ سے کم فاصلہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ احتیاطاً پونے دو گھنٹہ کا فاصلہ کرنا چاہئے اور آپ کے مقامی علماء کرام کو چاہئے کہ نمازی حضرات کو سمجھائیں کہ وقت ہونے پر ہی نماز ادا کریں تاکہ سب حضرات مسجد میں باجماعت نماز ادا کریں۔

لمافی البحر الرائق(۱/۴۲۷): قوله(وهو البياض) ای الشفق هو البياض عند الامام...... وعندهما وهو رواية عنه هو الحمرة ...... وصرح فی المجمع بان عليها الفتوى ورده المحقق فی فتح القدير ... ورجحه ايضاً تلميذه قاسم فی تصحيح القدوری۔ وقال فی آخره: فثبت ان قول الامام هو الاصح اھ وبهذا ظهر انه لايفتى ويعمل الا بقول الامام الاعظم ولا يعدل عنه الى قولهما او قول احدهما او غيرهما الالضرورة ...... وفی السراج الوهاج: فقولهما اوسع للناس وقول ابی حنيفة احوط.

وفی الهندية(۱/۵۱): ووقت المغرب منه الى غيبوبة الشفق وهو الحمرة عندهما وبه يفتى هكذا فی شرح الوقاية وعند ابی حنيفة الشفق هو البياض الذی يلی الحمرة هكذا فی القدوری وقولهما

اوسع للناس وقول ابی حنیفة رحمه الله احوط لان الاصل فی باب الصلاة ان لایثبت فیها رکن ولا شرط الا بما فیه یقین کذا فی النهایة ناقلاً عن الاسرار ومبسوط شیخ الاسلام.

وفی الدر المختار مع الشامیة(۱/۳۶۱): ووقت المغرب منه الی غروب الشفق وهو الحمرة عندهما وبه قالت الثلاثة والیه رجع الامام کما فی شروح المجمع وغیرها فکان هو المذهب وقال العلامة الشامی علیه الرحمة: قال العلامة قاسم: فثبت ان قول الامام هو الاصح ومشی علیه فی البحر مؤیداً له بما قدمناه عنه...... لکن تعامل الناس الیوم فی عامة البلاد علی قولهما وقد ایده فی النهر تبعاً للنقایة والوقایة والدرر والاصلاح ودرر البحار والامداد والمواهب وشرحه البرهان وغیرهم مصرحین بان علیه الفتوی وفی السراج: قولهما اوسع وقوله احوط.

(۸) مغرب اورعشاء کا درمیانی وقفہ

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جس نے تبلیغ میں بھی وقت لگایا ہے،فرماتے ہیں کہ مغرب اور عشاء کے درمیان ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ہوتا ہے،تو اس کی یہ بات درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا ماہ بماہ کچھ کچھ دنوں میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ ہمارے شہری (مجوزہ نقشوں کے مطابق) ایک گھنٹہ انتیس منٹ ہوتا ہے (جولائی کے بعض دنوں میں) اور کم سے کم ایک گھنٹہ اکیس منٹ ہوتا ہے (نومبر کے بعض دنوں میں)، اس لئے آپ کے دوست کا مطلق یہ کہہ دینا مغرب وعشاء کے درمیان کا وقت ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے درست نہیں، باقی ایام میں اس وقفہ کو معلوم کرنے کیلئے مساجد میں لگے مجوزہ نقشوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الدر المختار مع الشامیة (۱/۳۶۱): (و) وقت (المغرب منه الی) غروب (الشفق وهو الحمرة) عندهما وبه قالت الثلاثة والیه رجع الامام کما فی شروح المجمع وغیرها......

واذا تعارضت الأخبار والاثار فلا یخرج وقت المغرب بالشک کمافی الهدایة وغیرها ...... لکن تعامل الناس الیوم فی عامة البلاد علی قولهما...... (تنبیه) قدمنا قریباً أن التفاوت بین الشفقین بثلاث درج کما بین الفجرین فلیحفظ.

(۹) چھ ماہ دن، چھ ماہ رات رہنے والے ممالک میں ادائیگی نماز کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی نماز دلوک شمس کے بعد واجب ہوتی ہے تو جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہو، وہاں ظہر کی نماز کا کیا حکم ہے جبکہ دلوک شمس تو نہیں پایا گیا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جن ممالک میں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہو، وہاں کے لوگ اپنے قریبی معتدل ممالک کی نمازوں کے اوقات کے مطابق اندازاً اپنی نمازوں کے اوقات مقرر کر کے پڑھیں گے۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۶۲،۳۶۳): (وفاقد وقتهما) كبلغار فان فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق فی اربعينية الشتاء، (مكلف بهما فيقدر لهما) ولاينوی القضاء لفقد وقت الأداء، به أفتى البرهان الكبير واختاره الكمال وتبعه ابن الشحنة فی الغازه فصححه فزعم المصنف انه المذهب،

وفی الشامية تحته: (قوله فيقدر لهما) هذا موجود فی نسخ المتن المجردة ساقط من المنح ولم أرمن سبقه اليه سوى صاحب الفيض حيث قال ولو كانوا فی بلدة يطلع فيها الفجر قبل غيبوبة الشفق لايجب عليهم صلاة العشاء لعدم السبب وقيل يجب ويقدرا لوقت، بقي الكلام فی معنى التقدير والذی يظهر من عبارة الفيض ان المراد انه يجب قضاء العشاء بأن يقدر أن الوقت أعنى سبب الوجوب قد وجد كما يقدر وجوده فی ايام الدجال على ماياتی لانه لايجب بدون السبب فيكون قوله ويقدر الوقت جواباً عن قوله فی الاول لعدم السبب وحاصله انا لانسلم لزوم وجود السبب حقيقة بل يكفی تقديره كما فی ايام الدجال، ويحتمل ان المراد بالتقدير المذكور هوما قاله الشافعية من انه يكون وقت العشاء فی حقهم بقدر مايغيب فيه الشفق فی اقرب البلاد اليهم.

(۱۰) ضرورت کے وقت نمازِ عصر کو وقت سے پہلے پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فوج اگر محاذِ جنگ میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھے، تو کیا اس طرح ان کی نماز درست ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ظاہر الروایہ اور مفتی بہ قول کے مطابق عصر کی نماز کو سایۂ اصلی کے علاوہ مثلین تک انتظار کر کے پڑھنا چاہئے۔ اس سے پہلے عام حالات میں نمازِ عصر پڑھنا درست نہیں تاہم اگر کسی ضرورت شدیدہ کی وجہ سے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے مثلین تک انتظار کرنے کی بجائے اوّل وقت یعنی ایک مثل کے بعد پڑھ لے تو اختلاف فقہاء کی وجہ سے گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لمافی التاتارخانية(۱/۴۰۳): واوّل وقت العصر عند أبی يوسف ومحمدؒ اذا صار الظل قامة وزاد عليها وذكر أبو سليمان عن أبی يوسف أنه يعتبر الزيادة قال أبو الحسن الخلاف فی آخر وقت الظهر هوَ خلاف فی اقل وقت العصر وفی الغياثية واوّل وقت العصر اذا صارظل كل شئی مثليه. وهو المختار.

وفی الدر المختار مع الشامية (۱/۳۵۹): وعنه مثله وهو قولهما وزفر والائمة الثلاثة قال الامام

الطحاوی وبه نأخذ وفي غرر الاذكار وهو المأخوذ به وفي البرهان وهو الاظهر لبيان جبريل وهو نص في الباب وفي الفيض وعليه عمل الناس اليوم وبه يفتي (سوى فيئى).

(قوله الى بلوغ الظل مثليه) هذا ظاهر الرواية عن الامام نهاية وهو الصحيح بدائع ومحيط وينابيع وهو المختار غياثية واختاره الامام المحبوبي وعول عليه النسفي وصدر الشريعة تصحيح قاسم واختاره اصحاب المتون وارتضاه الشارحون فقول الطحاوی وبقولهما ناخذ لا يدل على أنه المذهب وما في الفيض من أنه يفتي بقولهما في العصر والعشاء مسلم في العشاء فقط على مافيه وتمامه في البحر...... (قوله وعليه عمل الناس اليوم) أي في كثير من البلاد والا حسن مافي السراج عن شيخ الاسلام أن الاحتياط أن لا يؤخر الظهر الى المثل وان لا يصلي العصر حتى يبلغ المثلين ليكون مؤديا للصلاتين في وقتهما بالاجماع وانظر هل اذا لزم من تأخيره العصر الى المثلين فوت الجماعة يكون الاولى التاخير ام لا والظاهر الأول بل يلزم لمن اعتقد رجحان قول الامام تامل.

(۱۱) نمازِ مغرب کو وقتِ عشاء سے پندرہ منٹ قبل ادا کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مرتبہ گلشن اپنے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں مغرب کی نماز میں نے ادا نہیں کی۔ جب مقام پر پہنچا تو ابھی عشاء کا وقت (بمطابق کیلنڈر) داخل ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نماز مغرب ادا کرنے لگا تو میرے ساتھی نے کہا کہ مغرب کا وقت ختم ہو چکا ہے، اب آپ قضاء نماز ادا کریں۔ تو کیا یہ نمازِ مغرب قضاء وقت میں شمار ہوگی یا ادا وقت میں؟ سنا ہے کہ مغرب کا وقت بہت مختصر ہوتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور انتہاءِ وقتِ مغرب "شفق ابیض" (یعنی غروب آفتاب کے بعد مغربی جانب آسمان پر پھیلی ہوئی سفیدی) کے غائب ہونے پر ہے، اور نمازِ مغرب کے مجموعی وقت کا گھٹنا اور بڑھنا دنوں کے گھٹنے اور بڑھنے پر موقوف ہے۔ لہٰذا گرمی کے موسم میں نمازِ مغرب کا مجموعی وقت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اور سردی کے موسم میں سوا گھنٹہ ہے، لوگوں پر آسانی کے پیش نظر اسی پر فتویٰ ہے۔ ہماری مساجد میں عام طور پر آویزاں نمازوں کے نظام الاوقات کا دائمی نقشہ بھی مذکورہ وقت کے حساب سے مرتب ہے، اسی نقشہ کے نظام الاوقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نمازوں کی ادائیگی کریں۔ آپ کی تحریر کردہ صورت کے مطابق کہ نماز عشاء کے وقت کے داخل ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے، تو ایسی صورت میں آپ کی نماز ادا ہی شمار ہوگی، لیکن نمازِ مغرب کو بلا کسی عذر کے مؤخر کرنا مکروہ ہے۔

لمافي الصحيح لمسلم (۱/۲۲۳): عن عبدالله بن عمرو ان رسول الله ﷺ قال وقت الظهر اذا زالت الشمس وكان ظل الرجل كطوله مالم تحضر العصر ووقت العصر مالم تصفر الشمس

ووقت صلوة المغرب مالم يغب الشفق ووقت صلوة العشاء الى نصف الليل الاوسط ووقت صلوة الصبح من طلوع الفجر مالم تطلع الشمس فاذا طلعت الشمس فامسک عن الصلوة فانها تطلع بين قرنى الشيطان.

وفى الهداية(۱/۷۸): وأول وقت المغرب اذا غربت الشمس وآخر وقتها مالم يغب الشفق ....ثم الشفق هو البياض الذى فى الأفق بعد الحمرة عند أبى حنيفة وعندهما هو الحمرة.

وفى الشامية (۱/۳٦۱): (قوله واليه رجع الامام) اى الى قولهما الذى هو رواية عنه ايضا وصرح فى المجمع بأن عليها الفتوى، ورده المحقق فى الفتح بانه لايساعده رواية ولادراية الخ وقال تلميذه العلامة قاسم فى تصحيح القدورى، ان رجوعه لم يثبت، لما نقله الكافة من لدن الأئمة الثلاثة الى اليوم من حكاية القولين ودعوى عمل عامة الصحابة بخلافه خلاف المنقول قال فى الاختيار: الشفق البياض، وهو مذهب الصديق ومعاذ بن جبل و عائشة رضى الله عنهم قلت: ورواه عبدالرزاق عن ابى هريرة وعن عمر بن عبدالعزيز ولم يروالبيهقى الشفق الاحمر الاعن ابن عمر ...... وتمامه فيه واذا تعارضت الأخبار والآثار فلا يخرج وقت المغرب بالشک كما فى الهداية وغيرها قال العلامة قاسم: فثبت ان قول الامام هو الاصح، ومشى عليه فى البحر مؤيد اله بما قدمناه عنه، من انه لايعدل عن قول الامام الالضرورة من ضعف دليل اوتعامل......تنبيه قدمنا قريبا ان التفاوت بين الشفقين بثلاث درج كما بين الفجرين فليحفظ.

(۱۲) سفر کی نمازوں کو پیشگی قصر کرنے کا حکم نیز کسی عذر کی وجہ سے دو وقتوں کی نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ سفر پر جانے سے پہلے ان وقتوں کی نمازوں کی قصر پیشگی گھر پر ادا کر لیتے ہیں جن کے بارے میں انہیں اندیشہ ہے کہ وہ سفر میں ادا نہیں کر سکیں گے، مثلاً اگر سفر ظہر سے پہلے شروع کیا اور رات گئے اپنی منزل پر پہنچنے کا امکان ہے تو یہ لوگ ظہر، عصر، مغرب کی نماز قصر پیشگی ادا کر لیتے ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا؟ ائمہ اربعہ کا اس بارے میں مسلک ضرور بیان فرمائیں۔

(۲)...... عرب ممالک میں بارش آندھی وغیرہ کے دن اکثر دو وقتوں کی نماز ایک ساتھ جمع کر لی جاتی ہے اس بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ یوم عرفات میں مسجد میں ظہر اور عصر کی نماز جمع کی جاتی ہے سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص مسجد نہ جا سکا تو پھر وہ خیمہ میں نماز پڑھتا ہے چاہے

تنہا یا مختصر جماعت کے ساتھ تو وہ نماز جمع کرے گا یا پھر دونوں نمازوں کو اپنے اپنے وقت پر پوری پڑھے گا یا قصر پڑھے گا حج میں لوگ قصر ہی پڑھتے ہیں؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے شریعتِ مطہرہ کو آسان بنایا ہے، اسلئے لوگوں کی آسانی کیلئے مختلف حالتوں میں مختلف احکام دیئے ہیں انہی احکام میں سے حالتِ سفر میں نمازوں کی قصر کا حکم ہے۔ البتہ نمازوں کی قصر کیلئے ضروری ہے کہ سفر کی حالت ہو، لہٰذا جب تک سفر شروع نہ ہوا ہو، ائمہ اربعہؒ میں سے کسی کے نزدیک قصر جائز نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ سفر شروع کرنے سے پہلے گھروں ہی میں سفر میں آنے والی نمازوں کو قصر کرتے ہیں یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۲)......اور رہا مسئلہ حالتِ سفر میں نمازوں کو جمع کرنے کا تو ائمہ اربعہؒ کا اس بارے میں اختلاف ہے، احنافؒ کے نزدیک سفر کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ جبکہ ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک سفر کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ لیکن یہ اختلاف جمع بین الصلاتین میں ہے یعنی دو نمازوں کو جمع کرنے کے بارے میں ہے اور وہ دو نمازیں یا تو ظہر وعصر کی نمازیں ہیں یا مغرب وعشاء کی تقدیماً یا تاخیراً۔ لیکن یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے کہ سب نمازوں کو ایک ہی وقت میں پڑھا جائے پس صورت مسئولہ میں اگر سفر شروع کرنے سے پہلے نمازوں کو جمع کرتے ہیں تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اگر سفر شروع کرنے کے بعد جمع کرتے ہیں پھر اگر ساری ہی نمازیں اکٹھی پڑھتے ہیں تو یہ بھی کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اگر دو نمازوں کو یعنی ظہر وعصر کو یا مغرب وعشاء کو جمع کرتے ہیں تو ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے لیکن احنافؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۳)......عرب ممالک میں چونکہ اکثر ائمہ ثلاثہؒ کے مقلدین رہتے ہیں اور ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک بارش وآندھی وغیرہ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین جائز ہے اس لئے وہ حضرات بارش وغیرہ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کرتے ہیں۔ لیکن احنافؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

(۴)...... یوم عرفات میں جمع بین الصلوتین کیلئے احنافؒ کے نزدیک صحیح قول کے مطابق یہ شرط ہے کہ خلیفۂ وقت یا اس کے نائب کے پیچھے نماز باجماعت پڑھی جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص اکیلے نماز پڑھ رہا ہو یا کسی اور امام کے پیچھے پڑھ رہا ہو تو اُس کیلئے جمع بین الصلاتین جائز نہیں ہوگی بلکہ عصر کو اپنے وقت میں ہی پڑھے گا۔ اور لوگ عموماً حج میں مکہ مکرمہ میں اقامت کی نیت کر لیتے ہیں تو مکہ مکرمہ میں نمازیں پوری پڑھی جائیں گی البتہ عرفات میں چونکہ تھوڑے وقت کیلئے آتے ہیں اور وہاں مسافر ہوتے ہیں اس لئے قصر کرنا لازم ہوگا۔

لمافی قوله تعالیٰ (النساء: ۱۰۳): ان الصلوٰة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً.

وفي الدر المختار (۲/۵۰۴): (صلى بهم الظهر والعصر باذان واقامتين) وقراءة سرية ولم يصل بينهما شيئاً على المذهب ولا بعداداء العصر في وقت الظهر (وشرط) لصحة هذا الجمع الامام الاعظم أو نائبه والا صلوا وحداناه.

وفي الشامية تحته. (قوله والاصلوا وحدانا) يوهم جواز صلوة العصر في وقت الظهر وعدم جواز الجماعة لوصليت العصر في وقتها وليس بمراد فالاصوب قول الزيلعيؒ صلوا كل واحدة منهما في

وقتها افاده ح اهـ.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۳۷۲): یجوز عند الجمهور غیر الحنفیة الجمع بین الظهر والعصر تقدیما فی وقت الأولیٰ وتأخیراً فی وقت الثانیة، والجمعة کالظهر الخ......

وفی (صـ۱۳۷۴): اتفق مجیزو الجمع تقدیما وتأخیراً علی جوازه فی احوال ثلاثة هی السفر، والمطر ونحوه.

(۱۳) رمضان میں افطاری کی خاطر نماز مغرب کو کچھ تاخیر سے پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان میں افطاری کے لئے نماز مغرب میں کچھ تاخیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کتب فقہ کی روشنی میں جواب دیجئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... افطار کیلئے جماعت مغرب میں پانچ دس منٹ تاخیر کی گنجائش ہے۔

لمافی مراقی الفلاح (صـ۱۴۷): فکان تأخیرها مکروه الافی یوم غیم والا من عذر سفر او مرض وحضور مائدة والتاخیر قلیلا لا یکره؟

وفی الشامیة (۱/۳۷۰): ای المذکور فی المبتغی بقوله یکره تاخیر المغرب فی روایة و فی اخری لامالم یغب الشفق والاصح الاول الالعذر اهـ.

(۱۴) عذر کی بنا پر نماز کو وقت سے پہلے پڑھنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک اکیڈمی میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہوں پڑھائی کا وقت تین سے سات تک ہے مسلسل اسباق ہوتے ہیں درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا حتیٰ کہ نماز کا وقفہ بھی نہیں ہے اس وجہ سے میری نماز رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے کیا تعلیم کی وجہ سے نماز چھوڑنا جائز ہے؟ نیز اس صورت کے پیش نظر میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ اب میرے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز کی فرضیت اوقات مقررہ میں ہر عاقل بالغ مسلمان مرد وعورت پر ہے اور اس کا ثبوت آیاتِ قرآنیہ اور احادیث مشہورہ سے ہے اور بلا کسی عذر شرعی کے اس کا چھوڑنا جائز نہیں۔ لہٰذا اپنی تعلیمی مصروفیات میں سے نماز کا وقت نکال کر ادا کرنا ضروری ہے۔ اور کسی بھی نماز کو اپنے وقت سے پہلے پڑھنا جائز نہیں۔ اگر پڑھ بھی لی تو فرض ادا نہ ہوگا اور قضاء لازم ہوگی۔

لمافی ردالمحتار علی الدر المختار (۱/۳۷۰): یشترط لصحة الصلاة دخول الوقت واعتماد دخوله کمافی نور الایضاح وغیره، فلو شک فی دخول وقت العبادة فاتی بها فبان انه فعلها فی

الوقت لم یجزہ.

وفی الدر المختار (۱/۳۵۶): سببها ترادف النعم ثم الخطاب ثم الوقت الخ.

وفی الشامیة: (قوله سببها ترادف النعم الخ) یعنی ان سبب الصلوٰة الحقیقی هو ترادف النعم علی العبد،..... ولما کانت النعم واقعة فی الوقت جعل الوقت سببا بجعل الله تعالیٰ وخطابه حیث جعله سببا للوجوب لقوله تعالیٰ اقم الصلوٰة لدلوک الشمس فکان الوقت هو السبب المتاخر.....

وفی الشامیة أیضاً (ص۳۵۷): وفی البحر عن الخلاصة غلام صلی العشاء ثم احتلم ولم ینتبه حتی طلع الفجر علیه اعادة العشاء هو المختار..... الی ان قال (قوله وانه الاصل) (قوله حتی یلزمهم) ای المجنون ومن ذکر بعده وکذا غیرهم ممن خرج علیه الوقت ولم یصل فیه قوله هو الصحیح.

﴿فصل فی الاذان﴾

(اذان واقامت سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۵) اذان واقامت کے شرائط وآداب

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان واقامت کے شرائط کیا ہیں؟ اسی طرح انکے آداب بھی بیان فرمادیں تاکہ ہم انکی رعایت کرسکیں. نیز نابالغ بچہ یا عورت اذان دے سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... کچھ شرائط مؤذن کیلئے ہیں اور کچھ اذان واقامت کیلئے، لہٰذا دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے۔

مؤذن کی شرائط.....اول مسلمان ہونا، دوم مرد ہونا، سوم عاقل ہونا۔

اذان واقامت کی شرائط.....وقت میں ہونا، عربی زبان میں ہونا، کلمات میں ترتیب کا پایا جانا، پے درپے ہونا یعنی درمیان میں بات چیت نہ کرنا۔

آداب.....باآواز بلند ہونا، مؤذن کا نیک وصالح ہونا، اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں رکھنا، اذان کے کلمات ٹھہر ٹھہر کر جبکہ اقامت قدرِ عجلت سے ادا کرنا، قبلہ کی طرف منہ کرنا، حی علی الصلاۃ میں دائیں جانب اور حی علی الفلاح میں بائیں جانب منہ پھیرنا، اذان واقامت کہنے والے کا ایک ہونا۔

نیز عورت اور ناسمجھ بچے کی اذان درست نہیں لہٰذا اگر دونوں میں سے کسی نے بھی اذان دیدی تو اسکا اعادہ ضروری ہوگا البتہ اگر بچہ اتنا بڑا ہے کہ اسکو سمجھ بوجھ حاصل ہو تو اسکی اذان درست تو ہو جائیگی مگر بہتر یہ ہے کہ کوئی بالغ سمجھدار آدمی اذان دے۔

لمافی الشامیة (۱/۳۸۴): (قوله للرجال) امالنساء فیکره لهن الاذان و کذاالاقامة لماروی عن انس وابن عمر (رضی الله عنهما) من کراهتهمالهن ولأن مبنی حالهن علی السترورفع صوتهن حرام، امداد. ثم الظاهر انه یسن للصبی اذا اراد الصلاة کمایسن للبالغ وان کان فی کراهة اذانه لغیره کلام.

وفی (صـ۳۸۹): (قوله اعادماقدم فقط) کمالوقدم الفلاح علی الصلاة یعیده فقط ای ولایستأنف الاذان من اوله ......(قوله ولوردسلام) اوتشمیت عاطس اونحوهمالافی نفسه ولابعدالفراغ علی الصحیح. (وفی صـ۳۹۳) (قوله وجزم المصنف) أی حیث قال فیمامر قیدنابالمراهق لأن اذان

الصبی الذی لایعقل غیر صحیح کالمجنون والمعتوہ اھ فافھم وھذا ذکرہ فی البحر بحثا فترجح عند المصنف فجزم بہ ویؤیدہ مافی شرح المنیۃ من انہ یجب اعادۃ اذان السکران والمجنون والصبی غیر العاقل لعدم حصول المقصود،لعدم الاعتماد علی قولھم.

(۱۶) حدود مسجد میں اذان نہ دینے کی وجہ کا بیان

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا کہ مسجد میں اذان نہیں دینی چاہئے آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ صحیح ہونے کی صورت میں اذان نہ دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے حالانکہ اذان میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور نماز کی طرف دعوت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے ایک قاری صاحب فرمارہے تھے کہ مسجد میں ہوں تو حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ نہیں کہنا چاہیے مسجد سے باہر کہنا چاہیے، آیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔

الجواب حامداً ومصلیاً......اذان بلند آواز سے بلند جگہ پر دی جائے تا کہ زیادہ دور تک آواز پہنچے جہاں تک مؤذن کی آواز پہنچے گی وہاں تک کی ہر چیز مؤذن کے حق میں گواہی دے گی مسجد کے اندر اذان نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سے آواز دور تک نہیں پہنچتی جس سے اذان کا اصل مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوتا، اس لئے بلند جگہ اذان دینا مستحب ہے تا کہ آواز دور تک پہنچ جائے البتہ اگر مسجد کے اندر بھی ایسا انتظام ہو جس سے آواز دور تک پہنچے (جیسے لاؤڈ اسپیکر وغیرہ) تو اس وقت مسجد کے اندر بھی اذان دے سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اذان کا جواب دینا مستحب ہے بعض علماء اذان کے جواب کو واجب کہتے ہیں مگر زیادہ معتمد یہی ہے کہ اجابت فعلی (اذان سن کر مسجد کی طرف جانا) واجب ہے اور اجابت قولی (اذان سن کر زبان سے جواب دینا) مستحب ہے حاضرین مسجد کیلئے ایک ہی صورت ہے کہ وہ زبان سے جواب دیں۔ چنانچہ قاری صاحب کا یہ کہنا کہ ''مسجد کے اندر'' حی علی الصلاۃ ''اور'' حی علی الفلاح'' کے جواب میں ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' نہیں کہنا چاہیے'' صحیح نہیں اس لئے کہ حدیث میں اذان کے جواب دینے کے بارے میں مطلق آیا ہے اس میں مسجد کے اندر ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔

لمافی البخاری (۱/۸۶): عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ ﷺ قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل مایقول المؤذن...... قال یحیی وحدثنی بعض اخواننا انہ قال لما قال حی الصلاۃ قال لاحول ولاقوۃ الا باللہ وقال ھکذا سمعنا نبیکم ﷺ یقول

وفیہ أیضاً (۱/۸۶): ان ابا سعید الخدری قال لہ انی اراک تحب الغنم والبادیۃ فاذا کنت فی غنمک او بادیتک فاذنت للصلوۃ فارفع صوتک بالنداء فانہ لا یسمع مدی صوت المؤذن جن ولا انس ولا شئ الاشھد لہ یوم القیمۃ قال ابو سعید سمعتہ من رسول اللہ ﷺ.

وفی اعلاء السنن(۲/۱۴۰): .... فالذی یظهر ان المقصود هو رفع الصوت والاعلام التام اینما حصل فلا تعارض بینهما فان رفع الصوت قد حصل فی الموضعین لعدم المانع فیهما بخلاف صحن المسجد.

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۸۸): (قوله ولو کان بمسجد لا) فیه ان اجابة اللسان مندوبة عنده فالمانع من تحصیلها فی المسجد.

وفی الدر المختار(۱/۳۹۸): (فیقطع قراء ة القرآن لو) کان یقرأ (بمنزله، ویجیب) لو أذان مسجد کما یاتی (ولو بمسجد لا) لانه اجاب بالحضور وهذا متفرع علی قول الحلوانی، وأما عندنا فیقطع ویجیب بلسانه مطلقا والظاهر وجوبها باللسان لظاهر الامر فی حدیث اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل مایقول.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۴۰۷): اما رفع الصوت فلیکون ابلغ فی اعلامه واعظم لثوابه کما ذکر حدیث ابی سعید اذا کنت فی غنمک ولما رواه الخمسة الا الترمذی عن ابی هریرة ان النبی ﷺ قال المؤذن یغفر له مدّ صوته ویشهد له کل رطب ویابس الخ.

وفی فتاویٰ اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة والافتاء(۶/۶۵): ج: الاذان بمکبرات الصوت لتبلیغ من بعد وغیره لاحرج فیه لمافی ذلک من المصلحة العامة.

(۱۷) ایک مسجد کی اذان دوسری مسجد کیلئے کافی نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو قریبی مساجد ہیں کیا دونوں میں اذان دینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کسی مسجد میں اذان نہیں دی گئی تو کیا وہ گناہگار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اذان شعائر اسلام میں سے ہے۔اور ہر وہ مسجد جس میں جماعت ہوتی ہے اس میں اذان مسنون ہے لہٰذا کہیں دو قریبی مسجدیں ہوں تو ہر مسجد میں اذان دینا ضروری ہے۔ایک مسجد کی اذان دوسری مسجد کیلئے کافی نہیں۔اگر کسی مسجد میں اذان نہ دی گئی تو وہ گنہگار ہوں گے۔

لمافی الهندیة(۱/۵۴): ویکره اداء المکتوبة بالجماعة فی المسجد بغیر اذان وإقامة.

وفی الدر المختار(۱/۳۹۴،۳۹۵): (وکره ترکهما) معا (لمسافر) ولو منفرداً (وکذا ترکها) لاترکه لحضور الرفقة (بخلاف مصل) ولو بجماعة (فی بیته بمصر) اوقریة لها مسجد

وفی الشامیة تحته:(قوله ولو بجماعة) وعن ابی حنیفة: لو اکتفوا بأذان الناس اجزاء هم وقد أساءوا

فلا فرق بین الواحد والجماعة فی هذه الروایة بحر

(۱۸) مختلف جگہوں پر اذان پوری کرنے کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مؤذن کا مختلف جگہوں پر کھڑے ہوکر اذان پوری کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً……اذان میں سنت یہ ہے کہ ایک ہی جگہ پر کھڑے ہوکر دی جائے کہ چاروں طرف با سانی آواز پہنچ جائے اور بہتر یہ ہے کہ حیعلتین پر بھی دائیں بائیں طرف منہ کرتے وقت قدم ایک ہی جگہ پر رہیں، تاہم ضرورت کی بنا پر تھوڑا بہت دائیں بائیں ہونے کی بھی گنجائش ہے جیسے منارہ پر بغیر آلہ مکبر الصوت کے اذان دی جائے لیکن آج کل چونکہ آلہ مکبر الصوت پر دی جاتی ہے اس میں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہوکر اذان پوری کرنا ضروری ہے۔ اور ایک ہی اذان کا مختلف جگہوں پر اس طور پر دینا کہ اس میں ٹھہراؤ نہ ہو اور چلنے کی سی صورت پیدا ہو جائے تو یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔

لمافی الهندية (۱/۵۶): وان استدار فی صومعته عند اتساعها فحسن هكذا فی البدائع فيستدير المؤذن فی المأذنة عند الحيعلتين ويخرج رأسه من الكوة اليمنى ويقول حیّ علی الصلوٰة مرّتين ثم من الكوّة اليسرىٰ ويقول حیّ علی الفلاح مرّتين، وهذا اذا لم يتم الإعلام مع بقاء المؤذن فی مقامه.

وفی اللجنة الدائمة (۶/۵۸): يشرع للمؤذن الذی يؤذن فی غير مكرفون أن يلتفت يمينا وشمالا عند الحيعلة مع ثبوت قدمه لان ذالک ثبت من فعل مؤذن رسول الله ﷺ بحضرته ولانه ابلغ فی اسماع النداء للصلوٰة لمن بعد عن المسجد.

(۱۹) لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان دینے کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بذریعہ لاؤڈ اسپیکر اذان دینا کیسا ہے جبکہ مسجد کے آس پاس تھوڑے سے گھر ہوں اور لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آواز اذان گھروں تک پہنچ سکتی ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً……اذان سے مقصود اعلام ہوتا ہے لہٰذا اذان جتنی بلند آواز سے دی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ صورت مسئولہ میں اگرچہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے بستی والوں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے لیکن اگر لاؤڈ اسپیکر میں اذان دی جائے تو اذان کی آواز علی وجہ الکمال پہنچے گی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز جائے گی تو وہاں تک کی ہر ہر چیز قیامت کے دن گواہی دے گی۔ اس لئے لاؤڈ اسپیکر میں اذان دینا بہتر ہے۔

لمافی الهندية (۱/۵۵): والسنة ان يؤذن فی موضع عال يكون اسمع لجيرانه ويرفع صوته ولا يجهد

نفسه ......

وفيه ايضاً(صـ٥٦): ويجعل اصبعيه في اذنيه وان لم يفعل فحسن لانه ليس بسنة اصلية وانما شرع لاجل المبالغة في الاعلام.

وفي الشامية(١/٣٨٨): (ويجعل اصبعيه الخ) لقوله ﷺ لبلال رضي الله عنه اجعل اصبعيك في اذنيك فانه ارفع لصوتك وان جعل يديه على اذنيه فحسن لان أبا محذورة ؓ ضم اصابعه الاربعة ووضعها على اذنيه..... (قوله فاذانه الخ) تفريع على قوله ندبا قال في البحر والامر اى في الحديث المذكور للندب بقرينة التعليل فلذا لولم يفعل كان حسنا فان قيل: ترك السنة كيف يكون حسنا؟ قلنا ان الاذان معه احسن فاذا تركه بقي الاذان حسنا كذا في الكافي.

وفي اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء(٦/٦٥): الاذان بمكبرات الصوت لتبليغ من بعد وغيره لاحرج فيه لما في ذلك من المصلحة العامة.

(۲۰) اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر پڑھنے کے طریقے

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر کو پڑھنے کے صحیح طریقے دو (۲) ہیں۔

(۱)..... پہلے اللہ اکبر کی راء کو ساکن پڑھیں اس صورت میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط نہ ہوگا۔

(۲)..... پہلے اللہ اکبر کی راء کو فتحہ دے کر دوسرے لفظ اللہ سے ملا کر (بنیت وقف) پڑھیں اس صورت میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط ہوگا۔ نیز پہلے اللہ اکبر کی راء کو ضمہ دے کر دوسرے لفظ اللہ سے ملا کر (ہمزہ ساقط کر کے) پڑھنا خلاف سنت ہے۔

لمافي الشامية (١/٣٨٦): والاصل في اكبر تسكين الراء فحولت حركة الف اسم الله الى الراء كما في ـ آلم الله ـ وفي المغني حركة الراء فتحة وان وصل بنية الوقف ثم قيل هي حركة الساكنين ولم يكسر حفظا لتفخيم الله وقيل نقلت حركة الهمزة وكل هذا خروج عن الظاهر والصواب ان حركة الراء ضمة اعراب وليس لهمزة الوصل ثبوت في الدرج فتنقل حركتها و بالجملة الفرق بين الاذان وبين ـ آلم الله ـ ظاهر فانه ليس لـ ـ آلم الله ـ حركة اعراب اصلا وقد كانت لكلمات الاذان اعرابا إلا انه سمعت موقوفة......

وحاصلها ان السنة ان يسكن الراء من الله اكبر الاول اويصلها بالله اكبر الثانية فان سكنها كفى وان

وصلها نوى السكون فحرك الراء بالفتحة فان ضمها خالف السنة لان طلب الوقف على اكبر الاول صيره كالساكن اصالة فحرك بالفتح.

(۲۱) اذانِ فجر میں الصلوٰۃ خیرٌ من النوم کا اضافہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کب ہوا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....احادیث مبارکہ کے تتبع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ ہجرت کے پہلے سال اذان کی مشروعیت کے کچھ دنوں بعد ہوا ہے اس لئے کہ جن صحابی (حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ) کو اذان کا الہام کیا گیا ہے انہیں سے الصلوٰۃ خیر من النوم کے اضافے سے متعلق ایک حدیث مروی ہے جس میں انہوں نے اذان کی مشروعیت کا واقعہ یوں بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنا خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے پھر اذان کہنے کا حکم دیا چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان کہا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کیلئے بلانے آیا کرتے تھے ایک دفعہ صبح کی نماز کیلئے بلانے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمارہے تھے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بآوازِ بلند الصلوٰۃ خیر من النوم کہا۔ اس حدیث کے راوی حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ یہ کلمات اس وقت سے صبح کی اذان میں داخل کئے گئے ہیں۔ پس حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ اذان کی مشروعیت کے کچھ ہی دنوں بعد ہوا ہے جبکہ اذان کی مشروعیت ہجرت کے پہلے سال ہوئی ہے۔

لما في المسند الجامع(۳۰۳/۸): عن سعيد بن المسيب عن عبدالله بن زيد بن عبدربه قال لما اجمع رسول الله ﷺ ان يضرب بالناقوس يجمع للصلاة الناس وهو له كاره لموافقته النصارى طاف بي من الليل طائف وانا نائم رجل عليه ثوبان اخضران وفي يده ناقوس يحمله قال فقلت له يا عبدالله اتبيع الناقوس؟ قال وما تصنع به؟ قلت ندعوبه الى الصلوٰة قال افلا ادلك على خير من ذالك؟ قال قلت بلى قال تقول الله اكبر الله اكبر..... (الى ان قال) فاخبرته بما رأيت قال فقال رسول الله ﷺ ان هذه لرؤيا حق ان شاء الله ثم امر بالتاذين فكان بلال "رضى الله عنه" مولىٰ ابى بكر يوذن بذالك ويدعو رسول الله ﷺ الى الصلوٰة قال فجاء ه فدعاه ذات غد الى الفجر فقيل له ان رسول الله ﷺ نائم قال فصرخ بلال باعلىٰ صوته الصلاة خير من النوم قال سعيد بن المسيب فادخلت هذه الكلمة فى التاذين الى صلاة الفجر"

وفى الدر المختار(۳۸۳/۱): (سببه ابتداء اذان جبرئيل) ليلة الاسراء وإقامته حين امامته عليه الصلوة والسلام ثم رؤيا عبدالله بن زيدؓ اذان الملك النازل من السماء فى السنة الاولىٰ من الهجرة.

(۲۲) فجر کی اذان میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' رہ جائے تو کیا حکم ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذانِ فجر میں اگر ''الصلوۃ خیر من النوم'' چھوٹ جائے تو کیا اذان کو دوبارہ لوٹانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فجر کی اذان میں ''الصلوۃ خیر من النوم'' کہنا مستحب ہے۔ لہٰذا اگر ''الصلوۃ خیر من النوم'' چھوٹ جائے تو اذان کو دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

لما في الدر المختار (۱/۳۸۷): (ويقول) ندبا (بعد فلاح اذان الفجر الصلوة خير من النوم مرتين) لانه وقت نوم وفي الشامية تحته: (قوله بعد فلاح الخ) فيه رد على من يقول ان محله بعد الاذان بتمامه.

وفي الفقه على المذاهب الاربعة (۱/۳۱۲): ثم يختم بقول لا اله الا الله الا في صلوة الصبح فانه يندب ان يقول بعد حي على الفلاح "الصلوة خير من النوم" مرتين واذا تركهما صح الاذان مع الكراهة.

(۲۳) بلا عذر بیٹھ کر اذان دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اذان کیلئے کھڑا ہونا ضروری ہے یا بیٹھ کر بھی اذان دی جاسکتی ہے؟ اگر بغیر عذر کے کسی نے بیٹھ کر اذان دیدی تو کیا اعادہ واجب ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان کے الفاظ کھڑے ہوکر ادا کرنا سنت ہے اور بلا عذر بیٹھ کر اذان دینا مکروہ ہے البتہ اگر کسی نے بیٹھ کر اذان دیدی تو دوبارہ دینا ضروری نہیں۔ البتہ ایک صورت میں بیٹھ کر اذان دینا بلا کراہت درست ہے وہ یہ کہ جب کوئی شخص تنہا نماز پڑھے۔

وفي الهندية (۱/۵۴): ويكره الاذان قاعدا وان اذن لنفسه قاعدا فلابأس به.

(۲۴) کیا مؤذن گواہ کے حکم میں ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مؤذن اذان میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتا ہے تو کیا اس کا یہ اذان دینا گواہی دینے کے حکم میں ہوگا؟ اور کیا مؤذن میں بھی ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو گواہ بننے کیلئے ہوتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان دینے سے مقصود اوقات صلاۃ کیلئے اعلان کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اذان دینا گواہی کے حکم میں نہیں اور نہ شرائط

گواہی اذان دینے کیلئے ضروری ہیں۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ اذان دینے والا عادل، نیک وصالح ہو۔

لمافی الهندية (۱/۵۴): ویکره اذان الفاسق ولایعاد.

(۲۵) بچے کی اذان کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ہماری مسجد میں ایک مرتبہ بارہ سال کے بچے نے اذان دیدی تو ایک آدمی نے اذان کا اعادہ کیا یہ کہتے ہوئے کہ بچے کی اذان درست نہیں ہے، کیا اس آدمی کی بات درست ہے؟ بچے کی اذان پر اعادہ لازم ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....بارہ سال کا بچہ کیونکہ عاقل ہے اسلئے اسکی اذان درست ہے اسکا اعادہ نہیں کیا جائیگا البتہ افضل یہ ہے کہ بالغ مکلف شخص اذان دیا کرے۔

لمافی الشامية (۱/۳۹۴): واما من حیث اقامة الشعار النافية للاثم عن اهل البلدة فیصح اذان الکل سوی الصبی الذی لایعقل لان من سمعه لایعلم انه مؤذن بل یظنه یلعب بخلاف الصبی العاقل لانه قریب من الرجال ولذاعبرعنه الشارح بالمراهق.

(۲۶) کئی سالوں کی قضاء نمازں کیلئے اذان واقامت

سوال .....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کی کئی سال کی نمازیں قضاء ہوچکی ہیں اور اب وہ مستحبات بھی نہیں چھوڑنا چاہتا اگر یہ شخص ظہر کی نماز پڑھنے سے پہلے یا بعد میں قضاء نماز پڑھے تو آیا اذان کہے یا نہیں جبکہ اذان ہوچکی ہو نیز ایسے شخص کیلئے اپنی نمازوں کی قضاء بہتر ہے یا نوافل اور سنت مؤکدہ پڑھنا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں ایسے شخص کی کیونکہ کئی سال کی نمازیں فوت ہوچکی ہیں لہٰذا اسکو اختیار ہے کہ چاہے پہلے وقتی نماز پڑھے یا قضا پڑھے البتہ اگر وقت میں اتنی گنجائش ہے کہ چندفوت شدہ نمازیں ادا سے پہلے پڑھ سکتا ہے تو پہلے قضا نمازیں پڑھ لے۔ اور اس وقت میں جتنی قضا نمازیں پڑھیگا تو پہلی قضا کیلئے اذان واقامت دونوں کہے گا، باقی میں اسکو اختیار ہے چاہے تو اذان واقامت دونوں کہے یا صرف اقامت پر اکتفا کرے۔

نیز عام نوافل میں مشغول ہونے سے بہتر ہے کہ پہلے قضا نمازیں پڑھے البتہ سنن مؤکدہ وغیر مؤکدہ پڑھ لینی چاہئیں۔

لمافی مجمع الانهر (۱/۱۱۴): (وکذا) یؤذن ویقیم (لاولی الفوائت وخیر فیه للبواقی) ان شاء اذن واقام وان شاء اقام فقط، هذااذاکان فی مجلس واحدواما اذاکان فی مجالس فانه یشترط کلاهما کمافی المستصفی.

وفی التاتارخانیة(۱/۷۷۰): وفی الحجة الاشتغال بقضاء الفوائت اولی واهم من النوافل الاالسنن المعروفة وصلاة الضحی وصلاة التسبیح والصلوات التی رویت فی الاخبار.

(۴۷) قضاء نماز پڑھتے وقت اذان واقامت کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قضا نماز پڑھتے وقت اذان اور اقامت کہنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... قضاء شدہ نماز اگر ایک ہے تو اس کو پڑھتے وقت اذان واقامت پوری کہنا مسنون ہے چاہے باجماعت پڑھی جائے یا اکیلے پڑھی جائے، اگر ایک سے زائد ہیں تو سب سے پہلی نماز کیلئے اذان واقامت، دونوں کا کہنا مسنون ہے اور بقیہ میں اختیار ہے چاہے تو اذان واقامت دونوں کہے یا صرف اقامت پر اکتفا کرے یہ اس وقت ہے جب ایک ہی مجلس میں ایک سے زائد نمازیں ادا کی جائیں البتہ اگر ہر ایک نماز الگ مجلس میں ادا کرے تو پھر ہر ایک کیلئے اذان واقامت کہنا مسنون ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۵۵): ومن فاتته صلاة فی وقتها فقضاها أذن لها وأقام واحدا كان او جماعة هكذا فی المحیط وإن فاتته صلوات أذن للاولی وأقام وكان مخیرا فی الباقی إن شاء أذن وأقام وإن شاء اقتصر علی الاقامة كذا فی الهدایة وإن أذن وأقام لكل صلاة فحسن..... والتخییر فی البواقی إنما هو إذا قضاها فی مجلس واحد اما إذا قضاها فی مجالس فیشترط كلاهما.

وفی الدر المختار(۱/۳۹۰):(و) یسن أن(یؤذن ویقیم لفائتة)......(وكذا) یسنان (لاولی الفوائت) لاالفاسدة (ویخیر فیه للباقی) لوفی مجلس وفعله اولی ویقیم للكل.

(۴۸) میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان دینا شرعاً کیسا ہے؟ جائز ہے یا بدعت؟ اگر بدعت ہے تو پھر نماز کے علاوہ اور مواقع میں کیوں جواز نقل کیا جاتا ہے ان میں وجہ فرق کیا ہے؟ تفصیل سے جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان دینا شرعاً درست نہیں، فقہاء نے اسے بدعت لکھا ہے۔ اور دیگر مقامات پر نماز کے علاوہ جو اذان کا جواز فقہاء نے نقل کیا ہے (مثلاً آندھی کے وقت، زلزلہ کے وقت، آگ لگ جانے کے وقت، جنات کی سرکشی کے وقت، کسی انسان یا جانور کی بدخلقی کے وقت، غمگین کے کان میں، مرگی کی بیماری کے وقت، غصہ کے وقت، نومولود بچہ کے کان میں) ان مقامات میں بعض تو منصوص ہیں مثلاً حزن کے وقت اور بچے کے کان میں اور جو غیر منصوص مقام ہیں ان میں بعض مقامات پر اذان دینے

سے دفع مضرت مقصود ہوتی ہے اور بعض میں جلب منفعت اور ان مواقع پر اذان دینے کو عبادت بھی نہیں سمجھا جاتا، اس کے برخلاف قبر پر اذان کو عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے اور عبادت کے ثبوت کیلئے دلیل خاص کا ہونا ضروری ہے اور یہاں دلیل معدوم ہے اس لئے فقہاء نے اسے بدعت لکھا ہے۔

تنبیہ……میت کو قبر میں اتارتے وقت احادیث مبارکہ میں یہ دعا منقول ہے: ''بسم اللہ وعلی ملّة رسول اللہ'' لہٰذا اس دعاء کو پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

لمافی الشامية(۲/۲۳۵): لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن وقد صرّح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة وقال . ومن ظنّ أنّه سنة قياسا على ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب.

وفي اللجنة الدائمة(۹/۷۲): لايجوز الأذان ولا الاقامة عند القبر بعد دفن الميت ولا في القبر قبل دفنه لأن ذلک بدعة محدثة.

(۲۹) شیعوں کا اذان میں ''علی ولی اللہ'' کا اضافہ کرنا

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شیعوں کا اذان میں ''علی ولی اللہ'' وغیرہ کا اضافہ کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً……شیعوں کا اذان میں ''عَلِی وَلِیُّ اللّٰہِ'' وغیرہ کا اضافہ کرنا بدعت ہے کیونکہ احادیث مبارکہ، اقوال صحابہ اور ائمہ مجتہدین میں کسی سے بھی ان کلمات کا اضافہ کرنا ثابت نہیں اور خود فقہاء شیعہ نے بھی اسکے عدم ثبوت کی صراحت اپنی کتابوں میں نقل کی ہے۔لہٰذا اس سے بچنا شرعاً لازم ہے۔واللہ اعلم

لمافي اللجنة الدائمة (۶/۹۲): س: كيف يضع بعض المسلمين اسم علي بن ابي طالب رضي الله عنه في الاذان والاقامة وهل فعل ذلک رسول الله ﷺ واصحابه؟

ج: الاذان من العبادات والعبادات كلها توقيفية ولم يكن فيه ولا في الاقامة على عهد رسول الله ﷺ ولا على عهد خلفائه الراشدين ذكر اسم علي رضي الله عنه ولم يشرع ذلک. وانما ابتدعه الرافضة كما هو شانهم في الابتداع واهل السنة لايرون ذلک بل ينكرونه على فاعليه صيانة للتشريع الاسلامي عن البدع وحفظاله منها.

وفي الحدائق الناضرة(۷/۴۰۳): (تاليف: شيخ يوسف البحراني): قال: شيخنا الصدوق في الفقيه بعد نقل خبر ابي بكر الحضرمي وكليب الاسدي: قال: مصنف هذا الكتاب هذا هو الاذان

الصحيح لايزاد فيه ولا ينقص منه والمفوضة (لعنهم الله) قدوضعوا اخباراً وزادوا في الاذان "محمد وال محمد خير البرية" مرتين وفي بعض رواياتهم بعد "أشهد ان محمدا رسول الله" "اشهد ان عليا ولي الله" مرتين ومنهم من روى بدل ذلك "اشهد ان عليا امير المؤمنين حقا" مرتين ولاشك في ان عليا ولي الله وأنه امير المؤمنين حقا وأن محمدا وال محمد (صلوٰت الله عليهم) خير البرية ولكن ليس ذلك في اصل الاذان وانما ذكرت ذلك ليعرف بهذه الزيادة المتهمون بالتفويض المد لسون انفسهم في جملتنا.

(۳۰) تہجد کی اذان کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عرب ممالک میں عام طور سے تہجد کی اذان ہوتی ہے فجر سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے یہ کب سے شروع ہوئی یہ خلفائے راشدین کے وقت میں رائج تھی یا نہیں اگر یہ بعد میں شروع ہوئی تو کیا بدعت میں شمار ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... تہجد کیلئے اذان احناف کے ہاں ثابت نہیں یہ اذان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شروع ہوئی تھی جو بعد میں نہیں رہی اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں بھی نہیں تھی جیسا کہ طحاوی میں حضرت علقمہؒ کے اثر سے معلوم ہوتا ہے البتہ اگر کوئی تہجد کیلئے اذان دے تو یہ بدعت نہیں ہوگی کیونکہ اس کی اصل موجود ہے لیکن دینی نہیں چاہیے۔

لمافي الطحاوي(۱/۱۰۵): فهذا ابن عمر رضي الله عنهما يروي عن النبي ﷺ ماذكرنا، وهو ممن قدروى عن رسول الله ﷺ أنه قال ان بلالا ينادي بليل فكلوا واشربوا حتى ينادي ابن ام مكتوم فثبت بذلك أن ماكان من ندائه قبل طلوع الفجر مما كان مباحاله، هو لغير الصلوة وأن ماأنكره عليه اذ فعله قبل الفجر كان للصلوة...... (صـ۱۴۱) وقدروى عن علقمة من هذاشيء...... عن ابراهيم قال شيعنا علقمة الى مكة فخرج بليل فسمع مؤذنا يؤذن بليل فقال أما هذا فقد خالف سنة أصحاب رسول الله ﷺ لوكان نائما لكان خيرا له فإذا طلع الفجر أذن، فأخبر علقمة أن التأذين قبل طلوع الفجر خلاف لسنة أصحاب رسول الله ﷺ.

وفي الشامية(۱/۳۸۵): (قوله كعيد) أي ووتر وجنازة وكسوف واستسقاء وتراويح وسنن رواتب لأنها أتباع للفرائض والوتر وإن كان واجبا عنده لكنه يؤدى في وقت العشاء فاكتفى بأذانه لالكون الأذان لهما على الصحيح كما ذكره الزيلعي بحر فافهم لكن في التعليل قصور لاقتضائه سنية الأذان لما ليس تبعا للفرائض كالعيد ونحوه فالمناسب التعليل بعدم وروده في السنة تأمل.

(۳۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اَذان دینے کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خود بھی اذان دی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جی ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر کے موقع پر خود بھی اَذان دینا ثابت ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۴۰۱): الافضل کون الامام هو المؤذن وفی الضياء انه عليه الصلاة والسلام اذن فی سفر بنفسه واقام وصلى الظهر وقدحققناه فی الخزائن.

وفی الشامية تحت: (قوله الافضل الخ) أی لقول عمر رضی الله عنه لولا الخليفی لأذنت مع الامامة كما قدمناه وفی السراج ان اباحنيفة كان يباشر الاذان والاقامة بنفسه. (قوله وقد حققناه فی الخزائن) حيث قال بعد ماهنا هذا وفی شرح البخاری لابن حجر ومما يكثر السئوال عنه هل باشر النبی ﷺ الاذان بنفسه وقد اخرج الترمذی انه عليه السلام اذن فی سفر وصلى باصحابه وجزم به النووی وقواه ولكن وجد فی مسند احمد من هذا الوجه فامر بلالاً فاذن فعلم ان فی رواية الترمذی اختصارا وان معنى قوله اذن امر بلالاً كما يقال اعطى الخليفة العالم الفلانی كذا وانما باشر العطاء غيره.

وفی تقريرات الرافعی (ص۴۷): قوله (ولكن وجد فی مسند احمد من هذا الوجه الخ) ذكر السندی مانصه وفی السراج روى عقبة بن عامر قال كنت مع رسول الله ﷺ فی سفر فلما زالت الشمس اذن بنفسه واقام وصلى الظهر وقال السيوطی ظفرت بحديث آخر مرسل اخرجه سعيد بن منصور فی سننه قال اذن رسول الله ﷺ مرة فقال حيی علی الصلاة وهذه رواية لاتقبل التاويل.

(۳۲) ’’اذان کا جواب‘‘ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ میں کہ کیا اذان کا جواب دینا واجب ہے؟ اگر واجب ہو تو کیا جس مسجد کی بھی اذان ہو اُن سب کا جواب دینا لازم ہوگا یا صرف اپنی مسجد کی اذان کا جواب دینا لازم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان کا جواب بالقول مستحب ہے اور بالفعل واجب ہے یعنی جب اذان کی آواز سنائی دے تو زبان سے جواب دینا مستحب ہے اور بالفعل کا مطلب یہ ہے کہ اذان سن کر نماز کیلئے جانا واجب ہے۔ پھر زبان سے جواب میں یہ تفصیل ہے کہ اگر متعدد اذانیں ہوں تو پہلی اذان کا جواب دیا جاتا ہے محلے کی مسجد میں ہو یا کہیں اور البتہ تمام اذانوں کا جواب دینا افضل ہے۔

وفي الشامية (۱/۳۹٦): (قوله قال الحلواني ندبا الخ) ای قال الحلوانی ان الاجابة باللسان مندوبة والواجبة هي الاجابة بالقدم......

وفيه ايضاً (۱/۳۹۷): (قوله ولوتكرر) أی بان اذن واحد بعد واحد، اما لو سمعهم فی آنٍ واحد من جهات فسيأتی (قوله اجاب الاول) سواء كان مؤذن مسجده او غيره......اذا كان فی المسجد أكثر من مؤذن أذنوا واحدا بعد واحد فالحرمة للاول.

(۳۳) جمعہ کی اذان ثانی کا جواب

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی اذان جوخطبہ کے وقت ہوتی ہے اسکا جواب دینا چاہئے یا خاموش رہنا چاہئے؟ اسی طرح اس اذان کے بعد دعا پڑھی جائیگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ کی دوسری اذان کا جواب زبان سے نہیں دینا چاہیے بلکہ دل ہی میں دیدینا کافی ہے اسی طرح اس اذان کے بعد کی دعا کا ترک افضل ہے۔

لما في التاتارخانية (۲/٦۷): وفي الاوزجندي: اذا قال الخطيب: يايها الذين امنوا صلوا عليه (الاية) في الخطبة فالأصح السكوت وفي الحجة ولوسكت فهوافضل تحقيقا للانصات والذى عليه عامة مشايخنا ان على القوم ان يستمعوا للخطبة من اولها الى اخرها وقال ابو حنيفة ومحمد: واذا ذكر الله والرسول في الخطبة يجب عليهم ان يستمعوا ولم يذكر الله تعالىٰ بالثناء عليه ولم يصلوا على النبى ﷺ.

وفي الدرالمختار (۱/۳۹۹): وينبغي ان لايجيب بلسانه اتفاقافي الاذان بين يدى الخطيب وان يجيب بقدمه اتفاقافي الاذان الاول يوم الجمعة لوجوب السعى بالنص.

(۳۴) چلتے ہوئے رک کر اذان کا جواب دینا بہتر ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پیدل چلتے وقت اگر اذان سنے تو چلتا ہوا جواب دے یا ٹھہر کر؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر پیدل چلتے وقت اذان سنائی دے تو اولی وبہتر یہ ہے کہ ٹھہر کر جواب دے تاہم اگر کسی ضرورت کی بنا پر چلتے چلتے جواب دیدے تو بھی کچھ حرج نہیں۔

لمافي الهندية (۱/۵۷): سمع الاذان وهو يمشي فالاولى أن يقف ساعة ويجيب.

وفی الشامیة (۱/۳۹۷): (قوله بزازیة) کذا نقله فی النهر ولم أره فیها فلتراجع نسخة أخری نعم رأیت فیها سمع وهو یمشی فالافضل أن یقف للاجابة لیکون فی مکان واحد.

(۳۵) دورانِ وعظ یا تقریر اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دوران وعظ یا تقریر اذان شروع ہو جائے تو کیا جواب دینا لازم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر دوران وعظ یا تقریر اذان شروع ہو جائے تو جواب دینا لازم نہیں ہوگا کیونکہ وعظ اور تقریر کا مقصد مسلمانوں کو دین کی اہمیت اور دین کے احکامات سکھانا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ وعظ اور تقریر بند کر کے اذان کا جواب دیا جائے۔

لمافی الهندیة (۱/۵۷): یجب علی السامعین عند الاذان الاجابة........ولا ینبغی ان یتکلم السامع فی خلال الاذان والاقامة ولا یشتغل بقراءة القرآن ولا بشئی من الاعمال سوی الاجابة.

وفی الشامیة (۱/۳۹۶): (قوله وتعلیم علم) ای شرعی فیما یظهر ولذا عبر فی الجوهرة بقراءة الفقه (قوله بخلاف قرآن) لانه لایفوت..... بخلاف التعلم فعلی هذا لویقرأ تعلما او تعلیما لایقطع.

(۳۶) اذان کے پورا ہو جانے کے بعد جواب دینا کیسا ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان پوری ہو جانے کے بعد اذان کا جواب دینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... مستحب یہ ہے کہ اذان کا جواب اذان کے ساتھ ساتھ دیا جائے اور اگر کوئی شخص اذان کے ساتھ اذان کا جواب نہ دے سکا ہو تو اذان کے بعد جواب دے دے بشرطیکہ زیادہ وقت نہ گزرا ہو، اور اگر اذان کے بعد وقت زیادہ ہو گیا ہو تو جواب دینا شرعاً مستحب نہ ہوگا۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی الدر (۱/۲۰۱): قال فی النهر لم أره ثم اذا لم یجب حتی فرغ من تدارکه ان قصر الفصل.

وفی الدر المختار (۱/۳۹۸): ولو لم یجبه حتی فرغ لم أره وینبغی تدارکه ان قصر الفصل.

وفی الشامیة تحته: فلوسکت حتی فرغ کل الاذان ثم اجاب قبل فاصل طویل کما فی اصل سنة الاجابة کما هو ظاهر.

(۳۷) ریڈیواورٹی وی کی اذان کا جواب دیناضروری نہیں

سوال......کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر ریڈیواورٹی وی میں نماز کے وقت اذان نشر کی جاتی ہے اگر کوئی شخص یہ اذان سن لے تو اس پر اذان کا جواب دیناضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......اس اذان کا جواب دیناضروری ہے جوسنت کے مطابق ہو،سنت کے مطابق وہ اذان ہے جس میں اعلام ہو اور دینے والا سمجھ دار ہو، چنانچہ اگر ناسمجھ بچہ اذان دیتا ہے تو اس کی اذان کا جواب دیناضروری نہیں کیونکہ یہ سنت کے مطابق نہیں اور نہ لوگ اس کے کلام کا اعتبار کریں گے اس کی اذان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص پرندہ کو اذان یا سجدہ تلاوت کی آیت سکھادے اور وہ پڑھے تو اس صورت میں نہ جواب دیناضروری ہوگا اور نہ سجدہ تلاوت واجب ہوگا اسی طرح جو آواز ٹکرا کر واپس آتی ہے اس سے بھی وجوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس میں فقط اعلام ہے یہی حال ریڈیواورٹی وی کی اذان کا ہے کہ ان میں فقط اعلام ہے اور اس لیے اگر ان پر اذان آتی ہے تو اس کا جواب دیناضروری نہیں۔

لمافي نور الایضاح(صـ۶۷):واذا سمع المسنون منه امسک وقال مثله وحوقل فی الحیعلتین (حاشیہ۔ا) وقید بالمسنون من الاذان فافاد انه اذا کان علی غیر وجه السنة کاذان المرأة وغیره لاتندب له المتابعة.

وفي الشامیة(۱/۳۹۴): وروی عن الامام انه تستحب اعادة اذان المرأة وعلی هذه الروایة مشی الزیلعي وذکر في البدائع ایضاً أن أذان الصبي الذی لا یعقل لایجزی ویعاد لان ما یصدر لاعن عقل لایعتد به کصوت الطیور.

وفي الهندیة(۱/۱۳۲):ولا تجب اذا سمعها من طیر، هو المختار.

(۳۸) مرغ کی اذان پر نماز فجر پڑھنا صحیح نہیں

سوال......کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر قریب میں کوئی مسجد نہ ہوتو مرغ کی اذان پر نماز پڑھناشرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......مرغ کی آواز کو اذان سمجھنا اور صرف اسی پر اعتماد کر کے نماز فجر پڑھنا صحیح نہیں، اولاً اس لئے کہ مرغ کی آواز عرف میں اذان کہہ دیتے ہیں ورنہ حقیقت میں یہ اذان نہیں ہے۔ ثانیاً یہ بے وقت بانگ دے دیتا ہے اس کو وقت کی تعیین نہیں، ہاں اگر نماز کا وقت ہوجانے کا دوسرے قرائن سے بھی علم ہوجائے تو نماز پڑھنا صحیح ہے۔

اور اذان شرعی تو وہ مخصوص کلمات ہیں جو اذان کے وقت میں کہے جاتے ہیں اور ان کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے کہ اذان کوئی ایسا عاقل

آدمی دے کہ جس پر لوگ بھروسہ کرتے ہوں تاکہ اذان کا مقصد ''اعلام'' صحیح طور پر حاصل ہو سکے۔اور اگر مذکورہ صورت میں مسجد قریب نہیں ہے تو وقت ہو جانے پر خود اذان دے کر نماز پڑھنا چاہئے۔

لمافي الهندية(۱/۵۳): واهلية الاذان تعتمد بمعرفة القبلة والعلم بمواقيت الصلوٰة، كذا في فتاوىٰ قاضي خان. وينبغي ان يكون المؤذن رجلاعاقلا. صالحا تقياعالمابالسنة كذا في النهاية.

وفيه ايضاً(۱/۵۴): واذان الصبى الذى لايعقل لايجوز ويعاد وكذا المجنون هكذا في النهاية.

وفي الشامية (۱/۳۹۴): وذكر في البدائع ايضاً أن اذان الصبى الذى لايعقل لايجزى ويعاد، لان مايصدر لاعن عقل لايعتد به كصوت الطيور.

(۳۹) دینی کتب کا مطالعہ کرتے وقت اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دینی کتب کے مطالعے کے دوران اگر اذان کی آواز سنے تو کیا اذان کا جواب دے یا مطالعہ جاری رکھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ مطالعہ چھوڑ دے اور اذان کا جواب دے۔

لمافي الهندية(۱/۵۷): ولاينبغي ان يتكلم السامع في خلال الاذان والاقامة ولايشتغل قراءة القرآن ولا بشئ من الاعمال سوىٰ الاجابة ولوكان في القراءة ينبغي ان يقطع ويشتغل بالاستماع والاجابة.

وفي الدر المختار(۱/۳۹۶ تا ۳۹۸): (يجيب) وجوبا وقال الحلواني ندباً والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) ولوجنبا لا حائضا ونفساء وسامع خطبة وفي صلاة جنازة وجماع ومستراح واكل وتعليم علم وتعلمه بخلاف القرآن (بأن يقول) بلسانه (كمقالة) ان سمع المسنون منه وهو ما عربيا..... (ولوكان في المسجد حين سمعه ليس عليه الاجابة ولوكان خارجه اجاب) بالمشى اليه (بالقدم ولواجاب باللسان لابه لايكون مجيباً)..... (فيقطع قرأة القرآن لو) كان يقرأ (بمنزله ويجيب).

(۴۰) اذان میں اللہ اکبر کے جواب میں صرف جل جلالہ کہنے کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کے اندر اللہ اکبر کے جواب میں صرف ''جل جلالہ'' کہنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اذان کے اندر اللہ اکبر کے جواب میں صرف جل جلالہ کہنا خلاف سنت ہے، اذان کے جواب میں اذان ہی کے کلمات دہرانے چاہئیں البتہ ''حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح'' کے جواب میں ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم'' اور ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کے جواب میں ''صدقت و بررت وبالحق نطقت'' کہنا چاہئے۔

لمافي الهندية (۵۸/۱): ويجب على السامعين عند الاذان الاجابة وهي ان يقول مثل ما قال المؤذن الا في قوله حي على الصلوة حي على الفلاح فانه يقول مكان حي على الصلوة لاحول ولا قوة الا بالله العلي العظيم .... وكذا في قول المؤذن الصلاة خير من النوم لا يقول السامع مثله ولكن يقول صدقت وبررت.

وفي الطحطاوي (۱۸۸/۱): (قوله ويجيب وجوبا) على المعتمد للأمر به في قوله عليه السلام فقولوا مثل مايقول (قوله ندباً) اي إجابة اللسان مندوبة (قوله والواجب).. (قوله ولوجنبا) لأنه ثناء لا أذان.

وفي الشامية (۳۹۶/۱): (قوله من سمع الأذان) يفهم منه أنه لولم يسمع لصمم أو لبعد أنه لايجيب وهو ظاهر الحديث الآتي، إذا سمعتم الأذان" حيث علق على السماع وقد صرح بعض الشافعية بأنه الظاهر وبأنه يجيب في جميعه إذا لم يسمع الا بعضه.

(۴۱) اقامت میں ''اشهد ان محمدا رسول الله'' کے جواب میں ''ﷺ'' کہنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اقامت میں اشهد ان محمدا رسول الله کے جواب میں صرف ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اذان واقامت میں اشهد ان محمدا رسول الله کے جواب میں اشهد ان محمدا رسول الله ہی کہنا چاہئے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جیسے مؤذن کہے تم بھی ویسے کہو (بخاری شریف، ۸۶/۱) اور حیعلتین کے جواب میں (لاحول ولاقوة الا بالله) اور اقامت میں قدقامت الصلاة کے جواب میں (اقامها الله وادامها) کہو، لہٰذا اشهد ان محمدا رسول الله کے جواب میں صرف صلی اللہ علیہ وسلم کہنا صحیح نہیں۔ ہاں یوں کرسکتا ہے کہ جواب میں اشهد ان محمدا رسول الله کہہ کر تھوڑا سا توقف کرے اور پھر صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ لے۔

لمافي البخاري (۸۶/۱): عن أبي سعيد الخدري ان رسول الله ﷺ قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن.

لمافي الهندية (۵۷/۱): ويجب على السامعين عند الاذان الاجابة وهي ان يقول مثل ما قال المؤذن

الا فی قولہ حی علی الصلوۃ حی علی الفلاح فانہ یقول مکان حی علی الصلوۃ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

وفی الدر المختار (۱/۴۰۰): (ویجیب الاقامۃ) ندبا اجماعا (کالاذان) ویقول عند: قدقامت الصلاۃ اقامہا اللہ وادامہا.

(۴۲) اذانِ مغرب کے بعد مروجہ وقفے کی شرعی حیثیت اوراس دوران نفل پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔اذانِ مغرب کے بعد دورکعت نمازنفل پڑھنے کی عند الاحناف شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲)۔آج کل بہت سی مساجد میں اذان مغرب کے بعد دو یا تین منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے شرعاً اس کی اجازت کیسی ہے؟ جبکہ اس سے قبل حنفی المسلک مساجد میں یہ ترتیب نہیں تھی۔ شرعی جواب عنایت فرمائیں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداًومصلیاً......نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے پہلے دورکعت پڑھنے کا معمول بنانا مکروہ ہے اوراس کی علت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ نوافل پڑھنے کی وجہ سے مغرب کی نماز میں تاخیر لازم آتی ہے۔حالانکہ نبی علیہ السلام نے مغرب میں تعجیل کا حکم فرمایا ہے" عن مرثد بن عبداللہ قال لما قدم ابو ایوب غازیاً وعقبۃ بن عامر یومئذ علی مصر فأخر المغرب فقام الیہ ابو ایوب فقال ماھذہ الصلوۃ یا عقبۃ قال شغلنا قال أما سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لا یزال امتی بخیر أو قال علی الفطرۃ مالم یؤخروا المغرب إلی ان تشتبک النجوم"(ابوداؤد،۱/۶۰)،(ترجمہ):حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) نے ایک مرتبہ مغرب کی نماز میں تاخیر کی تو حضرت ابوایوب (رضی اللہ عنہ) کھڑے ہوگئے اور فرمایا یہ کونسی نماز ہے اے عقبہ۔حضرت عقبہ نے فرمایا ہم مشغول کردیئے گئے۔حضرت ابوایوب نے فرمایا کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ ہمیشہ رہے گی میری امت خیر پر یا آپ نے فرمایا فطرت پر، جب تک مغرب کی نماز میں تاخیر نہیں کرے گی یہاں تک کہ ستارے چمک جائیں۔

اب اگر لوگ اذانِ مغرب کے بعد نوافل پڑھنا شروع کریں تو امام لازماً ان لوگوں کا انتظار کرے گا،جس سے مغرب کی نماز میں تاخیر لازم آئے گی اور تاخیر مغرب مکروہ ہے اوراگر امام ان لوگوں کا انتظار نہیں کرتا، تو بوقت اقامت صلوٰۃ مغرب ان لوگوں کا نوافل پڑھنا لازم آئے گا یہ بھی مکروہ ہے،بظاہر اس وجہ سے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے، صلوا قبل المغرب ثم قال فی الثالثۃ لمن شاء کراھیۃ أن یتخذھا الناس سنۃ،(بخاری ،۱/۱۵۷، وابو داؤد، ۱/۱۸۲) (ترجمہ: آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ مغرب کے فرض سے پہلے نماز پڑھا کرو تیسری مرتبہ آپ نے فرمایا جس کا جی چاہے کیونکہ آپ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ اسے ضروری (سنت) سمجھ بیٹھیں)۔

اسی طرح ابوداؤد (۱/۱۸۲) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے" عن طاؤس قال سئل عبداللہ بن عمر عن الرکعتین قبل المغرب فقال ما رأیت احداً فی عهد رسول اللہ ﷺ یصلیهما"

(ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ نبی علیہ السلام کے عہد مبارک میں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ یہ دو رکعت پڑھتے)

فتح القدیر (۱/۴۴۶) میں علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طبرانی نے مسند الشامیین میں نقل کیا ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ازواج مطہرات سے سوال کیا، کہ کیا آپ نے نبی علیہ السلام کو مغرب سے پہلے رکعتین پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، سب نے کہا نہیں، صرف حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ علیہ السلام نے ایک مرتبہ میرے ہاں دو رکعت پڑھ لی، میں نے کہا یہ کونسی نماز ہے؟ آپ نے فرمایا: نسیت رکعتین قبل العصر صلیتهما الان، (ترجمہ: عصر سے پہلے میں دو رکعت پڑھنا بھول گیا تھا وہ دو رکعت میں نے ابھی پڑھ لیں)۔

فتح الباری (۲/۸۶) میں حافظ صاحبؒ نے ابراہیم نخعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ خلفاء اربعہ مغرب سے پہلے دو رکعت نہیں پڑھتے تھے۔ حافظ صاحب نے اگرچہ اس طریق کو منقطع قرار دے کر اس کا اعتبار نہیں کیا لیکن مراسیل ابراہیم نخعی محدثین کے نزدیک قابل حجت ہیں، اسی طرح مسند بزار کی ایک روایت ہے"بین کل اذانین صلوۃ الا المغرب"(ترجمہ: ہر دو اذانوں (یعنی اذان و اقامت) کے درمیان نماز ہے مغرب کے علاوہ) یعنی مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیاں نماز نہیں ہے، اس حدیث کی تخریج دار قطنی (۱/۲۷۲) نے بھی کی ہے، ان تمام نصوص، خلفاء اربعہ کے عمل اور صحابہ کرام کا ازواج مطہرات سے پوچھنا اور ان کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے پہلے رکعتیں پڑھنا مندوب نہیں بلکہ ان کو سنت سمجھنا کراہت سے خالی نہ ہوگا، اس لئے کہ نوافل پڑھنے کی وجہ سے مغرب کی نماز میں بلاضرورت تاخیر لازم آتی ہے جو کہ مکروہ ہے۔

(۲)۔ مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا وقفہ کرنا جس میں ایک آیت طویلہ کی تلاوت ہو سکے یا اس قدر جلسہ خفیفہ کرنا جو خطیب دو خطبوں کے درمیان کرتا ہے جائز ہے۔ لہذا اگر کسی عذر شرعی (لوگوں کی اکثریت کو مسبوق ہونے سے بچانے کیلئے) کی وجہ سے انتظامی اعتبار سے ایک دو منٹ کا وقفہ اذان مغرب اور اقامت کے درمیان رکھ دیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لما فی خلاصة الفتاوی (۱/۴۹): ویقعد المؤذن بین الاذان والاقامة فی جمیع الصلوات الا فی المغرب فان وصل الاقامة بالاذان ولم یفصل بینهما یکره واجمع الفقهاء رحمهم اللہ ان المؤذن لا ینفصل بین الاذان والاقامة فی المغرب بالصلوة ولکن یقوم ساکتا ساعة یسیرة ولا یجلس وعندهما یجلس جلسة خفیفة قدر ما یجلس الخطیب بین الخطبتین ویسکت عند أبی حنیفة قدر آیة طویلة او ثلث ایات قصار لو فعل کما قالا لا یکره عنده ولو فعل کما قال لا یکره عندهما.

وفی الدر المختار (۱/۳۸۹): (ویجلس بینهما) بقدر ما یحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب (الا

فی المغرب) فیسکت قائما قدر ثلاث ایات قصار ویکره الوصل اجماعاً.

وفی الشامیة تحته: (قوله فیسکت قائماً) هذا عنده وعندهما یفصل بجلسة کجلسة الخطیب والخلاف فی الافضلیة فلوجلس لایکره عنده ویستحب التحول للاقامة إلی غیر موضع الاذان. وهو متفق علیه. وتمامه فی البحر.

(۴۳) اذان کے بعد دعا کیلئے ہاتھ اٹھانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دعا بعدالاذان میں ہاتھ اٹھانے کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اذان کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اذان کے بعد دعا میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔

وفی فیض الباری(۲/۱۶۷): باب الدعاء عند النداء: والمسنون فی هذا الدعاء الا ترفع الایدی لانه لم یثبت عن النبی ﷺ رفعها. والتشبث فیه بالعمومات بعد ماورد فیه خصوص فعله ﷺ لغو.

(۴۴) اذان کے بعد کی دعا کا لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں اذان کے بعد کی دعا لاؤڈ اسپیکر پر پڑھی جاتی ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے بعض لوگ اسے بدعت کہتے ہیں؟

(۲) ..... نماز کیلئے وضو لازم ہے کیا نماز جنازہ کیلئے بھی وضو شرط ہے؟ تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... (۱)۔ اذان کے بعد کی دعا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے اور اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ البتہ اس کو لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا کئی وجوہات سے درست نہیں ہے۔ ۱) ضرورت نہ ہونے کی بناپر ۲) لوگوں کا اس کو اذان کا جز سمجھنے کے اندیشے کی بناپر ۳)۔ اس پر التزام کر کے دین کا جز سمجھنے کی بناپر وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا اذان کے بعد کی دعا کو لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ نیز اگر لاؤڈ اسپیکر پر دعا پڑھنے کو مستحب اور ثواب سمجھا جائے تو پھر یہ بدعت کے زمرہ میں آئے گا۔

(۲) جس طرح نماز کیلئے وضو شرط ہے اسی طرح نماز جنازہ کیلئے بھی وضو شرط ہے۔ ہاں اگر نماز جنازہ فوت ہونے کا خوف ہو، تو پھر امام اور ولی کے علاوہ دوسروں کیلئے تیمم کے ذریعے نماز جنازہ ادا کرنا درست ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

لمافی صحیح البخاری(۱/۸۶): باب الدعاء عند النداء: عن جابر بن عبدالله ان رسول الله ﷺ قال: من قال حین یسمع النداء اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة ات محمدا الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته، حلت له شفاعتی یوم القیامة.

وفی المشکوة المصابیح(صـ۲۷): باب الإعتصام بالکتاب والسنة: عن عائشة: قالت: قال رسول الله ﷺ: "من أحدث فی أمرنا هذا ما لیس منه فهو ردّ" متفق علیه. وعن جابر رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ أمّا بعد فإن خیر الحدیث کتاب الله وخیر الهدی هدی محمد وشر الأمور محدثاتها وکل بدعة ضلالة.

وفی البحر الرائق(۱/۲۷۴): وصحح فی التجنیس فی الإمام عدم الجواز إن کانوا ینتظرونه والأجاز

وفی الشامیة(۲/۲۰۷): (مطلب فی صلاة الجنازة) ...... وأما الشروط التی ترجع إلی المصلی فهی شروط بقیة الصلوات من الطهارة الحقیقة بدناً وثوباً ومکاناً والحکمیة. وستر العورة والإستقبال والنیة سوی الوقت.

وفی الشامیة(۱/۲۴۱): (قوله: وجاز لخوف فوت صلاة جنازة) أی ولو کان الماء قریباً. ثم اعلم أنه اختلف فیمن له حق التقدم فیها: فروی الحسن عن أبی حنیفة أنه لایجوز للولی لأنه ینتظر ولو صلّوا له حق الإعادة، وصححه فی الهدایة والخانیة وکافی النسفی. وفی ظاهر الروایة: یجوز للولیّ أیضاً، لأنّ الإنتظار فیها مکروه، وصححه شمس الأئمة الحلوانی: أی سواء انتظروه اولا، قال فی البرهان: إن روایة الحسن هنا أحسن لأن مجرّد الکراهة لایقتضی العجز المقتضی لجواز التیمم، لأنها لیست أقوی من فوات الجمعة والوقتیة مع عدم جوازه لهما، وتبعه شیخ مشایخنا المقدّسی فی شرح نظم الکنز لإبن الفصیح اهـ ملخصاً من حاشیة نوح أفندی.

(۴۵) دعاءِ وسیلہ میں "والدرجة الرفیعة" پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ اذان کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں "اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوٰة القائمة ات محمدان الوسیلة والفضیلة والدرجة الرفیعة وابعثه مقاما محمودن الذی وعدته وارزقنا شفاعته یوم القیامة انک لا تخلف المیعاد" آیا یہ دعا کہیں سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتابوں کے حوالہ جات کے ساتھ تحریر کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان کے بعد جو دعاء وسیلہ پڑھی جاتی ہے، وہ صحیح بخاری وغیرہ میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

"اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلواة القائمة ات محمدان الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودن الذی وعدته"

اور "انک لا تخلف المیعاد" کی زیادتی "السنن الکبریٰ للبیہقی" میں سند قوی سے ثابت ہے۔ البتہ "والدرجة الرفیعة" "وارزقنا شفاعته یوم القیامة" کے الفاظ جو عوام الناس کے ہاں اس دعاءِ وسیلہ میں مشہور ہیں۔ حضرات محدثین کرام کے نزدیک ان الفاظ کی کوئی اصل نہیں۔ لیکن دعاءِ وسیلہ کے آخر میں اگر کوئی ان الفاظ کی زیادتی کرے، تو اس کی گنجائش ہے، کیونکہ دیگر روایات سے ان الفاظ کے معانی کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ان الفاظ کو اس دعاءِ وسیلہ کا جزء نہ قرار دے۔

لما فی الصحیح للبخاری (۸۶/۱): حدثنا علی بن عیاش قال حدثنا شعیب بن ابی حمزة عن محمد بن المنکدر عن جابر بن عبدالله ان رسول الله ﷺ قال من قال حین یسمع النداء "اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة ات محمدان الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودن الذی وعدته حلت له شفاعتی یوم القیامة.

وفی الموضوعات الکبری (صـ۱۲۲): حدیث "الدرجة الرفیعة" فیما یقال بعد الاذان من الدعاء قال السخاوی لم أره فی شئ من الروایات.

وفی عمدة القاری (۱۲۳/۵): وفی روایة البیهقی (الذی وعدته انک لاتخلف المیعاد)

وفی الشامیة (۳۹۸/۱): وروی البخاری وغیره من قال حین یسمع النداء "اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة آت محمدان الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودان الذی وعدته حلت له شفاعتی یوم القیامة" وزاد البیهقی فی آخره "انک لا تخلف المیعاد" وتمامه فی الامداد والفتح، قال ابن حجر فی شرح المنهاج وزیادة والدرجة الرفیعة وختمه بیا ارحم الراحمین لا أصل لهما.

(۴۶) اذان کے کچھ کلمات ہوجانے کے بعد اذان کا جواب کہاں سے دے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کا جواب دینا فرض ہے یا سنت؟ اگر آدھی اذان ہوچکی ہو، اور آدھی اذان باقی ہو، اور کوئی اس کا جواب دینا چاہئے تو کیا وہ شخص از سرنو اذان کا جواب دیگا یا جہاں تک اذان ہوئی ہے وہیں سے اذان کا جواب شروع کردے۔ میں اکثر از سرنو جلدی جلدی پڑھ کر موذن کی اذان تک کا جواب ایک ساتھ دے کر پھر موذن کے الفاظ کا جواب دیتا ہوں۔ کیا میرا یہ عمل درست ہے؟ مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان کا جواب زبان سے دینا مستحب ہے اور اذان سننے کے بعد نماز کی تیاری میں لگنا اور مسجد کی طرف جانا واجب ہے، کلماتِ اذان کو مکمل سنا جائے یا بعض کلماتِ اذان کو، بہر دو صورت مکمل اذان کا جواب دیا جائیگا ہاں اگر دور ہونے کی بنا پر اذان کو نہ سن سکے تو اس صورت میں جواب دینا مسنون نہیں، پس صورت مسئولہ میں آپ کا عمل درست ہے، مگر بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب اذان شروع ہو تو موذن کے ساتھ اذان کا جواب دیا جائے۔

لمافي الدر المختار (۱/۳۹۶): (ويجيب) وجوبا وقال الحلواني ندبا والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) وفي الشامية (قوله وقال الحلواني ندبا الخ) اى قال الحلوانى ان الاجابة باللسان مندوبة والواجبة هي الاجابة بالقدم...... (ص۳۹۷) (قوله كمقالته) اى مثلها في القول.... (ص۳۹۸) (قوله لم ار الخ) البحث لصاحب البحر، وصرح به ابن حجر في شرح المنهاج حيث قال فلو سكت حتى فرغ كل الاذان ثم اجاب قبل فاصل طويل كفى في اصل سنة الاجابة كما هو ظاهر واستفيد من هذا ان المجيب لا يسبق المؤذن بل يعقب كل جملة منه بجملة منه.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۱/۷۰۲): والدليل على الاجابة: ماروى ابو سعيد ان رسول الله ﷺ قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل يقول المؤذن لكن قال المالكية المتبادر من قوله سمعتم ولو البعض خصوصاً وقد قال فقولوا مثل ما يقول ولم يقل مثل ما قال وهذا في تقديري تعسف واضح في التاويل والظاهر كما قال بعض المالكية ان يحكي الاذان كله...... (ص۷۰۳) ويجيب المؤذن سواء سمع الاذان كله ام بعضه فان لم يسمع لبعد او صمم لا تسن له الاجابة.

(۴۷) شہادتین کے وقت انگوٹھے چومنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب مؤذن اذان میں "اشهد ان محمداً رسول الله" کہتا ہے تو یہ لوگ انگوٹھے چومتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے کہ شہادتین کے وقت انگوٹھے چومنا شرعاً کیسا ہے؟ اس کا ثبوت کسی حدیث سے ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً...... اذان میں مؤذن کے شہادتین کہتے وقت ہاتھوں کے انگوٹھے چومنا اور آنکھوں پر لگانا نہ کسی روایت صحیحہ سے ثابت ہے اور نہ کسی معتبر کتاب میں ہے۔ لہٰذا اس کو عبادت سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔

لمافي فيض الباري (۲/۱۶۶): وكذالك لا اصل لتقبيل الابهامين عند الشهادتين كما شرع في بلادنا الا اثر اخرجه القاري عن ابي بكر رضي الله عنه في الموضوعات لكنه ضعيف يقرب المنكر.

وفي المقاصد الحسنة للسخاوي (ص۳۸۴): وكذاما اورده ابو العباس احمد بن ابي بكر الرداد اليماني المتصوف في كتابه "موجبات الرحمة وعزائم المغفرة" بسند فيه مجاهيل مع انقطاعه عن الخضر عليه السلام انه ممن قال حين سمع المؤذن يقول اشهد ان محمدا رسول الله، مرحبا بحبيبي وقرة عيني محمد بن عبدالله ﷺ ثم يقبل ابهاميه ويجعلهما على عينيه لم يرمد ابداً.

وفي الشامية (۱/۳۹۸): يستحب ان يقال عند سماع الأولى من الشهادة: صلى الله عليك يا

رسول الله وعند الثانية منها قرت عيني بل يارسول الله اللهم متضي بالسمع والبصر بعد وضع ظفری الابهامين على العينين فانه عليه السلام يكون قائدا له الى الجنة ..... كذا فی كنز العباد اهـ قسهتانی ونحوه في الفتاویٰ الصوفية وفي كتاب الفردوس "من قبل ظفری إبهامه عند سماع أشهد أن محمدا رسول الله في الاذن أنا قائده ومدخله في صفوف الجنة وتمامه في حواشي البحر للرملي عن المقاصد الحسنة للسخاوی وذكر ذلک الجراحی وأطال ثم قال: ولم يصح في المرفوع من كل هذا شئ.

(۴۸) اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہوجانا، بے اصل بات ہے

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے کے لوگوں میں مشہور ہے کہ اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہوجاتے ہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اذان شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ پانچوں نمازوں اور جمعہ کی نماز کیلئے اذان دینا سنت مؤکدہ ہے۔ نماز کے علاوہ بعض مواقع ایسے ہیں جن سے سلف صالحین سے اذان دینا عملاً چلا آرہا ہے۔ مثلاً جہاد کے دوران غم اور پریشانی کے وقت، غصہ کے وقت، جب مسافر راستہ بھول جائے، مرگی کے دورہ پڑجانے کے وقت، جانور یا انسان کی بدخلقی کے وقت وغیرہ ایسے مواقع پر اذان دینا جائز ہے، تاہم یہ بات کہ اذان دینے سے چوہے بھاگ جاتے ہیں اور اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہوجاتے ہیں، بے اصل بات ہے۔

لما في المبسوط للسرخسي (۱/۱۳۰): ماروی ان النبی ﷺ قال اذا اذن المؤذن ادبر الشيطان وله حصاص كحصاص الحمار فاذا فرغ رجع فاذا ثوب أدبر فاذا فرغ رجع فاذا أقام أدبر فاذا فرغ رجع وجعل يوسوس الى المصلی انه كم صلی.

وفي الشامية (۱/۳۸۵): (قوله لايسن لغيرها) ای من الصلوات والا فيندب للمولود وفي حاشية البحر للخير الرملي: رأيت في كتب الشافعية انه قديسن الآذان لغير الصلوة كما في أذن المولود والمهموم والمصروع والغضبان ومن ساء خلقه من انسان اوبهيمة وعند مزدحم الجيش وعند الحريق.

(۴۹) اذان واقامت میں فصل کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان اور جماعت میں کتنا فصل ہونا چاہئے؟ نیز اگر کوئی

بغیر فصل کے نماز پڑھ لے تو کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نمازِ مغرب کے علاوہ اذان اور اقامت کے درمیان اتنا فصل کرنا مسنون ہے کہ کھانے والا کھانے سے فارغ ہوجائے اور وضو کرنے والا اپنی حاجت سے فارغ ہوجائے یا اتنا فصل کریں جس میں چار رکعت نماز اس طریقہ پر ادا ہوسکتی ہو کہ ہر رکعت میں دس آیات پڑھ لی جائیں اور مغرب میں صرف تین چھوٹی آیات پڑھنے کی بقدر فصل کرنا مسنون ہے اور اذان واقامت میں فصل کئے بغیر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

وفی الهندیة (۱/۵۶): ویفصل بین الاذان والاقامة مقدار رکعتین او اربع یقرء فی کل رکعة نحوا من عشر آیات کذا فی الزاهدی، والوصل بین الاذان والاقامة مکروه بالاتفاق...... والاولی للمؤذن فی الصلوٰة التی قبلها تطوع مسنون او مستحب ان یتطوع بین الاذان و الاقامة...... فان لم یصل یجلس بینهما واما اذا کان فی المغرب فالمستحب ان یفصل بینهما بسکتة یسکت قائماً مقدار مایتمکن من قرآة ثلاث ایات قصار.

وفی الدر المختار (۱/۳۸۹): (ویجلس بینهما) بقدر مایحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب الا فی المغرب فیسکت قائماً قدر ثلاث ایات قصار ویکره الوصل اجماعاً.

(۵۰) مؤذن کی بغیر اجازت کسی اور کا اقامت کہنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں بعض بزرگ نمازی ایسے ہیں کہ امام کے مصلیٰ پر پہنچتے ہی مؤذن کی اجازت کے بغیر اسکی جگہ پر پہنچ کر اقامت شروع کردیتے ہیں اور بعض دفعہ مؤذن کی طرف صرف اشارہ کر دیتے ہیں کہ اقامت میں کہوں گا، مؤذن اگرچہ دل سے اجازت نہیں دیتا لیکن مروتاً خاموش رہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ مؤذن کی اجازت کے بغیر یا صرف اشارۃً اجازت لے کر اقامت کہنا کیسا ہے، نیز اقامت کہنا کس کا حق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مؤذن کی موجودگی میں اگر کوئی شخص اقامت کہے اور مؤذن کو یہ ناگوار گزرے تو دوسرے شخص کا اقامت کہنا مکروہ ہے چاہے اشارۃً بغیر رضامندی کے اجازت دیدے یا مروتاً خاموش رہے، ہاں اگر مؤذن کو یہ ناگوار نہ گزرے یا وہ رضامندی سے اجازت دیدے تو پھر کراہت بھی نہ رہے گی۔ نیز افضل یہ ہے کہ جو شخص اذان کہے وہی اقامت بھی کہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی بھی ہے کہ جو شخص اذان کہے وہ اقامت بھی کہے۔

لمافی ابی داود (۱/۷۶): حدثنا عبدالله بن مسلمة ...... انه سمع زیاد ابن الحارث الصدائی (حدیث طویل فیه) فاراد بلال ان یقیم فقال له النبی ﷺ ان اخا صداء هو اذن ومن اذن فهو یقیم قال فاقمت.

وفی الهندیة (۱/۵۴): والافضل ان یکون المؤذن هو المقیم کذا فی الکافی، وان اذن رجل واقام

اخران غاب الاول جاز من غیر کراھۃ وان کان حاضرا ویلحقہ الوحشۃ باقامۃ غیرہ یکرہ وان رضی بہ لایکرہ عندنا کذافی المحیط.

(۵۱) امام سے دور کھڑے ہو کر اقامت کہنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں مؤذن اقامت کے وقت امام کے پیچھے نہیں بالکل دور کھڑے ہو کر اقامت کہتا ہے کیا اس طرح کرنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اقامت کہنے کیلئے کوئی جگہ متعین نہیں ہے جہاں مناسب ہو اقامت کہی جاسکتی ہے، البتہ چونکہ بعض اوقات امام کی نماز کسی وجہ سے فاسد ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے نائب امام مقرر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور عام طور پر چونکہ مسجد کا مؤذن ہی نائب امام ہوتا ہے، تو اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ امام کے پیچھے صف اوّل میں اقامت کہے تاکہ فسادِ نماز کے وقت بناء کر سکے یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو جو اہل علم ہوں، امام کے قریب کھڑے ہونے کا حکم فرمایا۔ بہر حال صورت مسئولہ میں امام سے دور کھڑے ہو کر اقامت کہنا درست ہے۔ واللہ اعلم

لمافی فتح الملھم(۳/۱۰۳ ۵): قال النووی: وفی ھذا الحدیث تقدیم الافضل فالافضل الی الامام لانہ اولی بالاکرام، ولانہ ربما احتاج الامام الی استخلاف فیکون ھو اولی ولانہ یتفطن لتنبیہ الامام علی السھو لما لایتفطن لہ غیرہ ولیضبطوا صفۃ الصلاۃ ویحفظوھا وینقلوھا ویعلموھا الناس ولیقتدی بافعالھم من ورائھم.

وفی الھندیۃ(۱/۸۹): وینبغی ان یکون بحذاء الامام من ھو افضل کذا فی شرح الطحاوی.

(۵۲) میاں بیوی کی جماعت میں اذان واقامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میاں بیوی دونوں مل کر جماعت کررہے ہیں، اس صورت میں آیا اذان واقامت ہوگی؟ اور جماعت کیلئے اقامت شوہر کہے گا یا بیوی بھی کہہ سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عورت کیلئے اذان واقامت کہنا مکروہ تحریمی ہے۔ اور اگر کبھی کسی ضرورت کی بناء پر گھر میں میاں بیوی جماعت سے نماز پڑھیں۔ تو محلہ کی مسجد میں کہی گئی اذان پر اکتفاء کر لینا جائز ہے۔ البتہ اگر اذان واقامت یا صرف اقامت کہنا چاہے تو صرف شوہر ہی کہے، بیوی کیلئے اذان واقامت کہنا جائز نہیں۔

لمافی معارف السنن(۲/۲۸۷): ثم من فاتتہ الجماعۃ فی مسجدہ لہ أن یصلّی فی مسجد حیہ منفرداً أو یأتی بیتہ فیجمع بأھلہ ویصلی بھم.

وفی الشامیة(۱/۳۹۳،۳۹۴): ثم اعلم انه ذکر فی الحاوی القدسی من سنن المؤذن کونه رجلا عاقلا، صالحاً عالما بالسنن والأوقات..... وأنه یکره أذان المرأة والصبی العاقل ویجزی حتی لا یعاد لحصول المقصود وهو الاعلام وروی عن الامام انه تستحب اعادة أذان المرأة اهـ.

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۴۸): ولیس علی النساء أذان ولا إقامة..... وللرجال یکره اداء المکتوبة بالجماعة فی المسجد بغیر اذان واقامة ولا یکره فی البیوت والکروم والضیاع فإن ترکوا الاذان والإقامة جاز.

(۵۳) امام کا خود ہی اقامت کہنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام کا خود ہی اقامت کہنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....امام کا خود ہی اقامت کہنا شرعاً درست ہے لہٰذا امام خود بھی اقامت کہہ سکتا ہے۔

وفی الهندیة (۱/۵۷): وان کان المؤذن والامام واحد فان اقام فی المسجد فالقوم لایقومون مالم یفرغ من الاقامة.

(۵۴) امام اقامت کے وقت اپنا رُخ کس طرف رکھے؟

سوال... .کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد میں امام ہوں۔ایک صاحب جو کہ کافی معمر ہیں وہ بھی میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب اقامت کہی جاتی ہے تو آپ قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔حالانکہ میں نے ایک بڑے عالم کو دیکھا ہے کہ جب اقامت ختم ہونے لگتی ہے وہ تب اپنا رخ قبلہ کی طرف کرتے ہیں۔اور وجہ یہ بتائی کہ لوگوں کی طرف بلاضرورت پیٹھ کرنا درست نہیں۔آنجناب سے گزارش تھی کہ اس مسئلے کو مدلل انداز میں برادِکرم تحریری صورت میں دیدیں تاکہ جو بھی صحیح صورت ہو میں اسے اپنالوں۔

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں مذکورہ بزرگ کی بات بالکل غلط ہے کیونکہ خود ان کی پیٹھ پچھلی صف والوں کی طرف ہے تو ان کو بھی چاہیے کہ پچھلی صف والوں کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں۔لہٰذا یہ بات بے بنیاد و من گھڑت ہے۔لہٰذا امام کو چاہیے کہ اقامت شروع ہوتے ہی قبلہ رُو کھڑا ہو جائے البتہ اگر صفوں کی درستگی کیلئے مقتدیوں کی طرف رُخ کرلے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۲۰۷): یستحب للامام تسویة الصفوف یلتفت عن یمینه وشماله.

وفی الموسوعة الفقهیة (۶/۲۱۲): یسن ان یامر بتسویة الصفوف فیلتفت عن یمینه وشماله قائلا "اعتدلوا وسووا صفوفکم..... فقال ان النبی ﷺ کان اذا قام الی الصلوة اخذه بیمینه فقال: اعتدلوا .....

ثم اخذه بيساره وقال: اعتدلوا..... وفي رواية اعتدلوا في صفوفكم وتراصوا فاني اراكم من وراء ظهري.

وفي الصحيح البخاري(١٠٠/١): حدثنا انس قال اقيمت الصلاة فاقبل علينا رسول الله ﷺ بوجهه فقال اقيموا صفوفكم وتراصوا فاني أراكم من وراء ظهري.

فصل فی شروط الصلاۃ وارکانھا وواجباتھا وسننھا وآدابھا

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کا بیان)

(۵۵) نجاست غلیظہ والے کپڑوں کے ساتھ نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو رات کے وقت احتلام ہوگیا بیدار ہونے کے بعد اس نے غسل کیا اور شلوار کو دھولیا پھر نمازیں وغیرہ پڑھتا رہا دوسرے دن ظہر کی نماز سے کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا کہ شلوار کے کونے میں منی لگی ہوئی ہے تو کیا جتنی اس نے نمازیں ادا کی ہیں وہ صحیح ہوگئیں یا دوبارہ لوٹانا ضروری ہے؟ اگر لوٹانا ضروری ہے تو کیا صرف فرائض وواجبات لوٹائے جائیں گے یا سنت ونوافل بھی لوٹانا ضروری ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کپڑے پر نجاست غلیظہ اگر مقدار درہم سے زیادہ لگی ہو تو نماز نہیں ہوتی ہے اور اگر ایک درہم سے کم یا ایک درہم کے برابر لگی ہو تو اتنی مقدار معاف ہے۔ نماز ہو جاتی ہے مگر پھر بھی نجاست کا دھونا ضروری ہے پس صورت مسئولہ میں اگر درہم کی مقدار سے کم یا درہم کے برابر منی لگی ہوئی تھی تو نماز ہوگئی اعادے کی ضرورت نہیں اور اگر ایک درہم سے زیادہ لگی ہوئی تھی تو نماز نہیں ہوئی کیونکہ کپڑوں کا پاک ہونا نماز کی شرائط میں سے ہے اور مذکورہ بالا صورت میں فرائض وواجبات کا لوٹانا ضروری ہے سنت ونوافل کا لوٹانا ضروری نہیں۔

لمافی الشامیة(۱/۳۱۴): نجاسة المنی عندنا مغلظة.

وفی الدر المختار مع الشامیة(۱/۳۱۶): (وعفا) الشارع (عن قدر درهم) وان کره تحریما فیجب غسله وما دونه تنزیها فیسن وفوقه مبطل

وفی الشامیة تحته: (قوله وان کره تحریما) اشار الی ان العفو عنه بالنسبة الی صحة الصلاة به فلا ینافی الاثم کما استنبطه فی البحر من عبارة السراج.

وفی الهندیة(۱/۴۳): فلو صلی مع هذا الثوب صلوات ثم ظهر ان النجاسة فی الطرف الاخر یجب علیه اعادة الصلوات التی صلی مع هذا الثوب کذا فی الخلاصة.

(۵۶) جن کپڑوں کو کیچڑ لگ جائے ان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بارش کے دنوں میں جب ہم چلتے ہیں تو کپڑوں کو مٹی،

کیچڑ وغیرہ لگ جاتی ہے تو کیا انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر کپڑوں کو مٹی وغیرہ لگ جائے تو بوجہ عموم بلوی اور ضرورتِ شدیدہ کے حضرات فقہائے کرام نے اس کے اندر گنجائش لکھی ہے، کہ ان ہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر کپڑوں کو کوئی ایسی نجاست لگی ہو جو نظر آ رہی ہو یا ظن غالب ہو کہ اس کو نجاست لگی ہے تو ایسی صورت میں دھونا واجب ہوگا۔ نیز یاد رہے کہ یہ اجازتِ جواز اس صورت میں ہے کہ جس وقت ضرورت شدید ہو ورنہ عدم ضرورت کے وقت ایسا نہ کرنا چاہئے بلکہ احتیاط کرنی چاہئے۔

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۶۱): والطین المسرقن والردغة فی الطریق فیها نجاسة طاهرة إلا إذا رأی عین النجاسة بحر وفیه دخان النجاسة......وفی البحر ماء المطر اذا مرّعلی العذرات لاینجس إلا أن تکون العذرة أکثر من الأرض الطاهرة أو تکون العذرة عند المیزاب.

وفی الشامیة(۱/۳۲۴،۳۲۵): والحاصل : أن الذی ینبغی أنه حیث کان العفو للضرورة وعدم إمکان الإحتراز أن یقال بالعفو إن غلبت النجاسة مالم یر عینها لو أصابه بلا قصد وکان ممن یذهب ویجیئ والا فلا ضرورة، وقد حکی فی القنیة أیضاً قولین فیما لو ابتلت قد ماه ممارش فی الأسواق الغالبة النجاسة ثم نقل أنه لوأصاب ثوبه، طین السوق أو السکة ثم وقع الثوب فی الماء تنجس.

(۵۷) ناپاک گھاس پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں ایسی گھاس یا چمن میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جہاں گائے یا کتے نے پیشاب کیا ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پیشاب خشک ہو جائے اور اسکے اثرات وہاں سے زائل ہو جائیں تو نماز پڑھنا جائز ہے ورنہ نہیں۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ حکم گھاس میں اس وقت ہے جب گھاس زمین پر اُگی ہوئی ہو، اگر گھاس کاٹ دی گئی اور بعد میں ناپاک ہوگئی تو اسے پاک کرنے کیلئے دھونے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۴۴): ومنها الجفاف وزوال الاثر الارض تطهر بالیبس وذهاب الاثر للصلاة لا للتیمم ...... ولا فرق بین الجفاف بالشمس والنار والریح والظل......ویشارک الارض فی حکمها کل ما کان ثابتا فیها کالحیطان والاشجار والکلاء والقصب مادام قائما علیها فاذا قطع الحشیش والخشب والقصب واصابته النجاسة لایطهر الا بالغسل.

(۵۸) بھینسوں کے باڑے پر نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بھینسوں کا باڑہ ہے ہم نے اس کے اندر اوپر چھتے لگا دیے ہیں تاکہ ان پر نماز پڑھیں گے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ بھینس کے باڑے کے اوپر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں آپ بھینس کے باڑے کے اوپر نماز پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ جگہ پاک ہو۔

لمافی الصحیح للإمام البخاری (۶۱/۱): عن انس بن مالک قال کان النبی ﷺ یصلی فی مرابض الغنم ثم سمعته بعد یقول کان یصلی فی مرابض الغنم قبل ان ینبی المسجد.

وفی عمدۃ القاری (۱۸۲/۴): (فان قلت) مرابد البقر هل تلحق بمرابض الغنم ام بمرابد الابل (قلت) ذکر ابوبکر بن المنذر انها ملحقة بمرابد الغنم فلا تکره الصلاة فیها. (فان قلت) فی حدیث عبدالله بن عمرو من مسند احمد الحاقها بالابل کما تقدم (قلت) فی اسناده عبدالله بن لهیعة والکلام فیه مشهور.

وفی الدر المختار (۴۰۲/۱، ۴۰۳): ثم الشرط لغة العلامة اللازمة، وشرعا مایتوقف علیه الشیٔ ولا یدخل فیه (هی) ستة (طهارة بدنه) الخ...... (ومکانه) ای موضع قدمیه او احداهما ان رفع الاخری وموضع سجوده اتفاقا فی الاصح لا موضع یدیه ورکبتیه علی الظاهر الا اذا سجد علی کفه کما سیجیٔ (من الثانی) ای الخبث، لقوله تعالی. وثیابک فطهر. فبدنه ومکانه اولیٰ.

(۵۹) باریک دوپٹہ میں نماز کی ادائیگی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت باریک دوپٹہ میں نماز پڑھے جس سے سر کے بال نظر آتے ہوں تو ایسے دوپٹہ کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ اس میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں ایسے باریک دوپٹہ میں نماز درست نہیں ہے البتہ نماز کے علاوہ ایسا دوپٹہ استعمال کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تنہائی میں یا محارم اور مسلمان خواتین کے سامنے اوڑھے تو جائز ہے اسکے علاوہ جائز نہیں۔

لمافی الهندیة (۵۸/۱): والثوب الرقیق الذی یصف ماتحته لاتجوز الصلاة فیه کذافی التبیین.

وفی الشامیة (۴۰۴/۱): ثم ان الظاهر أن المرادبمایجب ستره فی الخلوة خارج الصلاة هومابین السرة والرکبة فقط حتی ان المرأة لایجب علیهاسترماعداذالک وان کان عورة. یدل علیه مافی باب الکراهیة من القنیة حیث قال: وفی غریب الروایة یرخص للمرأة کشف الرأس فی

منزلها وحدها فأولى لها لبس خمار رقيق يصف ماتحته عند محارمها.

(۶۰) سگریٹ اور نسوار کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ نماز کیلئے آتے ہیں تو سگریٹ کی ڈبی (پیکٹ) جیب سے نکال کر باہر رکھ دیتے ہیں، پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ نشہ والی اشیاء جیب میں ہوں تو نماز صحیح نہیں ہوتی۔ کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بووالی چیز جو کسی بھی مخلوق کیلئے ایذاء رسانی کا سبب بنے اگرچہ وہ فی نفسہ مباح ہی ہو، اس کا استعمال کر کے اجتماع گاہوں میں آنا جائز نہیں ہے اس پر سخت وعیدیں مذکور ہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان اشیاء کا استعمال ترک کر دیا جائے یا کم از کم نماز سے قبل ان کے استعمال سے گریز کیا جائے، چاہے اور لوگ پاس نہ بھی ہوں فرشتے تو ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں تاکہ ان کو بھی تکلیف نہ ہو، البتہ اگر ان اشیاء کو جیب میں رکھ کر نماز ادا کر لی جائے تو فقہاء کرام نے اس میں گنجائش رکھی ہے کہ نماز درست ہو جائے گی، لہٰذا صورت مسئولہ میں یہ خیال کرنا کہ ان اشیاء کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی یہ خیال غلط ہے۔

لما في الدر المختار (۲/۴۶۰): (الاصل الاباحة أو التوقف)...... قلت فيفهم منه حكم النباتات الذي شاع في زماننا المسمى بالتتن فتنبه وقد كرهه شيخنا العمادى في هديته الحاقاله بالثوم والبصل بالاولى فتدبر.

وفي الشامية تحته: فقول الشارح الحاقاله بالثوم والبصل فيه نظر اذ لايناسب كلام العمادى نعم الحاقه بما ذكر هو الانصاف قال ابو السعود فتكون الكراهة تنزيهة والمكروه تنزيها يجامع الاباحة وقال ط. ويوخذ منه كراهة التحريم في المسجد للنهي الوارد في الثوم والبصل و هو ملحق بهما.

(۶۱) وقت کے اندر تاخیر سے پڑھنے سے نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دیہاتوں میں فجر کی نماز اتنی تاخیر سے پڑھاتے ہیں کہ جیسے ہی امام سلام پھیر لیتا ہے اس کے چند منٹ بعد ہی سورج طلوع ہوتا ہے۔ کیا اتنی تاخیر سے نماز پڑھانا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نماز فجر کا وقت صبح صادق سے لے کر سورج طلوع ہونے تک ہوتا ہے اس لئے صورت مسئولہ میں اتنی تاخیر سے پڑھی ہوئی نماز درست ہو جائے گی اور ہمارے نزدیک نماز فجر اتنی تاخیر سے پڑھنا افضل ہے کہ اگر نماز پڑھنے کے بعد کسی وجہ سے نماز کو لوٹانا پڑے تو اسے مسنون قرأت (چالیس سے ساٹھ آیات پڑھنے) کے ساتھ لوٹا سکے تاہم اتنی تاخیر کرنا مناسب نہیں کہ دوران نماز

سورج کے نکل آنے کا گمان ہو۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۴۰۴): قال اصحابنا رحمهم الله الاسفار بالفجر افضل فی الازمنة کلها الاصبیحة یوم النحر للحاج بمزدلفة فان هناک التغلیس افضل الاانه لاینبغی ان یؤخر تاخیراً یقع الشک فی طلوع الشمس لانه حینئذ یقع الشک فی فساد صلوته وفی الغیاثیة والمختار انه لایؤخر تاخیرا لایمکن للمسبوق قضاء مافاته.

وفی الهندیة (۱/۵۱): وقت الفجر من الصبح الصادق وهو البیاض المنتشر فی الافق الی طلوع الشمس .... یستحب تاخیر الفجر ولا یؤخرها بحیث یقع الشک فی طلوع الشمس بل یسفربها بحیث لو ظهر فساد صلوته یمکنه ان یعیدها فی الوقت بقراء ة مستحبة.

وفی تنویر الابصار مع الدر (۱/۳۶۶): (والمستحب) للرجل (الابتداء) فی الفجر (باسفار والختم به) هو المختار بحیث یرتل اربعین آیة ثم یعیده بطهارة لوفسد وقیل یؤخر جدا لان الفساد موهوم.

(۶۲) حطیم کے اندر نماز پڑھنے والا کس طرف رخ کرے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص حطیم کے اندر نماز پڑھ رہا ہو، تو اس کیلئے کعبہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حطیم کے اندر نماز پڑھنے والے کیلئے ضروری ہے کہ عین کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے۔

لمافی الهندیة(۱/۶۳): ولو صلی مستقبلاً بوجهه الی الحطیم لایجوز.

وفی الدر المختار(۲/۴۹۵): فلوطاف من الفرجة لم یجز کاستقباله احتیاطاً.

وفی الشامیة تحته(صـ۴۹۶): (قوله کاستقباله) ای فانه اذا استقبله المصلی لم تصح صلاته لان فرضیة استقبال الکعبة ثبتت بالنص القطعی وکون الحطیم من الکعبة ثبتت بالاحاد فصار کانه من الکعبة من وجه دون وجه فکان الاحتیاط فی وجوب الطواف ورائه وفی عدم صحة استقباله.

(۶۳) چاند پر بھی نماز کے وقت جہت قبلہ کی تعیین کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آئندہ زمانے میں لوگ خلائی سفر پر کثرت سے جانا شروع ہو جائیں گے۔ جو مسلمان چاند پر پہنچ جائے تو وہ وہاں کس سمت منہ کر کے نماز پڑھے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... واضح رہے کہ قبلہ کعبہ شریف کی چاردیواری کا نام نہیں ہے۔ بلکہ قبلہ تحت الثراء سے لے کر عرش معلی تک کعبہ کے

محاذات میں بننے والے خلا کا نام ہے۔لہٰذا انسان جہاں کہیں بھی ہو، سمت قبلہ معلوم ہونے کے بعد استقبال قبلہ نماز میں ضروری ہے ورنہ تحری کر کے کسی جہت کو متعین کر کے نماز ادا کرے، لہٰذا چاند پر پہنچنے والے مسلمان کیلئے اولاً تو نماز کیلئے تعیین قبلہ ضروری ہے اور اگر باوجود سعی وکوشش کے قبلہ مشتبہ رہے تو تحری سے کسی جہت کو متعین کر کے نماز ادا کرے۔

وفی الهندية (۱/۶۳): لايجوز لاحد اداء فريضة ولا نافلة ولا سجدة تلاوة ولا صلاة جنازة الا متوجها الى القبلة كذا فى السراج والوهاج، اتفقوا على ان القبلة فى حق من كان بمكة عين الكعبة فيلزمه التوجه الى عينها كذا فى فتاوىٰ قاضى خان...... ومن كان خارجا عن مكة فقبلته جهة الكعبة وهو قول عامة المشايخ هو الصحيح هكذا فى التبيين وجهة الكعبة تعرف بالدليل والدليل فى الامصار والقرى المحاريب التى نصبها الصحابة والتابعون فعلينا اتباعهم فان لم تكن فالسوال من اهل ذالك الموضع. واما فى البحار والمفاوز فدليل القبلة النجوم هكذا فى فتاوى قاضى خان......

وفى الشامية (۱/۴۳۲): (قوله والمعتبر فى القبلة الخ) اى ان الذى يجب استقباله او استقبال جهته هو العرصة... (قوله لاالبناء) اى ليس المراد بالقبلة الكعبة التى هى البنآء المرتفع على الارض..

(قوله فهى من الارض السابعة الى العرش) صرح بذلك فى الفتاوى الصوفية معزيا للحجنة، ثم قال: فلو صلى فى الجبال العالية والآبار العميقة السافلة جاز كما جاز على سطحها وفى جوفها فتال، فلو كان المعتبر البنآء لا العرصة لم يجز ذلك، فالتفريع صحيح فافهم.

(۶۴) ہوائی جہاز میں بوقت نماز سمت قبلہ کی تعیین کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہو، اور نماز کا وقت آ جائے تو نماز کس طرح ادا کرے کیونکہ جہاز میں سمت قبلہ کا تعین صحیح طور پر نہیں ہوتا۔ نماز پڑھنے کے دوران ہی جہاز کا رخ کسی اور طرف ہوتا ہے تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟

الجواب حامداًومصلیاً......سفر کے دوران ہوائی جہاز میں جب نماز کا وقت ہو جائے تو اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قدرت ہو تو کھڑے ہو کر ورنہ بیٹھ کر ادا کرے۔ ہوائی جہاز میں بھی استقبال قبلہ ضروری ہے۔ اگر قبلہ کے رُخ کا علم نہ ہو اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو تحری (خوب سوچ بچار) کر کے نماز ادا کرے۔ اگر بالفرض بعد میں اندازہ غلط بھی معلوم ہو تو نماز صحیح ہو گی اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نیز دورانِ نماز اگر جہاز کا رخ بدل جائے تو اسے بھی چاہیے کہ اپنا رخ قبلہ کی طرف پھیر لے۔

لمافى الهندية (۱/۱۴۴): اجمعوا أنه لو كان بحال يدور رأسه لو قام تجوز الصلاة فيها قاعداً. كذا فى الخلاصة. ويلزمه التوجه إلى القبلة عند افتتاح الصلاة. كذا فى الكافى فى باب صلاة المريض.

وكلما دارت السفينة يحول وجهه إليها ولوترك تحويل وجهه إلى القبلة وهو قادر عليه لايجزيه.

وفي الدر المختار(۱۰۱/۲): (صلى الفرض في فلك) جار (قاعداً بلا عذر صحّ) لغلبة العجز (وأساء) وقالا: لايصح الا بعذر وهو الأظهر، برهان......(صـ۱۰۲) ويلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وكلما دارت.

وفي الشامية (۱۰۲/۲): (قوله ويلزم استقبال القبلة ـالخ) أى في قولهم جميعاً، بحر، وإن عجز عنه يمسك عن الصلاة، إمداد عن مجمع الروايات ولعله يمسك مالم يخف خروج الوقت لما تقرر من أن قبلة العاجز جهة قدرته، وهذا كذلك والا فما الفرق فليتأمل. وإنما لزمه الاستقبال لأنها في حقه كالبيت حتى لايتطوع فيها مومئا مع القدرة على الركوع والسجود بخلاف راكب الدابة. كذا في الكافي شرح المنية.

(٦٥) بیت اللہ سے کس قدر انحراف جائز ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کی حالت میں قبلہ سے کتنے انحراف کی گنجائش ہے؟اسی طرح اگر کوئی شخص سعودی عرب میں نماز پڑھنا چاہے تو کعبہ کے بالکل مقابل میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروری ہے یا اگر تھوڑا بہت انحراف ہوجائے تو بھی نماز ہوجائیگی؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر بیت اللہ بالکل سامنے ہو تو اسوقت کعبہ کی سمت منہ کرنا لازمی ہے اور اگر بالکل سامنے نہ ہو تو اسمیں ۴۵ درجے انحراف کی گنجائش ہے اگر اتنی مقدار کعبہ سے منحرف ہو کر نماز پڑھ لی تو نماز درست ہوگی۔

لمافي معارف السنن(۳۷۹/۳): ثم انه قدرتلك السعة في الجهة بقدرربع الدائرة وصرحوابفساد صلاة من خرج عن مقدارالربع واذن يتحمل الانحراف في الجهة عن الكعبة نفسهانحوخمس واربعين درجة كماحققه الغزالي وغيره من المحققين.

(٦٦) مسجد سے متصل مکان کی چھت پر نماز میں امام کی اقتداء کرنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا مکان مسجد سے متصل ہے اس کی سطح مسجد کے برابر متصل ہے وہ وہاں سے چھت پر کھڑے ہو کر امام کی اقتداء کرتے ہیں امام کی حرکات ان پر مشتبہ بھی نہیں ہوتی تو کیا یہ اقتداء درست ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مذکورہ میں اس شخص کی اقتداء صحیح نہیں کیونکہ چھت اگر چہ مسجد کے ساتھ متصل ہے لیکن مکان مختلف ہے اور مکان مختلف ہونے کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہوتی۔

لمافي الهندية(۱/۸۸): وإن قام على سطح داره المتصل بالمسجد لايصح اقتداءه وإن كان لا يشتبه عليه حال الامام.

وفي الدرالمختار(۱/۵۸۶): ولو اقتدى من سطح داره المتصلة بالمسجد لم يجز لاختلاف المكان.

(۶۷) ایسے شخص کی نماز کا حکم جو بعض حروف کی ادائیگی پر قادر نہ ہو

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بعض حروف کے پڑھنے پر قادر نہ ہو اور الرحیم کی جگہ الجیم پڑھے، کیا ایسے شخص کی نماز درست ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... جو شخص بعض حروف کے پڑھنے پر قادر نہ ہو تو اس کے نماز پڑھنے کی دو صورتیں ہیں، یا تو وہ شخص امام ہوگا یا منفرد، اگر امام ہے تو وہ اپنے جیسے لوگوں کی تو امامت کرسکتا ہے لیکن ان لوگوں کی امامت نہیں کرسکتا جو الفاظ درست طریقے سے پڑھنے پر قادر ہوں، اور اگر وہ تنہا نماز پڑھتا ہے تو جبتک وہ الفاظ درست طریقے سے ادا کرنے پر قادر نہیں تو ایسی صورت میں اس کا اپنی نماز اسی طرح پڑھنا جائز ہے۔

لمافي الهندية(۱/۷۹): ان ذكر حرفا مكان حرف ولم يغير المعنى بان قرأ ان المسلون ان الظالمون وما اشبه ذلك لم تفسد صلاته وان غير المعنى فان أمكن الفصل بين الحرفين من غير مشقة كالطاء مع الصاد فقرا الطالحات مكان الصالحات تفسد صلاته عند الكل وان كان لايمكن الفصل بين الحرفين الا بمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين والطاء مع التاء اختلف المشايخ قال أكثرهم لاتفسد.

وفي الشامية(۱/۲۳۳):(قوله أو بدله بآخر) هذا اما ان يكون عجزا كالالثغ وقدمنا حكمه في باب الامامة، واما ان يكون خطأ، وحينئذ فاذا لم يغير المعنى فان كان مثله في القران نحوان المسلمون لايفسد، والا نحو قيامين بالقسط، وكمثال الشارح لاتفسد عندهما وتفسد عند ابي يوسف، وان غير فسدت عندهما.......(قوله الامايشق الخ) قال في الخانية والخلاصة الاصل فيما اذا ذكر حرفا مكان حرف وغير المعنى ان امكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد والايمكن الابمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال أكثرهم لاتفسد وفي خزانة الاكمل قال القاضي ابو عاصم: ان تعمد ذلك تفسد وان جرى على لسانه اولا يعرف التمييز لاتفسد وهو المختار.

(٦٨) رکوع اور سجدہ پر قدرت کے باوجود اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کمر کی شدید بیماری میں مبتلا ہے اور یہ آدمی نماز اس طریقے سے پڑھتا ہے کہ کسی تکیہ وغیرہ کو ٹیک لگا کر اشارہ کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں حالانکہ رکوع اور سجدہ کرنے میں تکلیف زیادہ نہیں ہوتی تو کیا رکوع اور سجدے پر قدرت کے باوجود اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنا جائز ہے اگر جائز ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنے والا رکوع اور سجدہ کس طرح ادا کرے گا؟ جو بھی طریقہ شرعاً جائز ہو، مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کے جواز کیلئے ضروری ہے کہ مریض کسی بھی طرح سے کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو اگر وہ رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر ہو تو اشارہ کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرنا اس کیلئے جائز نہیں البتہ اگر رکوع اور سجدہ کرنے سے اس کی تکلیف کی زیادتی یا مرض کے بڑھ جانے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں اشارہ سے رکوع اور سجدہ کر سکتا ہے البتہ سجدہ میں بنسبت رکوع کے زیادہ جھکے گا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ مذکورہ شخص کی تکلیف اتنی زیادہ نہیں ہے کہ وہ رکوع اور سجدہ نہ کر سکے۔ اس لئے اس کیلئے اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنا جائز نہیں۔

لمافی المحیط البرهانی(۲٦/۳): الأصل فی هذا الفصل: أن المریض اذا قدر علی الصلاة قائما برکوع وسجود فانه یصلّی المکتوبة قائماً برکوع وسجود ولا یجزئه غیر ذلک، لانه لما قدر علی القیام والرکوع والسجود کان بمنزلة الصحیح، والصحیح لا یجزئه أن یصلی المکتوبة الا قائماً برکوع وسجود کذلک هذا، وان عجز عن القیام وقدر علی القعود فانه یصلی المکتوبة قاعدا برکوع وسجود ولا یجزئه غیر ذلک لانه عجز عن نصف القیام وقدر علی النصف فما قدر علیه لزمه وما عجز عنه سقط.

وفی الهندیة (۱۳٦/۱): وان عجز عن القیام والرکوع والسجود وقدر علی القعود یصلی قاعدا بایماء ویجعل السجود اخفض من الرکوع کذا فی فتاویٰ قاضیخان.

وفی الشامیة(۹۷/۲): لو قدر علی بعض القیام دون تمامه أو کان یقدر علی القیام لبعض القراءة دون تمامها یؤمر بأن یکبر قائما ویقرأ ما قدر علیه ثم یقعد إن عجز وهو المذهب الصحیح لایروی خلافه عن اصحابنا، ولو ترک هذا خفت أن لا تجوز صلاته، وفی شرح القاضی فان عجز عن القیام مستویا قالوا یقوم متکئاً لایجزئه الا ذلک وکذا لو عجز عن القعود مستویا قالوا یقعد متکئاً لا یجزئه الا ذلک.

(۶۹) دورانِ سفر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایک مرتبہ ہم سفر میں تھے ایک ساتھی نے گاڑی میں سیٹ پر بیٹھے ہوئے نیت باندھ لی اور اشارہ کے ساتھ نماز پڑھتا رہا، بعد میں جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا اسطرح نماز پڑھنا جائز ہے تو انہوں نے کہا کہ نوافل پڑھ سکتے ہیں. اب معلوم یہ کرنا ہے کہ نوافل کا حکم صرف سفر کے ساتھ خاص ہے یا گاؤں، شہر کے اندر بھی اگر کہیں جانا ہو تو گاڑی میں اس طرح نوافل پڑھ سکتے ہیں؟ نیز اسی طرح چاہے سفر ہو یا حضر گاڑی میں نوافل کے علاوہ سنتوں وغیرہ کی نیت باندھی جاسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جب کوئی شخص شہر کی حدود سے باہر نکلے (مقیم ہو یا مسافر) تو اسکے لئے دورانِ سفر بس کی سیٹ پر بیٹھ کر فجر کی سنتوں کے علاوہ بقیہ سنن اور نوافل پڑھنا درست ہے۔

وفی الشامیة(۲/۳۸): (قوله ویتنفل المقیم راکبا الخ) ای بلاعذر .اطلق النفل فشمل السنن المؤكدة الاسنة الفجر.

(۷۰) بحری جہاز میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بحری جہاز میں سفر کر رہا ہو تو ایسے شخص کی نماز کی کیا صورت ہوگی کیونکہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے تو کیا ہر صورت میں کھڑا ہونا ضروری ہے اگر نہ ہو سکے تو کیا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر بحری جہاز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مشکل ومتعذر ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

لمافی الشامیة(۲/۱۰۱):(قوله وهو الاظهر) وفی الحلیة بعدسوق الأدلة : والاظهران قولهماأشبه فلاجرم ان فی الحاوی القدسی وبه ناخذ...(قوله والافکالواقفة) ای ان لم تحر کهاالریح شدیدابل یسیرافحکمهاکالواقفة فلاتجوز الصلاة فیهاقاعدامع القدرة علی القیام کمافی الامداد.

(۷۱) چارپائی اور گدے پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چارپائی پر بلا عذر نماز پڑھنا کیسا ہے، نیز جو چیز اپنی جگہ پر نہ ٹہرتی ہو مثلاً فوم کا گدا وغیرہ اس پر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......چارپائی پر نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے بشرطیکہ وہ ٹھوس ہو، نیز ادائیگی سجدہ کے لئے ضروری ہے کہ جس

چیز پر سجدہ کیا جارہا ہے وہ کم ازکم ایسی ہو کہ جس میں کچھ نہ کچھ سختی اور حجم ہو، اس طور پر کہ نمازی اگر سجدہ کرنے میں مبالغہ کرے تو وہ چیز اس گہرائی اور اترائی سے مزید آگے نہ بڑھے اور نہ دبے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اس موٹے فوم میں اگر یہ مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہوں تو اس پر نماز پڑھنا درست ہے ورنہ نہیں۔

لما فی الشامیۃ(۱/۵۰۰): (قولہ وان یجد حجم الارض) تفسیرہ ان الساجدلوبالغ لایتسفل رأسہ ابلغ من ذالک فصح علی طنفسۃ وحصیروحنطۃ و شعیروسریروعجلۃ ان کانت علی الارض لاعلی ظہرحیوان کبساط مشدودبین الاشجارولاعلی ارزاوذرۃ ...... اوحشیش الاان وجدحجمہ ومن ھنایعلم الجوازعلی الطراحۃالقطن فان وجدالحجم جازوالافلا.

(۷۲) سر کے بال بوقت سجدہ پیشانی کے نیچے آجائیں تو نماز کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر انسان کے بال لمبے ہوں اور سجدے کے وقت وہ پیشانی کے نیچے آجائیں تو کیا اس شخص کی نماز ہو جاتی ہے؟ جبکہ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس صورت میں نماز نہیں ہوتی۔

الجواب حامداًومصلیاً..... سجدہ کی ادائیگی کی صحت میں اصل بات یہ ہے کہ پیشانی اور ناک سجدہ کرنے کی حالت میں زمین پر یا جو چیز زمین پر ہے اچھی طرح قرار پالیں، ایسا نہ ہو کہ اگر نمازی اپنے سر کو زور دے، تو سر مزید نیچے جاسکے۔ جو بال سجدے کی حالت میں پیشانی پر آجاتے ہیں تو ان بالوں کے ہوتے ہوئے پیشانی اور ناک ظاہر ہے کہ اچھی طرح قرار پالیتے ہیں۔ لہٰذا اس شخص کی نماز درست ہے۔

لما فی الدرالمختار(۱/۵۰۰): (کما یکرہ تنزیھا بکورعمامتہ) الا بعذر(وان صح عندنا (بشرط کونہ علی جبھتہ) کلھا او بعضھا کمامر. (واما اذا کان) الکور (علی رأسہ فقط وسجد علیہ مقتصراً) ای ولم تصب الارض جبھتہ ولا انفہ علی القول بہ (لا) یصح لعدم السجود علی محلہ، وبشرط طھارۃ المکان وان یجدحجم الارض، والناس عنہ غافلون.

قال فی الشامی: (قولہ وأن یجدحجم الارض) تفسیرہ ان الساجد لوبالغ لا یتسفل راسہ ابلغ من ذالک، فصح علی طنفسۃ و حصیر وحنطۃ وشعیر وسریر ...... ولا علی أرز اوذرۃ الافی جوالق او ثلج ان لم یلبدہ وکان یغیب فیہ وجھہ ولا یجد حجمہ، او حشیش الا ان وجدحجمہ، ومن ھنا یعلم الجواز علی الطراحۃ القطن، فإن وجد الحجم جاز والا فلا، بحر (قولہ والناس عنہ غافلون) ای عن اشتراط وجود الحجم فی السجود علی نحو الکور والطراحۃ کما یغفلون عن اشتراط السجود علی الجبھۃ فی کور العمامۃ.

(۷۳) مقتدی کا امام سے پہلے رکوع سے اٹھنا اور پھر امام کے ساتھ دوبارہ رکوع میں شامل ہونا

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص امام سے پہلے رکوع میں چلا گیا، اب اس کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ رکوع ہی کی حالت میں رہے، یہاں تک کہ امام بھی رکوع کرلے لیکن اگر وہ شخص امام کے رکوع کرنے سے پہلے رکوع سے کھڑا ہوگیا اور امام کے ساتھ قیام میں رہا پھر امام کے ساتھ رکوع ادا کیا، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز کے فرائض میں مقتدی کا امام کی اقتداء کرنا فرض ہے بایں معنی کہ مقتدی امام کے ساتھ رکن میں شریک ہو جائے اب صورت مسئولہ میں چونکہ مقتدی امام کے ساتھ اس رکوع کا اعادہ کرلیتا ہے لہٰذا وہ امام کے تابع اور شریک ہے اور جس عمل میں اس نے امام سے انفراد اختیار کرلیا ہے وہ ایک رکعت سے کم ہے جو کہ مفسد نماز نہیں لہٰذا اس کی یہ نماز صحیح ہے۔

لمافي الهندية (۱/۱۰۴، ۱۰۵): اذا زاد في صلاته ركوعا أو سجودا ذكر في ظاهر الرواية انها لاتفسد ...... ولو زاد فيها ركعة تامة قبل اتمام صلاته فسدت صلاته لوركع الامام وسجد سجدة ورفع رأسه عنها فجاء رجل ودخل معه وركع وسجد سجدتين فانها تفسد صلاته لانه أدخل زيادة ركعة وهو الركوع والسجود وانما تفسد الصلاة هكذا في المحيط

وفي الشامية (۱/۴۷۱): نعم تكون المتابعة فرضاً بمعنى أن يأتي بالفرض مع امامه أوبعده كما لوركع امامه فركع معه مقارنا أومعاقبا وشاركه فيه أو بعد مارفع منه فلولم يركع اصلا أو ركع ورفع قبل ان يركع امامه ولم يعده معه اوبعده بطلت صلاته.

والحاصل ان المتابعة في ذاتها ثلاثة انواع مقارنة لفعل الامام مثل ان يقارن احرامه لاحرام امامه وركوعه لركوعه وسلامه لسلامه ويدخل فيها مالوركع قبل امامه ودام حتى ادركه امامه فيه ومعاقبة لابتداء فعل امامه مع المشاركة في باقيه ومتراخية عنه.

(۷۴) تعدادِ رکعات میں نیت کی غلطی

سوال... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ظہر کی سنتیں پڑھنے کی نیت کی لیکن بجائے چار کے دو رکعات کی نیت کرلی اب وہ کتنی رکعتیں پڑھے نیز ظہر کی سنتوں کا اعادہ کرے یا نہیں؟ اسی طرح اگر سنتوں کی نیت ہی نہیں کی بلکہ نماز کی نیت کی اور تکبیر کہہ دی اور پھر چار رکعات پڑھ لیں تو آیا اسطرح ظہر کی سنتیں ادا ہو جائینگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھیں کہ سنن رواتب کو مطلق نیت صلاۃ سے ادا کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر زبان سے دل کے ارادہ کیخلاف اور الفاظ نکل جائیں تو اسکا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جب نماز پڑھتے وقت اسکی نیت

چار رکعات کی تھی اور غلطی سے دو رکعات کے الفاظ نکل گئے تو اس صورت میں چار رکعات سنتیں ہی ادا ہونگی، ہاں اگر شروع کرتے وقت دل ہی سے دو رکعات کی نیت کی تھی تو پھر دو ہی سنتیں پڑھیگا۔ اور چار رکعات دوبارہ پڑھیگا، اسی طرح اگر سنت کی نیت نہ کی بلکہ صرف نماز کی نیت کی اور چار رکعات پڑھ لیں تو بھی ظہر کی سنتیں ادا ہو جائینگی۔

لمافي الدر المختار (۱/۴۱۴): (و) الخامس (النية) بالاجماع (وهي الارادة) المرجحة لاحد المتساويين اى ارادة الصلاة لله تعالى على الخلوص، وفي (ص ۴۱۵) فلاعبرة للذكر باللسان ان خالف القلب لانه كلام لانية،

وفي الشامية تحته: (قوله ان خالف القلب) فلو قصد الظهر و تلفظ بالعصر سهوا اجزأه.

وفي الدر المختار (۱/۴۱۷): (وكفى مطلق نية الصلاة) وان لم يقل لله (لنفل وسنة) راتبة (وتراويح) على المعتمد.

(۷۵) واجباتِ نماز کی تعداد، اور قومہ اور جلسہ کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چھوٹی کتابوں (نمازِ حنفی، تعلیم الاسلام وغیرہ) میں پڑھتے چلے آرہے ہیں کہ واجبات نماز چودہ ہیں جن کے اندر انہوں نے قومہ اور جلسہ بھی شمار کیا ہے اب ہم کنز الدقائق پر پہنچے تو اس میں واجبات بارہ لکھے، قومہ اور جلسہ کو سنن صلوۃ میں شمار کیا، عبارت یہ ہے: وسننها رفع اليدين للتحريمة...... والقومة والجلسة آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے واجبات نماز کتنے ہیں، اور قومہ، جلسہ واجب ہے یا مسنون؟ اور صاحب کنز نے ان کو سنن کے اندر کس لئے ذکر کر دیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... عام طور پر فقہ کی کتابوں میں واجبات کی تعداد ۱۴ بتائی جاتی ہے اور یہ وہ واجبات ہیں جن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ورنہ واجبات اس کے علاوہ اور بھی ہیں۔ قومہ اور جلسہ کے بارے میں مذہب مشہور تو یہ ہے کہ یہ دونوں مسنون ہیں۔ لیکن متاخرین فقہاء کرام (جیسا کہ علامہ ابن ہمام اور ان کے شاگرد ابن امیر حاج، علامہ طحطاوی، علامہ حصکفی اور علامہ شامی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک وجوب راجح ہے۔ صاحب کنز نے بناء بر مذہب مشہور کے ان (یعنی قومہ اور جلسہ) کو سنن میں ذکر کیا ہے۔

لمافي البحر الرائق (۱/۵۲۳): قيد بالطمأنينة في الاركان اى الركوع والسجود لان الطمانينة في القومة والجلسة سنة عند ابى حنيفة ومحمد بالاتفاق وعند ابى يوسفؒ فرض كما تقدم وفي شرح الزاهدى مايدل على وجوبها عندهما كوجوبها في الاركان فانه قال: وذكر صدر القضاة واتمام الركوع واكمال كل ركن واجب عند ابى حنيفة ومحمد وعند ابى يوسف والشافعي فرض فكذا رفع الراس من الركوع والانتصاب والقيام والطمأنينة فيه فيجب ان يكمل الركوع حتى يطمئن كل

عضو منه ويرفع راسه من الركوع حتى ينتصب قائما ويطمئن كل عضو منه وكذا فى السجود ولو ترك شيأ من ذالك ناسيا يلزمه سجدتا السهو ولو تركها عمدا يكره أشد الكراهة ويلزمه ان يعيد الصلوة اهـ وهو يدل على وجوب القومة والجلسة وسياتى التصريح بسنيهما ومقتضى الدليل وجوب الطمأنينة في الاربعة ووجوب نفس الرفع من الركوع والجلوس بين السجدتين للمواظبة على ذالك كله وللامر فى حديث المسيئ صلاته. وفى فتاوىٰ قاضى خان فى فصل مايوجب السهو قال: المصلى إذا ركع ولم يرفع راسه من الركوع حتى خرساجدا ساهيا تجوز صلاته فى قول ابى حنيفة ومحمد وعليه السهو اهـ وفى المحيط: لو ترك تعديل الاركان او القومة التى بين الركوع والسجود ساهيا لزمه سجود السهو فيكون حكم الجلسة بين السجدتين كذالک لان الكلام فيهما واحد والقول بوجوب الكل هو مختار المحقق ابن الهمام وتلميذه ابن امير حاج حتى قال، انه الصواب والله الموفق للصواب.

وفى فتح القدير(۱/۳۰۱،۳۰۲): (قوله ثم القومة والجلسة) اى بين السجدتين سنة عندهما: اى باتفاق المشايخ بخلاف الطمانينة على ما سمعت من الخلاف وعند ابى يوسف هذه الفرائض للمواظبة الواقعة بيانا وانت علمت حال الطمانينة، وينبغى ان تكون القومة والجلسة واجبتين للمواظبة. ....وانت علمت ان مقتضى الدليل فى كل من الطمأنينة والقومة والجلسة الوجوب.

وفى التاتارخانية(۱/۵۱۰): واما واجبات الصلوة فالمذكور فى شروح المشائخ انها ستة، احداها: تعديل الاركان عند ابى حنيفة رحمهما الله وفى المغرب، والمراد بتعديل اركان الصلاة تسكين الجوارح فى الركوع والسجود والقومة بينهما والقعدة بين السجدتين.......... وهاهنا اشياء اخرهى من جملة الواجبات.

وفى الطحطاوى على الدر(۱/۲۰۷): قال الطحطاوى تحت قول الدر (وهى) على ماذكره اربعة عشر، قوله على ما ذكره) اى لابالنظر للواقع لانها كثيرة جدا.

(۷۶) نماز میں دونوں پیروں کے درمیان فاصلہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کے قیام میں دونوں پیروں کے درمیان فاصلہ کتنا ہونا چاہئے اور کیا یہ فاصلہ واجب ہے، سنت ہے، یا مستحب ہے؟ نیز پاؤں رکھنے کا صحیح طریقہ بھی بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں نماز کے قیام میں دونوں پیروں کے درمیان ہاتھ کی چار انگلیوں کے برابر فاصلہ رکھنا مستحب

ہے لیکن اگر کسی شخص کو اس میں حرج ہو تو جتنی مقدار میں نماز میں خشوع وخضوع باقی رہے اسکے لئے وہی مستحب ہے بشرطیکہ پاؤں بالکل کھلے نہ ہوں اور نہ بالکل جڑے ہوں۔

نیز پاؤں رکھنے کا صحیح اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں ورنہ مکروہ ہے۔

لمافی الشامية (۱/۴۴۴): وينبغي ان يكون بينهما مقدار اربع اصابع اليد لانه اقرب الى الخشوع. هكذا روى عن ابى نصر الدبوسى انه كان يفعله كذافى الكبرى.

وفى الدر المختار (۱/۵۰۳): (ويستقبل باطراف اصابعه رجليه القبلة ويكره ان لم يفعل) ذالك.

وفى الشامية تحته: (قوله ويكره ان لم يفعل ذالك)..... وقال الرملى فى حاشية البحر ظاهره انه سنة وبه صرح فى زاد الفقير.

(۷۷) حالت نماز میں نگاہ کہاں رکھی جائے

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نماز میں نظر ایک جگہ نہیں رکھتے ادھر ادھر گھماتے رہتے ہیں، کیا ان لوگوں کی نماز صحیح ہو جائے گی نیز نماز کی حالت میں نگاہ کہاں رکھنی چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... حالت قیام میں نگاہ سجدہ گاہ میں رکھنا اور حالت رکوع میں اپنے پاؤں پر رکھنا، اور حالت سجدہ میں اپنے ناک پر رکھنا اور حالت قعود میں اپنی گود میں رکھنا اور پہلے سلام کے وقت دائیں کندھے پر اور دوسرے سلام میں بائیں کندھے پر رکھنا مستحب ہے..... خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی حالت میں خشوع اور خضوع مستحب ہے اگر نماز میں خشوع اور خضوع نہ ہو، اور آدمی ادھر ادھر دیکھے تو اس کو حدیث میں اختلاس شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی شیطان کا نماز میں سے چوری کرنا قرار دیا گیا ہے اور اگر نماز میں التفات ہو، اور خشوع اور خضوع میں خلل نہ ہو تو یہ خلاف اولیٰ ہے۔

لمافى البخارى (۱/۱۰۴): حدثنا مسدد قال حدثنا ابو الاحوص قال حدثنا اشعث بن سليم عن ابيه عن مسروق عن عائشة قالت سالت رسول الله ﷺ عن الالتفات فى الصلوة فقال هو اختلاس يختلسه الشيطان من صلوة العبد.

وفى بدائع الصنائع (۲/۷۳): فقال يرمى ببصره الى موضع سجوده فى حالة القيام، وفى حالة الركوع الى رؤس اصابع رجليه وفى حالت السجود الى ارنبة انفه، وفى حالة القعدة الى حجره لان هذا كله تعظيم وخشوع.

وفى الهندية (۱/۷۲): (وادابها) نظره ان موضع سجوده حال القيام والى ظهر قدميه حالة الركوع

والی ارنبتہ حالۃ السجود والی حجرہ حالۃ القعود وعند التسلیمۃ الاولی الی منکبۃ الایمن وعند الثانیۃ منکبہ الایسر.

وفی الدرالمختار (۱/۴۷۷): (ولہا آداب) ترکہ لایوجب اساء ۃ ولا عتاباً کترک سنۃ الزوائد لکن فعلہ افضل (نظرہ الی موضع سجودہ حال قیامہ والی ظہر قدمیہ حال رکوعہ والی ارنبۃ أنفہ حال سجودہ والی حجرہ حال قعودہ والی منکبہ الایمن والایسر عند التسلیمۃ الأولی والثانیۃ.

وفی الفقہ الاسلامی وادلتہ(۲/۹۶۴): قال الحنفیۃ: یکرہ تنزیہا الالتفات بالعنق فقط ای بالوجہ کلہ، او ببعضہ، وببصرہ.

(۷۸) نمازی کے سامنے سے گزرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میں پنج وقتہ نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا حتی الوسع اہتمام کرتا ہوں۔ اکثر ظہر کے وقت چونکہ لنچ ٹائم ہوتا ہے اور وقت بھی کم ہوتا ہے، ہمیں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اگلی صفوں میں نماز پڑھیں تو پچھلی صفوں میں بعد میں آنے والے نمازی چونکہ دیر تک نماز پڑھتے ہیں اس وجہ سے ہمیں بیٹھا رہنا پڑتا ہے، میں نے ایک صاحب سے سنا ہے کہ ایسی مجبوری کی صورت میں کچھ فاصلے سے گزرنا صحیح ہے۔ براہ کرم آپ مجھے تفصیل سے یہ بتادیں کہ نماز پڑھنے والے کے سامنے سے کتنے گز کے فاصلے پر آدمی کو شرعاً گزرنے کی اجازت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر نمازی چھوٹی مسجد یا چھوٹے کمرے میں ہو تو اس کے سامنے سے گزرنے کی اجازت نہیں (چھوٹی مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جو کہ چالیس گز شرعی یعنی ساٹھ فٹ انگریزی سے کم ہو) البتہ اگر نمازی بڑی مسجد صحرا یا کسی میدان میں ہو اور اس کے آگے کوئی سترہ یا آڑ نہ ہو تو اصح قول کے مطابق دو صفوں کے بقدر فاصلہ چھوڑ کر آگے سے گزرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی الہندیۃ(۱/۱۰۴): والاصح انہ موضع صلاتہ من قدمہ الی موضع سجودہ کذا فی التبیین قال مشایخنا اذا صلی رامیا بصرہ الی موضع سجودہ فلم یقع بصرہ علیہ لم یکرہ وہو الصحیح.

وفی الدر المختار (۱/۶۳۴): (ومرورمارفی الصحراء أوفی مسجد کبیر بموضع سجودہ) فی الاصح أو مرورہ (بین یدیہ) الی حائط القبلۃ (فی) بیت و (مسجد) صغیر فانہ کبقعۃ واحدۃ (مطلقا).

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ ومسجد صغیر) ہو اقل من ستین ذراعاً وقیل من اربعین وہو المختار کما اشار الیہ فی الجواہر قہستانی (قولہ فانہ کبقعۃ واحدۃ) ای من حیث انہ لم یجعل الفاصل فیہ بقدر صفین مانعا من الاقتداء تنزیلا لہ منزلۃ مکان واحد بخلاف المسجد الکبیر فانہ جعل فیہ

مانعافکذاھنا یجعل جمیع مابین یدی المصلی الی حائط القبلة مکانا واحداً بخلاف المسجد الکبیر والصحراء فانه لوجعل کذلک لزم الحرج علی المارة فاقتصر علی موضع السجود.

(۷۹) نمازی کے ایک جانب سلام پھیرنے کے بعد سامنے سے گزرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نماز پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف سلام پھیرا تو اس کے سامنے سے بکر گزر گیا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنے کی جو وعید ہے اس میں بکر آئے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں زید کا ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد اس کے سامنے سے گزرنے سے بکر وعید مذکور میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ پہلا سلام تحلیل اور خروج عن الصلاۃ کیلئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام جب ایک طرف سلام پھیر لیتا ہے اس کے بعد اس کے پیچھے اقتداء صحیح نہیں ہوتی۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۵۵۲): وعن محمدؒ ان التسلیمة الثانیة تحیة للحاضرین و التسلیمة الاولی للتحیة والخروج لان من تحرم فقد غاب عن الناس ولا یکلمهم ولا یکلمونه وعند التحلیل کانه یرجع الیهم فیسلم.

وفی الدر المختار(۱/۴۶۸): وتنقضی قدوة بالاول قبل علیکم علی المشهور عندنا (وفی الشامی) (قوله وتنقضی قدوة بالاول) ای بالسلام الاول قال فی التجنیس الامام اذا فرغ من صلاته فلما قال السلام جاء رجل واقتدیٰ به قبل ان یقول علیکم لایصیر داخلا فی صلاته لان هذا سلام.

(۸۰) نماز میں تکبیرات کی حیثیت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے اور اکثر اوقات امام کے ساتھ تکبیرات نہیں کہتا اور کہتا ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہو کیا اس کا ایسا کہنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... تکبیرات نماز میں سے تکبیر تحریمہ فرض ہے اور اس کو ترک کرنے سے نماز نہیں ہوتی۔ اور تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تکبیریں سنت ہیں، ان کے ترک سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے اور نہ سجدہ سہو لازم ہوتا ہے۔ البتہ ان کے ترک کی عادت بنانا برا اور باعث گناہ ہے، لہٰذا آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ تکبیرات کی ضرورت نہیں بالکل غلط ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۶۸): (منها التحریمة) وهی شرط عندنا.

وفیه ایضا(۱/۷۲): (سننها) رفع الیدین وتکبیر الرکوع وتکبیر السجود الخ.

وفی الدرالمختار(۱/۴۴۲): (من فرائضها) التی لاتصح بدونها (التحریمة) قائما (وهی شرط) فی

غير جنازة على القادر به يفتي.

وفي الشامية تحته : (قوله التي لاتصح بدونها) صفة كاشفة اذ لاشئ من الفروض ما تصح الصلاة بدونه بلا عذر (قوله التحريمة)...... سميت بها لتحريمها الاشياء المباحة قبل الشروع بخلاف سائر التكبيرات.

وفي الدرالمختار (۱/۴۷۳،۴۷۴،۴۷۴) : (وسننها) ترك السنة لايوجب فساداً ولا سهواً بل إساءة لوعامداً غير مستخف.

وفي حاشية الطحطاوي على المراقي(۱/۲۵٦): ترك السنة لايوجب فساداً ولا سهواً بل إساءة لوعامداً غير مستخف...... ويلام على تركها مع لحوق إثم يسير اهـ.

(۸۱) تکبیر تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا واجب ہے یا سنت، میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ سنت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تکبیر تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا واجب ہے لہٰذا ''اللہ اکبر'' کے علاوہ کسی ایسے لفظ سے اگر تکبیر کہی گئی جس سے تحریمہ صحیح ہوتی ہو، جیسے ''اللہ اجل'' وغیرہ تو یہ مکروہ تحریمی ہے۔

لمافي الهندية(۱/۷۲): والذكر إن كان وجب للصلاة فانه يجهر به كتكبيرة الافتتاح.

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح(ص۲۰۴): (قوله ويكره الشروع بغيره) أي تحريماً لأنه لترك الواجب.

(۸۲) قومہ وجلسہ اور اس میں طمانیت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ جب نماز پڑھتے ہیں تو وہ رکوع کے بعد سیدھے کھڑے نہیں ہوتے، جلدی سے سجدے میں چلے جاتے ہیں یعنی قومہ صحیح نہیں کرتے۔ اسی طرح ایک سجدہ کرنے کے بعد سیدھے نہیں ہو پاتے اس سے پہلے دوسرے سجدے میں چلے جاتے ہیں یعنی جلسہ بھی صحیح نہیں کرتے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ قومہ اور جلسہ کا کیا حکم ہے ان میں طمانینت ضروری ہے یا نہیں؟ جو لوگ اس کا خیال نہیں کرتے ان کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز کے تمام ارکان رکوع وسجدہ وغیرہ کی تعدیل تو واجب ہے، قومہ اور جلسہ نماز کے رکن نہیں ہیں، اس لئے مشہور تو مذہب میں یہی ہے کہ یہ سنت ہیں، لیکن علامہ شامی اور طحطاویؒ کی تصریح کے مطابق نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ساتھ طمانینت

قومہ وجلسہ بھی واجب ہے، علامہ ابن الہمام نے بھی نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ساتھ طمانینت قومہ وجلسہ کے وجوب کو اختیار کیا ہے۔ طمانینت وتعدیل یہ ہے کہ مصلی ایک مرتبہ تسبیح کہنے کی مقدار کھڑا ہوجائے اور تمام اعضاء اپنی جگہ پر ٹھہر جائیں، لہٰذا نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ایک مرتبہ تسبیح کہنے کی مقدار طمانینت بھی قومہ اور جلسہ میں ضروری ہے اگر کسی سے بھول کر چھوٹ جائے تو سجدہ سہو واجب ہوگا، اور سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز درست ہوجائے گی اور جولوگ جان بوجھ کر قومہ اور جلسہ نہیں کرتے وہ سخت گناہ گار اور مکروہ تحریمی کے مرتکب ہیں ان کی اس طرح پڑھی گئی تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں۔

لما في الدر المختار مع الشامية(١/٤٦٤): وتعديل الاركان اى تسكين الجوارح قدر تسبيحة فى الركوع والسجود وكذا فى الرفع منهما على ما اختاره الكمال لكن المشهور ان مكمل الفرض واجب ومكمل الواجب سنة، قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ تحت قوله وتعديل الاركان هو سنة عندهما فى تخريج الجرجانى وفى تخريج الكرخى واجب حتى تجب سجدتا السهو بتركه كذا فى الهداية، وجزم بالثانى فى الكنز، والوقاية والملتقى وهو مقتضى الادلة كما يأتى قال فى البحر: وبهذا يضعف قول الجرجانى (قوله وكذا فى الرفع منهما) اى يجب التعديل ايضا فى القومة من الركوع والجلسة بين السجدتين، وتضمن كلامه وجوب نفس القومة والجلسة ايضاً لانه يلزم من وجوب التعديل فيهما وجوبهما، (قوله على ما اختاره الكمال) قال فى البحر: ومقتضى الدليل وجوب الطمانينة فى الاربعة اى فى الركوع والسجود وفى القومة والجلسة، ووجوب نفس الرفع من الركوع والجلوس بين السجدتين للمواظبة على ذالک كله وللامر فى حديث المسئ صلاته، ولما ذكره قاضى خان من لزوم سجود السهو بترک الرفع من الركوع ساهياً وكذا فى المحيط فيكون حكم الجلسة بين السجدتين كذالک لان الكلام فيهما واحد، والقول بوجوب الكل هو مختار المحقق ابن الهمام وتلميذه ابن امير حاج حتى قال انه الصواب...... وقال فى شرح المنية ولا ينبغى ان يعدل عن الدراية اى الدليل اذا وافقتها رواية على ما تقدم عن فتاوى قاضى خان، ومثله ما ذكر فى القنية من قوله: وقد شدد القاضى الصدر فى شرحه فى تعديل الاركان جميعها تشديداً بليغاً فقال: واكمال كل ركن واجب عند ابى حنيفةؒ و محمدؒ وعند ابى يوسف والشافعى (رحمهما الله) فريضة، فيمكث فى الركوع والسجود وفى القومة بينهما حتى يطمئنّ كل عضو منه، هذا هو الواجب عند ابى حنيفة ومحمد رحمه الله حتى لو تركها أو شيئاً منها ساهياً يلزمه السهو ولو عمداً يكره اشد الكراهة، ويلزمه ان يعيد الصلوة وتكون معتبرة فى حق سقوط الترتيب ونحوه كمن طاف جنباً تلزمه الاعادة، والمعتبر هو الاول كذا هذا، والحاصل ان الاصح رواية ودراية وجوب تعديل

الارکان، واما القومة والجلسة وتعدیلهما فالمشهور فی المذهب السنیة، وروی وجوبهما، وهو الموافق للادلة، وعلیه الکمال ومن بعده من المتاخرین وقد علمت قول تلمیذه إنه الصواب.

(۸۳) دورانِ برف باری جوتوں میں ادائیگی نماز کا حکم

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ برف باری کے دوران جوتوں کے ساتھ نماز پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر جوتے پاک ہیں اور سجدہ کرتے وقت جوتوں کے ساتھ پاؤں کی انگلیاں بھی زمین سے لگ جاتی ہیں تو ایسے جوتوں کے ساتھ نماز پڑھنا درست ہے۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۹۱): حدثنا علی بن حجر نا اسماعیل بن ابراهیم عن سعید بن یزید ابی سلمة قال قلت لانس بن مالک اکان رسول الله ﷺ یصلی فی نعلیه قال نعم. قال ابو عیسی حدیث انس حدیث حسن صحیح والعمل علی هذا عند اهل العلم.

وفی فتح الملهم(۴/۱۲۹): قوله: "قال: نعم" الخ: فیه جواز الصلوة فی النعال والخفاف، ای اذا تحقق طهارتها، ویتمکن معها من تمام السجود، بأن یسجد علی جمیع اصابع رجلیه، کما قاله الخطابی.

وفی الدر المختار(۱/۴۴۷): (ومنها السجود) بجبهة وقدمیه، ووضع اصبع واحدة منهما شرط.

وفی الشامیة(۱/۴۴۷): (قوله وقدمیه) یجب اسقاطه لان وضع اصبع واحدة منهما یکفی کما ذکره بعد ح وأفاد انه لو لم یضع شیأ من القدمین لم یصح السجود.

(۸۴) اگر ایک سلام پھیر لینے کے بعد کوئی شخص امام کی اقتداء کرے تو کیسا ہے؟

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام نے دائیں طرف سلام پھیرا اور ابھی بائیں طرف سلام نہیں پھیرا تھا کہ کسی نے آکر اقتداء کرلی تو کیا اس کی اقتداء کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں اقتداء درست نہیں ہے کیونکہ امام کی نماز پوری ہوچکی ہے۔

لمافی بدائع الصنائع(۱/۱۹۴، ۱۹۵): واما صفته فاصابة لفظة السلام لیست بفرض عندنا ولکنها واجبة ومن المشایخ من اطلق اسم السنة علیها وانها لاتنافی الوجوب الی أن قال أماحکمه فهو الخروج من الصلوة ثم الخروج یتعلق باحدی التسلیمتین عند عامة العلماء وروی عن محمد انه

قال التسليمة الاولىٰ للخروج والتحية والتسليمة الثانية للتحية خاصة.

وفي الشامية(۱/۴۶۸): قال في التجنيس الامام اذا فرغ من صلوته فلما قال السلام جاء رجل واقتدى به قبل ان يقول عليكم لايصير داخلا في صلوته لان هذا سلام الا ترى انه لواراد ان يسلم على أحد في صلوته ساهياً فقال السلام ثم علم فسكت تفسد صلوته.

(۸۵) نماز کی سنتیں اور احادیث طیبہ سے ان کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے الحمدللہ اب ہروقت اس کی فکر رہتی ہے کہ یہ کام سنت اور حدیث کے مطابق ہورہا ہے یانہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سنتیں تحریری طور پر بھی میرے پاس رہیں اس کے لئے میں نے کچھ سوالات بنا کر آپ کو بھیجے ہیں براہ کرم اس دفعہ آپ مجھے اتنا بتادیں کہ نماز میں کتنی چیزیں مسنون ہیں؟ اور احادیث میں ان کا ثبوت ہے یانہیں، اگر ہے تو وہ حدیث ذکر فرمادیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... سنن صلوۃ درج ذیل ہیں:

(۱)...... تکبیر تحریمہ کہتے وقت مردوں کو دونوں ہاتھ کندھوں تک اور عورتوں کو سینے تک اٹھانا۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ ابوداؤد، حماد، عبدربہ اور عاصم الاحول کی روایات بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ(۱/۲۱۶)۔

(۲)...... مردوں کو ناف کے نیچے اور عورتوں کو سینے پر ہاتھ باندھنا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ مسند احمد، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بحوالہ اعلاء السنن (۳/۳۳)۔

(۳)...... ثنا یعنی سبحانک اللھم آخر تک پڑھنا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۵۷)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ سنن دار قطنی (۱/۲۹۹)۔

(۴)...... تعوذ یعنی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ مصنف عبدالرزاق (۲/۸۶)۔

(۵)...... تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔ حضرت ابراہیم رحمہ اللہ کی روایت بحوالہ مصنف عبدالرزاق (۲/۸۷)۔

(۶)...... ایک رکن سے دوسرے رکن منتقل ہوتے وقت تکبیر کہنا۔ حضرت عکرمہ اور حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہما کی روایت بحوالہ بخاری شریف(۱/۱۰۸)۔

(۷)...... رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ اور ربنا لک الحمد کہنا۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۱۰۹)

(۸)...... رکوع میں سبحان ربی العظیم کم از کم تین مرتبہ کہنا اور اسی طرح سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کم سے کم تین مرتبہ کہنا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۶۰)۔

(۹)...... جلسہ (یعنی دونوں سجدوں کے درمیان) اور قعدہ (یعنی التحیات میں مردوں کا دایاں پاؤں کھڑا کرکے بائیں پاؤں پر بیٹھنا، عورتوں

کا دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر کولھوں پر بیٹھنا۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۱۱۴)، حضرت وائل بن حجر اور حضرت عباس بن سہل رضی اللہ عنہما کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۶۵)، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بحوالہ ابوداؤد (۱/۱۱۴)، حضرت خالد بن اللجلاج کی روایت بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۲۴۲)۔

(۱۰)......درود شریف پڑھنا۔ حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۴۷۷)۔

(۱۱)......درود شریف کے بعد دعا پڑھنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۱۱۵)۔

(۱۲)......سلام پھیرتے وقت دائیں بائیں والوں کی نیت کرنا۔ حضرت جابر بن سمرہ اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہما کی روایات بحوالہ اعلاء السنن (۱/۱۸۲)۔

(۱۳)......سلام کے وقت دائیں بائیں رخ پھیرنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۶۰)۔

نوٹ: حضرات فقہائے کرام نے کتب فقہ میں مزید سنتیں بھی ذکر کی ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔

(۸۶) آستین چڑھا کر یا صرف ناف سے گھٹنوں تک بدن چھپا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ آستین چڑھا کر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح بغیر عذر صرف ناف سے لیکر گھٹنوں تک بدن چھپا کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں آستین کہنیوں سے اوپر چڑھا کر یا بغیر عذر صرف ناف سے لیکر گھٹنوں تک بدن کو چھپا کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اگر چہ نماز ہو جائیگی۔

وفي الهندية(۱/۱۰۶): ولو صلى مع السراويل والقميص عنده يكره كذافي الخلاصة وفي الفتاوى العتابية وتكره الصلاة مع البرنس ولايكره لبسه في الحرب كذافي التاتارخانية ولو صلى رافعاكميه الى المرفقين كره كذافي فتاوى قاضي خان.

(۸۷) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ تکبیر کہتے وقت اٹھائے جائینگے یا تکبیر کے بعد یا پہلے؟ نیز بعض لوگ اپنی ہتھیلیوں کا رخ چہرے کی طرف رکھتے ہیں آیا اسطرح کرنا درست ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کے تینوں طریقے درست ہیں البتہ تکبیر سے پہلے ہاتھ اٹھانا مستحب ہے اور مرد ہاتھوں کو اتنا اٹھائے کہ انگوٹھوں کے پورے کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں جبکہ عورت اپنے ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے کیونکہ اسمیں ستر زیادہ ہے، نیز ہتھیلیوں کا رخ چہرہ کی طرف کرنا بھی جائز ہے لیکن بہتر اور مستحب یہ ہے کہ ہتھیلیوں کا رخ قبلہ کی طرف

ہونا چاہئے۔

لما فی الهندیة (۱/۷۳): قال الفقیه ابو جعفر یستقبل ببطون کفیه القبلة وینشر اصابعه و یرفعهما فاذا استقرتا فی موضع محاذاة الابهامین شحمتی الاذنین یکبر قال شمس الائمة السرخسی علیه عامة المشائخ کذافی المحیط والرفع قبل التکبیر هو الاصح. والله اعلم بالصواب.

(۸۸) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کی انگلیوں کی حالت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین میں انگلیاں کس حالت میں رہنی چاہئیں، کھلی رکھے یا ملا کر؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... تکبیر تحریمہ کے وقت انگلیوں کو نہ ہی کھولنے کی کوشش کرے نہ ملانے کی۔ بلکہ اصل حالت پر رکھ کر انگوٹھوں کو کانوں کی لو سے لگائے اور ہتھیلیوں کو قبلہ رخ کرے۔

لما فی البحر الرائق (۱/۳۰۲): قوله ونشر اصابعه وکیفیته ان لا یضم کل الضم ولا یفرج کل التفریج بل یترکها علی حالها منشورة کذا ذکره الشارح والظاهر أن المراد بالنشر عدم الطی بمعنی انه لیس له ان یرفعهما منصوبتین لا مضمومتین حتی تکون الاصابع مع الکف مستقبلة القبلة ومن السنن ان لا یطاطئ رأسه عند التکبیر کمافی المبسوط.

وفی الدر المختار (۱/۴۷۴): (رفع الیدین للتحریمة) فی الخلاصة ان اعتاد ترکه اثم (ونشر الاصابع) ای ترکها بحالها.

قال الشامی رحمه الله تحته: (قوله ای ترکها بحالها) قال فی الحلیة ظن بعضهم انه اراد بالنشر تفریج الا صابع وهو غلط بل أراد به النشر عن الطی یعنی برفعها منصوبتین لا مضمومتین حتی تکون الاصابع مع الکشف مستقبلة للقبلة ثم لا یخفی انه لا تتوقف السنة علی ضم الاصابع اولا بل لو کانت منشورة غیر متفرجة کل التفریج ولا مضمومة کل الضم ثم رفعها کذلک مستقبلا بهما القبلة فقد اتی بالسنة.

(۸۹) تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنے کا طریقہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نیت کرتے وقت ہاتھ کہاں تک اٹھانا مسنون ہے؟ اور کہاں باندھنا مسنون ہے؟ نیز اقامت کے دوران یا رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا یا کسی بڑے کے سامنے ہاتھ باندھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کو دونوں کانوں تک اسطرح اٹھائیں کہ دونوں انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں اسکے بعد دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر ناف کے نیچے ہاتھ باندھ لیں۔ نیز دورانِ اقامت اور رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا ثابت نہیں ہے، جبکہ کسی بڑے کے سامنے ہاتھ تعظیماً باندھ کر کھڑا ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اسلئے کہ تعظیماً ہاتھ باندھنا عبادت کیلئے ہوتا ہے جیسے نماز میں، اور غیر اللہ کی اس طور پر تعظیم جائز نہیں۔

لمافي الهندية (۱/۷۳): وكيفيتهااذااراد الدخول في الصلاة كبرورفع يديه حذاء اذنيه حتى يحاذي بابهاميه شحمتي اذنيه وبرؤس الاصابع فروع اذنيه....(ووضع يده اليمنى على اليسرى تحت السرة) كمافرغ من التكبير.....وكل قيام ليس فيه ذكر مسنون كمافي تكبيرات العيدين فالسنة فيه الارسال كذا في النهاية وهو الصحيح، كذا في الهداية ..... ويرسل اتفاقا في قومة الركوع اذا لذكرسنة الانتقال لاالقومة...

وفيه ايضاً (۳۶۸/۵): والتواضع لغير الله حرام...تجوزالخدمة لغير الله تعالى بالقيام واخذاليدين والانحناء..... ان قبل يد عالم اوسلطان عادل لعلمه وعدله لابأس به ..... وان قبل يدغير عالم وغير السلطان العادل إن ارادبه تعظيم المسلم واكرامه فلابأس به وان ارادبه عبادة له اولينال منه شيئامن عرض الدنيافهومكروه.

(۹۰) تکبیر تحریمہ کہکر ہاتھ باندھے بغیر فوراً رکوع میں چلے جانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو کہ پنج وقتہ نمازی ہیں کہ جب وہ نماز کیلئے مسجد میں آئے تو امام صاحب رکوع میں تھے، ان صاحب نے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور بغیر باندھے رکوع میں چلے گئے کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ اور شرعاً ایسی صورت میں کیا کرنا بہتر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص نے تکبیر تحریمہ قیام کی حالت میں کہی ہے اس لئے اس کی نماز درست ہے تکبیر تحریمہ کا قیام یا قیام کے قریب حالت میں کہنا فرض ہے نیز تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنا مسنون ہے البتہ اگر نمازی کو تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ کر اور ثناء پڑھ کر امام کے ساتھ شامل ہونے کی صورت میں رکعت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں ہاتھ باندھے بغیر اور ثناء کو چھوڑ کر امام کے ساتھ شریک ہو سکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ کر امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے۔

لمافي الهندية(۱/۹۱): وان أدرك الامام في الركوع أو السجود يتحرى ان كان أكبر رأيه أنه لو أتى به أدركه في شي من الركوع أو السجود يأتي به قائماً والايتابع الامام ولا يأتي به واذا لم يدرك الامام في الركوع او السجود لاياتي بهما وان ادرك الامام في القعدة لايأتي بالثناء بل يكبر

للافتتاح ثم للانحطاط ثم يقعد.

وفي الدر المختار (۱/۴۸۰): ويشترط كونه (قائماً) فلو وجد الامام راكعا فكبر منحنياً ان الى القيام أقرب صح.

(۹۱) تکبیرِ اولیٰ کی فضیلت کب تک حاصل ہوسکتی ہے؟

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیرِ اولیٰ کا ثواب کب تک رہتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... تکبیرِ اولیٰ کا ثواب راجح قول کے مطابق پہلی رکعت کے حاصل ہونے تک رہتا ہے۔

لما في الهندية (۱/۶۹): أما فضيلة تكبيرة الإفتتاح فتكلموا في وقت إدراكها والصحيح أن من ادرك الركعة الأولى فقد أدرك فضيلة تكبيرة الافتتاح.

وفي الشامية (۱/۵۲۶): وتظهر فائدة الخلاف في وقت إدراك فضيلة تكبيرة الإفتتاح فعنده بالمقارنة، وعندهما إذا كبر في وقت الثناء وقيل بالشروع قبل قراءة ثلاث آيات لو كان المقتدى حاضراً وقيل سبع، لو غائبا وقيل بإدراك الركعة الأولى، وهذا أوسع وهو الصحيح اهـ وقيل بادراك الفاتحة، وهو المختار. خلاصة.

(۹۲) ناف سے نیچے ہاتھ باندھنے اور عدمِ رفع یدین کے ثبوت پر ایک تفصیلی فتویٰ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہے؟ اور کیا کسی حدیث میں عدمِ رفع یدین ثابت ہے؟ احادیث سے مسئلہ کو واضح فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جی ہاں احادیث مبارکہ میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہے۔ چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ (۳/۳۲۰، طبع ادارۃ القرآن) میں ہے: عن علقمة بن وائل بن حجر عن أبيه قال رأيت رسول الله ﷺ وضع يمينه على شماله في الصلوة تحت السرة.

(ترجمہ): حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ نے نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھا ہوا تھا۔

اسی طرح مسند امام احمد (۱/۱۷۷) میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے جو دارقطنی (۱/۲۸۹) اور بیہقی (۲/۳۱) اور ابوداؤد مع بذل المجہود (۲/۲۳)، المنهل العذب المورود شرح ابوداؤد (۳/۱۲۳، حصہ ۵)، وابوداؤد طبع دار ابن حزم (۱/۲۳۸)، شرح العینی لابی داؤد (۳/۳۳۷) اور مصنف لابن ابی شیبۃ (۳/۲۲۴)، اسی طرح حضرت ابوہریرۃ کی روایت ابوداؤد مع البذل (۲/۲۳)، المنهل العذب

المورود (۳/۱۶۳، حصہ ۵) وابوداؤد طبع دار ابن حزم (۱/۲۳۸) میں موجود ہے جس کو ابن حزم نے محلی بالآ ثار (۳/۳۰) میں بھی نقل فرمایا ہے۔ اور مغنی لابن قدامۃ (۱/۵۱۵) اور المجموع للنووی (۳/۲۵۹) میں بھی ہے اور امام اعظم، سفیان ثوری، ابومجلز، ابراہیم نخعی، اسحاق بن راہویہ، ابواسحاق مروزی شافعی، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں۔

(۲)۔ باقی رہا عدم رفع یدین تو خوب سمجھ لیا جائے کہ احناف عدم رفع یدین کے قائل نہیں بلکہ ترک رفع یدین کے قائل ہیں یعنی پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین، رکوع اور سجود میں جاتے وقت اور رکوع اور سجود سے اٹھتے وقت فرماتے تھے پھر رکوع اور سجود کے وقت رفع یدین کو ترک کر دیا صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے اس کے بعد رکوع اور سجود کے وقت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بالکل واضح ہے: عن ابن مسعود الا اصلی بکم صلاۃ رسول اللہ ﷺ فصلی فلم یرفع یدیہ الامرۃ، ترمذی (۱/۵۹) وفی النسائی (۲/۱۸۲) فرفع یدیہ اول مرۃ ثم لم یعد، وفی ابی داؤد (۱/۱۰۹)، مسند احمد (۱/۴۴۱) یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والی نماز نہ پڑھاؤں؟ تو آپ نے نماز پڑھائی اور صرف پہلی مرتبہ ہاتھ اٹھائے پھر نہیں اٹھائے۔

اسی طرح حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث ابوداؤد (۱/۱۰۹) میں ہے، جس کو امام طحاوی نے شرح معانی الآ ثار (۱/۱۶۳) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۴۱۴) اور مصنف عبدالرزاق (۲/۷۲) اور دارقطنی (۱/۲۹۵) نے نقل کیا ہے۔

قال: کان النبی ﷺ اذا کبر لا فتتاح الصلوۃ رفع یدیہ...... ثم لا یعود۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر تحریمہ کہتے تو ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نہیں اٹھاتے تھے، اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث دارقطنی نے (۱/۲۹۵) اور بیہقی نے نقل فرمائی۔ عن عبداللہ قال صلیت مع النبی ﷺ ومع ابی بکر ومع عمر رضی اللہ عنہما فلم یرفعوا ایدیھم الا عند التکبیرۃ الاولیٰ فی افتتاح الصلوۃ. یعنی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی وہ حضرات صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا عمل منقول ہے چنانچہ شرح معانی الآ ثار (۱/۱۶۳) اور مشکل الآ ثار (۱۵/۵۰) مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۸) میں ہے: عن الاسود قال رأیت عمر بن الخطاب یرفع یدیہ فی اول تکبیرۃ ثم لا یعود یعنی میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھائے پھر نہیں اٹھائے۔

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مؤطا میں امام محمد نے نقل کیا جس کو طحاوی نے شرح معانی الآ ثار (۱/۱۶۳) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۶) نے نقل کیا اور مسند الامام زید میں بھی (صفحہ ۸۹) میں مذکور ہے: واللفظ لہ حدثنی زید بن علی عن أبیہ عن جدہ عن علی رضی اللہ عنہ انہ کان یرفع یدیہ فی التکبیرۃ الاولی الی فروع اذنیہ ثم لا یرفعھما حتی یقضی صلاتہ یعنی سیدنا زید رحمہ اللہ اپنے والد علی بن حسین رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں وہ اپنے والد حسین رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں وہ اپنے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ

کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نماز کے اختتام تک نہیں اٹھاتے تھے۔

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل مؤطا (صفحہ۹۳) پر منقول ہے: عن عبدالعزیز بن حکیم قال رأیت ابن عمر رضی الله عنه یرفع یدیه حذاء اذنیه فی اول تکبیرة افتتاح الصلوة ولم یرفعهما فیما سوی ذلک یعنی عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا آپ فقط تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھاتے تھے اس کے علاوہ کہیں بھی نہیں اٹھاتے تھے۔ اس کو امام طحاوی نے مجاہد رحمہ اللہ سے بھی نقل کیا (۱/۱۶۳) اور یہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۷) میں بھی مذکور ہے۔

یہ بطور نمونہ کے چند صحابہ سے احادیث نقل کردیں، اس کے علاوہ تابعین و تبع تابعین اور فقہاء و محدثین میں جماعت کثیرہ کا یہی مسلک ہے جو احناف کا ہے یعنی رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہے، اس کے علاوہ نہیں۔ چنانچہ علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۲/۴، ۲۷۲، حصہ۵) میں چند کبار تابعین اور محدثین کے اسماء گرامی ذکر کیے مثلاً

سفیان ثوری، ابراہیم نخعی، ابن ابی لیلی، علقمہ بن قیس اور اسود بن یزید، عامر شعبی، ابواسحاق سبیعی، مغیرہ، وکیع، عاصم بن کلیب اور زفر رحمہم اللہ وغیرہم حضرات۔

جن میں اکثر کا ذکر شرح معانی الآثار (۱/۱۶۴)، مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۷) و مصنف عبدالرزاق (۲/۷۱)، و بیہقی میں ہے۔ اس کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۶) میں مذکور ہے کہ عن ابی اسحاق قال: کان أصحاب عبدالله ؓ و اصحاب علیؓ لایرفعون ایدیهم الا فی افتتاح الصلوة قال وکیع ثم لا یعودون. یعنی سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی اور تلامذہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نہیں اٹھاتے تھے۔ شیخ الاسلام ابوبکر بن عیاش (جو کہ امام ابوداؤد اور احمد بن حنبل کے استاذ ہیں) فرماتے ہیں میں نے کسی فقیہ کو تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین کرتے نہیں دیکھا، شرح معانی الآثار (۱/۱۶۵)۔

یہ حضرات صحابہ کرام جن میں خلفاء راشدین بھی شامل ہیں اور محدثین اور تابعین کی جماعت جو رفع یدین رکوع اور سجود کے وقت ترک کررہے ہیں یقیناً ان کے ہاں نسخ ثابت ہوچکا ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ نبی علیہ السلام کو تو انہوں نے رفع یدین عندالرکوع کرتے دیکھا ہو لیکن خود عمل اس کے خلاف کریں، صحابہ کرام کے بارے میں اس طرح کا گمان محال ہے۔

نیز اصول حدیث کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ راوی جب اپنی روایت کی ہوئی حدیث کے خلاف عمل کرے تو اس کی روایت کو منسوخ مانا جائے گا (حسامی صفحہ۷۶، توضیح ۲/۴۸۶) پس عبداللہ بن عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم جو رفع یدین بوقت رکوع نقل کرتے ہیں اور ان حضرات کا عمل اس کے خلاف ہے تو رفع یدین بوقت رکوع کا منسوخ ہونا اس اصول کی روشنی میں ثابت ہوگیا۔

نیز امام نسائی رحمہ اللہ کے صنیع سے بھی رفع یدین عندالرکوع کا نسخ ثابت ہوتا ہے چنانچہ امام نسائی رحمہ اللہ نے اولاً باب رفع الیدین للرکوع قائم کیا اس کے بعد عنوان قائم کیا ''ترک ذلک'' یعنی رفع الیدین بوقت رکوع ثابت ہے لیکن اس کا ترک بھی ثابت ہے۔ نسخ کی ایک اور دلیل جس کو امام ابوداؤد نے (۱/۱۰۸) میں نقل فرمایا: عن میمون المکی انه رأی عبدالله بن الزبیر وصلی بهم یشیر بکفیه حین یقوم وحین ینهض للقیام فیقوم فیشیر بیدیه فانطلقت الی ابن عباس فقلت انی رأیت ابن الزبیر

صلی صلاۃ لم أر أحداً يصليها فوصفت له الاشارة فقال: ان احببت ان تنظر الی صلاۃ رسول اللہ ﷺ فاقتد بصلاۃ عبد اللہ. یعنی حضرت میمون مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے عبد اللہ بن زبیرؓ کو دیکھا کہ وہ رکوع کے وقت رفع یدین فرمارہے تھے تو وہ ابن عباسؓ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ میں نے ابن زبیر کو ایسی نماز پڑھتے دیکھا کہ کسی کو بھی ایسی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تجھے یہ پسند ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز دیکھے تو ان کی نماز کی اقتدا کر۔ حضرت میمون مکی کا یہ فرمانا کہ "میں نے کسی کو ایسی نماز پڑھتے نہیں دیکھا" دلیل ہے اس بات کی کہ صحابہ کرام کا عام معمول رفع یدین بوقت رکوع نہ تھا باقی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اس کو صلاۃ الرسول فرمانا اس وجہ سے تھا کہ یہ ان سے ثابت ہے اور میمون مکی کا اس سے متوحش ہونا ٹھیک نہ تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ

ترک رفع یدین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اسی طرح خلفاء راشدین، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور فقہاء ومحدثین سے بھی ثابت ہے اور اسی پر ان کا عمل ہے لہٰذا اس کا انکار غلط ہے اور خلفاء راشدین، صحابہ کرام، فقہاء عظام، ائمہ مجتہدین اور محدثین پر بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(۹۳) امام کے قرأت شروع کرنے کے بعد شریک ہونے والے کا ثناء پڑھنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدرک اور مسبوق نماز میں امام کی قرأت شروع ہونے کے بعد شریک ہو تو اس کو ثناء پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں آیات واحادیث اور اقوال فقہاء کرام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کے قرأت شروع کرنے کے بعد مقتدی اور مسبوق وغیرہ کیلئے قرأت یا ثناء یا تعوذ وغیرہ پڑھنا ناجائز ہے خاموشی اختیار کر کے قرآن کا سننا اس کے لئے لازم ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ: واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون. (الاعراف: ۲۰۴)

وفي قاضيخان (۱/۵۱): المسبوق اذا ادرک الامام في القراءة التي فيها يجهر فيها لا يأتي بالثناء فاذا قام الى قضاء ماسبق ياتي بالثناء ويتعوذ للقراءة الخ.

وفي التاتارخانية (۱/۵۵۷): اذا انتهى الى الامام وقد سبقه الامام بشئ من صلوته هل يأتي بالثناء؟ فهذا على وجوه: الاول اذا ادرک في حال القيام في الركعة الاولى او في الثانية وفي هذا الوجه كان القاضي الامام ابو علي النسفي يحكي عن استاذه: لا ياتي بالثناء وقال غيره من اصحابنا ياتي وذكر الشيخ الاسلام المعروف بخواهرزاده ان كانت الصلوة صلاة يخافت فيها بالقراءة ياتي بالثناء لامحالة وفي النصاب وعليه الفتوى: وأما اذا كانت صلوة يجهر فيها بالقراءة ان ادرک الامام في الركعتين الاخريين فكذلک الجواب يشتغل بالثناء واذا كان في الركعتين الاوليين فقد اختلف

المشایخ: منهم من يقول يشتغل بالثناء ومنهم من يقول لا يشتغل بالثناء الخ.

وفي الشامية (۱/۵۴۶): وفي شرح المنية: والاصل ان الاستماع للقران فرض كفاية لانه لاقامة حقه بان يكون ملتفتا اليه غير مضيع وذلك يحصل بانصات البعض

وفي الدر المختار (۱/۵۴۶): يجب الاستماع للقراءة مطلقا لان العبرة لعموم اللفظ الخ.

(۹۴) ظہر اور عصر میں مسبوق ثنا کب پڑھے گا؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی نماز میں تلاوت زور سے نہیں ہوتی اگر کسی کی ایک رکعت نکل گئی ہو، اور وہ اس نماز میں شامل ہو جائے تو ثناء کب پڑھی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... مذکورہ صورت میں نیت باندھتے ہی تو ثناء نہیں پڑھ سکتے البتہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جو رکعت ادا کی جائے گی وہ پہلی رکعت ہوگی اس میں ہر نماز کی پہلی رکعت کی طرح ابتداً ثناء پھر اعوذ باللہ پھر بسم اللہ..... اس طرح آخر تک پڑھیں گے۔

لمافي الهندية (۱/۹۱): فاذا قام الى قضاء ماسبق يأتي بالثناء ويتعوذ للقراءة كذا في فتاوى قاضيخان والخلاصة والظهيرية..... ومنها انه يصلي اولاً ما ادرك مع الامام ثم يقضي ما سبق كذا في محيط السرخسي .....

(۹۵) رکوع وغیرہ میں ترک رفع یدین افضل ہے

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں اکثر رفع یدین کے متعلق لوگوں کے درمیان جھگڑا رہتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ رفع یدین مسنون ہے رکوع وغیرہ میں، اور بعض کہتے ہیں کہ ترک رفع یدین مسنون ہے۔ شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... خیر القرون سے لے کر دور حاضر تک رکوع وغیرہ میں رفع یدین اور ترک رفع یدین کے متعلق اختلاف چلا آ رہا ہے دونوں طریقے مسنون ہیں لہٰذا جس فریق کے نزدیک جو راجح طریقہ ہے اس کو سنت سمجھ کر اختیار کرے، رفع یدین کو شرارت اور جھگڑے کا ذریعہ نہ بنائے کہ رفع یدین کو اختیار کر کے دوسرے فریق کی نمازوں کو فاسد بتائے۔ تاہم علمائے احناف کے نزدیک قرآن وحدیث کی نصوص سے ترک رفع یدین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

لمافي الهندية (۱/۷۳): والرفع قبل التكبير هو الاصح هكذا في الهداية وهكذا تكبيرات القنوت وصلوة العيدين ولايرفعهما في تكبيرة سواها كذا في الاختيار شرح المختار فلو رفع عندنا لاتفسد صلوته على الصحيح.

وفی الشامیة(۱/۵۶۳): واما الاقتداء بالمخالف فی الفروع کالشافعی فیجوز مالم یعلم منه مایفسد الصلاة علی اعتقاد المقتدی علیه الاجماع...... ذهب عامة مشایخنا الی الجواز اذا کان یحتاط فی موضع الخلاف والا فلا والمعنی انه یجوز فی المراعی بلا کراهة وفی غیره معهاثم المواضع المهملة للمراعاة ان یتوضأ من الفصد والحجامة والقیئ والرعاف ونحو ذلک لافیما هو سنة عنده مکروه عندنا کرفع الیدین فی الانتقالات وجهر البسملة واخفائها۔

(۹۶) حالت رکوع میں ''الصاق کعبین'' کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسئلہ کے بارے میں متردد ہوں وہ یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ کی حالت میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کے ملاکر رکھنے کا کیا حکم ہے اب اس کے متعلق فتاویٰ شامیہ میں میں نے یہ عبارت پڑھی ہے:

(تنبیه) تقدم فی الرکوع انه یسن الصاق الکعبین ولم یذکروا ذلک فی السجود وقدمنا انه ربما یفهم منه ان السجود کذالک اذا لم یذکروا تفریجهما بعد الرکوع فالأصل بقاؤهما هنا کذلک تأمل. شامی(۱/۵۰۴)

اسی طرح طحطاوی میں ہے ''ویسن الصاق الکعبین فی الرکوع والسجود'' (طحطاوی علی الدر۱/۲۲۰)

اب مذکورہ بالاعبارت سے رکوع اور سجدہ میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کا ملاکر رکھنا مسنون ہونا معلوم ہوتا ہے، جبکہ آج تک کسی معتبر عالم دین سے یہ مسئلہ نہیں سنا تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ الصاق الکعبین سنت ہے یا نہیں ہے مذکورہ بالاعبارات کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا یا نہیں؟ براہِ مہربانی میرے اشکال کو حل فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں ذکر کی گئی عبارت سے اگرچہ رکوع وسجود میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کا ملاکر رکھنا مسنون معلوم ہوتا ہے لیکن درج ذیل وجوہ کی بناپر اس عبارت کے مطابق فتویٰ نہیں دیا جائے گا لہٰذا راجح اور صحیح قول یہی ہے، کہ رکوع وسجود میں الصاق کعبین مسنون نہیں ہے۔

(۱)......پہلی وجہ الصاق الکعبین کے مسنون نہ ہونے کی یہ ہے کہ جمہور فقہاء کرام نے اس کے مسنون ہونے کا ذکر نہیں کیا کیونکہ متون وشروح کی معتبر کتب جیسے قدوری، کنز، ہدایہ، بنایہ، فتح القدیر وغیرہ اسی طرح دیگر کتب معتبرہ میں اس کے مسنون ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔

(۲)......صرف متاخرین کی چند کتب میں اس کے مسنون ہونے کا ذکر ملتا ہے ان کے بارے میں بھی یہ صراحت ملتی ہے کہ انہوں نے صاحب مجتبیٰ کی اتباع میں لکھا ہے اور اس مسئلے کو فقہاء نے صاحب مجتبیٰ کے اوہام میں سے قرار دیا ہے۔

(۳)......متاخرین کی کتب میں اعلاء السنن (۳/۱۰،۴۳) میں رکوع وسجود دونوں میں الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کا قول کیا گیا

ہے جبکہ خود مصنفؒ نے امداد الاحکام (۱/ ۴۷۷) میں فتویٰ اس کے برعکس دیا ہے یعنی الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کا انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس مسئلے پر کوئی صحیح وصریح روایت دال نہیں ہے۔ لہٰذا جب مصنف کا اپنا فتویٰ روایت کے مخالف ہے تو ان کی اعلاء السنن والی عبارت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(۴)......امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار (صفحہ ۱۶۶) میں بذریعہ نظر کے الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کی تردید کی ہے۔

(۵)......جب تطبیق وتخنیہ بالاتفاق منسوخ ہوگئے تو اب الصاق الکعبین کو مسنون قرار دینا بظاہر بہت مشکل ہے اور خشوع کے خلاف ہے اسی بات کی طرف طحطاوی علی الدر میں اشارہ کیا گیا ہے اس عبارت میں قوله والصاق كعبيه) حالة الركوع هذا ان تيسر له والا كيف تيسير لهٗ على الظاهر. (طحطاوی ۱/۲۱۳) الغرض مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر راجح یہی ہے کہ الصاق الکعبین رکوع و سجود میں مسنون نہیں ہے۔

لما في الصحيح للبخارى (۱/ ۱۰۹): عن ابى يعفور قال سمعت مصعب بن سعد صليت الى جنب أبى فطبقت بين كفي ثم وضعتهما بين فخذى فنهاني ابى وقال كنا نفعلهٗ فنهينا عنه وامرنا ان نضع ايدينا على الركب.

وفى مصنف ابن أبى شيبة (۲/ ۱۱۰): عن ابى عبيدة قال: خرج عبدالله من داره الى المسجد واذا رجل يصلى صافاً بين قدميه فقال عبدالله اماهذا فقد اخطأ السنة ولو راوح بين قدميه كان احبّ إلى.

وفى تقريرات الرافعى (۱/ ۷۱): (قول الشارح ويسن ان يلصق كعبيه) قال الشيخ ابو الحسن السندى الصغير فى تعليقته على الدر هذه السنة انما ذكرها من ذكرها من المتأخرين تبعاً للمجتبىٰ وليس لها ذكر فى الكتب المتقدمة كالهداية وشروحها و كان بعض مشايخنا يرى أنها من اوهام صاحب المجتبىٰ ولم ترد فى السنة على ماوقفنا عليه وكأنهم توهموا ذالک مما ورد أن الصحابة كانوا يهتمون بسدّ الخلل فى الصفوف حتى يضمون الكعاب والمناكب ولا يخفى ان المراد هنا الصاق كعبه بكعب صاحبه لا كعبه مع كعبه الاخر.

قلت ولعل الشيخ أبا الحسن لحظ الى الآثار الواردة فى ان التراوح بين القدمين فى الصلوٰة مطلقا افضل من الصاقهما اهـ.

(۹۷) اگر امام جہراً تکبیر کہنا بھول جائے تو پھر کیا کرے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی امام رکوع میں جاتے وقت یا سجدہ سے اٹھتے وقت جہراً تکبیر کہنا بھول جائے تو اب وہ مقتدیوں کو کس طرح متنبہ کرے گا آیا دوبارہ تکبیر کہے گا یا کوئی اور طریقہ اپنائے گا؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں امام صاحب کو چاہئے کہ جب بھولی ہوئی تکبیر یاد آ جائے تو مقتدیوں کو متنبہ کرنے کیلئے دوبارہ جہراً تکبیر کہہ دے۔

لمافي التاتارخانية(۱/۴۲۰): ولوترک تکبيرات الرکوع والسجود وتسبيحاتهما فلا سهو فيهما.

وفي الهندية(۱/۱۲۶): ولا يجب بترک التعوذ والبسملة في الاولى والثناء وتکبيرات الانتقالات.

وفي رد المحتار(۲/۱۲): (قوله وتکبير انتقال) أي الى رکوع أوسجود او رفع منه (قوله وتسميع) أي اذا ترکه الامام لايترک المؤتم التحميد.

(۹۸) ’’سمع الله لمن حمده ربنا لک الحمد‘‘ کے ساتھ کچھ کلمات بڑھا کر پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک امام مسجد فرض نماز میں رکوع کے بعد قیام میں سمع الله لمن حمده ربنا لک الحمد کے بعد حمداً کثیراً طيباً مبارکاً فيه پڑھتا ہے تو ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ یہ صحیح نہیں ہے اس طرح کرنے سے ایک رکن کی زیادتی ہوتی ہے اور اس پر سجدہ سہو لازم ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ مولوی صاحب کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں اور اس امام کا اس طرح کرنے سے نماز میں کوئی اثر تو واقع نہیں ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً.....سوال میں مذکورہ کلمات حدیث سے ثابت ہیں۔احناف کے ہاں یہ منفرد کیلئے ہیں۔لہٰذا امام کو چاہیے کہ مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے یہ کلمات نہ پڑھے۔البتہ اگر یہ کلمات پڑھ لے تو سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا۔

لمافي شرح الکبير(صـ۳۱۸): (وان کان المصلي مقتديا) فانه (يأتي بالتحميد) بان يقول اللّهم ربنا ولک الحمد او اللّهم ربنا لک الحمد او ربنا ولک الحمد او ربنا لک الحمد وافضليتها على ترتيبها کذا في الکافي.

وفيه ايضاً(صـ۳۱۶): (ولا ينبغي للامام ان يطيل التسبيح) أو غيره (على وجه يمل به القوم) اذا اتى بقدر السنة (لانه) اى التطويل المذکور (سبب التنفير) عن الجماعة (وانه) اى التنفير عن الجماعة (مکروه) لانه مؤد الى حرمان المسلمين الثواب الموعود على الصلوة بالجماعة.

وفي الدر المختار(۱/۵۶۴): يکره تحريما(تطويل الصلاة) على القوم زائدا على قدر السنة في قراءة وأذکار رضى القوم أو لا لإطلاق الأمر بالتخفيف نهر وفي الشرنبلالية ظاهر حديث معاذ أنه لايزيد على صلاة أضعفهم مطلقا ولذا قال الکمال إلا لضرورة ... اهـ

(۹۹) رکوع سجدہ میں تسبیح پڑھنے کی مسنون مقدار نیز نماز میں درودِ ابراہیمی کی جگہ کوئی دوسرا مختصر درود پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کے رکوع اور سجود میں عام طور پر کم از کم تین بار سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا جاتا ہے اگر کوئی شخص جلدی میں ہو تو کیا وہ صرف ایک بار یہ تسبیح پڑھ سکتا ہے، کیا اس کی نماز ہو جائے گی نماز میں زیادہ سے زیادہ کتنی بار تسبیح پڑھی جائے گی؟ نماز کی آخری رکعت میں نمازی سلام پھیرنے سے پہلے تین دعائیں پڑھتا ہے پہلے التحیات پھر درود ابراہیمی اور آخر میں ایک دعاء،

(i) کیا آخر میں جو دعا پڑھتا ہے وہ مخصوص ہے یا علماء نے جو چند بتائی ہیں ان میں سے کوئی ایک پڑھ سکتا ہے؟

(ii) اگر ایک شخص جلدی میں ہے تو نماز مختصر کرنے کی نیت سے وہ آخری دعا نہیں پڑھتا اور درود ابراہیمی کے بعد سلام پھیر لیتا ہے کیا اس کی نماز درست ہے؟

(iii) اگر کوئی شخص جلدی کی وجہ سے پورا درود ابراہیمی کے بجائے صرف اللھم صلّ علیٰ محمد وبارک وسلّم پڑھ لے تو اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....رکوع اور سجدے میں تین تین دفعہ تسبیح پڑھنے سے سنت کی ادائیگی ہو جاتی ہے جبکہ منفرد کیلئے کمالِ سنت یہ ہے کہ رکوع اور سجدے میں تسبیح سات یا نو دفعہ پڑھے، البتہ امام تین تین دفعہ تسبیح پڑھنے پر اکتفا کرے اگر مقتدیوں کے اکتا جانے کا اندیشہ ہو، نیز رکوع یا سجدے میں اگر کوئی شخص ایک ہی دفعہ تسبیح پڑھتا ہے تو ایسا کرنا مکروہ ہے لیکن نماز ہو جائے گی۔

(i) آخری قعدہ میں درود شریف پڑھنے کے بعد ہر ایسی دعا پڑھ سکتے ہیں جو کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہو، کوئی خاص دعا متعین نہیں البتہ وہ دعا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمائی جو کہ صحیح بخاری شریف (۱/۱۱۵) میں بھی موجود ہے اس کے پڑھنے کا معمول بنالینا بہتر ہے وہ دعا یہ ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْماً کَثِیْراً وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ.

(ii) آخری قعدہ میں تشہد کا پڑھنا واجب ہے جبکہ درود شریف اور اس کے بعد دعا کا پڑھنا مسنون ہے، آخر میں دعا کا ترک کر دینا مکروہ ہے، لیکن نماز ہو جائے گی تاہم اگر کوئی عذر ہو جیسا کہ بیماری وغیرہ تو پھر کوئی حرج نہیں۔

(iii) مذکورہ درود شریف پڑھ لے تو بھی نماز ہو جائے گی البتہ درود ابراہیمی پڑھنا بہتر ہے جو کہ صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کی احادیث سے ثابت ہے۔

لمافی الشامیة (۱/۴۹۴): (قوله کره تنزیها) أی بناء علی أن الامر بالتسبیح للاستحباب بحر.....

والحاصل أن في تثليث التسبيح في الركوع والسجود ثلاثة اقوال عندنا، ارجحها من حيث الدليل الوجوب تخريجا على القواعد المذهبية، فينبغي اعتماده كما اعتمد ابن الهمام ومن تبعه رواية وجوب القومة والجلسة والطمانينة فيهما كمامر وأما من حيث الرواية فالأرجح السنية لأنها المصرح بها في مشاهير الكتب وصرحوا بأنه يكره أن ينقص عن الثلاث وان الزيادة مستحبة بعد أن يختم على وتر خمس أو سبع أو تسع مالم يكن اماما فلا يطول وقد منا في سنن الصلاة عن أصول أبي اليسر أن حكم السنة أن يندب الى تحصيلها ويلام على تركها مع حصول اثم يسير، وهذا يفيد أن كراهة تركها فوق التنزيه وتحت المكروه تحريما، وبهذا يضعف قول البحر ان الكراهة هنا للتنزيه لانه مستحب وان تبعه الشارح وغيره فتدبر.

وفي الهداية(۱/۱۱۵): ودعا بما يشبه الفاظ القرآن والادعية المأثورة لما روينا من حديث ابن مسعودؓ.

وفي الهندية (۱/۷۶): ومن الادعية المأثورة ماروى عن أبي بكر رضي الله عنه انه قال لرسول الله ﷺ علمني دعاء أدعو به في صلاتي فقال قل اللهم اني ظلمت نفسي ظلما كثيرا وانه لا يغفر الذنوب الا أنت فاغفرلي مغفرة من عندك وارحمني انک أنت الغفور الرحيم.

وفي الشامية(۱/۴۵۳):(قوله وترک كل سنة ومستحب) السنة قسمان: سنة هدى وهي المؤكدة. وسنة زوائد. والمستحب غيره وهو المندوب، اوهما قسمان وقد يطلق عليه سنة، وقدمنا تحقيق ذلک كله في سنن الوضوء. قال في البحر عند قوله وعلى بساط فيه تصاوير: الحاصل أن السنة ان كانت مؤكدة قوية لايبعد كون تركها مكروها تحريما، وان كانت غير مؤكدة فتركها مكروه تنزيها، وأما المستحب او المندوب فينبغي أن يكره تركه أصلا...... الخ.

وفي الشامية (۱/۵۱۲): (قوله وصل على النبي ﷺ) قال في شرح المنية: والمختار في صفتها مافي الكفاية والقنية والمجتبى قال: سئل محمد عن الصلاة على النبي ﷺ فقال يقول: اللهم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انک حميد مجيد، وبارک على محمد وعلى آل محمد كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انک حميد مجيد وهي الموافقة لمافي الصحيحين وغيرهما الخ.

(۱۰۰) سجدہ میں زمین پر پاؤں رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ سجدہ میں سات

اعضاء کا زمین پر لگنا ضروری ہے جن میں پاؤں بھی شامل ہیں۔ آجکل بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ سجدہ کی حالت میں ان کے دونوں پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوتے ہیں، کیا ان لوگوں کی نماز صحیح ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جن حضرات کے حالتِ سجدہ میں دونوں پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوتے ہیں ان کی نماز درست نہیں ہوتی اس لئے کہ وضع القدمین واجب ہے البتہ دونوں پاؤں میں سے کسی ایک کا کوئی جز بقدر تسبیحہ واحدہ رکھنا صحت صلاۃ کیلئے کافی ہے، پس اگر پورے سجدہ میں بقدر ایک تسبیح کے دونوں پاؤں میں سے کسی کا کوئی جز زمین پر رکھ لیا تو واجب ادا ہو جائے گا اگر اتنی مقدار بھی نہیں رکھا تو ترک واجب کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ واضح رہے کہ صرف ایک قدم کو زمین پر بغیر عذر رکھنا مکروہ ہے۔

لمافی شرح العینی (۱/۳۰): الخامس السجود لقوله تعالیٰ ارکعوا واسجدوا وفی حاشیة العینی (السجود بجبهته وقدمیه ووضع اصبع واحدة شرط.

الخامس تعدیل الارکان وهو تسکین الجوارح فی الرکوع والسجود حتیٰ تطمئن مفاصله وادناه مقدار تسبیحة وفی حاشیة العینی ای تسکین الجوارح فی الرکوع والسجود بقدر تسبیحة.

وفی فتح القدیر (۱/۳۰۵): وأما افتراض وضع القدم فلأن السجود مع رفعهما بالتلاعب أشبه منه بالتعظیم والاجلال، ویکفیه وضع أصبع واحدة وفی الوجیز وضع القدمین فرض فإن وضع إحداهما دون الاخری جازویکره.

وفی الشامیة (۱/۴۴۷): لو لم یضع شیئاً من القدمین لم یصح السجود.

وفی الدرالمختار (۱/۴۶۴) (وتعدیل الارکان) أی تسکین الجوارح قدر تسبیحة فی الرکوع والسجود وکذا فی الرفع منهما.

وفی الشامیة (۱/۵۰۴): وان ابن امیرحاج رجح فی الحلیة الثانیة وصرح هنا بأن توجیه الاصابع نحو القبلة سنة فثبت ماقدمناه من ان الخلاف السابق فی اصل الوضع لافی التوجیه وأن التوجیه سنة عندنا قولا واحداً...... ویؤید ماقلناه أن المحقق ابن الهمام قال فی زاد الفقیر ومنها: ای من سنن الصلاة توجیه اصابع رجلیه الی القبلة الخ.

(۱۰۱) مقتدی نے ابھی رکوع یا سجدہ کی تسبیحات ختم نہیں کیں کہ امام نے سر اٹھالیا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقتدی نے ابھی تین تسبیحات پوری نہیں پڑھی تھیں کہ امام نے رکوع سے یا سجدے سے سر اٹھالیا۔ تو مقتدی ساتھ ہی سر اٹھائے یا تین تسبیحات پوری کرنے کے بعد اُٹھائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مقتدی پر تین تسبیحات پوری کرنی ضروری نہیں بلکہ امام کی متابعت ضروری ہے اس لئے کہ امام

کی متابعت فرض ہے۔

لمافی قاضیخان(۱/۴۷): ولو رفع الامام رأسه من الركوع او السجود قبل ان يسبح المقتدی ثلاثا تكلموا فيه والصحيح انه يتابع الامام لأن متابعة الامام فرض فلا يتركها بالسنة......الخ.

وفي الهندية(۱/۹۰): ولو رفع الامام رأسه من الركوع أو السجود قبل ان يسبح المقتدی ثلاثاً الصحيح انه يتابع الامام......الخ.

(۱۰۲) فرض نماز کی آخری دو رکعتوں میں سورت ملانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر نمازی فرض میں تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اگر کوئی سورۃ ملالے تو آیا اس صورت میں سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرض نماز کی تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملانے کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔

لمافي الهندية(۱/۱۲۶): ولو قرأ في الأخريين الفاتحة والسورة لايلزمه السهو وهو الأصح.

وفي الدر المختار(۱/۵۱۱): (واكتفى) المفترض (فيما بعد الأوليين بالفاتحة) فإنها سنة على الظاهر ولو زاد لابأس به.

وفي الشامية تحته: (قوله ولو زاد لابأس) أي لو ضمّ اليها سورة لابأس به لأن القراءة في الأخريين مشروعة من غير تقدير.

(۱۰۳) قعدہ اولیٰ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قعدہ اولیٰ میں بیٹھنا واجب ہے یا نہیں؟ میرا ایک دوست ہے جس نے تبلیغی جماعت میں بھی وقت لگایا ہے وہ کہتا ہے کہ سنت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قعدہ اولیٰ واجب ہے۔ آپ کے دوست کو مغالطہ ہوا ہے۔ اور اس طرح بلا تحقیق شرعی احکام کو بیان نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے معاشرے میں دینی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

وفي الهندية(۱/۷۱): وتجب القعدة الاولىٰ قدر التشهد اذا رفع راسه من السجدة الثانية في الركعة الثانية في ذوات الاربع والثلاث هو الاصح هكذا في الظهيرية.

وفي الدر المختار(۱/۴۶۵): (والقعود الاوّل) ولو في نفل في الأصح وكذا ترك الزيادة فيه على التشهد وأراد بالأول غير الاخير.

(۱۰۴) تشہد میں اشارہ بالسّبابہ کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کا کیا حکم ہے؟ ہمارے محلے میں ایک امام صاحب ہیں وہ فرماتے ہیں کہ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا بدعت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز کے اندر تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا بدعت نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

لمافی سنن أبی داؤد(۱/۱۴۲): عن عبدالله بن الزبير انه ذكر ان النبی ﷺ كان يشير باصبعه اذا دعا ولايحركها.

وفی الدر المختار(۱/۵۰۸،۵۰۹): وشيخ الاسلام الجد وغيرهم انه يشير لفعله عليه الصلاة والسلام ونسبوه لمحمد والامام بل فی متن درر البحار وشرحه غرر الاذكار المفتی به عندنا انه يشير باسطا اصابعه كلها وفی الشرنبلالية عن البرهان الصحيح انه يشير بمسبحته وحدها يرفعها عند النفی ويضعها عند الاثبات واحترز بالصحيح عما قيل لايشير لانه خلاف الدراية والرواية وبقولنا بالمسبحة عما قيل يقعد عند الاشارة وفی العينی عن التحفة الاصح انها مستحبة.

وفی الشامية (۱/۵۰۹): وفی القهستانی: وعن اصحابنا جميعاً انه سنة فيحلق ابهام اليمنی ووسطها ملصقا رأسها برأسها ويشير بالسبابة فهذه النقول كلها صريحة بان الاشارة المسنونة انما هی علی كيفية خاصة الخ.

(۱۰۵) ''اشارہ بالسبابہ فی الصلوٰۃ'' عندالاحناف مکروہ ہے یا سنت؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احادیث مبارکہ سے نماز کے اندر تشہد کی حالت میں انگلی سے اشارہ کرنے کا جواز بلکہ سنیت واضح طور پر ثابت ہے اور احناف رحمہم اللہ بھی اس کے قائل ہیں لیکن احناف پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ''خلاصہ کیدانی'' والے نے اس کو مکروہ لکھا ہے، پھر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف معلوم نہیں لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ فتاویٰ سراجیہ نے بھی ''اشارہ بالسبابہ'' کو مکروہ لکھا ہے، چنانچہ لکھا ہے (صفحہ:۱۱): ويكره ان يشير بالسبابة فی الصلواة عند قوله''اشهد ان لا إله الا الله'' وهو المختار.

اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ کیا احناف کی دیگر کتابوں میں بھی اس طرح حوالہ ملتا ہے یا نہیں، اگر ہے جیسا کہ فتاویٰ سراجیہ میں ہے تو احناف کی دیگر کتابوں نے اس کا کوئی جواب یا رد لکھا ہے یا نہیں؟ فقط وفقکم اللہ تعالیٰ

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں فتاویٰ سراجیہ کے علاوہ احناف کی دیگر کتابوں میں بھی نماز کے اندر حالت تشہد میں انگلی سے اشارہ کرنے کی کراہت کا قول موجود ہے۔ لیکن ائمہ احناف کے متاخرین حضرات (علامہ عینی، علامہ ابن ہمام، علامہ سید احمد طحطاوی، علامہ شامی رحمہم اللہ) اس کے رد میں فرماتے ہیں کہ کراہت کا قول روایت اور درایت دونوں کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں مفتی بہ قول جواز اور سنت کا ہے۔

لما في حاشية الطحطاوي على المراقي(ص۲۶۹): (و) تسن (الاشارة في الصحيح) لانه ﷺ رفع اصبعة السبابة وقد أحناها شيئا ومن قال انه لا يشير أصلا فهو خلاف الرواية والدراية.

وقال الطحطاوي رحمه الله تحته: (قوله فهو خلاف الرواية) لانه روى عن عدة اخبار منها ما أخرجه ابن السكن في صحيحه عن ابن عمر......... (قوله والدراية) لان الفعل يوافق القول فكما ان القول فيه النفي والاثبات يكون الفعل كذلك

وفي الشامية(۱/۵۰۹): وعن كثير من المشائخ لايشير اصلا وهو خلاف الدراية والرواية فعن محمد ان ما ذكر في كيفية الاشارة قول أبي حنيفة ومثله في فتح القدير. وفي القهستاني: وعن اصحابنا جميعا انه سنة ....وهذا ما اعتمده المتأخرون لثبوته عن النبي ﷺ بالاحاديث الصحيحة ولصحة نقله عن ائمتنا الثلاثة فلذا قال في الفتح ان الأول خلاف الدراية والرواية.

وفي الموطا للامام محمد(ص۱۰۸): عن على ابن عبدالرحمن المعاوي انه قال رانى عبد الله ابن عمر وانا اعبث بالحصى في الصلوة فلما انصرفت نهاني وقال اصنع كما كان رسول الله ﷺ يصنع فقلت كيف كان رسول الله ﷺ يصنع قال كان رسول الله ﷺ اذا جلس في الصلوة وضع كفه اليمنى على فخذه اليمنى وقبض اصابعه كلها واشار باصبعه التي تلي الابهام ووضع كفه اليسرى على فخذه اليسرى قال محمد وبصنيع رسول الله ﷺ ناخذ وهو، قول ابي حنيفة رحمه الله.

وفي حاشية للامام الهمام ابي الحسنات محمد عبدالحي اللكنويؒ.

: :(قوله وهو قول ابي حنيفة)...... وقد ذكر ابن الهمام في فتح القدير والشمني في شرح النقاية وغيرهما انه ذكر ابو يوسف رحمه الله في الامالي مثل ما ذكر محمد فظهر ان اصحابنا الثلثة اتفقوا على تجويز الاشارة لثبوتها عن النبي ﷺ واصحابه بروايات متعددة وطرق متكثرة لا سبيل الى انكارها ولا الى ردها وقد قال به غيرهم من العلماء حتى قال ابن عبدالبر انه لا خلاف في ذلك والى الله المشتكى من صنيع كثير من اصحابنا من اصحاب الفتاوى كصاحب الخلاصة والبزازية والكبرى و العتابية والغياثية والولوالجية وعمدة المفتي والظهيرية وغيرها حيث ذكروا ان المختار

هو عدم الاشارة بل ذكر بعضهم انها مكروهة والذى حملهم على ذلك سكوت ايمتنا عن هذه المسالة فى ظاهر الرواية ولم يعلموا انه قد ثبت عنهم بروايات متعددة ولا انه ورد فى احاديث متكثرة فالحذو الحذر من الاعتماد على قولهم فى هذه المسالة مع كونه مخالفا لما ثبت عن النبى ﷺ واصحابه بل وعن ايمتنا ايضاً بل لوثبت عن ايمتنا التصريح بالنفى وثبت عن رسول الله ﷺ واصحابه الاثبات لكان فعل الرسول واصحابه احق والزم بالقبول فكيف وقد قال به ايمتنا ايضاً.

(۱۰۶) تشہد میں انگلی اٹھانے کا مسنون طریقہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ تشہد میں انگلی اٹھانے کی کیفیت ،طریقہ اور اسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پھر اسکو ہلاتے رہنا چاہئے یا نہیں؟ نیز کب اٹھانا چاہئے اور کب رکھنا چاہئے؟ آخر میں یہ بھی بتادیں کہ یہ طریقہ کسی حدیث شریف میں مذکور ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... تشہد میں انگلی اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نمازی کلمہ شہادت پر پہنچتے وقت چھنگلی اور اس سے ملحقہ انگلی بند کرلے اور درمیانی انگلی کا انگوٹھے کے ساتھ حلقہ بنا کر شہادت کی انگلی ''لا الہ'' پر اٹھائے اور ''الا اللہ'' پر چھوڑ دے مگر حلقہ کی ہیئت کو آخر تک باقی رکھے..... مذکورہ بالا طریقہ سنت ہے اور یہ طریقہ ابن ماجہ کی حدیث (ص ۶۵) اور ابوداؤد کی حدیث (۱۴۲/۱) میں مذکور ہے۔ نیز انگلی کو اٹھانے کے بعد ہلاتے رہنا مکروہ ہے، جو کہ نماز کے اندر سکون ووقار کے خلاف ہے جبکہ نماز میں سکون مطلوب ہے۔

لمافى سنن ابى داؤد (۱۴۲/۱): عن عبدالله بن الزبير انه ذكر أن النبى ﷺ كان يشير باصبعه اذا دعا ولا يحركها.

وفى اعلاء السنن (۱۱۲/۳): قال الطحطاوى فى حاشيته على مراقى الفلاح: قوله، وتسن الاشارة، أى من غير تحريك فانه مكروه عندنا.

وفى رسائل ابن عابدين (۱۳۴/۱): والصحيح المختار عند جمهور اصحابنا انه يضع كفيه على فخذيه ثم عند وصوله الى كلمة التوحيد يعقد الخنصر والبنصر ويحلق الوسطى والابهام ويشير بالمسبحة رافعا لها عند النفى وواضعا لها عند الاثبات ثم يستمر على ذلك الخ.

(۱۰۷) تشہد میں انگلیوں کا حلقہ کب تک بنائے رکھا جائے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حالتِ تشہد میں اشارہ بالسبابہ کے وقت انگلیوں کا جو حلقہ بنایا جاتا ہے یہ کس وقت تک رکھنا چاہئے ،اشهد ان محمد عبده ورسوله پر ختم کردینا چاہئے یا آخیر سلام تک رکھنا چاہئے۔قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حالتِ تشہد میں اشارہ بالسبابہ کے وقت انگلیوں کا جو حلقہ بنایا جاتا ہے وہ تشہد کے بعد آخیر سلام تک اسی طرح برقرار رکھنا چاہئے۔

لمافی رسائل ابن عابدين(۱/۱۲۷): وروی عن أئمتنا الثلاثة ابی حنيفة وابی يوسف ومحمد انه يشير عند التشهد وانه يعقد اصابعه علي مامر من اختلاف الكيفية وظاهر كلامهم انه لا ينشرها بعد العقد بل يبقيها كذلك لان المذكور فی هذه الرواية العقد ولم يذكروا النشر بعده، ورجح المتأخرون هذه الرواية لتأيدها بالمروی عن النبی الله ﷺ.

وفی رسائل ابن عابدين(۱/۱۳۴): والصحيح المختار عند جمهور اصحابنا انه يضع كفيه علي فخذيه ثم عند وصوله الی كلمة التوحيد يعقد الخنصر، والبنصر ويحلق الوسطی والابهام ويشير بالمسبحة رافعا لها عند النفي وواضعاً لها عند الاثبات ثم يستمر علی ذلک لانه ثبت العقد عند الاشارة بلاخلاف ولم يوجدأمر بتغييره فالأصل بقاء الشئ علی ماهو عليه وإستصحابه الی اخر أمره.

(۱۰۸) شہادت کی انگلی نہ ہونے کی صورت میں دوسری انگلی سے اشارہ کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی کی شہادت کی انگلی نہیں ہے تو تشہد میں شہادت کے دوران کونسی انگلی اٹھائے گا یا نہیں اٹھائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کسی کی شہادت کی انگلی نہیں ہے تو وہ تشہد میں شہادت کے وقت کوئی دوسری انگلی نہ اٹھائے۔

لمافی الفقه الاسلامی(۱/۷۱۵): بحيث تكون رؤوس أصابعهما علي الركبتين ورفع الاصبع السبابة من اليمنی فقط عند الشهادة فی التشهد.

وفی حاشية الطحطاوی(۱/۲۲۴): (قوله أنه يشير) بيان لما فی قوله ماصححه.(قوله المفتی به عندنا أنه يشير) ای بمسبحته ای وحدها.

وفی الدر المختار(۱/۵۰۹): الصحيح أنه يشير بمسبحته وحدها يرفعها عند النفي ويضعها عند الاثبات.

قال الشامیؒ تحته: (قوله بمسبحته وحدها) فيكره أن يشير بالمسبحتين كما فی الفتح وغيره.

(۱۰۹) امام مقتدی کے درود شریف پڑھنے سے قبل سلام پھیر دے تو کیا حکم ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تراویح میں امام کے پیچھے تراویح پڑھی جاتی ہے جب التحیات

پر بیٹھتے ہیں تو پیچھے والے درود تک پڑھتے ہیں اور امام صاحب سلام پھیر دیتے ہیں یہ پورا کرنا چاہئے یا امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اس صورت میں آپ کو امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے۔

وفی الهندية (۱/۹۰): ولو سلم الامام قبل ان یفرغ المقتدی من الدعاء الذی یکون بعد التشهد أو قبل أن یصلی علی النبی ﷺ فانه یسلم مع الامام.

(۱۱۰) مقتدی کا التحیات کے شروع میں اور ہر رکن میں بسم اللہ پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل عشاء کی نماز میں میرے برابر ایک معمر نمازی تھے۔ جب امام صاحب نے قعدۂ اولیٰ کیا تو انہوں نے التحیات الخ پڑھنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی، کیا اس طرح کرنے سے نماز میں کچھ حرج تو نہیں ہوتا؟ اور ہر رکن میں اگر بسم اللہ پڑھی جائے تو شرعاً یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......مذکورہ صورت میں معمر شخص کی نماز درست ہے اور اس پر مقتدی ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو بھی نہیں، البتہ رکوع، سجود اور تشہد کے شروع وغیرہ میں جو قرأت کا محل نہ ہو، قرأت نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس سے تأخیر واجب یا تأخیر رکن لازم آتا ہے جس سے سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ بسم اللہ صرف ہر رکعت کے شروع میں سنت ہے اور ہر رکن میں اس کا پڑھنا کہیں بھی ثابت نہیں لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

لمافی الهندية (۱/۱۲۷): وذكر هناک اذا بدأ فی موضع التشهد بالقراءة ثم تشهد فعلیه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقراءة فلا سهو علیه.

وفی الشامية (۲/۸۱): (قوله وتأخير قيام الخ) أشار إلى أن وجوب السجود لیس لخصوص الصلاة علی النبی ﷺ بل لترک الواجب وهو تعقیب التشهد للقیام بلا فاصل حتی لوسکت یلزمه السهو کما قدمناه فی فصل اذا أراد الشروع، قال المقدسی وکما لوقرأ القرآن هنا أو فی الرکوع یلزمه السهو مع أنه کلام الله تعالیٰ، وکمالو ذکر التشهد فی القیام مع أنه توحید الله تعالیٰ.

(۱۱۱) نماز کے درود میں لفظِ سیدنا کا اضافہ اور مختلف ارکان میں دعائیں پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں لفظ محمد سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا درست ہے؟ نیز ادعیہ ماثورہ جو کہ مختلف ارکان میں پڑھی جاتی ہیں کیا فرضوں میں ان کا پڑھنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں لفظ ''محمد'' اور لفظ ''ابراہیم'' (علیہما الصلاۃ والسلام) سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا افضل ہے اور ادعیہ ماثورہ فرض نماز کے مختلف ارکان میں امام کو نہ پڑھنا چاہئے اس لئے کہ امام کو تخفیف (ہلکی) نماز

پڑھانے کا حکم دیا گیا ہے البتہ منفرد کیلئے ان ادعیہ ماثورہ کا نماز کے مختلف ارکان میں پڑھنا درست ہے چاہے نماز فرض ہو یا نفل۔

لمافي الهندية (۱/۸۷): وينبغي للإمام أن لايطول بهم الصلاة بعد القدر المسنون وينبغي له أن يراعي حال الجماعة هكذا في الجوهرة النيرة.

وفي الطحطاوي (۱/۲۲۶): (قوله وندب) يحتمل أن يقرأ بصيغة المصدر عطفاً على فاعل صح أو بصيغة المجهول وظاهر الشرح طلبها في نبينا و أبيه الخليل عليهما الصلاة والسلام لاشتراكهما فيها وصيغة الصلاة على هذا "اللهم صل على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما صليت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انک حميد مجيد وبارک على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما باركت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انک حميد مجيد وترحم على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما ترحمت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انک حميد مجيد ولا يخفى أن هذه الزيادة مستحبة حلبي بزيادة (قوله لان زيادة الاخبار) الاولى حذف زيادة (قوله نقله الرملي) فيه أنه ليس من أهل المذهب.

وفي الدر المختار (۱/۵۱۳، ۵۱۴): وندب السيادة لأن زيادة الاخبار بالواقع عين سلوک الأدب فهو أفضل من تركه ذكره الرملي الشافعي وغيره ومانقل لا تسودوني في الصلاة فكذب و قولهم لا تسيدوني بالياء لحن أيضا والصواب بالواو.

وفي الشامية تحته: (قوله ذكره الرملي الشافعي) اى في شرحه على منهاج النووي ونصه: والأفضل الإتيان بلفظ السيادة كما قاله ابن ظهيرة وصرح به جمع وبه أفتى الشارح لأن فيه الاتيان بما أمرنا به وزيادة الاخبار بالواقع الذي هو أدب فهو أفضل من تركه وإن تردد في أفضليته الأسنوي، وأما حديث "لاتسيدوني في الصلوة" فباطل لا أصل له كما قاله بعض متأخري الحفاظ وقول الطوسي إنها مبطلة غلط واعترض بأن هذا مخالف لمذهبنا لمامر من قول الإمام من أنه لوزادفي تشهده أو نقص فيه كان مكروهاً قلت فيه نظر فإن الصلاة زائدة على التشهد ليست منه نعم ينبغي على هذا عدم ذكرها في وأشهد أن محمداً عبده ورسوله وأنه يأتي بها مع ابراهيم عليه السلام (قوله لحن أيضاً) اى مع كونه كذباً (قوله والصواب بالواو) لأنه واوي العين من ساد يسود.

(۱۱۴) نماز میں سلام پھیرنے کی کیفیت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ نماز میں سلام پھیرتے وقت چہرہ قبلہ کی

جانب ہو، اور دلیل میں ''تلقاء وجہہ'' والی روایت پیش کرتا ہے۔ آیا زید کا یہ قول درست ہے، اگر نہیں تو سلام پھیرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز میں سلام کی ابتداء چونکہ قبلہ رخ ہی ہوتی ہے اور یہی حال دوسرے سلام کا ہے، باقی راوی کا سلام کو تلقاء وجہہ سے تعبیر کرنا بیانِ حال کیلئے ہے کہ عموماً جیسے پہلا سلام کرتے وقت رخ قبلہ جانب ہوتا ہے اسی طرح دوسرے سلام میں بھی لفظ ''السلام علیکم'' کے وقت عموماً رخ خود بخود قبلہ جانب ہوجاتا ہے۔ نیز تکلفات میں پڑنا مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ خصوصاً عوام الناس کیلئے اور یہ ایسا اختلافی مسئلہ بھی نہیں کہ صحت وفساد صلاۃ اس پر موقوف ہوں۔ لہٰذا بحث ومباحثہ سے گریز کرنا بہتر ہے۔

لمافی معارف السنن(۳/۱۱۰): وتاوّل فيه بعض المتاوّلين بان البداءة كان به من تلقاء الوجه ممتداً به إلى اليمين و مثله ذكره في الكوكب الدرى، ولا ادرى لمن هو؟ ولعله يريد ان المقصود بيان كيفية السلام هكذا لابيان العدد، والكيفية هذه من ابتداء تلقاء الوجه وانتهائه في جانب اليمين، ذكره في المجموع والمغنى وهو المعمول به عندنا.

(۱۱۳) دعا کرتے وقت ہاتھ کیسے اور کہاں تک اٹھانے چاہئیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ مطلقاً دعا کرتے وقت خواہ نماز کے بعد ہو یا تلاوت کے بعد جب بھی کوئی دعا مانگے تو ہاتھ کاندھوں تک سیدھے سامنے رکھے اور دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملالے، یہی طریقہ مسنون ہے، اس کے برعکس عمر کہتا ہے کہ ہتھیلیوں کو ملائے نہ رکھے بلکہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تین انگل کا فاصلہ رکھے، کونسا طریقہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بوقت دعا دونوں ہتھیلیوں کے درمیان فاصلہ مستحب اور راجح ہے لیکن دونوں ہاتھ ملا کر بھی دعا کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ دونوں طریقے منقول ہیں۔ ہم دونوں طریقوں سے متعلق احادیث ذکر کرتے ہیں۔

حسب ذیل احادیث سے بوقت دعا دونوں ہاتھوں کو ملا کر رکھنے کی تائید ہوتی ہے۔

لمافی مجمع الزوائد(۱۰/۱۶۹): عن انس بن مالك رضی الله عنه قال رفع رسول الله ﷺ يديه بعرفة يدعو فقال اصحاب النبی ﷺ هذا الابتهال ثم حاصت الناقة ففتح احدى يديه فاخذها وهو رافع الاخرى رواه البزار والطبرانی فی الاوسط بنحوه الا انه قال فرفع يديه فسقط زمام الناقة فتناوله ورفع يديه وزاد هذا الابتهال والتفرع ورجال البزار رجال الصحيح غير احمد بن يحيىٰ الصوفی وهو ثقه ولكن لاعمش لم يسمع من انس رضی الله تعالىٰ عنه.

وعن سلمان رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ مارفع قوم اكفهم الى الله عزوجل يسئلونه شيئاً الا كان حقا على الله ان يضع في ايديهم ماسألوا قلت له حديث في السنن غير هذا رواه الطبرانی ورجاله رجال الصحيح.

وفي مرقاة المصابيح(۵/۴۷): وقدورد انه ﷺ في الدعا يوم عرفة جمع بين كفيه وجعلهما مقابل صدره كاستطعام المسكين(قال الحافظ نور الدين رحمه الله عليه في مجمع الزوائد)"رواه الطبراني في الاوسط وفيه الحسين بن عبدالله بن عبيد الله وهو ضعيف" قال ملا علی قاری فی مرقاة (۴۲/۵) ان الضعيف حجة فی الفضائل اتفاقا.

حسب ذیل عبارات سے فرجہ بین الیدین کے استحباب کی ترجیح ثابت ہوتی ہے۔

لمافي حاشية الطحطاوی علی المراقي(ص۲۵۷): وفي النهر من فعل كيفيته المستحبة ان يكون بين الكفين فرجة وان قلت الخ. لكن فی شرح الحصن الحصين والظاهر ان من الادب ايضا ضم اليدين وتوجيه اصابعهما نحو القبلة وفي شرح المشكوة وردانه ﷺ يوم عرفة جمع بين كفيه في الدعاء وان اريد بالضم فی الكلام القرب التام لا ينافي وجود الفرجة القليلة، واما قوله جمع بين كفيه لاينا فيه ايضاً لان المعنى جمع بينهما في الرفع ولم يفرداحدهما به.

وفي الهندية(۳۱۸/۵): والافضل في الدعاء ان يبسط كفيه ويكون بينهما فرجة وان قلت...... والمستحب ان يرفع يديه عند الدعاء بحذاء صدره كذا في القنية.

وفي الشامية(۵۰۷/۱): (فيبسط يديه) حذاء صدره (نحو السماء) لانها قبلة الدعاء ويكون بينهما فرجة"وايضاً في رد المحتار (قوله ويكون بينهما فرجة) أی وان قلت قنية.

(۱۱۴) مردوں اورعورتوں کی نمازوں میں فرق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک قاری صاحب فرماتے ہیں کہ عورتیں مردوں کے طریقہ نماز کی طرح نماز پڑھ سکتی ہیں۔تو کیا اس قاری صاحب کی بات درست ہے؟ یا عورتوں اور مردوں کے طریقہ نماز میں فرق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......احادیث مبارکہ اور عبارات فقہ کی رو سے مردوں اورعورتوں کی نمازوں میں مکمل طور پر یکسانیت نہیں ہے۔ بلکہ بعض مواقع پرعورتوں کی نماز مردوں سے مختلف ہے۔مثلاً (۱)۔تکبیر تحریمہ کے وقت عورتیں کاندھوں تک ہاتھ اٹھائیں گی۔جبکہ مرد کانوں تک اٹھاتے ہیں۔(۲)۔عورتیں سینے پر ہاتھ باندھیں گی،جبکہ مرد زیر ناف باندھتے ہیں۔(۳)۔رکوع میں عورتوں کیلئے مکمل جھکنا ضروری نہیں جبکہ مرد خوب جھکتے ہیں۔(۴)۔سجدے میں عورتوں کیلئے رانوں کو پیٹ سے اور ہاتھوں کو بغلوں سے ملانے کا حکم ہے جبکہ مرد جدا رکھتے ہیں۔(۵)۔قعدہ میں عورتیں سرین کے بل بیٹھیں گی جبکہ مرد بائیں پاؤں پر بیٹھتے ہیں۔(۶)۔اسی طرح عورتیں الگ جماعت نہیں کراسکتیں۔اگر کرالیں تو ان کی امام کو صف اول کے بیچ میں ہی کھڑا ہونا ہوگا۔

الحاصل......عورتیں نماز میں وہ طریقہ اختیار کریں گی کہ جو حالت ستر کے زیادہ قریب ہو۔

لمافي الشامية(۱/۵۰۴): (قوله وحررنا في الخزائن الخ) وذلک حیث قال تنبیه ذکر الزیلعی أنها تخلف الرجل في عشر وقد زدت اکثر من ضعفها. ترفع یدیها حذاء منکبیها. ولا تخرج یدیها من کمیها. وتضع الکف علی الکف تحت ثدیها. وتنحني في الرکوع قلیلا ولا تعقد ولا تفرج فیه أصابعها بل تضمها وتضع یدیها علی رکبتیها ولا تحني رکبتیها. وتنضم في رکوعها وسجودها. وتفترش ذراعیها. وتتورک في التشهد وتضع فیه یدیها تبلغ رؤوس أصابعها رکبتیها. وتضم فیه أصابعها. واذا نابها شيئ في صلاتها تصفق ولا تسبح. ولا تؤم الرجل وتکره جماعتهن ویقف الامام وسطهن ویکره حضورها الجماعة وتؤخر مع الرجال ولا جمعة علیها. لکن تنعقد بها. ولا عید ولا تکبیر تشریق. ولا یستحب أن تسفر بالفجر ولا تجهر في الجهریة بل لو قیل بالفساد بجهرها لا مکن بناء علی ان صوتها عورة.

(۱۱۵) عورتوں کی نماز کا طریقے کا احادیث سے ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ حنفی عورتیں جس طرح نماز پڑھتی ہیں اس کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر اس طریقے کا ثبوت احادیث سے ہے تو ان احادیث کو پیش کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......بعض لوگوں کا حنفی عورتوں کی نماز کے طریقے پر اعتراض کرنا کہ یہ طریقہ احادیث سے ثابت نہیں، درست نہیں ہے اس لئے کہ حنفی عورتوں کی نماز کا طریقہ احادیث طیبہ سے ثابت ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ عورتیں نماز میں ہاتھ سینے کے برابر اٹھاتی ہیں جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ(۱/۴۲۱) میں علامہؒ نے روایت ذکر کی ہے: عن عبد ربه بن زیتون قال رأیت ام الدرداء ترفع یدیها حذو منکبیها حین تفتتح الصلوة...... الخ اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اعلاء السنن کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے اور صراحتاً اس سے ہاتھوں کا سینے کے برابر اٹھانا ثابت ہو رہا ہے، عن وائل بن حجر رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ یا ابن حجر اذا صلیت فاجعل یدیک حذاء اذنیک والمرأة تجعل یدیها حذاء ثدیها، (اعلاء السنن، ۳/۱۸۱، بحواله مجمع الزوائد للطبراني)

اسی طرح عورت کی نماز میں سب سے زیادہ ستر کا خیال رکھا جاتا ہے لہٰذا جو طریقہ سب سے زیادہ ستر کا باعث ہو، اسی کے مطابق پڑھے یہ طریقہ کنز العمال کی روایت سے ثابت ہے عن ابن عمرؓ مرفوعاً اذا جلست المرأة في الصلوة وضعت فخذها علی فخذها الاخریٰ فاذا سجدت الصقت بطنها في فخذیها کاستر مایکون لها، (کنز العمال، ۷/۵۴۹) یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس طریقہ کے مطابق نماز میں ستر زیادہ ہو عورت اسی طرح سے نماز پڑھے، اس وجہ سے نماز میں ہاتھ باندھتے

وقت بھی اس کا خاص خیال رکھا جائے گا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ عورت سینے کے اوپر ہاتھ رکھے چنانچہ صاحب اعلاء السنن فرماتے ہیں، فقلنا به في هذه الحالة في حق الرجل بخلاف المرأة فانها تضع على صدرها لانه استرلها فيكون في حقها أولىٰ...... الخ. (اعلاء السنن، ۲/ ۱۹۹) لہٰذا اس صورت میں استر یہ ہے کہ عورت حالت قیام میں ہاتھ سینے کے اوپر رکھے، مذکورہ روایت پر اسی صورت میں عمل کرنا ممکن ہے نیز مذکورہ روایت کی تائید روایت تصفیق سے بھی ہوتی ہے جس میں عورت کو تصفیق کا حکم ہے جیسا کہ جامع الترمذی کی صحیح روایت میں ہے: عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ التسبيح للرجال والتصفيق للنساء......الخ (الجامع الترمذی، ۱/ ۸۵) اس حکم کی علت اور بناء ستر پر ہے کہ عورت ہر حال میں ستر کا لحاظ کرے گی اس لئے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ حالت رکوع میں بھی اس علت کی وجہ سے عورت زیادہ نہ جھکے گی اس لئے کہ زیادہ جھکنے کی صورت میں ستر کا لحاظ نہیں ہوتا لہٰذا رکوع میں صرف گھٹنوں پر ہاتھ رکھے گی اور انگلیاں مردوں کی طرح کھول کر نہیں رکھے گی۔ قال العلامة ابن عابدينؒ (وإلصاق كعبيه) أي حيث لا عذر (قوله للرجل) اى سنة للرجل فقط وهذا قيد للأخذ والتفريج لأن المرأة تضع يديها على ركبتيها وضعاً ولا تفرج أصابعها (ردالمحتار، ۱/ ۶۷۴، ط ایچ ایم سعید) اس عبارت سے عورت کے رکوع کی کیفیت استر معلوم ہوتی ہے۔ کنز العمال کی روایت میں بھی صراحت کے ساتھ منقول ہے، عن ابن عمرؓ...... اذا سجدت ...... كا ستر مايكون لها اس بناء پر اس کو استر طریقہ سے نماز کی پابندی کا حکم ہے۔

اسی طرح سجدہ بھی اس طریقہ سے کرے گی جس سے زیادہ ستر پوشی ہو مثلاً عورت اپنے پورے جسم کو سمیٹ لے اور جسم کے بعض اعضاء کو دوسرے اعضاء کے ساتھ ملالے، کہنیوں کو پہلوؤں کے ساتھ اور رانوں کو پیٹ کے ساتھ ملالے اور مرد کی طرح سجدہ نہ کرے جیسا کہ ابو داؤد کی روایت میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے عن يزيد بن ابي حبيب رضی الله عنه ان النبی ﷺ مرّ على امرأتين تصليان فقال اذا سجدتما فضمّا بعض اللحم الى الأرض فإن المرأة ليست كالرجل (مراسيل أبي داؤد، ص۸) اسی طرح روایت مصنف ابن ابی شیبہ اور اعلاء السنن میں وارد ہے، عن الحارث عن علی رضی الله عنه قال اذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذيها...... (مصنف ابن ابی شيبة، ۲/ ۵۰۴، اعلاء السنن، ۳/ ۳۰) ان روایات سے معلوم ہوا کہ سجدہ کرنے سے پہلے عورت اپنے کو پوری طرح سے سمیٹ لے گی اور پھر سجدہ کرے گی لیکن سجدہ کرنے سے پہلے دائیں ران کو بائیں ران پر رکھ کر پیروں کو ایک طرف نکال کر سجدہ کرے گی جیسا کہ کنز العمال کی روایت میں ابن عمرؓ سے مرفوعاً ثابت ہے اذا جلست المرأة في الصلوة وضعت فخذها على فخذها الاخرىٰ فاذا سجدت ألصقت بطنها في فخذيها كاستر مايكون لها (کنز العمال، ۷/ ۵۴۹) اور اس کے مشابہ مضمون امام اعظم رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے، ابو حنيفة عن نافع عن ابن عمر رضی الله عنه أنه سئل كيف كن النساء يصلين على عهد رسول الله ﷺ قال كن يتربعن ثم امرن أن يحتفزن (مسند الامام اعظم، ۱/ ۷۳) اس سے ماقبل والے مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ عورتیں خوب سمٹ کر پردے کے ساتھ نماز پڑھیں اور پھر حالت تشہد میں عورت کو مرد کی طرح بیٹھنے کا حکم نہیں بلکہ اپنے پاؤں کو دائیں طرف نکال کر بائیں سرین پر بیٹھ جائے سنن کبری کی

روایت میں مذکور ہے: عن أبی سعید الخدری رضی الله عنه صاحب النبی ﷺ عن النبی ﷺ أنه قال...... وكان يأمر الرجال أن يتجافوا في سجودهم ويأمر النساء يتجفضن في سجودهن وكان يأمر الرجال أن يفرشوا اليسرى وينصبوا اليمنى في التشهد ويأمر النساء أن يتربعن ......الخ (السنن الکبری للامام البیهقی، ۲/۲۲۲)

اس روایت میں عورت کو مرد سے مختلف نماز پڑھنے کا حکم ہے اور اسکی ہم معنی روایت مصنف ابن ابی شیبہ کی ہے عن خالد بن اللجلاج قال كن النساء يؤمرن أن يتربعن اذا جلسن في الصلاة ولا يجلسن جلوس الرجال على أوراكهن يتقى ذلك على المرأة مخافة أن يكون منها الشئ. (مصنف ابن ابی شیبه، ۲/۵۰۶) ان احادیث وروایات سے معلوم ہوا کہ عورت حالت تشہد میں بائیں سرین پر بیٹھے گی اور پیروں کو دائیں طرف نکالے گی یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عورت کی نماز کا فرق جو احناف کرتے ہیں روایات سے ثابت ہے اور ان لوگوں کا یہ کہنا کہ عورت کی نماز کا یہ طریقہ کسی حدیث سے ثابت نہیں غلطی پر مبنی ہے جیسا کہ اوپر کی روایات سے معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

لمافي اعلاء السنن (۳/۳۰): عن عليؓ قال اذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذيها......

وقال رحمه الله في اعلاء السنن في شرح حديث على رضى الله عنه والقياس أيضا يقتضى مخالفة هيئة المرأة في جلوسها وسجودها عن هيئة الرجال لكون مبنى احوالهن على التستر والاحاديث المذكورة مويدة له ...... الخ.

وفي الهندية (۱/۷۵): والمرأة لا تجافى في ركوعها وسجودها وتقعد على رجليها وفي السجدة تفترش بطنها على فخذيها...... الخ.

وفي الدر المختار (۱/۵۰۴): (والمرأة تخفض) فلا تبدى عضديها (وتلصق بطنها بفخذيها) لانه استر وحررنا في الخزائن انها تخالف الرجل في خمسة وعشرين......

وفي الشامية: وتضع يديها على ركبتيها ولا تحنى ركبتيها وتنضم في ركوعها وسجودها وتفترش ذراعيها...... وذكر في البحر انها لا تنصب اصابع القدمين......الخ.

(۱۱۶) ٹوپی کیسی ہو؟ آپ ﷺ سے ٹوپی پہننے کا ثبوت اور بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز اور غیر نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوپی پہننا ثابت ہے یا نہیں؟ ٹوپی کس قسم کی ہونی چاہئے؟ بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنا یعنی ننگے سر نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضور اقدس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے نماز اور غیر نماز میں ٹوپی اور عمامہ یعنی پگڑی کا پہننا ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپیاں تین طرح کی تھیں ایک وہ تھی جو سر کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی تھی دوسری

وہ تھی جو سر سے کسی قدر اونچی ہوتی تھی تیسری بڑی ٹوپی تھی جس میں کان بھی ڈھک جاتے تھے اور بغیر ٹوپی کے ننگے سر نماز پڑھنا خلاف سنت ہے اس لئے ٹوپی پہننے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

لما فی شمائل الترمذی(ص۸): عن جابر قال دخل النبی ﷺ مکة یوم الفتح علیه عمامة سوداء.

وفی الصحیح للبخاری(۱/۵۶):وقال الحسن کان القوم یسجدون علی العمامة والقلنسوة ویداه فی کمه.

وفی کنز العمال(۷/۱۲۱): کان یلبس قلنسوة بیضاء(طب عن ابن عمر).

کان یلبس القلانس تحت العمائم وبغیر العمائم ویلبس العمائم بغیر القلانسو کان یلبس القلانس الیمانیة وهن ابیض المضربة ویلبس ذوات الآذان فی الحرب وکان ربما نزع قلنسوته فجلعها سترة بین یدیه وهو یصلی الخ.

وفی بذل المجهود (۵/۵۲): ولأبی الشیخ عن ابن عباس کان لرسول الله ﷺ ثلث قلانس الحدیث.

(۱۱۷) مسجد میں رکھی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ٹوپی نہ ہونیکی صورت میں مسجد میں پڑی ہوئی ٹوپی کا استعمال یا چھوٹا رومال سر پر رکھ کر نماز پڑھنا جائز ہے؟ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ ان دونوں صورتوں سے بہتر ہے کہ ننگے سر نماز پڑھ لی جائے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ٹوپی نہ ہونے کی صورت میں مسجد میں رکھی ہوئی ٹوپی کو استعمال کرنا یا چھوٹا رومال سر پر رکھنا درست ہے البتہ اسکی عادت نہ بنائی جائے، اور آپ کے دوست کی بات درست نہیں ہے کیونکہ سر ڈھانپنا نماز کے آداب میں سے ہے۔

لمافی الشامیة(۱/۶۴۱):(قوله ولابأس به للتذلل) قال فی شرح المنیة : فیه اشارة الی أن الاولی ان لایفعله وأن یتذلل ویخشع بقلبه فانهمامن أفعال القلب وتعقبه فی الامداد بمافی التجنیس من أنه یستحب له ذالک لأن مبنی الصلاة علی الخشوع.

(۱۱۸) ننگے سر نماز پڑھنے سے متعلق مکروہ تنزیہی اور تحریمی کی تحقیق

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچھ لوگ جب نماز کو آتے ہیں تو ٹوپی نہیں پہن کر آتے بلکہ مساجد میں جو پلاسٹک کی ٹوپیاں یا لکڑی کی چھال کی ٹوپی بنی ہوتی ہے وہ پہن لیتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ تو اپنی جیب سے ناک صاف کرنے والا رومال باندھ لیتے ہیں کیا ایسی صورت میں نماز ہو جاتی ہے کیونکہ میں نے کسی دینی کتاب میں یہ بات پڑھی تھی کہ ان ٹوپیوں میں نماز نہیں ہوتی۔ براہ کرم جلد از جلد قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... سب سے پہلے چند امور قابل ذکر ہیں۔

(۱)۔ اکثر فقہاء نے ننگے سر نماز پڑھنے کو مطلق مکروہ کہا ہے۔

(۲)۔ جب کبھی مطلق کراہت کا ذکر ہو تو اس سے مراد کراہت تحریمی ہوتی ہے الا یہ کہ کراہت تنزیہی کی کوئی دلیل وہاں موجود ہو جیسا کہ الشامیہ (۱/۲۲۴) پر مذکور ہے کہ ''الکراھة حیث اطلقت فالمراد منها التحریم''

(۳)۔ بعض فقہاء نے ننگے سر نماز پڑھنے کو ازار واحد میں نماز پڑھنے پر قیاس کیا ہے جیسا کہ البحر الرائق (۲/۴۴) پر مذکور ہے ''وان صلّی فی ازار واحد یجوز ویکره...... وکذا مکشوف الرأس للتهاون والتکاسل'' اور ازار واحد میں نماز (باوجود قمیص یا چادر وغیرہ پر قدرت کے) مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ حاشیۃ الطحطاوی (صفحہ ۳۴۹) پر مذکور ہے ''وصلاته فی السراویل اوفی ازار مع قدرته علی لبس القمیص. لما فیه من التهاون والتکاسل. وفی شرحه (لما فیه من التهاون هذا یفید کراهة التحریم'' لہٰذا مقیس (ننگے سر نماز پڑھنا) بھی مکروہ تحریمی ہوگا۔

(۴)۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے الشامیہ (۱/۶۵۳) میں فرمایا ہے کہ اگر سنت، سنت مؤکدۃ قویۃ ہو تو اس کا ترک مکروہ تحریمی ہے اور سر ڈھانپ کر نماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مؤکدہ ہے جیسا کہ ملتقی الابحر (۱/۱۰۸۔۱۰۹) پر ملا علی قاری رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام کے علاوہ کبھی بھی ننگے سر نماز ادا نہیں فرمائی لہٰذا اس سے بھی ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہی ثابت ہوتا ہے۔

(۵)۔ بعض فقہاء کی عبارات میں اس کی صراحت ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے جیسا کہ شرح الوقایۃ (۱/۱۶۸) کے حاشیہ پر اور الفقہ الاسلامی وادلتہ (۲/۹۷۲) میں مذکور ہے۔ لہٰذا عبارات مذکورہ کے پیش نظر اگر کبھی کبھار کسی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھی گئی تو مکروہ تنزیہی ہوگی اور اگر ننگے سر نماز پڑھنے کو مستقل عادت بنالیا گیا ہو تو اس صورت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا نیز ٹوپی اچھی اور صاف ہونی چاہئے اور ٹوپی نہ ہو تو مسجد میں رکھی ہوئی ٹوپی پہن کر نماز ادا کرنا درست ہے البتہ رومال وغیرہ سے سر باندھنے میں سر کا درمیانی حصہ چھپانا ضروری ہے ورنہ اس صورت میں بھی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا۔

لمافی شرح الوقایة (۱/۱۶۸): وصلاته حاسرا راسه للتکاسل او للتهاون بها. لیس المراد بالتهاون الاهانة بالصلاة فانها کفر بل المراد قلة رعایتها ومحافظة حدودها. وفی حاشیة (صلاته حاسرا راسه) والظاهر ان الکراهة ههنا تنزیهیة.

وفی فتاوی سراجیة (صـ۱۱): اذا صلی حاسر الرأس کره.

وفی الشامیة (۱/۱۳۲): اذا ذکروا مکروهاً فلا بد من النظر فی دلیله فان کان نهیا ظنیا یحکم بکراهة التحریم الالصارف النهی عن التحریم الی الندب فان لم یکن الدلیل نهیا بل کان مفیداً للترک الغیر الجازم فهی تنزیهیة.

وفی الشامیة (۱/۲۲۴): واعلم ان المکروه اذا اطلق فی کلامهم فالمراد منه التحریم الا ان ینص

علی کراهة التنزیه۔ فقد قال المصنف فی المصفی: لفظ الکراهة عند الاطلاق یراد بها التحریم.
قال ابو یوسف قلت لابی حنیفة: اذا قلت فی شئ اکرهه فما رأیک فیه؟ قال: التحریم.
وفی الشامیة (۱/۶۵۲): (والاعتجار) لنهی النبی ﷺ عنه، وهو شد الرأس او تکویر عمامته علی راسه وترک وسطه مکشوفاً.........و کراهته تحریمیة.
وفی الشامیة (۱/۶۵۳): ان السنة ان کانت مؤکدة قویة لا یبعد کون ترکها مکروهاً تحریماً وان کانت غیر مؤکدة فترکها مکروه تنزیهاً. واما المستحب او المندوب فینبغی ان یکره ترکه اصلاً.

(۱۱۹) سلام کا کتنا لفظ کہنے سے نماز سے خارج ہو جائے گا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز سے خروج کے لئے السلام علیکم کہنا واجب ہے تو قابل دریافت امر یہ ہے کہ پورا سلام کہنے سے نماز سے خارج ہو جاتا ہے یا نصف سلام یا اس سے بھی کم الفاظ کہنے سے نماز سے خارج ہو جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......دائیں طرف سلام کرتے وقت لفظ ''السلام'' کے میم کے ختم ہوتے ہی نمازی نماز سے خارج ہو جاتا ہے۔
لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۲۱۰): لفظ السلام مرتین فالثانی واجب علی الاصح برهان دون علیکم وتنقضی قدوة بالاول قبل علیکم علی المشهور وعلیه الشافعیة.
وفی الدر المختار (۱/۴۶۸): (ولفظ السلام) مرتین والثانی واجب علی الاصح برهان دون علیکم وتنقضی قدوة بالاول قبل علیکم علی المشهور عندنا وعلیه الشافعیة
قال الشامی تحته: (قوله وتنقضی قدوة بالاول) ای بالسلام الاول قال فی التجنیس الامام اذا فرغ من صلوته فلما قال السلام جاء رجل و اقتدی به قبل ان یقول علیکم لایصیر داخلا فی صلاته.

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾

(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۲۰) نابالغ کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چھوٹا بچہ بڑوں کی امامت کرسکتا ہے یا نہیں، نیز چھوٹا بچہ اگر چھوٹے بچوں کی امامت کرے تو اسکا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نابالغ بچے کی امامت بڑوں کیلئے مطلقاً ناجائز ہے چاہے فرائض ہوں یا نوافل بڑوں کی نماز ادا نہ ہوگی البتہ اگر بچہ بچوں کی امامت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

لمافی الشامية(۱/۵۵۰): وشروط الامامة للرجال الاصحاء ستة اشياء الاسلام والبلوغ والعقل والذكورة والقراءة والسلامة من الاعذار...... احترز بالرجال الاصحاء...... عن الصبيان فلايشترط فى امامهم البلوغ.

(۱۲۱) نابالغ بچہ کا نابالغ بچوں کی امامت کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مدارس میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ بچوں کو جب چھٹی ہوتی ہے تو ان میں سے ایک نابالغ بچہ نابالغ بچوں کی جماعت کراتا ہے شرعی طور پر یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نابالغ بچہ نابالغ بچوں کی امامت کراسکتا ہے۔

لمافی الدر المختار(۱/۵۷۸): وصح لو توضأ على الانقطاع وصلى كذلك كاقتداء بمفتصد أمن خروج الدم وكاقتداء امرأة بمثلها وصبى بمثله ومعذور بمثله الخ.

وفى الهندية(۱/۸۵): وامامة الصبى المراهق لصبيان مثله يجوز كذا فى الخلاصه اهـ.

وفى الشامية(۱/۵۷۷): واما غير البالغ فان كان ذكراً تصح امامته لمثله من ذكر وأنثى وخنثى اهـ.

(۱۲۲) ۱۶ سالہ لڑکے کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد کا امام ہوں، اور الحمدللہ پانچوں وقت

پابندی سے نماز پڑھاتا ہوں، میرا ایک بیٹا (عبدالحمید) ہے جس کی عمر سولہ، سترہ سال ہے اور وہ حافظ قرآن بھی ہے۔ کبھی کبھی میری عدم موجودگی میں وہ نماز پڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح ابھی رمضان میں آخری دنوں میں تراویح بھی اس نے پڑھائی تھی۔ میری مسجد کے بعض نمازی حضرات اس کی امامت پر اعتراض کرتے ہیں کہ ابھی یہ چھوٹا ہے۔ آپ حضرات سے شریعت کی روشنی میں یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا میرا یہ بیٹا فرض نمازوں میں، میری عدم موجودگی میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟ اور لوگوں کا اس پر اعتراض درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے بیٹے (عبدالحمید) کو نماز کے ضروری مسائل سے بخوبی واقفیت ہے اور امامت سے متعلق کوئی قابلِ اعتراض بات اس میں نہیں پائی جاتی تو شرعاً اس کے لئے نماز کی امامت کرانا درست ہے اور نمازیوں کا بلاوجہ اس کی امامت پر اعتراض کرنا شرعاً درست نہیں۔

لمافی الهندية(۱/۸۶۔۸۷): رجل ام قوما وهم له كارهون ان كانت الكراهة لفساد فيه أو لانهم أحق بالامامة يكره له ذلك وان كان هو أحق بالامامة لايكره هكذا في المحيط.

وفي الشامية(۱/۵۶۲):(قوله وكذا تكره خلف أمرد) الظاهر أنها تنزيهية أيضاً والظاهر أيضاً كماقال الرحمتي أن المراد به الصبيح الوجه لأنه محل الفتنة..... سئل العلامة الشيخ عبدالرحمن بن عيسى المرشدي عن شخص بلغ من السن عشرين سنة وتجاوز حد الانبات ولم ينبت عذاره فهل يخرج بذلك عن حد الأمردية وخصوصا قد نبت له شعرات في ذقنه تؤذن بأنه ليس من مستديري اللحى، فهل حكمه في الإمامة كالرجال الكاملين أم لا، أجاب: سئل العلامة الشيخ أحمد بن يونس المعروف بابن الشلبي من متأخري علماء الحنفية عن هذه المسألة فأجاب بالجواز من غير كراهة وناهيك به قدوة.

(۱۲۳) غیر شادی شدہ شخص کی امامت کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ہے جس کا تعلق اونچے خاندان سے ہے اور وہ درجہ سادسہ میں پڑھتے ہیں اور ان کے والد کا تعلق علماء اور مشائخ کے ساتھ ہے اور وہ طالبعلم ایک بڑی جامع مسجد کے امام بھی ہیں لیکن وہ غیر شادی شدہ ہیں جس کی وجہ سے اکثر مقتدی اعتراض کرتے ہیں تو اس صورت میں ان کے لئے نماز پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... شریعت میں امامت کیلئے امام کا اعلم بالسنۃ ہونا ضروری ہے (یعنی نماز کے مسائل پر عبور ہو کہ صحت نماز کیلئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں اور کن چیزوں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے وغیرہ) اسی طرح امام کا فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرنا بھی ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں جیسا کہ واضح ہے کہ مذکورہ امام وہ درجہ سادسہ کے طالب علم ہیں تو یقیناً نہ صرف نماز کے مسائل پر بلکہ دیگر مسائل پر بھی

انکو عبور حاصل ہوگا اور بظاہر وہ نیک وصالح بھی ہوں گے لہٰذا ایسے شخص کا نمازیں پڑھانا اور امامت کے منصب پر فائز ہونا جائز ہے اور مقتدیوں کا صرف ''غیر شادی شدہ'' ہونے کی بناء پر مذکورہ امام پر اعتراض کرنا صحیح نہیں۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۵۵): عن اوس بن ضمعج قال سمعت ابا مسعود الانصاری رضی الله عنه يقول قال رسول الله ﷺ يؤم القوم اقرؤهم لكتاب الله فان كانوا فی القراء ة سواء فاعلمهم بالسنة فان كانوا فی السنة سواء فاقدمهم هجرة فان كانوا فی الهجرة سواء فاكثرهم سنا ولا يؤم الرجل فی سلطانه ولا يجلس علی تكرمته فی بيته الا باذنه.

وفی الهندية(۱/۸۳): الاولی بالامامة اعلمهم باحكام الصلاة هكذا فی المضمرات وهو الظاهر هكذا فی البحر الرائق هذا اذا علم من القراء ة قدرما تقوم به سنة القراء ة هكذا فی التبيين ولم يطعن فی دينه كذا فی الكفاية وهكذا فی النهاية ويجتنب الفواحش الظاهرة وان كان غيره اورع منه كذا فی المحيط وهكذا فی الزاهدی وان كان متبحرا فی علم الصلاة لكن لم يكن له حظ فی غيره من العلوم فهوا ولی كذا فی الخلاصة.

وفی الشامية(۱/۵۵۷): (والاحق بالامامة)..... (الاعلم باحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وحفظه قدر فرض(قوله باحكام الصلاة فقط) ای وان كان غير متبحر فی بقية العلوم وهوا ولی من المتبحر كذا فی زاد الفقير عن شرح الارشاد (قوله بشرط اجتنابه الخ) كذا فی الدارية عن المجتبی وعبارة الكافی وغيره: الاعلم بالسنة اولی الا ان يطعن عليه فی دينه لان الناس لا يرغبون فی الاقتداء به..... وفی (ص۵۵۹) (ولو ام قوما وهم له كارهون، ان) الكراهة (لفساد فيه اولانهم احق بالامامة منه كره) له ذلك تحريما لحديث ابی داؤد ''لايقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون (وان هو احق لا) والكراهة عليهم.

(۱۲۴) جس امام کی قرأت صحیح نہ ہو، اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے قرآن غلط سلط پڑھ رکھا تھا لیکن اللہ کی توفیق سے چار ماہ لگائے اس میں قرآن بھی سیکھا جب واپس کالونی کی مسجد میں آیا تو اب امام صاحب کا قرآن غور سے سنا تو ان کی قرأت درست نہ تھی مثلاً اللہ اکبر کو (اَلْلٰهُوْ اَكْبَرْ) کہتے ہیں اور الحمدلله رب العلمين○ الرحمن الرحيم ○ درمیان میں نہ وقف کرتے ہیں اور نہ ملا کر پڑھتے ہیں بلکہ ایک سانس میں پڑھتے ہیں اور الرحمٰن الف پر زبر کو ظاہر کرتے ہیں اور اَلْعٰلَمِيْنَ کا زبر جو نون پر ہے کھا جاتے ہیں۔ کیا اس سے نماز میں خلل آتا ہے یا نہیں؟ ہم تو ۱۸ سال سے ان کے پیچھے نمازیں پڑھ رہے ہیں گذشتہ نمازوں کا کیا

حکم ہے؟ مہربانی فرمائی جائے کہ بندہ بہت زیادہ پریشان ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....امام ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو بقدرِ ضرورت تجوید (وقف، وصل، تشدید، تخفیف وغیرہ) کو جانتا ہو، اور قرآن پاک کو صحیح پڑھ سکتا ہو۔ صورت مسئولہ میں جس امام صاحب کے پیچھے اب تک آپ نے نمازیں پڑھی ہیں وہ تو ٹھیک ہیں، ان کی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ امام صاحب نے ایسی غلطی نہیں کی ہے جس سے نماز فاسد ہو جائے البتہ آئندہ کیلئے ان امام کے بجائے کسی ایسے امام کو مقرر اور متعین کرنا چاہیے جو بقدرِ ضرورت تجوید سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کو بھی صحیح پڑھ سکتا ہو۔

لما في حاشية الطحطاوي (ص ۲۷۹): قوله: (بلا مدّ) الحاصل ان المد في التكبير إما ان يكون في لفظ الله او في لفظ اكبر، فان كان في لفظ الله فاما ان يكون في اوله اوفي وسطه او في آخره......

وان كان في آخره بان اشبع حركة الهاء فهو خطأ من حيث اللغة ولا تفسد به الصلاة، وكذا تسكينها كذا في الحلبي.

وفي الهندية (۱/۸۱): (ومنها الوقف والوصل والابتداء في غير موضعها) اذا وقف في غير موضع الوقف أو ابتدأ في غير موضع الابتداء ان لم يتغير به المعنى تغيرا فاحشا...... لا تفسدبا لاجماع بين علمائنا هكذا في المحيط. وكذا ان وصل في غير موضع الوصل كمالو لم يقف عند قوله أصحاب النار بل وصل بقوله الذين يحملون العرش لاتفسد......

وفي الدر المختار (۱/۴۸۰): (واذا أراد الشروع في الصلاة كبر)...... (للافتتاح)...... (بالحذف) اذ مد احد الهمزتين مفسد وتعمده كفر وكذا الباء في الاصح. وفي الشامية تحته اعلم ان المد ان كان في الله فاما في اوله اووسطه او آخره...... وان كان في آخره فهو خطأ ولا يفسد ايضا، وقياس عدم الفساد فيهما صحة الشروع بهما

وفي الشامية (۱/۶۳۲): تحت (قوله أو بوقف وابتداء) قال في البزازية الابتداء ان كان لا يغير المعنى تغير افاحشا لايفسد......

وفي الهندية (۱/۸۳): الاولىٰ بالامامة أعلمهم باحكام الصلوة هكذا في المضمرات وهو الظاهر هكذا في البحر الرائق، هذا اذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين......فان تساووا فأقرؤهم اى اعلمهم بعلم القراءة يقف في موضع الوقف ويصل في موضع الوصل ونحو ذالك من التشديد والتخفيف وغيرهما كذا في الكفاية.

(۱۲۵) تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک کرنے والے کی امامت کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلّہ میں ایک امام صاحب ہیں جو تعویذ گنڈے

اور جھاڑ پھونک کرتے ہیں ان کے پاس عورتیں تعویذات کیلئے آتی رہتی ہیں اس امام صاحب کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بکثرت روکنے کے باوجود اس کام سے باز نہیں آرہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جائز طریقہ سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جائز طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک قرآن وحدیث اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ذریعے یا ایسے کلام کے ذریعے کیا جائے جس میں شرکیہ کلمات نہ ہوں اور وہ عربی زبان میں ہو یا ایسی زبان میں ہو جس کے معنی معلوم ہوں اور اس کو مؤثر بالذات سمجھنے کا اعتقاد نہ ہو بلکہ اسکا اعتقاد یہ ہو کہ مؤثر حقیقی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور تعویذ گنڈہ دوسرے اسباب کی طرح ایک سبب ہے جو نفع ونقصان دینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا محتاج ہے۔ لہٰذا جو امام صاحب جائز طریقہ سے تعویذ گنڈے کرتے ہوں ان کی امامت درست ہے البتہ نامحرم عورتوں کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، براہ راست تعویذ نہ دینا چاہئے، بلکہ ان کے کسی محرم یا خاوند کے ذریعے ان کو تعویذ دینا چاہئے۔

وفی الدر المختار(۶/۳۶۳): (فرع) فی المجتبی: التمیمة المکروهة ما کان بغیر العربیة.

(وفی الشامیة تحته): ولاباس بالمعاذات اذا کتب فیها القرآن او اسماء الله تعالیٰ ویقال رقاه الراقی رقیا ورقیة اذا عوذه ونفث فی عوذته قالوا وانما تکره العوذة اذا کانت بغیر لسان العرب، ولا یدری ما هو ولعله یدخله سحر أو کفر أو غیر ذالک، واما ما کان من القرآن او شی من الدعوات فلا باس به اهـ.

(۱۲۶) بریلویوں کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں بریلویوں کی مساجد ہیں، دیوبندیوں کی ذرا دور ہیں، تو کیا ہم بریلویوں کی مساجد میں ان کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتے ہیں یا محلے سے دور دیوبندیوں کے پیچھے جا کر نمازیں پڑھیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایسا مبتدع امام جس کے عقائد کفریہ ہوں تو اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ اور اگر اس کے عقائد کفریہ نہ ہوں تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر بریلوی ایسے ہیں کہ ان کے عقائد کفریہ ہیں تو ان کی اقتداء میں نماز نہیں ہوتی اور اگر ان کے عقائد کفریہ نہیں تو ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا بریلویوں کی مساجد کے علاوہ دوسری مساجد دیوبندیوں کی ہیں ان میں جا کر نماز پڑھنا چاہئے۔ البتہ اگر آپ (کسی عذر کی وجہ سے) وہاں نہیں جا سکتے تو اکیلے نماز پڑھنے سے (ان بریلویوں کے پیچھے جن کے عقائد کفریہ نہیں) انکے پیچھے نماز پڑھ لینا بہتر ہے۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۱۵۰): والفاسق اذا کان یؤم الجمعة وعجز القوم عن منعه قال بعضهم یقتدی به فی الجمعة ولا یترک الجماعة بامامة وفی غیر الجمعة یستقبل من ان یتحول الی مسجد

آخر ولا یاثم بذلک ولو صلی خلف مبتدع اوفاسق فهو محرز ثواب الجماعة. لکن لاینال مثل ما ینال خلف تقی.

وفی الهندیة(۱/۸۶): الفاسق اذا کان یؤم یوم الجمعة وعجز القوم عن منعه قال بعضهم یقتدی به فی الجمعة ولا تترک الجمعة بامامته وفی غیر الجمعة یجوز ان یتحول الی مسجد آخر ولایأثم به.

(۱۲۷) غیرمقلد کی امامت کا شرعی حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں سفر پر جارہا تھا تو راستے میں ہم نے ایک مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جو غیرمقلدین کی تھی تو کیا ہماری نماز غیرمقلد کے پیچھے صحیح ہوگئی یا دوبارہ اعادہ واجب ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....فقہاء کرام نے مخالف مذہب والے امام کی اقتداء کے بارے میں تمام کتب معتبرہ ومستندہ میں یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر مخالف مذہب والا امام (مثلاً غیرمقلد ہو) اگر وہ ان مسائل میں جو ہمارے علماء احناف اوران کے مابین مختلف فیہا ہوں ان میں ہمارے اصول کی رعایت رکھتا ہو، مثلاً غیر سبیلین سے کسی شے کے خارج ہونے پر وضو کرتا ہو، کپڑوں پر بقدر درہم منی لگ جانے پر دھوتا ہو، خون کے نکلنے پر وضو کرتا ہو، تو اس صورت میں اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اوراگر رعایت نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اورآج کل کے غیرمقلدین کا ان مسائل میں ہمارے اصول کی رعایت نہ کرنا روزِ روشن کی طرح عیاں ہے لہٰذا اب ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اوراحتیاطاً واجب الاعادہ ہے۔لہٰذا آپ نے جو نماز غیرمقلد امام کی اقتداء میں ادا کی ہے احتیاطاً اس نماز کا اعادہ کرلیجئے۔

لمافی الشامیة(۱/۵۶۳): وأما الاقتداء بالمخالف فی الفروع کالشافعی فیجوز مالم یعلم منه مایفسد الصلاة علی اعتقاد المقتدی علیه الاجماع، انما اختلف فی الکراهة اهـ فقید بالمفسد دون غیره کما تری فی رسالة [الاهتداء فی الاقتداء] لملاعلی القاری: ذهب عامة مشایخنا إلی الجواز اذا کان یحتاط فی موضع الخلاف والا فلا. والمعنی أنه یجوز فی المراعی بلا کراهة وفی غیره معها ثم المواضع المهملة للمراعاة ان یتوضأ من الفصد والحجامة والقیئ والرعاف ونحو ذالک لافیما هو سنة عنده مکروه عندنا کرفع الیدین فی الانتقالات وجهر البسملة واخفائها فهذا وأمثاله لایمکن فیه الخروج عن عهدة الخلاف فکلهم یتبع مذهبه ولا یمنع مشربه اهـ.

وفی الفتاویٰ الکبریٰ لابن تیمیة (۲/۲۸۵): یکونون فی وقت یقلدون من یفسده وفی وقت یقلدون من یصححه بحسب الغرض والهویٰ ومثل هذا لایجوز باتفاق الامة.

(۱۲۸) جو شخص مرغ لڑاتا، نسوار اور سگریٹ استعمال کرتا ہو، اس کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نسوار کھاتا ہے اور سگریٹ کثرت سے پیتا ہے اور مرغ لڑاتا ہے تو ایسے شخص کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں جبکہ وہ قاری ہے اور منزل بھی یاد ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی امام نسوار یا سگریٹ استعمال کرتا ہو تو اس کو چاہئے کہ انکا استعمال ترک کردے اور اگر اس کے لئے ان چیزوں کا ترک کرنا مشکل ہو تو پھر جب بھی مسجد آئے تو نسوار اور سگریٹ کی بدبو کو زائل کر کے آئے کیونکہ حدیث میں بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اگر امام مرغ لڑاتا ہو تو اس کو اس سے بچنا چاہئے کیونکہ مرغ لڑانا ناجائز ہے اور اسی طرح مرغ لڑانے پر جوا لگانے سے اس فعل کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے مرغ لڑانے اور اس پر جوا لگانے سے آدمی فاسق ہو جاتا ہے اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

لمافی الشامیة(۱/۵۵۹): (ویکره تنزیها الخ) لقوله فی الاصل امامة غیرهم احب الی، بحر عن المجتبیٰ والمعراج ثم قال فیکره لهم التقدم ویکره الاقتداء بهم تنزیها فان امکن الصلوة خلف غیرهم فهو افضل والا فالاقتداء اولی من الانفراد ...... (صـ۵۶۰) (قوله و فاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر، والزانی وآکل الربا ونحو ذلک کذا فی البرجندی اسمعیل وفی المعراج قال اصحابنا لاینبغی ان یقتدی بالفاسق الا فی الجمعة لانه فی غیرها یجد اماما غیره اھ قال فی الفتح وعلیه فیکره فی الجمعة اذا تعددت اقامتها فی المصری علی قول محمد المفتی به لانه بسبیل الی التحول.

(۱۲۹) داڑھی پر سیاہ خضاب لگانے والے کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص داڑھی پر سیاہ خصاب لگاتا ہو تو اس کو امام بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... داڑھی پر سیاہ خضاب لگانا مکروہ تحریمی ہے اور اس کا مرتکب فاسق ہے اور فاسق کا امام بنانا مکروہ ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص اپنے اس فعل کو چھوڑ کر توبہ نہیں کرتا تو اس کو امام نہ بنایا جائے بلکہ کسی متقی شخص کو امامت کیلئے منتخب کرنا چاہئے۔

لمافی الهندیه(۵/۳۵۹): أما الخضاب بالسواد فمن فعل ذلک من الغزاة لیکون اهیب فی عین العدوّ فهو محمود منه اتفق علیه المشایخ ومن فعل ذلک لیزین نفسه للنساء ولیحبب نفسه الیهن فذلک مکروه وعلیه عامة المشایخ. وبعضهم جوز ذلک من غیر کراهة. وروی عن أبی یوسف أنه

قال: کما یعجبنی ان تتزین لی یعجبها أن أتزین لها.

وفی الشامیۃ (۷۵۶/۶): ومذھبنا استحباب خضاب الشیب للرجل والمرأۃ بصفرۃ أوحمرۃ وتحریم خضابہ بالسواد علی الاصح.

وفی التاتارخانیۃ (۶۰۳/۱): ویکرہ ان یکون الامام فاسقا...... وفی الکافی: وان تقدم الفاسق جاز...... یجوز الاقتداء بمن کان معروفا بأکل الربا ولکن یکرہ.

(۱۳۰) مسجد کا مقرر شدہ امام امامت کیلئے حقدار ہے یا دوسرا شخص؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر مسجد میں کوئی بڑا عالم دین اور بزرگ بھی آ جائے تو نماز کون پڑھائے، امام مسجد یا مذکورہ بزرگ؟ بعض مقتدیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ مذکورہ بزرگ نماز پڑھائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد کا جو مقرر امام ہے وہی مستحق ہے کہ امامت کرائے اگرچہ آنے والا بزرگ اور بڑا عالم کیوں نہ ہو۔

لمافی الدر المختار والشامیۃ (۵۵۹/۱): واعلم أن صاحب البیت ومثلہ امام المسجد الراتب اولیٰ بالإمامۃ من غیرہ مطلقا. (قولہ مطلقا) ای وإن کان غیرہ من الحاضرین من ھو أعلم وأقرأ منہ.

وفی الھندیۃ (۸۳/۱): دخل المسجد من ھو أولیٰ بالإمامۃ من إمام المحلۃ فإمام المحلۃ اولیٰ کذا فی القنیۃ.

(۱۳۱) امامت میں وراثت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جہاں پر ایک امام کے مرنے پر اس کا بیٹا امام بن جاتا ہے، اس کے مرنے پر پھر اس کا بیٹا امام بن جاتا ہے اور اکثر بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے، تو کیا امامت میں اس طرح کی وراثت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... امامت میں وراثت جاری نہیں ہوتی بلکہ بانی مسجد اور محلہ والے جس کو بھی امام بنائیں وہی امام ہوگا، چاہے وہ امام کا بیٹا ہو یا کوئی اور ہو، بشرطیکہ اس میں امامت کی شرائط اور صلاحیت موجود ہو۔

لمافی الھندیۃ (۸۳/۱): الاولی بالامامۃ أعلمھم بأحکام الصلاۃ ھکذا فی لمضمرات وھو الظاھر ھکذا فی البحر الرائق ھذا اذا علم من القراءۃ قدرما تقوم بہ سنۃ القراءۃ ھکذا فی التبیین ولم یطعن فی دینہ کذا فی الکفایۃ وھکذا فی النھایۃ ویجتنب الفواحش الظاھرۃ وان کان غیرہ اورع منہ کذا فی المحیط وھکذا فی الزاھدی وان کان متبحرا فی علم الصلاۃ لکن لم یکن لہ حظ فی غیرہ من

العلوم فهو أولىٰ كذا في الخلاصة فان تساووا فاقرء هم أي اعلمهم بعلم القراءة.

وفي تنوير الابصار مع الدر (۱/۵۵۷): (والأحق بالامامة) تقديما بل نصبا مجمع الانهر (الاعلم باحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وحفظه قدر فرض وقيل واجب وقيل سنة (ثم الاحسن تلاوة) وتجويداً (للقراة ثم الاورع) الاكثر اتقاء للشبهات والتقوى اتقاء المحرمات (ثم الاسن) اى الاقدم اسلاما فيقدم شاب على شيخ اسلم وقالوا يقدم الاقدم ورعا وفي النهر عن الزاد وعليه يقاس سائر الخصال فيقال يقدم الدم علما ونحوه وحينئذ فقلما يحتاج للقرعة (ثم الاحسن خلقا) بالضم الفة بالناس (ثم الاحسن وجها).

وفي الدر المختار (۱/۴۰۰): ولاية الاذان والاقامة لباني المسجد مطلقا وكذا الامامة لو عدلا

وفي الشامية تحته: (قوله مطلقا) اى عدلا أولا. وفي الأشباه: ولد الباني وعشيرته اولىٰ من غيرهم اهـ

(۱۳۲) حضور ﷺ سے وتر کی امامت کا ثبوت اور مسبوق کا اپنی چھوٹی ہوئی رکعت کو پورا کرنے کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نماز میں کچھ تاخیر سے پہنچا اور اس کی کچھ رکعت امام کے پیچھے چھوٹ گئی تو وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کر لیتا ہے سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ کب سے شروع ہوا کیا یہ طریقہ جو آجکل معمول ہے حدیث میں آیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے اسے مدینہ منورہ میں شروع کیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا پھر رائج کیا؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۲)۔ کیا وتر کی امامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسبوق کی نماز کا طریقہ اصل میں سنت سے ثابت ہے البتہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اکثر رکعت رہ جاتی تھی ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا کہ وہ اپنی فوت شدہ نماز پوری کر رہے ہیں تو آپ علیہ السلام نے تاکید کے طور پر فرمایا کہ تم میں سے جب کسی کی رکعت چھوٹ جائے تو تم بھی ایسا ہی کر لیا کرو جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کر رہے ہیں۔

(۲)...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر کی امامت ثابت نہیں ہے کیونکہ آپ علیہ السلام وتر ہمیشہ گھر میں پڑھا کرتے تھے البتہ صحابہ کرام سے صرف رمضان المبارک میں وتر باجماعت پڑھنا ثابت ہے اس لئے فقہاء کرام نے غیر رمضان میں وتر باجماعت نہ پڑھنے پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔

لما في مسند امام احمد بن حنبل (۶/۲۴۶): حدثنا عبدالله...... عن معاذ بن جبل قال احيلت الصلوة

ثلاثة احوال...... قال وكانوا يأتون الصلوة وقد سبقهم ببعضها النبی ﷺ قال فكان الرجل يشير الى الرجل ان جاء كم صلى فيقول واحدة أو اثنتين فيصليها ثم يدخل مع القوم فى صلاتهم قال: فجاء معاذ فقال لا اجده على حال أبدا الاكنت عليها ثم قضيت ماسبقنى قال فجاء وقد سبقه النبی ﷺ ببعضها قال فثبت معه فلما قضى رسول الله ﷺ صلاته قام فقضى فقال رسول الله ﷺ انه قد سن لكم معاذ فهكذا فاصنعوا......

وفى اعلاء السنن(۶،۵/۳۳): وروى ابن مسعود مرفوعا قال رسول الله ﷺ وتر الليل ثلاث كوتر النهار صلاة المغرب، واسناده حسن كما سيأتى......(ص ۳۴) ولان عائشةؓ كانت ترى وتره ﷺ اكثر مما يراه ابن عمر لانه ﷺ كان يوتر فى بيته دائما وفى آخر الليل غالبا......

وفيه ايضاً(۵،۶/۳۶): حدثنا ابو النضر...... عن عائشةؓ ان رسول الله ﷺ كان اذا صلى العشاء دخل المنزل ثم صلى ركعتين ثم صلى بعدهما ركعتين اطول منهما ثم اوتر بثلاث لايفصل بينهن.

وفى الهداية(۱/۱۵۸): ولا يصلى الوتر بجماعة فى غير شهر رمضان عليه اجماع المسلمين.

(۱۳۳) فجر اور ظہر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فجر اور ظہر کی نمازیں بسا اوقات تاخیر سے آتے ہیں اور جلدی سے وضو کر کے سنت ادا کئے بغیر نماز پڑھاتے ہیں جبکہ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ فجر یا ظہر کی سنتیں پڑھنے سے پہلے امام کا جماعت کرانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فجر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کرنا مکروہ ہے کیونکہ فرض کے بعد وقت کے اندر ان کی قضاء نہیں ہوسکتی، اس لئے کراہت زیادہ ہے البتہ ظہر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کرنا جائز ہے لیکن بلاعذر ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

لمافى الترمذى (۱/۹۷): عن عائشة ان النبی ﷺ كان اذا لم يصل اربعا قبل الظهر صلاهن بعدها.

وفى اعلاء السنن(۷/۷): عن عائشة رضى الله عنها قالت لم يكن النبی ﷺ على شى من النوافل اشد تعاهداً منه على ركعتى الفجر. قوله عن عائشة رضى الله عنهاالخ، قال المؤلف دلالته على تاكيدسنة الفجر ظاهرة.

(۱۳۴) فجر کی سنت ادا کئے بغیر امامت کرانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے امام صاحب کو اگر کبھی فجر کی جماعت کے وقت

پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے تو وہ بغیر سنت پڑھے نماز فجر پڑھا دیتے ہیں۔ میں نے کسی سے سنا ہے کہ فجر کی سنت جس نے نہ پڑھی ہو، اسے فجر کے فرض پڑھانا مکروہ ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ براہِ کرم صحیح بات سے مجھے جلد از جلد مطلع فرما دیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً...... فجر کی سنت تمام سنتوں میں مؤکد ترین اور اقویٰ سنت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پڑھنے پر مداومت فرمائی ہے۔ اور سفر و حضر صحت و بیماری کسی حال میں ترک نہیں فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کا ترک کرنا درست نہیں۔ البتہ اگر کسی نے عذر کی بناء پر چھوڑ دی تو اس پر گناہ نہیں۔

صورت مسئولہ میں اگر امام صاحب کو جماعت کے وقت پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے اور وہ سنت پڑھے بغیر فجر کی نماز پڑھا دیں تو نماز پڑھانا درست ہے۔ البتہ بغیر عذر کے ایسا کرنا خلاف سنت ہے۔

لمافی البخاری (۱/۱۵۶): عن عائشة قالت لم یکن النبی ﷺ علی شئ من النوافل اشد تعاهدا منه علی رکعتی الفجر.

وفی الفتاوی التاتارخانیة (۱/۶۴۱): یجب ان یعلم ان التطوع قبل الفجر رکعتان اتفقت الاثار علیهما وانهما من اقوی السنن، وفی المنافع: سنة الفجر اقوی السنن حتی لو انکرها یخشی علیه الکفر، ولا یجوز ان یصلیها قاعدا مع القدرة علی القیام، ولهذا قیل انها قریب من الواجب،

وفیه ایضاً (۱/۶۴۴): وفی النوازل: اذا ترک السنن ان ترکها بعذر فهو معذور، وان ترکها بغیر عذر لایکون معذورا فیها ویسأل الله تعالیٰ یوم القیامة عن ترکها. (وفی الصفحة ۶۴۶) وفی الکافی: وقالوا لو کان العالم مرجعا للفتوی له ترک سائر السنن لحاجة الناس الیه الاسنة الفجر.

(۱۳۵) اقامت کے وقت امام اور مقتدی کب کھڑے ہوں؟ اور امام کب تکبیر تحریمہ کہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں موجود ہے کہ جماعت کے وقت امام اور مقتدی حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں اور امام قد قامت الصلوٰۃ کے وقت نماز شروع کر دے۔ عبارت یہ ہے والقیام حین قیل حی علی الفلاح وشروع الامام مذقیل قد قامت الصلوٰة کنز الدقائق (۱/۲۴) آجکل ہماری مساجد میں اس کے خلاف عمل ہو رہا ہے کہ امام اور مقتدی اقامت سے پہلے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اقامت ختم ہو جانے کے بعد امام نماز شروع کرتا ہے۔ آیا ہماری مساجد میں یہ عمل خلاف سنت ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس عبارت کا کیا مقصد ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا معمول تھا؟

الجواب حامداً و مصلیاً...... امام اور مقتدی کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱)۔ کہ مقتدی مسجد میں ہو، اور امام خارج مسجد سے داخل ہو رہا ہو۔ اگر امام سامنے محراب کی طرف سے داخل ہو رہا ہو۔ تو مقتدی ان کو دیکھتے ہی نماز کیلئے کھڑے ہو جائیں۔ (۲)۔ اگر امام صف کے پیچھے سے آ رہا ہو، تو امام جس صف سے گزرتا جائے اس صف والے مقتدی کھڑے ہوتے جائیں۔ (۳)۔ امام اور مقتدی مسجد کے اندر ہوں۔

تو اس بارے میں ہماری کتب میں جو تصریح ہے۔ جیسے کہ کنز الدقائق (۲۴/۱) پر ہے ''والقیام حین قد قیل حی علی الفلاح'' اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد امام اور مقتدی نہ بیٹھے جیسا کہ البحر الرائق (۵۳۱/۱) میں اس کی علت یہ بیان کی ہے ''لانہ أمر فیستحب المسارعة الیه'' تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بیٹھنا مسارعت اِلی الطاعت کے خلاف ہے۔ نہ کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا بلکہ اس میں مسارعت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور یہ کہ کنز کی اس عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا تعامل بھی یہ تھا کہ ابتداء اقامت سے کھڑے ہوتے تھے۔ لہٰذا ہماری مساجد میں ائمہ اور مقتدیوں کا اقامت کی ابتداء سے کھڑا ہونا خلاف سنت نہیں ہے اور امام کے شروع فی الصلوٰۃ کے بارے میں امام ابو یوسفؒ کا قول یہ ہے کہ جب مؤذن اقامت سے فارغ ہو جائے تو امام تکبیر کہے۔ تاکہ مؤذن امام کے ساتھ تکبیر اولیٰ اور امام کے ساتھ نماز شروع کرنے کی فضیلت سے محروم نہ ہو جائے۔

لمافي الصحيح لمسلم (۲۲۰/۱): عن أبي هريرةؓ ان الصلوة كانت تقام لرسول الله ﷺ فيأخذ الناس مصافهم قبل أن يقوم النبي ﷺ مقامه.

وفي فيض الباري (۱۸۷/۲): باب (متى يقوم الناس) ويعلم من بعض الأحاديث أنهم كانوا يقومون لها بعد تمام الإقامة ومن بعضها أنهم كانوا يقومون في خلالها وهكذا في كتبنا...... والمسألة فيه أن الامام إن كان خارج المسجد ينبغي للمقتدين أن يقوموا لتسوية الصفوف إذا دخل في المسجد، وإن كان في المسجد فالمعتبر قيامه من موضعه وكيف ما كان ليست المسألة من نفس الصلاة بل من الآداب فان قام أحدٌ قبله لا يكون عاصياً.

"فلا تقوموا حتى تروني" قال العلماء إن بلالاً رضي الله عنه كان يراقب النبي ﷺ فاذا رأه أقام وأما سائر الناس فكانوا لايرونه إلا بعد أن يصل إلى الصف وكان المسجد من بيته بحيث لو خرج قدمه منها وقع في المسجد فكان بلال رضي الله عنه يقيم إذا خرج فاذا وصل موضع الإقامة وجد الصفوف قد سويت والاقامة قد تمت.

وفي البحر الرائق (۵۳۱/۱): قوله: (والقيام حين قيل حيّ على الفلاح) لانه أمر به فيستحب المسارعة إليه أطلقه فشمل الإمام والمأموم إن كان الإمام بقرب المحراب وإلا فيقوم كل صف ينتهي اليه الإمام وهو الأظهر...... (وشروع الإمام مذقيل قدقامت الصلاة) عند أبي حنيفةؒ و محمدؒ و قال أبو يوسفؒ: يشرع إذا فرغ من الإقامة محافظة على فضيلة متابعة المؤذن وإعانة للمؤذن على الشروع معه ولهما أن المؤذن أمين، وقد أخبر بقيام الصلاة فيشرع عنده صوناً لكلامه عن الكذب وفيه مسارعة إلى المناجات وقد تابع المؤذن في الأكثر فيقوم مقام الكل على أنهم قالوا المتابعة في الأذان دون الاقامة كذا ذكره الشارح وفيه نظر لما نقلناه في باب الأذان أن اجابة الاقامة مستحبة

وفي الظهيرية: ولو أخر حتى يفرغ المؤذن من الاقامة لا بأس به في قولهم جميعا والله اعلم.

وفي الهندية(۱/۵۷): وإن كان المؤذن غير الإمام وكان القوم مع الإمام في المسجد فانه يقوم الإمام والقوم إذا قال المؤذن حيّ على الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو الصحيح ☆ فاما إذا كان الإمام خارج المسجد فان دخل المسجد من قبل الصفوف فكلما جاوز صفا قام ذلك الصف واليه مال شمس الائمة الحلواني والسرخسي وشيخ الإسلام خواهرزاده وإن كان الإمام دخل المسجد من قدامهم يقومون كما رأ والامام وإن كان المؤذن والإمام واحدا فإن أقام في المسجد فالقوم لا يقومون مالم يفرغ من الإقامة وإن أقام خارج المسجد فمشائخنا اتفقوا على أنهم لا يقومون مالم يدخل الإمام المسجد.

وفي الدر المختار(۱/۴۷۹): (قوله وشروع الإمام) في الصلوة (مذقيل قد قامت الصلوة) ولو أخّر حتى اتمها لا بأس به إجماعاً وهو قول الثاني والثلاثة. وهو أعدل المذاهب كمافي شرح المجمع لمصنفه وفي القهستاني معزيا للخلاصة وهو الأصح (وتحته في الشامية) ......(قوله لا بأس به إجماعاً) أى لأن الخلاف في الأفضلية فنفي البأس اى الشدة ثابت في كلا القولين وإن كان الفعل أولى في أحدهما (قوله وهو) أى التأخير المفهوم من قوله أخر (قوله أنه الأصح) لأنه فيه محافظة على فضيلة متابعة المؤذن وإعانة له على الشروع مع الإمام.

(۱۳۶) امام کا محراب میں کھڑے ہونے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام کو محراب میں کس جگہ کھڑا ہونا چاہئے۔ اگر کوئی امام محراب سے بالکل باہر کھڑا ہو، لیکن سجدہ محراب میں ادا کرتا ہو، کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... محراب اگر اتنی چھوٹی ہو کہ اُس میں امام کے کھڑے ہونے سے اُس کی حالت مقتدیوں پر مشتبہ ہوتی ہو تو مکروہ ہے۔ البتہ اگر اتنی بڑی محراب ہو کہ اُس میں کھڑے ہونے سے امام کی حالت مقتدیوں پر مشتبہ نہ ہوتی ہو تو امام کا محراب میں کھڑا ہونا بلا کراہت جائز ہے۔

لمافي الهندية (۱/۱۰۸): ويكره قيام الامام وحده في الطاق وهو المحراب ولايكره سجوده فيه اذا كان قائما خارج المحراب هكذا في التبيين وإذا ضاق المسجد بمن خلف الامام فلابأس بأن يقوم في الطاق كذا في الفتاوىٰ البرهانية.

وفي الطحطاوى تحته (قوله لاشتباه الحال على القوم) فان انتفى الاشتباه انتفت الكراهة وهذا

التعليل لجماعة منهم الفقيه أبو جعفر الهندوانی.

وفی الشامية (۱/۲۲۵): وحاصله أنه صرح محمد فی الجامع الصغير بالكراهة ولم يفصل، فاختلف المشايخ فی سببها، فقيل كونه يصير ممتازا عنهم فی المكان لأن المحراب فی معنى بيت آخر وذلک صنيع أهل الكتاب، واقتصر عليه فی الهداية واختاره الامام السرخسیؒ و قال إنه الأوجه، وقيل اشتباه حاله على من فی يمينه ويساره فعلی الاول يكره مطلقا وعلی الثانی لايكره عند عدم الاشتباه، وأيد الثانی فی الفتح بأن امتياز الامام فی المكان مطلوب، وتقدمه واجب وغايته اتفاق الملتين فی ذلک، وارتضاه فی الحلية وأيده لكن نازعه فی البحر بأن مقتضی ظاهر الرواية الكراهة مطلقاً، وبأن امتياز الامام المطلوب حاصل بتقدمه بلاوقوف فی مكان اخر ولهذا قال فی الولوالجية وغيرها إذا لم يضق المسجد بمن خلف الامام لاينبغی له ذلک لأنه يشبه تباين المكانين.........

قلت: ای لأن المحراب إنما بنی علامة لمحل قيام الامام ليكون قيامه وسط الصف كما هو السنة، لا لأن يقوم فی داخله فهو وإن كان من بقاع المسجد لكن أشبه مكانا اخر فأورث الكراهة.

(۱۲۷) امام اور مقتدیوں میں تعدادِ رکعات میں اختلاف کی صورت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام اور مقتدی میں تعدادِ رکعات پر اختلاف ہوجائے تو کس کا قول معتبر ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب امام اور مقتدیوں کو تعدادِ رکعات میں اختلاف ہوجائے۔ مثلاً مقتدی کہیں کہ تین رکعات پڑھائی ہیں۔ جبکہ امام کہتا ہو کہ میں نے پوری چار رکعات پڑھائی ہیں۔ تو اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱)...... اگر امام کو اپنی بات کا پورا یقین ہے تو اس صورت میں امام کا قول معتبر ہوگا۔

(۲)...... اگر امام کو اپنی بات کا پورا یقین تو نہیں ہے مگر مقتدیوں میں سے کوئی ایک بھی اس کا حامی ہے تو اس صورت میں بھی امام کا قول معتبر ہوگا۔

(۳)...... امام کو اپنی بات کا پورا یقین بھی نہیں ہے، اور تمام مقتدی بھی اس کی رائے کے مخالف ہیں تو اس صورت میں مقتدیوں کا قول معتبر ہوگا، اور نماز دوبارہ لوٹائی جائے گی۔

لما فی الهندية (۱/۱۳۱): إذا شک الإمام فأخبره عدلان يأخذ بقولهما رجل صلی وحده أو صلی بقوم. فلما سلّم، أخبره رجل عدل، إنک صليت الظهر ثلاث ركعات. قالوا إن كان عند المصلی أنه صلی أربع ركعات لايلتفت إلی قول المخبر.

وفی الدر المختار(۲/۹۴): ولو إختلف الإمام والقوم فلو الإمام علی یقین لم یعد وإلا أعادبقولهم.

وفی الطحطاوی(۱/۳۱۷):(قوله ولو إختلف الإمام والقوم). أی کل القوم، أما لو إختلف القوم وقال بعضهم صلی ثلاثاً وقال بعضهم صلی أربعا. والإمام مع أحد الفریقین یؤخذ بقول الامام وإن کان معه واحد.

(۱۳۸) گرمی کی وجہ سے مسجد کے ہال کو چھوڑ کر مسجد کی چھت پر جماعت کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک مسجد ہے جس میں رمضان المبارک میں ماشاء اللہ تراویح مع ختم قرآن ہوتی ہے۔لیکن بعض اوقات موسم گرما میں نماز عشاء اور تراویح وغیرہ مسجد کی چھت پر پڑھی جاتی ہے۔ خصوصاً جب بجلی موجود نہ ہو سخت پریشانی ہوتی ہے۔تو کیا جماعت خانہ خالی ہوتے ہوئے مسجد کی چھت پر نماز عشاء وتراویح ادا کرنا مکروہ ہے یا جائز؟ حالانکہ مسجد کی چھت تو مسجد ہی کے حکم میں ہوا کرتی ہے۔جیسے معتکف اگر مسجد کی چھت پر چڑھ جائے تو اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔سوال یہ ہے کہ مسجد کی چھت پر جماعت خانہ کے خالی ہوتے ہوئے نماز عشاء وتراویح ادا کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....مسجد کے ہال کو چھوڑ کر چھت پر بغیر عذر نمازِ عشاء یا تراویح کی جماعت مکروہ ہے۔اور فقہاء کرام کی عبارات گرمی کی وجہ سے چھت پر باجماعت نماز کی کراہت پر واضح ہیں۔لہٰذا گرمی کوئی ایسا عذر نہیں جس کی وجہ سے مسجد کے ہال کو چھوڑ دیا جائے البتہ مسجد کے صحن میں نماز ادا کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

جہاں تک معتکف کی بات ہے، معتکف کے چھت پر چڑھنے کی وجہ سے اعتکاف اس لئے نہیں ٹوٹتا کہ چھت مسجد کے حکم میں ہے اور جماعت اس لئے مکروہ ہے کہ چھت جماعت خانے کے حکم میں نہیں ہے اسلئے اگر کسی مسجد کی دو منزلیں ہیں تو دوسری منزل میں ہال کو چھوڑ کر نماز یا جماعت بلا کراہت جائز ہے کیونکہ وہ جماعت خانے کے حکم میں ہے۔

لمافی کبیری(صـ۳۹۲): وفی القنیة امام یصلی التراویح علی سطح المسجد اختلف فی کراهته والاولی ان لایصلی فیه عند العذر فکیف بغیره.

وفی التاتارخانیة(۱/۲۷۰): وکذا اذا غلبه النوم یکره له أن یصلی مع القوم بل ینصرف حتی یستیقظ وکذا لو صلی علی السطح من شدة الحر.

وفی الهندیة(۵/۳۲۲): الصعود علی سطح کل مسجد مکروه لهذا اذا اشتد الحر یکره ان یصلوا بالجماعة فوقه الا اذا ضاق المسجد فحینئذ لا یکره الصعود علی سطحه للضرورة.

وفی الشامیة(۱/۶۵۶): ثم رأیت القهستانی نقل عن المفید کراهة الصعود علی سطح المسجد اهـ ویلزمه کراهة الصلاة ایضاً فوقه. فلیتامل(قوله لانه مسجد) علة لکراهة ماذکر فوقه قال الزیلعی،

ولهذا يصح اقتداء من على سطح المسجد بمن فيه اذا لم يتقدم على الامام ولا يبطل الاعتكاف بالصعود اليه.

(۱۳۹) بیمار کی تیمارداری کیلئے جماعت کی نماز چھوڑنے کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گھر والوں کی طبیعت سخت خراب ہو، ان کے پاس گھر میں کوئی اوران کی تیمارداری کرنے والا نہ ہو، اور مسجد میں نماز پڑھنے جانے کی صورت میں گھر والوں کو تکلیف ہوتی ہو، تو کیا ایسی صورت میں جماعت کی نماز چھوڑنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً……اگر بیمار آدمی کے ساتھ تیمارداری کرنے والا کوئی اور نہ ہو، اور مسجد میں چلے جانے کی صورت میں بیمار کو تکلیف ہوتی ہو، تو اس صورت میں جماعت چھوڑنا درست ہے۔

لمافي الهندية(۱/۸۳): تسقط الجماعة بالاعذار حتى لاتجب على المريض ……أن تفوته قافلة أو كان قيما لمريض الخ.

وفي الشامية (۱/۵۵۶): (قوله وقيامه بمريض)أي يحصل له بغيبته المشقة والوحشة.

(۱۴۰) فرض نماز کا ''جماعت سے'' اور ''مسجد میں جاکر'' پڑھنا الگ الگ واجب ہے

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا صرف جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے؟ یا مسجد کی طرف جماعت کی نماز پڑھنے کیلئے جانا بھی واجب ہے؟ جبکہ علامہ طحطاویؒ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے جیسا کہ حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے ''الأصح أن اقامتها في البيت كاقامتها في المسجد وان تفاوتت الفضيلة (ص۲۸۶) ''اور اعلاء السنن کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنے کیلئے مسجد کی طرف جانا بھی واجب ہے ''فثبت ان اتيان المسجد ايضا واجب كوجوب الجماعة(اعلاء السنن،۴/۱۷۳) ''اب ان دونوں قولوں میں سے راجح کون سا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ مسجد کی طرف جانا جماعت سے نماز پڑھنے کیلئے اگر واجب ہو، تو پنج وقت نماز کیلئے جانا واجب ہے، یا اکثر اوقات، یا بعض اوقات جانا واجب ہے، اور بعض اوقات جانے سے وجوب ساقط ہوجائے گا جیسا کہ علامہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ''فالواجب الحضور احيانا(الشامية،۱/۵۵۲)'' کبھی کبھی جانے سے وجوب ساقط ہوجائے گا۔ قول فیصل بیان فرما کر مشکور فرمائیں۔ نیز یہ کہ بعض حضرات سے سنا ہے، کہ اگر کسی شخص نے تین نمازیں باجماعت ادا کیں تو وہ شخص تارک جماعت شمار نہ ہوگا۔ آیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرض نمازوں کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا مستقل طور پر واجب ہے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کیلئے مسجد میں آنا یہ الگ واجب ہے۔ اور ہر ایک کے ترک کرنے پر احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ چند جوانوں سے کہوں کہ بہت سا ایندھن اکٹھا کر کے لائیں پھر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو بلا عذر گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں اور جا کر ان کے گھروں کو جلا دوں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ کل قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں مسلمان بن کر حاضر ہو وہ ان نمازوں کو ایسی جگہ ادا کرنے کا اہتمام کرے جہاں اذان ہوتی ہے یعنی مسجد میں اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمہارے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کیلئے ایسی سنتیں جاری فرمائی ہیں جو سراسر ہدایت ہیں انہیں میں سے یہ جماعت کی نمازیں بھی ہیں اگر تم لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں شخص پڑھتا ہے تو تم نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کے چھوڑنے والے ہوگے اور یہ سمجھ لو کہ اگر نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کو چھوڑ دوگے تو گمراہ ہو جاؤ گے اور جو شخص اچھی طرح وضوء کرے اس کے بعد مسجد کی طرف جائے تو ہر ہر قدم پر ایک ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک ایک درجہ بلند ہوگا اور ایک ایک خطا معاف ہوگی اور ہم تو اپنا یہ حال دیکھتے تھے کہ جو شخص کھلم کھلا منافق ہو، وہ تو جماعت سے رہ جاتا تھا ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عام منافقوں کی بھی جماعت چھوڑنے کی ہمت نہ ہوتی تھی یا کوئی سخت بیمار ہو ورنہ جو شخص دو آدمیوں کے سہارے سے گھسٹتا ہوا جا سکتا تھا وہ بھی صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

رہی یہ بات کہ صاحب حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی نے صاحب قنیہ کے حوالے سے جو مطلقاً لکھا ہے الاصح ان اقامتها فی البیت کاقامتها فی المسجد وان تفاوتت الفضیلة اس کے متعلق صاحب اعلاء السنن نے تصریح کی ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ اصحاب مذہب کی تصریحات اس کے خلاف ہیں اور صاحب قنیہ کی نقل ضعیف ہے اور یہ قول احادیث صحیحہ کے بھی خلاف ہے اور جہاں تک علامہ شامی کا قول ہے "فالواجب الحضور أحیانا" تو یہ اس صورت پر محمول ہو سکتا ہے جب کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں جماعت رہ گئی ہو، ورنہ بعض فقہاء نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ بغیر عذر کے کبھی کبھار بھی گھر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بدعت اور مکروہ ہے۔ اور بعض حضرات سے سنی ہوئی بات کہ "اگر کسی شخص نے تین نمازیں باجماعت ادا کیں تو وہ شخص تارک جماعت شمار نہ ہوگا" درست نہیں ہے۔

لما فی اعلاء السنن (۱۸۶/۴): قلت دلالته علی الجزء الاول ظاهرة حیث بولغ فی تهدید من تخلف عنها وحکم علیه بالنفاق ومثل هذا التهدید لا یکون الا فی ترک الواجب ولا یخفی ان وجوب الجماعة لو کان مجردا عن حضور المسجد لماهم رسول الله ﷺ باضرام البیوت علی المتخلفین لاحتمال انهم صلوها بالجماعة فی بیوتهم فثبت ان اتیان المسجد ایضا واجب کوجوب الجماعة فمن صلاها بجماعة فی بیته اتی بواجب وترک واجبا اخر.

وفیه ایضاً (۱۸۸/۴): قلت: وهذا صریح فی ان وجوب الجماعة انما یتأدی بجماعة المسجد لا

بجماعة البيوت ونحوها فما ذكره صاحب القنية اختلف العلماء في اقامتها في البيت والاصح انها كاقامتها في المسجد الا في الفضيلة وهو ظاهر مذهب الشافعي اهـ. كذا في حاشية البحر لابن عابدين لا يصح مالم ينقل نقلا صريحا عن اصحاب المذهب ويرده ماذكرنا من الاحاديث في المتن فالصحيح ان الجماعة واجبة مع وجوب اتيانها في المسجد ومن اقامها في البيت وهو يسمع النداء فقد أساء وأثم والله سبحانه وتعالیٰ أعلم.

وفي البحر الرائق(۱/۶۰۶):وسئل الحلواني عمن يجمع بأهله أحيانا هل ينال ثواب الجماعة أو لا؟ قال: لا ويكون بدعة ومكروها بلا عذر.

(۱۴۱) نماز باجماعت پڑھنے کی فضیلت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں مدنی مسجد شب جمعہ کو چلا گیا۔مغرب میں تھوڑی دیر سے پہنچا۔مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ہو چکی تھی۔برآمدے میں دوجگہ جماعت کے ساتھ نماز ہو رہی تھی۔ایک جماعت میں نمازیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی جبکہ دوسری جماعت میں نمازیوں کی تعداد کم تھی۔معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ جس جماعت میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہے ان کی آخری رکعت ہے۔اور جس جماعت میں تھوڑے سے حضرات ہیں ان کی پہلی رکعت ہے۔اب میں سخت متردد ہوا کہ کس جماعت میں شامل ہو جاؤں؟ آخر کار اس جماعت میں شریک ہوا جس کی پہلی رکعت تھی۔لیکن دل میں ابھی تک یہ تردد ہے کہ کون سی جماعت میں شریک ہو جانا چاہیے تھا؟ اب آپ حضرات رہنمائی فرمائیں کہ اگر ایسا معاملہ پیش آجائے تو کیا کرنا چاہیے؟ آیا ثواب میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......احادیث مبارکہ میں بکثرت نماز باجماعت کا حکم دیا گیا ہے۔اور باجماعت نماز نہ پڑھنے والوں کیلئے وعیدیں بھی بیان فرمائی گئی ہیں۔لہٰذا ضروری ہے کہ نماز ہمیشہ باجماعت ادا کی جائے۔اور تکبیر اولیٰ کے حصول کی بھی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔احادیث میں اس کی بھی فضیلت وارد ہوئی ہے۔نیز اگر کوئی شخص جماعت کی نماز میں ایک رکعت یا چند رکعات ہونے کے بعد شریک ہوتا ہے تو بلاشبہ وہ بھی جماعت کو پانے والا ہے لیکن اس شخص کا ثواب اس آدمی سے کم ہوگا جو شروع سے امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے۔

صورت مسئولہ میں آپ نے جو عمل کیا کہ اس جماعت میں شریک ہوئے جن کی ابھی پہلی رکعت تھی یہ بالکل درست ہے جس سے یقیناً آپ تکبیر اولیٰ اور باجماعت نماز پڑھنے کے ثواب کے مستحق ہوں گے جبکہ دوسری جماعت میں شریک ہونے سے آپ ان فضائل سے محروم ہو جاتے۔لہٰذا جہاں ایسی صورتحال ہو کہ دو جماعتیں ہو رہی ہوں اور ایک کی پہلی رکعت ہو، اور دوسری جماعت کی اکثر رکعات ہو چکی ہوں تو اس جماعت میں شریک ہونا چاہیے جن کی پہلی رکعت ہو یا کم رکعات ادا ہوئی ہوں، بشرطیکہ دوسری جماعت مسجد کے احاطہ سے باہر ہو رہی ہو۔اگر مسجد کے احاطے ہی میں دوسری جماعت ہو رہی ہے تو یہ درست نہیں ہر ایک کو انفرادی نماز ادا کرنی چاہیے۔

لمافی ترمذی(۱/۵۲): عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ ﷺ صلوۃ الجماعۃ تفضل علی صلوۃ الرجل وحدہ بسبع وعشرین درجۃ.

وفی الشامیۃ(۱/۳۹۶): الراجح عند اہل المذہب وجوب الجماعۃ وانہ یاثم بتفویتہا اتفاقاً: وحینئذ یجب السعی بالقدم لا لاجل الاداء فی اول الوقت اوفی المسجد بل لأجل اقامۃ الجماعۃ والا لزم فوتہا اصلاً او تکرارہا فی مسجد ان وجد جماعۃ اخری وکل منہا مکروہ.

(۱۴۲)-بار بار وضوٹوٹنے' ٹانگوں میں درد جیسے عذر کی بنا پر مسجد میں آ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک سال پہلے اپنی مقامی مسجد (جامع مسجد گول مارکیٹ) میں وضو کے بعد اچانک پیر پھسلنے کے بعد گر پڑا اور اس حادثے کے بعد سے مستقل طور پر بیمار آدمی کی زندگی گزار رہا ہوں، اس حادثے کے کچھ عرصے بعد جسم کے بائیں طرف فالج کا حملہ ہوا اور حالت مزید خراب ہوگئی۔ اب اللہ کے فضل سے بذریعہ علاج کچھ افاقہ ہوا۔ میری روٹین کچھ اس طرح ہے کہ میں عصر کی نماز میں باجماعت شریک ہوجاتا ہوں اور پھر تلاوت کر کے مغرب باجماعت پڑھ کر گھر لوٹتا ہوں۔ مسلسل گرم دواؤں کے استعمال سے مجھے قبض اور گیس کی شکایت رہتی ہے۔ میں عصر کی جماعت کیلئے گرم پانی کا وضو بنا کر گھر سے چلتا ہوں مگر وضو ۱۵منٹ یا آدھا گھنٹے میں ٹوٹ جاتا ہے اکثر نماز شروع کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسجد میں ٹھنڈے یا گرم جو بھی میسر ہو دوبارہ وضو بنانا پڑتا ہے، مسجد میں گرم پانی ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا، لہٰذا مجبوراً ٹھنڈے پانی سے وضو بنانے پر میری انگلیوں میں اور پیروں میں کھنچاؤ اور تکلیف ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر نے رمضان کے روزے رکھنے اور نماز پڑھنے سے بھی منع کیا ہے۔ اب اس مسئلے کے حل کی جتنی بھی شرعی صورتیں ہوسکتی ہیں بیان فرمادیں۔ ان میں سے مناسب اور آسان صورت کو اختیار کرلوں گا۔ مسجد ۱۰ منٹ کی مسافت پر ہے اور بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ نہیں چلا جاتا۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر بار بار وضو کرنے سے آپ کو تکلیف ہوتی ہو، اور گھر سے وضو کر کے مسجد تک جاتے جاتے یا نماز شروع ہوتے ہوتے وضو ٹوٹ جاتا ہو، یا بڑھاپے کی وجہ سے مسجد تک چلنے میں تکلیف ہوتی ہو، تو ایسی صورت میں اگر آپ جماعت میں شریک ہونے کی بجائے گھر میں ہی وضو کر کے جلدی جلدی نماز پڑھ لینا چاہتے ہیں تو آپ کیلئے شرعاً اجازت ہے کہ آپ گھر میں ہی پڑھ لیں۔ کذا فی نفع المفتی والسائل بحوالہ فتاوی رحیمیہ (۱/۱۹۵)۔ کیونکہ بیماری اور ایسے بڑھاپے میں جس کی وجہ سے مسجد تک چلنا مشکل ہوجائے اس سے جماعت ساقط ہوجاتی ہے۔

دوسری صورت آپ کیلئے یہ ہے کہ اگر پانی کے استعمال سے بیماری میں اضافہ ہونے یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں آپ تیمم کر کے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن یہ خوف غالبہ ظن یا تجربہ یا کسی مسلمان غیر فاسق حاذق طبیب کی خبر سے معلوم ہوسکتا ہے۔

رہا ڈاکٹر کا روزہ رکھنے سے منع کرنا، تو اگر روزہ رکھنے کی وجہ سے بیماری میں اضافہ ہونے کا یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو، اور کوئی

مسلمان غیر فاسق حاذق طبیب آپ کو روزہ نہ رکھنے کا مشورہ دے تو آپ کو شرعاً روزے فی الحال نہ رکھنے کی اجازت ہے البتہ بعد صحت قضاء کرنا ضروری ہوگا۔

رہا نماز کا مسئلہ، تو اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہو، اور بیماری میں اضافہ یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو تو بیٹھ کر ہی رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر رکوع وسجدہ میں بھی تکلیف ہوتی ہو تو اشارہ کر کے نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہو تو لیٹ کر اشارتاً رکوع وسجدہ کرتے ہوئے نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر بیماری کی شدت کی وجہ سے اشارہ کرنے پر بھی قادر نہ ہوں تو فی الحال نماز کو موخر کر دیں۔

لما في الهندية (۸۳/۱): وتسقط الجماعة بألاعذار حتى لا تجب على المريض والمقعد والزمن ومقطوع اليد والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذى لا يستطيع المشى والشيخ الكبير العاجز والاعمىٰ عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ.

وفي الطحطاوى(ص۲۹۸): قوله وشيخوخة، مصدر شاخ يشيخ اذا استبان منه السن قاموس. اى اذا صار شيخا كبيرا لايستطيع المشى سقطت عنه الجماعة.

وفي الهندية (۲۸/۱): ولو كان يجد الماء الا انه مريض يخاف ان استعمل الماء اشتد مرضه او ابطأبرءه يتيمم .... ويعرف ذلك الخوف اما بغلبة الظن عن امارة او تجربة او أخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق كذا في شرح منية المصلى لأبراهيم الحلبى.

(۱۴۳) راستوں وغیرہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ محلّہ کی مسجد میں جماعت ثانی ہیئت اولیٰ کی تبدیلی کے باوجود درست نہیں ہے آیا یہ حکم صرف محلّہ والوں کے لئے ہے یا مسافر بھی اس میں داخل ہیں، مثلاً تبلیغی جماعت والے محلّہ کی مسجد میں اس وقت آئے جبکہ محلّہ والے جماعت سے نماز پڑھ چکے تھے آیا یہ تبلیغی جماعت والے یعنی کوئی بھی مسافر ہیئت اولیٰ بدل کر مسجد میں جماعت ثانی کرواسکتے ہیں یا نہیں؟

(۲)۔ اڈے کی مساجد مثلاً جو بس اسٹاپ پر ریلوے اسٹیشن پر یا سڑک کے کنارے پر بنی ہوئی ہوتی ہیں ان مساجد میں امام ومؤذن متعین ہوں جو پانچ وقت اذان دیتا ہو، اور نماز پڑھاتا ہو تو کیا اس صورت میں اسٹاپ وغیرہ کی مساجد میں جماعت ثانی کروانا درست ہے یا نہیں، درست ہونے کی صورت میں ہیئت اولیٰ بدلنی ہوگی یا نہیں؟ یا اسٹاپ وغیرہ کی مساجد میں اس وقت جماعت ثانی کروانا درست ہوگی جب ان مساجد میں امام ومؤذن متعین نہ ہوں کیا اس صورت میں بھی ہیئت اولیٰ بدلنی ہوگی یا نہیں؟

(۳)۔ تبلیغی جماعت والوں کی تشکیل مثلاً سندھ یا پنجاب کے کسی دیہات میں ایک مہینے کی ہوئی وہاں بستی قریب قریب ہوتی ہیں مثلاً دو یا

تین کلومیٹر کے فاصلے پر۔ دیہاتوں میں ہوتا یوں ہے کہ جس کی زمین ہوتی ہے وہ وہاں گھر بنا کر رہنا شروع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ہی علاقے میں کئی بستیاں وجود میں آ جاتی ہیں تو پوچھنا یہ ہے کہ یہ جماعت والے بستیوں کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں یا دیہات کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے؟ جیسے بالفرض جماعت والوں کی تشکیل ایک مہینے کی نوابشاہ کے دیہاتوں میں ہوئی وہ نوابشاہ کے بھی قریب ہیں یعنی شرعی فاصلہ نہیں ہے اور آپس میں بھی دو یا تین کلومیٹر کے فاصلہ پر ہیں تو اس صورت میں جماعت والے نوابشاہ کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے یا دیہاتوں کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں گے؟

(۴)۔ جیسے کراچی کے چار ضلع ہیں جماعت والوں کی تشکیل بیس دن کی ایک ضلع میں ہوئی اب یہ تشکیل کے دوران دوسرے ضلع میں جاتے ہیں تو اس صورت میں جماعت والے کراچی شہر کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے یا اس کے ضلع کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرمائیں اللہ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... (۲،۱)۔ مسجد محلہ جس میں امام ومؤذن مقرر ہوں اس میں جماعت ثانی مکروہ ہے۔ اور یہ حکم صرف محلہ والوں کے لئے نہیں ہے بلکہ جو بھی جماعت ہو جانے کے بعد آئیں وہ سب اس حکم میں شامل ہیں۔ لہٰذا جو بعد میں آئیں اور اگر وہ جماعت ثانی کرانا چاہتے ہیں تو کسی ایسی جگہ میں جو مسجد کی حدود سے خارج ہو وہاں جماعت کرا سکتے ہیں۔ اور اسی طرح ان مساجد میں بھی جماعت ثانی مکروہ ہے جن میں امام ومؤذن اور مقتدی معین ہوں، البتہ وہ مساجد جن میں امام ومؤذن اور مقتدی معین نہ ہوں تو ان میں جماعت ثانی مکروہ نہیں ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بس اڈے، ریلوے اسٹیشن اور سڑک کے کنارے جو مساجد ہیں اگر ان میں امام ومؤذن اور مقتدی معین ہیں تو ان مساجد میں جماعت ثانی مکروہ ہوگی اور اگر معین نہیں ہیں تو جماعت ثانی جائز ہوگی۔

(۳)۔ اقامت کی نیت کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے یہ ہے کہ ایک ہی جگہ میں پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کی اقامت کی نیت کریں اور اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ سفر کو منقطع کریں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر جماعت والوں کی تشکیل پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کیلئے پنجاب یا نواب شاہ ہوئی، اب اگر انہوں نے وہاں ایک ہی جگہ میں پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت کی اب اس کے بعد اگر وہ اڑتالیس میل کے اندر اندر دن کو جاتے ہیں اور رات کو واپس آتے ہیں یا کبھی کبھار رات بھی گزارتے ہیں تو اس صورت میں وہ پوری نماز پڑھیں گے قصر نماز پڑھنا جائز نہیں ہوگا۔ اور اگر جماعت والے ایک جگہ پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت نہیں کرتے ہیں بلکہ دو تین دن ایک بستی میں رہتے ہیں، دو تین دن دوسری بستی میں تو اس صورت میں مسافر شمار ہوں گے اور قصر نماز پڑھیں گے۔

(۴)۔ پورے شہر کا حکم ایک ہوتا ہے چاہے کتنا ہی بڑا ہو، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر جماعت والوں کی تشکیل پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کیلئے کراچی شہر میں ہو جائے، تو وہ پورے کراچی شہر میں چاہے جس ضلع میں جائیں نماز پوری پڑھیں گے۔

لما في الدر المختار (۱/۵۵۲): ويكره تكرار الجماعة بأذان وإقامة في مسجد محلة لا في مسجد طريق او مسجد لا إمام له ولا مؤذن. وفي الشامية تحته (قوله يكره) أي تحريما لقول الكافي لايجوز، والمجمع لايباح، وشرح الجامع الصغير إنه بدعة كما في رسالة السندي (قوله بأذان و

اقامة الخ)......يكره تكرار الجماعة في مسجد محلة بأذان وإقامة إلا إذا صلى بهما فيه أولا غير أهله أو أهله لكن بمخافتة الأذان، ولو كرر أهله بدونهما أو كان مسجد طريق جاز اجماعا، كما في مسجد ليس له إمام ولا مؤذن ويصلي الناس فيه فوجا فوجا، فإن الأفضل ان يصلي كل فريق بأذان وإقامة على حدة كما في امالي قاضيخان ونحوه في الدرر، والمراد بمسجد المحلة ماله إمام وجماعة معلومون كما في الدرر وغيرها، قال في المنبع: والتقييد بالمسجد المختص بالمحلة احتراز من الشارع، وبالأذان الثاني احتراز عما اذ اصلى في مسجد المحلة جماعة بغير اذان حيث يباح اجماعا، ...... وأما مسجد الشارع فالناس فيه سواء لا اختصاص له بفريق دون فريق.

وفي المحيط البرهاني(۲/۲۰۲): خراساني قدم بغداد وعزم على الإقامة بها خمسة عشر يوما، ومكي قدم الكوفة وعزم على الإقامة بها خمسة عشر يوما، ثم خرج كل واحد منهما من وطنه يريد قصر ابن هبيره، ليتلقى صاحبه بالقصر. فإنهما يصليان أربعا في الطريق وبالقصر لأنهما كانا متوطنين أحدهما ببغداد، والآخر بالكوفة، ولم يقصدا مسيرة مدة السفر، لأن من بغداد إلى الكوفة مسيرة أربع ليال، والقصر هو المنتصف فكان كل واحد منهما قاصداً مسيرة ليلتين، وبهذا لايصير مسافراً.

وفي الشامية(۲/۱۲٦): (قوله كمالو نوى مبيته بأحدهما) فإن دخل أولا الموضع الذي نوى المقام فيه نهارا لا يصير مقيما، وان دخل أولا مانوى المبيت فيه يصير مقيما ثم بالخروج إلى الموضع الآخر لايصير مسافرا لأن موضع إقامة الرجل حيث يبيت به.

(۱۴۴) بدعتیوں کی جماعت کے بعد جماعت ثانی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد میں جب اہل بدعت میں سے مثلاً بریلوی عقائد کا حامل شخص جماعت کرائے تو کیا اس مسجد میں دوبارہ صحیح العقیدہ شخص جماعت کرا سکتا ہے یا نہیں اور یہ تکرارِ جماعت میں داخل ہوگا یا نہیں؟ اور دوسری جماعت کا کیا حکم ہے، آیا وہ درست ہے یا نہیں؟ یا مکروہ ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک مسجد میں جماعت کراہت کے ساتھ کروائی گئی ہو تو دوسری جماعت کرائی جاسکتی ہے۔ اور وہ عبارت یہ ہے: لان تكرار الجماعة في مسجد واحد مكروه عندنا على المعتمد الا اذا كانت الجماعة الاولىٰ غير اهل ذلك المسجد او اديت الجماعة على وجه مكروه. (شامية: ۱/۵٦۴) المطلوب: ۱)۔ بریلویوں کی جماعت کا کیا حکم ہے؟

۲)۔ جب ایک دفعہ بریلوی عقائد کا حامل شخص جماعت کروادے تو کیا دوسری جماعت اسی مسجد میں کروائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۳)۔ دوسری جماعت میں کراہت تو نہیں ہوگی؟ وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب محلے والے اپنی مسجد میں اذان اور اقامت کے ساتھ ایک مرتبہ نماز ادا کرلیں تو وہاں جماعت ثانیہ کروانا شرعاً مکروہ ہے۔ جماعت ثانیہ کا ادا کرنا چونکہ جماعت اولیٰ کی سستی کا سبب ہے اور لوگوں کے دلوں سے فوتِ جماعت کا خوف نکل جانے کا سبب ہے اس لئے جماعت ثانی مکروہ ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بریلویوں کی جماعت بشرطیکہ ان کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں کراہت کے ساتھ جائز ہے اس لئے اگر ایک دفعہ بریلویوں نے جماعت کرالی تو دوسری جماعت اسی مسجد میں کرانا جائز نہیں ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے یہ مراد نہیں کہ جب ایک مسجد میں جماعت کراہت کے ساتھ کروائی گئی ہو تو دوسرے لوگ دوسری جماعت کراسکتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی ایسے فعل میں کراہت ہے جس کا تعلق ماہیت صلوٰۃ کے ساتھ ہے تو اس جماعت کا اعادہ واجب ہے۔

لمافی الکبیری(ص۔۴۷۶): یکره تقدیم المبتدع ایضا لانه فاسق من حیث الاعتقاد وهو اشد من الفسق من حیث العمل لان الفاسق من حیث العمل یعترف بانه فاسق ویخاف ویستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من یعتقد شیئاً علی خلاف ما یعتقده اهل السنة والجماعة وانما یجوز الاقتداء به مع الکراهة اذا لم یکن مایعتقده یودی الی الکفر عند اهل السنة اما لو کان مؤدیا الی الکفر فلا یجوز اصلا.

وفی الشامیة(۱/۴۵۷): فیخالف تلک القاعدة الا ان یدعی تخصیصها بان مرادهم بالواجب والسنة التی تعادبترکه ما کان من ماهیة الصلاة واجزائها فلا یشمل الجماعة لانها وصف لها خارج عن ماهیتها.

وفی اعلاء السنن(۴/۲۳۲): عن عبید الله بن عدی بن الخیار انه دخل علی عثمان بن عفان رضی الله عنه. وهو محصور، فقال: انک امام عامة، ونزل بک ما تری، ویصلی لنا امام فتنة، ونتحرج، فقال: الصلاة احسن ما یعمل الناس، فاذا احسن الناس فاحسن معهم، واذا اساؤا فاجتنب اساء تهم اخرجه البخاری(۱/۹۶)

قوله عن عبید الله بن عدی الخ. دلالته علی صحة الصلاة خلف الفاسق من قول عثمان رضی الله عنه، ظاهرة، والمراد بامام الفتنة هو کنانة بن بشر البلوی احد رؤوس المصریین، فان سیف بن عمر روی حدیث الباب فی کتاب الفتوح من طریق اخری عن الزهری بسنده فقال فیه: دخلت علی عثمان وهو محصور وکنانة یصلی بالناس فقال: کیف تری؟ الحدیث.

كذا قال الحافظ في الفتح(۲/۱۵۹): وفيه دليل على كراهة الصلاة خلفه ايضاً لما فيه من قول عبيد الله بن عدى:"ونتحرج" ولما في رواية سيف بن عمر من قول يوسف الانصارى"كره الناس الصلاة خلف الذين حصروا عثمان" ولكن عثمان رضى الله عنه، انما حضهم على الصلاة خلفهم لما علم من عجز القرم عن عزلهم وبذلك تزول الكراهة عمن يقتدى به.

(۱۴۵) اہل حق کی مسجد نہ ہونے کی صورت میں بدعتیوں کے پیچھے نماز کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ کے رشتہ دار کراچی کے ایک علاقہ میں رہتے ہیں وہاں قریب میں کوئی مسجد اہل حق کی نہیں ہے بلکہ تمام مساجد بدعتیوں کی ہیں۔اب نماز کا کیا حکم ہے گھر میں پڑھ لیں یا ان کی اقتداء میں مسجد جا کر پڑھیں نیز بندہ کا وہاں کبھی کبھی جانا ہوتا ہے تو بندہ کیلئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بندہ آخری سال کا طالب علم ہے۔تفصیلاً وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....بہتر یہ ہے کہ اہل حق کی مساجد میں نماز ادا کی جائے اور اگر اہل حق کی مساجد وہاں قریب میں نہیں ہیں تو اس صورت میں اکیلے نماز پڑھنے سے بہتر یہ ہے کہ بدعتیوں کی مساجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں۔

لمافي كنز العمال(۶/۵۴،۱۴۸۱۵): صلوا خلف كل بر وفاجر.

وفي نصب الراية(۲/۲۸): قال عليه السلام: ((من صلى خلف عالم تقى، فكأنما صلى خلف نبى)).

وفي الدر المختار(۱/۵۶۲): وفي النهر عن المحيط، صلى خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة، وفي الشامية(قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال، كما ينال خلف تقى ورع.

(۱۴۶) تبلیغی جماعتوں کا بریلوی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تبلیغی حضرات کی جماعتیں جب سہ روزہ یا چلہ وغیرہ کیلئے نکلتی ہیں تو ہر مسجد میں دن گزارتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ جماعتیں بریلوی حضرات کی مسجدوں میں چلی جاتی ہیں تو وہاں پر جماعت کے ساتھ فرض نمازیں ان کے پیچھے باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اس وجہ سے کہ جوڑ پیدا ہو اگر علیحدہ اپنی نماز ادا کریں تو توڑ پیدا ہوگا اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ یہ شرک وبدعات کا ارتکاب کرتے ہیں اس کے باوجود بھی وہ شخص ان کے پیچھے نماز ادا کرے تو اس شخص کو چاہیے کہ دوبارہ کلمہ پڑھے اور اگر شادی شدہ ہے تو تجدید نکاح کرے تو آپ حضرات رہنمائی فرمائیں کہ واقعی ایسا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بدعتی آدمی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جبکہ اس کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں اور لوگ اس کے معزول کرنے پر قادر ہوں لیکن اگر لوگ اس کے معزول کرنے پر قادر نہیں اور اس مسجد کے علاوہ کوئی دوسری مسجد بھی گاؤں اور محلے میں نہیں ہے تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر بدعتی کے عقائد کفر تک پہنچے ہوں تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں تبلیغی حضرات کی نمازیں بریلوی ائمہ کے پیچھے کراہت کے ساتھ ادا ہو جائیں گی بشرطیکہ اس بریلوی کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں لیکن تجدید نکاح اور دوبارہ کلمہ پڑھنے کا قول کرنا درست نہیں۔

لما في اعلاء السنن(۲۳۲/۴): كره الناس الصلاة خلف الذين حصروا عثمان، ولكن عثمان رضي الله عنه إنما حضهم على الصلاة خلفهم لما علم من عجز القوم عن عزلهم وبذالك تزول الكراهة عمن يقتدي به.

وفي البحر الرائق(۲۱۱/۱): وأطلق المصنف في المبتدع فشمل كل مبتدع هو من أهل قبلتنا، وقيده في المحيط والخلاصة والمجتبى وغيرها بان لا تكون بدعته تكفره فان كانت تكفره فالصلاة خلفه لا تجوز.

وفي الدر المختار(۵۶۲/۱): وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة

قال في الشامية (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع، لحديث "من صلى خلف عالم تقي فكانما صلى خلف نبي".

وفي كبيرى(ص۴۷۶): ويكره تقديم المبتدع ايضاً لانه فاسق من حيث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حيث العمل لان الفاسق من حيث العمل يعترف بانه فاسق ويخاف ويستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من يعتقد شيئاً على خلاف ما يعتقده أهل السنة والجماعة .... أما لو كان مؤديا الى الكفر فلا يجوز أصلا كالغلاة من الروافض.

(۱۴۷) بدعتی اور فاسق کے پیچھے پڑھی گئی نماز کے بارے میں فقہائے کرام کے اقوال (مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی) میں تطبیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ بدعتی، فاسق وفاجر مثلاً شرابی، زانی، ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے، مماتی، بلاوجہ دوسرے پر لعن طعن کرنے والے، سود خور

الغرض کسی بھی قسم کے گناہ کبیرہ میں مبتلا شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ مکروہ تحریمی یا تنزیہی؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز یا مکروہ تحریمی ہے تو ذمہ سے فرضیت صلاۃ ساقط ہوگی یا واجب الاعادہ ہے؟ اگر واجب الاعادہ نہیں تو فقہاء کرام کی اس عبارت کا کیا مطلب: وکل صلاۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تعاد؟ (الدر المختار، ۲/۶۴) نیز کتب فقہاء کی عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ فساق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارات میں ہے کہ:

قال (ویجوز امامۃ الاعمی والاعرابی...... والفاسق، وغیرھم احب الی) (المبسوط السرخسی: ۱/۴۰)

فالحاصل انہ یکرہ لھولاء التقدم ویکرہ الاقتداء بھم کراھۃ تنزیھۃ الخ. (البحر الرائق، ۱/۶۱۱)

(ویکرہ) تنزیھا (امامۃ عبد) ...... (وفاسق واعمی) الخ. (الدر المختار، ۱/۵۵۹،۵۶۰)

دوسری بات یہ ہے کہ فقہاء احناف نے ان حضرات مذکورہ کے پیچھے نماز پڑھ لینے کو جائز قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ فساق کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی نہیں مثلاً منقول ہے: باب امامۃ المفتون والمبتدع، وقال الحسن صل، وعلیہ بدعتہ .... عن عبید اللہ بن عدی بن الخیار انہ دخل علی عثمان بن عفان وھو محصور فقال انک امام عامۃ، ونزل بک ماتری! ویصلی لنا امام فتنۃ، ونتحرج فقال الصلوۃ...... الخ. (صحیح البخاری، ۱/۹۶)

ویکرہ تقدیم العبد...... والفاسق...... فان تقدموا جاز. (مختصر القدوری، ص۳۵)

ویکرہ تقدیم العبد...... والفاسق...... وان تقدموا جاز. (الفقہ النافع، ۱/۲۱۵)

حتی تجوز امامۃ العبد والاعرابی...... والفاسق وھذا قول عامۃ العلماء. (بدائع الصنائع، ۱/۶۶۲)

قال اما الفاسق فتجوز الصلاۃ خلفہ لقولہ علیہ السلام "صلوا خلف کل بر وفاجر". (المحیط البرھانی، ۲/۱۷۸)

قال المرغینانی: تجوز الصلاۃ خلف صاحب ھوی وبدعۃ. (تبیین الحقائق، ۱/۳۴۵)

قولہ: (ویکرہ تقدیم العبد والاعرابی)...... قولہ (والفاسق)...... (فان تقدموا جاز) لقولہ علیہ السلام صلوا خلف کل بر و فاجر. (الجوھرۃ النیرۃ، ۱/۱۵۹)

وفی الفتاوی لو صلی خلف فاسق او مبتدع ینال فضل الجماعۃ الخ. البحر الرائق(۱/۶۱۰)

الصلاۃ خلف اھل الھواء والبدعۃ ان کان ھوی لا یکفر...... وھو من اھل ملّینا یجوز. (الفتاویٰ الولوالجیۃ، ۱/۱۲۰)

ویصح الاقتداء باھل الھواء الخ. (الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ، ۱/۹۱)

الاقتداء باھل الھواء جائزۃ الخ. (خلاصۃ الفتاویٰ، ۱/۱۴۹)

اذا صلی رجل خلف فاسق او مبتدع ینال فضل الجماعۃ الخ. (کتاب التجنیس والمزید، ۲/۳)

الصلوة خلف المبتدع تجوز الافی روایة عن ابی حنیفة (الفتاوی السراجیة: صـ۱۵)

والمصلی خلف مبتدع او فاسق ینال ثواب الجماعة. (البزازیة علی هامش الهندیة: ۱/۵۵)

قال المرغینانی تجوز الصلاة خلف صاحب هوی وبدعة. (الهندیة المعروف بالفتاوی العالمگیریة: ۱/۸۴)

ان مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق، بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور جماعت کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے اگرچہ مکروہ ہے، پس اس کراہت کو کراہت تنزیہہ پر محمول کرنا چاہئے ورنہ اگر مکروہ تحریمی پر محمول کیا جائے گا تو ''کل صلاة ادیت مع کراهة التحریم تعاد'' کے خلاف ہونا لازم آئے گا، کیونکہ نماز کا واجب الاعادہ ہونا بظاہر جواز صلاۃ خلف الفاسق کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے عمدۃ الرعایۃ علی شرح الوقایۃ حاشیہ نمبر ۸ صفحہ نمبر ۱۵۲ پر فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ قوله كره: الكراهة في تقديم الفاسق تحريمية، وكذا المبتدع فانه اشد من الفاسق من حيث العمل الخ. (شرح الوقاية مع عمدة الرعاية، ۱/۱۵۲) اور علامہ طحطاویؒ نے بھی اسی کے موافق لکھا۔

(فتجب إهانته شرعا فلا يعظم بتقديمه للإمامة) تبع فيه الزيلعي ومفاده كون الكراهة في الفاسق تحريمية. (حاشية الطحطاوي، صـ۳۰۳، طبع قديمي كتب خانه)

الحاصل: حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی وعلامہ طحطاوی رحمہما اللہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، پس اگر اس قول کو لیا جائے تو قاعدہ ''وکل صلاة ادیت مع کراهة التحریم تعاد'' کے مطابق نماز واجب الاعادہ ہونی چاہئے، نیز یہ کہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا بھی ناجائز ہو، اور فضیلت جماعت بھی حاصل نہ ہو۔

باقی دیگر فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے، بناء بریں ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز بھی ہوگا اور فضیلت جماعت بھی حاصل ہوجائے گی، اب آپ یہ بتائیں کہ ان میں کونسا قول درست ہے؟ اگر نماز مکروہ تحریمی ہے تو واجب الاعادہ ہے یا نہیں، اگر نہیں تو مذکورہ قاعدہ ''وکل صلاة ادیت الخ'' کا کیا مطلب ہے؟

(۲)۔ فرض کو مجازاً واجب، اور واجب کو مجازاً فرض کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... فقہاء کرام کی عبارات پر آپ کے پیش کردہ اشکالات بادی النظر میں تو درست معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر کچھ غور وفکر کریں اور تمام عبارتوں پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام کی عبارتوں میں حقیقتاً کوئی تعارض نہیں ہے۔

دفع تعارضِ اوّل:..... جہاں فقہاء کرام نے فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز کے مکروہ تحریمی ہونے کا قول کیا ہے وہاں فقہاء کرام نے لفظ ''تقدیم'' استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قصد واختیار سے کسی فاسق وبدعتی کو امامت کیلئے آگے کرنا، جس سے معلوم ہوا کہ کراہتِ تحریمی ''تقدیم'' کی صورت میں ہے اور جہاں مکروہ تنزیہی کا قول کیا ہے وہاں لفظ ''اقتداء یا تقدم'' استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں پہلے سے فاسق وبدعتی امام موجود ہو یا خود ہی آگے بڑھ جائے جس کو ہٹانے میں فتنہ وفساد کا خوف ہو، اور پھر اس کی اقتداء میں نماز پڑھی جائے، جس سے واضح ہوا کہ کراہت تنزیہی محض ''اقتداء'' کی صورت میں ہے تو دونوں صورتیں الگ ہیں جس کی وجہ

سے دونوں کا حکم بھی الگ ہے فلا تعارض بینھما۔

دفع تعارضِ ثانی:......فقہاءِ کرام نے جس مکروہ تحریمی کی وجہ سے اعادۂ صلوۃ کا حکم دیا ہے اس کے بارے میں علامہ شامی علیہ الرحمہ نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب کراہت ماہیتِ صلوۃ میں ہو، اور جماعت ماہیتِ صلوۃ میں داخل نہیں ہے لہٰذا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے میں جو کراہتِ تحریمی آئی ہے وہ ماہیتِ صلاۃ میں داخل نہیں ہے (دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی مسجد کی جماعت بلا عذر ترک کر کے انفراداً پڑھے تو مکروہ تحریمی ہے اس کے باوجود فقہاء نے اس کے اعادہ کا حکم نہیں دیا جس سے واضح ہوا کہ جماعت ماہیتِ صلوۃ میں داخل نہیں ہے) لہٰذا فاسق و بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کی صورت میں اعادہ بھی واجب نہیں ہے اگرچہ مکروہ تحریمی ہے۔ فاندفع الاشکال۔

(۲)۔فرض کو واجب کی جگہ اور واجب کو فرض کی جگہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔

لمافي الشامية(۱/۵٦۰): بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا قال: ولذا لم تجز الصلاة خلفه أصلاً عند مالك ورواية عن أحمد.

وفي الشامية (۱/۴۵۷): أقول: وقد ذكر في الا مداد بحثا ان كون الإعادة بترك الواجب واجبة لا يمنع أن تكون الإعادة مندوبة بترك سنة...... بل قال في فتح القدير: والحق التفصيل بين كون تلك الكراهة كراهة تحريم فتجب الإعادة أو تنزيه فتستحب. بقي هنا شئ وهو أن صلاة الجماعة واجبة على الراجح في المذهب أو سنة مؤكدة في حكم الواجب كما في البحر وصرّحوا بفسق تاركها وتعزيره وأنه يأثم ومقتضى هذا أنه لو صلى منفرداً يؤمر بإعادتها بالجماعة وهو مخالف لما صرّحوا به في باب ادراك الفريضة من أنه لو صلى ثلاث ركعات من الظهر ثم اقيمت الجماعة يتم ويقتدى متطوعاً، فإنه كالصريح في أنه ليس له إعادة الظهر بالجماعة مع أن صلاته منفرداً مكروهة تحريماً أو قريبة من التحريم فيخالف تلك القاعدة إلا أن يدعى تخصيصها بأن مرادهم بالواجب والسنة التى تعاد بتركه ما كان من ماهية الصلاة وأجزائها فلا يشمل الجماعة لأنها وصف لها خارج عن ماهيتها. أو يدعى تقييد قولهم يتم ويقتدى متطوعاً بما إذا كانت صلاته منفرداً لعذر كعدم وجود الجماعة عند شروعه فلا تكون صلاته منفرداً مكروهة. والأقرب الأول ولذا لم يذكروا الجماعة من جملة واجبات الصلاة لأنها واجب مستقل بنفسه خارج عن ماهية الصلاة ويزيده أيضاً أنهم قالوا يجب الترتيب في سور القرآن فلو قرأ منكوساً أثم لكن لا يلزمه سجود السهو لأن ذلك من واجبات القراءة لامن واجبات الصلاة كما ذكره في البحر في باب السهو لكن قولهم كلّ صلاة اديت مع كراهة التحريم يشمل ترك الواجب وغيره، ويؤيده

ماصرّحوا به من وجوب الإعادة بالصلاة في ثوب فيه صورة بمنزلة من يصلي وهو حامل الصنم.

وفي حاشية الطحطاوي(ص ۳۰۳): قوله فتجب إهانته شرعاً فلا يعظم بتقديمه للإمامة تبع فيه الزيلعي: ومفاده كون الكراهة في الفاسق تحريمية.

وفي البحر الرائق(۱/۶۱۱): فالحاصل أنه يكره لهولاء التقدم ويكره الإقتداء بهم كراهة تنزيهة فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالإقتداء أولى من الإنفراد، وينبغي أن يكون محل كراهة الإقتداء بهم عند وجود غيرهم وإلا فلا كراهة كمالا يخفى.

وفي الشامية (۱/۹۵): ثم إن المجتهد قد يقوى عنده الدليل الظني حتى يصير قريبا عنده من القطعي، فماثبت به يسميه فرضا عمليًا لأنه يعامل معاملة الفرض في وجوب العمل، ويسمى واجباً نظراً إلى ظنّية دليله ...... وفي التلويح أن إستعمال الفرض فيما ثبت بظني والواجب فيما ثبت بقطعي شائع مستفيض فلفظ الواجب يقع على ماهو فرض علما وعملاً كصلاة الفجر.

﴿فصل فی المسبوق واللاحق﴾

(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

(۱۴۸) امام کے رکوع سے سر اُٹھا لینے کے بعد جماعت میں شامل ہونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ امام جب رکوع سے قیام کی طرف آجائے اور اب تک تکبیر نہ کہی ہو۔ اسی دوران کوئی مقتدی آکر نماز کی نیت کر کے رکوع بھی امام کے تکبیر کہنے سے قبل ادا کر کے قیام کی طرف آجائے تو یہ کیسا ہے؟

(۲)۔ مقتدی (مسبوق) کے رکوع کا وقت امام کے رکوع سے اٹھنے پر ختم ہوتا ہے یا تکبیر کہنے پر یا دونوں کے جمع ہونے پر؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مقتدی کے رکوع کا وقت امام کے رکوع سے اٹھنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ امام جب رکوع سے قیام کی طرف آجائے اس وقت مقتدی رکوع میں شامل ہوا تو مقتدی کی اس رکعت کو شمار نہیں کیا جائے گا، مقتدی مسبوق کہلائے گا، کیونکہ امام کے ساتھ افعال میں مشارکت ضروری ہے، اور امام کے رکوع سے سر اٹھانے کی وجہ سے مشارکت نہیں پائی گئی۔

لما فی الدر المختار (۲/۶۰): (ولو اقتدی بامام راکع فوقف حتی رفع الإمام رأسه لم یدرک) المؤتم (الرکعة) لأن المشارکة فی جزء من الرکن شرط ولم توجد فیکون مسبوقا فیاتی بها بعد فراغ الامام بخلاف مالو أدرکه فی القیام ولم یرکع معه فإنه یصیر مدرکاً لها فیکون لاحقاً.

(۱۴۹) امام کو آخری رکعت میں پالینے والے شخص کیلئے بقیہ نماز پڑھنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ اگر کوئی شخص امام کے ساتھ آخری رکعت پالے چار رکعت والی نماز میں، تو نماز پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

(۲)۔ اگر کوئی شخص اس کے بعد والی رکعت پر نہ بیٹھے بلکہ دو رکعت کے بعد بیٹھے اور تشہد پڑھ کر آخری رکعت کے لئے اٹھے تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱)۔ جو شخص چار رکعت والی نماز میں امام کے ساتھ ایک رکعت پائے وہ باقی نماز اس طرح ادا کرے کہ پہلی رکعت میں ثناء، تعوذ، تسمیہ، فاتحہ پڑھے اور ساتھ سورت ملائے اس رکعت میں دوسرے سجدہ کے بعد قعدہ اولیٰ میں بیٹھے اور تشہد پڑھے۔

پھر دوسری رکعت میں تسمیہ پڑھے قرأت کرے پہلی رکعت کی طرح لیکن قعدہ نہ کرے، تیسری رکعت میں صرف فاتحہ پڑھے اور باقی نماز پوری کرے۔

(۲)۔اگر کوئی بعد والی رکعت پر نہ بیٹھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا اگر سجدہ سہو ترک کر دیا تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافي بدائع الصنائع(۲/۱۲۵): ولو ادرک مع الامام رکعة في ذوات الأربع، فقام إلى القضاء. قضى ركعةً يقرأ فيها بفاتحة الكتاب وسورة ويتشهد ثم يقوم فيقضي ركعةً أخرى يقرأ فيها بفاتحة الكتاب وسورة،ولوترک القراءة في إحداهما تفسد صلاته لما قلنا وفي الثالثة هو بالخيار والقراءة أفضل لما عرف.

وفي الشامية(۱/۵۹۷): وفي الفيض عن المستصفي: لو أدركه في ركعة الرباعي يقضي ركعتين بفاتحة وسورة ثم يتشهد ثم يأتي بالثالثة بفاتحة خاصة اهـ عند أبي حنيفة وقالا: ركعة بفاتحة وسورة وتشهد ثم ركعتين اولاهما بفاتحة وسورة و ثانيتهما بفاتحة خاصة اهـ وظاهر كلامهم اعتماد قول محمد.

(قوله وتشهد بينهما): قال في شرح المنية ولو لم يقعد جاز استحساناً لا قياساً ولم يلزمه سجود السهو لكون الركعة أولى من وجه.

وفي تقريرات الرافعي على الشامية (۱/۷۷): (قوله ولو لم يقعد جاز الخ) المراد بالجواز الصحة بلا اثم نظراً لكون الركعة التي صلاها أولىٰ من وجه لا أصل الصحة اذهي قياس أيضا اذ التشهد واجب ولا المحل بلا كراهة أصلا اذ هي متحققة ثم ظهر أن المراد أنه ترک القعود بينهما اصلا لا التشهد فقط فالقياس الفساد عندهما لأنه هو القعود الأخير.

(۱۵۰) مسبوق کا امام کے سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز میں شریک ہونا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل رات نماز عشاء میں ہمارے امام صاحب نے کسی غلطی کی بنا پر سجدۂ سہو کیا تو اس وقت ایک آدمی نماز میں شریک ہوا لیکن وہ شخص سجدۂ سہو میں شریک نہیں ہوسکا بلکہ سجدۂ سہو ہوجانے کے بعد نماز میں آکر ملا، آیا اس طرح اس کی نماز ہوگئی؟ اور کیا مسبوق آدمی سجدۂ سہو کے بعد بھی جماعت میں شرکت کرسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کی نماز ہوجائے گی اور مسبوق آدمی سجدۂ سہو کے بعد بھی جماعت میں شرکت کرسکتا ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۲۸): ولايشترط ان يكون مقتديا به وقت السهو حتى لوأدرک الامام بعدما

سهوا يلزمه ان يسجد مع الامام تبعاله ولو دخل معه بعدما سجد سجدة السهو يتابعه في الثانية ولا يقضي الأولىٰ وان دخل معه بعد ما سجدهما لا يقضيهما كذا في التبيين.

وفي الدر المختار (۲/۸۲):(والمسبوق يسجد مع امامه مطلقا) سواء كان السهو قبل الاقتداء أوبعده (ثم يقضي مافاته).

(وفي الشامية تحته): (قوله سواء كان السهو قبل الاقتداء أو بعده) بيان للاطلاق وشمل أيضا ماإذا سجد الامام واحدة ثم اقتدى به قال في البحر فانه يتابعه في الاخرى ولا يقضي قضاء الاولى كما لا يقضيهما ولو اقتدى به بعدما سجدهما.

(۱۵۱) مسبوق کیلئے امام کے ساتھ قعدہ آخیرہ میں درود شریف پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسبوق درود شریف وغیرہ بھی پڑھے گا یا صرف تشہد پڑھے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... مسبوق کو قعدہ اخیرہ میں درود شریف اور دعا وغیرہ نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ تشہد کو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھے کہ امام کے سلام تک اس سے فارغ ہو، اگر پہلے فارغ ہو جائے تو کلمۂ شہادت کو مکرر پڑھتا رہے یا پھر خاموش بیٹھا رہے۔

لمافي الهندية(۱/۹۱): ان المسبوق ببعض الركعات يتابع الامام في التشهد الاخير واذا أتم التشهد لايشتغل بما بعده من الدعوات ثم ماذا يفعل تكلموا فيه ومن ابن شجاع انه يكرر التشهد اى قوله اشهد والصحيح ان المسبوق يترسل في التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام.

وفي الدر المختار(۱/۵۱۱): واما المسبوق فيترسل ليفرغ عند سلام امامه. وقيل يتم، وقيل يكرر كلمة الشهادة.

(وفي الشاميه تحته): (قوله فيترسل) اى يتمهل وهذاماصححه في الخانية وشرح المنية في بحث المسبوق من باب السهو وباقي الاقوال مصحح ايضاً. قال في البحر وينبغي الافتاء بما في الخانية كما لا يخفى......و هذا في قعدة الامام الاخيرة كما هو صريح.قوله: ليفرغ عند سلام امامه واما فيما قبلها من القعدات فحكمه السكوت كما لايخفى.

(۱۵۲) تشہد میں مسبوق کا درود شریف پڑھنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسبوق قعدہ میں تشہد پڑھنے کے بعد خاموش رہے یا

درود شریف وغیرہ پڑھے۔ نیز اگر قدیم اور جدید قضاء نمازیں جمع ہوں تو کیا ترتیب ساقط ہوگی۔ مثلاً زید دس سال سے مسلسل نماز پڑھ رہا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے اس کے ذمے بہت سی قضاء نمازیں ہیں۔ اب پھر اس سے ایک نماز چھوٹ گئی تو اس پر صاحب ترتیب کے احکام تو لاگو نہیں ہوں گے؟ شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مسبوق امام کے ساتھ قعدہ آخیرہ میں تشہد پڑھنے کے بعد درود شریف نہ ملائے بلکہ بہتر یہ ہے کہ تشہد کو اتنا آہستہ پڑھے کہ امام کے سلام پھیرنے تک مکمل کرے اور اگر پڑھ چکا ہے تو شہادتین کو لوٹاتا رہے۔ ایسا شخص جس کی قدیم نمازیں باقی ہوں تو ایسے شخص کو سب سے پہلے اپنی فوت شدہ نمازوں کی فکر کرنی چاہئے۔ جتنا جلد ممکن ہو فوت شدہ نمازوں کو ادا کرلے۔ تاہم ایسا شخص صاحب ترتیب نہیں کہلائے گا۔

لما فی الهندية(۱/۹۱): ومنها ان المسبوق ببعض الركعات يتابع الامام في التشهد الاخير و اذا اتم التشهد لا يشتغل بما بعده من الدعوات ثم ما ذا يفعل تكلموا فيه وعن ابن شجاع انه يكرر التشهد اى قوله أشهد ان لا اله الا الله وهو المختار كذا في الغياثية والصحيح أن المسبوق يترسل في التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام كذا في الوجيز للكردرى وفتاوىٰ قاضي خان وهكذا في الخلاصة وفتح القدير.

وفي الشامية(۲/۶۹): (قوله أوقديمة على المعتمد الخ) كما لو ترك صلاة شهر نسقا ثم أقبل على الصلاة ثم ترك فائتة حادثة فان الوقتية جائزة مع تذكر الفائتة الحادثة لانضمامها إلى الفوائت القديمة وهي كثيرة فلم يجب الترتيب وقال بعضهم إن المسقط الفوائت الحديثة لا القديمة ويجعل الماضي كأن لم يكن زجراً له عن التهاون بالصلوات فلا تجوز الوقتية مع تذكرها وصححه الصدر الشهيد. وفي التجنيس وعليه الفتوى وذكر في المجتبى ان الأول أصح وفي الكافي والمعراج وعليه الفتوىٰ فقد اختلف التصحيح والفتوى كما رايت والعمل بما وافق إطلاق المتون اولىٰ.

(۱۵۴) ایک یا دو رکعات نکل جانے کی صورت میں تلاوت والی رکعت کس طرح ادا کی جائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ہم فرض نماز امام کے ساتھ پڑھیں، اور ہماری ایک یا دو رکعت نکل جائے تو اب تلاوت والی رکعت کس طرح ادا کی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد آپ کی بقیہ نماز ''تلاوت'' کے بارے میں شروع کی نماز ہوگی اور ''قعدہ وتشہد'' کے سلسلے میں آخری نماز ہوگی یعنی آپ امام کے سلام کے بعد جو رکعت پڑھیں گے اس میں پہلی رکعت کی طرح تلاوت

کریں گے پھر دوسری رکعت میں دوسری رکعت کی طرح تلاوت کریں اور امام کے بعد جو آپ نے دو رکعتیں ادا کیں ہیں اس کے بعد جو قعدہ کریں گے (تشہد پڑھیں گے) وہ آخری ہوگا۔

لمافی الهندية (۱/۹۱): ومنها أنه يقضي أول صلاته في حق القراءة وآخرها في حق التشهد حتى لو ادرك ركعة من المغرب قضى وفصل ركعتين بقعدة فيكون بثلاث قعدات وقرأ في كل فاتحة وسورة.

(۱۵۴) مسبوق اپنی چھوٹی ہوئی رکعات میں قرأت کیوں کرتا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض کی آخری دو رکعت میں سورۃ کی قرأت نہیں کی جاتی، لیکن جب کوئی امام کے ساتھ دو رکعت کے بعد شریک ہوتا ہے اور جب وہ اپنی اگلی دو رکعت امام کے سلام پھیرنے کے بعد پڑھتا ہے تو اسے حکم دیا جاتا ہے کہ سورۃ بھی پڑھو، اور اگر کوئی سورۃ پڑھنا بھول جاتا ہے تو اسے سجدۂ سہو کا حکم ہوتا ہے۔ براہ کرم اس کی وجہ ذرا وضاحت کے ساتھ بتادیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے دین کی خدمت میں لگائے رکھے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی شخص امام کے ساتھ دو رکعت کے بعد شریک ہوتا ہے تو اس کی یہ دو رکعتیں آخری دو رکعتیں شمار ہوتی ہیں اس لئے امام کے سلام کے بعد جو دو رکعت وہ پڑھتا ہے یہ اس کی پہلی دو رکعتیں شمار ہوتی ہیں، اور فرض کی پہلی دو رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورت ملانا واجب ہے اس لئے ان دو رکعتوں میں اس کو سورت پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اگر سورت پڑھنا بھول جائے تو چونکہ ان دو رکعتوں میں سورت فاتحہ کے ساتھ سورت کا ملانا واجب ہے تو اس واجب کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کو سجدۂ سہو کا حکم دیا جاتا ہے۔

لمافي الهندية (۱/۷۱): الفصل الثاني في واجبات الصلاة. يجب تعيين الاولیين من الثلاثية والرباعية المكتوبتين للقراءة المفروضة حتى لو قرأ في الاخريين من الرباعية دون الأوليين اوفي احدى الاوليين واحدى الاخريين ساهياً وجب عليه سجود السهو كذا في البحر الرائق: وتجب قراءة الفاتحة وضم السورة أوما يقوم مقامها من ثلاث آيات قصاراو آية طويلة في الاوليين بعد الفاتحة كذا في النهر الفائق ...... وكذا ما يقضيه المسبوق بعد فراغ الامام أول صلاته عندنا.

وفي الشامية(۱/۴۴۶): (قوله ومنها القراءة) اى قراءة آية من القرآن وهي فرض عملي في جميع ركعات النفل والوتر وفي ركعتين من الفرض...... واما تعيين القراءة في الاوليين من الفرض فهو واجب ...... واما قراءة الفاتحة والسورة أو ثلاث آيات فهي واجبة ايضاً.

وفي الدرالمختار(۱/۵۹۶): (والمسبوق من سبقه الامام بها أو ببعضها وهو منفرد) حتىٰ يثنى و يتعوذ ويقرأ ...... (فيما يقضيه) اى بعد متابعته لامامه، فلو قبلها فالا ظهر الفساد ويقضي اول صلاته

فی حق قراء ة، واخرها فی حق تشهد،

وفیه ایضاً(۲/۸۳): (ثم یقضی مافاته) ولو سها فیه سجد ثانیاً.

(قوله ولو سها فیه) ای فیما یقضیه بعد فراغ الامام یسجد ثانیاً لانه منفرد فیه والمنفرد یسجد لسهوه.

(۱۵۵) مسبوق کوبھی سجدہ سہو میں امام کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص یعنی مسبوق امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے، امام نے جیسے ہی سجدہ سہو کیلئے دائیں طرف سلام پھیرلیا تو وہ فوراً کھڑا ہوگیا، لیکن امام بائیں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو میں چلا گیا تو کیا یہ مسبوق بھی امام کے ساتھ سجدہ سہو میں چلا جائے؟ اور مسبوق پر اس طرح فعل کرنے سے سجدہ سہو لازم آتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں مسبوق کو بھی سجدہ سہو میں امام کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس کے کھڑے ہونے اور بیٹھنے کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا۔

لمافی الهندیة(۱/۱۲۸): ولوسلم الامام فقام المسبوق ثم تذکر الامام ان علیه سهواً فسجد له قبل ان یقید المسبوق الرکعة بسجدة فعلیه ان یرفض ذلک ویعود الی متابعته ثم اذا سلم الامام قام الی القضاء ولا یعتد بما فعل من القیام والقراء ة والرکوع ولو لم یعد الی متابعة الامام ومضی علی قضائه فانه تجوز صلوته ویسجد للسهو بعد فراغه استحسانا.

وفی الشامیة (۱/۵۹۸) : والحاصل انه اذا لم یقید ماقام الیه بسجدة لم یصر منفردا ویرتفض فلو لم یتابع امامه فسدت صلوته وقد اطلق الفساد هنا فی الفتح وغیره لکن فصل فی الذخیرة فی تذکر التلاوية بانه ان لم یتابع الامام فیها ینظران وجد منه قیام وقراء ة بعد فراغ الامام من القعدة الثانية مقدار ماتجوز به الصلوة جازت صلوته والا فلا.

وفی الدر المختار (۱/۵۹۸) وهذا کله قبل تقیید ماقام الیه بسجدة اما بعده فتفسد فی صلبية مطلقا وکذا فی تلاوية وسهو ان تابع والا لا.

(۱۵۶) مسبوق اپنی بقیہ رکعات کیلئے کب کھڑا ہو؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جب وہ کبھی مسبوق ہوتا ہے تو امام کے سلام پھیرتے ہی وہ فوراً کھڑا ہوجاتا ہے تو امام کے سلام کے کتنی دیر بعد مسبوق کو اُٹھنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آپ کے دوست کو امام کے سلام پھیرتے ہی فوراً کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ امام کی فراغت کا انتظار کرے تا کہ امام پر سجدہ سہو ہونے کی صورت میں یہ اس میں شریک ہو سکے۔

لمافی الهندية (۱/۹۱): انه لايقوم الى القضاء بعد التسليمتين بل ينتظر فراغ الامام.

وفي الدرالمختار (۱/۵۹۷): وينبغي أن يصبر حتى يفهم أنه لاسهو على الامام.

وفي الشامية تحته: (قوله وينبغي أن يصبر الخ) أي لايقوم بعد التسليمة أو التسليمتين بل ينتظر فراغ الامام بعدهما كما في الفيض والفتح والبحر: قال الزند ويستى في النظم يمكث حتى يقوم الامام الى تطوعه أويستند الى المحراب ان كان لاتطوع بعدها، قال في الحلية: وليس هذا بلازم بل المقصود مايفهم أن لاسهو على الامام أو يوجد له مايقطع حرمة الصلاة.

(۱۵۷) مسبوق پر امام کی سورتوں کی ترتیب کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جماعت میں شامل ہوا اس وقت ایک رکعت مکمل ہو چکی تھی، امام نے پہلی رکعت میں سورۃ الشمس اور دوسری میں سورۃ واللیل پڑھی ہے یہ شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی رکعت پوری کرے گا، اب اس مسبوق کیلئے سورتوں کی ترتیب ضروری ہے کہ نہیں یا یہ کوئی بھی سورت مثلاً اخلاص، کافرون وغیرہ پڑھ سکتا ہے؟ ترتیب کو الٹنے سے کراہت آئے گی یا نہیں جبکہ مکمل نماز میں سورتوں کی ترتیب ضروری ہے ورنہ کراہت آتی ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسبوق پر امام کی سورتوں کی ترتیب ضروری نہیں ہے اس لئے کہ مسبوق اپنی بقیہ نماز میں منفرد کے حکم میں ہوتا ہے۔

لمافي المبسوط السرخسي (۱/۱۸۶): لان المسبوق فيما يقضي كالمنفرد حتى تلزمه القراءة وسجود السهو اذا سها.

وفي الدرالمختار (۱/۵۹۶): والمسبوق من سبقه الامام بها او ببعضها وهو منفرد.

(۱۵۸) مسبوق اگر اپنی پہلی رکعت میں سورت نہ ملائے تو اس کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں ظہر کی نماز میں تاخیر سے پہنچا اور جماعت کھڑی تھی، میں جماعت میں شریک ہوا، اور ایک رکعت مل گئی امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد میں نے بقایا تین رکعات اس طرح پڑھیں کہ پہلی رکعت میں صرف الحمد شریف پڑھی اور قعدہ کرلیا اس کے بعد دو رکعات میں الحمد کے ساتھ سورۃ بھی ملالی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طریقے سے میری نماز ادا ہوگئی ہے یا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے نیز اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جب آپ امام کے ساتھ آخری رکعت میں شریک ہوئے تو بقیہ نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آپ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پہلی اور دوسری رکعت میں الحمد شریف کے ساتھ دوسری کوئی سورت ملاتے اور اگر پہلی رکعت میں ملانا بھول گئے تو آخر میں سجدہ سہو کرتے لیکن چونکہ آپ نے اس طرح نہیں کیا، لہٰذا آپ پر دوبارہ نماز پڑھنا واجب اور ضروری ہے اگر آپ دوبارہ نماز نہیں لوٹائیں گے تو گناہگار رہوں گے۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۱۶۵، ۱۶۶): والمسبوق فيما يقضي يقضي اول صلاته في حق القراءة واخر صلوته في حق التشهد حتى لو ادرک مع الامام رکعة من المغرب ثم قام الى قضائه بعد تسليم الامام فانه يقضي رکعتين ويقرأ في رکعة بالفاتحة والسورة ولو ترک القراءة في احداهما تفسد صلوته وعليه ان يقضي رکعة ويتشهد ثم رکعة اخرى ويتشهد ويسلم.

وفي الشامية(۱/۴۵۹): اعلم ان في محل القراءة المفروضة في الفرض ثلاثة اقوال الاول ان محلها الرکعتان الاوليان عينا وصححه في البدائع. الثاني ان محلها رکعتان منها غير عين: اى فيكون تعيينها في الاوليين واجبا وهو المشهور في المذهب الثالث ان تعيينها فيهما افضل وعليه مشى في غاية البيان وهو ضعيف والقولان الاولان اتفقا على ان لو قرأ في الاخريين فقط يصح ويلزمه سجود السهو لو ساهيا لكن سببه على الاول تغيير الفرض عن محله وتكون قراءته قضاء عن قرأته في الاوليين وسببه على الثاني ترک الواجب وتكون قراءته في الاخريين اداء...... والحاصل انه قيل ان محل القراءة رکعتان من الفرض غير عين وكونها في الاوليين افضل وقيل ان محلها الاوليان منه عينا فيجب كونها فيهما وهو المشهور في المذهب الذى عليه المتون وهو المصحح وعلمت تأييده بما مرفي عبارة البحر عن البدائع من مسألة المسافر والمسبوق وقال القهستاني: انه الصحيح من مذهب اصحابنا.

وفيه ايضاً(۱/۴۵۶): (ولها واجبات) لا تفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو ان لم يسجد له وان لم يعدها يكون فاسقا آثما وكذا كل صلاة اديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها.

(۱۵۹) مسبوق امام کے ساتھ سجدۂ سہو کرے گا یا نہیں؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ایک یا دو رکعات کے بعد امام کیساتھ شریک ہوا امام نے آخری رکعت میں سجدہ سہو کیلئے سلام پھیرا اور سجدہ سہو کیا تو پیچھے اس مسبوق نے بھی امام کیساتھ سلام پھیر دیا اور بعد میں کھڑے ہو کر اپنی نماز پوری کر لی، اب سوال یہ ہے کہ مسبوق کے امام کیساتھ سلام پھیرنے سے مسبوق کی نماز ادا ہوئی یا نہیں؟ اور اس پر سجدۂ سہو

واجب تو نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ مسبوق سجدہ سہو میں تو امام کی متابعت کریگا یعنی سجدہ سہو امام کیساتھ ادا کریگا البتہ سلام میں امام کی متابعت نہیں کریگا یعنی بغیر سلام پھیرے امام کیساتھ سجدہ میں جائیگا، اب صورت مسئولہ کو سمجھئے اگر مسبوق نے امام کیساتھ سلام پھیرلیا تو پھر اگر قصداً سلام پھیرا ہے (یہ بات یاد ہو کہ میری نماز باقی ہے) تو اسکی نماز فاسد ہوگئی اور اگر قصداً سلام نہیں پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور سجدہ سہو بھی لازم نہ ہوگا، اسی طرح جب امام نماز ختم کرنے کیلئے سلام پھیرے تو اس سلام میں بھی مسبوق، امام کی متابعت نہ کرے اگر اس آخری سلام میں مسبوق نے امام کیساتھ قصداً سلام پھیرلیا (یہ بات یاد ہو کہ میری نماز باقی ہے) تو اسکی نماز فاسد ہوجائیگی اور اگر سہواً سلام پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور یہ سلام جو مسبوق نے سہواً پھیرا ہے اگر یہ سلام، امام کے سلام سے کچھ پہلے یا متصل واقع ہوا ہو تو مسبوق پر اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا کیونکہ مسبوق مقتدی کے حکم میں ہے اور امام کے ساتھ مقتدی جب سہو کرلے تو اسپر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا البتہ اگر مسبوق نے امام کے سلام پھیرنے کے بعد سلام پھیرا تو اپنی نماز کے آخر میں اسپر سجدہ سہو لازم ہوگا کیونکہ اب یہ منفرد ہوگیا۔

لمافی الشامیة (۸۲/۲): (قوله، والمسبوق یسجدمع امامه) قیدبالسجود لانه لایتابعه فی السلام بل یسجدمعه ویتشهدفاذاسلم الامام قام الی القضاء فان سلم فان کان عامدافسدت والالاولاسجود علیه ان سلم سهواقبل الامام اومعه وان سلم بعده لزمه لکونه منفردا حینئذ.

(۱۶۰) مسبوق کا اپنی بقیہ رکعات میں قرأت بھول جانے پر سجدۂ سہو نہ کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ظہر کی نماز میں دو رکعت کے بعد آ کر جماعت میں شریک ہوا، اور جب امام نے سلام پھیر دیا تو کھڑے ہو کر اپنی بقیہ دو رکعت پڑھنے لگا، ان دو رکعت میں وہ سورۂ فاتحہ کے بعد سورت پڑھنا بھول گیا۔ لیکن چونکہ اس نے آخری دو رکعت امام کے ساتھ پڑھیں تھیں اس وجہ سے اس نے ان دو رکعتوں میں چھوٹنے والی سورۃ کی وجہ سے سجدۂ سہو نہیں کیا تو آیا اس کی نماز ہوگئی؟ یا اس کا اعادہ کرنا لازم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......مسبوق آدمی (جس کی ابتداءً امام سے کچھ رکعتیں رہ گئی ہوں) وہ بقیہ رکعتوں کی ادائیگی میں منفرد یعنی اکیلے نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہوتا ہے اور جب وہ بقیہ رکعتوں کی ادائیگی کرے تو اس کے ذمہ پہلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ ملانا واجب ہے اسی طرح اگر اس سے کچھ سہو ہوجائے اپنی بقیہ رکعتوں کی ادائیگی میں تو اس پر سجدہ سہو کرنا بھی لازم ہوتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص پر واجب کے ترک یعنی پہلی دو رکعتوں میں سورت چھوڑنے کی بناء پر نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے اور مذکورہ شخص کا اس بات کو علت ومدار بنانا کہ میں نے چونکہ آخری دو رکعتیں امام کے ساتھ پڑھی تھیں اس لئے سجدہ سہو نہیں کیا یہ بات صحیح نہیں۔

لمافی المبسوط للامام السرخسی (۱/۲۲۰): قال وان سها عن القراءة فی الاولیین فعلیه سجود

السھو لان القراءۃ رکن والاولیان تعینتا لاداء ھذا الرکن واجبا وبترک الواجب یتمکن النقصان فی الصلاۃ.

وفی الھندیۃ (۱/۹۱): ولو ادرک رکعتین قضی رکعتین بقراءۃ ولو ترک فی احدٰھما فسدت،

وفی (صـ۱۲٦): ولا یجب السجود الا بترک واجب او تاخیرہ.......... ولو قرأ الفاتحۃ وحدھا وترک السورۃ یجب علیہ سجود السھو وکذا لو قرأ مع الفاتحۃ آیۃ قصیرۃ کذا فی التبیین.

(۱٦۱) سجدہ میں سو جانے اور نیند یا کسی اور وجہ سے مقتدی کے لاحق ہو جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں دکان پر کام کرتا ہوں اور رات دیر تک دکان کھلی رہتی ہے اس لئے صبح کبھی کبھی نیند کا غلبہ ہوتا ہے آج صبح کی نماز میں میں پہلے سجدہ میں سو گیا اور جب آنکھ کھلی تو امام صاحب کھڑے تھے میں بھی کھڑا ہو گیا اور آخر میں امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لی تو میری یہ نماز ہوئی یا نہیں؟ نہیں ہوئی تو کس طرح ادا کروں از سر نو ادا کروں یا آخر میں امام کے سلام کے بعد سجدہ سہو کر کے ادا کروں۔ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب آپ سجدہ میں سو گئے، اگر اس حالت میں سجدہ کی مسنون کیفیت برقرار نہ رہی تو اس سے آپ کا وضو ٹوٹ گیا، اور نماز بھی جاتی رہی۔ سجدہ کی مسنون کیفیت سے مراد یہ ہے کہ حالت سجدہ میں انسان کا پیٹ رانوں سے اور بازو پہلوؤں سے الگ رہیں اور اگر سجدہ کی مسنون کیفیت برقرار رہی، تو آنکھ کھلنے پر آپ کو چاہئے تھا کہ پہلے دوسرا سجدہ جو آپ سے چھوٹ گیا تھا، ادا کرتے اور پھر امام کے ساتھ رکعت میں شریک ہو جاتے، تو آپ کی نماز درست ہو جاتی، لیکن آپ نے ایسا نہ کیا۔ پھر بھی اگر آپ امام کے سلام پھیرنے کے بعد چھوٹا ہوا سجدہ ادا کر کے سلام پھیر دیتے، تب بھی آپ کی نماز درست ہو جاتی۔ لیکن چونکہ آپ نے ان صورتوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار نہ کی بلکہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کیا، حالانکہ سجدہ سہو سے فرض کا تدارک نہیں ہوتا، اور نہ ہی لاحق (جو شروع سے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو، اور بیچ میں نماز کا کچھ حصہ عذر کی بنا پر چھوٹ جائے) پر سجدہ سہو آتا ہے۔ اور فرض کے رہ جانے سے نماز نماز ہی نہیں رہتی۔ لہٰذا اب آپ کو چاہیے کہ اپنی نماز کی از سر نو قضا کریں۔

لمافی الھندیۃ (۱/۹۲): واذا کبر مع الامام ثم نام حتی صلی الامام رکعۃ ثم انتبہ فانہ یصلی الرکعۃ الاولیٰ وان کان الامام یصلی الرکعۃ الثانیۃ ھکذا فی الذخیرۃ ولو لم یشتغل بقضاء ما سبقہ الامام ولکن یتابع الامام اولا ثم قضی ما سبقہ الامام بعد تسلیم الامام جازت صلاتہ عندنا.

وفی الشامیۃ (۱/۱۴۱): (قولہ وساجدا) وکذا قائما وراکعا بالاولیٰ والھیئۃ المسنونۃ بان یکون رافعا بطنہ عن فخذیہ مجافیا عضدیہ عن جنبیہ کما فی البحر، قال ط: وظاھرہ ان المراد الھیئۃ المسنونۃ فی حق الرجل لا المرأۃ.

﴿فصل فی القراءۃ﴾

(نماز میں قرأت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۶۲) نماز میں منہ ہی منہ میں قرأت کا حکم

سوال......سری نماز میں صحت نماز کیلئے صرف حروف کا تلفظ کافی ہے یا آواز کا سنائی دینا بھی ضروری ہے؟ اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ منہ ہی منہ میں قرأت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سری نمازوں میں صحتِ نماز کیلئے تصحیح حروف ضروری ہے اگرچہ نمازی کو اپنی آواز سنائی نہ دے۔لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ قرأت اتنی بلند آواز سے ہو کہ خود نمازی کو اپنی آواز سنائی دے سکے۔

لمافی الهندية(۱/۷۲): اختلفوا فی حد الجهر والمخافتة قال الفقيه ابو جعفر والشيخ الامام ابو بكر...... ادنی الجهر ان يسمع غيره وادنی المخافتة ان يسمع نفسه وعلی هذا يعتمد كذا فی محيط. وهو الصحيح كذا فی الوقاية والنقاية. وبه اخذ عامة المشايخ، ولو كان بحيث تجاوز شفتيه حتی لو قرب انسان صماخه من فمه يدخل صوته فی اذنه وفهم مايقرأ فهذه مجمجة (۱) كذا فی الخلاصة.

وفی الشامية (۱/۵۳۴): فشرط الهندوانی والفضلی لوجودها خروج صوت يصل الی اذنه وبه قال الشافعی وشرط بشر المريسی واحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الی اذنه...... ولم يشترط الكرخی وابوبكر البلخی السماع واكتفيابتصحيح الحروف. واختار شيخ الاسلام. وقاضيخان وصاحب المحيط والحلوانی قول الهندوانی...... وان ما قاله الهندوانی اصح وارجح لاعتماد اكثر علمائنا عليه.

(۱۶۳) نماز میں دل ہی دل میں تلاوت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں الحمد للہ ایک عرصہ سے نماز پابندی سے پڑھ رہا ہوں، میں نے اپنی قضائے عمری بھی پوری کرلی ہے۔ایک صاحب سے ایک دن باتوں باتوں میں اس مسئلے کا پتا چلا کہ نماز میں تلاوت

زبان سے کرنا ضروری ہے، حالانکہ میں تو اب تک ساری نمازوں میں تلاوت وغیرہ دل ہی دل میں کرتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں بڑا پریشان ہوں کہ میری گزشتہ نمازوں کا کیا ہوگا؟ کیا دل ہی دل میں تلاوت کرنے سے نماز نہیں ہوتی؟ مہربانی فرما کر اس مسئلے کا حل جلد مرحمت فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......نماز میں تلاوت زبان سے کرنا ضروری ہے اور دل ہی دل میں تلاوت کرنے سے نماز نہیں ہوتی لہٰذا جتنی نمازیں آپ نے اس طرح اکیلے پڑھی ہیں وہ ادا نہیں ہوئیں لہٰذا ان نمازوں کا اعادہ کرنا لازم ہے۔

لما في بدائع الصنائع (۱/۱۶۱، ۱۶۲):ثم المنفرد اذا خافت واسمع أذنيه يجوز بلا خلاف لوجود القراءة بيقين اذ السماع بدون القراءة لا يتصور وأما اذا صحح الحروف بلسانه وأداها على وجهها ولم يسمع أذنيه ولكن وقع له العلم بتحريك اللسان وخروج الحروف من مخارجها فهل تجوز صلاته اختلف فيه ذكر الكرخي انه يجوز وهو قول أبي بكر البلخي المعروف بالأعمش وعن الشيخ أبي القاسم الصفار والفقيه أبي جعفر الهندواني والشيخ الامام أبي بكر محمد بن الفضل البخاري انه لا يجوز مالم يسمع نفسه وعن بشر بن غياث المريسي انه قال ان كان بحال لو أدنى رجل صماخ أذنيه الى فيه سمع كفي وإلا فلا ومنهم من ذكر في المسئلة خلافاً بين أبي يوسف ومحمد فقال على قول أبي يوسف يجوز وعلى قول محمد لا يجوز وجه قول الكرخي أن القراءة فعل اللسان وذلك بتحصيل الحروف ونظمها على وجه مخصوص وقد وجد فأما اسماعه نفسه فلا عبرة به لأن السماع فعل الأذنين دون اللسان..... وما قاله الكرخي أقيس وأصح.

وفي الشامية(۱/۵۳۴): اعلم انهم اختلفوا في حد وجود القراءة على ثلاثة أقوال فشرط الهندواني والفضلي لوجودها خروج صوت يصل إلى أذنه وبه قال الشافعي. وشرط بشر المريسي وأحمد خروج الصوت من الفم وإن لم يصل إلى أذنه لكن بشرط كونه مسموعاً في الجملة حتى لو أدنى أحد صماخه إلى فيه يسمع ولم يشترط الكرخي وأبو بكر البلخي السماع واكتفيا بتصحيح الحروف..... وذكر أن كلامن قولي الهندواني والكرخي مصححان وأن ما قاله الهندواني أصح وأرجح لإعتماد أكثر علمائنا عليه.

(۱۶۴) سری نمازوں میں قرأت میں تصحیح حروف ضروری ہے یا پھر آواز کا سنائی دینا بھی؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سری نماز میں صحت نماز کیلئے صرف حروف کا تلفظ کافی ہے یا آواز کا سنائی دینا بھی ضروری ہے؟ اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ منہ ہی منہ میں تلاوت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... سری نمازوں میں صحتِ نماز کیلئے تصحیح حروف ضروری ہے اگرچہ نمازی کو اپنی آواز سنائی نہ دے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ قرأت اتنی بلند آواز سے ہو کہ خود نمازی کو اپنی آواز سنائی دے سکے۔

لمافي عالمگیری(۱/۷۲): اختلفوا فی حد الجهر والمخافتة قال الفقيه ابو جعفر والشيخ الامام ابو بكر محمد بن الفضل ادنى الجهر ان يسمع غيره وادنى المخافتة ان يسمع نفسه وعلى هذا يعتمد كذا فى المحيط. وهو الصحيح كذا فى الوقاية والنقاية. وبه اخذ عامة المشايخ كذا الزاهدى ولو كان بحيث تجاوز شفتيه حتى لو قرب انسان صماخه من فمه يدخل صوته فى اذنه وفهم مايقرأ فهذه مجمجه كذا فى الخلاصة.

وفى الشامية (۱/۵۳۴): فشرط الهندوانى والفضلى لوجودها خروج صوت يصل الى اذنه وبه قال الشافعى وشرط بشر المريسى واحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الى اذنه..... ولم يشترط الكرخى وابوبكر البلخى السماع واكتفيابتصحيح الحروف. واختار شيخ الاسلام. وقاضيخان وصاحب المحيط والحلوانى قول الهندوانى..... وأن ما قاله الهندوانى اصح وارجح لاعتماد اكثر علمائنا عليه.

(۱۶۵) ''ض'' کی ادائیگی کا طریقہ اور اس میں تعامل عرب

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ''ض'' کی ادائیگی میں جو اختلاف ہے براہ کرم اس کی صحیح وضاحت فرمادیں کہ کونسا طریقہ افضل ہے ''دال'' کی آواز میں پڑھنا افضل ہے یا ''ظا'' ''ذال'' کی آواز میں پڑھنا افضل ہے۔ اور یہ بھی وضاحت سے بتادیں کہ تعامل عرب کیا ہے؟ کیونکہ حدیث میں ہے کہ قرآن کو عرب کے طرز میں پڑھیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... جمہور قراء اور فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ حرف ضاد کا مخرج اصلی حافہ لسان یعنی زبان کی دائیں، بائیں کروٹ اور اس کی متصل داڑھیں ہیں۔ جس کی آواز ظاء معجمہ کے مشابہ ہے البتہ دال کے مشابہ نہیں ہے جیسا کہ بعض کتب فقہ اور قرأت کی کتابوں میں اس کی تشریحات موجود ہیں اور چونکہ حرف ضاد، ظا کے مشابہ ہے تو قراء کرام نے ضاد کو صحیح طور پر ادا کرنے کیلئے یہ فرمایا ہے کہ اس کو بذریعہ استطالت اور ظاء سے ممتاز کر کے پڑھا جائے تا کہ ہر ایک میں امتیاز ہو سکے۔ البتہ اگر کوئی قاری کوشش کے باوجود بھی حرف ضاد کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکے تو پھر فقہاء کرام نے گنجائش رکھی ہے کہ اگر دال یا ذال، یا ظا میں سے جس کے مشابہ بھی پڑھا جائیگا عموم بلویٰ کے تحت اس کی نماز درست قرار دی جائے گی، البتہ اگر کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ جان بوجھ کر غلط پڑھتا ہے تو پھر نماز فاسد ہو جائے گی۔

لما فى الشامية (۱/۶۳۳): وفى التاتارخانية عن الحاوى حكى عن الصفار انه كان يقول الخطأ اذا دخل فى الحروف لايفسد لان فيه بلوى عامة الناس لانهم لايقيمون الحروف الابمشقة، اهـ وفيها

اذا لم یکن بین الحرفین اتحاد المخرج ولا قربه الا ان فیه بلوی العامة کا لذال مکان الصاد أو الزای المحض مکان الذال والظاء مکان الضاد لاتفسد عند بعض المشایخ.

وفیه ایضاً (۱/۶۳۳): ان تعمد ذلک تفسد وان جری علی لسانه أو لایعرف التمیز لاتفسد وهو المختار حلیة وفی البزازیة وهو أعدل الاقاویل وهو المختار.

(۱۶۶) ظہر وعصر کی نمازوں میں آہستہ قرأت کرنے کی وجہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں قرأت آہستہ کیوں کی جاتی ہے جبکہ دیگر نمازوں میں قرأت زور سے کی جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء میں تمام نمازوں کے اندر قرأت جہر (اونچی آواز) کے ساتھ پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ کفار نے مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے اور ان کی نمازوں میں خلل ڈالنے کیلئے قرأت کے دوران شور مچانے کا مشورہ کیا۔ ظہر اور عصر اِن دو اوقات میں یہ لوگ فارغ ہوتے تھے، اسی لئے ان اوقات میں تکلیف پہنچانے اور اپنے مذموم ارادوں کو پورا کرنے کیلئے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ بخلاف باقی تین اوقات کے کہ ان میں یہ لوگ مصروف رہتے تھے اس وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ضرر سے بچنے کیلئے ظہر اور عصر کی نمازوں کی قرأت آہستہ پڑھنا شروع کی اور چونکہ اسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاحیات مواظبت اختیار کی اس وجہ سے یہ عمل واجب قرار پایا۔ جمعہ اور عیدین میں چونکہ مسلمانوں کی کثرت ہوتی تھی اور یہ نمازیں شہر میں ادا ہوتی تھیں اور کفار کو شہر میں مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کی قوت حاصل نہیں تھی۔ اس لئے جمعہ اور عیدین میں قرأت جہراً ہوا کرتی تھی۔

اب بھی ظہر اور عصر میں آہستہ قرأت پڑھنا حکمت اور فائدے سے خالی نہیں۔ یہ کہ قرأت رکن ہے جس کو امام قوم کی طرف سے ادا کرتا ہے تو جہر اس لئے کرتا ہے کہ اس میں فکر کریں اور ان کو بھی فائدہ حاصل ہو، لیکن ظہر اور عصر کی نمازوں میں لوگوں کے دل عموماً اپنے کاموں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جن کو چھوڑ کر لوگ نماز کیلئے آئے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے حقیقی معنوں میں قرأت میں فکر کرنا مشکل ہے۔ اس لئے ظہر اور عصر میں قرأت جہراً مفید نہیں بلکہ سراً مفید ہے۔ بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان میں لوگ فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور پوری توجہ قرأت کی طرف یکسوئی کے ساتھ مبذول کی جاسکتی ہے۔ اس لئے اس میں قرأت جہراً مفید ہے۔ جمعہ اور عیدین کا خاص دن ہونے کی وجہ سے ان میں تیاری کر کے اہتمام کے ساتھ آتے ہیں۔ اور فارغ البال ہو کر توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔

لمافی بدائع الصنائع (۱/۶۸۲، ۶۸۳): ویجب علیه المخافتة فیما یخافت وانما کان کذلک لأن القراءة رکن یتحمله الامام عن القوم فعلا فیجهر لیتأمل القوم ویتفکروا فی ذلک فتحصل ثمرة القراءة وفائدتها للقوم فتصیر قراءة الامام قراءة لهم تقدیرا کأنهم قرؤوا وثمرة الجهر تفوت فی صلوة النهار لأن الناس فی الاغلب یحضرون الجماعات فی خلال الکسب والتصرف والانتشار فی

الارض فكانت قلوبهم متعلقة بذلك فيشغلهم ذلك عن حقيقة التأمل فلا يكون الجهر مفيداً بل يقع تسبيباً الى الاثم بترك التأمل.

وفي المبسوط للسرخسي(۱/۱۷):وقد كان النبي ﷺ في الابتداء يجهر بالقرآن في الصلاة كلها وكان المشركون يؤذونه ويسبون من أنزل ومن أنزل عليه فأنزل الله تعالىٰ ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا فكان يخافت بعد ذلك في صلاة الظهر والعصر لأنهم كانوا مستعدين للأذى في هذين الوقتين ويجهر في صلاة المغرب لأنهم كانوا مشغولين بالأكل وفي صلاة العشاء والفجر لأنهم كانوا نياما ولهذا جهر في الجمعة والعيدين لأنه اقامها بالمدينة وما كان للكفار بها قوة الأذى.

وفي الدر المختار(۱/۵۳۳): وكان عليه الصلاة والسلام يجهر في الكل ثم تركه في الظهر والعصر لدفع أذى الكفار.

(۱۶۷) قراتِ شاذہ سے تلاوت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرأت شاذہ سے تلاوت کرنا کیسا ہے اور اگر نماز میں پڑھے تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز میں قرأت شاذہ سے تلاوت کرنا بذات خود تو منع نہیں ہے، مگر عام مجمعوں میں اس سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ ناواقف لوگوں میں شکوک وشبہات کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لئے عام مجمعوں میں قرأتِ حفص سے ہی تلاوت کرنی چاہئے۔

لمافي الهندية(۱/۷۹): في الحجة قراءة القران بالقراءات السبعة والروايات كلها جائزة. ولكني أرى الصواب أن لايقرأ القراءة العجيبة بالأمالات، والروايات الغريبة.

وفي الطحطاوي على الدر (۱/۲۰۳) : (قوله ومنها القراءة) أي من القرآن المنقول عن الرسول عليه الصلاة والسلام متواترا فلا يقرأ بالشواذ وان قرأ بها لا تفسد ولا يعتد بها .

وفي الشامية(۱/۵۴۴):. حاصل معنى كلام هذين الشيخين بيان وجه الكراهة في المداومة. وهو أنه ان رأى ذالك حتماً يكره من حيث تغيير المشروع، وإلايكره من حيث إيهام الجاهل.

(۱۶۸) قراءة سبعه او عشره کی نماز میں تلاوت اور مخفف کو مشدد یا برعکس پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ''مسجد خالد بن ولید'' میں امام ہے یہ مسجد چونکہ

ہمارے گھر کے قریب ہے اس لئے میں اکثر نمازیں وہاں پڑھتا ہوں، لیکن امام صاحب عام طور پر مشدد الفاظ کو غیر مشدد کر کے پڑھتے ہیں کبھی کبھی غیر مشدد الفاظ کو مشدد کر کے ادا کرتے ہیں، ایک دن میرے ایک دوست جو کہ ''حافظ قرآن اور اچھے قاری ہیں'' تشریف لائے تھے جب ہم مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو حافظ صاحب نے کہا کہ تمہارے امام صاحب تو قرآن بہت غلط پڑھتے ہیں شاید اس سے نماز فاسد ہوتی ہو۔لہٰذا آپ کسی مفتی صاحب سے معلوم کرلیں، لیکن پہلے میں نے جا کر اپنے امام صاحب سے پوچھ لیا تو انہوں نے کہا کہ قرآن مجید کی ایک ہی قرأت نہیں بلکہ بہت ساری قرائتیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو نماز میں پڑھنا جائز ہے۔لیکن مجھے بہت تعجب ہوا۔کہ اب تک یہ بات ہم نے کسی سے نہیں سنی تھی۔لہٰذا مفتی صاحب برائے مہربانی آپ فرمائیں کیا اس طرح قرأت کرنے سے نماز ہو جاتی ہے؟ کیا امام صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن پڑھنے کی بہت سی قرائتیں ہیں یہ بات صحیح ہے اور جتنی نمازیں اب تک ہم نے پڑھی ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... قراءۃ سبعہ او عشرہ (جو کہ مشہور ''سبعہ عشرۃ'' سے ہیں) اگرچہ نماز میں پڑھنا درست ہے لیکن ائمہ کرام کیلئے بہتر یہی ہے کہ جو مشہور روایت (امام حفص ؒ کی روایت) عام طور پر پڑھی جاتی ہے اس کی تلاوت کریں کیونکہ عوام دوسری روایات کے متعلق علم نہیں رکھتے اس لئے وہ بعض اوقات ان روایات کو صحیح نہیں سمجھتے حالانکہ ان کے صحیح ہونے میں کسی قسم کا کوئی تردد نہیں۔لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ عوام کو گناہ گار ہونے سے بچانے کیلئے روایت حفص میں ہی قرأت کی جائے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر امام صاحب قراءۃ سبعہ اور عشرۃ کا علم رکھتے ہیں اور پھر کسی روایت کے تحت مشدد کو غیر مشدد اور غیر مشدد کو مشدد پڑھ رہے ہیں تو ان کیلئے اس طرح پڑھنا جائز ہوگا گو مصلحت کے تحت مناسب نہیں۔لیکن اگر وہ قراءۃ سبعہ اور عشرۃ کا علم نہیں رکھتے بلکہ مشہور قرأت حفص میں ہی تلاوت کرتے ہوئے مشدد کو غیر مشدد اور غیر مشدد کو مشدد پڑھتے ہیں تو اب دیکھا جائے گا اگر اس سے معنی میں تغیر فحش پیدا نہیں ہوا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

لمافی الصحیح للبخاری(۲/۷۴۷): حدثاہ انهما سمعا عمر بن خطاب...... ثم قال اقرأ یاعمر فقرأت القراءة التی اقرأنی فقال رسول اللہ ﷺ کذلک انزلت ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرؤا ماتیسر منه.

وفی التاتارخانیة(۱/۴۹۲): فی ترک المد والتشدید فی موضعهما والاتیان بهما فی غیر موضعهما ان کان لا یغیر المعنی ولا یقبح الکلام لایوجب فساد الصلوة وان کان یغیر المعنی ویقبح الکلام اختلف المشائخ: قال بعضهم: لا تفسد الصلوٰة: وقال عامتهم تفسد صلاته، وفی النصاب وعلیه الفتوی.

مثال الاول فی ترک التشدید اذا قرأ ''ملعونین اینما ثقفوا اخذوا وقتلو'' بغیر تشدید لا تفسد الصلوته لانه قریب من ''قتّلو'' بالتشدید...... المثال الثانی...... ولو قرأ ''فمن اظلم ممن کذب علی

اللہ شدد الذال فی "کذب" اختلف المشائخ فیہ وفی الغیاثیہ قال بعضھم لاتفسد، وعلیہ الفتویٰ.
ولو قرأ "فاولئک ھم العادون" وشدد الدال تفسد صلاتہ بلا خلاف............

وفی الھندیۃ (۱/۷۹): فی الحجۃ قراءۃ القران القراءات السبعۃ والروایات کلھا جائز ولکنی اری الصواب ان لا یقرأ القراءۃ العجیبۃ بالامالات والروایات الغریبۃ کذا فی التاتارخانیۃ.

وفی الشامیۃ (۱/۵۴۱): (قولہ ویجوز بالروایات السبع) بل یجوز بالعشر ایضاً کما نص علیہ اھل الاصول (قولہ بالغریبۃ) ای بالروایات الغریبہ والامالات، لأن بعض السفھاء یقولون مالا یعلمون فیقعون فی الاثم والشقاء، ولا ینبغی للأمۃ ان یحملوا العوام علی مافیہ نقصان دینھم ولا یقرأ عندھم مثل قراءۃ ابی جعفر وابن عامر وعلی بن حمزۃ والکسائی صیانہ لدینھم فلعلھم یستخفون او یضحکون وان کان کل القراءات والروایات صحیحۃ فصیحۃ، ومشایخنا اختاروا قراءۃ ابی عمر وحفص عن عاصم من التاتارخانیۃ عن فتاویٰ الحجۃ.

(۱۶۹) نماز میں قرأت کے چند متفرق مسائل

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز میں ترتیب سورۃ (مثلاً اگر پہلی رکعت میں سورۃ فیل پڑھی ہے تو دوسری رکعت میں سورۃ قریش پڑھیں نہ کہ سورۃ ہمزہ) کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور بصورت عدم لحاظ ترتیب شرعی حکم کیا ہوگا؟ اسی طرح ہر رکعت میں ایک ہی سورت پڑھنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ اسی طرح پہلی رکعت میں سورۃ نصر اور دوسری میں سورۃ اخلاص پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ نیز پہلی رکعت میں طویل قرأت اور دوسری رکعت میں مختصر قرأت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ اور اس کا لحاظ نہ کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ ان تمام مسائل میں فرض، سنن اور نوافل کے اعتبار سے کوئی فرق ہے؟ اگر کسی شخص کو وتر میں یہ ہی یاد نہ ہو کہ اس نے دعائے قنوت پڑھی یا نہیں تو ایسے شخص پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟ چار رکعت والی نماز میں اگر کوئی غلطی سے تیسری رکعت میں قعدہ کرلے پھر یاد آنے پر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو یا بغیر تکبیر کہے کھڑا ہو کر چوتھی رکعت مکمل کرے۔ آیا اس کی نماز ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......فرض نماز میں سورتوں کی ترتیب بلحاظ قراءت ملحوظ رکھنی چاہئے۔ اگر کوئی عدم ترتیب کو عادت بنائے گا تو گناہ گار ہوگا اور قصداً منکوس قراءت کرنا (یعنی پہلی رکعت میں بعد والی سورت اور دوسری رکعت میں اس سے اوپر والی سورت پڑھنا) خلاف اولیٰ ہے۔ البتہ اگر نفل میں کوئی اس طرح کرے تو کوئی حرج نہیں اسی طرح فرض نماز میں چھوٹی سورتوں میں بیچ میں ایک سورت چھوڑنا خلاف اولیٰ ہے۔ پہلی رکعت میں طویل قراءت اور دوسری میں مختصر قرأت کرنا فجر میں سنت ہے اور باقی نمازوں میں اولیٰ ہے۔ اور اس کے برعکس کرنے میں اگر دوسری رکعت تین آیات کی مقدار سے زیادہ طویل ہوجائے تو یہ خلاف اولیٰ ہے۔

اگر کسی کو وتر میں یہ یاد ہی نہ ہو کہ قنوت پڑھی ہے یا نہیں تو اس کو آخر میں سجدہ سہو کرلینا چاہئے۔ چار رکعت والی نماز میں اگر کوئی تیسری

رکعت میں قعدہ کرلے تو پھر یاد آنے پر بغیر تکبیر کہے کھڑا ہوجائے اور اگر تین تسبیح کے بقدر بیٹھا ہو تو آخر میں سجدہ سہو کرنا ضروری ہے۔

لمافی صحیح البخاری(۱/۱۰۷): عن عبداللہ بن ابی قتادہ عن ابیہ ان النبی ﷺ کان یقرء فی الظھر فی الاولیین بام الکتاب وسورتین وفی الرکعتین الاخریین بام الکتاب ویسمعنا الایة ویطول فی الرکعة الاولیٰ مالا یطیل فی الرکعة الثانیة وھکذا فی العصر وھکذا فی الصبح.

وفی حاشیة الطحطاوی(۴۷۴): (قولہ: وجب علیہ سجود السھو) إذا شغلہ التفکر عن اداءِ واجب.. بقدر رکن...... وھو مقدر بثلاث تسبیحات، ثم ان محل وجوب سجود السھو إذا لم یشتغل حالة الشک بقرأة ولا تسبیح اھ.

وفی الدر المختار(۱/۵۴۱،۵۴۲): (وتطال اولی الفجر علی ثانیتھا) بقدر الثلث وقیل النصف ندبا فلوفحش لابأس بہ (فقط) وقال محمد: ولی الکل حتی التراویح قیل وعلیہ الفتوی (واطالة الثانیة علی الاولی یکرہ) تنزیھا(اجماعا ان بثلث آیات) ان تقاربت طولا وقصرا والااعتبر الحروف والکلمات .... (صـ۵۴۳) (وان باقل لا) یکرہ.

وفی الدر المختار(۱/۵۴۶،۵۴۷): لابأس ان یقرأ سورة ویعید ھافی الثانیة وان یقرأ فی الاولی من محل وفی الثانیة من آخر ولومن سورة ان کان بینھما ایتان فأکثر ویکرہ الفصل بسورة قصیرة وان یقرأ منکوسا الا اذا ختم فیقرأ من البقرة وفی القنیة قرأ فی الاولی الکافرون وفی الثانیة الم تر أوتبت، ثم ذکر یتم وقیل یقطع ویبدء ولایکرہ فی النفل شئ من ذلک

وفی الشامیة تحتہ: (قولہ ثم ذکر یتم) افاذان التنکیس أو الفصل بالقصیرة انما یکرہ اذا کان عن قصد فلو سھوا فلا کمافی شرح المنیة.

وفیہ ایضاً(۲/۹): (ولو نسیہ) أی القنوت(ثم تذکرہ فی الرکوع لایقنت) فیہ لفوات محلہ (ولایعود الی القیام) فی الاصح لان فیہ رفض الفرض للواجب (فان عادالیہ وقنت ولم یعدا لرکوع لم تفسد صلاتہ) لکون رکوعہ بعد قراءة تامة (صـ۱۰) (وسجد للسھو) قنت اولا لزوالہ عن محلہ.

(۱۷۰) مسئلہ زلۃ القاری

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)......مسئلہ زلۃ القاری میں فتویٰ طرفین رحمہما اللہ کے قول پر ہے یا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر؟

(۲)......طرفین رحمہما اللہ کے نزدیک فساد وعدم فساد کا مدار دولفظوں کے آپس میں قریب المعنی اور بعید المعنی ہونے پر ہے، کسی لفظ کے

قریب المعنی اور بعید المعنی ہونے کی کیا تحدید اور ضابطہ ہے؟

(۳)......مسائل زلۃ القاری میں جن مقامات میں متقدمین ومتاخرین کے قول میں اختلاف ہے فتویٰ متقدمین کے قول پر ہے یا متاخرین کے قول پر، مثلاً وہ خطائی الاعراب جو مکفر ہو عندالاعتقاد اور دیگر مقامات۔

الجواب حامداً ومصلیاً......قرآن مجید کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں اتارا ہے لہٰذا اس کو عربی لہجے میں پڑھنا چاہئے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اقرءوا القرآن بلحون العرب یعنی قرآن مجید کو عربی لہجے میں پڑھو۔ لہٰذا قرآن مجید کو تجوید کے قواعد کے مطابق یعنی ہر حرف کو اپنے مخارج اور صفات کے ساتھ اپنی قدرت وگنجائش کے موافق پڑھنے کی مشق کرنا اور کوشش کرتے رہنا ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص بے فکر ہو کر ہمیشہ غلط پڑھتا رہے تو وہ گنہگار ہوگا۔

صورت مسئولہ میں جن مقامات میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے وہاں پر فتویٰ متاخرین کے قول پر ہے۔ لیکن جو شخص صحیح حروف اور صحیح اعراب ادا کرنے پر فعلاً قادر ہو اور پھر بھی وہ جان بوجھ کر قصداً غلط ادا کرتا ہے اور غلط ادا کرنے کی وجہ سے معنی میں بھی تغیر فاحش آ جائے تو پھر متقدمین اور متاخرین سب کا فتویٰ یہی ہے کہ نماز فاسد ہوگی۔

لما فی الشامية (۱/۶۳۰): ان الخطاء اما فی الاعراب أی الحركات والسكون ويدخل فيه تخفيف المشدد وقصر الممدود وعكسهما أو فی الحروف بوضع حرف مكان اخر، أو زيادته أو نقصه أو تقديمه أو تأخيره أو فی الكلمات أو فی الجمل كذلک أو فی الوقف ومقابله والقاعدة عند المتقدمين ان ماغير المعنی تغيراً يكون اعتقاده كفراً يفسد فی جميع ذلک سواء كان فی القرآن أولا. الا ما كان من تبديل الجمل مفصولا بوقف تام وان لم يكن التغيير كذلک فان لم يكن مثله فی القرآن والمعنی بعيد متغير تغيراً فاحشاً يفسد ايضاً كهذا الغبار مكان هذا الغراب، وكذا اذا لم يكن مثله فی القرآن ولا معنی له كالسرائل باللام مكان السرائر وان كان مثله فی القرآن والمعنی بعيد ولم يكن متغيرا فاحشا تفسد أيضا عند ابی حنيفة و محمد، وهو الاحوط، وقال بعض المشايخ: لاتفسد لعموم البلوی، وهو قول أبی يوسف وان لم يكن مثله فی القرآن ولكن لم يتغير به المعنی نحو قيامين مكان قوامين فالخلاف علی العكس، فالمعتبر فی عدم الفساد عند عدم تغير المعنی كثيرا وجود المثل فی القرآن عنده والموافقة فی المعنی عند هما، فهذه قواعد الائمة المتقدمين، واما المتأخرون كابن مقاتل وابن سلام واسمعيل الزاهد وابی بكر البلخی والهندوانی وابن الفضل والحلوانی، فاتفقوا علی ان الخطأ فی الاعراب لايفسد مطلقاً ولو اعتقاده كفرا لان اكثر الناس لايميزون بين وجوه الاعراب، قال قاضيخان: وما قاله المتأخرون أوسع وما قاله المتقدمون أحوط، وان كان الخطأ بابدال حرف بحرف، فان امكن الفصل بينهما بلا كلفة كالصاد مع الطاء بأن قرء

الطالحات مكان الصالحات فاتفقوا على انه مفسد، وان لم يمكن الابمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين فاكثرهم على عدم الفساد لعموم البلوى، وبعضهم يعتبر عسر الفصل بين الحرفين وعدمه و بعضهم قرب المخرج وعدمه، ولكن الفروع غير منضبطة على شيئ من ذلك، فالاولى الاخذ فيه بقول المتقدمين لانضباط قواعدهم وكون قولهم احوط واكثر الفروع المذكورة في الفتاوىٰ منزلة عليه ونحوه في الفتح، وسياتي تمامه.

وفيه ايضاً (۱/۶۳۳): الاصل فيما اذا ذكر حرفا مكان حرف وغير المعنى ان امكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد، والايمكن الابمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال اكثرهم لاتفسد، وفي خزانة الاكمل قال القاضي ابوعاصم: ان تعمد ذلك تفسد، وان جرى على لسانه او لايعرف التميز لاتفسد، وهو المختار حلية وفي البزازية: وهو اعدل الاقاويل، وهو المختار.

(۱۷۱) قرأت میں حرکات واعراب کی تبدیلی سے نماز کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب صبح کی نماز پڑھا رہے تھے انہوں نے سورۃ النمل کا آخری رکوع تلاوت کیا جب اس آیت پر پہنچے "وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ٥ (سورة نمل: ۹۲) تو انہوں نے مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ کو مِنَ الْمُنْذَرِيْنَ پڑھا جب نماز ہوگئی سارے مقتدی چلے گئے تو بعد میں امام صاحب کو خیال آیا کہ میں نے تو قرأت میں غلطی کی ہے۔ آیا اس طرح قرأت کرنے سے نماز ہوگئی یا اعادہ ضروری ہوگا نیز اعادہ کرنے میں انتشار کا بھی قوی اندیشہ ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی آسان ساحل اس مسئلے کا نکالدیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز کے دوران قراءت کرتے وقت حرکات اور اعراب میں غلطی کرنے سے نماز میں کسی قسم کی خرابی اور نقصان واقع نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ حرکات اور اعراب میں غلطی کرنے سے معنی ومطلب میں تبدیلی اور فساد واقع ہوجائے۔ صورت مسئولہ میں اس غلطی سے نماز فاسد نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

لمافي الهندية (۱/۸۱): (ومنها اللحن في الاعراب) اذا لحن في الإعراب لحنا لايغير المعنى بأن قرأ "لاترفعوا اصواتكم" "برفع التاء" لاتفسد صلاته بالاجماع وان غير المعنى تغيراً فاحشا بأن قرأ "وعصى آدم ربه" "بنصب الميم" ورفع الرب" وما اشبه ذلك ممالو تعمد به يكفر اذا قرأ خطأً فسدت صلاته في قول المتقدمين واختلف المتأخرون "إلى ان قال" لاتفسد صلاته وما قاله المتقدمون احوط لانه لو تعمد يكون كفراً وما يكون كفراً لا يكون من القرآن. وما قاله المتأخرون

اوسع لان الناس لايميزون بين اعراب واعراب كذا فى فتاوىٰ قاضى خان. وهو الأشبه كذا فى المحيط، وبه يفتى كذا فى العتابية، وهكذا فى الظهيرية.

وفى الدر المختار (۱/۶۳۱، ۶۳۲): "ومنها زلة القارى". فلو فى اعراب او تخفيف مشدد وعكسه او بزيادة حرف فأكثر نحو الصراط الذين، او بوصل حرف بكلمة نحو إياک نعبد، أو بوقف و ابتداء لم تفسد وإن غير المعنى به يفتى بزازية الخ.

وفى الشامية: (قوله فلو فى اعراب) ككسر قواما مكان فتحها وفتح باء تعبد مكان ضمها، ومثال ما يغير، إنما يخشى الله من عباده العلماء. بضم الجلالة وفتح همزة العلماء، وهو مفسد عند المتقدمين. واختلف المتأخرون، فذهب ابن مقاتل ومن معه الى انه لايفسد والاول أحوط وهذا أوسع، كذا فى زاد الفقير لإبن الهمام، وكذا. وعصى آدم ربه. بنصب الاول ورفع الثانى يفسد عند العامة، وكذا. فساء مطر المنذرين. بكسر الذال. وإياک نعبد. بكسر الكاف و. المصور. بفتح الواو إلا اذا نصب الراء أو وقف عليها وفى النوازل: لا تفسد فى الكل، وبه يفتى بزازية وخلاصة.

(۱۷۲) آیت کا کچھ حصہ چھوٹنے پر نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ امام سے دوران قرأت ایک آیت شریفہ کا کچھ حصہ چھوٹ گیا اس سے آگے کی آیات پڑھ لیں، ایسی صورت میں نماز کا اعادہ کرنا پڑیگا یا نہیں؟ اور اگر امام نے نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرلیا ہو تو نماز ہو جائیگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر امام سے دوران قرأت آیت شریفہ کا کچھ حصہ چھوٹ گیا اور اسکی وجہ سے معنی میں تغیرِ فاحش واقع ہو گیا ہو تو نماز فاسد ہو جائیگی چاہے سجدہ سہو بھی کرلیا ہو، اور اگر معنی میں تغیرِ فاحش واقع نہیں ہوا تو نماز بغیر سجدہ سہو کے ہو جائیگی اگر سجدہ سہو کرلیا تو بھی نماز میں کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ نیز اگر ایک آیت کو مکمل کرنے کے بعد عمداً ایک یا چند آیات کو چھوڑ کر آگے سے پڑھ لیا تو یہ مکروہ ہے۔

لمافى الحلبى الكبير (۱/۴۹۴): لوانتقل فى الركعة الواحدة من اية الى اية يكره وان كان بينهما ايات بلاضرورة.

وفى الدرالمختار (۱/۶۳۲، ۶۳۳): ولوزاد كلمة اونقص كلمة...لم تفسدمالم يتغير المعنى.

(۱۷۳) آیات کے کلمات میں تقدیم وتاخیر کردینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج ہمارے امام صاحب مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے تو

انہوں نے پہلی رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی آخری آیات تلاوت کیں لیکن اس میں تقدیم وتاخیر کردی مثلاً اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ قرآن میں اس طرح ہے لیکن انہوں نے خُلِقَتْ کی جگہ رُفِعَتْ پڑھا، رُفِعَتْ کی جگہ خُلِقَتْ پڑھا، نُصِبَتْ کی جگہ سُطِحَتْ پڑھا اور سُطِحَتْ کی جگہ نُصِبَتْ پڑھا آیا اس صورت میں نماز ہوگئی یا واجب الاعادہ ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... دورانِ نماز اگر غلطی سے ایک کلمہ کی جگہ پر دوسرا کلمہ پڑھ لیں اور اس سے معنی میں تغیر فاحش لازم آتا ہو، تو نماز فاسد ہوجاتی ہے لیکن اگر معنی میں فساد زیادہ لازم نہ آتا ہو، اور دوسرا کلمہ قرآن میں موجود بھی ہو تو امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس صورت میں بھی نماز فاسد ہوجاتی ہے لیکن امام ابویوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں نماز فاسد نہیں ہوتی۔ صورت مسئولہ میں اگرچہ احتیاط طرفین کے قول پر عمل کرنے ہی میں ہے کہ نماز کا اعادہ کیا جائے البتہ اس نماز کی ادائیگی کو چند دن گزر چکے ہیں اور اعادہ کا حکم کرنے سے فساد اور حرج کا اندیشہ ہے لہٰذا امام ابویوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

لما فی محیط البرهانی(۶۷/۲): وان كان اختلافاً متباعداً نحو أن يختم اية الرحمة باية العذاب أو اية العذاب باية الرحمة، أو اراد أن يقرء الرحمن علم القران فجرى على السانه الشيطان...... فعلى قول أبي حنيفة ومحمد تفسد صلاته وأما على قول ابي يوسف: فقد اختلف المشايخ، قال بعضهم لا تفسد اذا لم يقصد ذلك، ومر على لسانه غلطا، ويجعل كأنه ابتدا بكلمة من كلمات القراءة وهذا لأنه قصد قراءة القران على ما أنزل، فيجعل فى التقدير كأنه ترك القراءة من هذا الموضع وأخذ بالقراءة من ذلك الموضع، وهو فى ذلك الموضع قرآن فلا تفسد صلاته وبه كان يفتى الشيخ الامام الفقيه ابو الحسن وهو اختيار محمد بن مقاتل الرازى وقيل فى المسئلة عن ابى يوسف روايتان.

وفى خلاصة الفتاوى(۱۱۵/۱):ولو قرء أفلا ينظرون الى قوله والى الجبال كيف سطحت مكان نصبت فعلى قياس قول ابى يوسف لايفسد وكذا نصبت مكان سطحت وخلقت مكان رفعت وعلى قولهما ينبغى أن يفسد.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۱۰۳۷/۲): تبطل الصلوة بكل ما غير المعنى تغيراً يكون اعتقاده كفراً، وبكل مالم يكن مثله فى القرآن، والمعنى بعيد متغير تغيراً فاحشاً، كهذا الغبار مكان"هذا الغراب" (المائدة،۳۱/۵) وبكل مالم يكن له مثل فى القران ولا معنى له كالسرائل مكان "السرائر" (الطارق : ۹/۸۶) وتبطل ايضاً عند ابى حنيفة ومحمد بماله مثل فى القران والمعنى بعيد ولم يكن متغيرا تغيراً فاحشاً ولا تبطل عند ابى يوسف لعموم البلوى.

وفي الشامية(۱/ ۶۳۱): فالمعتبر في عدم الفساد عند عدم تغير المعنى كثيرا وجود المثل في القران عنده والموافقة في المعنى عندهما فهذه قواعد الائمة المتقدمين.

وفي الشامية(۱/ ۶۳۳): وهذا كله قول المتأخرين، وقد علمت أنه أوسع، وأن قول المتقدمين أحوط، قال في شرح المنية: وهو الذي صححه المحققون وفرعوا عليه، فاعمل بما تختار، والاحتياط أولىٰ سيما في أمر الصلوة التي هي أول ما يحاسب العبد عليها.

(۱۷۴) اس آدمی کی نماز کا حکم جو قرأت پر قدرت نہ رکھتا ہو

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بھائی ہے جس کی زبان میں زبردست قسم کی لکنت ہے۔ ایک ایک حرف کو کئی کئی بار ادا کرتا ہے اور لفظوں کو خوب کھینچ تان کر پڑھتا ہے، مثلاً اگر اس نے یہ پوچھنا ہو (یہ کون ہے) تو کہے گا اے اے اے کون (میں ک ک ک) واو کو بھی خوب کھینچتا ہے تین چار واو بن جاتے ہیں۔ (ہے) کو عجوبہ بناتا ہے۔ وہ بالغ ہے اب نماز کا اس کیلئے مسئلہ ہے سوچتے ہیں قرآن نہ پڑھائیں بگاڑے گا تو گناہگار ہوگا۔ مسجد میں آتا ہے امام کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے لیکن پڑھتا نہیں اور جب سنتیں پڑھتا ہے تو ہم کہتے ہیں، اللہ اللہ، پڑھتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی نماز بغیر قرأت درست ہے یا نہیں؟ یا ہم اس کو لازمی غلط سلط قرآن سکھوائیں یا یوں ہی رہنے دیں اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ابتداء میں قرآن پڑھوانے کی کوشش کی امام صاحب بیچارے نے بہت زور لگایا مگر وہ بھی تھک گئے کہنے لگے یہ نہیں پڑھ سکتا اور جو چند جملے سیکھے گا وہ بھی قرآن کی بجائے کوئی لطیفہ نظر آئے گا۔ مہربانی کریں کہ شرعی حکم سے آگاہ کریں تاکہ بیچارا جہنم سے بچ جائے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... نماز میں قرأت کرنا اُس آدمی پر فرض ہے جو قرأت قرآن پر قادر ہو۔ صورت مسئولہ میں اگر آپ کا بھائی اس طریقہ پر قرآن پڑھتا ہو جس سے معنی میں فساد لازم آتا ہے اور وہ کسی بھی سورت کے صحیح پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتا، بہت کوشش کرنے کے بعد وہ سیکھنے سے مایوس ہو جائے، اور کوئی معتبر قاری اس کی تصدیق بھی کرے کہ یہ کبھی بھی درست نہیں پڑھ سکتا تو اس کی نماز بغیر قرأت قرآن کے درست ہے۔

لما في الشامية(۱/ ۵۸۲): (قوله دائماً) اى في آناء الليل وأطراف النهار، فمادام في التصحيح والتعلم ولم يقدر عليه فصلاته جائزة وان ترك جهده فصلاته فاسدة كما في المحيط، وغيره، قال في الذخيره، وانه مشكل عندى، لان ما كان خلقة فالعبد لا يقدر على تغييره اهـ وتمامه في شرح المنية.

وفي اعلاء السنن(۴/ ۱۴۸): عن رفاعة بن رافع أن رسول الله ﷺ علم رجلاً الصلوة فقال ان كان معك قران فاقرأ والا فاحمدالله، وكبره، وهلّله، ثم اركع، رواه ابو داؤد، والترمذى، وأخرجه

النسائی، ایضاً وقال الترمذی: حدیث رفاعة حسن، کذا فی النیل (۱۱۸/۲)

قوله عن رفاعة بن رافع الخ، قلت فیه دلالة علی أن العاجز عن قراءة القران تسقط عنه القراءة مادام عاجزا، ویکفیه الذکر عوضا عنها، ولا یخفی أن الذکر لا یتقید بالعربیة ولا ینحصر فیها بل یحصل بأی لسان کان، کالایمان فانه لو آمن بغیر العربیة جاز اجماعاً لحصول المقصود، کذا فی البحر (۲۰۷/۱).

وفیه ایضاً (۱۶۳/۴): قلت وقد صرح بوجوب التجوید وتصحیح الحروف فقهاء نا الحنفیة ایضاً، قال فی غنیة المستملی: وقال صاحب المحیط: والمختار للفتوی فی جنس هذه المسائل انه إن کان یجتهد آناء للیل وأطراف النهار فی التصحیح ولا یقدر علیه فصلاته جائزة وان ترک جهده فصلاته فاسدة وان ترک جهده فی بعض عمره لا یسعه أن یترکه فی باقی عمره ولو ترک تفسد صلاته، انتهی.

وقال صاحب الذخیرة: وانه مشکل عندی (۱) لان ماکان خلقة فالعبد لا یقدر علی تغییره "انتهی".

وعلی هامشها (۱۶۳/۴): (۱) ای الحکم بفساد صلاة بترک الجهد بعد ما اجتهد مدة وصرف فیها برهة من الزمان...... مشکل یفضی إلی الحرج ولذا قال شیخ فی بعض تصانیفه إن تصحیح الحروف وبذل الجهد فیه واجب مالم یحصل الیاس منه، واذا أیس سقط الجهد وتجوز صلاته دائماً، والمعتبر فی حصول الیأس شهادة حاذق من القراء بان ذالک لا یرجی منه أن یصح الحروف ابداً لا مجرد زعم المتعلم "فانهم" فان هذا لا تجده فی کتاب ولکنه هو الأولی بالصواب.

(۱۷۵) سورۂ "الم السجدة" اور "هل اتی علی الانسان" جمعہ کو فجر کی نماز میں پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک چچازاد بھائی ہے جو گلشن اقبال میں پڑھتا ہے ایک دن اس سے ملنے کسی کام کی وجہ سے جانا ہوا تو رات وہیں رہا صبح کی نماز جماعت سے پڑھی امام نے بہت طویل قرأت کی دونوں رکعتوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھیں جب نماز ختم ہوگئی تو میں نے کہا بھائی تمہارا امام تو بہت طویل قرأت کرتا ہے کہنے لگا اصل میں آج جمعہ ہے اور جمعہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح میں الم السجدہ اور سورة هل اتی علی الانسان، پڑھتے تھے۔ میں نے کہا ہمارے امام صاحب نے تو کبھی نہیں پڑھی پھر جب میں اپنے محلے میں آیا امام صاحب کو بتایا کہ یوں معاملہ ہوا اس نے کہا ہمارے فقہ میں ان کو پڑھنا منع ہے، اس لئے میں نہیں پڑھتا میرے ذہن میں خیال آیا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے پھر ہمارے فقہ میں کیوں منع ہے مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ برائے مہربانی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... یہ بات تو احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ المبارک کے دن فجر کی نماز میں سورۃ ''الم السجدہ'' اور سورۃ ''ھل اتی علی الانسان'' کی تلاوت فرمایا کرتے تھے البتہ یہ سورتیں ہمیشہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں پڑھنے سے ہمارے فقہاء کرام نے منع فرمایا ہے کیونکہ ہمیشہ پڑھنے سے صرف ان سورتوں کی فضیلت اور دوسری سورتوں سے اعراض لازم آتا ہے اور چونکہ ان سورتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ نہیں پڑھا اس لئے ان پر مداومت اختیار کرنے سے کراہت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا جو کام شریعت میں جس طرح ثابت ہے اسی کے مطابق عمل کیا جائے تو وہ باعث ثواب ہوگا ورنہ باعث عتاب، آجکل تو یہ سنت بالکل ہی متروک ہوکر رہ گئی ہے لہٰذا ائمہ مساجد کو کبھی کبھی ان سورتوں کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ یہ سنت زندہ ہوسکے۔

خلاصہ یہ کہ یہ سورتیں کبھی کبھی چھوڑ دینی بھی چاہئیں دوام اختیار نہیں کرنا چاہیے البتہ ان ائمہ کرام کا عمل بھی درست نہیں جو ان سورتوں کو کبھی نہیں پڑھتے سب کو اعتدال سے کام لینا چاہیے۔

لمافی ابی داؤد (۱/۱۵۴): عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ ﷺ کان یقرأ فی صلوۃ الفجر یوم الجمعۃ تنزیل السجدۃ وھل اتیٰ علی الانسان حین من الدھر.

وفی فتح القدیر (۱/۳۳۷): والحق أن المداومۃ مطلقاً مکروھۃ سواء رآہ حتما یکرہ غیرہ أولا لأن دلیل الکراھۃ لا یفصل وھو ایھام التفضیل وھجر الباقی لکن الھجران إنما یلزم لو لم یقرأ الباقی فی صلوۃ أخریٰ فالحق أنہ ایھام التعین ثم مقتضی الدلیل عدم المداومۃ لا المداومۃ علی العدم کما یفعلہ حنفیۃ العصر بل یستحب أن یقرأ بذلک أحیاناً تبرکاً بالمأثور فإن لزوم الایھام ینتفی بالترک أحیاناً.

وفی الھندیۃ (۱/۷۸): ویکرہ أن یوقت شیئاً من القرآن لشیٔ من الصلوات قال الطحاوی والاسبیجابی ھذا اذا رآہ حتماً واجباً بحیث لا یجوز غیرہ أو رأی قراءۃ غیرہ مکروھۃ وأما اذا قرأ لاجل الیسر علیہ أو تبرکاً فقراء تہ ﷺ فلا کراھیۃ فی ذلک ولکن یشترط أن یقرأ غیرہ أحیاناً لئلا یظن الجاھل أن غیرہ لا یجوز ھکذا فی التبیین.

وفی الشامیۃ (۱/۵۴۴): ھذا، وقید الطحاوی والاسبیجابی الکراھۃ بما اذا رأی ذلک حتماً لا یجوز غیرہ أما لو قراء للتیسیر علیہ أو تبرکاً بقراء تہ علیہ الصلاۃ والسلام فلا کراھۃ لکن بشرط أن یقرأ غیرھا أحیانا لئلا یظن الجاھل أن غیرھا لا یجوز واعترضہ فی الفتح بأنہ لا تحریر فیہ لأن الکلام فی المداومۃ اھ.

وأقول: حاصل معنی کلام ھذین الشیخین بیان وجہ الکراھۃ فی المداومۃ وھو أنہ إن رأی ذلک حتماً یکرہ من حیث تغییر المشروع والا یکرہ من حیث ایھام الجاھل وبھذا الحمل یتاید أیضا

کلام الفتح السابق ویندفع اعتراضه اللاحق فتدبر.

(۱۷۶) آیت سجدہ کو بطور مذاق پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم ایک مدرسہ میں پڑھتے ہیں جب کھانے کیلئے جمع ہوتے ہیں تو ایک ساتھی کی عادت ہے کہ وہ سجدہ والی آیت پڑھ دیتا ہے سب ساتھی سجدہ کرتے ہیں اور اس کو منع کرتے ہیں مگر وہ باز نہیں آیا اس کی پٹائی بھی لگائی لیکن وہ باز نہ آیا، اب ہم نے کہا ہم سجدہ نہیں کریں گے اور گناہ تم کو ہوگا کیونکہ تم جان بوجھ کر ہمیں تنگ کرتے ہو، سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح دوسروں کو تنگ کرنے کیلئے جو پڑھے اس سے سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ ہم سجدہ چھوڑ دیں تو وہ گناہگار ہوگا یا ہم بھی گناہگار ہوں گے کیونکہ اس کا قصد تلاوت نہیں بلکہ ہمیں تنگ کرنا مقصود ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... آیت سجدہ کی تلاوت کرنے سے یا سننے سے سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے تلاوت کرنے والے یا سننے والے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ لوگوں پر آیت سجدہ سننے سے سجدہ کرنا واجب ہے اگرچہ آیت سجدہ تلاوت کرنے والا تنگ کرنے کی نیت سے تلاوت کرے البتہ اس طرح کرنے والا لوگوں کو تنگی میں مبتلا کرنے والا ہے جس کی وجہ سے وہ سخت گنہگار ہوگا، نیز آیات قرآنیہ کو بطور مذاق پڑھنے پر فقہاء نے ایسے شخص کے متعلق کفر کا حکم لکھا ہے۔ مذکورہ صورت میں بھی مذاق کی سی صورت پائی جارہی ہے اس لئے اس شخص کو اپنے اس فعل شنیع سے خوب توبہ واستغفار کرنا چاہیے اور آئندہ ایسی نازیبا حرکت سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لمافي الهندية(۱/۱۳۲): والسجدة واجبة في هذه المواضع على التالي والسامع سواء قصد سماع القرآن اولم يقصد.

وفي الدر المختار مع الشامية(۲/۱۰۴): (بشرط سماعها) فالسبب التلاوة وان لم يوجد السماع كتلاوة الاصم والسماع شرط في حق غير التالي ولو بالفارسية......

وفي الشامية تحته: وذكر في المجتبى ان الموجب للسجدة احد ثلاثة التلاوة والسماع والائتمام ...... وصرح ايضا بان السماع شرط في حق غير التالي.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۲/۱۱۲۶): سجدة التلاوة واجبة بالتلاوة على القارى والسامع عند الحنفية، سنة عند بقية الفقهاء سواء عند الحنفية والشافعية قصد السامع سماع القرآن اولم يقصد اى فتطلب من القارى والمستمع (وهو قاصد السماع) والسامع (وهو من لم يقصد السماع)...... استدل الحنفية على الوجوب بحديث (السجدة على من سمعها وعلى من تلاها) وفيه ايضاً(صـ۱۱۴۱) يستحسن اخفاء اية السجدة عن سامع غير متهئ للسجود.

وفي الهندية(۲/۲۶۶): اذا انكر الرجل آية من القرآن او تسخر بآية من القرآن وفي الخزانة

اوعاب کفر کذا فی التاتارخانیة.

وفی بزازیة علی هامش الهندیة(۳۳۸/۶): قرأ القرآن علی ضرب الدف والقضیب یکفر لاستخفافه وأدب القرآن ان لا یقرأ فی مثل هذه المجالس. والمجلس الذی اجتمعوا فیه للغنا والرقص لا یقرأ فیه القرآن کما لا یقرأ فی البیع والکنائس لانه مجمع الشیطان قال من ذکر الله کبر یکفر. ادخال اية القرآن فی المزاح والدعا به کفر لانه استخفاف به وکذا المزاح به مثل ان یقول قل هو الله احد راپوست بردی. الخ.

(۱۷۷) نماز میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے غلطی کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے سال مدرسہ کی سالانہ چھٹیوں میں، میں چلے میں گیا تھا، ہماری تشکیل بلوچستان کے پہاڑی علاقے ڈیرہ بگٹی میں ہوئی وہاں مسجد کے جو امام صاحب تھے قرآن پڑھتے ہوئے تلفظ صحیح طریقے سے ادا نہیں کر سکتے تھے اور ایک بڑی غلطی یہ کرتے کہ الحمد للہ میں الحمد کے الف کو کھینچ کر پڑھتے، تو میں نے ان سے کہا کہ اس طرح پڑھنے سے معنی غلط ہو جاتا ہے اور اس سے نماز بھی مکروہ ہو جاتی ہے تو امام صاحب نے کہا کہ میرے پیچھے کئی مرتبہ علماء نے نماز پڑھی ہے مگر کسی نے اعتراض نہیں کیا ہے تم تبلیغی لوگ ویسے علماء پر اعتراضات کرتے ہو۔ تو میں خاموش ہو گیا کہ جب علماء کرام نے کچھ نہیں فرمایا ہے تو شاید نماز اس سے فاسد نہ ہوتی ہو، مگر دل پھر بھی مطمئن نہ ہوا، لہٰذا مفتی صاحب آپ فرمائیں قرآن وسنت کی روشنی میں کیا اس طریقے سے قرآن پڑھنا جائز ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز میں قرآن شریف کو صحیح نہ پڑھنا اور تلفظ ادا کرنے میں ایسی غلطی کرنا جس سے معنی میں بگاڑ لازم آتا ہو۔ ایسی غلطی سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور جس غلطی سے معنی میں بگاڑ لازم نہ آتا ہو، تو ایسی غلطی سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں امام صاحب کا الحمد کے الف کو کھینچ کر پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی۔ کیونکہ الف کو کھینچ کر پڑھنے سے ہمزہ استفہام بن کر الحمد للہ کا معنی بگڑ جاتا ہے۔

لمافی الهندیة(۶۸/۱): ولو قال الله اکبر مع الف الاستفهام لا یصیر شارعاً بالاتفاق.

وفیه ایضاً(ص۷۹): ان ذکر حرفاً مکان حرف ولم یغیر المعنی...... لم تفسد صلوته، وان غیر المعنی فان امکن الفصل بین الحرفین من غیر مشقة کالطاء مع الصاد فقرأ الطالحات مکان الصالحات تفسد صلوته عند الکل وان کان لایمکن الفصل بین الحرفین الا بمشقة کالظاء مع الضاد والصاد مع السین والطاء مع التاء اختلف المشائخ قال اکثرهم لاتفسد صلاته هکذا فی فتاوی قاضیخان وکثیر من المشایخ افتوابه.

وفي الدر المختار (۱/ ۶۳۰): ومنها مد الهمزة في التكبير كمامر، ومنها القراء ة بالالحان ان غير المعنىٰ والا لا، الا في حرف مدّولين اذا فحش والا لا بزازية.

وفي الشامية تحته: (قوله والا لا الخ) اى وان لم يغير المعنى فلا فساد الافي حرف مدّ ولين ان فحش فانه يفسد، وان لم يغير المعنىٰ.

(۱۷۸) دورانِ نماز سورتوں کے درمیان قصداً ترتیب نہ رکھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں مسجد کا جو امام ہے وہ ایک نوجوان آدمی ہے جو کہ صرف حافظ قرآن ہے اب تک اُس نے عالم کا کورس نہیں کیا ہے، بعض اوقات یہ حافظ صاحب نمازوں میں پہلی رکعت میں کوئی سورت پڑھ لیتا ہے پھر دوسری رکعت میں اُس سے پیچھے والی سورت پڑھ لیتا ہے۔ تو ایک دن عشاء کی نماز میں جب اس نے اسی طرح کیا تو نماز کے بعد میں نے کہا کہ حافظ صاحب اس طرح پڑھنا جائز نہیں ہے اور اِس سے نماز فاسد ہوتی ہے تو حافظ صاحب نے کہا کہ قرآن پاک میں اللہ پاک کا ارشاد مبارک ہے "فَاقْرَؤُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ" (قرآن مجید میں سے جو آسان ہو پڑھ لو) لہٰذا جس طرح بھی پڑھ لیں نماز ہو جاتی ہے مگر حافظ صاحب چونکہ عالم یا مفتی نہیں ہیں لہٰذا اس کی بات پر مجھے اطمینان نہیں ہوا، لہٰذا مفتی صاحب آپ بتائیں، کیا اس طرح جان بوجھ کر نماز میں قرأت جائز ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت رکھنا یہ قرآن مجید کی تلاوت کے واجبات میں سے ہے اگر کسی شخص سے غیر ارادی طور پر کبھی سورتوں میں تقدیم اور تاخیر ہو جائے تو نماز بلا کراہت ادا ہو جاتی ہے البتہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا فعل کرے تو فرض نماز مکروہ ہوتی ہے نفل نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں حافظ صاحب کا قصداً اس طرح کرنا اور اس بات کو اپنی عادت بنا لینا ٹھیک نہیں کیونکہ اس صورت میں فرض نماز کی ادائیگی کراہت کے ساتھ ہوتی ہے البتہ آپ کا یہ کہنا کہ اس طرح سورتوں میں تقدیم وتاخیر کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں، کیونکہ سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت یہ قرآن کی تلاوت کے واجبات میں سے ہے نہ کہ نماز کے واجبات میں سے لہٰذا نماز فاسد نہیں ہوتی مگر قصداً اس طرح کرنے سے فرض نماز مکروہ ضرور ہوتی ہے، لہٰذا حافظ صاحب کو احسن طریقے سے مسئلہ بتا دیا جائے۔

لما في البحر الرائق (۲/ ۱۶۵): ...... لو قرأ سورة ثم قرأ في الثانية سورة قبلها ساهيا لا يجب عليه السجود لان مراعاة ترتيب السور من واجبات نظم القران لا من واجبات الصلاة فتركها لا يوجب سجود السهو.

وفي الهندية (۱/ ۷۸): واذا قرأ في ركعة سورة وفي الركعة الاخرى اوفي تلك الركعة سورة فوق تلك السورة يكره...... هذا كله في الفرائض واما في السنن فلا يكره.

وفی الدرالمختار (۱/۵۴۶): ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ وان یقرأ منکوسا الا اذا ختم فیقرأ من البقرۃ وفی القنیۃ قرأ فی الاولی الکافرون وفی الثانیۃ الم تر او تبت ثم ذکر یتم وقیل یقطع ویبدأ

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ وان یقرأ منکوسا) بان یقرأ فی الثانیۃ سورۃ اعلی مما قرأ فی الاولی، لان ترتیب السور فی القراءۃ من واجبات التلاوۃ وانما جوز للصغار تسہیلا لضرورۃ التعلیم......(قولہ ثم ذکریتم) افاد ان التنکیس او الفصل بالقصیرۃ انما یکرہ اذا کان عن قصد فلو سہوا فلا کما فی شرح المنیۃ.

وفیہ ایضاً (۱/۵۴۷) ویؤیدہ ایضا انہم قالوا یجب الترتیب فی سور القران فلو قرأ منکوسا اثم لکن لا یلزمہ سجود السہو لان ذلک من واجبات القراءۃ لامن واجبات الصلوٰۃ کما ذکرہ فی البحر فی باب السہو لکن قولہم کل صلوٰۃ ادیت مع کراہۃ التحریم یشمل ترک الواجب وغیرہ ویؤیدہ ماصرحوا بہ من وجوب الاعادۃ بالصلاۃ فی ثوب فیہ صورۃ بمنزلۃ من یصلی وھو حامل الصنم.

(۱۷۹) دورانِ تلاوت سورتوں کے درمیان ترتیب قائم رکھنا کیوں واجب ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن ہمارے امام صاحب غائب تھے تو ایک بوڑھے آدمی کو لوگوں نے نماز کیلئے آگے کر دیا اس نے پہلی رکعت میں ارأیت الذی (سورۃ الماعون) پڑھی، دوسری رکعت میں الم تر (سورۃ الفیل) پڑھی مسجد میں شور شروع ہو گیا قرآن الٹا پڑھا نماز نہیں ہوئی، متولی صاحب کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو خاموش کرایا اور کہا نماز ہو جاتی ہے پھر ہم دو آدمی دوسری مسجد کے امام کے پاس چلے گئے ان سے سوال کیا انہوں نے فرمایا کہ نماز ہو گئی البتہ اس طرح پڑھنا مکروہ ہے وہاں سے تو ہم خاموشی سے چلے آئے مگر میرے ذہن میں یہ بات آتی رہی مکروہ کیوں ہے؟ سارا قرآن ہے جہاں سے پڑھو پھر یہ کراہت کیوں؟ جبکہ بی اے کے نصاب میں ہم نے پڑھا تھا کہ قرآن کی ترتیب نزولی اور ہے جب نازل ہونے میں کسی ترتیب کی ضرورت نہیں پھر بغیر ترتیب کے پڑھنے سے کیوں کراہت آتی ہے؟ مہربانی فرما کر تشفی فرمائیں تاکہ میرے عقائد میں اس وجہ سے کوئی خلل نہ آئے اور اکابر پر بدگمانی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزاء عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں مذکورہ امام صاحب کا یہ کہنا کہ نماز ہو گئی البتہ اس طرح پڑھنا مکروہ ہے تو یہ بات ٹھیک ہے مگر یہ بات جان لیجئے کہ سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت یہ تلاوتِ قرآن مجید کے واجبات میں سے ہے نہ کہ نماز کے واجبات میں سے لہٰذا اگر کسی شخص سے بغیر قصد کے اس طرح ہو جائے تو نماز بلا کراہت درست ہے ہاں اگر قصداً اس طرح تقدیم وتاخیر کرے تو فرض نماز مکروہ ہوتی ہے نفل نہیں، جہاں تک آپ کی یہ بات رہی کہ سارا قرآن ہے جہاں سے دل چاہے پڑھو اور آپ کا ''بی اے'' کے نصاب میں یہ بات پڑھنا کہ ترتیب نزولی کچھ اور تھی تو جہاں سے دل چاہے پڑھو اور نماز میں اس طرح کرنے سے کراہت کیوں آتی ہے تو یہ بات سمجھ لیں کہ اگرچہ ترتیب نزولی قرآن مجید کی کچھ اور تھی اور وجہ اس کی موقع ومحل کی مناسبت اور ضرورت تھی کہ جب جس مسئلہ کی

ضرورت ہوئی تو اللہ رب العزت نے وحی کے ذریعے اس کو نازل کر دیا مگر جب وحی نازل ہوتی تھی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد رکھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاتبین وحی کو اسی طرح حکم فرمایا کرتے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی طرح قرآن کو لکھا جس طرح آپ سے سنا، اگرچہ قرآن مجید کو مصحف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار فانی سے پردہ فرما جانے کے بعد جمع کیا گیا لیکن صحابہ نے صرف جمع کرنے میں سعی کی، ترتیب میں نہیں، ترتیب وہی تھی جس کو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور تلاوت کے سنا تھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ اس ترتیب سے رکھو اور مصحف میں اس ترتیب کے ساتھ رکھنے پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے اس وجہ سے سورتوں کے درمیان ترتیب قائم رکھنا دورانِ تلاوت، تلاوت کے واجبات میں سے ہے، لہٰذا اس واجب کے ترک کی بناء پر (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کے اجماع سے ثابت ہے) کراہت آتی ہے۔

لمافی البحر الرائق(۲/۱۶۵): الرابع سببه ترک واجب من واجبات الصلاة الاصلية سهوا وهو المراد بقوله "بترک واجب" لا کل واجب بدليل ماسنذکره من انه ترک ترتيب السور لا يلزمه شی مع کونه واجبا وهو اجمع ما قيل فيه.......... لو قرأ سورة ثم قرأ فی الثانية سورة قبلها ساهيا لا يجب عليه السجود لان مراعاة ترتيب السور من واجبات نظم القران لامن واجبات الصلاة فترکها لا يوجب سجود السهو.

وفی الهندية(۱/۷۸): واذا قرأ فی رکعة سورة وفی الرکعة الاخری اوفی تلک الرکعة سورة فوق تلک السورة يکره...... هذا کله فی الفرائض واما فی السنن فلا يکره.

وفی الشامية(۱/۵۴۶): ويکره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منکوسا الا اذا ختم فيقرأ من البقرة وفی القنية قرأ فی الاولی الکافرون وفی الثانية الم تر أوتبت ثم ذکر يتم وقيل يقطع يبدأ (قوله وان يقرأ منکوسا) بان يقرأ فی الثانية سورة اعلی مما قرأ فی الاولی، لان ترتيب السور فی القراءة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهيلا لضرورة التعليم (قوله ثم ذکر يتم) افاد ان التنکيس او الفصل بالقصيرة انما يکره اذا عن قصد فلو سهوا فلا کما فی شرح المنية، وفيه ايضاً(۱/۴۵۷): ويؤيده ايضا انهم قالوا يجب الترتيب فی سور القران فلو قرأ منکوسا اثم لکن لا يلزمه سجود السهو لان ذلک من واجبات القراءة لامن واجات الصلوة کما ذکره فی البحر فی باب السهو.

(۱۸۰) ایک رکعت میں دو سورتیں ملا کر پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعرات کی رات کو چونکہ مدرسہ میں چھٹی ہوتی

اپنے گھر کو چلا گیا مغرب کو جب نماز پڑھنے کیلئے مسجد گیا تو امام صاحب نے نماز پڑھانے کیلئے مجھے کہا، تو میں نے مغرب کی نماز میں پہلی رکعت میں الم ترکیف اور سورۃ قریش دونوں پڑھیں اور دوسری رکعت میں سورہ اخلاص پڑھی، سلام پھیرنے کے بعد امام صاحب نے کہا کہ جماعت پڑھاتے ہوئے دوسورتیں ایک رکعت میں نہیں پڑھنا چاہیے میں نے کچھ نہیں کہا اور سوچا کہ مدرسہ جا کر مفتی صاحب سے پوچھ لیں گے۔لہٰذا مفتی صاحب آپ بتلائیں کہ مذکورہ امام کا یہ کہنا کہ ''فرض نماز کی جماعت کراتے ہوئے دوسورتوں کو ملا کر ایک رکعت میں نہیں پڑھنا چاہیے'' صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....بہتر یہ ہے کہ فرض نماز کی ایک رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد ایک سورت پڑھی جائے دوسورتیں نہ پڑھے اگر دو سورتیں پڑھ لیں، جیسا کہ صورت مذکورہ میں ہے تو بھی بلا کراہت نماز جائز ہے لہٰذا امام صاحب کی بات درست ہے۔

لمافی بدائع الصنائع (۲/۴۴): ولو جمع بین السّورتین فی رکعة لا یکره لما روی أنّ النبی ﷺ اوتر بسبع سور من المفصّل والافضل الّا یجمع.

وفی الهندیة (۱/۷۸): واذا جمع بین سورتین بینهما سور أو سورة واحدة فی رکعة واحدة یکره وأمّا فی الرّکعتین ان کان بینهما سور لا یکره الخ......

وفی الشامیة(۱/۵۴۶): وفی التاتارخانیة: اذا جمع بین سورتین فی رکعة رایت فی موضع انّه لا بأس به وذکر شیخ الاسلام لاینبغی له ان یفعل علی ما هو ظاهرالروایة اهـ وفی شرح المنیة: الاولیٰ ان لا یفعل فی الفرض ولو فعل لا یکره إلّا ان یترک بینهما سورة أو أکثر.

﴿فصل فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

(۱۸۱) دورانِ نماز ستر کھل جانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بچہ ہے جس کی عمر دو تین سال ہے میں جب نماز پڑھتی ہوں تو میرے پاس آ کر میرا دوپٹہ اتار لیتا ہے جس کی وجہ سے میرا سر ننگا ہو جاتا ہے بسا اوقات میرے آگے آ کر بیٹھ جاتا ہے میں اس کو ایک طرف کر کے سجدہ کر لیتی ہوں اب سر ننگا ہونے کی وجہ سے یا بچہ کو ہٹانے کی وجہ سے میری نماز میں فساد آئے گا یا نماز درست ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... عورت کا نماز کے اندر سوائے چہرہ، ہتھیلی اور قدموں کے تمام بدن کا چھپانا فرض ہے۔ بدن کے جو اعضاء ستر میں داخل ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کا چوتھائی یا اس سے زیادہ حصہ نماز پڑھتے وقت کھل جائے اور اتنی دیر کھلا رہے کہ اس دوران میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جا سکتی ہو تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر کھلتے ہی فوراً کھلے ہوئے حصے کو عمل قلیل کے ساتھ چھپا لیں تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ عمل قلیل سے مراد وہ کام ہے جو ایک ہاتھ کے ذریعے سے کیا جا سکے اور اس میں تکرار بھی نہ ہو۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ کا سر اتنی دیر تک ننگا رہے کہ اس دوران میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جا سکتی ہے تو آپ کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ البتہ اگر سر کھلتے ہی فوراً عمل قلیل کے ساتھ سر کو دوبارہ چھپا لیں تو آپ کی نماز درست ہو جائے گی۔ اسی طرح سجدہ کرنے کیلئے سامنے بیٹھے ہوئے بچے کو عمل قلیل کے ذریعے ایک طرف ہٹا دینے سے بھی نماز فاسد نہیں ہوگی۔

لمافی الهندية(۱/۵۸): بدن الحرة عورة الاوجهها و كفيها وقدميها كذا فی المتون وشعر المرأة ماعلى راسها عورة واما المسترسل ففيه روايتان الاصح انه عورة كذا فی الخلاصة وهو الصحيح وبه اخذ الفقيه ابو الليث و عليه الفتوى كذا فی معراج الدراية...... وان انكشف عورته فی الصلاة فسترها بلا مكث جازت صلاته اجماعا وان ادى ركنا مع الانكشاف فسدت اجماعاً ...... والعمل القليل ان تاخذه بيدواحدة كذا فی السراج الوهاج.

وفی الدرالمختار(۱/۴۰۵): (وللحرة) ولو خنثى (جميع بدنها) حتى شعرها النازل فی الاصح (خلا الوجه والكفين) فظهر الكف عورة على المذهب (والقدمين)

وفیه ایضاً(۱/۴۰۸):(ویمنع)حتی انعقادها(کشف ربع عضو)قدر اداء رکن بلاصنعه (من عورة غليظة او خفيفة على المعتمد(والغليظة قبل ودبر وماحولهما والخفيفة ماعدا ذلک) من الرجل والمرأة

وفی الشامیة (۱/۴۰۸): (قوله حتی انعقادها)...... ای ویمنع صحة الصلاة حتی انعقادها، والحاصل انه يمنع الصلاة فی الابتداء ویرفعها فی البقاء ح (قوله قدر اداء رکن) ای بسنته منية قال شارحها وذلک قدر ثلاث تسبیحات اهـ.

وفی الهندیة(۱/۱۰۱): العمل الكثير يفسد الصلاة والقليل لا كذا فی محیط السرخسی...... وفيه ایضاً (صـ۱۰۲) وكل ما يقام بيد واحدة فهو يسير مالم يتكرر كذا فی فتاوی قاضیخان...... (والثالث) انه لو نظر اليه ناظر من بعيد ان كان لا يشک انه فی غير الصلاة فهو كثير مفسد وان شک فليس بمفسد وهذا هو الاصح هكذا فی التبيين وهو احسن كذا فی المحيط السرخسی وهو اختيار العامة كذا فی فتاویٰ قاضیخان والخلاصة.

وكذا اذا تردی برداء او حمل شيئا خفيفا يحمل بيد واحدة او حمل صبيا او ثوباً على عاتقه لم تفسد صلاته كذا فی فتاوی قاضیخان. وان حمل شيئا بحيث يتكلف بحمله وله مونة فسدت صلاته كذا فی الظهیریة.

(۱۸۲) نماز میں قرآن یا کوئی لکھی ہوئی تحریر دیکھ کر پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے کمرے میں مغرب کی جانب دیوار میں ایک بڑا سا چارٹ لگا ہوا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ نسب تفصیل سے لکھا ہوا ہے جب میں کمرے میں نماز پڑھتا ہوں تو بعض اوقات میری نظر اس پر پڑ جاتی ہے کبھی تو الفاظ بھی پڑھ لیتا ہوں تو کیا میری نماز صحیح ہو جائیگی یا دوبارہ لوٹانا لازم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً...... اگر کوئی شخص نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھتا ہے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی تھوڑا پڑھا ہو یا زیادہ لہٰذا نماز دوبارہ پڑھے گا اگر اس نے قرآن میں دیکھا اور سمجھ گیا لیکن زبان سے نہیں پڑھا تو اس کی نماز درست ہے لیکن مکروہ ہے۔لہٰذا اگر آپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ مبارک زبان سے پڑھ لیا تو آپ کی نماز فاسد ہے دوبارہ پڑھنی ہوگی۔

لمافی الدر المختار(۱/۶۲۴): وقراء ته من مصحف ای مافیه قرآن مطلقا لانه تعلم وفی الشامية قوله ای مافيه قرآن عممه ليشمل المحراب فانه اذا قرأ مافيه فسدت فی الصحيح (قوله مطلقا) ای قليلا او كثيرا اماماً أو منفردا اميا لا يمكنه القراءة الا منه اولا.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۰۲۴): ولا تفسد الصلوة بالنظر الى مكتوب وفهمه غير انه مكروه اما

القراءة من المصحف فتفسد الصلوة عند ابی حنیفة لان حمل المصحف والنظر فیه وتقلیب الاوراق عمل کثیر ولانه یشبه التلقین من الآخرین.

(۱۸۳) نماز کے اندر سونے کی حالت میں ہنسنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو، اور نماز کی حالت میں اس کو نیند آجائے تو کیا اس سے نماز میں کچھ خلل پڑے گا یا نہیں؟ نیز اگر نیند کے اندر وہ ہنسنے لگ جائے تو پھر اس کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... قہقہہ وہ ہنسی ہے جو دوسرے کو بھی سنائی دے۔ اس سے بیداری کی حالت میں وضو اور نماز دونوں فاسد ہو جاتے ہیں۔ ضحک وہ ہنسی ہے جس کی آواز اپنے تک محدود رہے۔ اس سے بیداری کی حالت میں نماز فاسد ہوتی ہے، نہ کہ وضو۔ اور تبسم وہ مسکراہٹ ہے جس میں کوئی آواز نہ ہو۔ اس سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے نہ وضو۔ اور نماز کی حالت میں نیند آنے سے نماز میں کچھ خلل نہیں پڑتا۔ بشرطیکہ نماز ہیئت مسنونہ پر ہو، اور نماز کے اندر سونے کی حالت میں ہنسنے یعنی ضحک سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے نہ وضو، اور سونے کی حالت میں قہقہہ لگانے سے صرف نماز فاسد ہو جاتی ہے وضو نہیں ٹوٹتا۔

لمافی تاتارخانیه (۱/۱۳۸): وکذلک القهقهة من النائم فی الصلاة لاینقض الوضوء...... هکذا وقع فی بعض الکتب وذکر الزندوسی فی نظمه، اذا نام فی صلوته قائماً او ساجداً ثم قهقهه لا روایة لهذا فی الاصول قال شداد بن اوس (قال ابو حنیفة تفسد صلوته ولایفسد وضوءه وهکذا افتیٰ الفقیه عبدالواحدؒ.

وفی الهندیة (۱/۱۲): ومنها النوم، ینقضه النوم مضطجعاً فی الصلوة وفی غیرها بلاخلاف بین الفقهاء وکذا النوم متورّکاً بأن نام علی احدورکیه هکذا فی البدائع ...... ولا ینقض نوم القائم والقاعد ولو فی السرج او المحمل ولا الراکع ولا الساجد مطلقاً ان کان فی الصلوة وان کان خارجها فکذلک.

وفی الشامیة (۱/۱۴۱): قال فی شرح الوهبانیة، ظاهر الروایة ان النوم فی الصلوة قائماً او قاعداً او ساجداً لا یکون حدثاً سواء غلبه النوم او تعمده، وفی جوامع الفقه انه فی الرکوع والسجود لاینقض ولو تعمده ولکن تفسد صلوته.

وفی تبیین الحقائق (۱/۵۶): ثم القهقهة ما یکون مسموعاً له ولجیرانه بدت اسنانه اولا وقد تقدم حکمها، والضحک مایکون مسموعاً له دون جیرانه وهو مبطل للصلوة دون الوضوء والتبسم مالاصوت فیه ولا تأثیر له فی واحد منهما.

(۱۸۴) عورت اگر مرد کے محاذاۃ میں کھڑی ہو اور دونوں نماز میں مشترک ہوں تو اس کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں گھر میں ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا دو رکعت فرض ادا کئے تھے کہ میری بیوی نے اسی مصلےٰ پر میرے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی اسی دوران میری بیوی کے بڑے بھائی آگئے جو کہ عالم ہیں انہوں نے دیکھ کر فرمایا آپ کی نماز فاسد ہوگئی ہے کیونکہ آپ نے عورت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے اب آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی میری نماز فاسد ہوگئی ہے یا نہیں؟ دوبارہ لوٹانے کی ضرورت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب کوئی عورت نماز میں مرد کے ساتھ یا آگے اس طرح کھڑی ہو جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، اور نہ دونوں میں ایک آدمی کے کھڑے ہونے کے بقدر فاصلہ ہو، اور دونوں ایک ہی نماز میں شریک ہوں، یعنی ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہوں، تو مرد کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ یہ صورت نہیں پائی گئی لہٰذا آپ کی نماز صحیح ہے۔ دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں، مگر اس طرح عورت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لمافی الهندية(۱/۸۹): محاذاة المرأة الرجل مفسدة لصلاته...... والمسبوق بان فی حق التحريمة منفرد فيما يقضيه فلو حاذت الرجل المرأة فيما يقضيان لاتفسد صلوته. كذا فی التبيين.

وفی الدر المختار مع الشامية(۱/۵۷۴): (مشتركة) فمحاذاة المصلية لمصل ليس فی صلاتها مكروهة لامفسد.

وفی الشامية تحته: (قوله ليس فی صلاتها) بأن صليا منفردين أو مقتديا أحدهما بامام لم يقتدبه الآخر شرح المنية (قوله مكروهة) الظاهر انها تحريمة لانها مظنة الشهوة والكراهة علی الطارئ ط، قلت: وفی معراج الدراية: وذكر شيخ الاسلام مكان الكراهة الاساءة، والكراهة أفحش اهـ.

وفی الشامية(۱/۵۷۳): فالتفسير الصحيح للمحاذاة مافی المجتبی: المحاذاة المفسدة ان تقوم بجنب الرجل من غير حائل او قدامه.

(۱۸۵) مرد کا عورت کے پیچھے کھڑے ہو کر اپنی نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گھر پر عورت مرد سے آگے نماز پڑھ رہی ہے۔ یعنی مرد اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دل میں یہ خیال آجائے کہ عورت امامت کر رہی ہے جبکہ وہ امامت نہیں کر رہی ہوتی، اس صورت میں مرد کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اصل حکم یہ ہے کہ مرد عورت سے آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھے تاکہ نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ تاہم گھر وغیرہ پر محرم

عورت یا بیوی آگے نماز پڑھ رہی ہے۔اور مرد اس کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھ لے اس طور پر کہ نماز میں یکسوئی برقرار رہے اور کوئی خلل بھی واقع نہ ہو تو نماز پڑھ سکتا ہے۔اور دل میں صرف یہ خیال آنا کہ "عورت امامت کرا رہی ہے" نماز کیلئے مخل نہیں جبکہ حقیقت میں وہ امامت کرا بھی نہیں رہی ہے۔

لمافی صحیح البخاری(۱/۷۴): عن عائشة رضی الله عنها قالت بئسما عدلتمونا بالکلب و الحمار لقد رأیتنی ورسول الله ﷺ یصلی وانا مضطجعة بینه وبین القبلة فاذا اراد ان یسجد غمز رجلی فقبضتهما.

وفی الشامیة(۱/۶۳۴): (قوله ولو امرأة او کلبا) بیان للاطلاق، واشار به إلی الرد علی الظاهریة بقولهم. یقطع الصلاة مرور المرأة والکلب والحمار.

(۱۸۶) تعدادِ رکعات میں شک کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میرے ایک عزیز ہیں جنہیں نماز کے دوران اکثر شک پڑ جاتا ہے کہ دو رکعتیں پڑھیں یا تین، ایسی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً……دورانِ نماز اگر رکعتوں کی تعداد میں اکثر شک ہوتا ہو تو تحری، غور وفکر کے ذریعے جس جانب ظن غالب ہو اس کے مطابق نماز پوری کرلیں اور اگر کسی ایک جانب ظن غالب نہ ہو تو کم رکعتوں پر بنا کریں اور ہر رکعت پر قعدہ کر کے آخر میں سجدہ سہو کرلیں۔

لمافی الدر المختار(۲/۹۲،۹۳): (اذاشک) فی صلاته……………(وان کثر)شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والااخذبالاقل) لتیقنه (وقعدفی کل موضع توهمه موضع قعوده) و لو واجبالئلا یصیر تارکافرض القعود او واجبه،

وفی الشامیة تحته: ولوشک انها الثانیة او الثالثة اتمها وقعد ثم صلی اخری وقعد.ثم الرابعة وقعد وتمامه فی البحر.

(۱۸۷) نماز میں قطرہ کا وہم اور تعداد رکعات میں شک کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا ہے شادی سے پہلے میں بہت دین کا کام کرتی تھی اور بہت زیادہ عبادت کرتی تھی گھر کے تمام کام خود کرتی تھی اور جو کچھ احادیث پڑھتی تھی اُن پر عمل کرتی تھی پھر دوسری حدیث پڑھتی تھی۔

(۱)۔ بہرحال مسئلہ یہ ہے کہ میں آپ کو زیادہ تفصیل نہیں بتاسکتی بس اتنا بتاسکتی ہوں جتنا نماز کو اچھا اور خوبصورت بنانا چاہتی ہوں اتنی ہی نماز میں بھولتی ہوں میں اول وقت میں نماز پڑھتی تھی اللہ کی توفیق سے اور اب بھی میری یہی کوشش ہوتی ہے مگر مجھے بیماری ایسی ہے کہ پیشاب نکل جاتا ہے وہ بھی صرف قطرہ اور کبھی وہم ہوتا اور ایسا لگتا ہے کہ نکل گیا۔ پوری نماز میں مجھے یہی ہوتا ہے کہ نکل گیا جب دیکھتی ہوں تو بعض دفعہ تو ایک قطرہ ہوتا ہے یا نقطہ بعض دفعہ کچھ نہیں مگر نماز میں یہی خیال ہوتا ہے کہ نکل گیا نماز پڑھنے کھڑی ہوتی چار رکعت کی نیت کرتی ہوں اور آرام سے صحیح سے پڑھتی ہوں اور پھر بھول جاتی ہوں کہ کتنی رکعت پڑھی پھر دوبارہ پڑھتی ہوں اور کہیں جاتی ہوں وضو کر کے کہ اگر اذان ہوگی تو فوراً نماز پڑھ لوں گی تو یہی خیال ہوتا ہے کہ پہلے پیشاب کر لوں وضو ٹوٹ گیا نماز کو دیر ہو جاتی ہے اور جب کھڑی ہو جاؤں جلدی تو بھول جاتی ہوں کہ کیا پڑھا اور سوچتی ہوں کہ نفل پڑھوں گی قرآن پڑھوں گی بعض دفعہ تو پڑھ لیتی ہوں اور بعض دفعہ وقت نہیں رہتا اسی میں تھک جاتی ہوں جب باتھ روم جاتی ہوں تو اتنی دیر ہو جاتی ہے پیشاب رک رک کے آتا ہے بار بار دھوتی ہوں پہلے ہر وقت وضو رہتا تھا۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ ہر وہ شخص جس کو قطروں کی بیماری ہو، اور اس کے پیشاب کے قطرے ہر وقت ٹپکتے رہتے ہوں اور اس کو نماز پڑھنے کے وقت کے بقدر بھی قطروں سے افاقہ نہ ہوتا ہو تو وہ شخص معذور ہوگا اور اگر یہ کیفیت اور حالت نہ ہو بلکہ پوری نماز بغیر قطروں کے ٹپکنے کے پڑھی جاسکتی ہو تو وہ شخص معذور شمار نہیں ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ معذور کے حکم میں نہیں ہیں اس لئے اچھے طریقے سے وضوء کر کے نماز شروع کریں۔ دورانِ نماز قطرے گرنے کے جو خیالات آتے رہتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ اپنی نماز پوری کرلیں لیکن اگر قطرے گرنے کا یقین ہو جائے تو پھر نماز توڑ کر وضو کر کے دوبارہ پڑھ لیں۔ بغیر یقین کے جتنے بھی وہم اور خیال قطروں کے گرنے کے آئیں تو نماز نہ توڑیں بلکہ اپنی نماز کو اسی حالت میں پوری کرلیں۔ رہا نماز میں بھول جانے کا مسئلہ تو اس کا حکم یہ ہے کہ جب آپ نماز میں بھول جائیں تو غور وفکر کر کے جتنی رکعت پڑھنے کا ظن غالب ہو جائے اسی رکعت سے آگے پڑھ لیں مثلاً دو اور تین رکعت میں اگر ظن غالب تین رکعتوں کا ہے تو تیسری رکعت سے آگے پڑھنا شروع کریں اور اگر ظن غالب دو رکعتوں کا ہے تو دوسری رکعت سے آگے پڑھنا شروع کریں۔ اور اگر تحری کے باوجود ظن غالب کسی رکعت کا حاصل نہیں ہوتا ہو تو پھر بناء علی الاقل کریں۔ یعنی مثلاً تین اور چار میں تین رکعت پر اکتفاء کر کے مزید ایک رکعت اور ساتھ ملالیں۔ اور پھر آخر میں سجدہ سہو کرلیں۔

لمافی البخاری(۲۵/۱): عن عباد بن تمیم عن عمه انه شکیٰ الی رسول اللہ ﷺ الرجل الذی یخیل الیه انه یجد الشیٔ فی الصلاۃ فقال لا ینفتل او لاینصرف حتی یسمع صوتا او یجد ریحا.

وفی الدر المختار (۹۲/۲، ۹۳، ۹۴): (واذاشک) فی صلاته (من لم یکن ذلک) ای الشک (عادة له) وقیل من لم یشک فی صلاۃ قط بعد بلوغه وعلیه اکثر المشائخ بحر عن الخلاصة (کم صلی استأنف) بعمل مناف و بالسلام قاعدا اولی لانه المحل (وان کثر) شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والا اخذ بالاقل) لتیقنه (وقعد فی کل موضع توهمه موضع قعوده) ولو واجبا

لئلا یصیر تارکا فرض القعود او واجبه (و) اعلم انه (اذا شغله ذلک) الشک فتفکر (قدر اداء رکن ولم یشتغل حالة الشک بقراءة ولا تسبیح) ذکره فی الذخیرة (وجب علیه سجود السهوفی) جمیع (صور الشک) سواء عمل بالتحری اوبنی علی الاقل فتح لتاخیر الرکن لکن فی السراج انه یسجد للسهو فی اخذ الاقل مطلقا وفی غلبة الظن ان تفکر قدر رکن.

(۱۸۸) رکوع وسجود اور سلام میں امام کی متابعت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقتدی قعدہ اولی میں اپنا تشہد پورا کر کے اٹھے گا یا امام کی اطاعت کرتے ہوئے اسکے ساتھ اٹھے گا اسی طرح رکوع اور سجدے میں تسبیحات مکمل کر کے اٹھے یا امام کے ساتھ ہی اٹھ جائے؟ نیز قعدہ اخیرہ میں مقتدی کے درود شریف پڑھنے سے پہلے ہی امام نے سلام پھیر دیا تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں تین مسئلے ہیں (۱) پہلے مسئلہ میں مقتدی کو چاہئے کہ قعدہ اولی میں اپنا تشہد پورا کر کے پھر اٹھ جائے، اگر تشہد پورا کئے بغیر اٹھ جائے تو یہ بھی جائز ہے لیکن علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق اسطرح کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔ (۲) (۳) دوسرے اور تیسرے مسئلہ میں مقتدی کو چاہئے کہ رکوع اور سجدے کی تسبیحات کو چھوڑ کر اسی طرح درود شریف کو چھوڑ کر امام کی اتباع کرے کیونکہ تسبیحات اور درود شریف نماز میں پڑھنا سنت ہے جبکہ امام کی اتباع واجب ہے چنانچہ امام کی اتباع میں مقتدی کو رکوع وسجدے سے اٹھ جانا اور درود شریف چھوڑ کر امام کے سلام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے۔

لمافی الشامیة (۱/۴۷۰): ......فإن عارضها واجب لاینبغی أن یفوته بل یأتی به ثم یتابع، کما لو قام الإمام قبل أن یتم المقتدی التشهد فإنه یتمه ثم یقوم لان الاتیان به لایفوت المتابعة بالکلیة وانما یؤخرها، والمتابعة مع قطعه تفوته بالکلیة، فکان تأخیر أحد الواجبین مع الاتیان بهما أولی من ترک أحدهما بالکلیة بخلاف مااذاعارضهاسنة کمارفع الامام قبل تسبیح المقتدی ثلاثافالاصح انه یتابعه لان ترک السنة اولی من تاخیر الواجب......

(۱۸۹) سجدہ کی حالت میں پیر کی انگلیوں کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند دن پہلے ہماری مسجد میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص ظہر کی سنتیں ادا کر رہا تھا کہ سجدہ کی حالت میں اسکے پاؤں کی انگلیاں اٹھ گئیں، بعد نماز ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپکی نماز ادا نہیں ہوئی دوبارہ ادا کریں یہ بات ہم نے امام صاحب سے دریافت کی تو وہ ہمیں اسکا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے، برائے مہربانی صحیح جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حالت سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ کرنا سنت ہے، دونوں پاؤں زمین سے لگانا واجب ہے اور بلا عذر ایک پاؤں کا زمین سے اٹھائے رکھنا مکروہ تحریمی ہے اور دونوں میں سے ایک پاؤں کا کچھ حصہ زمین پر لگانا فرض ہے چاہے ایک انگلی ہی کیوں نہ ہو اور اگر دونوں پاؤں زمین سے اٹھائے اور تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کی مقدار اٹھائے رکھے تو نماز فاسد ہو جائیگی۔

لمافی البحر الرائق(۲/۱۴): ...... أو سقوط الثوب عن عورته مع التعمد مطلقا ومع اداء ركن ان لم يتعمد علم أو يعلم ومع المكث قدره ان لم يؤد عند أبي حنيفةؒ ومحمدؒ.

وفي الدر المختار(۱/۲۲۵-۲۲۶): (و) يفسدها (أداء ركن) حقيقة اتفاقا (أو تمكنه) منه بسنة، وهو قدر ثلاث تسبيحات...... الخ.

وفي الشامية(۱/۴۴۷): (قوله وقدميه) يجب اسقاطه لان وضع اصبع واحدةمنهمايكفي كما ذكره بعد. ح. وافادانه لولم يضع شيأمن القدمين لم يصح السجود وهو مقتضي ماقدمناه انفا.

(۱۹۰) دوسرے شخص کا نمازی کو نماز میں یاد دلانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک عزیز ہیں جنکی عمر بھی زیادہ ہو گئی ہے اور بیماری کی وجہ سے اکثر باتیں بھول جاتے ہیں، چونکہ وہ نماز کے بہت پابند ہیں اگر کوئی نماز ایسی حالت میں قضا ہو جائے تو سب پر ناراض ہوتے ہیں، چنانچہ جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو انہیں رکعات کی تعداد بلکہ بعض دفعہ دو سجدوں میں بھی غلطی ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں انکے ساتھ ایک آدمی بیٹھتا ہے جو انہیں یاد دلاتا رہتا ہے کہ ابھی کھڑے ہو جائیں اور اب بیٹھ جائیں وغیرہ، کیا ایسی صورت میں انکی نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... خارج صلوٰۃ سے کسی شخص کا نمازی کو یاد دلانے سے نماز درست نہیں ہوتی بلکہ جو شخص تعداد رکعات وغیرہ میں بھول کے عارضہ میں مبتلاء ہو اور یہ عارضہ اسے کثرت سے پیش آتا ہو تو اسکے لئے حکم یہ ہے کہ ایسا شخص نماز میں غور وفکر کرے اور جس طرف غالب گمان ہو جائے اسی رکن سے نماز پوری کرے اور اگر کسی ایک جانب غالب گمان نہ ہو رہا ہو تو بنا علی الاقل یعنی جو کم رکن ہو اس سے نماز پوری کرے مثلاً پہلی یا دوسری رکعت میں شک واقع ہو گیا تو غور وفکر کے بعد اگر غالب گمان یہ ہو کہ دوسری رکعت ہے تو اسی سے نماز جاری رکھے اور اگر غالب گمان نہ ہو تو پہلی رکعت ہی سمجھے کیونکہ یہ صورت یقینی ہے، اسیطرح سجدوں کی تعداد میں کرے اور آخر میں سجدہ سہو کر لے۔

لمافي الشامية (۱/۲۲۲): (قوله الااذاسمعه المؤتم الخ) في البحرعن القنية ولوسمعه المؤتم ممن ليس في الصلاة ففتح به على امامه يجب ان تبطل صلاة الكل لان التلقين من خارج.

وفي الشامية ايضاً(۲/۹۳): (قوله وان كثرشكه) بان عرض له مرتين في عمره على ماعليه اكثرهم اوفي صلاته على مااختاره فخرالاسلام...... (وقوله والا) اى وان لم يغلب على ظنه شئ.

وفیہ ایضاً(ص۹۴): (قوله سواء عمل بالتحری) ای بأن غلب علی ظنه انها الرکعة الثانیة مثلا، وقوله اوبنی علی الاقل ای بأن لم یغلب علی ظنه شئ واخذ بالاقل.

(۱۹۱) فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چار رکعت والی فرض نماز میں کوئی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی فاتحہ کے بعد بھی سورت پڑھ لے تو سجدہ سہو لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی فاتحہ کے بعد سورت ملالے تو سجدہ سہو لازم نہیں آئے گا۔

لمافی الهندیة(۱/۱۲۶): ولو قرأ فی الاخریین الفاتحة والسورة لایلزمه السهو وهو الاصح.

وفی الشامیة (۱/۵۱۱): (قوله ولو زاد ولابأس) ای لوضم إلیها سورة لابأس به لأن القراءة فی الاخریین مشروعة من غیر تقدیر.

(۱۹۲) نمازی کا کسی دوسرے کو سبحان اللہ کہہ کر تنبیہ کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہو۔ تو خارج عن الصلوٰۃ کو تنبیہ کرنے کیلئے ''سبحان اللہ'' کہتا ہے اس صورت میں اس کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ اگر فاسد ہوتی ہے تو صاحب ہدایہؒ کی اس عبارت کا کیا مطلب ہے: ''أو یدفع بالتسبیح لما روینا من قبل'' (الهدایہ،۱/۹۹)

الجواب حامداً ومصلیاً...... فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ اگر نمازی نماز میں قرآن کی آیت یالا الہ الا اللہ یا سبحان اللہ یا الحمد للہ وغیرہ کسی کو جواب دینے کی نیت سے پڑھے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نماز فاسد ہوئے گی۔ اور اگر کوئی نمازی مذکورہ کلمات بطور اعلام (کہ میں نماز میں ہوں) یا امام دورانِ نماز قرأت وغیرہ میں غلطی کرے اور مقتدی نے یہ کلمات پڑھے تو نماز فاسد نہ ہوگی اگر چہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ نماز فاسد ہوجائے لیکن یہاں پر حدیث کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا گیا ہے۔ اور یہی مقصد صاحب ہدایہ کی اس عبارت کا ہے۔

لمافی البخاری(۱/۱۶۲،۱۶۵،۳۷۰): من نابه شئ فی صلاته فلیقل سبحان الله.

وفی الهدایة(۱/۱۳۸): (فلو اجاب فی الصلوة رجلا بلا إله الا الله فهذا کلام مفسد عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ وقال ابو یوسفؒ لا یکون مفسدا) وهذا الخلاف فیما اذا اراد به جوابه له أنه ثناء بصیغته فلا یتغیر بعزیمته ولهما أنه اخرج الکلام مخرج الجواب وهو یحتمله فیجعل جوابا کالتشمیت والاسترجاع علی الخلاف فی الصحیح(وان اراد به اعلامه انه فی الصلوة لم تفسد بالاجماع) لقوله

علیه السلام اذا نابت احدکم نائبة فی الصلوٰة فلیسبح.

وفی الدر المختار (۱/۶۲۰،۶۲۱): (وجواب خبر) سوء (بالاسترجاع علی المذهب) لانه بقصد الجواب صار ککلام الناس (وکذا) یفسدها (کل ما قصدبه الجواب) کأن قیل أمع الله اله فقال لا اله الا الله...... (أو الخطاب ک) قوله لمن اسمه یحیی أو موسی (یا یحیی خذ الکتاب بقوة) أو، وما تلک بیمینک یاموسی (مخاطبا لمن اسمه ذلک)......الخ.

وقال فی الشامیة(۱/۶۲۱): واحترز بقصد الجواب عما لو سبح لمن استأذنه فی الدخول علی قصد اعلامه أنه فی الصلاة کما یأتی أو سبح لتنبیه إمامه فانه وان لزم تغییره بالنیة عندهما إلا أنه خارج عن القیاس بالحدیث الصحیح ((اذا نابت أحدکم نائبة وهو فی الصلاة فلیسبح))

(۱۹۳) امام کے پیچھے نیت میں غلطی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایک صاحب نے ظہر کی نماز میں امام کے پیچھے ظہر کی جگہ عصر کی نماز کی نیت کر لی تو کیا انکی نماز صحیح ہوگئی اگر صحیح ہوگئی تو ظہر کی ہوئی یا عصر کی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جس شخص نے امام کے پیچھے ظہر کے بجائے عصر کی نیت کی تو نہ ظہر ادا ہوگی نہ ہی عصر البتہ اگر مقتدی کے دل میں نیت ظہر پڑھنے کی تھی لیکن غلطی سے زبان سے عصر کے الفاظ نکل گئے تو اس صورت میں ظہر ہی کی نماز ادا ہوگی۔

لمافی الهندیة(۱/۸۶):لایصح اقتداء مصلی الظهر بمصلی العصر.

وفی الشامیة(۱/۵۷۹): (قوله وبمفترض فرضاآخر) سواء تغایر الفرضان اسماً او صفة کمصلی ظهر امس بمصلی ظهر الیوم.

وفی الدر المختار(۱/۴۱۵): فلا عبرة للذکر باللسان إن خالف القلب لأنه کلام لانیة

وقال الشامی رحمه الله تحته: (قوله إن خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهوا أجزأه.

(۱۹۴) عمداً واجب کو ترک کرنے سے نماز کا لوٹانا واجب ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میری والدہ گھر میں عصر کی نماز ادا کر رہی تھیں کہ بھول کر پہلی رکعت میں التحیات پر بیٹھ گئیں اور التحیات پوری پڑھنے کے بعد انہیں یاد آیا کہ یہ تو پہلی رکعت ہے تو فوراً کھڑی ہوگئیں۔اور دوسری رکعت میں التحیات پر نہیں بیٹھیں اور آخری رکعت میں التحیات پڑھ کر سجدہ سہو کیا۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بیٹا کیا اس طرح میری نماز ہوگئی ہے تو میں نے امی سے کہا کہ آپ کو دوسری رکعت میں بھی التحیات میں بیٹھنا چاہیے تھا تو امی کہنے لگیں وہ تو میں پہلی رکعت

میں پڑھ چکی تھی اسلئے نہیں بیٹھی۔ لیکن آخر میں سجدہ سہو تو کرلیا ہے۔ کیا میری نماز ہوگئی۔ تو میں نے امی سے کہا کہ میں اپنے مدرسے میں مفتی صاحب سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔ اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح میری والدہ کی نماز درست ہے یا دوبارہ ادا کریں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کی والدہ پہلی رکعت کے بعد بیٹھ گئی تھیں، جس سے تاخیر رکن لازم آیا، اب اگر وہ دوسری رکعت کے بعد بھی بیٹھ جاتیں، اور تشہد پڑھ لیتیں، تو سہواً تاخیر رکن کی وجہ سے سجدہ سہو کر لینے سے نماز درست ہو جاتی، لیکن چونکہ انہوں نے قعدہ اولیٰ قصداً ترک کر دیا اور واجب کو قصداً ترک کرنے سے تو صرف سجدہ سہو کر لینا کافی نہیں بلکہ اعادہ صلوٰۃ (نماز کا لوٹانا) واجب ہے، لہٰذا آپ کی والدہ پر اس نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۶): وفي الولوالجية: الأصل في هذا أن المتروك ثلاثة أنواع فرض وسنة، وواجب ...... وفي الثالث ان ترك ساهياً يجبر بسجدتي السهو وان ترك عامداً لا كذا في التاتارخانية وظاهر كلام الجم الغفير أنه لا يجب السجود في العمد وانما تجب الاعادة جبراً لنقصانه، كذا في البحر الرائق.

وفي البحر الرائق(۲/۱۶۱): وظاهر كلام الجم الغفير أنه لايجب السجود في العمد وانما تجب الاعادة اذا ترك واجباً عمدا جبر النقصانه، وذكر الولوالجي في فتاواه أن الواجب اذا تركه عمدا لا ينجبر بسجدتي السهو لانها عرفتا جابرتين بالشرع والشرع ورد حالة السهو وجعلها مثلاً لهذا الفائت لا فوقه.

وفي الشامية(۲/۷۹): ولو بنى على الفرض تطوعاً وقد سها في الفرض لا يسجد اهـ...... لان النفل صلاة أخرى غير الفرض ولا يمكن ان يكون سجود السهو لصلاة واقعاً في صلاة أخرى مقصودة وان كانت تحريمة الفرض باقية فلذا لا يسجد، أو لانه لما بنى النفل عمدا صار مؤخراً للسلام عن محله عمدا، والعمد لا يجبره سجود السهو بل تلزم فيه الاعادة، وحيث كانت الاعادة واجبة لم يبق السجود واجبا عن سهوه في الفرض لانه بالاعادة يأتي بماسها فيه، والسجود جابر عما فات قائم مقام الاعادة، فاذا وجبت الاعادة سقط السجود.

(۱۹۵) امام نے پانچ رکعت پڑھیں اعادۂ نماز کے وقت دیگر لوگ شامل ہوگئے انکی نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں مولوی صاحب نے عصر کی نماز چار رکعات کی بجائے پانچ رکعات پڑھائیں اور قعدہ اخیرہ میں نہیں بیٹھے تھے۔ سلام کے بعد مقتدیوں نے یاد دلایا کہ پانچ رکعتیں ہوگئیں لہٰذا مولوی صاحب نے نماز دوبارہ لوٹا دی اور دوسری جماعت کے بعد یہ اعلان کیا کہ جو حضرات پہلی جماعت میں شریک نہیں تھے وہ دوبارہ نماز دھرائیں ان کی نماز نہیں ہوئی۔ کیا ان کا یہ اعلان کرنا درست ہے یا نہیں، اگر درست ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ تفصیلاً جواب

عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جب امام صاحب نے پانچ رکعات نماز پڑھائی تو ان کی فرض نماز باطل ہوگئی لہٰذا جب دوبارہ نماز لوٹانے کیلئے دوبارہ جماعت کرائی گئی تو گویا وہ پہلی بار نماز پڑھ رہے تھے لہٰذا وہ لوگ جو پہلی جماعت میں شریک نہیں تھے لیکن دوسری جماعت میں شریک ہوگئے ان کی نماز درست ہے۔

لمافی الهداية(۱/۱۵۹): وان سهى عن القعده الأخيرة حتىٰ قام الى الخامسة رجع الى القعدة مالم يسجد..... والغىٰ الخامسة..... وان قيد الخامسة بسجدة بطل فرضه عندنا.

وفي الهندية(۱/۱۰۴): ولو زاد فيها ركعةً تامةً قبل إتمام صلوٰته فسدت صلوته.

(۱۹۶) سنت کے فساد پر اعادہ کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اگر عشاء کی نماز میں وتر پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ سنتیں پڑھتے ہوئے کوئی ایسی غلطی ہوگئی تھی جسکی وجہ سے نماز فاسد ہوگئی تھی یا صرف فساد کا شک ہو تو یہ سنتیں دوبارہ پڑھی جائینگی یا نہیں؟ اگر دوبارہ پڑھی جائینگی تو آیا وتر بھی دوبارہ پڑھے جائینگے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....اگر سنتوں کے فساد کا یقین ہو تو انکا اعادہ ضروری ہے البتہ وتر دوبارہ پڑھنا ضروری نہیں اگر فساد میں صرف شک ہو پھر ظن غالب کو ترجیح دی جائیگی اگر فساد کا ظن غالب ہو تو پھر بھی صرف سنتوں کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے نہ کہ وتر اور اگر فساد کا ظن غالب نہیں ہے تو نہ سنتوں کا اعادہ کرنا ہوگا اور نہ وتر کا۔

وفي الشامية(۲/۲۸): ولو صلى العشاء بلا وضوء والوتر والسنة به يعيدالعشاء والسنة لا الوتر .....

.......والله اعلم بالصواب.

(۱۹۷) نماز کے فساد کا اعلان امام پر لازم ہے

سوال .....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ ایک گاؤں کی مسجد میں امام ہے امسال رمضان المبارک سے پہلے یہ مسئلہ پیش آیا کہ بندہ نے مغرب کی نماز بغیر وضو کے پڑھادی۔اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....امام اگر کسی خاص محلہ کا ہے یا معین لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ کسی بھی طریقہ سے مقتدیوں کو اطلاع کردے کہ وہ اپنی نماز کا اعادہ کرلیں، اور اگر بعض مقتدی معین ہوں اور بعض غیر معین ہوں تو جن کو جانتا ہے انکو اطلاع کرنا لازم ہوگا البتہ غیر معین حضرات کو اطلاع کرنا لازم نہ ہوگا۔

لمافي الشامية (۱/۵۹۲): (قوله لومعينين) اى معلومين وقال: ح:وان تعين بعضهم لزمه اخباره

(قوله والا) ای وان لم یکونوا معینین کلهم او بعضهم لایلزمه.

(۱۹۸) پہلے سے نماز میں شامل فرد کا امام کے رکوع کے بعد رکوع کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں رمضان المبارک میں وتر کی نماز پڑھا رہا تھا تو آخری رکعت میں بجائے قنوت کے میں تکبیر کہہ کر رکوع میں چلا گیا مقتدیوں نے لقمہ دیا میں نے نہیں لیا چونکہ میں رکوع میں پہنچ گیا تھا بعد میں کچھ مقتدی تو میرے ساتھ رکوع میں شامل ہوگئے اور بعض نے میرے اٹھنے کے بعد رکوع کیا، میں نے سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لی اب جن حضرات نے میرے بعد رکوع کیا ہے، ان کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جن مقتدیوں نے امام کے ساتھ رکوع نہیں کیا لیکن امام کے بعد کرلیا ہے، تو ان کی نماز بھی درست ہوگئی، ایسے لوگ لاحق کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔

لمافی الهندیة(۱/۱۲۰): "اجمعوا أنّه لو انتهی الی الامام وهو قائم فکبّر ولم یرکع مع الامام حتی رکع الامام، ثم رکع أنّه یصیر مدرکا لتلک الرکعة."

وفی الشامیة(۱/۵۹۴): قال فی الدر المختار: (واللاحق من فاتته) الرکعات (کلها أو بعضها) لکن (بعد اقتدائه بعذر کغفلة وزحمة...... وکذا بلا عذر...... ویبدا بقضاء ما فاته عکس المسبوق ثم یتابع امامه إن امکنه ادراکه والا تابعه.

وقال فی الشامی(صـ۵۹۵): وحق التعبیر أن یقول: ویبدأ بقضاء ما فاته بلا قراءة عکس المسبوق ثم یتابع امامه ان ادرکه ثم ما سبق به.

وفیه ایضاً(۱/۴۷۰، ۴۷۱): "والحاصل ان متابعة الامام فی الفرائض والواجبات من غیر تاخیر واجبة، فان عارضها واجب لاینبغی أن یفوته بل یاتی به ثم یتابع........ نعم تکون المتابعة فرضاً، بمعنی أن یأتی بالفرض مع امامه او بعده، کمالو رکع امامه فرکع معه مقارناً او معاقباً او شارکه فیه او بعد مارفع منه، فلو لم یرکع اصلاً او رکع ورفع قبل ان یرکع امامه ولم یعده معه او بعده بطلت صلاته.

(۱۹۹) نماز پڑھتے ہوئے کسی کی آمد پر دروازہ کھولنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کسی کا انتظار کر رہا ہو، اور اسے نماز بھی پڑھنی ہے تو وہ نماز شروع کر دیتا ہے اب نماز کے دوران آنے والا آجاتا ہے تو پھر نمازی کو کیا کرنا چاہئے، کیا نماز توڑ کر دروازہ کھولنا چاہئے یا اگر وہ دروازے کے قریب ہی ہے تو وہ بغیر نیت توڑے جا کر دروازہ کھول دے اور پھر نماز پوری کرے، کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز چونکہ ایک اہم ترین عبادت ہے بندہ کو چاہئے کہ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرے اور دھیان صرف اللہ کی طرف ہو، کسی دوسری طرف دھیان نہ جائے اور کوئی منافی صلوٰۃ کام سرزد نہ ہو، لہٰذا جب کوئی شخص نماز کو شروع کرے اور کوئی نماز کے دوران آجائے تو اگر آنے والے کے بارے میں غالب گمان یا یقین ہو کہ اسے کوئی جلدی یا اشد ضرورت نہیں تو نماز مکمل کر کے ہی دروازہ وغیرہ کھولنا چاہئے، تاہم اگر دوران نماز آنے والا بہت جلدی میں ہو، یا اسے کوئی سخت حاجت ہو تو نمازی آدمی کیلئے دورانِ نماز دروازہ کھولنے کی صرف ان شرائط کے ساتھ گنجائش ہے کہ نمازی دروازے کے قریب ہو، اور تھوڑے سے عمل سے دروازہ کھول سکتا ہو۔ اور ایک دوقدم سے زیادہ چلنا پھرنا لازم نہ آتا ہو۔ اور قبلہ سے انحراف بھی لازم نہ آتا ہو، تب اگر ایک دوقدم چل کر دروازہ کھول دے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی جب تک کہ عمل کثیر کا ارتکاب نہ کرے، (عمل کثیر یہ ہے کہ اگر نمازی کوئی عمل کرتا ہو، اور نماز سے باہر کوئی اس کو دیکھ لے تو وہ یہ یقین کرے کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھ رہا)۔

لمافی مشکوۃ المصابیح(۱/۹۲): وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يصلى تطوعاً والباب مغلق عليه فجئت فاستفتحت فمشى ففتح لى ثم رجع الى مصلاه وذكرت ان الباب كان فى القبلة. (رواه احمد وابو داؤد والترمذى وروى النسائى نحوه)

و فى الشامية (۱/۶۲۸): هذا وذكر فى الحلية ايضاً فى فصل المكروهات أن الذى تقتضيه القواعد المذهبية المستندة الى الادلة الشرعية ووقع به التصريح فى بعض الصور الجزئية ان المشى لا يخلوا ما ان يكون بلا عذر او بعذر فالاول ان كان كثيراً متوالياً تفسد وان لم يستدبر القبلة وان كان كثيراً غير متوال بل تفرق فى ركعات او كان قليلاً فان استدبرها فسدت صلاته للمنافى بلا ضرورة والا فلا و كره لما عرف ان من افسد كثيره كره قليله بلا ضرورة وان كان بعذر فان كان للطهارة عند سبق الحدث او فى صلاة الخوف لم يفسدها ولم يكره قل او كثر استدبر اولا وان كان لغير ماذكر فان استدبر معه فسدت قل او كثر وان لم يستدبر فان قل لم يفسد ولم يكره وان كان كثيرا متلاحقاً افسد واما غير المتلاحق ففى كونه مفسداً او مكروها خلاف وتأمل اهـ ملخصاً. وقال فى هذا الباب والذى يظهر ان الكثير الغير المتلاحق غير مفسد ولا مكروه اذا كان لعذر مطلقاً اهـ

(۲۰۰) ایک نیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کتنی رکعات پڑھی جاسکتی ہیں؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نیت کے ساتھ گیارہ رکعات نماز بھی پڑھی ہیں، یہ کب اور کس سلسلے میں ہوا، کیا یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا یا امت کیلئے

بھی حسب ضرورت ایسا کرنا ممکن ہے؟ زیادہ سے زیادہ ایک نیت کے ساتھ کتنی رکعات پڑھی جاسکتی ہیں؟ نفل یا سنت؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... یہ جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی نیت سے گیارہ رکعات پڑھی ہیں اس کی صراحت تو ہم کو نہیں ملی البتہ بعض احادیث میں یہ آیا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رات کو گیارہ رکعات پڑھی ہیں، لیکن اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ ایک نیت سے پڑھیں اور اس میں بھی فقہاء حضرات یہ فرماتے ہیں کہ دو دو رکعت ایک نیت سے پڑھی ہیں اور آخر میں تین رکعت وتر ایک نیت سے پڑھی ہیں۔ لہٰذا گیارہ رکعات نماز ایک نیت سے پڑھنا کہیں صراحتاً ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ایک نیت سے گیارہ رکعات نہیں پڑھنی چاہئیں۔ اور دن میں ایک نیت سے چار رکعات نفل ادا کی جاسکتی ہیں اور اس سے زیادہ مکروہ ہے اور رات میں زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات نفل ایک نیت سے ادا کی جاسکتی ہیں اور اس سے زیادہ مکروہ ہے۔ البتہ افضل دونوں میں یہ ہے کہ چار رکعات نفل ایک نیت سے ادا کرے۔

لما فی اعلاء السنن (۶۰/۷): والاصل فی ذالک ان النوافل شرعت تبعا للفرائض والتبع لا یخالف الاصل فلوزید علی الاربع فی النهار لخالفت الفرائض وهذا هو القیاس فی اللیل الا ان الزیادة علی الاربع الی الثمان او الی الست عرفناه بالنص وهو ماروی عن النبی علیه الصلوة والسلام انه کان یصلی باللیل خمس رکعات، سبع رکعات تسع رکعات، احدی عشرة رکعة ثلاث عشرة رکعة والثلاث من کل واحد من هذه الاعداد الوتر (والظاهر لفظ الحدیث وان کان یشعر بوصل الوتر بالتطوع وانه صلاهما جمیعاً بتسلیمة واحدة ولکن حدیث عائشة عن احمد وابی داؤد (کان علیه الصلوة والسلام یوتر باربع وثلاث وست وثلاث، وثمان وثلاث وعشرة وثلاث" صریح فی انه کان یفصل ثلاث الوتر عن التطوع وقد مرانه حسن الاسناد ورکعتان من ثلاثة عشر سنة الفجر......الخ.

وفی الهندیة (۱۱۳/۱): وکره الزیادة علی أربع فی نوافل النهار وعلی ثمان لیلاً بتسلیمة واحدة والافضل فیهما رباع لانه ادوم تحریمة فیکون اکثر مشقة وازید فضیلة ولهذا لونذر ان یصلی اربعاً بتسلیمة لایخرج عنه بتسلیمتین وعلی القلب یخرج کذا فی التبیین.

(۲۰۱) پیشاب کی تھیلی جسم پر بندھے ہونے کی حالت میں مریض کا نماز پڑھنا!

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے مثانہ کا آپریشن ہوا ہے اور پیشاب کیلئے ایک نلکی لگی ہوئی ہے۔ جس کے ذریعے سے پیشاب جا کر ایک تھیلی میں جمع ہو جاتا ہے اور وہ تھیلی جسم کے کسی حصے کے ساتھ باندھی ہوئی ہوتی ہے۔ زید نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟ بمع اس تھیلی کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں کیونکہ تھیلی کو نکالنا ممکن نہیں، اگر پڑھ سکتا ہے تو تھیلی کو پیشاب سے خالی کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب تھیلی کوجسم سے ہٹاناممکن نہیں اورحرج لازم آتاہےتو اسی لگی ہوئی تھیلی کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے،لیکن نماز سے پہلے اس کو پیشاب سے خالی کرنا ضروری ہے کیونکہ عذر کی وجہ سے نجاست کو معاف قرار دیا گیا ہے اور عذر میں نجاست کو جس قدر کم کرنا ممکن ہوتو وہ ضروری ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۳۰۷): وكذا مريض لايبسط ثوبا الاتنجس فوراً له تركه.

وفي الدر المختار (۱/۳۰۷): يجب ردّ عذره أو تقليله بقدر قدرته.

(۲۰۲) گندگی اورنجاست کاجیب میں موجودہونااوراسی حالت میں نماز پڑھنے کاحکم

سوال......کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کچھ عرصہ پہلے بیمار ہوگیا ڈاکٹر نے کہا کہ کل صبح جب نیند سے بیدار ہوتو اس وقت پیشاب ایک بوتل میں لے آنا تاکہ ٹیسٹ کرکے بیماری کا پتہ چلایا جاسکے صبح میں نے شیشی میں پیشاب کرکے بندکردیا اور پھر جیب میں ڈال کر ہسپتال آیا لیکن کافی دیر ہوگئی اتنے میں ظہر کا وقت ہوگیا۔ میں نے نمازِ ظہر پڑھ لی اور پیشاب والی شیشی میری جیب میں تھی کیا میری نماز صحیح ہوگئی یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......کسی نجاست اور گندگی کا اپنی جگہ اور محل میں موجود ہونے سے اُس کو اپنے محل کے اندر نجاست کے حکم میں شمار نہیں کیا جاتا ہے،جیسا کہ دورانِ نماز جیب میں انڈا ہو،جس کا پانی خون میں تبدیل ہوگیا ہو،اُس کی موجودگی میں نماز درست ہوجاتی ہے،اگر وہ نجاست اپنے غیر محل اور غیر جگہ میں ہوتو اس نجاست کو اپنے غیر محل کے اندر نجاست کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے،جیسا کہ دورانِ نماز جیب میں شیشی ہو،اور اُس میں خون یا شراب وغیرہ ہوتو اُس شیشی کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے،اس نماز کا اعادہ کرنا پڑے گا۔ مذکورہ مسئلہ میں جیب میں پیشاب والی شیشی کی موجودگی میں نماز ادا نہیں ہوئی،لہٰذا اس نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا ضروری ہے۔

لمافي التاتارخانية (۱/۲۰۴): وهذه المسائل يبتني على اصل ان الحيوانات التي لا تعيش الا في الماء..... فالماء معدن هذه الحيوانات ومكانها والشئ في معدنه ومكانه لا يعطى له حكم النجاسة، الاترى ان الرجل اذا صلى وفي كمه بيضة حال محها دماً فصلاته جائزة، ولو صلى وفي كمه قارورة بول لايجوز.

وفي الهندية (۱/۶۲): إذا صلى وفي كمه بيضة مذرة قد حال محها دماً جازت صلاته وكذا البيضة التي فيها فرخ ميت كذا في فتاوىٰ قاضيخان.

رجل صلى وفي كمه قارورة فيها بول لا تجوز الصلوة سواء كانت ممتلئة اولم تكن، لان هذا ليس في مظانه ومعدنه بخلاف البيضة المذرة لانه في معدنه ومظانه وعليه الفتوىٰ.

وفي الشامية(۱/۴۰۳): ونجاسة باطنه في معدنها فلا يظهر حكمها كنجاسة باطن المصلي، كما لو

صلى حاملا بيضة مذرة صار محها دما جاز، لأنه فى معدنه، والشى مادام فى معدنه لايعطى له حكم النجاسة، بخلاف مالو حمل قارورة مضمومة فيها بول فلا تجوز صلاته لانه فى غير معدنه كمافى البحر عن المحيط.

(۲۰۳) امام کے بھول جانے پر لقمہ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے ایک مسجد میں نماز پڑھی اور نماز میں امام صاحب قراءت میں بھول گئے اب نہ وہ پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی رکوع کرتے تھے تو میں نے لقمہ دیا پھر امام صاحب نماز مکمل کرنے کے بعد مجھ پر غصہ ہوئے اور مجھ سے کہا کہ تم اپنی نماز کا اعادہ کرو تمہاری نماز فاسد ہوگئی ہے۔قریب میں ایک اور صاحب بھی کھڑے تھے جو بظاہر عالم لگتے تھے انہوں نے کہا کہ نماز کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے لقمہ دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن امام صاحب ماننے کو تیار نہیں۔اب آپ فیصلہ فرمائیں کہ امام صاحب کی یہ بات درست ہے یا نہیں؟ کیا میرے لئے نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہے یا نماز ادا ہوگئی نیز نماز میں امام کو لقمہ دینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب امام نماز پڑھاتے ہوئے قراءت میں بھول جائے اور مقتدی لقمہ دے تو مقتدی کے لقمہ دینے سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔لہٰذا صورت مسئولہ میں امام صاحب کا مقتدی سے یہ کہنا کہ وہ نماز کا اعادہ کرے درست نہیں، بلکہ دونوں کی نماز ادا ہوگئی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔البتہ مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ بلاضرورت امام کو لقمہ نہ دیں۔ہاں اگر نماز کے فساد کا اندیشہ ہو یا امام دوران قراءت بالکل رک جائے اور رکوع میں بھی نہ جاتا ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں تو لقمہ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔اور امام صاحب کو بھی چاہئے کہ وہ مقتدیوں کو لقمہ دینے کا موقع نہ دیں، دوران نماز ان سورتوں کی قراءت کریں جو اچھی طرح یاد ہوں اور اگر امام قراءت میں بھول جائے اور اتنی مقدار قراءت کرلی ہے کہ جس سے نماز ادا ہو جائے تو رکوع کرلینا چاہئے۔

لمافي الهداية (۱/۹۷،۹۶): وإن فتح على امامه لم يكن كلاما استحسانا لانه مضطر الى اصلاح صلاته فكان هذا من اعمال صلاته معنى وينوى الفتح على امامه دون القراءة هو الصحيح لانه مرخص فيه وقراءته ممنوع عنها.

وفى الهندية (۱/۹۹): وأما اذا قرأ أو تحول ففتح عليه تفسد صلاة الفاتح والصحيح انها لا تفسد صلاة الفاتح بكل حال ولا صلاة الامام لو أخذ منه على الصحيح، هكذا فى الكافى.

وفى الدر المختار مع رد المحتار (۱/۶۲۲): (بخلاف فتحه على امامه) فانه لا يفسد (مطلقا) لفاتح وآخذ بكل حال.

قال الشامي رحمه الله: (قوله مطلقا) فسره بما بعده (قوله بكل حال) اى سواء قرأ الامام قدر ما

تجوز به الصلاة أم لا انتقل الی آیة اخری ام لا تکرر الفتح ام لا هو الاصح.

(۲۰۴) مقتدی اگر نماز میں اللہ اکبر کہہ دے تو اس کی نماز کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مسجد میں عصر کی نماز پڑھی امام صاحب دوسری رکعت میں بھی کھڑے ہوگئے تو پیچھے سے ایک شخص نے آواز دی ''اللہ اکبر'' بعد میں جب امام نے سلام پھیرا۔ تو کہا کہ جس شخص نے آواز دی تھی وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے۔ یہ کہاں تک درست ہے تفصیل سے جواب مطلوب ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر امام سے نماز میں سہو ہو جائے مثلاً چار رکعت یا تین رکعت والی نماز میں امام دوسری رکعت میں بھی کھڑا ہو جائے اور مقتدی پیچھے سے اصلاح نماز کیلئے تسبیح پڑھتا ہے تو اس صورت میں مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوتی بالکل یہی صورت آپ کے اس مسئلہ میں ہے کہ امام صاحب دوسری رکعت میں قعدہ کئے بغیر کھڑے ہوگئے مقتدی نے پیچھے سے اللہ اکبر کہا تو اس سے مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوئی، لہٰذا دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

لمافی البخاری (۱/۹۴): فقال رسول الله ﷺ مالی رأیتکم اکثر تم التصفیق من نابه شیٔ فی صلوته فلیسبح فانه اذا سبح التفت الیه وانما التصفیق للنساء.

وفی الهندیة (۱/۹۹): ولو عرض للامام شیٔ فسبح الماموم لاباس به لان القصد به اصلاح الصلوٰة ولا یسبح للامام اذا قام الی الاخریین لانه لا یجوز له الرجوع اذا کان الی القیام اقرب فلم یکن التسبیح مفیداً.

وفی الشامیة (۱/۶۲۱): لو سبح لمن استاذنه فی الدخول علی قصد اعلامه انه فی الصلوٰة کما یأتی او سبح لتنبیه امامه فانه وان لزم تغییره بالنیة عندهما الا انه خارج عن القیاس بالحدیث الصحیح ((اذا نابت احدکم نائبة وهو فی الصلوٰة فلیسبح.

(۲۰۵) پہلے بائیں طرف سلام پھیرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دفعہ میں نے غلطی سے پہلے بائیں طرف سلام پھیر لیا اب میں بہت پریشان ہوں کہ میری وہ نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... سلام پھیرنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے دائیں طرف سلام پھیرا جائے پھر بائیں طرف اور اگر کسی نے بھول کر پہلے بائیں طرف سلام پھیر لیا۔ پھر دائیں طرف۔ تو اسے دوبارہ بائیں طرف سلام پھیرنے کی ضرورت نہیں۔ تاہم قصداً ایسا کرنا اور اس کی عادت بنالینا خلاف سنت ہے۔

لمافی الهندیه(۱/۷۷): ولوسلم اولاعن یساره فانه یسلم عن یمینه مالم یتکلم ولا یعید السلام عن یساره.

وفی الدرالمختار(۱/۵۲۴): ثم یسلم عن یمینه ویساره حتی یری بیاض خده، ولوعکس سلم عن یمینه فقط.

وفی الشامیة تحته: (قوله ولوعکس) بأن سلم عن یساره أولا عامدا أوناسیا بحر(قوله فقط) ای فلایعید التسلیم عن یساره.

(۲۰۶) امام کے سلام سے پہلے سلام پھیرنے والے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ اگر امام کے سلام پھیرتے وقت امام کے سلام کے الفاظ پورے ہونے سے پہلے مقتدی نے سلام کے الفاظ پورے کرلیے تو اس کی جماعت سے نماز ادا نہ ہوگی گویا اس نے اکیلے نماز پڑھی ہے اور عمرو کہتا ہے کہ اگر مقتدی نے امام کے سلام کے الفاظ پورے ہونے سے پہلے اپنے سلام کے الفاظ پورے کرلئے تو اس کی نماز فاسد ہے دوبارہ نماز پڑھے گا۔ مولوی صاحب ان دونوں مسئلوں کے بارے میں معلوم کرنا تھا دونوں میں کس کا قول صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......مقتدی اگر امام کے سلام اوّل کے لفظ ''السلام'' سے قبل اپنے سلام کے الفاظ پورے کرلے تو بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ مقتدی کی اقتداء امام کے سلام اوّل کے لفظ ''السلام'' تک کہنے پر پوری ہوتی ہے۔ البتہ اس صورت میں اس کی نماز جماعت سے ہی ادا ہوگی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ دونوں قول زید وعمرو کے کہ اس کی نماز اکیلے ادا ہوگی یا فاسد ہوجائے گی درست نہیں ہیں۔

لمافی الدر المختار (۱/۵۲۵): ولو أتمه قبل امامه فتکلم جاز وکره. وفی الشامی (تحت قوله ولوأتمه الخ) أی لو أتم المؤتم التشهد، بأن أسرع فیه وفرغ منه قبل إتمام امامه فأتی بما یخرجه من الصلاة کسلام أو کلام أو قیام جاز: أی صحت صلاته لحصوله بعد تمام الأرکان، لأن الإمام وإن لم یکن أتم التشهد لکنه قعد قدره، لأن المفروض من القعدة قدر أسرع ما یکون من قراءة التشهد وقد حصل، وانما کره للمؤتم ذالک لترکه متابعة الإمام بلا عذر.

وفی الدر المختار (۱/۴۶۸): وتنقضی قدوة باالأول قبل علیکم علی المشهور عندنا. وفی الشامیة (قوله وتنقضی قدوة بالأول) أی باالسلام الأول. قال فی التجنیس: الإمام اذا فرغ من صلاته فلما قال السلام جاء رجل واقتدیٰ به قبل أن یقول علیکم لا یصیر داخلاً فی صلاته، لأن هذا سلام، ألا تریٰ أنه لو أراد أن یسلم علی احد فی صلاته ساهیاً فقال السلام ثم علم فسکت تفسد صلاته.

(۲۰۷) مکہ مکرمہ میں زوال کے وقت نماز پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب میں عمرہ کے لیے گیا تھا وہاں کوئی ایسا وقت نہیں جاتا تھا کہ نماز نہ پڑھتے ہوئے دیکھا گیا جیسے ہمارے یہاں زوال کا وقت ہے لیکن وہاں پر ان کے کسی بھی نماز کے نقشے میں زوال کا وقت نہیں ہے۔ اب ہم وہاں پر زوال کا وقت کس طرح معلوم کریں یا وہاں پر زوال کا وقت نہیں ہوتا۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... سورج جب بالکل آسمان کے بیچ میں آجائے تو اس وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہاں تک کہ زوال ہو جائے اور یہ حکم احناف کے نزدیک عام ہے تمام نمازوں کیلئے اور تمام مقامات کیلئے لیکن دیگر ائمہ کرام اس حکم سے چند نمازوں کا استثناء کرتے ہیں مثلاً فرض نمازوں کی قضاء کرنا، طواف کی دو رکعت پڑھنا اور نذر کی نماز وغیرہ اور اسی طرح شوافع مکہ مکرمہ کی تخصیص بھی کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں اوقات مکروہہ میں نوافل بھی پڑھنا جائز ہے اس لیے لوگ وہاں اس وقت میں بھی نماز پڑھتے ہیں البتہ ہمارے نزدیک مکہ مکرمہ میں بھی اس وقت نماز پڑھنا جائز نہیں اور اس کے تعین کا طریقہ یہ ہے کہ وقتِ زوال طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب کے کل وقت کا نصف ہے اس سے پانچ منٹ پہلے اور پانچ منٹ بعد تک نماز نہ پڑھے تاکہ مکروہ وقت نکل جائے۔

لمافي الجامع للترمذي(۱/۲۰۰): عن عقبة بن عامر الجهني قال ثلث ساعات كان رسول الله ﷺ ينهانا أن نصلي فيهن أو نقبر فيهن موتاناحين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل وحين تضيف للغروب حتى تغرب.

وفي عمدة القاري(۵/۷۷،۷۸): احتج به ابو حنيفة على انه يكره أن يتنفل بعد صلاة الفجر حتى تطلع الشمس وبعد صلاة العصر حتى تغرب الشمس..... وزعم ابن العربي أن الصلاة في هذين الوقتين تؤدى فيهما فريضة دون النافلة عند مالك وعند الشافعي تؤدى فيهما الفريضة والنافلة التي لها سبب ومذهب آخر لا يصلي فيهما بحال لا فريضة ولانافلة ومذهب آخر تجوز بمكة دون غيرها وزعم الشافعي في كتاب اختلاف الحديث و ذكر الصلاة التي لها سبب وعددها ثم قال وهذه الصلاة واشباهها تصلي في هذه الأوقات بالدلالة عن رسول الله ﷺ حيث قال من نسي صلاة فليصلها اذا ذكرها وصلى ركعتين كان يصلّيهما بعد الظهر شغل عنهما بعد العصر وأمرأن لايمنع أحد طاف بالبيت أي ساعة شاء والاستثناء الوارد في حديث عقبة الابمكة وله في الجمعة حديث أبي سعيد انه ﷺ نهى عن الصلاة في نصف النهار الا يوم الجمعة..... الخ.

وفي الشامية (۱/۳۵۹): (ووقت الظهر من زواله أي ميل ذكاء عن كبد السماء) اى وسطها بحسب مايظهر لنا.

وفی الشامیة (۱/۳۷۲): وقد قال أصحابنا: ان الصلاة فی هذه الاوقات ممنوع منها بمكة وغيرها اهـ. ورأیت فی البدائع ایضاً مانصه: ما ورد من النهی إلا بمكة شاذ لا يقبل فی معارضة المشهور، وكذا رواية استثناء يوم الجمعة غريب فلا يجوز تخصيص المشهور به اهـ.

(۲۰۸) دوسورتوں کے درمیان سورت چھوڑنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں درجہ خامسہ میں پڑھتا ہوں ہمارے استادوں نے مسئلہ بیان کیا جب آدمی ایک سورت پڑھ لے تو اس کے بعد ایک سورت چھوڑ کر دوسری سورت شروع نہ کرے یعنی درمیان میں ایک سورت کا فرق نہ کرے۔ یہ مسئلہ میرے ذہن پر نہیں لگتا کہ پڑھنا تو قرآن ہی ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے معاذ اللہ جب آدمی ایک سورت پڑھ لے تو پھر دوسری سورت چھوڑ کر تیسری پڑھتا ہے قرآن ہی تو پڑھتا ہے کوئی ناجائز کام تو نہیں کرتا پھر منع کیوں؟ پھر بڑی اور چھوٹی سورتوں میں کوئی فرق ہے مثلاً بقرہ پڑھ کر سورۂ نساء پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر فرق ہے تو کتنی آیت والی سورت پڑھ سکتا ہے کتنی والی نہیں پڑھ سکتا۔ میں اس مسئلہ کے بارے میں کافی پریشان ہوں۔ مہربانی فرما کر ضرور ایسا حل عنایت فرمائیں کہ میرے تردد کو دفع کردے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں بعض حضرات کے نزدیک مطلقاً کراہت نہیں ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ترتیب سے پڑھے اور درمیان میں کوئی سورت نہ چھوڑے۔

لمافی المحيط البرهانی (۲/۴۷): وأما فی رکعتين فإن كان بينهما سور لا يكره وإن كان بينهما سورة واحدة هل يكره؟ اختلف المشائخ فيه قال بعضهم يكره وقال بعضهم ان كانت السورة طويلة لا يكره وقال بعضهم لايكره أصلاً.

وفی مراقی الفلاح (ص۲۸۷): (و) يكره (فصله بسورة بين سورتين قرأهما فی رکعتين) لمافيه من شبهة التفضيل والهجر وقال بعضهم لا يكره إذا كانت السورة طويلة كما لو كان بينهما سورتان قصيرتان.

وفی الهندية (۱/۷۸): وأما فی رکعتين إن كان بينهما سور لا يكره وإن كان بينهما سورة واحدة قال بعضهم يكره وقال بعضهم إن كانت السورة طويلة لا يكره هكذا فی المحيط كما اذا كان بينهما سورتان قصيرتان كذا فی الخلاصة، وقال بعضهم لايكره أصلاً.

وفی الشامية (۱/۵۴۶): (قوله ويكره الفصل بسورة قصيرة) أما بسورة طويلة بحيث يلزم منه إطالة الركعة الثانية إطالة كثيرة فلايكره شرح المنية كما اذا كانت سورتان قصيرتان وهذا لو فی رکعتين

أما فی رکعة فیکره الجمع بین سورتین بینهما سور أو سورة فتح.

(۲۰۹) کیا دورانِ نماز انگڑائی لینے سے نماز ہوجائے گی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام یا مقتدی نماز میں انگڑائی اور جمائی کثرت کے ساتھ لیں تو اِن کی نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں نماز میں انگڑائی اور جمائی لینا ویسے بھی مکروہ ہے اس لئے اس کو حتی الامکان دفع کیا جائے اور اگر اتنی زیادہ ہوجائے کہ عمل کثیر بن جائے تو اس وقت نماز فاسد ہوجائے گی۔

لمافی الخلاصة الفتاوی(۱/۵۷): وقوله اذا تثاؤب احدکم فی الصلاة فلیغط فاه دلیل علما انه لا یباح فی غیر تلک الحالة وهذا اذاکان بحال لایمکنه الامتناع عن التثاؤب اما اذا امکنه ان یاخذ شفتیه باسنانه فلم یفعل وغطی فاه بیده او بثوبه یکره.

وفی الهندیة(۱/۱۰۷):ویکره التلثم وهو تغطیة الانف والفم فی الصلاة والتثاؤب فان غلبه فلیکظم ما استطاع فان غلبه وضع یده او کمه علی فیه.

وفی الهندیة(۱/۱۰۲): انه لو نظر الیه ناظر من بعید ان کان لا یشک انه فی غیر الصلاة فهو کثیر مفسد وان شک فلیس بمفسد وهذا هو الاصح هکذا فی التبیین وهو احسن کذا فی محیط السرخسی وهو اختیار العامة.

(۲۱۰) پینٹ شرٹ میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جدید دور ہے لوگ جدت کی طرف مائل ہیں حتیٰ کہ لباس میں بھی جدت ہے شہروں میں لوگ پینٹ شرٹ پہنتے ہیں اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھتے ہیں تو کیا پینٹ شرٹ پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... پینٹ اگر چست ہونے کی بنا پر مخفی اعضاء کو ظاہر کرتی ہے تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اگر چست اور باریک نہ ہو، اور پائنچے ٹخنوں سے نیچے نہ ہوں، تو اس میں نماز پڑھنا جائز ہے مگر ایک مسلمان کو صلحاء کا لباس ہی اختیار کرنا چاہئے کیونکہ وہی سنت ہے۔

لمافی الدر المختار(۱/۴۱۰،۴۰۹):(والشرط سترها عن غیره) ولو حکماً کمکان مظلم (لا) سترها (عن نفسه) به یفتی فلو راٰها من زیقه لم تفسدو ان کره (وعادم ساتر) لایصف ماتحته ولا

يضر التصاقه وتشكله...... (ص۱۱۴) (يصلي قاعداً).

وفي الشامية تحته: (قوله ولا يضر التصاقه) اى بالالية مثلا وقوله وتشكله من عطف المسبب على السبب وعبارة الشرح المنية أما لو كان غليظاً لايرى منه لون البشرة إلا أنه التصق بالعضو وتشكل بشكله فصار شكل العضو مرئياً فينبغي أن لا يمنع جواز الصلوٰة لحصول الستر. اهـ.

(۴۱۱) دورانِ نماز شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دورانِ نماز شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا کیسا ہے اور نماز کے علاوہ عام حالت میں نیچے رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ آیا شلوار کو اوپر سے اور پینٹ کو نیچے سے فولڈ کرنے سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور پینٹ کو باہر کی طرف فولڈ کریں یا اندر کی طرف؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

الجواب حامداً ومصلیاً...... مردوں کیلئے شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا جائز نہیں۔ خواہ نماز کی حالت ہو یا نماز کے علاوہ۔ احادیث میں شلوار ٹخنوں سے نیچے رکھنے والوں سے متعلق بہت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ لہٰذا مردوں کو چاہئے کہ وہ اپنی شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے اوپر رکھیں خواہ اوپر سے فولڈ کریں یا نیچے سے، باہر کی طرف کریں یا اندر کی طرف دونوں طرح درست ہے۔ اور یہ حکم نماز اور خارج نماز دونوں کیلئے ہے۔

لمافي صحيح البخاري(۸۶۱/۲): عن ابي هريرة (رضي الله عنه) عن النبي ﷺ قال ما اسفل من الكعبين من الازار في النار.

وفي تكملة فتح الملهم(۱۲۳/۴): والحاصل عند هذا العبد الضعيف عفا الله عنه۔ ان العلة الاصلية من وراء تحريم الاسبال هي الخيلاء كما صرح به رسول الله ﷺ في حديث الباب ولكن تحقق الخيلاء أمر مخفي ربما لا يطلع عليه من ابتلى به فأقيم سببه مقام العلة وهو الاسبال الى ان قال. كلما تحقق الاسبال تحت الكعبين جاء المنع الافي غير حالة الاختيار فان انتفاء الخيلاء في ذلك متيقن.

(۴۱۲) محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام محراب کے اندر کھڑا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے صحیح ہے یا نہیں؟

(۲)۔ نماز کتنے سال میں فرض ہوتی ہے اس میں مرد وعورت کا کوئی فرق ہے یا نہیں؟

(۳) میں ۱۱/ سال کی عمر سے نماز پڑھ رہا ہوں کیا میرے اوپر قضائے عمری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... اصل حکم یہ ہے کہ دورانِ امامت امام ایسی جگہ کھڑا ہو کہ صف کی دونوں طرفیں برابر ہوں۔اور اکثر محراب مسجدوں کے درمیان ہی میں بنے ہوئے ہوتے ہیں۔اور محراب مسجد ہی کے حکم میں ہوتا ہے۔امام کو عام حالات میں محراب سے باہر ہی کھڑے ہو کر نماز پڑھانی چاہیے اور اگر ضرورت ہو جیسے جمعہ کے دن میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو محراب کے اندر بھی امام کھڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن امام کا محراب کے اندر کھڑا ہونا خلاف اولیٰ ہے، بہرصورت ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے۔

۲)۔مرد اور عورت جب پندرہ سال کے ہو جائیں اگر چہ ان میں بلوغت کی علامات (مثلاً مرد میں احتلام کا ہو جانا، عورت کو حاملہ کر دینا، اور بیداری کی حالت میں انزال ہو جانا اور لڑکی میں حیض کا آنا، احتلام کا ہو جانا، حاملہ ہو جانا) نہ پائیں جائیں تو پندرہ سال کی عمر میں ان پر نماز فرض ہو جاتی ہے اور اگر پندرہ سال سے پہلے لڑکے یا لڑکی میں مذکورہ علامات ظاہر ہو گئیں تو جس وقت بلوغت کی علامت ظاہر ہو نگی اس وقت سے ان پر نماز فرض ہو جائے گی۔

۳)۔نماز کے فرض ہونے کیلئے بلوغت شرط ہے اور لڑکے کے بالغ ہونے کی کم سے کم عمر ۱۲ سال ہے اور زیادہ سے زیادہ عمر ۱۵ سال ہے۔ اگر پندرہ سال سے پہلے لڑکے میں بلوغت کی علامات ظاہر ہو جائیں تو اسی وقت سے نماز فرض ہو جاتی ہے لہٰذا اگر بالغ ہونے کے بعد آپ کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی تو آپ پر قضاء عمری نہیں ہے۔

لمافی الهندية(۱۰۸/۱): ويكره قيام الامام وحده فی الطاق وهو المحراب ولايكره سجوده فيه اذا كان قائما خارج المحراب هكذا فی التبيين، واذا ضاق المسجد بمن خلف الامام فلا بأس بان يقوم في الطاق كذا فی فتاوی البرهانية.

وفی الشامية(۶۴۷/۱):وحكی الحلوانی عن ابی الليث: لايكره وقيام الامام فی الطاق عند الضرورة بأن ضاق المسجد على القوم......

وفی الدر المختار(۱۵۴،۱۵۳/۶): (بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال) والأصل هو الإنزال (والجارية بالاحتلام والحيض والحبل) ولم يذكر الإنزال صريحا لأنه قلما يعلم منها (فإن لم يوجد فيهما) شيء(فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى) لقصر أعمار أهل زماننا

وفی الشامية تحته: (قوله به يفتى) هذا عندهما وهو رواية عن الإمام وبه قالت الأئمة الثلاثة. (وأدنى مدته له اثنتا عشرة سنة ولها تسع سنين) هو المختار كمافی أحكام الصغار.

(۲۱۳) آستینیں چڑھا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام ... مسئلہ کے بارے میں کہ آستینیں اگر کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہوں تو اس

حالت میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اگر کہنیوں سے تو نیچے ہوں لیکن کلائیوں سے اوپر ہوں تو اس صورت میں بھی کیا نماز میں کراہت آئے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آستینیں اگر کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہوں تو اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ لیکن اگر کہنیوں سے تو نیچے ہوں لیکن کلائیوں سے اوپر ہوں تو اس صورت میں نماز میں کراہت نہیں آئے گی۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ آستینوں کو کلائیوں سے بھی اوپر نہ چڑھائے۔

لما فی الدر المختار (۶۴۰/۱): (و) کره (کفه) أی رفعه ولو لتراب کمشمر کم أوذیل.

وفی الشامیة تحته: (قوله کمشمر کم أوذیل) أی کمالو دخل فی الصلوة وهومشمر کمه أوذیله واشاربذالک الی ان الکراهة لاتختص بالکف وهو فی الصلوٰة کما افاده فی شرح المنیة لکن قال فی القنیة. واختلف فیمن صلی و قد شمر کمیه لعمل کان یعمله قبل الصلوة او هیئته ذالک ومثله مالو شمر للوضوء ثم عجل لادراک الرکعة مع الامام: واذا دخل فی الصلوة کذالک وقلنا بالکراهة فهل الأفضل ارخاء کمیه فیها بعمل قلیل اوترکهما؟ لم اره والاظهر الاول بدلیل قوله الاتی ولو سقطت قلنسوته فاعادتها افضل تامل هذا وقید الکراهة فی الخلاصة و المنیة بان یکون رافعا کمیه الی المرفقین وظاهره انه لایکره الی مادونهما قال فی البحر والظاهر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل ونحوه فی الحلیة وکذا قال فی شرح المنیة الکبیر ان التقیید بالمرفقین اتفاقی. قال: وهذا لوشمرهما خارج الصلوة ثم شرع فیها کذالک امالو شمر وهو فیها تفسد لانه عمل کثیر.

(۲۱۴) نماز میں کہنیوں کو کھلا رکھنے اور مچھروں کی وجہ سے ٹخنے ڈھانپنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دورانِ نماز کہنیوں کو کھلا رکھنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص مچھروں سے بچاؤ کے لئے اپنے ٹخنوں کو ڈھانپے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح نماز کیلئے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کس حد تک؟ مدلل طور پر جواب دے کر مشکور وممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز کے دوران کہنیوں کا ڈھانپنا سنت ہے اور ان کو کھلا رکھنا مکروہ ہے۔ مردوں کیلئے [illegible] وغیرہ کا کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں کیونکہ احادیث میں اس کے بارے میں بہت سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ البتہ مچھروں سے بچنے کیلئے جرابوں وغیرہ کا استعمال کریں۔

نماز کے درست ہونے کیلئے کپڑوں کا مکمل پاک ہونا ضروری ہے البتہ اگر کسی شخص نے نماز پڑھی اور اس کے کپڑوں میں نجاست غلیظہ

(مثلاً پیشاب، منی، پاخانہ، شراب وغیرہ) لگی ہوئی تھی اب اس نجاست کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ نجاست ایک درہم کی مقدار سے کم ہے تو نماز ہوگئی ہاں اگر ایک درہم یا ایک درہم سے زیادہ ہے تو نماز درست نہ ہوگی۔ اور اگر کپڑے پر نجاست خفیفہ (مثلاً ان جانوروں کا پیشاب جن کا گوشت کھایا جاتا ہے گائے، بکری، وغیرہ) لگی ہوئی تھی اگر اس نجاست کی مقدار کپڑے کے چوتھائی سے کم تھی تو نماز ہوگئی اگر زیادہ تھی تو نماز درست نہ ہوگی۔

لما في مشكوة المصابيح (۱/۲۴۳): عن النبي ﷺ قال: ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر اليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب اليم قال ابو ذر: خابوا وخسروا من هم؟ يا رسول الله! قال، المسبل، والمنان، والمنفق سلعته بالحلف الكاذب.

وفي مراقي الفلاح (صـ۲۰۷، ۲۰۸): (و) منها (طهارة الجسد والثوب والمكان) الذي يصلي عليه ...... (من نجس غير معفو عنه) وتقدم بيانه.

وفيه ايضاً (صـ۱۵۶، ۱۵۷): ولما بين القسمين بين القدر المعفو عنه فقال (وعفي قدر الدرهم) وزناً في المتجسدة وهو عشرون قيراطاً ومساحة في المائعة وهو قدر مقعر الكف داخل مفاصل الاصابع كما وفقه الهندواني، و هو الصحيح فذلك عفو (من) النجاسة (المغلظة) فلا يعفى عنها إذا زادت على الدرهم مع القدرة على الازالة (و) عفي قدر مادون ربع الثوب الكامل (أو البدن) كله على الصحيح من الخفيفة لقيام الربع مقام الكل.

وفي الدر المختار (۱/۶۴۰): وكره كفه أي رفعه ولو لتراب كمشمر كم أو ذيل

وفي الشامية تحته: اى كما لو دخل في الصلاة وهو مشمر كمه أو ذيله وأشار بذلك الى ان الكراهة لاتختص بالكف وهو في الصلاة كما أفاده في شرح المنية لكن قال في القنية واختلف في من صلى وقد شمر كميه لعمل كان يعمله قبل الصلاة او هيئته ذلك اهـ. ومثله ما لو شمر للوضوء ثم عجل لادراك الركعة مع الامام واذادخل في الصلاة كذلك وقلنا بالكراهة فهل الأفضل ارخاء كميه فيها بعمل قليل أو تركهما؟ لم أره: والاظهر الأول بدليل قوله الاتي ولو سقطت قلنسوته فإعادتها أفضل.

هذا وقيد الكراهة في الخلاصة والمنية بأن يكون رافعا كميه الى المرفقين وظاهره أنه لا يكره الى مادونهما قال في البحر: والظاهر الاطلاق لصدق كف الثوب على الكل اهـ ونحوه في الحلية وكذا قال في شرح المنية الكبير: ان التقييد بالمرفقين اتفاقي

قال: وهذا لوشمرهما خارج الصلاة ثم شرع فيها كذلك أما لو شمر وهو فيها تفسد لانه عمل كثير.

(۲۱۵) سود کے پیسوں سے بنائے ہوئے مکان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک دوست سود کا کاروبار کرتے ہیں اور سودی رقم سے مکان بنایا ہے تو اب پوچھنا یہ ہے کہ سود کی رقم سے بنے ہوئے مکان میں نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں سودی کاروبار کرنے والا گناہ کبیرہ میں مبتلا ہے، اسے چاہئے کہ کوئی جائز کاروبار شروع کرے۔اور ان پیسوں سے جو مکان بنایا ہے اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

لما في الهندية(۵/۱۴۲): في المنتقى قال ابو يوسفؒ اذا غصب رجل أرضاوبناها حوانيت و حماما و مسجدا فلا باس بالصلوة في ذلك المسجد فأما الحمام فلا يدخل ولا يستأجر الحوانيت قال ولابأس بان يدخل الحوانيت لشراء المتاع قال هشآم وأنا أكره الصلوة فيه حتى يطيب بذلك اربابه.

وفي الفقه الاسلامي(۲/۹۸۴): الصلوة في الارض المغصوبة حرام بالاجماع لان اللبث فيها يحرم في غير الصلاة فلان يحرم في الصلوة اولى . والله اعلم بالصواب.

(۲۱۶) ٹی وی اور آلات موسیقی والے کمرے میں نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے ایک کمرے میں ٹی وی رکھا ہوا ہے اس کمرے میں کوئی اور سامان نہیں ہے بالکل خالی ہے تو ہمارے گھر والے اور ہم لوگ اس کمرے میں نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ آیا جس کمرے میں ٹی وی رکھا ہو، اس میں نماز پڑھنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر ٹی وی چل رہا ہو پھر تو یہ انتہائی مکروہ فعل ہے کیونکہ اس میں تصویروں کی عبادت کرنے والوں سے مشابہت لازم آئے گی لیکن نماز کراہت کے ساتھ ہوجائے گی اور اگر ٹی وی بند ہو تو پھر بھی نماز ہوجائے گی لیکن خلاف اولیٰ ہے کیونکہ عموماً ایسی جگہوں پر نماز میں اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا۔

لما في الهندية(۱/۶۳): وتكره الصلاة في تسع مواطن في قوارع الطريق ومعاطن الابل والمزبلة والمجزرة والمخرج والمغتسل والحمام والمقبرة وسطح الكعبة ولا بأس بالصلاة والسجود على الحشيش والحصير والبسط والبواري هكذا في فتاوىٰ قاضيخان.

وفيه ايضاً(۲/۹۸۱): الكنيسة(معبد النصارى) والبيعة (معبد اليهود) ونحوهما من أماكن الكفرّ تكره الصلاة فيها عند الجمهور وابن عباس مطلقا عامرة أو دارسة الا لضرورة كحر أو برد أو مطر

أو خوف عدو او سبع فلا كراهة، وحكمة الكراهة إنها ماوى الشياطين لأنها لا تخلو من التماثيل والصور ولأنها موضع فتنة وأهواء مما يمنع الخشوع...... قال النووى فى المجموع. وتكره الصلاة فى ماوى الشياطين كالخمارة وموضع المكس ونحو ذلك من المعاصى الفاحشة.

(۲۱۷) آئینہ کے سامنے نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایسی جگہ نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جہاں نمازی کے سامنے بڑا سا آئینہ ہو جس میں اسکی تصویر دکھائی دے رہی ہو، نیز اندھیرے کمرے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......آئینہ کے سامنے نماز پڑھنا جائز ہے البتہ اگر اسکی وجہ سے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہو رہا ہو تو آئینے کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ ہوگا، نیز اندھیرے کمرے میں نماز پڑھنا بھی درست ہے جبکہ استقبال قبلہ درست ہو، اگر قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو تو کسی سے پوچھ کر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور اگر کوئی بتانے والا نہ ہو تو خود تحری کر کے نماز پڑھ لے۔

لمافى مراقى الفلاح(ص۲۹۳): (و)تكره بحضرة كل (مايشغل البال) كزينة (و) بحضرة ما (يخل بالخشوع) كلهو ولعب ولذانهى النبى ﷺ عن الاتيان للصلاة سعيا بالهرولة.

وفى الشامية(۱/۴۳۱):فان كان عاجزا بالاشتباه وهو ان يكون فى المفازة فى ليلة مظلمة ولا علم له بالامارات الدالة على القبلة فان كان بحضرته من يسئله عنها لايجوزله ان يتحرى بل يجب ان يسئل لماقلنااى من ان السوال أقوى من التحرى.

(۲۱۸) آئینے کے سامنے نماز پڑھنا تصویر کے حکم میں نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے سامنے بڑا آئینہ لگا ہوا ہو تو وہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں جبکہ اس کی تصویر آئینے میں مکمل طور پر نظر آتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......آئینے میں جو چیز نظر آتی ہے اس کو تصویر نہیں کہا جاتا بلکہ عکس کہا جاتا ہے اس لئے یہ تصویر کے حکم میں نہیں ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آئینے کے سامنے نماز پڑھنے میں فی نفسہٖ کوئی کراہت نہیں جیسا کہ مصلی کا سایہ بحالت نماز سامنے پڑنا موجب کراہت نہیں البتہ آئینہ اور اس جیسی اشیاء جن سے نمازی کے خشوع وخضوع میں خلل آتا ہو سامنے کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

لمافى قاضى خان(۱/۱۲۸): ولو نظر فى مرأة ورأى فيها فرج إمرأة فنظر عن شهوة لا يحرم عليه أمها وابنتها لانه لم يرفرجها وإنما رأى عكسها. ولو كانت المرأة على شط حوض او على قنطرة فنظر الرجل فى الماء فرأى الرجل فرجها فنظر عن شهوة لا يثبت الحرمة.

وفی الشامیة(۱/۶۵۸):قوله لانه یلهی المصلی: أی فیخل بخشوعه من النظر الی موضع سجوده ونحوه، وقد صرح فی البدائع فی مستحبات الصلوة أنه ینبغی الخشوع فیها ویکون منتهی بصره إلیٰ موضع سجوده الخ وکذا صرح فی الاشباه أن الخشوع فی الصلوة مستحب والظاهر من هذا ان الکراهة هنا تنزیهیة فافهم.

وفیه ایضاً(ص۴۰۳): وفی القنیة: لو صلّی علی زجاج یصف ماتحته قالو جمیعا یجوز.

وفی المفصل فی احکام المرأة والبیت المسلم(۱/۲۲۹): مایکره فی الصلاة: یکره للمصلی فی صلوته العبث بثوبه او بدنه او...... یرفع بصره الی السماء أو...... إلی ما یشغله عن الصلوة أو...... ان یصلی بحضرة الطعام أو...... ان یترک شیأ من سنن الصلوة.

(۲۱۹) اندھیرے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے بڑے فرماتے ہیں کہ جب نماز پڑھی جائے تو روشنی کا انتظام پہلے کر لینا ضروری ہے، اندھیرے میں نماز نہیں ہوتی۔ کیا ان حضرات کی بات صحیح ہے یا اندھیرے میں بھی نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آپ کے بڑوں کا یہ کہنا کہ ''اندھیرے میں نماز نہیں ہوتی'' صحیح نہیں ہے۔ اندھیرے میں نماز بلا کراہت درست ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۶۴): رجل صلی فی المسجد فی لیلة مظلمة بالتحری فتبیّن انه الی غیر القبلة جازت صلوته.

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۹۲): اما باللیل فیصلی قائماً لان ظلمة اللیل تستر عورته.

وفی الدرالمختار(۱/۴۳۳): وان علم به فی صلوته او تحول رایه .... ولو بمکة او مسجد مظلم ولا یلزمه قرع ابواب ومس جدران.

وفی الشامیة تحته: وفی الخلاصة اذا لم یکن فی المسجد قوم والمسجد فی مصرٍ فی لیلةٍ مظلمةٍ (قوله ومس جدران) لان الحائط لو کانت منقوشة لا یمکنه تمییز المحراب من غیره وعسی ان یکون ثم هامة مؤذیةً .... وهذا انما یصح فی بعض المساجد فاما فی الاکثر فیمکن تمییز المحراب من غیره فی الظلمة بلا ایذاءٍ.

(۲۲۰) سامنے موم بتی یا لالٹین وغیرہ رکھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موم بتی اور لالٹین وغیرہ سامنے رکھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

نماز میں کراہت تو نہیں آتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اگر کوئی شخص موم بتی یا لالٹین وغیرہ سامنے رکھ کر نماز پڑھے تو نماز درست ہے اور نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ نماز کی حالت میں موم بتی یا لالٹین وغیرہ جانبین میں سے کسی جانب رکھیں۔

لمافی الهندية (۱/۱۰۸): ولو توجه الى قنديل أو الى سراج لم يكره.

وفی الدر المختار (۱/۲۵۱):(و) لایکره (صلاة الى ظهر قاعد) أو قائم ولو (يتحدث) الااذا خيف الغلط بحديثه (و) لا الى (مصحف أو سيف مطلقا أو شمع أو سراج) أونار توقد لأن المجوس انما تعبد الجمر لا النار الموقدة.

(۲۲۱) چشمہ لگا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل ایک صاحب مجھ سے الجھ پڑے کہ نماز چشمہ اتار کر پڑھنا چاہئے، یہی اولیٰ اور افضل ہے۔ آنجناب سے گذارش یہ تھی آپ میری صحیح بات کی طرف راہنمائی فرمادیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں فی نفسہ چشمہ لگانا جائز ہے البتہ اگر سجدہ وغیرہ کرتے وقت ڈھیلا ہونے سے الجھنے کا گمان ہو یا اس سے خشوع وخضوع میں خلل آتا ہو تو چشمہ لگانا نماز میں مکروہ ہے، اس کو اتار دینا افضل ہے۔ اور اگر اس کی وجہ سے خشوع وخضوع میں اضافہ ہوتا ہو تو چشمہ لگا کر نماز ادا کرنا بلا کراہت درست ہے۔ نیز ایسے امور میں آپس میں بحث ومباحثہ اور الجھنا اچھا نہیں۔

وفی الهندية(۱/۱۰۹): ولا بأس ان يصلي متقلداً للقوس والجعبة الا ان يتحركا عليه حركة تشغله فحينئذ مكروه ويجزيه.

وفی الدر المختار(۱/۶۴۰):(و) كره (كفه)أى رفعه ولولتراب كمشمركم أوذيل (وعبثه به) اى بثوبه (وبجسده) للنهي الالحاجة ولا بأس به.

وفی الشامية تحته: (قوله وعبثه) هو فعل لغرض غير صحيح قال في النهاية :وحاصله ان كل عمل هو مفيد للمصلي فلا بأس به اصله ماروى ان النبي ﷺ عرق في صلاته فسلت العرق عن جبينه اى مسحه لانه كان يؤذيه فكان مفيداً. وفي زمن الصيف كان اذاقام من السجود نفض ثوبه يمنة أو يسرةً لانه كان مفيدا كي لاتبقى صورة فأما ما ليس بمفيد فهو العبث.

وفی فتاوی اللجنة(۷/۱۷۳): س: ماحكم الصلاة في النظارات الطبية:

ج: يجوز للانسان ان يصلي بالنظارات الطبية الا اذا كان استعمالها يمنع من تمكين المصلي جبهته

او انفه من الارض فلا يجوز.

(۲۴۴) بغیر عمامہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا پڑھانا کیسا ہے، آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نماز بغیر عمامہ کے پڑھنا ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... عمامہ باندھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت ہے اور احادیث مبارکہ میں عمامہ باندھنے کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عمامہ باندھنا اجر وثواب کا باعث ہے. چنانچہ بغیر عمامہ نماز پڑھنا اور پڑھانا اگر چہ جائز ہے لیکن (بعض روایات ۔کے مطابق اگر چہ وہ ضعیف ہیں) عمامہ باندھ کر پڑھی گئی نماز کا ثواب بغیر عمامہ پہنے پڑھی گئی نماز کے مقابلے میں پچیس گنا زیادہ ہے لہٰذا بغیر عمامہ کے پڑھی گئی نماز میں پچیس گنا ثواب سے محرومی ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا تتبع کے باوجود نہ مل سکا البتہ ننگے سر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے حالت احرام کے کبھی نماز نہیں پڑھی۔

لمافي المرقاة (۸/۲۵۰): وروى ابن عساكر عن ابن عمر مرفوعا صلاة تطوع او فريضة بعمامة تعدل خمسا وعشرين صلاة بلاعمامة وجمعة بعمامة تعدل سبعين جمعة بلا عمامة فهذا كله يدل على فضيلة العمامة مطلقا.

وفي حاشية ملتقى الابحر (۲/۲۳۲): العمامة سنة نبوية شريفة غفل عنها كثير من العلماء بل زهدوا حتى في تغطية الرأس مما ليس من شعار الكفرة وقد قال علي القاريؒ ان رسول الله ﷺ ماصلى حاسر الرأس الا في احرامه.

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾

(سنن اور نفل نمازوں کا بیان)

(۲۲۳) سنتوں کو اذان سے پہلے پڑھ لینے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی اذان سے قبل چار سنتیں پڑھنا کیسا ہے چاہے بعض مساجد میں اذان ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یہ سنتیں وقت کی تابع ہیں یا اذان کے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اذان شریعت میں فرض نماز کیلئے مشروع ہوئی ہے اور یہ نماز کے دخول وقت کی علامت ہے۔ البتہ نوافل اور سنتیں فرائض کے تابع ہیں۔ لہٰذا ان کو فرض نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ ابھی اذان نہ ہوئی ہو۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۸۴): (و) سببه (بقاء دخولِ الوقت، وهو سنة) للرجال فی مکان عال (مؤکدة) هی کالواجب فی لحوق الاثم (للفرائض) الخمس (فی وقتها ولو قضاء) لأنه سنة للصلاة حتی یبرد به لا للوقت (لا) یسن (لغیرها) کعید.

(۲۲۴) صبح صادق کے بعد ''نفل'' سنت فجر شمار ہوگی

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تہجد کی نیت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ صبح صادق طلوع ہوگئی ہے تو کیا یہ دو رکعت سنت فجر سے کفایت کرے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر کوئی شخص تہجد کی نفل کی نیت کر کے نماز شروع کر دے بعد میں معلوم ہو جائے کہ صبح صادق طلوع ہو چکی ہے تو یہ دو رکعت فجر کی سنت ہی شمار ہوگی۔

لمافی الهندیة (۱/۱۱۲): لو صلی رکعتین وهو یظن أن اللیل باق فاذا تبین أن الفجر قد کان طلع ..... قال المتأخرون یجزیه عن رکعتی الفجر ذکر الشیخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانی فی شرح کتاب الصلاة ظاهر الجواب أنه یجزیه عن رکعتی الفجر لان الاداء حصل فی الوقت.

(۲۲۵) اگر جماعت کھڑی ہو چکی ہو تو سنت فجر کب پڑھی جائے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں اور امام نماز پڑھا رہا

ہوتو بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کسی طرح یہ یقین یا ظن غالب ہو جائے کہ ایک رکعت جماعت سے مل جائے گی تو پھر فجر کی سنتوں کو پڑھ لینا چاہیے اور بعض فرماتے ہیں کہ اگر تشہد ہی مل جانے کی امید ہو تو پھر بھی پڑھ لینا چاہیے۔سوال یہ ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے کونسا قول راجح ہے تاکہ اس پر عمل کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......آپ کے ذکر کردہ اقوال میں دوسرا قول راجح ہے یعنی اگر مقتدی کو صرف تشہد مل جانے کی امید ہو، تب بھی فجر کی سنتیں پڑھ لینی چاہئیں نیز اس صورت میں اس کو دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں گی، سنت فجر کی بھی اور جماعت کی بھی لہٰذا یہی بہتر ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۲۰): ولم يذكر في الكتاب أنه ان كان يرجو ادراک القعدة كيف يفعل فظاهر ما ذكر في الكتاب أنه ان خاف أن تفوته الركعتان يدل على أنه يدخل مع الامام وحكى عن الفقيه أبي جعفرؒ أنه قال على قول أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ يصلي ركعتي الفجر لأن ادراک التشهد عندهما كادراک الركعة كذا في الكفاية.

وفي الشامية(۲/۵۶): (وقيل التشهد) أي اذا رجا ادراک الامام في التشهد لايتركها بل يصليها وان علم أن تفوته الركعتان معه ...... قلت: لكن قواه في فتح القدير بما سيأتي من أن من ادرک ركعة من الظهر مثلا فقد أدرک فضل الجماعة وأحرز ثوابها كما نص عليه محمد وفاقا لصاحبيه وكذا لو ادرک التشهد يكون مدركا لفضيلتها على قولهم قال: وهذا يعكر على ماقيل إنه لورجا ادراک التشهد لايأتي بسنة الفجر على قولِ محمدؒ والحق خلافه لنص محمد على ما يناقضه أي لان المدار هنا على ادراک فضل الجماعة وقد اتفقوا على ادراكه بادراک التشهد فيأتي بالسنة اتفاقا كما أوضحه في الشرنبلالية ايضا وأقره في شرح المنية الخ.

(۲۲۶) فجر کی سنت کس وقت چھوڑ سکتا ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی سنتیں کس وقت چھوڑنا جائز ہے نیز اگر مقتدی کو معلوم نہ ہو کہ کونسی رکعت ہے تو اس وقت سنت چھوڑنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......فجر کی سنت اس وقت چھوڑ سکتا ہے جبکہ فرض کی دونوں رکعات فوت ہو جانے کا خدشہ ہو، اور اگر یہ یقین ہو کہ امام کے ساتھ تشہد میں شریک ہو سکتا ہوں تو سنت چھوڑنا درست نہیں ہے۔

لمافي التاتارخانية(۱/۶۴۷): اذا كان يرجوا دراک القعدة مع الامام صريحا انه يشتغل بركعتي الفجر: واشار الى انه يدخل مع الامام فانه قال: اذا خشي ان تفوته الركعتان مع الامام دخل في صلاة الامام وبه اخذ بعض المشايخ...... ومنهم من قال على قياس قول ابي حنيفة و ابي يوسف رحمهما

الله يجب ان يشتغل بركعتي الفجر اذا كان يرجوادراك الامام في التشهد.

وفي حلبي كبير (صـ۳۹۷): بخلاف سنة الفجر الفجر فانه يجوز اداؤها اذا علم انه يدركه في التشهد عندهما وعند محمد اذا علم انه يدرك الركعة الثانية.

(۲۲۷) سنتِ فجر کی قضاء نہیں ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کارخانے میں ملازمت کرتا ہوں اللہ کے فضل سے نمازوں کی پابندی کرتا ہوں کبھی میری صبح جلدی آنکھ نہیں کھلتی جس کی وجہ سے صبح کی سنت رہ جاتی ہیں دن میں مصروفیت کی وجہ سے قضا بھی نہیں کر پاتا تو کیا صبح کے فرائض کے فوراً بعد میرے لیے سنت پڑھنے کی گنجائش ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سنت فجر کی احادیث میں بہت تاکید وارد ہوئی ہے، اور سنن نماز میں سب سے زیادہ مؤکد سنت ہے۔اس لیے سنتِ فجر کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔اگر امام کے ساتھ تشہد ملنے کی امید ہو، اور جماعت فوت ہونے کا خوف نہ ہوتو سنت ادا کر کے جماعت میں شامل ہونا چاہیے، تاہم اگر کبھی سنت فجر قضاء ہوجائے تو اصولی طور پر سنت کی قضاء نہیں ہے۔البتہ سنت فجر کی تاکید بہت زیادہ وارد ہونے کی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر سنت فجر فرض کے ساتھ رہ جائے تو طلوع آفتاب کے بعد زوال سے پہلے پہلے اس کی قضا فرض کے تابع ہوکر درست ہوگی۔اور بعد از زوال صرف فرض کی قضاء ہوگی۔سنت کی قضاء ساقط ہوجائے گی۔

لمافي الهندية(۱/۵۳): ومنها ما بعد صلاة الفجر قبل طلوع الشمس هكذا في النهاية والكفاية ولو افسد سنة الفجر ثم قضاها بعد صلوة الفجر لم يجزه الخ.

(۱/۱۱۲)اقوى السنن ركعتا الفجر...... والسنن اذا فاتت عن وقتها لم يقضها الا ركعتي الفجر اذا فاتتا مع الفرض يقضيهما بعد طلوع الشمس الى وقت الزوال ثم يسقط هكذا في محيط السرخسي وهو الصحيح هكذا في البحر الرائق، واذا فاتتا بدون الفرض لايقضي عندهما خلافا لمحمد رحمه الله تعالىٰ

وفي المراقي(صـ۳۱۴): ركعتان قبل صلوة الفجر وهي اقوى السنن، وفي حاشية الطحطاوي (صـ۳۱۵) لكثرة ما ورد فيها من المرغبات ...... وتقضىٰ اذا فاتت مع الفرض دون غيرها الخ.

وفي الشامية على الدر المختار(۲/۱۴): والسنن آكدها سنة الفجر اتفاقاً،فيه ايضاً(صـ۱۵) ولا يجوز تركها لعالم صار مرجعاً في الفتاوىٰ ...... وتقضى اذا فاتت معه.

وفي الشامية تحته: (قوله فله تركها الخ) الظاهر ان معناه انه يتركها وقت اشتغاله بالافتاء ...... وظاهر التفرقة بين سنة الفجر وغيرها، انه ليس له ترك الجماعة لانها من الشعائر فهي آكد من سنة الفجر

ولذا یتر کھا لو خاف فوت الجماعۃ.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ وتقضیٰ) ای الی قبیل الزوال وقولہ معہ تنازعہ قولہ تقضی وفاتت فلا تقضی الامعہ حیث فات وقتھا، أما اذا فاتت وحدھا فلا تقضی ولا تقضی قبل الطلوع ولا بعد الزوال ولو تبعاً علی الصحیح.

(۲۲۸) ظہر اور جمعہ سے پہلے کی سنتوں کی قضاء کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اردو فتاویٰ کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا۔ اس میں جمعہ کی سنت قبلیہ کے بارے میں لکھا تھا کہ اگر یہ کسی عذر کی بناء پر نماز جمعہ پڑھنے سے پہلے کوئی نہ پڑھ سکا تو وہ ساقط ہو جائیں گی۔ ان کی قضاء نہیں۔ اس لئے کہ اس بارے میں کوئی نص وارد نہیں۔ اور ظہر کی سنت قبلیہ فوت ہونے کی صورت میں قضاء کرنے کے بارے میں روایت سے صراحت ثابت ہے۔ جبکہ بعض دوسرے فتاویٰ میں قضاء کرنے کی ترتیب لکھی ہے کہ جمعہ کے فرض پڑھنے کے بعد پہلے چار سنتیں پڑھ لے پھر وہ شروع والی فوت شدہ چار سنتیں پڑھ لے۔ جبکہ شروع میں بندہ نے خود اس پہلے قول کے مطابق عمل شروع کیا۔ اب دوسرے فتاویٰ دیکھنے سے تردد میں پڑ گیا۔ کیونکہ دوسرے قول سے قضاء کرنا معلوم ہوتا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ قول راجح اور مفتی بہ کی طرف رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً.....فقہاء کرام کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نماز کا قضا کرنا فرض یا واجب کے ساتھ مختص ہے۔ اس لئے اگر سنن اپنے محل سے فوت ہو جائیں تو ان کی قضاء نہیں ہے۔ تاہم صبح کی سنتیں زوال تک تبعاً للفرض قضاء کرنا درست ہے اسی طرح اگر کوئی شخص ظہر سے قبل کی چار رکعت سنت جماعت سے پہلے نہ پڑھ سکے تو جماعت کے بعد ان کی قضاء درست ہے۔ ان دو وقت کی سنتوں کو نص کی وجہ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، جمعہ سے قبل کی سنتوں کے متعلق بھی بعض فقہاء کی یہی رائے ہے چنانچہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وحکم الاربع قبل الجمعۃ کالاربع قبل الظھر" بعض دوسرے فقہاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب وہ اپنے وقت سے فوت ہو جائیں تو جمعہ پڑھنے کے بعد نہیں پڑھی جائیں گی۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ ظہر کی سنتوں کی قضاء کے بارے میں نص موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "کان رسول اللہ ﷺ اذا فاتتہ الاربع قبل الظھر صلاھا بعد الرکعتین بعد الظھر" (ابن ماجہ، ص ۸۰) "یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جاتیں تو ان کو ظہر کے بعد کی دو رکعتوں کے بعد پڑھتے تھے" جبکہ جمعہ سے قبل کی سنتوں کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے کہ وہ جمعہ کے بعد پڑھی گئی ہیں اور سنتوں میں اصل یہ ہے کہ ان کی قضاء نہ کی جائے اس لئے جمعہ سے پہلے کی سنتیں اگر فوت ہو جائیں تو نماز جمعہ پڑھنے کے بعد ان کی قضاء نہ کی جائے لہٰذا جن مفتیان کرام نے قضاء کا فتویٰ دیا ہے انہوں نے ظہر سے قبل کی چار سنتوں پر قیاس کیا ہے اور بعض فقہاء کرام کا یہ قول بھی ہے اور جن حضرات نے عدم قضاء کا فتویٰ دیا ہے انہوں نے اصول کو پیش نظر رکھا ہے البتہ احتیاط اس میں ہے کہ پڑھ لی جائیں۔

لمافی البحر الرائق(۲/۷۵):(وقضی التی قبل الظهر فی وقته قبل شفعه) بیان لشیئین احدهما القضاء والثانی محله اما الاول ففیه اختلاف والصحیح انها تقضی کما ذکره قاضیخان فی شرحه مستدلا بما عن عائشة ان النبی ﷺ کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر قضاهن بعده وظاهر کلام المصنف انها سنة لا نفل مطلق الی ان قال وحکم الاربع قبل الجمعة کالاربع قبل الظهر کما لا یخفی.

وفی الدرالمختار(۲/۵۷،۵۸): ولا یقضیها الا بطریق التبعیة لقضاء فرضها قبل الزوال لا بعده فی الاصح لورود الخبر بقضائها فی الوقت المهمل، بخلاف القیاس فغیره علیه لا یقاس بخلاف سنة الظهر وکذا الجمعة فانه ان خاف فوت رکعة یترکها ویقتدی ثم یاتی بها علی انها سنة فی وقته ای الظهر،

وفی الشامیة تحته: (قوله وکذا الجمعة) ای حکم الاربع قبل الجمعة کالاربع قبل الظهر کما لا یخفی بحر، وظاهره انه لم یره فی البحر منقولا صریحاً وقد ذکره القهستانی لکن لم یعزه الی احد، وذکر السراج الحانوتی ان هذا مقتضی مافی المتون وغیرها لکن قال فی روضة العلماء انها تسقط لما روی انه علیه الصلاة والسلام قال "اذا خرج الامام فلا صلاة الا المکتوبة" اقول وفی هذا الاستدلال نظر لانه انما یدل علی انها لا تصلی بعد خروجه لاعلی انها تسقط بالکلیه ولا تقضی بعد الفراغ من المکتوبة والالزم ان لا تقضی سنة الظهر ایضاً. فانه ورد فی حدیث مسلم وغیره اذا اقیمت الصلوٰة فلا صلاة الا المکتوبة نعم قد یستدل للفرق بینهما بشی اخر وهو ان القیاس فی السنن عدم القضاء کمامر وقد استدل قاضیخان لقضاء سنة الظهر بما عن عائشة رضی الله عنها "ان النبی ﷺ کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر قضاهن بعده" فیکون قضاؤها ثبت بالحدیث علی خلاف القیاس کمافی سنة الفجر، کماصرح به فی الفتح فالقول بقضاء سنة الجمعة یحتاج الی دلیل خاص، وعلیه فتنصیص المتون علی سنة الظهر دلیل علی ان سنة الجمعة لیست کذالک فتأمل.

(۲۲۹) تحیۃ المسجد سنتوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتی

سوال.....کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ اگرکوئی ظہریاجمعہ کی چاررکعات،فرضوں سے پہلے نہ پڑھ سکےتو آیافرضوں کے بعدکی دوسنتوں کے بعد پڑھے گایاپہلے؟اسیطرح اگرکوئی شخص ظہرکی چاررکعات کی جگہ تحیۃ المسجد پڑھ لےتو یہ سنتوں کے قائم مقام ہوجائینگی؟

الجواب حامداًومصلیاً۔ صورت مسئولہ میں تحیۃ المسجد پڑھنا سنتوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتا اسی طرح اگرچاررکعات سنتیں فرضوں سے پہلے رہ جائیں توانکوفرضوں کے بعدادا کیاجائیگاالبتہ دوسنتوں کے بعدادا کرنا بہتر ہے۔

لمافی الشامیة(۲/۵۹): قوله وبه یفتی (اقول وعلیه المتون لکن رجح فی فتح القدیر تقدیم الرکعتین وقال وفی الامداد، فی فتاوی العتابی أنه المختار، وفی مبسوط شیخ الاسلام أنه الاصح لحدیث عائشة (انه علیه الصلاة والسلام کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر یصلیهن بعد الرکعتین) وهو قول الامام الاعظم ابی حنیفة رحمه الله تعالی.

(۲۳۰) فجر، ظہر اور عصر کی سنتوں کا فرض کے بعد پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ اگر کسی شخص کی فجر کی سنتیں رہ جائیں اور وہ فرض باجماعت پڑھ لے تو یہ سنتیں بعد میں پڑھی جاسکتی ہیں یا نہیں، اگر ادا کی جاسکتی ہیں تو کب تک؟ نیز ظہر، عصر کی چار رکعات جو پہلے ادا کی جاتی ہیں اگر ادا نہ ہوسکیں تو انہیں بعد میں ادا کیا جاسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر کسی کی فجر کی سنتیں رہ جائیں تو وہ طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک انکی قضا کرسکتا ہے اسی طرح اگر ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں تو انکو ظہر کے وقت میں پڑھ سکتا ہے البتہ اگر عصر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں تو انہیں ادا نہیں کریگا کیونکہ عصر کی نماز کے بعد نوافل مکروہ ہیں۔

لمافی الشامیة(۲/۵۷): (قوله ولا یقضیها الا بطریق التبعیة الخ) ای لا یقضی سنة الفجر الا اذا فاتت مع الفجر فیقضیها تبعا لقضائه لو قبل الزوال واما اذا فاتت وحدها فلا تقضی قبل طلوع الشمس بالاجماع لکراهة النفل بعد الصبح واما بعد طلوع الشمس فکذلک عندهما وعند محمدؒ احب الیّ ان یقضیها إلی الزوال کمافی الدرر، قیل هذا قریب من الاتفاق.

وفی الدر المختار(۲/۵۸): (بخلاف سنة الظهر) وکذا الجمعة (فإنه) إن خاف فوت رکعة (یترکها) ویقتدی (ثم یأتی بها) علی أنها سنة (فی وقته) ای الظهر (قبل شفعه) عند محمد وبه یفتی

وفی الشامیة تحته: (قوله فی وقته) فلا تقضی بعده لا تبعا ولا مقصودا بخلاف سنة الفجر.

وفی الشامیة (۱/۳۷۵): (قوله بعد صلوة فجر وعصر) متعلق بقوله وکره ای وکره نفل الخ بعد صلاة فجر وعصر أی إلی ما قبیل الطلوع والتغیر الخ.

(۲۳۱) سنتوں کی تیسری رکعت میں خطبہ شروع ہوجائے تو کیا کرے

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے چار رکعت سنتیں پڑھ رہا تھا۔ جب وہ تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوگیا، تو امام صاحب نے خطبہ شروع کیا۔ تو اس نے فوراً قعدہ کی طرف واپس آکر سجدہ سہو

کر کے سلام پھیر دیا۔ تو ایک مولوی صاحب اس کے قریب کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا تو بعد میں اس سے کہا۔ ایسی صورت میں آپ پر سجدہ سہو واجب نہیں ہے کیونکہ یہاں آپ سے سہو نہیں ہوا تھا بلکہ یہ تو شریعت کی طرف سے آپ کو حکم ہے۔ تو کیا مولوی صاحب کی یہ بات صحیح ہے یا ایسے آدمی پر سجدہ سہو لازم ہوگا؟ دلائل کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......کوئی شخص جمعہ کے دن چار رکعت سنتیں پڑھ رہا ہو، اسی دوران خطبہ شروع ہو جائے تو اگر وہ ایک رکعت پڑھ چکا ہے تو دوسری رکعت ملا کر دو رکعت مکمل کر کے سلام پھیر دے اگر تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوگیا تو اس صورت میں چار رکعت پوری پڑھنا لازم ہے۔ لہٰذا مذکورہ شخص کو چار رکعت سنت پوری کرنی چاہیے تھی جو کہ اس نے پوری نہیں کی اس لئے اس کے ذمے اس کی قضاء لازم ہوگی۔

لمافی المحیط البرھانی(۲/۲۶۴): وان افتتح الصلاۃ بعد ما خرج الامام خففها و اتمها قال الشیخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانیؒ ابهم الجواب فی الاصل فسره فی النوادر فقال ان کان صلی رکعة اضاف الیها اخری وسلم وان کان نوی اربعا عند التکبیر فان قید الثالثة بالسجدة اضاف الیها الرابعة وسلم وخفف القراء ة فیها فیقرأ بفاتحة الکتاب وسورة قصیرة وان کان له ورد فی القراء ة ترک الورد فی هذه الصورة واذا لم یقید الثالثة بالسجدة ماذا یصنع؟ لم یذکر هذا الفصل فی النوادر والمتاخرون فی هذا علی قولین منهم من قال یمضی فیها ویتمها اربعا ویخفف القراء ة ومنهم من قال یعود الی القعدة وکان هذا القائل قاس هذه السئلة بمسألة باب الحدث.

وفی الشامیة (۲/۱۶):(قوله ولا یصلی الخ) أقول قال فی البحر فی باب صفة الصلاة: إن ما ذکر مسلم فیما قبل الظهر، لما صرحوا به من أنه لا تبطل شفعة الشفیع بالانتقال إلی الشفع الثانی منها ولو أفسدها قضی أربعا الخ.

وفی الدر المختار(۲/۱۵۸): (اذا خرج الامام) من الحجرة ان کان والا فقیامه للصعود شرح المجمع (فلا صلاة ولا کلام الی تمامها) وان کان فیها ذکر الظلمة فی الاصح (خلا قضاء فائتة لم یسقط الترتیب بینها وبین الوقتیة) فانها لاتکره سراج وغیره لضرورة صحة الجمعة والا لا ولو خرج وهو فی السنة او بعد قیامه لثالثة النفل یتم فی الاصح ویخفف القراء ة.

وفی الشامیة (۲/۱۵۹): عزاه فی البحر الی الولوالجیة والمبتغی ولم یذکر مسئلة النفل فی الشرنبلالیة عن الصغریٰ وعلیه الفتوی. قال فی البحر وما فی الفتح من أنه لو خرج وهو فی السنة یقطع علی رأس رکعتین ضعیف و عزاه قاضیخان الی النوادر.

(۲۳۲) شرعی سفر میں سنت ونوافل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر سفر پر جانا ہوتا ہے تو مجھ پر فرائض کے علاوہ سفر کے دوران سنتیں اور نوافل بھی پڑھنا ضروری ہے یا صرف فرائض پر اکتفاء کرنا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......شرعی سفر میں گاڑی وغیرہ کے نکلنے کا خوف ہو، یا جلدی ہو یا حالتِ سیر (یعنی چلنے کی حالت) ہو تو پھر صرف فرائض کی ادائیگی کافی ہے۔ اور اگر حالتِ نزول (یعنی ٹھہرنے کی حالت) اور امن ہو، جلدی بھی نہ ہو تو اس حالت میں سنت مؤکدہ کا حکم وہی ہے جو حالتِ اقامت میں ہے۔ البتہ سنن غیر مؤکدہ اور نوافل پڑھ لینا افضل ہے۔

وفی الهندية (۱/۱۳۹): وبعضهم جوزوا للمسافر ترک السنن والمختار انه لایاتی بها فی حال الخوف ویاتی بها فی حال القرار والامن.

وفی الدرالمختار (۲/۱۳۱): (ویاتی) المسافر (بالسنن) ان کان (فی حال امن وقرار والا) بان کان فی خوف وفرار (لا) یاتی بها هو المختار لانه ترک لعذر، تجنیس، قیل الا سنة الفجر.

وفی الشامية تحته: (قوله ویاتی المسافر بالسنن) ای الرواتب...... (قوله هو المختار) وقیل الافضل الترک ترخیصا، وقیل الفعل تقربا. وقال الهندوانی: الفعل حال النزول والترک حال السیر...... قلت: والظاهر ان مافی المتن هو هذا وان المراد بالامن والقرار النزول وبالخوف والفرار السیر لکن قدمنا فی فصل القراءة أنه عبر عن الفرار بالعجلة لانها فی السفر تکون غالبا من الخوف تامل.

(۲۳۳) سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ماموں کے گھر کے پاس جو مسجد ہے اس میں ہر نماز کے بعد خصوصاً جن نمازوں کے بعد سنتیں وغیرہ پڑھی جاتی ہیں۔ ان نمازوں میں امام صاحب سنتوں سے فارغ ہو کر اجتماعی دعا کرواتے ہیں اور سب لوگ ان کے ساتھ شریک ہو کر آمین آواز بلند کہتے ہیں، آنجناب سے اسی مسئلہ کے متعلق یہ معلوم کرنا تھا کہ سنتوں کے بعد اس طرح اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کا مروجہ طریقہ کہ امام آواز بلند دعا کرتا ہے اور سارے مقتدی آمین کہتے ہیں اور بعض جگہ اس کو واجب اور اتنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اگر امام سے دعا میں تاخیر ہو جائے تو اس پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے اور اس کے نہ کرنے والے پر ملامت کی جاتی ہے یہ بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا شرعاً سنتوں کے بعد دعا کا اس طرح التزام درست نہیں اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

لما فی اعلاء السنن (۲۰۵/۳): ورحم الله طائفة من المبتدعة فی بعض اقطار الهند حيث واظبوا على ان الامام ومن معه يقومون بعد المكتوبة بعد قرائتهم اللهم انت السلام ومنك السلام الخ. ثم اذا فرغوا من فعل السنن والنوافل يدعوا الامام عقب الفاتحة جهراً بدعاء مرة ثانيةً والمقتدون يؤمنون على ذلك وقد جرى العمل منهم بذلك على سبيل الالتزام والدوام حتى ان بعض العوام اعتقدوا ان الدعاء بعد السنن والنوافل باجتماع الامام والمأمومين ضروري واجب حتى انهم اذا وجدوا من الامام تاخيراً لاجل اشتغاله بطويل السنن والنوافل اعترضوا عليه قائلين: انا منتظرون للدعاء ثانياً وهو يطيل صلاته وحتى ان متولى المساجد يجبرون الامام الموظف على ترويج هذا الدعاء المذكور بعد السنن والنوافل على سبيل الالتزام ومن لم يرض بذلك يعزلونه عن الامامة ويطعنونه ولا يصلون خلف من لايصنع بمثل صنيعهم، وايم الله! ان هذا امر محدث فی الدين...... وايضاً ففى ذلك من الحرج مالا يخفى وايضاً فقد مرّ ان المندوب ينقلب مكروهاً اذا رفع عن رتبته لأن التيمن مستحب فى كل شئ من امور العباداة لكن لماخشى ابن مسعودؓ ان يعتقدوا وجوبه اشار الى كراهته. فكيف بمن اصرّ على بدعة اومنكر؟...... كان ذلك بدعة فى الدين محرمة...... (وفى ص ۲۰۷) ويستحب ان يستقبل بعده اى بعد التطوع الناس ويستغفرون الله ثلاثاً...... ثم يدعون لانفسهم وللمسلمين رافعى ايدهم الخ فانه لادلالة فيه على قراءة كل ذلك والدعاء بعدهامجتمعين.

وفى مرقاة المفاتيح (۲۶/۳): وقال الطيبى: وفيه ان من اصر على امر مندوب وجعله عزماً ولم يعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشيطان من الاضلال فكيف من اصر على بدعة او منكر.

(۲۳۴) دن ورات میں نفل نمازیں، ان کی تعدادِ رکعات اوران کےاوقات کا بیان

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مزدور آدمی ہوں اور پہلے نمازوں میں بہت کوتاہی کرتا تھا اب ایک دوست کی دعوت پر تبلیغ میں ایک چلہ لگایا جس سے زندگی میں کافی تبدیلی رونما ہوئی چنانچہ اب پنج وقتہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا ہوں اور چلہ کے دوران امیر صاحب نے دو نفل نمازیں بتائی تھیں، اشراق اور تہجد اس کے پڑھنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ فرض نمازوں کے علاوہ دن رات میں کتنی نفل نمازیں ہوتی ہیں اوران کے کیا اوقات ہیں اور کتنی کتنی رکعات ادا کی جاتی ہیں؟ جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً...... دن ورات میں فرض نمازوں کے علاوہ آپ نفل نمازیں جتنی چاہیں پڑھ سکتے ہیں ان کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے بشرطیکہ مکروہ وقت نہ ہو البتہ چند نفل نمازیں مخصوص ہیں ان میں:

(۱)۔نماز تہجد ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں ہیں اس کا وقت نصف شب کے بعد شروع ہوتا ہے (سویا ہو یا نہ سویا ہو، ہاں سو کر اٹھنے کے بعد پڑھنا بہتر ہے) صبح صادق تک رہتا ہے۔

(۲)۔اشراق کی نماز ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار رکعتیں ہیں اس کا وقت طلوعِ آفتاب ہونے کے بعد احتیاطاً پندرہ منٹ بعد شروع ہوتا ہے اور چاشت کی نماز تک رہتا ہے۔

(۳)۔چاشت کی نماز ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ہیں اس کا وقت بھی مکروہ وقت کے بعد سے شروع ہو کر زوال تک رہتا ہے لیکن افضل ومختار یہ ہے کہ ایک چوتھائی دن گزرنے کے بعد پڑھی جائیں۔

(۴)۔زوال کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعت

(۵)۔عصر کی فرض نماز پڑھنے سے پہلے چار رکعت

(۶)۔مغرب کی سنتیں پڑھنے کے بعد اوابین کی چھ رکعت

(۷)۔عشاء کی فرض نماز پڑھنے سے پہلے چار رکعت

(۸)۔صلوۃ التسبیح کی چار رکعت روزانہ دن میں مکروہ وقت کے علاوہ اور رات میں جب بھی پڑھ لی جائیں وگرنہ ہفتے یا مہینے یا سال یا زندگی میں ایک مرتبہ پڑھ لی جائیں۔

(۹)۔دو رکعت تحیۃ الوضو

(۱۰)۔دو رکعت تحیۃ المسجد

(۱۱)۔عشاء کے بعد صلوۃ التوبہ دو رکعت

(۱۲)۔صلوۃ الحاجات دو رکعت

(۱۳)۔دو رکعت صلوۃ الاستخارہ

لما فی الهندية(۱/۱۱۲): ومن المندوبات صلوة الضحیٰ واقلها رکعتان واکثرها ثنتا عشرة رکعة ووقتها من ارتفاع الشمس الی زوالها.

وفی الدر المختار(۲/۲۲): وندب اربع فصاعدا فی الضحیٰ علی الصحيح من بعد الطلوع الی الزوال ووقتها المختار بعد ربع النهار وفی المنية اقلها رکعتان واکثرها اثنی عشر واوسطها ثمان وهو افضلها کما فی الذخائر الاشرفية الخ.

وفی الهندية (۱/۱۱۲): وندب الاربع قبل العصر والعشاء وبعدها والست بعد المغرب کذا فی الکنز...... ومنها (ای المندوبات) تحية المسجد وهی رکعتان ومنها رکعتان عقب الوضوء ومنها صلاة الاستخارة وهی رکعتان ومنها صلاة الحاجة وهی رکعتان .... واما صلوة التسبيح فذکرها فی

الملتقط يكبر ويقرأ الثناء ثم يقول سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر خمس عشرة الخ.

وفي الدر المختار (۲/۱۳): ويستحب اربع قبل العصر وقبل العشاء وبعدها بتسليمة ...... وست بعد المغرب ليكتب من الاوابين بتسليمة اوثنتين او ثلاث والاول ادوم واشق.

وفي الشامية تحته: (قوله من الاوابين) جمع اواب: اى رجاع الى الله تعالىٰ بالتوبة والاستغفار (قوله بتسليمة اوثنتين او ثلاث) جزم بالاول في الدرر، وبالثاني في الغزنوية و بالثالث في التجنيس كمافي الامداد لكن الذى في الغزنوية مافي التجنيس ...... فكان المستحب فيه ثلاث تسليمات ليكون على نسق واحد قال هذا ماظهرلى ولم اره لغيرى.

وفي الشامية (۱/۳۷۳): واعلم ان الاوقات المكروهة نوعان الاول الشروق والاستواء والغروب والثاني مابين الفجر والشمس وما بين صلوة العصر الى الاصفرار: فالنوع الاول لاينعقد فيه شئ من الصلوات التي ذكرناها اذا شرع بها فيه وتبطل ان طرأ عليها الا صلاة جنازة حضرت فيها وسجدة تليت آيتها فيها وعصر يومه والنفل والنذر المقيدبها وقضاء ماشرع به فيها ثم افسده فتنعقد هذه الستة بلا كراهة اصلا في الاولى منها ومع الكراهة التنزيهية في الثانية والتحريمية في الثالثة وكذا في البواقي لكن مع وجوب القطع والقضاء في وقت غير مكروه: والنوع الثاني ينعقد فيه جميع الصلوات التي ذكرناها من غير كراهة الاالنفل والواجب لغيره فانه ينعقد مع الكراهة فيجب القطع والقضاء في وقت غير مكروه اهـ.

وفي الدر المختار (۲/۲۴): وصلاة الليل واقلها على مافي الجوهرة ثمان ولو جعله اثلاثا فالاوسط افضل ولو انصافا فالاخير افضل

وفي الشامية تحته: (قوله ولو جعله اثلاثا الخ) اى لو اراد ان يقوم ثلثة وينام ثلثيه فالثلث الاوسط افضل من طرفيه لان الغفلة فيه اتم والعبادة فيه اثقل ولو اراد ان يقوم نصفه وينام نصفه فقيام نصفه الاخير افضل لقلة المعاصي فيه غالبا الخ.

(۲۳۵) میت کیلئے بطور ایصالِ ثواب نوافل پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے ان کے جو کپڑے وغیرہ ہیں یہ کپڑے کن کو دینا جائز ہیں مؤذن یا مدرسہ میں اور ان کیلئے نوافل پڑھی جائے تو اس کی کیا نیت ہوگی؟

(۲)۔جس وقت یہ نوافل پڑھی جاتی ہے تو اسی وقت کی نسبت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......(۱)۔آپ کے والدصاحب کے کپڑے ان کے ترکے میں شامل ہوں گے یہ تمام ورثاء کی ملکیت ہوں گے البتہ اگر سب ورثاء اپنی رضامندی سے کسی ضرورت مند کو صدقہ کردیں تو درست ہے بشرطیکہ ورثاء میں کوئی نابالغ نہ ہو۔

(۲)۔عام نفل کی طرح نیت کر کے میت کو ایصالِ ثواب کریں،اس وقت کی طرف منسوب کرنا ضروری نہیں،اس کے علاوہ کسی مدرسہ میں یا محتاج کو صدقہ وغیرہ کر کے بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته (۱/۷۷۲۶): التركة لغة مايتركه الشخص ويبقيه، واصطلاحاً عند الحنفية الاموال والحقوق المالية التی كان يملكها الميت فتشمل الاموال المادية من عقارات ومنقولات وديون على الغير ،والحقوق العينية التی ليست مالاً، ولكنها تقوم بمال أو تتصل به.

وفی الشامية (۲/۲۴۳): تنبيه: صرح علماؤنا فی باب الحج عن الغير بان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوماً أو صدقة أوغيرها كذا فی الهداية، بل فی زكاة التتارخانية عن المحيط: الافضل لمن يتصدق نفلاً أن ينوی لجميع المؤمنين والمؤمنات لانها تصل اليهم ولا ينقص من أجره شئ اهـ هو مذهب اهل السنة والجماعة.

وفی الدرالمختار (۱/۴۱۷): ولا عبرة بنية متأخرة عنها على المذهب وجوزه الكرخیؒ الى الركوع وكفى مطلق نية الصلاة وان لم يقل لله لنفل وسنة راتبة وتراويح على المعتمد اذ تعيينها بوقوعها وقت الشروع، والتعيين احوط، ولا بد من التعيين عند النية

وفی الشامية تحته:(قوله وكفى الخ) أی بان يقصد الصلوة بلا قيد نفل أو سنة أو عدد (قوله لنفل) هذا بالاتفاق.

(۲۳۶) نفل کی نیت سے فرض نماز پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دفعہ میں نے غلطی سے نفل کی نیت سے فرض نماز پڑھ لی تو اب میں کیا کروں،نماز کو دوبارہ لوٹادوں یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو،اور زبان سے تلفظ کرنا اگرچہ مستحسن ہے مگر نماز کے صحیح ہونے کیلئے شرط نہیں،اس لئے دل کے ارادے کا اعتبار ہوگا۔لہٰذا اگر نیت سے مقصود فرض نماز تھی لیکن غلطی سے زبان سے نفل نکل گیا تو اس سے نماز کی صحت میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ دل کے قصد کا اعتبار کر کے نماز کو درست کہا جائے گا۔

لمافی الهندية (۱/۶۵): (الفصل الرابع فی النية)النية ارادة الدخول فی الصلواة والشرط ان يعلم

بقلبه ای صلاة یصلی وادناها مالو سئل لامکنه ان یجیب علی البدیهة وان لم یقدر علی ان یجیب الابتامل لم تجز صلاته ولا عبرة للذکر باللسان.

وفی الشامیة (۱/۴۱۵): (قوله ان خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهواً اجزأه کما فی الزاهدی قهستانی.

(۲۳۷) سنت نماز یا دوگانہ نماز کے تحیۃ المسجد وتحیۃ الوضو کے قائم مقام ہونے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی چار سنتیں پڑھ کر مسجد میں جائے تو تحیۃ المسجد پڑھنا کیسا ہے؟ اور ان چار رکعت کے بعد تحیۃ الوضو پڑھنا کیسا ہے؟ اسی طرح تحیۃ الوضو وتحیۃ المسجد دونوں کی نیت کر کے صرف دو رکعت پر اکتفا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ظہر کی سنتیں پڑھ کر مسجد پہنچنے کے بعد اگر وقت باقی ہو تو تحیۃ المسجد پڑھنا درست ہے۔ تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضو دونوں کے لئے ایک نماز کافی ہے، بلکہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد جو بھی نماز پڑھی جائے گی تحیۃ المسجد ادا ہو جائے گی اسی طرح وضو کرنے کے بعد جو بھی نماز پڑھی جائے گی تحیۃ الوضو ادا ہو جائے گی۔

لمافی الدر المختار (۲/۲۲): (وندب رکعتان بعد الوضوء) یعنی قبل الجفاف، کما فی الشرنبلالیة عن المواهب.

وفی الشامیة تحته: (قوله وندب رکعتان بعد الوضو)..... وانظر هل تنوب عنهما صلاة غیرهما کالتحیة ام لا؟ ثم رأیت فی شرح لباب المناسک ان صلاة رکعتی الاحرام سنة مستقلة کصلاة استخارة وغیرها مما لا تنوب الفریضة منا بها بخلاف تحیة المسجد وشکر الوضوء فانه لیس لهما صلاة علی حدة کماحققه فی الحجة.

(۲۳۸) سنت اور نفل نماز گھر میں پڑھنا لازمی نہیں، بلکہ افضل ہے

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چار بھائی ہیں سب سے بڑا بھائی سعودیہ میں رہتا ہے اور سال، دو سال بعد گھر آتے ہیں حال ہی میں وہ سعودیہ سے آئے جب نماز کا وقت ہو گیا ہم مسجد چلے گئے جماعت سے فارغ ہو کر وہ گھر واپس آ گئے اور میں نے سنت اور نفل وہاں مسجد میں پڑھی جب میں گھر آیا تو اس نے مجھے تاکید کی کہ فرض نماز مسجد میں ادا کیا کریں اور باقی تمام سنت اور نوافل گھر پر ادا کیا کرو کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ اور اپنے گھروں میں نماز ادا کرو، لہٰذا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اپنے بھائی جان کی زبانی سنا تو میں بھی اسی پر عمل کرتا ہوں جس کا مجھے حکم ملا، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا سنت اور نفل نماز گھر پر پڑھنا لازمی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... سنت اور نفل نماز گھر پر پڑھنا لازمی نہیں بلکہ افضل ہے حدیث شریف میں ہے کہ ''آدمی کا سوائے فرض نمازوں کے باقی نمازیں گھر میں پڑھنا میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے'' بشرطیکہ سنت اور نفل پڑھنے کیلئے گھر لوٹ کر جانے سے نمازی کو کسی کام میں مشغول ہو جانے کا خوف نہ ہو، گھر میں نماز پڑھنے سے نمازی کے خشوع وخضوع میں کمی واقع ہونے کا خوف نہ ہو تو گھر میں پڑھنا افضل ہے ورنہ مسجد ہی میں پڑھنا چاہیے۔

لما فی اعلاء السنن(۶۵/۷): والامر للاستحباب لان الاجارة وردت فی التطوع فی المسجد ایضاً کما یدل علیه الحدیث الثانی من الباب وسیأتی تقریره قال المؤلف: النوافل التی فیها الجماعة مستثناة من هذا العموم، وکذلک تحیة المسجد للاحادیث التی وردت فیها.

قوله عن انس الخ' قال المؤلف دلالته علی الجزء الثانی من الباب کماقرره النووی ونصه: وفیه جواز النفل فی المسجد، فانها کانت تصلی النافلة فیه فلم ینکر علیها. (۲۶۶/۱)

وفی الهندیة(۱۱۳/۱): الافضل فی السنن والنوافل المنزل لقوله علیه السلام صلاة الرجل فی المنزل افضل الا المکتوبة الخ.

وذکر الحلوانی الافضل ان یؤدی کله فی البیت الا التراویح ومنهم من قال یجعل ذلک احیانا فی البیت والصحیح ان کل ذلک سواء فلا تختص الفضیلة بوجه دون وجه ولکن الافضل ما یکون ابعد من الریاء واجمع للاخلاص والخشوع کذا فی النهایة.

وفی الشامیة(۲۲/۲): (قوله والافضل فی النفل الخ) شمل ما بعد الفریضة وما قبلها، لحدیث الصحیحین "علیکم الصلاة فی بیوتکم فان خیر صلاة المرء فی بیته الا المکتوبة" واخرج ابو داؤد "صلاة المرء فی بیته افضل من صلاته فی مسجدی هذا الا المکتوبة" وتمامه فی شرح المنیة وحیث کان هذا افضل یراعی مالم یلزم منه خوف شغل عنها لو ذهب لبیته، او کان فی بیته ما یشغل باله ویقلل خشوعه فیصلیها حینئذ فی المسجد لان اعتبار الخشوع ارجح

(قوله غیر التراویح) ای لانها تقام بالجماعة ومحلها المسجد، واستثنی فی شرح المنیة ایضا تحیة المسجد وهو ظاهر.

(۲۳۹) نفل نماز میں قراءۃ سبعہ پڑھنے کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میں نے لاہور سے سبعہ قرأت مکمل پڑھ لی جس میں بعض تمیں قرأت شاذہ بتاتے ہیں بعض مشہورہ اور بعض متواترہ میرا ارادہ ہوا کہ ہر ایک قرأت میں نوافل میں ختم کروں لیکن مسائل

سے ناواقف ہوں میں نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ نیکی کے بجائے گناہ سر لوں، اس لئے آپ سے التماس ہے کہ میری رہنمائی فرمائیں کہ میں اس طرح پڑھ سکتا ہوں میری نماز میں تو کوئی خلل نہ آئے گا اس لئے کہ اگر ان کو نماز میں پڑھنا گناہ ہو، اس سے باز رہوں لیکن ساتھ ذہن میں خدشہ ہوتا ہے جب ان سے نماز فاسد ہوتی پھر ان کو پڑھنا کیسے جائز ہوگا قراء اس کی تعلیم بھی نہ دیں؟ اسی طرح قاری عاصم کوفی کے علاوہ دیگر ائمہ کی قرأت کو پڑھنا نماز میں کیسا ہے؟ جلد جواب عنایت فرمائیں بندہ اپنے معمولات شروع کرنے کیلئے آپ کے جواب کا منتظر ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... قراءۃ سبعہ نماز میں پڑھنا جائز ہے۔ البتہ جماعت کی نماز میں امام نہ پڑھے اور یہ کہ جماعت کی نماز میں عام لوگوں کا قرأت کے بارے میں تشویش میں پڑنے کا قوی اندیشہ ہے عام لوگ اس بارے میں جاہل ہوتے ہیں۔ ایک قرأت مشہورہ کے علاوہ دوسری قراءتوں کا ان کو پتہ ہی نہیں ہوتا۔ اگر وہ دوسری قرأت سنیں گے۔ تو بعض مرتبہ جہالت کی وجہ سے بعض لوگ اس کے قرأت ہونے کا انکار کر دیتے ہیں، یا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ عوام کو گناہ گار ہونے سے بچانے کیلئے جماعت کی نماز میں قرأت مشہورہ (روایت حفصؒ) میں تلاوت کرے۔ ہاں اگر دوسری قرأت پڑھنا چاہے تو نفل نماز میں پڑھ سکتے ہیں، ان قرأت کے پڑھانے میں کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ اس کے پڑھانے پر ان شاء اللہ تعالیٰ اجر وثواب ملے گا اور یہ قرأت سبعہ فصیح اور صحیح ہیں۔

لمافي الهندية (۱/۷۹): وفي الحجة قراءة القرآن بالقرا آت السبعة والروايات كلها جائزة ولكني أرى الصواب أن لا يقرأ القرأة العجيبة بالإمالات والروايات الغريبة.

وفي الدر المختار (۱/۵۴۱): ويجوز بالروايات السبع، لكن الأولى ان لا يقرأ بالغريبة عند العوام صيانةً لدينهم

وفي الشامية تحته: أي بالروايات الغريبة والإمالات، لأن بعض السفهاء يقولون مالا يعلمون فيقعون في الإثم والشقاء ولا ينبغي للأئمة أن يحملوا العوام على مافيه نقصان دينهم، ولا يقرأ عندهم مثل قراءة ابي جعفر وابن عامر وعلي بن حمزة والكسائي صيانة لدينهم فلعلهم يستخفون أو يضحكون وإن كان كل القراء ات والروايات صحيحة: فصيحة ومشائخنا اختاروا اقراء ة أبي عمرو حفص عن عاصم.

وفي حاشية الطحطاوي على الدر (۱/۲۳۶): (قوله ويجوز بالروايات السبع) لاوجه للتقييد بالسبع بل يجوز الى العشر كما نص عليه اهل الأصول (قوله صيانةً لدينهم) لأن بعض السفهاء ربما يقع في الإثم فلا يقرأ عند العوام بقراءة أبي جعفر وابن عامر وحمزة و الكسائي صيانةً لدينهم فربما يستخفون أو يضحكون وإن كانت كلها صحيحة فصيحة ومشائخنا اختار واقراء ة أبي عمرو وحفص عن ابن عامر أبو السعود عن شارح المنية.

(۲۴۰) بغیر عذر کے نوافل نہ پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری دلی خواہش تھی کہ میرا کوئی بیٹا عالم بن جائے تو میں نے ایک بیٹے کو پڑھنے کیلئے کراچی بھیج دیا وہ اس سال فراغت حاصل کر کے مفتی بن رہا ہے جب وہ گھر آتا ہے تو نمازوں کے وقت صرف فرائض وسنن پڑھ کر چلا جاتا ہے نوافل نہیں پڑھتا اور کہتا ہے نوافل لازمی نہیں ہیں پڑھو تو ثواب ہے نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیا واقعی اس کی بات صحیح ہے کہ نوافل لازم نہیں۔ اگر کوئی بغیر عذر کے نوافل چھوڑ دے تو گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نوافل اور مستحبات کی دین میں بڑی اہمیت ہے جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ روزِ قیامت فرائض کی کمی بیشی کو پورا فرمادیں گے اور ان میں سستی بھی نہیں کرنی چاہیے تاہم اگر کوئی نوافل کو بغیر عذر کے بھی ترک کرتا ہے تو وہ قابل عتاب اور مواخذہ نہیں۔ لہٰذا آپ کے بیٹے کی بات درست ہے۔

لمافي ردالمحتار (۱/۱۰۲): اعلم ان المشروعات اربعة اقسام، فرض وواجب وسنة ونفل فما كان فعله اولى من تركه مع منع الترك ان ثبت بدليل قطعي ففرض او بظني فواجب، وبلامنع الترك ان كان مما واظب عليه الرسول ﷺ أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة والا فمندوب ونفل والسنة نوعان: سنة الهدى، وتركها يوجب اساءة وكراهية كالجماعة والاذان والاقامة ونحوها. وسنة الزوائد وتركها لايوجب ذالک كسير النبي عليه الصلوٰة والسلام في لباسه وقيامه وقعوده، والنفل ومنه المندوب يثاب فاعله ولا يسيئی تاركه، قيل وهو دون سنن الزوائد.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۲/۱۰۵۵): "فصلاة التطوع: هي ما طلب فعلها من المكلف زيادة على الفرائض طلباً غير جازم، وتكمل به صلاة الفرض يوم القيامة، ان لم يكن المصلي اتمها، وفيه حديث صحيح مرفوع رواه احمد في المسند......

وحكمها: أنه يثاب على فعلها ولايعاقب على تركها".

(۲۴۱) اشراق اور چاشت ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک طالبعلم ہوں درجہ ثانیہ میں پڑھتا ہوں اللہ کے فضل سے تہجد، اشراق اور اوابین کا اہتمام کرتا ہوں لیکن پڑھائی کی وجہ سے چاشت ادا نہیں کر پاتا چونکہ اساتذہ کرام چھٹی نہیں دیتے اس جمعرات اپنے شیخ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا آپ چاشت کو اشراق کے ساتھ ادا کرلیا کرو۔ چونکہ وہ عالم نہیں ہیں اس لئے ان کی بات سے دل مطمئن نہیں ہوا، اب آپ حضرات میری رہنمائی کریں کہ اشراق اور چاشت ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اشراق اور چاشت دونوں ایک ہی نماز ہے، البتہ سورج نکلنے کے فوراً بعد جو نماز پڑھی جاتی ہے بعض حضرات نے اس کو اشراق کہا ہے۔ اور جو تھوڑی دیر بعد جبکہ سورج بلند ہو جائے پڑھی جاتی ہے اس کو چاشت کہا ہے۔ لہٰذا اشراق اور چاشت کو ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۱۲): (ومن المندوبات صلوة الضحى) واقلها ركعتان واكثرها ثنتا عشرة ركعة ووقتها من ارتفاع الشمس الى زوالها.

وفى الدر المختار (۲/۲۲): (و) ندب (اربع فصاعدا فى الضحى) على الصحيح من بعد الطلوع الى الزوال، ووقتها المختار بعد ربع النهار.

وفى الشامية تحته: (قوله من بعد الطلوع) عبارة شرح المنية من ارتفاع الشمس. (قوله ووقتها المختار) اى الذى يختار ويرجح لفعلها وهذاعزاه فى شرح المنية الى الحاوى، وقال: لحديث زيد بن ارقم ان رسول الله ﷺ قال ((صلاة الاوابين حين ترمض الفصال" رواه مسلم. وترمض بفتح التاء والميم اى تبرك من شدة الحر فى اخفافها اهـ.

(۲۴۲) کیا عورت اپنے گھر میں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے اس جمعرات کو ہمارے محلے کی مسجد میں بیان فرمایا جس کے اندر مرد اور خواتین کی اکثریت نے شرکت کی مولانا صاحب نے فرمایا کہ جب انسان مسجد آئے تو وضو کرنے کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ لے۔ اس کے انہوں نے کافی فضائل سنائے تو محلے کی عورتیں فضائل سن کر پڑھنے کو تیار ہو گئیں لیکن ان کو علم نہیں کہ عورتیں بھی تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟ یا صرف یہ نمازیں مردوں کیلئے ہیں۔ آپ حضرات صحیح رہنمائی فرمائیں کہ عورتیں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جس طرح مرد تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں۔ البتہ خوف وفتنہ کی وجہ سے عورت کا مسجد میں جانا ممنوع قرار دیا گیا ہے تو گھر میں جو جگہ نماز کیلئے مخصوص کی ہو جس طرح اس میں اعتکاف کیلئے بیٹھ سکتی ہے اسی طرح اگر اس جگہ میں تحیۃ المسجد بھی پڑھ لیں تو انشاء اللہ اجر ملے گا۔ اور تحیۃ الوضوء کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اس لئے عورت بھی تحیۃ الوضوء پڑھ سکتی ہے۔

لمافى مسند احمد (۷/۱۲۰): عن ام سلمة (رضى الله تعالىٰ عنها) عن رسول الله ﷺ أنه قال "خير مساجد النساء قعر بيوتهن".

وفى الهندية (۱/۱۱۲): (ومن المندوبات صلاة الضحى) الى ان قال (ومنها) تحية المسجد وهى

رکعتان (ومنها) رکعتان عقیب الوضوء.

وفی الدر المختار مع الشامیة(۱۸/۲، ۱۹): (ویسن تحیة) رب (المسجد وهی رکعتان وأداء الفرض) أو غیره وکذا دخوله بنیة فرض أو اقتداء وتکفیه لکل یوم مرة ولا تسقط بالجلوس عندنا بحر.

وفیه ایضاً(۲۲): (قوله وندب رکعتان بعد الوضوء) لحدیث مسلم "مامن أحد یتوضاء فیحسن الوضوء ویصلی رکعتین یقبل بقلبه ووجهه علیهما الا وجبت له الجنة" خزائن.

(۲۴۳) بیٹھ کر نوافل پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہو کر؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر پرانے وقت کے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ظہر کے بعد مغرب کے بعد اسی طرح عشاء کے بعد کے نوافل بیٹھ کر پڑھتے ہیں جب ان سے پوچھا جائے تو کہتے ہیں نوافل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی نوافل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے؟ کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے یا بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب برابر ملے گا؟ حالت صحت اور بیماری میں حکم یکساں ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نفل نماز میں شرعاً قاعدہ یہ ہے کہ عام حالات میں کھڑے ہو کر پڑھنے میں پورا ثواب ملتا ہے اور بغیر کسی عذر کے بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب کم ہوگا۔ اس کے برخلاف بیماری کی حالت میں آدمی کو اپنی عبادت کا پورا ثواب ملتا ہے۔ خواہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرے یا بیٹھ کر یا جس طرح ممکن ہو، اور اگر مریض تحمل مشقت کرتے ہوئے کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے تو ایسی صورت میں اس مریض کو مشقت برداشت کرنے پر جو کامل اجر وثواب ملے گا، اسی طرح کا مریض اگر رخصت پر عمل کرتے ہوئے بیٹھ کر نماز پڑھ لیتا ہے تو اس کو کھڑے ہونے والے مریض کی بہ نسبت آدھا ثواب ملے گا جو کہ عام تندرست آدمی کی کامل نماز کے پورے ثواب کے برابر ہوگا۔ اور عذر کی وجہ سے اس کے ثواب میں کمی نہ ہوگی۔

لمافی فتح الباری (۴۶۷/۲): قال: قال الخطابی کنت تأولت هذاالحدیث علی ان المراد به صلاة التطوع یعنی للقادر لکن قوله من صلی نائما یفسده لان المضطجع لایصلی التطوع کما یفعل القاعد، لانی لا احفظ عن احد من اهل العلم انه رخص فی ذلک...... وقد رأیت الآن ان المراد بحدیث عمران المریض المفترض الذی یمکنه ان یتحامل فیقوم مع مشقة فجعل اجر القاعد علی النصف من اجر القائم ترغیباً له فی القیام مع جواز قعوده...... فمن صلی فرضا قاعدا وکان یشق علیه القیام اجزأه وکان هو ومن صلی قائما سواء کما دل علیه حدیث انسؓ وعائشةؓ فلو تحامل هذا المعذور وتکلف القیام ولو شق علیه کان أفضل لمزید اجر تکلف القیام فلا یمتنع ان یکون اجرهٗ

علی ذلک نظیر اجره علی الصلاة فیصح ان اجر القاعد علی النصف من اجر القائم ومن صلی النفل قاعدا مع القدرة علی القیام اجزأه وکان اجرهٗ علی النصف من اجر القائم بغیر اشکال الخ.

وفی اعلاء السنن(۶/۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷): اجعلوا اخر صلوتکم من اللیل وترا الخ..... وقد ورد مایخالفه ایضاً ففی صحیح مسلم فی حدیث طویل ثم یصلی النبی ﷺ بعد الوتر رکعتین بعد ما یسلم وهو قاعد. واخرج الدار قطنی فی سننه عن ام سلمة رضی الله عنها ان النبی ﷺ کان یصلی رکعتین خفیفتین بعد الوتر وهو جالس..... واخرج الدارمی والطحاوی والدار قطنی واللفظ لهما عن ثوبان مولی رسول الله ﷺ قال کنامع رسول الله ﷺ فی سفر فقال "ان السفر جهد وثقل فاذا اوتر احد کم فلیرکع رکعتین فان استیقظ والا کانتاله، وفی التعلیق المغنی اسناده جید وفی آثار السنن اسناده حسن ...... وأخرج الطحاوی عن ابی امامة رضی الله عنه"ان النبی ﷺ کان یصلیهما بعد الوتر وهو جالس یقرأ فیهما، اذا زلزلت وقل یآایها الکفرون، واسناده حسن:

والتطبیق بینهما وبین حدیث الباب بوجوه منها ماذکره الحافظ فی الفتح بما نصه، وقد ذهب الیه (ای الی مشروعیة التنفل بعد الوتر)بعض اهل العلموجعلوا الامر فی قوله اجعلوا اخرصلاتکم من اللیل وتراً. مختصاً بمن اوتر آخر اللیل. وقال العبد الضعیف: معناه اوتروا فی اللیل مرة لامرتین لتکون اخر صلوتکم باللیل وترا فان من اوتر مرتین فقد جعل آخر صلاته باللیل شفعاً..... وحمل بعضهم حدیث الرکعتین بعد الوتر علی الجواز، وامر الایتار اخر اللیل علی الاستحباب.....

قال النووی فی شرح مسلم هذا الحدیث (ای حدیث الرکعتین بعد الوتر) اخذ بظاهره الاوزاعی واحمد فیما حکاه القاضی عنهما. فأباحا رکعتین بعد الوتر جالساً..... قلت والصواب ان هاتین الرکعتین فعلهما علیه السلام بعد الوتر جالسا لبیان جواز الصلاة بعد الوتر، وبیان جواز النفل جالسا، ولم یواظب علی ذلک بل فعله مرة او مرتین او مرات قلیلة. وانما تأولنا حدیث الرکعتین جالسا لان الروایات المشهورة فی الصحیحین وغیرهما عن عائشة مع روایة خلائق من الصحابة فی الصحیحین مصرحة بان اخر صلاته ﷺ فی اللیل کان وتراً. وفی الصحیحین احادیث کثیرة مشهورة بالامر بجعل اخر صلاة اللیل وترا فکیف یظن به علیه السلام مع هذه الاحادیث واشباهها انه یداوم علی الرکعتین بعد الوتر ویجعلهما اخر صلاة اللیل؟

وانما معناه ماقدمناه من بیان الجواز وهذا الجواب هو الصواب.

(۲۴۴) بیٹھ کرنماز پڑھنے میں آدھے ثواب کا حکم فرائض یا نوافل سب میں ہے یا صرف نوافل میں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کہا جاتا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے سے ثواب آدھا ملتا ہے اگر معذوری نہ ہو تو؟ مثلاً ایک شخص بخار کی حالت میں ہے یا بدن، ہاتھ میں اچھا خاصا درد ہو، یا تھکاوٹ بہت لگ رہی ہو، اس صورت میں بھی نماز کھڑے ہوکر پڑھنی چاہئے، کیا صرف فرض نماز میں ثواب آدھا ہوجاتا ہے یا سنت اور نفل میں بھی آدھا ہوجاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرض نماز میں رکوع اور سجدہ کی طرح قیام بھی فرض ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص بغیر عذر کے فرض نماز بیٹھ کر پڑھے گا تو اس کی نماز ہی نہ ہوگی اور اگر کوئی شخص معذور ہو، مثلاً قیام پر قدرت نہ رکھتا ہو، یا قیام کرنے سے بیماری بڑھنے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا تو اس کو نماز کا پورا ثواب ملے گا، البتہ نوافل میں قیام فرض نہیں ہے اس لئے اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر نفل پڑھے گا تو اس کو نماز کا آدھا ثواب ملے گا اور اگر کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھے گا تو پورا ثواب ملے گا۔

لمافي الصحيح لمسلم(۱/۲۵۳): وعن عبدالله بن عمرو رضي الله عنه قال: حدثت أن رسول الله ﷺ قال صلوة الرجل قاعداً نصف الصلاة، قال فأتيته فوجدته يصلي جالسا فوضعت يدى على رأسه فقال: مالك يا عبدالله بن عمرو قلت حدثت يا رسول الله أنك قلت "صلوة الرجل قاعدا على نصف الصلاة" وأنت تصلي قاعدا قال اجل ولكني لست كأحد منكم

وفي جامع الترمذي(۱/۸۵): (باب ماجاء ان صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم) عن عمران بن حصين قال سألت رسول الله ﷺ عن صلاة الرجل وهو قاعد فقال من صلى قائما فهو افضل ومن صلاها قاعدا فله نصف أجر القائم ....وقال سفيان الثوري في هذا الحديث من صلى جالسا فله نصف أجر القائم قال هذا للصحيح ولمن ليس له عذر فأما من كان له عذر من مرض أوغيره فصلى جالسافله مثل أجر القائم.

و في الشامية (۱/۴۴۵): (قوله القادر عليه) فلو عجز عنه حقيقة وهو ظاهر ،و حكما كما لو حصل له به ألم شديد أوخاف زيادة المرض و كالمسائل الآتية في قوله وقد يتحتم القعود الخ فإنه يسقط.

(۲۴۵) سنت فجر گھر میں پڑھ کر آنے والے کیلئے تحیۃ المسجد کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص فجر کی سنتیں گھر میں پڑھے اور پھر مسجد میں آئے تو کیا وہ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تمام سنتوں کی طرح سنت فجر بھی گھر میں پڑھنا افضل ہے اور طلوع فجر کے بعد نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا جو

شخص گھر میں سنت فجر پڑھ کر مسجد آئے تو اس کے لئے تحیۃ المسجد پڑھنا درست نہیں بلکہ اسے چاہئے کہ تیسرا کلمہ اور درود شریف پڑھے یہ پڑھنے سے اسے تحیۃ المسجد پڑھنے کا ثواب مل جائے گا اور اگر مسجد میں آتے ہی فرض نماز میں مشغول ہوگیا تو پھر فرض نماز تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہو جائے گی اگر چہ اس نے تحیۃ المسجد کی نیت نہ کی ہو۔

لمافي قاضي خان(۱/۳۶): وركعتي الطواف وتحية المسجد أولم يكن لها سبب بعد طلوع الفجر قبل صلوة الفجر لايجوز إلا سنة الفجر وبعد الفريضة قبل طلوع الشمس.

وفي الهندية(۱/۵۲): منها مابعد طلوع الفجر قبل صلاة الفجر كذا في النهاية والكفاية يكره فيه التطوع بأكثر من سنة الفجر.

وفي الشامية(۲/۱۸): وركعتان أو اربع وهي أفضل لتحية المسجد الا اذا دخل فيه بعد الفجر أو العصر فانه يسبح ويهلل ويصلي على النبي ﷺ فانه حينئذ يؤدي حق المسجد كما اذا دخل للمكتوبة فانه غير مامور بها حينئذ كمافي التمرتاشي.

(۲۴۶) تہجد کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تہجد کی کم تعداد کتنی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم سے کم تہجد کتنی رکعات پڑھیں، دو یا چار رکعات تہجد ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تہجد کی اقل مقدار کی احادیث میں کوئی تصریح موجود نہیں ہے البتہ فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اقل مقدار دو رکعت ہے۔

لمافي الشامية(۲/۲۵): وهذا بناء على ان اقل تهجده ﷺ كان ركعتين وان منتهاه كان ثماني ركعات الى ان قال اقول فينبغي القول بان اقل التهجد ركعتان واوسطه اربع واكثره ثمان.

(۲۴۷) صلاۃ التسبیح پڑھنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ان سے اصلاحی تعلق قائم کرلوں انہوں نے میری درخواست قبول کرلی اور مجھے کچھ معمولات بتائے جن میں سے ایک صلوٰۃ التسبیح بھی ہے، انہوں نے فرمایا کہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ صلوٰۃ التسبیح ضرور پڑھا کرو اب مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ کیسے پڑھی جاتی ہے۔ اب آپ حضرات اس کے پڑھنے کا طریقہ بتادیں نیز یہ بھی بتائیں کہ صلوٰۃ التسبیح پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صلاۃ التسبیح بڑی اہم نماز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یہ نماز بڑی تاکید کے بعد

بطورتحفہ سکھائی تھی۔امام حاکم نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے صحیح ہونے پر یہ دلیل ہے کہ تبع تابعین کے زمانہ سے ہمارے زمانہ تک مقتداء حضرات اس پر مداومت کرتے اور لوگوں کو تعلیم دیتے رہے ہیں جن میں عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔یہ چار رکعات والی نماز ہے جس میں تین سومرتبہ تسبیحات پڑھی جاتی ہیں۔

صلاۃ التسبیح پڑھنے کے دوطریقے ہیں:

اوّل...... یہ کہ کھڑے ہوکر الحمد شریف اور سورت کے بعد پندرہ مرتبہ تیسرا کلمہ سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھے، پھر رکوع میں سبحان ربی العظیم کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر رکوع سے کھڑا ہوکر سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر دونوں سجدوں میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد دس دس مرتبہ پڑھے پھر دونوں سجدوں کے درمیان دس مرتبہ پڑھے اور جب دوسرے سجدے سے اللہ اکبر کہہ کر اُٹھے تو کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ جائے اور دس مرتبہ پڑھے۔پھر بغیر اللہ اکبر کہے کھڑا ہوجائے۔اسی طرح تیسری رکعت کے بعد جب چوتھی رکعت کیلئے اٹھنا ہو وہاں بھی پہلے اللہ اکبر پھر تسبیحات اور پھر بغیر اللہ اکبر کہے کھڑا ہوجائے لیکن پہلے قعدہ میں اللہ اکبر کے بعد تسبیحات پھر التحیات اور پھر اللہ اکبر کہہ کر تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوجائے۔اسی طرح پہلے اور دوسرے قعدہ میں پہلے ان تسبیحات کو دس دس مرتبہ پڑھے پھر التحیات پڑھے۔

دوم...... یہ ہے کہ سبحانک اللھم کے بعد الحمد شریف سے پہلے پندرہ مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھے اور الحمد شریف اور سورت کے بعد دس مرتبہ پڑھے باقی وہی طریقہ ہے جو پہلے میں تھا۔البتہ اس صورت میں نہ دوسرے سجدہ کے بعد بیٹھنے کی ضرورت ہے اور نہ التحیات کے ساتھ پڑھنے کی۔علماء نے کہا ہے اور لکھا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ کبھی اس طرح پڑھ لیا کریں اور کبھی اس طرح پڑھ لیا کریں۔

یہ نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو سکھائی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی ہے یا نہیں یہ بات تتبع کے باوجود نہیں مل سکی۔

لمافي المشكوة (صـ۱۱۷): صلوة التسبيح ـ عن ابن عباس ان النبي ﷺ قال للعباس بن عبدالمطلب يا عباس يا عماه الا اعطيك الا امنحك الا اخبرك الا افعل بك عشر خصال اذا انت فعلت ذالك غفر الله لك ذنبك اوله واخره قديمه وحديثه خطأه وعمده صغيره وكبيره سره وعلانيته ان تصلي اربع ركعات تقرء في كل ركعة فاتحة الكتاب وسورة فاذا فرغت من القراءة في اول ركعة وانت قائم قلت سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر خمس عشرة مرة ثم تركع فتقولها وانت راكع عشرا ثم ترفع راسك من الركوع فتقولها عشرا ثم تهوى ساجدا فتقولها وانت ساجد عشراً ثم ترفع راسك من السجود فتقولها عشرا ثم تسجد فتقولها عشرا ثم ترفع راسك فتقولها عشرا فذالك خمس وسبعون في كل ركعة تفعل ذالك في اربع ركعات ان استطعت ان تصليها في كل يوم مرة فافعل فان لم تفعل ففي كل جمعة مرة فان لم تفعل ففي كل سنة

مرة فان لم تفعل ففي عمرک مرة رواه ابو داؤد وابن ماجه والبيهقي في الدعوات الكبير وروى الترمذي عن ابي رافع نحوه.

وفي المستدرک على الصحيحين(۱/۴۶۵): ......ثنا/ ابو وهب محمد بن مزاحم قال: سألت عبدالله بن المبارک عن الصلوة التي يسبح فيها، فقال تكبر ثم تقول: سبحانک اللهم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالى جدک ولا اله غيرک ثم تقول خمس عشرة مرة سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر، ثم تتعوذ وتقرأ بسم الله الرحمٰن الرحيم وفاتحة الكتاب وسورة، ثم تقول عشر مرات سبحان الله والحمدلله ولا اله الا الله والله اكبر ثم تركع فتقولها عشرا ثم ترفع راسک فتقولها عشرا ثم تسجد فتقولها عشرا ثم ترفع راسک فتقولها عشرا ثم تسجد الثانية فتقولها عشرا، ثم ترفع راسک فتقولها عشرا تصلي اربع ركعات على هذا، فذالک خمس وسبعون تسبيحة في كل ركعة، وذالک تمام الثلاث مائة فان صلاها ليلا فأحب الي ان يسلم في الركعتين فان صلى نهارا فان شاء سلم وان شاء لم يسلم. رواة هذا الحديث عن ابن المبارک كلهم ثقات اثبات ولا يتهم عبدالله ان يعلمه مالم يصح عنده سنده

وفي مرقاة المفاتيح(۳/۳۷۷): وينبغي للمتعبد ان يعمل بحديث ابن عباس تارة ويعمل بحديث ابن مبارک أخرى.

(۲۴۸) صلوٰۃ التسبیح میں چھوٹ جانے والی تسبیح کو دوسرے رکن میں پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے مجھے فرمایا کہ آپ ہفتہ میں ایک مرتبہ صلوٰۃ التسبیح پڑھا کریں میں نے معمول بنالیا کہ جمعہ والے دن اذان کے فوراً بعد پڑھا کروں گا اس جمعہ کو میں نے پڑھنا شروع کی تو پہلی رکعت میں رکوع سے اٹھنے کے بعد کی تسبیحات بھول گیا پھر میں نے سجدے میں دوگنی پڑھ دیں گویا کہ تین سو تعداد مکمل ہوگئی آیا میری نماز صحیح ہوگئی یا دوبارہ لوٹانا ضروری ہوگا صلوٰۃ التسبیح میں تسبیحات پڑھنا واجب ہیں یا مسنون یا مستحب ان کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صلوٰۃ التسبیح پڑھنا مستحب ہے اور احادیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ تسبیح پڑھی جاتی ہے جن کی تعداد چار رکعات میں ۳۰۰ بنتی ہے اور اس میں اصل مطلوب ۳۰۰ کا عدد پورا کرنا ہے اور ان تسبیحات کا پڑھنا مسنون عمل ہے اگر کسی سے ایک رکن میں تسبیح ادا کرنا رہ گئی تو وہ دوسرے رکن میں دگنی ادا کر کے تعداد پوری کرسکتا ہے پس صورت مسئولہ میں جب آپ نے رکوع سے اٹھنے کی تسبیحات کو سجدے میں ادا کرلیا تو تسبیحات کی تعداد مکمل ہوگئی اس لیے آپ کی نماز درست ہے دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

لمافي الهندية(۱/۱۱۲): (ومن المندوبات)..... واما صلوة التسبيح فذكرها في الملتقط يكبرو يقرأ الثناء ثم يقول سبحانه الله والحمدلله ولا اله الا الله والله اكبر خمس عشر مرة ثم يتعوذ ويقرأ فاتحة الكتاب وسورة ثم يقرأ هذه الكلمات عشرا وفي الركوع عشرا وفي القيام عشرا وفي كل سجدة عشرا وبين السجدتين عشرا ويتمها اربع ركعات.

وفي الشامية(۲/۲۷): والطعن في ندبها بان فيها تغييرا لنظم الصلوة انما ياتي على ضعف حديثها فاذا ارتقى الى درجة الحسن اثبتها..... قال الملا علي في شرح المشكاة مفهومه انه سها ونقص عددا من محل معين ياتي به في محل آخر تكملة للعدد المطلوب قلت و استفيد انه ليس له الرجوع الى المحل الذي سها فيه وهو ظاهر وينبغي كما قال بعض الشافعية ان ياتي بما ترك فيما يليه ان كان غير قصير فتسبيح الاعتدال ياتي به في السجود اما تسبيح الركوع فياتي به في السجود ايضا لافي الاعتدال لانه قصير قلت وكذا تسبيح السجدة الاولیٰ ياتي به في الثانية لافي الجلسة لان تطويلها غير مشروع عندنا على مامر في الواجبات.

(۲۴۹) مغرب کی دوسنتوں کے بعد نوافل کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ(۱)..... اکثر لوگ عموماً مغرب کی دوسنت کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے ہیں، آیا مغرب کی دوسنت کے بعد دورکعت نفل پڑھنا مسنون ہے حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

(۲)..... صلوٰۃ الاوابین کی کل کتنی رکعت ہیں فرض کے بعدوالی دورکعت سنت کوبھی صلوٰۃ الاوابین میں شمار کر سکتے ہیں یانہیں مثلاً دورکعت سنت کے ساتھ چاررکعت اور ملالیں تو چھ رکعت صلوٰۃ الاوابین بن گئی یا دورکعت سنت کے علاوہ چھ رکعت پڑھنا ضروری ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... (۱)۔ نمازِ مغرب کی دوسنتوں کے بعد نوافل کا پڑھنا یقیناً باعث اجر وثواب ہے، جیسا کہ متعدد روایات میں اس کی تصریح موجود ہے لیکن سنتوں کی ادائیگی کے بعد دورکعت نفل پڑھنے کومسنون قرار دینے کی صراحت بندہ کو نہ مل سکی البتہ مستحب کہہ سکتے ہیں۔

(۲)۔ متعدد روایات میں صلاۃ الاوابین کی رکعات کی تعداد چھ(۶) ملتی ہے اگر چہ اس سے کم وبیش کی بھی صراحت ملتی ہے۔ چنانچہ افضل صورت یہی ہے کہ دورکعت سنت مؤکدہ کی ادائیگی کے بعد چھ(۶) رکعت صلاۃ الاوابین کی مستقل ادائیگی کی جائے البتہ مشاغل کی کثرت کی وجہ سے چاررکعت پر اکتفا کر کے دورکعت سنت مؤکدہ کو بھی ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔

لما في كنز العمال(۷/۳۸۶): ۱۹۴۲۱. من صلى بعد المغرب ركعتين قبل أن يتكلم كتبتا في عليين.

وفيه ايضاً(۷/۳۹۲): ۱۹۴۵۱. من صلى أربع ركعات بعد المغرب كان كمن عقب غزوة بعد غزوة في سبيل الله عزوجل (أبو الشيخ عن ابن عمر).

وفی الشامية(۲/۱۴): (قوله وهل تحسب المؤكدة) أى فى الأربع بعد الظهر وبعد العشاء والست بعد المغرب بحر (قوله إختار الكمال) نعم ذكر الكمال فى فتح القدير أنه وقع إختلاف بين أهل عصره فى أن الأربع المستحبة هل هى أربع مستقلة غير ركعتي الراتبة أو أربع بهما؟ وعلى الثانى هل تؤدى معهما بتسليمة واحدة أو لا، فقال جماعة لا، واختار هو أنه إذا صلى أربعا بتسليمة أو تسليمتين وقع عن السنة والمندوب، وحقق ذلک بمالا مزيد عليه وأقره فى شرح المنية والبحر والنهر.

(۲۵۰) دورکعت نمازِ نفل میں متعدد نیت کرنے سے متعدد نفل ادا کرنے کا ثواب ملے گا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ساتھی نے بتایا نفل دورکعت میں جتنے دوسرے نوافل کی نیت کر و سب ادا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دورکعت نفل نماز میں اگر کوئی شخص حاجت کی نماز، توبہ کی نماز، شکرانے کی نماز، اشراق چاشت کی نماز کی نیت کرتا ہے تو دورکعت نفل پڑھنے سے سب نمازیں ادا ہو جائیں گی۔ کیا ان کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہے تو دو رکعت نفل مطلقاً ادا ہو جائیگی یا ان میں سے جس کی نیت پہلے کی ہوگی وہ ادا ہوگی یا کوئی بھی ادا نہ ہوگی۔ کیا اس طرح نیت کرنا صحیح ہے زیادہ ادا نہ ہوں ایک دو ادا ہو جائے مثلاً دورکعت میں توبہ شکرانے کی نماز کی نیت کرلے یا توبہ حاجت کی نماز کی نیت کرلے۔ جلدی جواب دیں اللہ آپ کو ثواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......آپ کے ساتھی کی بات صحیح ہے کہ دورکعت نفل میں جتنی نوافل کی نیت کر و سب ادا ہو جاتی ہیں۔ البتہ وہ نوافل جو کسی وقت کے ساتھ موقت ہیں۔ یا ذوات الاسباب ہیں۔ تو ان کے ادا ہونے کیلئے وقت اور سبب کا پایا جانا ضروری ہے۔ مثلاً دورکعت نفل میں اشراق کی نیت کی جائے تو اشراق تب ادا ہوگی جب اشراق کا وقت موجود ہو۔ یا دورکعت نفل میں تحیۃ المسجد کی نیت کی جائے تو تحیۃ المسجد تب ادا ہوگی جب دخول مسجد ہو۔

لمافی الصحیح للبخاریؒ(۱/۲): .... علقمة ابن وقاص الليثى يقول سمعت عمر بن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه على المنبر يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول انما الاعمال بالنيات وانما لامرئ مانوى.

وفى حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح(ص۲۱۶): ثم انه ان جمع بين عبادات الوسائل فى النية صح كمالو اغتسل لجنابة وعيد وجمعة اجتمعت ونال ثواب الكل وكمالو توضا لنوم وبعد غيبة وأكل لحم جزور وكذا يصح لونوى نافلتين او اكثر كمالو نوى تحية مسجد وسنة وضوء وضحى وكسوف.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۱/۷۷۹): وان كانت الصلاة نافلة: فيجب تعيينها ان كانت معينة او

موقتة بوقت کصلوة الکسوف والاستسقاء والتراویح والوتر والسنن الرواتب.

(۲۵۱) موٹر سائیکل پر نفل پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے چند روز قبل دوران مطالعہ میں نے ایک صحابیؓ کے حالات میں پڑھا ہے کہ انہوں نے دوران سفر سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کئے تو کیا آج بھی سواری پر بیٹھ کر اشارہ سے نوافل پڑھنا جائز ہے؟ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے روزانہ دو ڈھائی گھنٹے سفر کرنا پڑتا ہے اگر میں بھی دوران سفر سواری پر نفل نماز اشارے سے پڑھتا رہوں تو میرے لئے جائز ہوگا؟ نیز اگر میں موٹر سائیکل خود چلاؤں تو پھر نفل پڑھ سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں نفل نماز حالتِ سفر میں سواری پر پڑھنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے لہٰذا ہمارے فقہاءِ کرام نے شہر سے باہر نفل نماز اشارہ سے پڑھنے کے جواز کے قول کو اختیار کیا ہے. البتہ اگر سواری خود چلا رہا ہے تو شرط یہ ہے کہ عمل کثیر نہ پایا جائے اگر سواری چلاتے وقت عمل کثیر پایا گیا تو نماز درست نہ ہوگی۔ اور چونکہ موٹر سائیکل چلاتے وقت عام طور سے عمل کثیر پایا جاتا ہے اس لیے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے نماز پڑھنا درست نہیں۔

لمافی الشامیة (۳۸/۲): (قوله خارج المصر) هذاهوالمشهور، وعندهمایجوزفی المصر، لکن بکراهة عندمحمدلأنه یمنع من الخشوع وتمامة فی الحلیة.

(قوله محل القصر) : بالنصب بدل من خارج المصروفائدته شمول خارج القریة وخارج الاخبیة ح ای المحل الذی یجوز للمسافر قصر الصلاة فیه وهو الصحیح بحر.........

(قوله ولوسیرها): ذکره فی النهربحثااخذامن قولهم اذاحرک رجله أوضرب دابته فلابأس به اذالم یکن کثیرا. ۔

(۲۵۲) وتروں کے بعد دو رکعت کا مخصوص سورتوں کے ساتھ ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وتروں کے بعد دو رکعت مخصوص سورتوں کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہو تو ان کی ترتیب اور فضیلت بھی بیان فرمادیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... وتروں کے بعد دو رکعت مخصوص سورتیں، سورۃ الزلزال اور سورۃ الکافرون کے ساتھ پڑھنا حدیث سے ثابت ہے۔ البتہ ان کو لازم نہ سمجھا جائے۔ کبھی کبھار ترک بھی کر دینا چاہئے۔ تاکہ واجب کا اعتقاد نہ رہے۔ اور ابن خزیمہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ تم رات کے قیام کو لازم پکڑو۔ کیونکہ بے شک یہ تم سے پہلے نیک لوگوں کا طریقہ رہا ہے اور قربت کا ذریعہ ہے اور گناہوں کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے کا ذریعہ ہے اور طبرانی میں ہے کہ جو نماز، نمازِ عشاء کے بعد سونے سے پہلے پڑھی جائے وہ صلوۃ اللیل

میں شمار ہوتی ہے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح (صـ۱۱۳): عن ام سلمة ان النبی ﷺ کان یصلی بعد الوتر رکعتین.

وفیه ایضاً: عن ثوبان عن النبی ﷺ قال ان هذا السهر جهد وثقل فاذا اوتر احدکم فلیرکع رکعتین فان قام من اللیل والا کانتا له.

وفیه ایضاً: عن ابی امامة (رضی الله عنه) ان النبی ﷺ کان یصلّیهما بعد الوتر وهو جالس یقرأ فیهما اذا زلزلت وقل یایها الکفرون.

وفی الشامیة(۲/۲۴): قال فی البحر، فمنها مافی صحیح مسلم مرفوعاً افضل الصلاة بعد الفریضة صلاة اللیل، وروی الطبرانی مرفوعاً ((لابد من صلاة بلیل ولو حلب شاة وما کان بعد صلاة العشاء فهو من اللیل)) وهذا یفید ان هذه السنة تحصل بالتنفل بعد صلاة العشاء قبل النوم.

وفیه ایضاً(۲/۳۸۱): وکذا قالوا بسنیة قرائة السور الثلاثة فی الوتر مع الترک احیاناً لئلا یعتقد وجوبها.

(۲۵۳) فوت شدہ نماز کے بارے میں یادنہیں کہ کونسی تھی تو اس کی قضا کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چار سال قبل میں ساتھیوں کے ساتھ کسی تفریحی مقام پر پکنک منانے گیا تھا اور میں نے قصداً اور سستی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھی، لیکن اب میں اس پر بہت نادم ہوں اور مجھے وہ نماز بھی یادنہیں ہے کہ ظہر کی نماز چھوڑی تھی یا عصر کی۔ تو اب میں کیا کروں کوئی شرعی حل بتائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر کسی سے کوئی نماز فوت ہوجائے لیکن اس کو یہ یاد نہ ہو کہ کونسی نماز فوت ہوئی ہے تو یہ آدمی پورے دن کی نمازوں کی قضا کرے۔ صورت مسئولہ میں آپ کو چونکہ صرف ظہر اور عصر میں تردد ہے اس لئے صرف ان دونوں کی قضاء کرلیں۔

لمافی فتاویٰ سراجیة(صـ۱۶): رجل فاتته صلاة من یوم ولیلة ولا یدری ایة صلاة هی اعاد صلاة یوم ولیلة احتیاطاً.

وفی الهندیة(۱/۱۲۴): رجل نسی صلاة ولا یدریها ولم یقع تحرّیه علی شئ یعید صلاة یوم ولیلة عندنا کذا فی الظهیریة.

(۲۵۴) چھوڑی ہوئی نمازوں اور روزوں کی قضاء کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عمر پچاس سال ہے اللہ پاک نے کافی مال سے

نوازا ہے اور اولاد بھی دی ہے لیکن آج تک میں احکام خداوندی سے دور تھا نماز اکثر چھوڑ دیتا تھا روزے بھی کبھی رکھ لیے اور کبھی چھوڑ دیے اب سے کچھ عرصہ پہلے ایک جماعت والے آئے وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے میں نے ایک چلہ جماعت کے ساتھ لگایا تو اب ندامت ہوتی ہے میں نے ساری عمر ضائع کی ہے۔ تو اسی وقت اللہ پاک سے توبہ کر لی اور آئندہ نماز نہ چھوڑنے کا عزم کیا ہے۔ کیا جتنے روزے اور نمازیں چھوڑ دیں معاف ہو جائیں گی یا ان کیلئے مزید کوئی اور حکم ہے؟ مہربانی فرما کر میری رہنمائی کریں میں انتہائی پریشان ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جتنے روزے اور نمازیں آپ نے چھوڑی ہیں ان سب کی قضاء آپ پر لازم ہے۔ اور قضاء کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت سے استغفار بھی کریں۔ اس لیے کہ بغیر عذر نماز، روزہ، وغیرہ کو چھوڑنا بہت سخت گناہ ہے۔

لمافی مصنف ابن ابی شیبه(۲/۳۴۷): عن سعید بن المسیب قال جاء رجل النبی ﷺ فقال انی افطرت یوماً فی رمضان فقال له النبی ﷺ تصدق واستغفرالله وصم یوماً مکانه.

وفی الدر المختار(۲/۶۵): والقضاء فعل الواجب بعد وقته. (وفیه، ۲/۶۲) اذا لتاخیر بلا عذر کبیرة لاتزول باالقضاء بل باالتوبة او الحج

وفی الشامیة تحته: قوله (لاتزول باالقضاء) وانما یزول اثم الترک فلا یعاقب علیها اذا قضاها واثم التاخیر باق بحر.

(۳۵۵) وقتی اور فوت شدہ نمازوں میں ترتیب کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کی فجر، ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں قضا ہو جائیں تو ترتیب کے ساتھ یہ نمازیں پڑھنا ضروری ہے یا بغیر ترتیب بھی پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی سے فجر کی نماز رہ گئی تو ظہر کی جماعت کا وقت ہو جانے پر کیا پہلے فجر کی نماز پڑھنا ضروری ہے یا ظہر کی نماز پڑھ کر پھر فجر پڑھ لیں، امام ومقتدی کے اعتبار سے اس مسئلے میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱)۔ کسی کی فجر، ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں قضاء ہو جائیں، اگر وہ شخص صاحب ترتیب ہے (صاحب ترتیب اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ذمے چھ نمازیں باقی نہ ہوں، چاہے پرانی ہوں یا نئی مسلسل ہوں یا متفرق، اگر کسی کے ذمے چھ نمازوں کی قضاء باقی ہو تو وہ صاحب ترتیب نہیں) تو ترتیب کے ساتھ ان نمازوں کو ادا کرنا اس کیلئے ضروری ہے۔ اگر صاحب ترتیب نہیں تو ترتیب کا لحاظ رکھنا بہتر ہے اور بغیر ترتیب کے پڑھنا بھی جائز ہے۔ اسی طرح کسی کی فجر کی نماز رہ گئی ابھی تک ادا نہیں کر سکا تھا کہ ظہر کی جماعت کا وقت ہو گیا اگر وہ امام ہے اور صاحب ترتیب بھی ہے تو اس صورت میں اگر مقتدی حضرات امام کے قضاء نماز ادا کرنے تک انتظار کو گوارا کرتے ہوں تو امام پہلے قضاء نماز پڑھے بعد میں جماعت کرائے، اگر مقتدی حضرات انتظار کو گوارا نہیں کرتے تو کسی اور شخص سے

جماعت کروائے اور خود پہلے قضاء نماز پڑھے بعد میں وقتی نماز، اگر وہ شخص امام نہیں بلکہ عام آدمی ہے تو صاحب ترتیب ہونے کی صورت میں اس کیلئے بھی پہلے قضاء نماز ادا کرنا ضروری ہوگا بعد میں وقتی نماز پڑھے گا۔ صاحب ترتیب نہ ہونے کی صورت میں پہلے وقتی نماز پڑھ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صاحب ترتیب آدمی کیلئے وقتی نمازوں اور فوت شدہ نمازوں میں ترتیب قائم رکھنا ضروری ہے، غیر صاحب ترتیب کے لئے ضروری نہیں۔

لمافی الدر المختار (۲/۶۸، ۶۹): (اوفاتت ست اعتقادية) لدخولها فی حد التكرار المتقضی للحرج (بخروج وقت السادسة) علی الاصح ولو متفرقة او قديمة علی المعتمد.

وفی الشامية تحته: ولا يسقط الترتيب الا بفوت ست صلوات.............. (قوله ولو متفرقة) ای يسقط الترتيب بصيرورة الفوائت ستا ولو كانت متفرقة.

(۳۵۶) امدادی کاروائیوں کی وجہ سے نماز قضاء کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں زلزلہ آ گیا تھا اور اکثر آبادی اپنے گھروں میں دب گئی تھی (تقریباً ۳۰۰/افراد) لیکن ہم ۸ دوست زلزلے میں دبنے سے رہ گئے تو کیا ہم امدادی کارروائیوں کی وجہ سے نماز قضاء کر سکتے ہیں کیونکہ ہم نے لوگوں کو ملبے سے نکالنے کیلئے اپنی کافی ساری نمازیں قضا کردی تھیں اور کافی لوگوں کو ملبے سے زندہ نکالنے میں کامیاب ہوگئے تھے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ تمام نمازیں بروقت باجماعت ادا کرے۔ تاہم اگر کسی عذر شرعی کی بناء پر نماز میں تاخیر ہوجائے اور وقت میں ادا نہ ہوسکے تو اس کی قضاء کرنے میں تاخیر نہ کرنی چاہئے۔ لہٰذا آپ سے اگر امدادی کارروائیوں میں شریک ہوکر دوسرے مسلمانوں کی جان بچاتے ہوئے نمازیں قضاء ہوگئی ہیں تو امید ہے کہ عنداللہ مؤاخذہ نہ ہوگا۔ البتہ آپ کیلئے ضروری ہے کہ آپ ان نمازوں کی جلد از جلد قضاء کریں۔

لمافی صحيح البخاری (۱/۷۶): سألت النبی ﷺ ای العمل احب الی الله قال الصلوٰة علی وقتها قال ثم ای قال ثم بر الوالدين قال ثم ای قال الجهاد فی سبيل الله قال حدثنی بهن ولو استزدته لزادنی.

وفی الدر المختار مع الشامية (۲/۶۲): ومن العذر العدو وخوف القابلة موت الولد لأنه عليه الصلاة و السلام اخرها يوم الخندق.

قال الشامی رحمه الله تعالیٰ تحته: قوله ومن العذر ای لجواز تأخير الوقتية عن وقتها ......قوله العدو كما اذا خاف المسافر من اللصوص او قطاع الطريق جاز له أن يؤخر الوقتية لأنه بعذر.

وفی مراقی الفلاح (ص۳۷۱): من تأخير الصلوٰة وتركها (يجب قطع الصلوٰة) ولو فرضاً باستغاثة شخص

ملهوف لمهم أصابه كما لو تعلق به ظالم أو وقع في ماء أو صال عليه حيوان فاستغاث بالمصلي.

(۳۵۷) دورانِ نماز دورہ پڑ جائے تو اس نماز کی قضاء کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا چھوٹا بھائی اسلم جس کی عمر تقریبا ۲۰ سال ہے گزشتہ رات عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک دورہ پڑ گیا اور گر گیا تقریبا ۲۴ گھنٹے بعد بحمد اللہ ہوش میں آ گیا۔ اب جو نمازیں اس کی رہ گئی ہیں ان کی قضاء واجب ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو کیا وہ نماز جس کو شروع کیا تھا دورہ پڑ گیا تو اس کی قضاء بھی واجب نہیں یا اس کی قضاء واجب ہے؟ اس لئے کہ اس کو شروع کیا تھا، اور جب نماز کو شروع کرنے کے بعد توڑ دیا جائے تو احناف کے نزدیک اس کی قضاء واجب ہے لہٰذا مفتی صاحب آپ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی شخص دورانِ نماز بے ہوش ہو جائے اور پانچ نمازوں تک بے ہوش رہے تو قضاء واجب ہوگی۔ البتہ اگر پانچ نمازوں سے زائد وقت گزر جائے تو قضاء واجب نہ ہوگی۔ صورت مسئولہ میں آپ کے بھائی اسلم اگر پانچ نمازوں کے مکمل وقت بے ہوش رہے تو ان پر قضاء واجب نہ ہوگی۔ اور اگر پانچ نمازوں کے مکمل وقت میں یا اس سے کم بے ہوش رہے تو شروع کی ہوئی نماز سمیت تمام نمازوں کی قضاء واجب ہوگی۔

لمافي الهندية (۱/۱۳۷): ومن أغمي عليه خمس صلوات قضى ولو أكثر لا يقضي والجنون كالاغماء وهو الصحيح ثم الكثرة تعتبر من حيث الاوقات عند محمد رحمه الله تعالىٰ وهو الاصح.

وفي الدر المختار (۲/۱۰۲): (ومن جن أو اغمي عليه) ولو بفزع من سبع أو آدمي (يوما وليلة قضى الخمس وإن زاد وقت صلوٰة) سادسة (لا) للحرج.

وفي الشامية تحته: (ومن جن أو أغمي عليه) الجنون افة تسلب العقل والاغماء أفة تستره الى ان قال: واعتبر الزيادة بالأوقات على قول الثالث وهو الأصح.

وفي الفقه الاسلامي وأدلته (۱/۲۲۸، ۲۲۷): فلو جن البالغ أو اغمي عليه أو حاضت المرء ة أو نفست في أول الوقت أو أثناء ه بحيث يمكنه أداء الصلاة وجب عليه عند الجمهور غير الحنفية قضاء تلك الصلوٰة ان مضى قدر الفرض مع الطهر، ولا تجب الصلاة الثانية التي تجمع معها لأن وقت الاولى لا يصلح للثانية الا اذا صلاهما جمعاً بخلاف العكس الى ان قال: وقال الحنفية لا تجب صلاة ذلك الوقت على أصحاب الأعذار هؤلاء. لأن سبب ايجاب الصلوة: هو الجزء الذي يتصل به الأداء من الوقت فان لم يؤد تعين الجزء الاخير الذي يسع الواجب للسببية، وبعد خروج الوقت تضاف السببية الى جملة الوقت.

﴿فصل فی التراویح﴾

(تراویح سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۵۸) تعدادرکعاتِ تراویح کی بحث

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں تراویح صرف آٹھ رکعت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی آٹھ ہی کا تھا بیس تراویح کا ثبوت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں آٹھ تراویح کے بارے میں کافی روایات ہیں کیا واقعی ان لوگوں کی بات صحیح ہے یا بیس رکعت کا ثبوت احادیث میں ہے اگر ہے تو ان روایات کو ذکر کریں بشرطیکہ وہ روایات صحیح ہوں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس رکعت تراویح کا ثبوت ہو تو اس کو ضرور بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حدیث مرفوع صحیح سے صرف دو امر ثابت ہیں اول یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو تراویح کی ترغیب فرمایا کرتے تھے۔ دوم یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود تین دن تراویح کی جماعت کا اہتمام فرمایا حتی کہ لوگوں کو اور گھر والوں کو بھی جمع فرمایا لیکن پھر فرضیت کے خوف کی بناء پر جماعت ترک فرمادی، اس سے تراویح کی سنیت اور جماعت کا ثبوت بوجہ احسن ہوتا ہے البتہ تعداد رکعات مذکور نہیں، تعداد رکعات کیلئے حدیث حسن لغیرہ اور آثار صحابہ بکثرت موجود ہیں بیس رکعاتِ تراویح سے متعلق ایک حدیث سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اور چونکہ تراویح کا تعلق فرائض سے تو ہے نہیں تطوعات سے ہے اور تطوعات میں ضعیف روایات بھی قابل قبول ہوتی ہیں جبکہ کوئی اور روایت اس کے معارض نہ ہو خصوصاً جبکہ جمہور صحابہ کرام اور تابعین کا بیس رکعات پر اتفاق واجماع ہے۔

اور آٹھ رکعات والی روایات تراویح سے متعلق نہیں ان کا تعلق تہجد سے ہے جیسا کہ فتح الباری میں صراحت مذکور ہے اس لئے ان سے تراویح کی تعداد رکعات پر استدلال کرنا لغو ہے اور اگر بالفرض مان بھی لیا جائے تب بھی ان میں آٹھ رکعات سے زائد کی نفی مذکور نہیں بلکہ یہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ رکعات گھر ہی میں ادا فرمائی ہوں اور آٹھ رکعات باہر تشریف لاکر جماعت سے ادا فرمائی ہوں "اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال"۔

لمافی السنن الکبریٰ للبیهقی(۲/۴۹۶): عن ابن عباسؓ قال کان النبی ﷺ یصلی فی شهر رمضان فی غیر جماعة بعشرین رکعة والوتر تفردبه ابو شیبة ابراهیم بن عثمان العبسی الکوفی وهو ضعیف.

وفی فتح الملهم (۵/۱۱۵): روی ابن خزیمة وابن حبان عن جابرؓ "صلی بنا رسول الله ﷺ فی

رمضان ثمان ركعات، ثم اوتر، فلما كانت القابلة اجتمعنا في المسجد ورجونا أن يخرج إلينا حتى اصبحنا ثم دخلنا فقلنا يا رسول الله...... فهذا كما تراه ليس فيه الابيان فعله الجزئي في ليلة واحدة فقط دون سائر الليالي بل ليس فيه التصريح بنفي الزائد على الثمان في تلك الليلة أيضاً فإنه يمكن ان يكون هو ﷺ قد صلى قبل الخروج اليهم منفرداً عنهم ماشاء الله من الركعات ثم صلى بهم ثمان ركعات والوتر.

وفي ايضاً(۵/۱۱۷): واحاديث الزيادة على فعله في بعض الاوقات نادراً وحينئذ فلا منافاة بين حديث عائشة وبين ماروى ابن ابي شيبة والطبراني والبيهقي من حديث ابن عباسؓ باسناد ضعيف "أنه عليه الصلاة والسلام كان يصلي في رمضان عشرين ركعة سوى الوتر" أى في بعض الليالي، لا في اكثرها والمسئلة ليست من الفرائض والواجبات بل هي من الفضائل والتطوعات والحديث الضعيف مقبول فيها اذا لم يعارضه حديث صحيح وقدبينا أنه لا معارضة بين حديث العشرين وحديث عائشة اذا حمل حديثها على الاوقات الغالبة والأحوال الاكثرية ولاسيما اذا اتفق جمهور الصحابة والتابعين على العشرين في اخر الامر قال البيهقي "ثم استقر الأمر على العشرين فإنه المتوارث."

وفي فتح الباري(۳/۱۶): وظهر لي أن الحكمة في عدم الزيادة على احدى عشرة أن التهجد والوتر مختص بصلاة الليل وفرائض النهار الظهر وهي أربع والعصر وهي أربع والمغرب وهي ثلاث وتر النهار فناسب ان تكون صلوة الليل كصلاة النهار في العدد جملة وتفصيلاً وأما مناسبة ثلاث عشرة فبضم صلاة الصبح لكونها نهارية إلى ما بعدها.

(۲۵۹) بغیر روزہ رکھے تراویح کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں سانس کا مریض ہوں روزے رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ایک روز تراویح کیلئے چلا گیا تو ایک صاحب نے کہا کہ تراویح اس شخص پر لازم ہے جو روزے رکھ رہا ہو، چونکہ آپ روزے نہیں رکھ رہے اس لئے آپ کو تراویح نہیں پڑھنی چاہیے۔ کیا اس شخص کی بات صحیح ہے؟ اور کیا روزے نہ رکھنے والا تراویح ادا کرسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تراویح سنت مؤکدہ ہے، اس کا چھوڑنا اور بغیر عذر کے چھوڑنے پر اصرار کرنا جائز نہیں اور تراویح رمضان کے روزوں کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ بلکہ رمضان کے روزے اور رمضان میں رات کا قیام یعنی تراویح دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔ لہٰذا جو شخص روزہ رکھنے سے معذور ہے اور تراویح پڑھنے پر قادر ہے، تو اس کو تراویح پڑھنی چاہیے۔ اگرچہ روزہ نہ رکھتا ہو۔

لمافی الهندية(۱/۱۱٦): وهي سنة رسول الله ﷺ وقيل هي سنة عمر رضي الله عنه، والاول اصح كذا في جواهر الاخلاطي، وهي سنة للرجال والنساء جميعاً، كذا في الزاهدي ونفس التراويح سنة على الاعيان عندنا كما روى الحسن عن ابي حنيفةؒ وقيل تستحب والاول أصح.

وفي الدر المختار(۲/۴۳): (التراويح سنة) مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين (للرجال والنساء) اجماعاً.

وفي الشامية(۲/۱۲): ولهذا كانت السنة المؤكدة قريبة من الواجب في لحوق الأثم كمافي البحر، ويستوجب تاركها التضليل واللوم كمافي التحرير اى على سبيل الاصرار بلا عذر.

(۲٦۰) تراویح میں امام کو کھانسی وغیرہ کے ذریعے غلطی پر متنبہ کرنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید تراویح پڑھاتا ہے اور عمرو سامع ہے، زید عمرو سے کہتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی تلاوت میں ہوجائے تو آپ صرف کھانسی یا کھنکارنے کے ذریعے مجھے مطلع کیجئے اگر پھر بھی صحیح نہ کرسکا تو پھر بھلے آپ بتا بھی سکتے ہیں، اس کے ساتھ یہ بات یاد رہے کہ یہ ساری کہانی جو حضرت قاری صاحب نے بنا رکھی ہے، اس لئے کہ مقتدیوں کو پتہ نہ چلے کہ کیسا حافظ ہے۔ آپ علماء سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس صورت میں نماز کا کیا حکم ہوگا آیا نماز میں کچھ فساد تو نہیں آئے گا۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....نماز میں کسی عذر (مثلاً گلے میں خراش وغیرہ) کی وجہ سے کھانسنا یا غرض صحیح (مثلاً تحسین صوت یا مقتدی کا امام کو غلطی پر متنبہ کرنے پر) کھانسنا یہ مفسدِ صلوٰة نہیں۔ اور اگر بلا عذر اور بلاوجہ کھانسا جائے تو اس سے نماز ٹوٹ جائے گی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں سامع کا قاری کی تلاوت میں غلطی آنے پر اس وجہ سے کھنکارنا کہ دوسرے لوگ غلطی پر مطلع نہ ہوں اور قاری صاحب کو پتہ چل جائے اس سے نماز تو فاسد نہ ہوگی البتہ اس طرح کرنا ایک نامناسب حرکت ہے اس سے گریز کرنا چاہئے۔

لما في الشامية (۱/۶۱۹): (قوله على الصحيح) لانه يفعله لاصلاح القراءة فيكون من القراءة معنى كالمشي للبناء فانه وإن لم يكن من الصلاة لكنه لاصلاحها فصار منها معناً شرح المنية عن الكفاية، لكنه لايشمل مالو كان لاعلام انه في الصلاة اوليهتدي امامه الى الصواب. والقياس الفساد في الكل الافي المدفوع اليه كما هو قول ابي حنفية ومحمد لانه كلام، والكلام مفسد على كل حال كما مر وكأنهم عدلوا بذلك عن القياس وصححوا عدم الفساد به اذا كان لغرض صحيح لوجود نص.

وفي الفقه الاسلامي (۲/۱۰۲۳): وتبطل بالتنحنح بحرفين بلاعذر، فان وجد عذر، كان نشأ من طبعه فلا تفسد، كمالا تفسد ان كان لغرض صحيح كتحسين الصوت، اوليهتدي امامه الى

الصواب، اوللاعلام انه فی الصلاة، فلا فساد علی الصحیح، وھکذا فإن التنحنح عن عذر لا یفسد الصلاة.

(۲۶۱) نمازِ تراویح کی بیس رکعات کا دو اماموں کا پڑھانا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں رمضان المبارک کے مہینے میں تراویح کیلئے دو امام ہوتے ہیں ایک امام صاحب سولہ رکعت پڑھاتے ہیں اور دوسرے چار رکعت پڑھاتے ہیں دونوں مل کر قرآن پاک مکمل سناتے ہیں معلوم یہ کرنا ہے کہ نماز تراویح دو امام پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... تراویح کی نماز دو امام پڑھا سکتے ہیں۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ (۱/۶۴): اذا صلی الترویحة الواحدة امامان کل امام رکعتین اختلف المشایخ فیه والاصح انه لایستحب لکن کل ترویحة یؤدیها امام واحد.

وفی الهندیة (۱/۱۱۶): واذا جازت التراویح بامامین علی هذا الوجه جاز ان یصلی الفریضة احدهما ویصلی التراویح الاخر وقد کان عمرؓ یؤمهم فی الفریضه والوتر وکان ابی یؤمهم فی التراویح کذا فی السراج الوهاج.

(۲۶۲) تراویح میں ایک امام کا بارہ رکعات، دوسرے کا آٹھ رکعات پڑھانا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں دو سال سے یہ معمول ہو گیا ہے کہ رمضان المبارک میں تراویح دو امام پڑھاتے ہیں۔ ایک بارہ رکعات اور دوسرا آٹھ رکعات، تو کیا ایک مصلے پر دو امام ایک قرآن سنا سکتے ہیں؟ یا ایک ہی کو سنانا چاہئے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کے دور میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟ اور افضل صورت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ایک امام کا بارہ رکعات اور دوسرے کا آٹھ رکعات پڑھانا درست ہے۔ جبکہ ایک امام پورا ایک ترویحہ پڑھائے۔ رہی یہ بات کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں اس کی کوئی مثال تو اس کے متعلق صاحب الجوہرۃ النیرۃ علامہ ابو بکر بن محمد رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز اور وتر پڑھاتے اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز تراویح پڑھاتے تھے۔ لہذا دو اماموں کا نماز پڑھانا اور انصراف جائز ہے۔

لمافی الجوهرة النیرة طبع مکتبه رحمانیه (۱/۲۴۶): والأفضل أن یصلّی التراویح بامام واحد لأنّ عمر رضی الله عنه جمع الناس علیٰ قارئ واحد، وهو أبی بن کعب رضی الله عنه، فان صلوها بامامین فالمستحب ان یکون انصراف کل واحد علی کمال الترویحة فإن انصرف علی تسلیمة، لا

یستحب ذلک وکان عمر رضی الله عنه یؤمهم فی الفریضة والوتر، وکان أبی بن کعب رضی الله عنه یؤمهم فی التراویح.

وفی فتاویٰ قاضی خان(۱/۱۱۲): ولو أقاموا التراویح بإمامین فصلّی کل امام تسلیمة بعضهم جوّزوا ذلک والصحیح أنّه لا یستحب وانما یستحب ان یصلی کل امام ترویحة لیکون موافقا عمل أهل الحرمین.

وفی الهندیة(۱/۱۱۶): والأفضل أن یصلّی التراویح بإمام واحد فان صلّوها بإمامین فالمستحب ان یکون انصراف کل واحد علی کمال الترویحة فان انصرف علی تسلیمة لا یستحب ذلک فی الصحیح.

(۲۶۳) فلیٹ میں نماز پنجگانہ اور تراویح پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ ماریہ لگژری اپارٹمنٹ میں ابھی حال ہی میں رہائش پذیر ہوئے ہیں یہاں سارے فلیٹ ہیں کیونکہ یہاں نہ کوئی مسجد بنائی گئی ہے اور نہ ہی کوئی مسجد کی جگہ دی ہے لہٰذا ہم لوگ آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ماریہ فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں نماز تراویح اور پانچوں وقت کی نماز ادا کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صحت نماز کیلئے مسجد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ زمین کے ہر ہر جزء اور موضع میں نماز جائز ہے اگرچہ مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں نماز پنجگانہ اور تراویح جائز ہے۔ البتہ اس جگہ کی حیثیت شرعاً مسجد کی نہ ہوگی کیونکہ مسجد کیلئے ضروری ہے کہ مالک اس جگہ میں ہمیشہ کیلئے لوگوں کو نماز کی اجازت دیتے ہوئے اس کو اپنی ملکیت سے خارج کردے چنانچہ پھر یہ جگہ اس کی میراث میں بھی تقسیم نہ ہوگی جبکہ صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہے۔

لمافی البخاری(۱/۶۲): باب قول النبیؐ جعلت لی الارض مسجدا وطهورا. عن جابر بن عبدالله رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اعطیت خمسا لم یعطهن احد من الأنبیاء قبلی، نصرت بالرعب مسیرة شهر وجعلت لی الارض مسجدا و طهورا الخ.

وفی البحر الرائق(۵/۲۱۶): ولا قال المصنفؒ ومن جعل ارضه مسجدا بدل قوله ومن بنی لکان اولی لأنه لو کان له ساحة لابناء فیها فأمر قومه ان یصلوفیها بجماعة قالوا ان امرهم بالصلوة فیها ابدا او أمرهم بالصلوة فیها بالجماعة ولم یذکر ابدا الا أنه ارادبها الأبد ثم مات لایکون میراثا عنه وان امرهم بالصلاة شهرا او سنة ثم مات تکون میراثا عنه لأنه لابدمن التابید والتوقیت ینافی التابید کذا فی الخانیة.

(۲۶۴) نمازِ تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد قہوہ پینا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب نمازِ تراویح میں چار رکعت کے بعد قہوہ پیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس سے میرا گلہ صاف ہو جاتا ہے؟ تو کیا تراویح کی نماز کے دوران اس عذر پر قہوہ پینا درست ہے؟ نمازِ تراویح بکروہ تو نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی میٹھی چیز پی کر نماز کے اندر داخل ہو جائے جبکہ اس کے منہ میں مٹھاس باقی ہو، اور وہ اس کو نگلتا ہے تو اس سے نماز کی صحت پر کچھ فرق نہیں آئے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں تراویح کی نماز کے دوران جبکہ عذر بھی ہے قہوہ پینا جائز ہے۔

لما في الهندية(۱/۱۰۲): اذا كان بين اسنانه شئ من الطعام فابتلعه ان كان قليلاً دون الحمصة لم تفسد صلوته الا أنه يكره، وان كان مقدار الحمصة فسدت......

......ولو أكل شيأ من الحلاوة وابتلع عينها فدخل فى الصلوة فوجد حلاوتها فى فيه فابتلعها لا تفسد صلوته ولو ادخل الفانيد او السكر فى فيه ولم يمضغه لكن يصلي والحلاوة تصل الى جوفه تفسد صلاته.

وفي الشامية(۱/۶۲۳): قوله كسكر الخ، أفاد ان المفسد اما المضغ الكثير أو وصول عين المأكول الى الجوف بخلاف الطعم. قال فى البحر عن الخلاصة: ولو أكل شيأ من الحلاوة وابتلع عينها فدخل فى الصلاة فوجد حلاوتها فى فيه وابتلعها لاتفسد صلاته، ولو ادخل الفانيد او السكر فى فيه ولم يمضغه لكن يصلي والحلاوة تصل الى جوفه تفسد صلاته.

(۲۶۵) نمازِ تراویح کے بعد اجتماعی دعا مانگنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نماز اور تراویح اور اسی طرح جب وتر نماز جماعت کے ساتھ رمضان المبارک میں ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد دعا انفرادی طور پر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اس دعا کو ایک ہیئت اور جمعیت کے ساتھ لازم سمجھنا کہ امام کے ساتھ دعا کے بغیر کوئی بھی نہ اُٹھے تو یہ کام کیسا ہے؟ شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق ہے یا نہیں تو دونوں کی ادلہ اربعہ شرعیہ سے وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا مانگنا ثابت ہے البتہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا پر ایسا التزام ودوام کرنا کہ جو شخص اس اجتماعی دعا میں شامل نہ ہو رہا ہو اس پر طعن وتشنیع کی جائے درست نہیں نیز تراویح کے بعد اجتماعی طور پر دعا ثابت تو نہیں البتہ تلاوتِ قرآن کے بعد دعا کے قبول ہونے کے بارے میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں اس لئے کبھی کبھار ترک کے ساتھ سنت سمجھے بغیر اگر تراویح کے بعد دعا کر لی جائے تو حرج نہیں اور اکابرین سے یہ متوارث بھی ہے تاہم رمضان کے وتر کی

جماعت کے بعد بھی اسی اجتماعی ہیئت سے دعا مانگنا صحیح نہیں۔

لما فی اعلاء السنن(۱۹۳/۳): واعلم انه قد وقع العرف فی دیارنا ان الامام والقوم یدعون مستقبل القبلة رافعی ایدیهم عقیب السلام معافی الظهر والمغرب والعشاء ولا ینحرف الامام فی هذه الاوقات عن القبلة وبعد العصر والفجر ینحرف یمینا وشمالا ویقرأ شیئاً من الورد جالسا. وکذا القوم معه ثم یدعون فانکر بعض الناس علی ذلک بوجهین اما اولا فلعدم انحراف الامام یمینا وشمالا فی الظهر والمغرب والعشاء ودعائه مستدبرا للمأمومین. وقد ثبت انه ﷺ کان ینحرف دائما، واما ثانیا فلان الدعاء بعد السلام من الصلاة لم یثبت عنه ﷺ بل عامة الادعیة المتعلقة بالصلاة انما فعلها فیها، وامر بها فیها. والجواب عن الاول بانه قد ثبت عنه ﷺ انه دعا فی بعض الاحیان مستقبل القبلة مستدبرا القوم ...... وعن الثانی بان الدعاء بعد السلام ثبت عنه ﷺ، قولا وفعلا، وانکار ذلک مکابرة الخ......

وفیه ایضاً(صـ۱۹۴): قوله عن ابی امامة الخ، قلت فیه اثبات الدعا بعد الصلاة فاندحض به ماأورده ابن القیم ان الدعاء بعد السلام من الصلاة مستقبل القبلة او المأمومین. فلم یکن من هدیه ﷺ اصلا ولا روی عنه باسناد صحیح ولا حسن...... قلت قد ثبت ذلک عنه ﷺ قولا وفعلا فهذا حدیث ابی امامة فیه ارشاد الامة بالدعاء بعد الصلوات المکتوبات واما تاویله بان المراد من دبر الصلوات ما قبل السلام کما زعمه ابن القیم فباطل...... فان فیه یسبحون دبر کل صلاة وهو بعد السلام جزماً......

وفی سنن الدارمی(۵۶۱/۲): عن مجاهد قال بعث الی قال انمادعوناک انا اردنا ان نختم القرآن وانه بلغنا ان الدعاء یستجاب عند ختم القران قال فدعوا بدعوات.

(۲۶۶) تراویح کی جماعت ثانی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چچازاد بھائی امریکہ میں رہتے ہیں انہوں نے ایک مسئلہ معلوم کروایا ہے کہ امریکہ میں بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مسجد میں محراب میں تھوڑے وقفے سے دو الگ تراویح کی جماعت ہوتی ہیں، دراصل لوگوں کی ڈیوٹی ٹائمنگ کچھ ایسی ہے کہ یوں کرنا پڑتا ہے؟ اس میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرض نماز میں جماعت ثانی جماعت اولیٰ کی تبدیل ہیئت کے باوجود مکروہ ہے لیکن تراویح میں فرائض کی بہ نسبت توسع ہے اس لئے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے تراویح کی جماعت ثانی پہلی جماعت کی ہیئت کی تبدیلی کے ساتھ

درست ہے اور ہمارے اسلاف رحمہ اللہ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ امداد الاحکام (۶۳۴/۱) میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ چونکہ آپ کے مسئلہ میں جماعت ثانی پہلی جماعت کی ہیئت پر ہے اس وجہ سے یہ دوسری جماعت مکروہ ہے نیز اگر پہلا امام اور پہلے مقتدی دوسری مرتبہ تراویح کی جماعت کرواتے ہیں تو یہ جماعت ثانی مکروہ ہے خواہ مسجد میں پڑھیں یا مسجد سے باہر پڑھیں۔

لمافی الشامیة(۵۵۳/۱): عن ابی یوسف رحمه الله انه اذا لم تکن الجماعة علی الهیئة الاولی لا تکره والا تکره وهو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الهیئة کذا فی البزازیة.

وفی کبیری(ص۳۸۹): ولو امّ فی التراویح مرّتین فی مسجد واحد کره.

وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص۳۳۵): وکره ان یوم فی التراویح مرّتین فی لیلة واحدة وعلیه الفتوی لان السنة لاتتکرر فی الوقت الواحد فتقع الثانیة نفلا مضمرات.

وفی قاضی خان(۱۱۲/۱): ولو صلی التراویح مرّتین فی مسجد واحد یکره کما لو اذّن واقام مرّتین فی مسجد واحد واختار الفقیه ابو اللیث قول ابی بکر هذا اذا امّ للناس مرّتین.

وفی الهندیة(۱۱۶/۱): ولو صلی التراویح مرّتین فی مسجد واحد یکره.

(۲۶۷) عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت چھوڑنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک بچپن کے دوست ہیں ہم دونوں کلاس فیلو بھی رہے ہیں ان بیچاروں کو ڈکار کا مرض ہے، اور ڈکاریں بھی گیس کی آتی ہیں۔ نماز تراویح میں انہیں بڑی پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آیا اس صورت میں وہ نماز تراویح چھوڑ سکتے ہیں؟ یا تنہا گھر پر پڑھ لیا کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر گیس کی ڈکاریں ایسی ہوں کہ جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو مثلاً ان میں بدبو ہو یا ڈکاریں ایسی آواز ہوں کہ جن کی وجہ سے پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہو، تو ایسی صورت میں تراویح کی نماز گھر پے ادا کر سکتا ہے۔ البتہ بغیر عذر کے تراویح کی نماز کو بالکل چھوڑ دینا جائز نہیں کیونکہ تراویح سنت مؤکدہ ہے اور بغیر عذر کے سنت مؤکدہ کے چھوڑنے پر اصرار کرنے میں گناہ ہے۔

لمافی الشامیة(۱۲/۲): (قوله سن مؤکدا)...... زیادة علی بقیة النوافل ولهذا کانت السنة المؤکدة قریبة من الواجب فی لحوق الاثم کمافی البحر، ویستوجب تارکها التضلیل واللوم...... ای علی سبیل الاصرار بلا عذر.

وفی الشامیة(۶۶۱/۱): کل ماله رائحة کریهة ماکولا او غیره...... وکذلک الحق بعضهم بذلک من بفیه بخر اوبه جرح له رائحة وکذلک القصاب والسماک والمجذوم والابرص اولی بالالحاق

وقال سحنون لاأرى الجمعة عليهما.

وفي الهندية(۱/۸۳): وتسقط الجماعة بالاعذار حتى لا تجب على المريض والمقعد والزمن ومقطوع اليد والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذى لا يستطيع المشى والشيخ الكبير العاجز والاعمى عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ والصحيح انها تسقط بالمطر والطين والبرد الشديد والظلمة الشديدة كذا فى التبيين وتسقط بالريح فى الليلة المظلمة..... أو كان اذا خرج يخاف أن يحسبه غريمه فى الدين أو يريد سفرا واقيمت صلاة فيخشى ان تفوته القافلة أو كان قيما لمريض أو يخاف ضياع ماله.

وفي الدر المختار(۱/۵۵۴،۵۵۵،۵۵۶): (فتسن أو تجب) ثمرته تظهر فى الإثم بتركها مرة (على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج) ولو فاتته ندب طلبها فى مسجد آخر الا المسجد الحرام ونحوه (فلا تجب على مريض ومقعدوزمن ومقطوع يدورجل من خلاف) او رجل فقط...... (وبرد شديد وظلمة كذلک) وريح ليلا لانهارا، وخوف على ماله او من غريم او ظالم أو مدافعة أحد الأخبثين الخ.

(۲۶۸) بیس رکعات تراویح کا دورانیہ کتنا ہو؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں حفاظ نماز تراویح مختلف انداز اور رفتار سے پڑھاتے ہیں۔کوئی تو ڈیڑھ دو گھنٹے لگا دیتا ہے اور کوئی آدھ پون گھنٹے میں فارغ کر دیتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ بیس رکعات نماز تراویح کتنی دیر میں ختم ہونا چاہئے؟اس بارے میں شریعت کا کوئی حکم ہے؟اگر ہے تو براہ کرم مرحمت فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......بیس رکعات نمازِ تراویح ختم کرنے کا کوئی متعین وقت مقرر نہیں قاری کی اس رفتار کا اعتبار ہے جو شریعت میں معتبر ہے لہٰذا شرعاً اتنی مقدار پڑھنے کی اجازت ہے جس سے لوگ تراویح کی جماعت میں آنے سے متنفر نہ ہوں اور اتنی سرعت کے ساتھ پڑھنا کہ الفاظ پوشیدہ رہ جائیں یا اپنے مخارج سے ادا نہ ہوسکیں مکروہ ہے بلکہ بین بین ہو یعنی نہ تو اتنی تیز رفتاری ہو کہ سمجھ میں ہی نہ آئے، اور نہ اتنی سست روی کہ لوگ اکتا جائیں۔

لمافي الهندية(۱/۱۱۸): والافضل فى زماننا أن يقرأ بما لا يؤدى إلى تنفير القوم عن الجماعة لكسلهم لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراء ة.

وفي الشامية(۱/۵۴۱): (قوله وفى الحجة) اسم كتاب من كتب الفتاوى(قوله بين بين) أى بأن تكون بين الترسل والاسراع.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۲/۱۰۹۰): قال احمد رحمه الله! یقرأ الامام بالقوم فی شهر رمضان ما یخف علی الناس ولا یشق علیهم.

(۲۶۹) نمازِ تراویح کے بعد قرآن مجید کا خلاصہ بیان کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس رمضان میں پورے مہینے میری رات کی ڈیوٹی رہی میں اپنی فیکٹری کے قریب جا کر ہی ایک مسجد میں تراویح پڑھتا تھا۔ چونکہ ڈیوٹی کا وقت تھوڑی دیر میں شروع ہوتا تھا اس لئے تراویح کے بعد کچھ دیر وہیں تلاوت کا معمول بنانے کا سوچا تھا لیکن اس مسجد میں تراویح کے بعد تھوڑی دیر خلاصہ سنایا جاتا تھا، میں بھی اس میں شریک ہوجاتا تھا، مجھے یہ انداز بہت اچھا لگا، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں یہ بدعت میں تو شمار نہیں ہوتا؟ آپ مجھے اس بارے میں صحیح صحیح بتادیں کہ آئندہ میں اسی کے مطابق عمل کروں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر وہ کام جو دین نہ ہو پھر اسے دین سمجھ کر کرنا بدعت کہلاتا ہے۔ لہٰذا تراویح کے بعد خلاصہ بیان کرنا بدعت نہیں۔ بلکہ یہ اشاعت للدین کے زمرہ میں آتا ہے۔ اور اس کے لئے ہر وہ صورت جو کہ قواعد شرع کے خلاف نہ ہو اختیار کرنا جائز ہے۔ جبکہ دیگر موانع موجود نہ ہوں، مثلاً نمازیوں کو اس طور سے پابند کرنا نہ پایا جاتا ہو کہ جس سے وہ دین کی بات سننے سے اکتا جائیں۔ حاصل کلام یہ کہ جو نمازی اپنی خوشی سے آسانی کے ساتھ بیٹھ کر سننا چاہیں ان کیلئے مناسب مقدار میں بیان کر دینا چاہیے۔

لما فی مرقاۃ المفاتیح(۱/۲۱۶): قال النووی رحمه الله: البدعة کل شئ عمل علی غیر مثال سبق وفی الشرع احداث مالم یکن فی عهد رسول الله ﷺ.

وفی فتح الباری(۱/۱۳۳): قال: کان عبدالله یذکر الناس فی کل خمیس فقال له رجل یا ابا عبدالرحمن لوددت انک ذکرتنا کل یوم قال أما إنه یمنعنی من ذلک أنی أکره أن املکم وإنی أتخو لکم بالموعظة کما کان النبی ﷺ یتخولنا بها مخافة السامة علینا.

ویستفاد من الحدیث استحباب ترک المداومة فی الجد فی العمل الصالح خشیة الملال وان کانت المواظبة مطلوبة لکنها علی قسمین اما کل یوم مع عدم التکلف واما یوما بعد یوم فیکون یوم الترک لاجل الراحة لیقبل علی الثانی بنشاط واما یوما فی الجمعة ویختلف باختلاف الاحوال والاشخاص والضابط الحاجة مع مراعاة وجود النشاط.

(۲۷۰) تراویح میں دوسرے ختم کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں ایک قاری صاحب نے قرآن

مجید کا ختم کیا اپنی مسجد میں دوسرا ختم وہ اسی مسجد میں نہیں کرسکتا جبکہ مقتدین حضرات کہتے ہیں کہ دوسرا ختم بھی سناؤ کیونکہ تین ختم مسنون ہوتے ہیں آپ حضرات تفصیل سے آگاہ فرمائیں کہ تین ختم کرنا اس قاری صاحب کیلئے ضروری ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً...... واضح رہے کہ رمضان المبارک میں ایک مرتبہ تراویح میں قرآن پاک ختم کرنا سنت ہے ایک سے زیادہ مرتبہ افضل ضرور ہے لیکن لازمی اور ضروری نہیں۔ لہٰذا صورت مذکورہ میں مقتدین حضرات کا قاری صاحب کے اوپر زبردستی کرنا (کہ آپ دوسرا ختم بھی سنائیں) درست نہیں تاہم اگر وقت ہو، اور قاری صاحب اپنی خوشی سے سنانا چاہیں تو افضل اور بہتر ہے ورنہ ایک ہی ختم کافی ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۱۷):السنة فی التراويح انما هو الختم مرّة فلا يترک لکسل القوم...... والختم مرتين فضيلة والختم ثلاث مرات افضل كذا فی السراج الوهاج.

وفی الدر المختار(۲/۴۶): (والختم) مرّة سنة ومرتين فضيلة وثلاثا افضل (ولا يترک) الختم (لکسل القوم).

﴿فصل فی الوتر﴾

(وتر سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۷۲) دعائے قنوت کے وقت ہاتھ کانوں تک اٹھانا، اور قنوت نازلہ پڑھنے کا وقت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا قرآن وحدیث میں وتروں میں دعائے قنوت کے وقت رفع یدین کا ثبوت ہے یا نہیں؟ اور قنوت کے وقت ہاتھ کہاں باندھے؟ اور قنوت نازلہ کن کن نمازوں میں پڑھی جاسکتی ہے، اور قنوت نازلہ کے وقت ہاتھ باندھنے ہیں یا چھوڑنے ہیں؟ کن حالات میں قنوت نازلہ پڑھنی چاہئے؟ جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... وتروں میں دعائے قنوت کے وقت رفع یدین ثابت ہے البتہ اگر وتر فوت ہوجائے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھنا ہو تو ہاتھ نہ اٹھانے کی بھی گنجائش ہے تاکہ لوگوں کو اس کی سستی پر علم نہ ہو، اور قنوت کے وقت ہاتھوں کو زیر ناف باندھے اور قنوت نازلہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف نماز فجر میں مسلمانوں پر سخت حالات مثلاً (قحط، وباء، خوف) کے وقت پڑھنی چاہئے اور قنوت نازلہ کے وقت ہاتھوں کو چھوڑنا بہتر ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۱۱): اذا فرغ من القراء ة فی الركعة الثالثة كبرورفع يديه حذاء اذنيه ويقنت قبل الركوع....... واختلفوا انه يرسل يديه فی القنوت ام يعتمد و المختار انه يعتمد.

وفی الدرالمختار(۲/۶): (ويكبر قبل ركوع ثالثته رافعا يديه) كما مرثم يعتمد وقيل كالداعی (وقنت فيه) (فی رد المحتار قوله رافعايديه) ای سنة الی حذاء اذنيه كتكبيرة الاحرام وهذا كما فی الامداد عن مجمع الروايات لوفی الوقت اما فی القضاء عند الناس فلا يرفع حتی لايطلع احد على تقصيره..... (قوله ثم يعتمد) ای يضع يمينه على يساره كما فی حالة القراء ة (قوله وقيل كالداعی) ای عن ابی يوسفؒ انه يرفعهما الی صدره وبطونهما الی السماء امداد والظاهر انه يبقيهما كذلك الی تمام الدعاء على هذه الرواية تأمل.

وفی تنوير الابصار مع الدر(۲/۸، ۹): (وياتی الماموم بقنوت الوتر لاالفجر بل يقف ساكتا على الاظهر) مرسلايديه قال الشامی تحت(قوله مرسلايديه) لان الوضع سنة قيام طويل فيه مسنون

وهذا الذكر ليس بمسنون عندنا.

(۲۷۲) دعائے قنوت سے پہلے رفع یدین کا حدیث سے ثبوت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ صلوٰۃ وتر میں دعائے قنوت پڑھتے وقت رفع الیدین کرنا کہاں سے ثابت ہے آثار صحابہ اور احادیث نبوی سے مزین جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... وتر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے وقت رفع الیدین کرنا احادیث نبوی اور آثار صحابہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمرؓ کے تعامل سے ثابت ہے۔

لمافي السنن الكبرى(۲/۲۱۱): عن سلمان الفارسي رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال إن الله حيي كريم يستحيي اذا رفع الرجل إليه يديه ان يردهما صفرا خائبتين. رفعه جعفر بن ميمون هكذا وقفه سليمان التيمي عن أبي عثمان في احدى الروايتين عنه والحديث في الدعاء جملة الا ان عددا من الصحابة رضي الله تعالىٰ عنهم رفعوا أيديهم في القنوت مع مارويناه عن انس بن مالك عن النبي ﷺ.

وفي اعلاء السنن(۶/۸۶): عن أبي عثمان: "كان عمر رضي الله تعالىٰ عنه يرفع يديه في القنوت.

وفي شرح معاني الآثار(۱/۴۱۷): وقدروى في ذلك عن ابراهيم النخعي ماحدثنا سليمٰن بن شعيب بن سليمٰن عن ابيه عن ابي يوسف عن ابي حنيفة عن طلحة بن مصرف عن ابراهيم النخعي قال ترفع الايدى في سبع مواطن في افتتاح الصلوة وفي التكبير للقنوت في الوتر وفي العيدين وعند استلام الحجر و على الصفا والمروة وبجمع وعرفات وعند المقامين عند الجمرتين.

(۲۷۳) دعائے قنوت کیلئے ہاتھ کانوں تک اٹھا کر باندھنے کا ثبوت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وتر میں دعائے قنوت کے وقت جو ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں آیا یہ کانوں تک اٹھا کر باندھنا کسی حدیث یا نص سے ثابت ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دعا کی صورت میں اٹھانا چاہیے، ان کی بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز وتر میں دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے، اور دعائے قنوت کیلئے کانوں کی لو تک ہاتھوں کو اٹھانا اور پھر دونوں ہاتھوں کو باندھنا سنت ہے۔ صورت مسئولہ میں دعائے قنوت کیلئے دونوں ہاتھوں کو اُٹھانا یہ حدیث مبارکہ سے ثابت ہے حدیث مبارکہ یہ ہے:

(۱)۔"عن ابراهيم قال: ارفع يديك للقنوت"۔(مصنف ابن ابی شیبہ،۴/۵۳۱)

(۲)۔"عن ليث، عن ابن الاسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعودؓ: أنه كان يرفع يديه إذا قنت في الوتر"۔(مصنف ابن ابی شیبہ،۴/۵۳۱)

لیکن ہاتھوں کے اُٹھانے میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ کانوں کی لوتک دونوں ہاتھوں کو اُٹھایا گیا ہو، یا دعاء کی طرح دونوں ہاتھوں کو سینے تک اُٹھایا گیا ہو۔لہٰذا ان احتمالات کی وجہ سے ان احادیث کو کانوں کی لوتک اُٹھانے پر بطور استدلال پیش نہیں کیا جاسکتا۔البتہ فقہاء اور علماء کے اقوال اور افعال سے دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لوتک اُٹھا کر باندھنا ثابت ہے۔وہ اس طرح کہ دعائے قنوت میں دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لوتک اُٹھانے کو احنافؒ نے تکبیر تحریمہ پر قیاس کیا ہے کیونکہ تکبیر تحریمہ میں کانوں کی لوتک اُٹھانا مسنون ہے۔

اور پھر دونوں ہاتھوں کو باندھنا قیام پر جس میں طویل اور مسنون ذکر ہو، قیاس کیا ہے۔لہٰذا فقہاء احناف نے احادیث میں رفع یدین کے دونوں احتمالوں کو قیاس سے ثابت کیا ہے۔

لمافي المصنف لابن ابي شيبة(۴/ ۵۳۱): ۵۹۴. في رفع اليدين في قنوت الوتر.

۷۰۲۶. حدثنا ابو الاحوص، عن مغيرة، عن ابراهيم قال: ارفع يديك للقنوت.

۷۰۲۷. حدثنا معاوية بن هشام قال: حدثنا سفيان، عن ليث، عن عبدالرحمن بن الأسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعود: انه كان يرفع يديه في قنوت الوتر.

۷۰۲۸: حدثنا عبدالرحمن بن محمد المحاربي: عن ليث: عن ابن الاسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعود: انه كان يرفع يديه اذا قنت في الوتر.

وفي الدرالمختار (۲/۶): (ويكبر قبل ركوع ثالثته رافعا يديه) كمامر ثم يعتمد، وقيل كالداعي (وقنت فيه) ويسن الدعاء المشهور، ويصلي على النبي ﷺ به يفتى.

وفي الشامية تحته: (قوله رافعاً يديه) أي سنة الى حذاء أذنيه كتكبيرة الاحرام وهذا كما في الامداد عن مجمع الروايات لوفي وقت، أما في القضاء عند الناس فلا يرفع حتى لا يطلع احد على تقصيره اهـ (قوله كمامر) أي في فصل اذا اراد الشروع في الصلوٰة عند قوله ولا يسن رفع اليدين الا في سبع. (قوله ثم يعتمد) أي يضع يمينه على يساره كمافي حالة القراءة ح (قوله وقيل كالداعي) أي عن أبي يوسف انه يرفعهما الى صدره وبطونهما الى السماء امداد، والظاهر أنه يبقيهما كذلك الى تمام الدعاء على هذه الرواية تامل (قوله وقنت فيه) اى في الوتر او الضمير الى ماقبل الركوع.

وفي اعلاء السنن(۶/۱۲۲): وأما السادس: فلم أرفقهائنا تعرضوا له خصوصاً، نعم مقتضى اطلاقهم ان من محال الرفع القنوت وهو يعم قنوت النوازل أيضاً ان يرفع يديه عنده، ولكن الدليل الذى

استدل به الحنفية للرفع في قنوت الوتر لايعم غيره، بل يختص به، هو أثر ابراهيم النخعي بسند صحيح عند الطحاوي، قال "ترفع الايدى في سبع مواطن، في افتتاح الصلاة وفي التكبير للقنوت في الوتر الخ.

وفيه ايضاً(صـ۱۲۳،۱۲۴): بقي أنه لا دليل فيه ولا في أثر غيره على أنه ﷺ كان يضع يديه بعد رفعهما حيال منكبيه او يرسلهما، فمن اين قال ابو حنيفةؒ وابو يوسفؒ بالوضع في القنوت بعده؟ والجواب: أن الوضع والارسال بعد الرفع مسكوت عنهما في الاحاديث، فجرى محمدؒ على الأصل وهو الإرسال، لأن الوضع عمل حادث يحتاج الى الدليل، وأخذ الشيخان بالقياس وقالا: إن ارسال اليدين زمانا طويلا ينافي الخشوع، وإنما السنة أن نقول وضع الكف على الكف تحت السرة كما مر في باب صفة الصلاة، وكان مقتضى ذلك ان نقول بالوضع في القومة بين الركوع والسجدة أيضاً، لكن في الوضع للقيام اليسير وتركه معا حرج، فقلنا بأن الوضع سنة قيام فيه ذكر مسنون طويل، فيضع يديه في القنوت للنازلة أيضاً، لكونه ذكر اطويلا، ولا يرفعهما حذاء الوجه، فقدروى مسلم عن حصين عن عمارةؓ بن رويبة: "رأى بشر بن مروان على المنبر رافعاً يديه، فقال، قبح الله هاتين اليدين، لقد رأيت رسول الله ﷺ مايزيد على أن يقول بيده هكذا، وأشار باصبعة المسبحة اهـ(۱/۲۸۷) فلما أنكر على الرفع في حال الخطبة التي هي مشابهة بالصلاة فكيف في عين الصلاة؟ فما ورد عن النبي ﷺ أنه رفع يديه يدعو في القنوت للنازلة، وما ورد عن عمر مثله محمول على الرفع القصير الذي يكون قبل القنوت وهذا هو الأمر التاسع فافهم.

......وايضاً(صـ۱۲۳): والحاصل: أنه يضع عند الشيخين في القنوت سواء كان قبل الركوع أو بعده، وعند محمد يرسل ولا يرفع يديه في خلال القنوت خذاء الوجه او الصدر كرفعهما في الدعاء خارج الصلاة عندهم اتفاقاً، فإن المشروع عندهم بعد رفعهما في افتتاح الصلاة أو عند القنوت، إما الوضع وإما الإرسال لا إبقائهما مرفوعتين الخ.

(۴۷۴) دعائے قنوت کی جگہ سورۂ اخلاص پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں جن عورتوں کو دعائے قنوت نہیں آتی وہ اس کی جگہ ''سورہ اخلاص'' پڑھتی ہیں تو کیا اس سے دعائے قنوت کا وجوب ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا ان عورتوں پر ان سب وتر نمازوں کی قضاء کرنا واجب ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً...... وتر کی تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے کوئی مخصوص دعا پڑھنا واجب نہیں بلکہ کوئی بھی دعا پڑھ سکتے ہیں البتہ احنافؒ کے نزدیک مشہور دعا ''اللھم انا نستعینک ونستغفرک ونومن بک...... الخ '' پڑھنا سنت ہے۔لیکن اگر کسی شخص کو یہ دعا یاد نہیں تو اسے چاہیے کہ اس کو یاد کرے اور جب تک یہ دعا یاد نہیں ہوتی اس کی جگہ دوسری دعا مثلاً '' رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار '' یا '' اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ '' تین مرتبہ پڑھنے سے نماز درست ہوجائے گی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں جن عورتوں کو مذکورہ دعا یاد نہیں تو ان کو چاہیے کہ اس کو یاد کرنے کی کوشش کریں اور جب تک یاد نہ ہو تو مذکورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھ سکتی ہیں اس سے نماز درست ہوجائے گی۔عام حالت میں حکم یہی ہے تاہم اگر کسی شخص کو دعائے قنوت یا کوئی دعا یاد نہیں تو اگر وہ اس کی جگہ تین مرتبہ ''سورۃ اخلاص'' پڑھ لیتا ہے تو اس کی نماز درست ہوجائے گی۔

لمافي الشامية (۲/۶،۷): (قوله ويسن الدعاء المشهور) قد منافي بحث الواجبات التصريح بذلك عن النهر، وذكر في البحر عن الكرخي انّ القنوت ليس فيه دعاء مؤقت، لانه روى عن الصحابة ادعية مختلفة، لانّ المؤقت من الدعا يذهب برقة القلب...... ومن لا يحسن القنوت يقول. ربنا اتنا في الدنيا حسنه ـ الآية. وقال ابو ليث يقول: اللهم اغفرلي يكررها ثلاثا، وقيل يقول يارب ثلاثا، ذكره في الذخيرة.

وفي السعاية في كشف مافي شرح الوقاية، باب صفة الصلاة (۲/۱۳۹): وفي مقدمة الغزنوية: ان كان لايحسن القنوت يقرأ ثلاث مرات "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" او ثلاث مرات "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ".

وفي حاشية الطحطاوي على الدر المختار (۱/۲۸۰): (وقوله ويسن الدعاء المشهور) وهو اللهم انا نستعينك ونستهديك ونستغفرك ونتوب اليك ونومن بك......الخ ويجوز ان يقتصر في دعا القنوت على نحو قوله رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِيْ الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ او يقول يا رب ثلاثا او اللهم اغفرلي ثلاثا لانه غير مؤقت في ظاهر الرواية مطلقا سواء كان يحسن الدعا اولا......

(۲۷۵) وتر کی تیسری رکعت کے رکوع سے قنوت کیلئے لوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص وتر کی نماز پڑھ رہا تھا، تیسری رکعت میں دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا، جب رکوع میں یاد آیا کہ دعائے قنوت نہیں پڑھی تو وہ واپس کھڑا ہوگیا اور دعائے قنوت پڑھ کر دوبارہ رکوع کیا، اب پوچھنا یہ تھا کہ آیا یہ شخص سجدہ سہو کرکے سلام پھیر دے تو نماز درست ہوجائے گی یا نہیں؟ یا پھر اسے دوبارہ سے

نماز پڑھنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر سجدہ سہو کرلیا جائے تو نماز درست ہو جائے گی۔ البتہ اس صورت میں رکوع کی طرف واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔

لـمافـي الشـامية(۲/۸۱): والـحـاصـل ان مايقرؤه يلتحق بما قبل الركوع ويلغو هذا الركوع فتلزم اعـادتـه، حتـى لـو لـم يـعـده بطلت صلاته بل ذكر في شرح المنية انه لو قام لاجل القراء ة ثم بدا له فسـجـد ولـم يـقرأ ولم يعد الركوع قال بعضهم تفسد لانه لما انتصب قائماً للقراء ة ارتفض ركوعه وان كـان البـعـض يقول لا تفسد اهـ وهذا كله بخلاف مالو تذكر القنوت في الركوع فالصحيح انه لايعود، ولو عاد وقنت لا يرتفض ركوعه وعليه السهو لان القنوت اذا اعيد يقع واجباً لا فرضاً.

وفـي الهـنـدية (۱/۱۲۷): وكـذا اذا سـجد في موضع الركوع أو ركع في موضع السجود أو كرّر ركناً أو قدم الركن أو أخره ففي هذه الفصول كلها يجب سجود السهو.

(۲۷۶) رمضان میں عشاء کی نماز باجماعت نہ پڑھنے والے کا وتر باجماعت پڑھنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے رمضان المبارک میں نماز عشاء جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی آیا یہ آدمی وتر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟ مفتی بہ قول ذکر کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جس آدمی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھی ہو، وتر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے۔ یہی مفتی بہ قول ہے۔

لـمـافـي حـلـبـي كـبـيـري(ص۴۱۰): واذا لم يصل الفرض مع الامام فعن عين الائمة الكرابيسي انه لا يتبـعـه فـي التـراويـح ولا في الوتر وكذا اذا لم يتابعه في التراويح لا يتابعه في الوتر، وقال ابويوسف البـانـي اذا صلى مع الامام شيئا من التراويح يصلي معه الوتر وكذا اذا لم يدرك معه شيئا منها وكذا اذا صـلـى التـراويـح مـع غيـره له ان يصلي الوتر معه وهو الصحيح ذكره ابو الليث وكذا قال ظهير الدين المرغيناني الخ.

وفـي حـاشـيـة طـحـطـاوي عـلـى الدر المختار(۲۹۷/۱): قوله فليراجع قضية التعليل في المسئلة السابقة بقولهم لانها تبع أن يصلي الوتر بجماعة في هذه الصورة لانه ليس بتبع للتراويح ولا للعشاء عند الامام رحمه الله تعالىٰ انتهىٰ حلبي.

وفي فتاوىٰ دارالعلوم ديوبند(۴/۱۵۳): جماعت وتر میں شریک ہوسکتا ہے۔ كذا صرح به في الطحطاوي،

اور علامہ شامی نے بے شک عدم جواز نقل کیا ہے لیکن طحطاوی کی عبارت میں جواز کی تصریح ہے، اور قاعدہ بھی مقتضی جواز کو ہے اس لئے ہمارے اکابر اساتذہؒ وتر کی جماعت میں شرکت کے جواز کے قائل ہیں کیونکہ وجہ عدم جواز کی کچھ نہیں ہے۔

(۲۷۷) صرف رمضان میں وتر جماعت سے ادا کرنے کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان کے مہینہ میں وتر باجماعت ادا کیے جاتے ہیں دوسرے مہینوں میں انفرادی طور پر ادا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے نیز رمضان میں وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں فرض ہیں یا واجب یا سنت؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... رمضان میں وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے ثابت ہے اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے اور دوسرے مہینوں میں انفرادی اس لئے ادا کیے جاتے ہیں کہ ان مہینوں میں کوئی اثر وارد نہیں ہے۔ وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں یہ مستحب ہے۔

لمافي البحر الرائق(۲/۶۹): (قوله ويوتر بجماعة في رمضان فقط) أي على وجه الاستحباب وعليه اجماع المسلمين كمافي الهداية واختلفوا في الافضل ففي الخانية الصحيح ان اداء الوتر بجماعة في رمضان أفضل لان عمرؓ كان يؤمهم في الوتر الخ.

وفي الشامية(۲/۴۹،۴۸):أن جماعة الوتر تبع لجماعة التراويح وان كان الوتر نفسه أصلا في ذاته لان سنة الجماعة في الوتر انما عرفت بالأثر تابعة للتراويح..........

(صـ۴۹) فالوتر كالتراويح فكما أن الجماعة فيها سنة فكذلك الوتر بحر وفي شرح المنية والصحيح أن الجماعة فيها أفضل الا ان سنيتها ليست كسنية جماعة التراويح الخ.

(۲۷۸) وتر میں نو سورتیں پڑھی جانے والی حدیث پر عمل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں (۹) سورتیں تلاوت فرماتے تھے پہلی رکعت میں سورۃ التکاثر، سورۃ القدر، سورۃ الزلزال، دوسری رکعت میں سورۃ العصر، النصر، الکوثر اور تیسری رکعت میں سورۃ الکافرون، اللھب اور سورۃ الاخلاص، اب اگر کوئی اتباع سنت کی نیت سے ان (۹) سورتوں کو پڑھے تو جو ترتیب حدیث میں وارد ہوئی ہے اس طرح پڑھنا مسنون ہوگا یا قرآن شریف کی ترتیب پر پڑھنا مسنون ہوگا۔ کیا ذخیرہ احادیث میں اس مضمون کی حدیث ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرض اور واجب نماز میں ترتیب سے قرأت کرنا قرأت کے واجبات میں سے ہے اور اس کی مخالفت کرنا مکروہ

ہے البتہ نوافل کے اندر اس کی گنجائش ہے اور چونکہ وتر کی نماز ہمارے ہاں واجب ہے اور واضح رہے کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب بھی صحیح قول کے مطابق توقیفی ہے لہٰذا اس کی رعایت کرنا ضروری ہے اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے نمازِ وتر کے اندر پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۃ الاخلاص پڑھنے والی روایت کو سنیت پر محمول کیا ہے لہٰذا یہی طریقہ سنت ہے البتہ مسند احمد کی روایت سے ان "۹" سورتوں کا پڑھنا بھی ثابت ہے لیکن اس میں چونکہ ترتیب توقیفی (جس کی رعایت واجب ہے) کا عکس ہے اس لئے اس کو بیان جواز پر محمول کیا جائے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں وتر کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص پڑھنا ہی مسنون ہے البتہ یہ روایت (کہ جس میں ان ۹ سورتوں کا پڑھنا مذکور ہے) جواز پر محمول ہے۔ اگر کبھی کبھار اس طرح پڑھ لے تو اس کی گنجائش ہے۔ اور بعض حضرات نے وتر میں مسنون قرأت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں۔

(۱)۔ پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ، دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۃ الاخلاص۔

(۲)۔ پہلی میں سورۃ التکاثر، دوسری میں سورۃ العصر، تیسری میں سورۃ الکافرون۔

(۳)۔ پہلی رکعت میں سورۃ القدر، دوسری رکعت میں سورۃ النصر، تیسری میں سورۃ اللہب۔

(۴)۔ پہلی رکعت میں سورۃ الزلزال، دوسری میں سورۃ الکوثر اور تیسری میں سورۃ الاخلاص۔

اگر اس تاویل کو لے لیا جائے تو اس میں سورتوں کی ترتیب کی بھی رعایت ہوجاتی ہے اور تمام روایات پر عمل بھی ہوجاتا ہے لیکن اس میں بھی پہلا طریقہ زیادہ راجح ہے لانہ اکثر عملاً، البتہ وتر کی جماعت میں (جو کہ صرف رمضان میں ہوتی ہے) اس پر بھی التزام نہ کیا جائے۔

لمافی الترمذی (۱/۱۰۶): عن عبدالعزیز بن جریج قال سالت عائشة بأی شئ کان یوتر رسول اللہ ﷺ قالت کان یقرأ فی الاولی بسبّح اسم ربک الاعلی وفی الثانیة بقل یایها الکافرون وفی الثالثة قل هو اللہ احد والمعوذتین.

وفی تحفة الاحوذی (۱/۳۴۱): والذی اختاره اکثر اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ ومن بعدهم ان یقرأ بسبّح اسم ربک الاعلی وقل یاایها الکفرون وقل هو اللہ احد ویقرأ فی کل رکعة من ذلک بسورة وبه قال الحنفیة.

وفی المسند للامام احمد (۱/۱۴۳): عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنه قال کان رسول اللہ ﷺ یوتر بتسع سور من المفصل، قال اسود: یقرأ فی الرکعة الأولی الهاکم التکاثر، وإنا انزلناه فی لیلة القدر، واذا زلزلت الارض وفی الرکعة الثانیة والعصر واذا جاء نصر اللہ والفتح وانا اعطیناک الکوثر وفی الرکعة الثالثة قل یاایها الکافرون وتبت یدا ابی لهب وقل هو اللہ احد.

وفی الموسوعة الفقهیة (۲۷/۲۹۸): اتفق الفقهاء علی انه یقرأ فی کل رکعة من الوتر الفاتحة ...... ثم ذهب الحنفیة الی انه لم یوقت فی القراءة فی الوتر شئ غیر الفاتحة فما قرأ فیه فهو حسن، وما

ورد عن النبی ﷺ: انه قرأ به فی الأولی بسورة سبح اسم ربک الاعلی وفی الثانية الكافرون، وفی الثالثة بالاخلاص فيقرأ به احياناً، ويقرأ بغيره احيانا للتحرز عن هجران باقی القرآن.

وفی الهندية (۱/۷۹): هذا كله فی الفرائض اما فی السنن فلا يكره هكذا فی المحيط.

وفی الشامية (۱/۵۴۴): لان الشارع إذا لم يعين عليه شيئا تيسيرا عليه كره له ان يعين...... لما فيه من هجر الباقی وايهام التفضيل ...... وهذا اذا صلی الوتر بجماعة وان صلی وحده يقرأ كيف شاء اهـ .... فيستحب ان يقرا ذلک احيانا تبركا بالماثور

وايضاً ذكر فی وتر البحر عن النهاية انه لا ينبغی ان يقرأ سورة متعينة علی الدوام لئلا يظن بعض الناس انه واجب...... اما لو قرأه للتيسير عليه او تبركا بقراءته عليه السلام فلا كراهة ولكن بشرط ان يقرأ غيرها احيانا لئلا يظن الجاهل ان غيرها لايجوز......

وفی الشامية (۲/۶):والسنة السور الثلاث ای الاعلی والكافرون والاخلاص لكن فی النهاية ان التعيين علی الدوام يفضی الی اعتقاد بعض الناس أنه واجب وهو لا يجوز فلو قرأ بما ورد به الآثار احيانا بلا مواظبة يكون حسنا......

وفی الدرالمختار (۱/۵۴۶): ويكره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منكوسا الا اذا ختم فيقرأ من البقرة ...... وفی الشامية تحته (وقوله وان يقرأ منكوسا) بأن يقرأ فی الثانية سورة اعلی مما قرأ فی الاولی لان ترتيب السور فی القراة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهيلا لضرورة التعليم ......

وفی مرقاة المفاتيح(۵/۱۱۱): بخلاف ترتيب السور فانه لما كان مختلفا فيه كرهت مخالفته لغير عذر، ولما ورد أنه ﷺ قرا النسآء قبل آل عمران لبيان الجواز او نسيانا ليعلم الصحة به، مع ان الاصح ان ترتيب السور توقيفی.

(۲۷۹) وتر کی نماز دوسلاموں سے پڑھنے کا حکم

سوال...... کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میراارادہ انشاءاللہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا ہے اب مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کے ائمہ وتر کی نماز میں دورکعات پرسلام پھیرتے ہیں پھراسکے بعدایک رکعت پڑھ کردوبارہ سلام پھیرتے ہیں، آیامیرے لئے اسطرح انکی اقتدامیں نماز پڑھناجائز ہوگایانہیں اگرنہیں توکیاانفرادوترکی نماز پڑھوں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اصح قول کی بناپرکسی حنفی المسلک کوایسے امام کی اقتداءدرست نہیں بلکہ انفرادی نماز پڑھ لی جائے۔

لمافی الشامیة (۸/۲): ولم یذکر الشارح تعلیل اشتراط عدم الفصل بسلام اکتفاءً بما اشار الیه قبله من ان الاصح اعتبار اعتقاد المقتدی والسلام قاطع فی اعتقاده فیفسد اقتدائه وان صح شروعه معه اذلامانع منه فی الابتداء کماافاده. ح

(۲۸۰) وتر میں حنفی کا شافعی کی اقتداء کرنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱)۔ عربوں کے یہاں وتر دو اور ایک رکعت کر کے پڑھی جاتی ہے، حنفی ایک نیت کے ساتھ تینوں رکعت پڑھتے ہیں، اگر شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھی جائے (رمضان میں) تو پھر حنفی ان کے ساتھ نماز پڑھیں یا نہیں؟ اکثریت حنفی کی پڑھتی ہے، شرعاً کیا حکم ہے؟

(۲)۔ دوسری بات یہ ہے کہ نیت کیا کرنی چاہئے امام نماز سے پہلے بولتا ہے کہ دو رکعت نماز عشاء ہے اور پھر بعد میں کہتا ہے کہ ایک رکعت نماز وتر ہے، اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ نیت کس نماز کی کرنی چاہئے لہٰذا اکثر حنفی یہ نیت کرتے ہیں کہ "جونیت امام کی وہ میری" کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... (۱)۔ احناف کے ہاں وتر تین رکعات ہیں جو کہ ایک سلام کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر شافعی امام وتر میں پہلی دو رکعات کے بعد سلام پھیرتا ہے اور اس کے بعد ایک رکعت پڑھ کر آخر میں پھر سلام پھیرتا ہے تو ایسے شافعیؒ امام کے پیچھے حنفی کی اقتداء شرعاً درست نہیں ہے۔

(۲)۔ اگر شافعی امام دو رکعات کے بعد سلام نہیں پھیرتا ہے بلکہ تینوں رکعات کیلئے آخر ہی میں سلام پھیرتا ہے تو اس کے پیچھے حنفی کی اقتداء درست ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ حنفی وتر کی نیت میں مطلقاً وتر کا ذکر کرے۔

لما فی الدر المختار (۷/۲): (وصح الاقتداء فیه) ففی غیره اولی ان لم یتحقق منه مایفسدها فی اعتقاده فی الاصح کما بسطه فی البحر (بشافعی) مثلاً (لم یفصله بسلام) لا ان فصله (علی الاصح) فیهما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد (و) لذا (ینوی الوتر لاالوتر الواجب کما فی العیدین) للاختلاف.

(۲۸۱) حنفی کا شافعی امام کے پیچھے وتر میں لفظ واجب ملانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مفتی صاحب سے یہ مسئلہ سنا ہے کہ حنفی آدمی شافعی آدمی کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ امام اس حنفی مقتدی کے مسائل اختلافیہ میں اس کی رعایت رکھتا ہو، اب میرے ذہن میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی حنفی وتر یا عیدین شافعی امام کے پیچھے پڑھتا ہے تو چونکہ احناف کے نزدیک یہ نمازیں واجب ہیں اور شوافع

کے نزدیک غیر واجب ہیں، آیا اس صورت میں اقتداء درست ہو جائے گی؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ وتر کے ساتھ واجب کا لفظ نہ کہو تو پھر ہو جائے گی کیا یہ درست ہے؟ اس صورت میں بھی تو عملاً نماز بہر حال مقتدی کی واجب ہی رہے گی تو اس کا کیا جواب ہوگا؟

براہ کرم تفصیل سے دلائل کے ساتھ میرے اس مسئلے کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حنفی آدمی کا شافعی مسلک امام کی اقتداء میں وتر ادا کرنا درست ہے اس شرط کے ساتھ کہ امام وتر کی دوسری رکعت میں سلام نہ پھیرے اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ امام نے مطلق وتر کی نیت کی ہو، وتر سنت کی نیت نہ کی ہو، اور اس دوسری شرط کا علم چونکہ قدرے دشوار ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ وتر الگ سے یا حنفی امام کے پیچھے پڑھے اور یہ بات کہ شافعی امام کے پیچھے جب وتر پڑھے تو لفظ واجب وتر کے ساتھ نہ کہے جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے (وینوی الوتر لا الواجب) استحباب پر محمول ہے جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ (۳۰۲/۱) میں تصریح کی ہے۔ اگر کوئی لفظ واجب ساتھ کہہ دے تو اس سے صحت اقتداء پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ احناف کے نزدیک وتر اور عید کی نماز واجب ہے اور شوافع کے نزدیک سنت ہے اور فرض یا واجب پڑھنے والے کیلئے نفل پڑھنے والے کی اقتداء کرنا درست نہیں، لہٰذا مذکورہ صورت میں اقتداء کرنا درست نہ ہوا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عقیدہ میں شافعی امام اور حنفی کا اختلاف ہے، حنفی کے نزدیک وتر واجب اور شافعی کے نزدیک سنت ہے لیکن نیت دونوں کی ایک نماز یعنی وتر یا عید کی ہے پس اس نیت کے اتحاد کا اعتبار کرتے ہوئے اقتداء درست ہے اور وتر میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وتر کا وجوب ضعیف ہے کیونکہ بہت سی چیزوں میں وتر کی سنت سے مشابہت ہے مثلاً ایک یہ کہ وتر کیلئے باقی فرائض کی طرح مستقل وقت نہیں بلکہ عشاء کے تابع ہے اور اس کیلئے اذان ہے اور نہ ہی اقامت، یہی وجہ ہے کہ سنت کی طرح وتر کی بھی تمام رکعات میں قرأت فرض ہے پس ان وجوہات کی بناء پر اقتداء کرنا درست ہے۔

وفی الهندية (۸۴/۱): قال الفضلي يصح اقتداء الحنفي في الوتر بمن يرى مذهب ابي يوسف ومحمد رحمهما الله تعالىٰ هكذا في الخلاصة.

وفيه ايضاً (۱۱۱/۱): ولو صلى الوتر بمن يقنت في الوتر بعد الركوع في القومة والمقتدى لا يرى ذالك تابعه فيه هكذا في فتاوى قاضيخان.

وفي الدر المختار (۸،۷/۲): (وصح الاقتداء فيه) ففي غيره أولى ان لم يتحقق منه ما يفسدها في اعتقاده في الأصح كما بسطه في البحر (بشافعي) مثلاً (لم يفصله بسلام) لا ان فصله (على الاصح) فيهما للاتحاد وان اختلف اعتقاد (و) لذا (ينوى الوتر لا الوتر الواجب كمافي العيدين) للاختلاف.

وفي الشامية تحته: (قوله للاتحاد الخ) علة لصحة الاقتداء. ورد على ما مرّ من الإرشاد بما نقله أصحاب الفتاوى عن ابن الفضل أنه يصح الاقتداء لأن كلا يحتاج إلى نية الوتر، فأهدر اختلاف الاعتقاد في صفة الصلاة، واعتبر مجرد النية اهـ. ....ورده في البحر بما صرح به في التجنيس

ایضاً من انّ الامام ان نوی الوتر وھو یراہ سنۃ جاز الاقتداء کمن صلی الظھر خلف من یری انّ الرکوع سنۃ وان نواہ بنیۃ التطوع لایصح الاقتداء لانہ یصیر اقتداء المفترض بالمتنفّل اھـ............

(قولھلا الوتر الواجب) الذی ینبغی ان یفھم من قولھم انہ لا ینوی انہ واجب انہ لا یلزمہ تعیین الوجوب لامنعہ من ذالک لانہ ان کان حنفیاً ینبغی ان ینویہ لیطابق اعتقادہ وان کان غیرہ فلا تضرہ تلک النیۃ بحر (قولہ للاختلاف) ای فی الوجوب والسنیّۃ وھو علۃ للعیدین فقط.

(۴۸۲) وتر کے بعد دو رکعت کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک دیندار انسان ہے تمام نمازیں باجماعت پڑھنے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح نوافل کا بھی اہتمام کرتا ہے چنانچہ وہ روزانہ وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھتا ہے لیکن عمرو کہتا ہے کہ کھڑے ہوکر پڑھنا چاہیے کیونکہ بیٹھ کر پڑھنے سے ثواب آدھا ملے گا، اب پوچھنا ہے کہ وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے؟ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً...... نفل نماز مطلقاً چاہے وتر کے بعد کی دو رکعت ہوں یا دیگر نوافل، کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے اور اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر پڑھے تو اس کو آدھا اجر ملے گا۔

لمافی مشکوۃ المصابیح (صـ۱۱۳): وعن أبی امامۃ أن النبی ﷺ کان یصلیھما بعد الوتر وھو جالس یقرأ فیھما إذا زلزلت وقل یاأیھا الکفرون رواہ احمد.

وفی النسائی (۱/۱۸۸): عن عبداللہ بن عمرو قال رأیت النبی ﷺ یصلی جالساً فقلت حدثت انک قلت ان صلوۃ القاعد علی النصف من صلوۃ القائم وأنت تصلی قاعداً قال أجل ولکنی لست کأحد منکم.

وفی ھامشہ (صـ۵): قولہ لست کأحد منکم یفید انہ مخصوص بینھم بأن لا ینقص لہ فی الاجر فی صلاتہ قاعداً وقائماً کذا قال السندی.

وفی الدر المختار(۲/۳۶): (ویتنفل مع قدرتہ علی القیام قاعداً)...... وفیہ أجر غیر النبی ﷺ علی النصف الا بعذر.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ أجر غیر النبی ﷺ) أما النبی ﷺ فمن خصائصہ أن نافلتہ قاعداً مع القدرۃ علی القیام کنافلتہ قائماً...... (قولہ علی النصف الابعذر) أمامع العذر فلا ینقص ثوابہ عن ثوابہ قائماً.

وفی شرح النووی علی هامش الصحیح المسلم(۱/۲۵۴): قلت الصواب أن هاتین الرکعتین فعلهما ﷺ بعد الوتر جالساً لبیان جواز الصلوة بعد الوتر وبیان جواز النفل جالساً ولم یواظب علی ذالک بل فعله مرة أو مرتین أو مرات قلیلة ولا تغتر بقولها کان یصلی فإن المختار الذی علیه الأکثرون والمحققون من الأصولیین أن لفظة کان لایلزم منها الدوام ولا التکرار وانما هی فعل ماض یدل علی وقوعه مرة فان دل دلیل علی التکرار عمل به وإلا فلا تقتضیه بوضعها وقد قالت عائشة رضی الله عنها کنت أطیب رسول الله ﷺ لحله قبل أن یطوف ومعلوم أنه ﷺ لم یحج بعد أن صحبته عائشة الاحجة واحدة وهی حجة الوداع فاستعملت کان فی مرة واحدة.

﴿فصل فی سجود السہو والتلاوۃ﴾

(سجدۂ سہو اور سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)

(۲۸۳) سجدۂ سہو کے واجب ہونے کی صورتیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر نماز میں یہ پریشانی لاحق ہوجاتی ہے کہ کچھ چیزیں چھوٹ جاتی ہیں، کبھی رکوع وسجدے کی تسبیحات چھوٹ جاتی ہیں اور کبھی کیا، میں اس پر سجدہ سہو کرلیا کرتا تھا، پھر میرے ایک دوست نے کہا کہ ہر غلطی پر سجدۂ سہو نہیں ہوتا بلکہ بعض مخصوص صورتیں ہیں کسی عالم دین سے اس کی تفصیل پوچھ لو۔ براہ کرم آپ مجھے اس تحریر کے ذریعے بتادیں کہ سجدہ سہو کن کن صورتوں میں کرنا ضروری ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سجدہ سہو کسی واجب کے چھوٹ جانے یا واجب یا فرض میں تاخیر یعنی دیر ہوجانے یا کسی فرض کو اس کی جگہ سے ہٹا کر پہلے کردینے یا کسی فرض کو دوبارا دا کردینے سے واجب ہوجاتا ہے اور سجدہ سہو سے اس بھول کی تلافی ہوجاتی ہے اگر قصداً ایسا کرے تو سجدۂ سہو سے کام نہ چلے گا بلکہ نماز کا دوہرانا لازم ہوگا اور اگر کوئی فرض چھوٹ جائے تو اس کی تلافی سجدۂ سہو سے نہ ہوگی۔ اور تسبیحات وغیرہ جو سنت اور مستحب کی قبیل سے ہیں ان کے چھوٹنے پر کچھ واجب نہیں۔

لمافی المحیط البرهانی(۲/۳۰۸): تکلم المشائخ فی هذا و اکثرهم علی انه یجب بستة اشیاء بتقدیم رکن وتاخیر رکن وبتکرار رکن وبتغیر واجب وبترک واجب وبترک سنة تضاف الی جمیع الصلاة. اما تقدیم الرکن نحو ان یرکع قبل ان یقرأ ویسجد قبل ان یرکع وتاخیر الرکن ان یترک سجدة صلبیة سهوا فیذکرها فی الرکعة الثانیة فیسجد ها أو یؤخر القیام الی الثالث بالزیادة علی قدر التشهد وتکرار رکن. ان یرکع رکوعین أو یسجد ثلاث سجدات وتغییر الواجب ان یجهر فیما یخافت او یخافت فیما یجهر وترک الواجب نحو ان یترک القعدة الاولی (فی الفرائض وترک السنة المضافة الی جمیع الصلاة نحو ان یترک التشهد فی القعدة الاولیٰ.

وفی الهندیة(۱/۱۲۶): ولایجب بترک التعوذ والبسملة فی الاولیٰ والثناء وتکبیرات الانتقالات الخ.

وفی الشامیة (۲/۷۹): والعمد لا یجبره سجود السهو بل تلزم فیه الاعادة.

وفی شرح الوقایة (۱/۱۸۴): فی هامش (۱۲) بعد اسطر: ولا یجب ایضا بترک رکن عمدا کان

او سهوا لان ترک الرکن مبطل للصلوٰۃ رأسا ولا یمکن جبر نقصان ثابت به ولو ترک الواجب عمدالا یسجد لان الوارد فی الاحادیث هو السجود عند السهو لا عند العمد بل یعید الصلوٰۃ.

(۴۸۴) امام کا قرأت کے دوران بھول کر خاموش رہنا پھر سجدہ سہو کرنا کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں نے تبلیغی جماعت میں ۴ مہینے لگائے، جب گاؤں میں واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ اکیلے نماز پڑھنے کے مقابلے میں جماعت سے نماز پڑھنے میں ستائیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے اس لئے اکیلے اکیلے نماز پڑھنے کے بجائے تم اور دوستوں کو بھی یہاں میری بیٹھک میں ہی لے آیا کرو، ہم سب مل کر جماعت سے نماز پڑھا کریں گے۔ الحمدللہ اب ہم سب جماعت سے نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دوسروں کی نسبت ماموں کو قرآن پڑھنا درست آتا ہے اسلئے وہ ہمارے امام بن جاتے ہیں لیکن قرأت کے دوران غلطیاں بہت کرتے ہیں کبھی پڑھتے پڑھتے بھول جاتے ہیں تو خاموش ہوجاتے ہیں یا پھر دوسری سورت شروع کردیتے ہیں اور آخر میں سجدہ سہو کرتے ہیں کیا اس طرح ہم سب کی نماز سجدہ سہو کرنے سے درست ہوجائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ کل قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں مسلمان بن کر حاضر ہو، وہ ان نمازوں کو ایسی جگہ ادا کرنے کا اہتمام کرے جہاں اذان ہوتی ہو (یعنی مسجد میں) اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمہارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے ایسی سنتیں جاری فرمائی ہیں جو سراسر ہدایت ہیں انہیں میں سے یہ جماعت کی نمازیں بھی ہیں۔ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں شخص پڑھتا ہے تو نبی علیہ السلام کی سنت کو چھوڑنے والے ہوگے، اور یہ سمجھ لو کہ اگر نبی علیہ السلام کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہوجاؤ گے (مسلم شریف، ۱/۲۳۲)...... دوسری حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی ہوگی (کنز العمال، ۷/۶۵۰)، نیز اور بے شمار وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان لوگوں کے بارے میں جو بلاعذر اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں، ان تمام احادیث کی بنا پر آپ کے ماموں کیلئے یہ بات جائز نہیں کہ یہ مسجد کو چھوڑ کر بیٹھک میں جماعت کروائیں لہٰذا ان کو چاہیے کہ تمام نمازوں کو مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ ادا کریں ہاں اگر قریب میں کوئی مسجد نہیں تو کسی مسجد کی بنیاد رکھیں تاکہ ان وعیدوں سے بچ سکیں البتہ صورت مسئولہ میں اگر آپ کے ماموں قرأت کے دوران ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن سے معنی تبدیل نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں نماز فاسد نہ ہوگی، ہاں ان کا بھول جانا پھر خاموش ہوجانا اگر ایک رکن کی مقدار ہے تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنے سے نماز درست ہوگی اور اگر اتنی مقدار سے کم خاموش رہے تو سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا، اور نماز درست ہوگی۔

لمافی المسلم (۱/۲۳۲): عن عبداللہ قال من سره ان یلقی اللہ تعالیٰ غدا مسلما فلیحافظ علی هولاء الصلوات حیث ینادیٰ بهن فان اللہ شرع لنبیکم سنن الهدی، وانهن من سنن الهدی ولو انکم صلیتم

في بيوتكم كما يصلي هذا المتخلف في بيته لتركتم سنة نبيكم ولوتركتم سنة نبيكم لضللتم......الخ.

وفي سنن ابی داؤد(۱/۸۱): عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من سمع المنادی فلم يمنعه من اتباعه عذر قالوا وما العذر قال خوف أو مرض لم تقبل منه الصلوٰة التي صلیٰ.

وفي المحيط البرهاني(۳/۴/۲): وشرح الكافي "للصدر الشهيد: وكان الشيخ الامام الأجل ظهير الدين المرغيناني يقول: لا يجب سجود السهو بقوله : اللهم صل على محمد ونحوه، وانما المعتبر مقدار ما يؤدى فيه ركناً.

وفي البحر الزائق(۱/۲۰۶): وسئل الحلوانی عمن يجمع باهله احيانا هل ينال ثواب الجماعة أولا؟ قال: لا ويكون بدعة ومكروها بلا عذر.

وفي التاتارخانية(۱/۵۷): سئل الحلوانی عمن يصلي جماعة مع اهله في بيته أحيانا هل ينال فضل الجماعة؟ قال لا وسئل هل يكون بدعة ومكروها؟ قال نعم.

وفي الهندية (۱/۸۱): وان غير المعنى تغيرا فاحشا بأن قرأ "وعصى ادم ربه" بنصب الميم ورفع الرب وما أشبه ذلک مما لو تعمد به يكفر اذا قرأخطأ فسدت صلاته في قول المتقدمين واختلف المتأخرون قال محمد بن مقاتل...... وشمس الائمة الحلوانی لاتفسد صلاته الخ.

(۲۸۵) قیام میں پہلے التحیات پڑھے پھر فاتحہ یا قعدہ میں فاتحہ پڑھے تو کیا حکم ہے

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی قیام میں التحیات للہ الخ پڑھ لیتا ہے پھر اس کو خیال آیا اور قرأت کی۔ آیا اس پر سجدہ سہولازم ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح اگر تشہد میں سورۂ فاتحہ پڑھے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کوئی شخص قعدہ میں تشہد سے پہلے فاتحہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوتا ہے اور اگر قیام میں پہلے تشہد پڑھے پھر فاتحہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا، اور اگر قعدہ میں پہلے تشہد پڑھے پھر فاتحہ تو بھی سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا۔

لمافي الخلاصة(۱/۱۷۷): وفي الفتاوى لو قرأ الفاتحة او آية من القرآن في القعدة اوفي الركوع اوفي السجود او قرأ التشهد في الركوع اوفي السجود عليه السهو، ولو قرأ التشهد في القيام قبل ان يشرع في القرآءة عامداً او ناسياً فلا سهو عليه.

لمافي الهندية(۱/۱۲۷): واذا قرأ الفاتحة مكان التشهد فعليه السهو وكذالک اذا قرء الفاتحة ثم التشهد كان عليه السهو كذا روی عن ابی حنيفة رحمة الله تعالیٰ عليه في الواقعات الناطفية وذكر هناک اذا بدأ في موضع التشهد بالقرآءة ثم تشهد فعليه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقرآءة فلا

سهو علیه.

(۲۸۶) سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان ربی الاعلی پڑھ لیا تو سجدہ سہو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نماز میں سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان ربی الاعلیٰ پڑھ لیا تو اس شخص پر سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......مذکورہ صورت سجدہ سہو لازم نہیں۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۵۱۷): واما الاذكار كل ذكر لم يقصد لنفسه ...... لا يلزمه السهو...... و كتسبيحات الركوع والسجود.

وفی الشامیة (۲/۸۰): قوله بترک واجب) .... واحترز بالواجب عن السنة، كاالثناء والتعوذ ونحوهما.

(۲۸۷) قعدہ اولیٰ نہ کرنے کا حکم

سوال......جناب حضرت مفتی صاحب ایک مسئلہ پوچھنا ہے کہ اگر چار رکعات والی سنتوں میں یا وتر میں کوئی قعدہ اولیٰ بھول جائے تو سجدہ سہو کرنے سے نماز ہو جائیگی؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سنتوں اور وتر میں قعدہ اولیٰ فرض ہے لہٰذا بھول جانے پر سجدہ سہو کافی نہیں، نماز نہیں ہوگی اعادہ واجب ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً......چار رکعات والی سنتوں اور وتر میں قعدہ اولیٰ واجب ہے نہ کہ فرض، لہٰذا اگر کسی سے قعدۂ اولیٰ رہ گیا تو سجدہ سہو کر لینے سے نماز ہو جائیگی اعادہ واجب نہ ہوگا۔

لمافی الدرالمختار(۱/۴۶۵): (والقعود الاول) ولو فی النفل فی الاصح وكذاترک الزيادة فيه على التشهد.

(۲۸۸) غلطی سے قاعدہ اولیٰ میں سلام پھیرنے کا حکم

سوال......ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا چار رکعات کی نیت باندھ لی تھی لیکن بھولے سے قعدہ اولیٰ میں سلام پھیر دیا جب یاد آیا کہ یہ میری دوسری رکعت ہے تو فوراً کھڑا ہو گیا اور باقی نماز پڑھ لی اور آخر میں سجدہ سہو بھی کر لیا آیا اس شخص کی نماز ہو گئی؟ نیز اگر مسبوق سے امام کے ساتھ یا امام کے فارغ ہونے کے بعد کوئی واجب رہ جائے تو اسپر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب بھولے سے سلام پھیر لیا اور قبلہ کی طرف سینہ پھیرنے اور کسی مفسد صلاۃ کے ارتکاب

سے پہلے بقیہ رکعات پڑھ کر سجدہ سہو کرلیا تو نماز ہوگئی، نیز مسبوق اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے کوئی واجب چھوڑ دے تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا البتہ اگر امام کے سلام پھیرنے کے بعد کوئی واجب رہ جائے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا۔

لمافی الشامیة(۲/۹۲): در: ویسجد للسهو ولو مع سلامه ناویاللقطع لان نیة تغیر المشروع لغو ...... مالم یتحول عن القبلة اویتکلم...... سلم مصلی الظهر مثلاعلی راس الرکعتین توهما اتمها اربعا وسجد للسهو لان ساهیالایبطل لانه دعاء من وجه بخلاف مالوسلم علی ظن.

وفی الشامیة تحته: قوله لانه دعاء من وجه ای فلذاخالف الامام ......

وفی الشامیة (۱/۵۹۶): قوله حتی یثنی، تفریع علی قوله منفرد فیمایقضیه بعدفراغ امامه ...... ویلزمه السجود اذاسهافیمایقضیه.

(۲۸۹) قعدۂ اولیٰ سہواً چھوٹ جانے کے بعد قیام سے دوبارہ واپس آنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل ظہر کی پہلی چار سنتیں جماعت سے پہلے نہیں پڑھ سکا اور بعد میں چار سنتیں پڑھ رہا تھا۔ تو دوسری رکعت میں التحیات میں بیٹھنا بھول گیا اور سیدھا کھڑا ہوگیا ابھی تک سورۃ فاتحہ شروع نہیں کی تھی کہ مجھے یاد آگیا کہ میں التحیات پر بیٹھنا بھول گیا ہوں، تو میں فوراً التحیات میں بیٹھ گیا۔ پھر تیسری اور چوتھی رکعت پوری کی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا۔ کیا اس طرح میری نماز درست ہوگئی ہے۔ یا سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں تھی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں آپ کی نماز ہوگئی اور آپ نے جو سجدہ سہو کیا ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ البتہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ آپ نہ بیٹھتے اور آخر میں سجدۂ سہو کر کے اپنی نماز کو مکمل کرتے۔

لمافی الفتاویٰ التاتارخانیة(۱/۷۳۸): وفی الفتاوی العتابیة وان کان فی التطوع قال بعضهم یعود مالم یقید بالسجدة والصحیح انه لا یعود.

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۳۱۲): (قوله واماالنفل) ولو الرباعیة المؤکدة نهر (قوله فیعود) لان کل شفع صلاة علی حدة فی حق القراءة فأمر نابالعود الی القعدة احتیاطا ومتی عادتبین ان القعدة وقعت فرضا فیکون رفض الفرض لمکان الفرض فیجوز وقیل لا یعود لانه صار کاالفرض حلبی عن البحر.

وتحت (قوله ویسجد لتاخیر الواجب) الاولی ان یقول لتاخیر الفرض وهو القیام اویقول لترک الواجب وهو القعود.

وفی الدر المختار(۲/۸۴): (وإلا) أی وإن استقام قائما (لا) یعود لاشتغاله بفرض القیام (وسجد

للسھو) لترک الواجب (فلو عاد إلی القعود) بعد ذلک (تفسد صلاته) لرفض الفرض لما لیس بفرض وصححه الزیلعی (وقیل لا) تفسد لکنه یکون مسیئا ویسجد لتأخیر الواجب (وھو الأشبه) کما حققه الکمال وھو الحق بحر الخ.

وفی الشامیة تحته: (قوله بعد ذلک) ای بعد ما استقام قائما ...... (قوله لکنه یکون مسیئا) أی ویأثم.

(۲۹۰) دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سجدہ سہو کیلئے منفرد کو دونوں طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنا چاہئے یا ایک طرف بھی سلام پھیرنا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... منفرد کو سجدۂ سہو میں ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنا چاہئے البتہ اگر دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرلیا تو بھی نماز ہوجائے گی۔

لمافی الشامیة(۷۸/۲): والذی ینبغی الاعتماد علیه تصحیح المجتبی أنه یسلم عن یمینه فقط......

...... ویؤیده ماوجھوا به القول الواحدة من أن السلام الأول لشیئین: للتحلیل وللتحیة والسلام الثانی للتحیة فقط ای تحیة بقیة القوم لأن التحلیل لا یتکرر، وھنا سقط معنی التحیة عن السلام لأنه یقطع الإحرام فکان ضم الثانی إلیه عبثا ولو فعله فاعل لقطع الإحرام.

(۲۹۱) سجدہ سہو کرنا بھول کر دونوں طرف سلام پھیر دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نے نماز میں غلطی کی اور سجدہ سہو کرنا تھا مگر بھول کر سلام پھیر دیا اب اسے پوری نماز دھرانی پڑے گی یا کوئی اور طریقہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کسی وجہ سے سجدہ سہو کرنا تھا لیکن یاد نہ رہا اور بھول کر سلام پھیر دیا تو اس صورت میں اگر نمازی نے کوئی منافی صلاۃ عمل نہ کیا ہو، مثلاً اپنی جگہ سے ابھی اٹھا نہیں اور نہ ہی قبلہ سے رُخ پھیرا ہو کہ اس کو یاد آگیا تو فوراً سجدہ سہو کر کے نماز پوری کرلے اور اگر کوئی عمل منافی صلاۃ کیا ہو تو اس صورت میں سجدۂ سہو چھوڑ دینے کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافی فتاویٰ التاتارخانیة (۷۳۲/۱): واذا سلم یرید به قطع الصلوۃ وعلیه سجود السھو فعلیه أن یسجد للسھو ...... فقد شرط لاداء سجدتی السھو شرطاً زائداً وھو أن لا یتکلم ولا یقوم عن محله ذالک، فھذا اشارۃ الی أنه متی قام عن محله واستدبر القبلة أنه لا یأتی بسجدتی السھو وان کان لم یخرج عن المسجد بعد.

وفی الدر المختار (۱/۴۵۶): (ولها واجبات) لاتفسد بترکها وتعاد وجوبا فی العمد والسهو إن لم یسجدله.

(۲۹۲) سجدۂ سہو بھول کر سلام پھیرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے ہفتے میں کسی کام کے سلسلے میں صدر گیا ہوا تھا اور وہاں عشاء کی اذان ہوگئی تو میں نے اپنے کام کو مؤخر کیا اور مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے گیا۔ جماعت سے نماز پڑھنے کے بعد وتر کی نماز میں دعا قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا۔ کیونکہ مجھے مسئلہ معلوم تھا کہ اب رکوع سے نہیں اٹھنا چاہیے بلکہ آخر میں سجدہ سہو کر لینا چاہیے۔ لیکن آخری قعدہ میں بھی سجدہ سہو کیے بغیر ہی بھول کر سلام پھیر دیا۔ جب سلام پھیرا تو مجھے یاد آیا کہ مجھ پر سجدہ سہو کرنا ضروری تھا اور میں نے سجدۂ سہو نہیں کیا۔ اس لئے میں نے دوبارہ وتر ادا کیے۔ کیا اگر سجدۂ سہو واجب ہو، اور آدمی سجدہ سہو کرنا بھول جائے تو نماز نئے سرے سے پڑھنا ضروری ہے یا اس وقت صرف سجدۂ سہو کرلیں تو کیا نماز درست ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے، نہ پڑھنے کی صورت میں سجدۂ سہو لازم ہوگا۔ تاہم اگر کوئی شخص سجدۂ سہو بھول جائے اور نماز ختم کرنے کی نیت سے سلام پھیر دے۔ تو اس صورت میں اگر قبلہ سے انحراف نہ پایا گیا ہو، اور بات چیت نہ کی ہو تو ترکِ واجب کے یاد آنے پر سجدۂ سہو کر لینے سے اس کی نماز بغیر نقصان کے درست ہو جائے گی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کر لیتے تو آپ کی نماز بغیر نقصان کے ٹھیک ہو جاتی اور دوبارہ پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی۔

لما فی فتاویٰ التاتارخانیة (۱/۷۳۲): واذا سلم یرید به قطع الصلوة وعلیه سجود السهو فعلیه أن یسجد للسهو...... فقد شرط لاداء سجدتي السهو شرطاً زائداً وهو أن لا یتکلم ولا یقوم عن محله ذالک، فهذا اشارة الی أنه متی قام عن محله واستدبر القبلة أنه لا یأتي بسجدتی السهو وان کان لم یخرج عن المسجد بعد.

وفی الشامیة(۲/۹۱): قال فی الدر: (ویسجد للسهو ولو مع سلامه) ناویاً (للقطع) لأن نیة تغییر المشروع لغو، (مالم یتحول عن القبلة او یتکلم) لبطلان التحریمة.

قال فی الشامیة: قید بالسهو لأنه لو سلم ذاکراً أن علیه سجدة تلاوة او قراء ة التشهد الأخیر سقطت عنه، لأن سلامه عمد فیخرجه من الصلاة ولا تفسد صلاته لأنه لم یبق علیه رکن من أرکان الصلوة بل تکون ناقصة لترک الواجب......

(قوله لبطلان التحریمة) ای بالتحول أو التکلم، وقیل لا یقطع بالتحول مالم یتکلم أو یخرج من المسجد کما فی الدرر عن النهایة.

(۲۹۳) سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی جگہ دوبارہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز کے اندر سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی جگہ پھر بھی فاتحہ کو پڑھتا ہے تو اس شخص کی نماز کا کیا حکم ہے نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... فرض کی آخری دو رکعتوں کے علاوہ چاہے فرض ہو یا واجب سنت ہو یا نفل ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت، تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت ملانا واجب ہے۔

صورت مسئولہ میں دوبارہ فاتحہ پڑھنے سے واجب ادا نہ ہوا۔ پس اگر یہ فعل سہواً صادر ہوا ہو، تو سجدہ سہو کرنے سے نماز صحیح ہو جائے گی۔ اور اگر قصداً کیا ہے تو نماز کا اعادہ کرنا لازم ہوگا۔

لمافی القدوری (باب النوافل) (صـ۲۶): القراءة واجبة فی الرکعتین الاولیین وهو مخیر فی الاخریین ان شاء قرأ الفاتحة، وان شاء سکت وان شاء سبح والقراءة واجبة فی جمیع رکعات النفل وجمیع الوتر.

وفی الطحطاوی علی الدر (۲۵۸/۱): (قوله کذا ترک تکریرها) فلو قرأ الفاتحة مرتین قبل السورة وجب سجود السهو لتاخیر السورة.

وفی الشامیة (۴۵۶/۱): (قوله وتعاد وجوباً) ای بترک هذه الواجبات او واحد منها وما فی الزیلعی والدرر والمجتبی من انه لو ترک الفاتحة یؤمر بالاعادة لالو ترک السورة رده فی البحر بان الفاتحة وان کانت آکد فی الوجوب للاختلاف فی رکنیتها دون السورة لکن وجوب الاعادة حکم ترک الواجب مطلقا لا الواجب المؤکد وانما تظهر الآکدیة فی الاثم لانه مقول بالتشکیک.

(۲۹۴) سجدہ سہو ادا کرنے کے بعد قیام کی طرف لوٹنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے نماز کے دوران سہو ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کیا اس کے بعد نماز کو پورا کرنے کے بجائے کھڑے ہو کر سورہ فاتحہ پڑھنے لگا پھر سورہ فاتحہ پڑھتے وقت یاد آجائے تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟ از روئے شرع اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں یہ شخص سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز کو مکمل کرنے کے بجائے کھڑا ہو گیا اب یہ شخص قعدہ کی طرف واپس لوٹ آئے اور سلام پھیر کر نماز کو ختم کرے۔

لمافی الهندیة (۱۲۶/۱): قال فی الفتاوی القعدة بعد سجدتی السهو لیست برکن وإنما أمربها بعد

سجدتي السهو ليقع ختم الصلاة بها حتى لو تركها فقام وذهب لاتفسد صلاته كذا قاله الحلواني كذا في السراج الوهاج.

وفي الدر المختار (۲/۸۵): (ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه، (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد، (مالم يقيدها بسجدة) لأن مادون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود،

وفي الشامية تحته: (قوله ولو سها عن القعود الأخير) اراد به القعود المفروض او ماكان آخر الصلاة فيشمل نحو الفجر،

وفي الهندية (۱/۱۳۰): السهو في سجود السهو لا يوجب السهو لانه لايتناهي كذافي التهذيب......... ولو سها في صلاته مرارا يكفيه سجدتان كذا في الخلاصة.

(۲۹۵) امام کا بھول کر سری نماز میں جہراً تلاوت کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے اور تجوید بھی کی ہے اور میرا ارادہ تھا کہ عالم بھی بنوں گا لیکن گھر کے حالات کچھ ایسے تھے کہ میں عالم نہیں بن سکا اب ایک مسجد میں امامت کراتا ہوں کل عصر کی نماز کے وقت جب میں امامت کرا رہا تھا تو بھول کر سورۃ فاتحہ زور سے پڑھنا شروع کردی جب اھدنا الصراط تک پہنچا تو پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا (سبحان اللہ) تو مجھے یاد آیا کہ میں تو عصر کی نماز پڑھا رہا ہوں اور اس میں قرأت آہستہ کرنی ہوتی ہے اور میں نے زور سے پڑھا ہے تو میں فوراً خاموش ہوگیا اور باقی سورۃ فاتحہ اور دوسری سورت دل میں ہی پڑھی ہے۔ کیا اس طرح نماز درست ہوگئی ہے۔ یا پھر سجدہ سہو کرنا ضروری تھا۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....امام کیلئے جہری نمازوں میں جہراً اور سری نمازوں میں سراً قرأت کرنا واجب ہے۔ اگر امام بھول کر کسی سری نماز میں جہراً قرأت شروع کردے تو اگر ایک طویل آیت یا تین چھوٹی آیتوں کے بقدر تلاوت کردی تو ترک واجب کی بناء پر سجدہ سہو واجب ہوگا۔ اب اگر امام سجدہ سہو کرلیتا ہے تو نماز بلا کراہت درست ہوجائے گی اور اگر سجدہ سہو نہیں کیا تو ترک واجب کی بناء پر نماز مکروہ ہوگی اور نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔

صورت مسئولہ میں آپ پر سجدہ سہو واجب تھا اگر آپ نے بغیر سجدہ سہو کے سلام پھیر دیا تو اگرچہ فرضیت ادا ہوگئی مگر واجب ترک کرنے کی وجہ سے نماز مکروہ ہوگئی جس کا اعادہ آپ پر اور مقتدیوں پر واجب ہے۔ اعادہ نہ کرنے کی صورت میں گناہ گار رہوں گے۔

لمافي الهندية (۱/۱۲۸): (ومنها الجهر و الإخفاء) حتى لو جهر فيما يخافت أو خافت فيما يجهر وجب عليه سجود السهو واختلفوا في مقدار ما يجب به السهو منهما قيل يعتبر في الفصلين بقدر ما

تجوز به الصلاة وهو الأصح ولا فرق بين الفاتحة وغيرها.

وفي الدر المختار (۲/۸۱): (والجهر فيما يخافت فيه)...... (وعكسه) ...... والأصح تقديره (بقدر ما تجوز به الصلاة في الفصلين. وقيل) قائله قاضيخان يجب السهو (بهما) أي بالجهر والمخافتة (مطلقا) أي قل أو كثر (وهو ظاهر الرواية)

وفي الشامية تحته: (قوله والأصح الخ) صححه في الهداية والفتح والتبيين والمنية لأن اليسير من الجهر والإخفاء لايمكن الإحتراز عنه وعن الكثير يمكن وما تصح به الصلاة كثير غير أن ذالك عنده آية واحدة وعندهما ثلث آيات هداية.

وفي الدرالمختار (۱/۴۵۷،۴۵۶): (ولها واجبات) لاتفسد بتركها وتعاد وجوباً في العمد والسهو ان لم يسجد له، وإن لم يعدها يكون فاسقاً آثماً. وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها.

وفي الشامية تحته: (قوله وتعاد وجوباً) أي بترك هذه الواجبات أو واحدمنها..............

(قوله إن لم يسجد له) أي للسهو، وهذا قيد لقوله والسهو، إذ لا سجود في العمد...... وهل تجب الاعادة بترك سجود السهو لعذر كما لو نسيه أو طلعت الشمس في الفجر؟ لم أره فليراجع والذي يظهر الوجوب كماهو مقتضىٰ اطلاق الشارح، لأن النقصان لم ينجبر بجابر، وإن لم يأثم بتركه فليتأمل.

وفي (صـ۴۵۷)وأن النقص إذا دخل في صلاة الإمام ولم يجبر وجبت الإعادة على المقتدي أيضاً.

(۲۹۶) فرض کے چھوٹ جانے کی کمی کو سجدۂ سہو سے پورا کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ رات ہماری بستی کے امام صاحب عشاء کی نماز میں چوتھی رکعت میں بیٹھنا بھول گئے۔ یعنی التحیات نہیں پڑھی اور کھڑے ہوگئے۔ پیچھے سے ایک مقتدی نے لقمہ بھی دیا لیکن امام صاحب نے پانچویں رکعت پوری کی پھر چھٹی رکعت پوری کر کے سجدہ سہو کیا اور سلام پھیر دیا۔ ان کے سلام پھیرنے کے بعد کچھ لوگ کہنے لگے کہ اس طرح نماز نہیں ہوئی لیکن امام صاحب کہتے ہیں کہ میں بھول گیا اور جب کوئی بھول ہوجائے تو سجدہ سہو کرتے ہیں اور میں نے سجدہ سہو بھی کیا ہے، لہٰذا نماز درست ہے بلکہ چار رکعت فرض نماز ہوگئی اور دو رکعت نفل ہوگئی۔ آپ حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا امام صاحب کی بات درست ہے اور سجدہ سہو کرنے سے نماز ہوگئی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نماز میں واجب کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو کرنے سے اس کی کمی پوری ہوجاتی ہے۔ اور فرض کے چھوٹ

جانے سے سجدہ سہو کرنے سے اس کی کمی پوری نہیں ہوتی ہے، بلکہ دوبارہ اس نماز کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔

چونکہ نماز میں قعدہ اخیرہ فرض ہے، اور امام صاحب نے قعدہ اخیرہ نہیں کیا، بلکہ پانچویں رکعت کیلئے کھڑے ہوگئے تو فرض کے چھوٹ جانے سے نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا پڑے گا، سجدہ سہو کرنے سے یہ نماز نہیں ہوئی، باقی امام صاحب کا یہ کہنا کہ ''بھول سے سجدہ سہو کرتے ہیں، اس لئے میں نے کیا'' یہ بات درست نہیں بلکہ سجدہ سہو اس وقت واجب ہوتا ہے جب کوئی واجب چھوٹ جائے یا فرض اور واجب میں تاخیر ہوجائے۔ لہٰذا امام سمیت سب مقتدیوں پر اس نماز کا اعادہ لازمی ہے۔

وفی الدرالمختار(۲/۸۵ تا ۸۸): (ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد (مالم يقيدها بسجدة) لان مادون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود، (وإن قيدها) بسجدة عامدا أو ناسيا أو ساهيا او مخطئا (تحول فرضه نفلاً برفعه) الجبهة عند محمد، وبه يفتى، لأن تمام الشئ بآخره، فلو سبقه الحدث قبل رفعه توضأ وبنى خلافاً لأبي يوسفؒ، حتى قال: زه صلاة فسدت أصلحها الحدث والعبرة للإمام، حتى لو عاد ولم يعلم به القوم حتى سجدوا لم تفسد صلاتهم مالم يتعمدوا السجود. وفيه يلغز: أيّ مصلّ ترك القعود الأخير وقيد الخامسة بسجدة ولم يبطل فرضه، (وضم سادسة) ولو في العصر والفجر (إن شاء) لاختصاص الكراهة والإتمام بالقصد (ولا يسجد للسهو على الأصح) لأن النقصان بالفساد لا ينجبر (وإن قعد في الرابعة) مثلاً قدر التشهد (ثم قام عاد وسلم) ولو سلم قائما صح، ثم الاصح أن القوم ينتظرونه، فإن عاد تبعوه (وإن سجد للخامسة سلموا) لأنه تم فرضه، إذ لم يبق عليه إلا السلام (وضم إليها سادسة) لو في العصر، وخامسة في المغرب: ورابعة في الفجر، به يفتى (لتصير الركعتان له نفلا) والضم هنا آكد، ولا عهدة لوقطع، ولا بأس بإتمامه في وقت كراهة على المعتمد (وسجد للسهو) في الصورتين لنقصان فرضه بتاخير السلام في الأولى وتركه في الثانية.

(۲۹۷) مقتدی سے سہو کی صورت میں سجدۂ سہو کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ہم امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہوں اور کوئی غلطی ہوجائے تو سجدہ سہو کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر آپ امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ سے کوئی سہو یا غلطی ہوجائے تو آپ سجدہ سہو نہیں کریں گے۔

وفي الهندية (۱۲۸/۱): سهو المؤتم لايوجب السجدة.

(۲۹۸) سجدۂ سہو میں تکرار نہیں

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سجدہ سہو کے بعد اگر دوبارہ غلطی کی تو دوبارہ سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورتِ مسئولہ میں جبکہ نمازی ایک مرتبہ غلطی کرنے پر سجدۂ سہو کر چکا ہو، تو دوسری بار غلطی کرنے پر دوبارہ سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ کیونکہ سہو کے دو سجدے تمام غلطیوں کا ازالہ کر دیتے ہیں اور سجدۂ سہو میں تکرار نہیں ہے۔

وفي التجنيس (۱۴۸/۲): قال الشيخ الامام شمس الأئمة الحلواني، القعدة بعد سجدتي السهو ليس بركن، وانما امرنا بها بعد سجود السهو ليقع ختم الصلوة بها. فيوافق ذالک موضع الصلوة ونظمها، فأما أن يكون ركناً فلا، حتي لوتركها، بان سجد سجدتين، بعد السلام ثم قام وذهب لم تفسد صلوته ......ولو سجد قبل السلام لا يعيد، لانه مجتهد فيه، فاذا اداه، وقع جائزا وهذا لأنه لوأعاده يؤدي إلى تكرار سجود السهو ولم يقل به احد.

وفي الطحطاوي على الدر(۳۱۰/۱): لو سجد قبل السلام لايعيده،لأنه لو أعاده يتكرر وهو خلاف الاجماع.

وفي الهندية(۱۳۰/۱): السهو في سجود السهو لايوجب السهو لأنه لا يتناهي كذا في التهذيب.

(۲۹۹) سجدہ تلاوت کے وجوب سے لاعلمی کی بناء پر سجدہ تلاوت نہ کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے بچپن میں ایک حافظ صاحب سے قرآن پڑھا تھا تقریباً اس وقت میری عمر دس پندرہ سال تھی اب میں چالیس سال کے قریب ہوں مسئلہ یہ پیش آیا کہ میں نے سجدہ تلاوت کو کبھی بھی ادا نہیں کیا کیونکہ مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ اس طرح سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے اب چار ماہ لگائے تو پتہ چلا کہ سجدہ واجب ہوتا ہے میں بہت پریشان ہوں کہ پچیس سال میں نہ جانے کتنے سجدے چھوڑے اور نماز میں بھی سورۃ علق پڑھتا تھا کیونکہ مجھے میرے استاد نے بتایا تھا کہ یہ قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت ہے مجھے بہت پسند ہے، اب ان نمازوں کی بھی تعداد یاد نہیں۔ برائے مہربانی آپ حضرات علماء ہیں رہنمائی فرمائیں کہ ان سجدوں اور نمازوں کا میں کیا کروں کوئی تاوان ہے یا قضاء ہے اگر قضاء ہے تو نمازوں کا کیا حکم ہے ان کی بھی قضاء ضروری ہے یا فقط ان سجدوں کی قضاء کافی ہے۔ جو نماز میں نہیں کیے گئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... قرآن کریم میں چودہ مقامات ایسے ہیں جن کے تلاوت کرنے سے یا سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے۔ اب آیت سجدہ تلاوت کرنے والا یا سننے والا، نماز میں ہوگا یا غیر نماز میں۔ اگر نماز میں ہو تو مقتدی ہوگا یا منفرد اگر مقتدی ہو تو اپنے امام سے

آیت سجدہ سننے سے، سجدہ کرنے میں امام کا تابع ہوگا اگر کسی اور شخص سے سنے جو اس نماز میں شریک نہ ہو تو نماز کے بعد اس پر سجدہ کرنا واجب ہوگا۔ اور اگر منفرد ہو تو آیت سجدہ کے تلاوت کرنے سے نماز میں سجدہ تلاوت کرنا واجب ہوگا۔ البتہ اگر نماز میں کسی وجہ سے سجدہ نہیں کیا تو نماز کے بعد اس کو ادا نہیں کیا جائے گا بلکہ ساقط ہو جائے گا (البتہ ترکِ واجب کا گناہ ہوگا)۔ جبکہ حالتِ نماز کے علاوہ آیت سجدہ خود پڑھنے یا دوسرے سے سننے پر سجدہ تلاوت واجب ہو جاتا ہے جو ادا کئے بغیر ساقط نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جو نمازیں آپ نے پڑھی ہیں اور ان میں سورۃ علق تلاوت کی ہے اور نماز میں سجدہ تلاوت ادا نہیں کیا ہے تو نمازیں درست ہیں ان کا اعادہ نہیں ہے اور سجدے بھی ساقط ہو گئے ہیں البتہ واجب کے چھوڑنے کی وجہ سے گناہ ہوگا جس سے توبہ واستغفار ضروری ہے۔ جبکہ نماز کے علاوہ جتنے سجدے آپ پر، آیت سجدہ خود پڑھنے سے یا دوسروں سے سننے سے واجب ہوئے ہیں ان کا ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا بلوغت سے اب تک کا حساب لگا کر تمام سجدے اسی حساب سے ادا کئے جائیں۔

لمافی الجوهرة النيرة (۱/۱۱۱): وفي رواية النوادر: ماوجب خارج الصلوة لا يسقط.

وفي الهندية (۱/۱۳۲): والسجدة واجبة في هذه المواضع على التالي والسامع سواء قصد سماع القران اولم يقصد كذا في الهداية (وفي صـ۱۳۳) ولو قرأ بالعربية يلزمه مطلقا لكن يعذر بالتاخير مالم يعلم.............. ولو سمعها من الامام اجنبي ليس معهم في الصلاة ولم يدخل معهم في الصلاة لزمه السجود كذا في الجوهرة النيرة وهو الصحيح كذا في الهداية سمع من امام فدخل معه قبل ان يسجد سجد معه وان دخل في صلاة الامام بعد ما سجدها الامام لا يسجد ها..............ولو سمع المصلي من اجنبي يسجد بعد الفراغ. (وفي صـ ۱۳۴) و السجدة التي وجبت في الصلاة لا تؤدى خارج الصلاة كذا في السراجية وهكذا في الكافي. (وفي صـ ۱۳۵) وفي الغياثية واداؤها ليس على الفور حتى لو اداها في ایّ وقت كان يكون مؤديا لاقاضيا كذا في التتارخانية.

وفي الدر المختار مع الشامية(۲/۱۰۹): (وهي على التراخي) على المختار ويكره تاخيرها تنزيها، ويكفيه ان يسجد عدد ما عليه بلا تعيين و يكون مؤديا.

وفي الشامية تحته: (قوله على المختار) كذا في النهر: وينبغي ان يكون محل الخلاف في الاثم وعدمه حتى لو اداها بعد مرة كان مؤديا اتفاقا لاقاضيا اهـ...... (قوله تنزيها) لانه بطول الزمان قدينساها، ولو كانت الكراهة تحريمية لو جبت على الفور وليس كذلک ولذا كره تحريما تاخير الصلاتية عن وقت القراءة امداد واستثنى من كراهة التاخير ما اذا كان الوقت مكروها كوقت الطلوع.

(۳۰۰) آیت سجدہ سننے والوں کو اگر علم ہو کہ آیتِ سجدہ تلاوت کی گئی ہے تو سجدہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب رمضان قریب آتا ہے حفاظ دو دو ہو کر ایک دوسرے کا قرآن دن کو سنتے ہیں ہم بھی ساتھ بیٹھتے ہیں کبھی کبھی وہ سجدہ کرتے ہیں ہمیں تو کچھ پتہ نہیں لگتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے میں نے ایک حافظ صاحب سے پوچھا اس نے کہا قرآن میں چودہ سجدے ہیں پڑھنے اور سننے والے پر جب بھی پڑھے یا سنے واجب ہے کہ سجدہ کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ آیت سجدہ ہے یا نہیں پھر ہمارے لئے آگے دو حالتیں ہوتی ہیں کبھی تو پڑھنے والا سجدہ کرتا ہے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ آیت سجدہ تھی۔ لیکن کبھی پڑھنے والا ہمیں نظر ہی نہیں آتا اور وہ آیت سجدہ پڑھ رہا ہوتا ہے ہم گزر جاتے ہیں آیت سن لیتے ہیں۔ مگر خبر نہیں ہوتی کہ آیت سجدہ تھی۔ کیا دونوں حالتوں میں سجدہ واجب ہوگا اور ترک پر گناہ ہوگا یا کچھ فرق ہوگا؟ تفصیل سے آسان اور واضح الفاظ میں جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ اللہ آپ کو دنیا وآخرت میں اجرِ عظیم عطا فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... سجدے کے وجوب کا تعلق نفسِ سماع سے ہے چاہے سننے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ البتہ جو شخص ان مقاماتِ سجدہ سے ناواقف ہو تو اس پر سجدہ تلاوت واجب ہونے کیلئے شرط یہ ہے کہ اسے معلوم بھی ہو جائے کہ آیت سجدہ کی تلاوت کی گئی ہے، اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں ترکِ واجب کا گناہ بھی نہ ہوگا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آپ کو جب اس بات کا علم ہو جائے کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے تو آپ پر سجدہ کرنا واجب ہے، اور اگر آپ کو علم نہ ہو سکا تو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے آپ پر کوئی گناہ نہ ہوگا، یہاں تک کہ اس کا علم ہو جائے لیکن جس شخص نے آیت سجدہ کی تلاوت کی ہے اس کی ذمہ لازم ہے کہ یا تو آیت سجدہ کے مقام پر اپنی آواز کو پست رکھے تاکہ زیادہ لوگ مشقت میں نہ پڑیں یا پھر تلاوت کے بعد سامعین کو اس سے باخبر کر دے کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے۔

لما فی الخانیة(۱/۴۲): اما السامع إن علم انها آية السجدة يلزمه السجدة والا فلا الخ.

وفی الهندية(۱/۱۳۳): اذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أولا اذا أخبر السامع انه قرأ آية السجدة وعندهما ان كان السامع يعلم أنه يقرأ القرآن يلزمه والا فلا ...... ولو قرأ بالعربية يلزمه مطلقاً لكن يعذر بالتاخير مالم يعلم الخ.

وفی الدر مع الشامية(۲/۱۰۵): فی الدر: والسماع شرط فی حق غير التالی ولو بالفارسية اذا اخبر الخ.

وفی الشامية تحته: (قوله اذا أخبر) ای بأنها آية سجدة سواء فهمها او لا وهذا عند الإمام، و عندهما ان علم السامع أنه يقرأ القرآن لزمته والا فلا بحر، وفی الفيض وبه يفتى، وفی النهر عن السراج أن

الامـام رجع الى قولهما وعليه الاعتماد..... أمّا لو كانت بالعربية فانه يجب بالاتفاق فهم أو لا لكن لا يجب على الأعجمي مالم يعلم كمافي الفتح أي وان لم يفهم الخ.

وفيه ايضاً(۱۱۸/۲): واستحسن اخفاؤها عن سامع غير متهيئ للسجود الخ.

وفي الشامية تحته: (قوله واستحسن اخفاء ها الخ) لأنه لو جهربها لصار موجبا عليهم شيئاً ربما يتكاسلون عن ادائه فيقعون في المعصية فان كانوا متهيئين جهربها بحر عن البدائع قال في المحيط بشرط أن يقع في قلبه أن لا يشق عليهم أداء السجدة فان وقع أخفاها وينبغي أنه اذا لم يعلم بحالهم أن يخفيها نهر.

(۳۰۱) سجدۂ شکر کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب بھی وتر سے فارغ ہوتا ہوں یا صلاۃ الضحیٰ سے فارغ ہوتا ہوں تو اس کے بعد سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں، میرے ایک دوست نے مجھے کہا کہ اس طرح کرنا صحیح نہیں ہے، تو اب آپ حضرات سے یہ سوال ہے کہ میرا اس طرح کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کسی نعمت کے حصول یا مصیبت سے نجات پر سجدۂ شکر کرنا مستحب ہے۔ البتہ کسی بھی نماز کے فوراً بعد سجدۂ شکر کرنے کو فقہاءِ کرام نے مکروہ لکھا ہے۔ لہٰذا آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ ''اس طرح کرنا صحیح نہیں'' درست ہے۔ اس سے اجتناب کیا جائے۔ تاہم دیگر اوقات میں سجدۂ شکر ادا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لما في الدر المختار(۱۱۹/۲، ۱۲۰): وسجدة الشكر، مستحبة به يفتى، لكنها تكره بعد الصلاة، لأنّ الجهلة يعتقد ونها سنة أو واجبة وكل مباح يؤدى اليه فمكروه.

وفي الشامية تحته: (قوله. وسجدة الشكر)..... وهي لمن تجددت عنده نعمة ظاهرة أو رزقه الله تعالىٰ مالاً أو ولداً أو اندفعت عنه نقمة ونحوذلك، يستحب له أن يسجد لله تعالىٰ شكراً مستقبل القبلة يحمد الله تعالىٰ فيها ويسبحه ثم يكبّر فيرفع رأسه كما في سجدة التلاوة، سراج.

﴿فصل فی المریض والمسافر﴾

(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

(۳۰۲) زخم سے مسلسل خون نکلنے کی صورت میں نماز کی صورت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے ایسا زخم ہو جس سے مسلسل خون رستا رہتا ہو تو اب وضو اور نماز کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر خون اس قدر مسلسل بہتا ہو کہ اس شخص پر ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ اس کو وضو سے فراغت کے بعد خون بہنے کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ وہ نماز کے وقت میں فرض نماز پڑھ سکے تو وہ معذور سمجھا جائے گا، اور اس وقت تک معذور شمار کیا جائے گا جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی اس کا عذر پایا جائے۔ ایسی صورت میں وہ ایک نماز کے وقت میں ایک دفعہ وضو کرلے پھر اس وضو سے اس نماز کے وقت کے ختم ہونے تک جس قدر فرائض ونوافل چاہے ادا کرسکتا ہے اور وقت کے ختم ہوتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا دوسری نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔ اور اگر خون اس قدر مسلسل نہیں بہتا تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ پاکی کی حالت میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۰۵):(وصاحب عذر من بہ سلس) بول لا یمکنہ امساکہ(او استطلاق بطن ......ان استوعب عذرہ تمام وقت صلاۃ مفروضۃ)بان لایجد فی جمیع وقتھا زمنا یتوضأ ویصلی فیہ خالیا عن الحدث(ولو حکما)لان الانقطاع الیسیر ملحق بالعدم(وھذا شرط)العذر (فی حق الابتداء وفی)حق(البقاء کفی وجودہ فی جزء من الوقت)ولو مرۃ(وفی)حق الزوال یشترط(استیعاب الانقطاع)تمام الوقت (حقیقۃ)لانہ الانقطاع الکامل.

(وحکمہ الوضو)لا غسل ثوبہ وفی(صـ۳۰۶) ونحوہ (لکل فرض)اللام للوقت کمافی لدلوک الشمس ثم یصلی بہ (فیہ فرضا ونفلا)فدخل الواجب بالاولی(فاذا خرج الوقت بطل).

(۳۰۳) زخمی کیلئے لیٹ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید میرا خالہ زاد بھائی ہے پچھلے ہفتے وہ بذریعہ ٹرین ڈیرہ

غازی خان سے آ رہا تھا راستہ میں ٹرین کے بعض ڈبے پٹڑی سے اترنے کی وجہ سے زید کی ٹانگ ٹوٹ گئی اب الحمدللہ آپریشن ہوا ہے جو کہ بظاہر کامیاب ہے۔ آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ زید کھڑا تو نہیں ہو سکتا لیکن بیٹھنے میں بھی کافی تکلیف ہوتی ہے کیا زید کیلئے ایسی حالت میں لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر جائز ہے تو کیا نوافل اور سنن بھی لیٹ کر پڑھ سکتے ہیں یا صرف فرائض جائز ہے لیٹ کر؟ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں زید اگر سہارا لگا کر بیٹھ سکتا ہو، اگرچہ بیٹھنے میں تھوڑی بہت مشقت ہو، تو اس کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اگر زید کو سہارا لگا کر بیٹھنے سے بھی شدید تکلیف ہو یا مرض کے بڑھنے کا خوف ہو، تو اس کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا (سر اور ہاتھوں کے اشارہ سے) جائز ہے۔ خواہ فرض نماز ہو یا سنت یا نفل سب کا حکم یکساں ہے۔

لمافي الهندية (۱/۱۳۶، ۱۳۷): اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد وأصح الاقاويل في تفسير العجز ان يلحقه بالقيام ضرر وعليه الفتوى ..... واذا لم يقدر على القعود مستوياً وقدر متكئا أو مستنداً الى حائط أو انسان يجب أن يصلي متكئا أو مستنداً ولا يجوز له أن يصلي مضطجعاً على المختار.......... وان تعذر القعود أو ما بالركوع والسجود مستلقياً على ظهره وجعل رجليه إلى القبلة وينبغي أن يوضع تحت رأسه وسادة حتى يكون شبيه القاعد ليتمكن من الايماء بالركوع والسجود واضطجع على جنبه ووجهه الى القبلة وأومأجاز وا لاول أولى كذا في الكافي وان لم يستطع على جنبه الايمن فعلى الايسر كذا في السراج الوهاج ووجهه الى القبلة.

وفي الدر المختار (۲/۹۵، ۹۶، ۹۷): (من تعذر عليه القيام) أي كله (لمرض) حقيقي وحده أن يلحقه بالقيام ضرر به يفتى، (قبلها أو فيها) أي الفريضة .... (صلى قاعداً) ولو مستنداً إلى وسادة أو إنسان فإنه يلزمه ذلك على المختار. .... وفي(ص۹۹): (وإن تعذر القعود) ولو حكماً (أومأ مستلقياً) على ظهره (ورجلاه نحو القبلة).

(۳۰۴) مسلسل قطرات آنے کی صورت میں نماز کیسے پڑھیں؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو پیشاب کی تکلیف ہے جس کی وجہ سے اسے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے رہتے ہیں اور وضو کر کے نماز پڑھنا انتہائی مشکل ہوتا ہے، کیا ایسا شخص نماز پڑھے گا، اگر پڑھے گا تو پڑھنے کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلاً جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر پیشاب کے قطرات اس قدر مسلسل آتے ہوں کہ اس پر ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ اس کو وضو سے فراغت کے بعد قطرات کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ وہ نماز کے وقت میں فرض نماز پڑھ سکے تو وہ

معذور سمجھا جائے گا، اور اس وقت تک معذور شمار کیا جائے گا جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی اس کا عذر پایا جائے۔ ایسی صورت میں وہ ایک نماز کے وقت میں ایک دفعہ وضو کرلے پھر اس وضو سے اس نماز کے وقت کے ختم ہونے تک جس قدر فرائض ونوافل چاہے ادا کرسکتا ہے اور وقت کے ختم ہوتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا دوسری نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔ اور قطرات اگر اس قدر مسلسل نہیں آتے تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ پاکی کی حالت میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔

لما فی المصنف لعبدالرزاق (۱/۱۵۱): عبدالرزاق عن معمر عن الزهری عن خارجة بن زيد قال ۔ٍ ..زید حتی سلس منه البول فكان يداويه مااستطاع فاذا غلبه توضأثم صلى.

بقية الدلائل مر سابقاً فی السوال السابق

(۳۰۵) اگر اٹھنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص پر نماز فرض ہے یا نہیں؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اتنا زخمی ہو چکا ہو کہ اس کا چارپائی سے اٹھنا بھی مشکل ہو، تو کیا ایسی حالت میں اس پر نماز واجب ہے یا نہیں؟ اور اگر واجب ہو، تو پھر وضو کس طرح کرے حالانکہ اس کا چارپائی سے اُٹھنا بھی مشکل ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... مریض اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھے گا اور اگر بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہ ہو تو لیٹ کر سر کے اشارے سے نماز پڑھے گا اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو نماز کو مؤخر کرے گا صحیح ہونے تک، صحیح ہونے کے بعد اگر پانچ سے کم نمازیں قضا ہوئی ہوں تو ان کی قضا کرنا لازمی ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو اس سے قضا ساقط ہوگی لہٰذا صورت مذکورہ میں اگر کھڑے ہونے پر قادر نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھے، اس پر بھی قادر نہیں ہے تو لیٹ کر اشارہ سے پڑھے اور وضو اگر نہ خود کرسکتا ہے نہ ایسا شخص ہے جو اسے وضو کرائے تو تیمم کرکے نماز پڑھے۔ الغرض نماز ایسے شخص پر بھی فرض ہے جو بیٹھ کر یا اشارہ سے پڑھ سکتا ہو۔

لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۱۲۵): (قوله يشتد) تقييد لاطلاق المصنف المرض فيعلم ان اليسير لايبيح التيمم ولا فرق فی الاشتداد بين ان يشتد بالتحرک كالمبطون كما افاده بقوله ولو بتحرک او بالاستعمال كالجدری وجاز له التيمم اتفاقا ان كان لايجد من يوضئه ولا يقدر بنفسه

وفيه ايضاً (۱/۳۱۹): (قوله بان زادت على يوم وليلة) ای بالساعات او بالاوقات على وزان ماسيأتی فی مسئلة المجنون (قوله فی ظاهر الرواية) وقيل تؤخرولا تسقط وصحح (قوله وعليه الفتوى) راجع الى المغيابه لاللمغيا عليه وهو اذا لم يفهم فانه لايقضى فيه إجماعاً ومحل الخلاف فيما اذا برئ من مرضه...... على الايماء بالرأس اما ان قدر عليه بعد عجزه فانه يلزمه القضاء وان كان القضاء يجب موسعا لتظهر فائدته فی الايصاء بالاطعام عنه بحر.

وفي الشامية (۲/ ۹۹): (قوله بان زادت على يوم وليلة) أما لو كانت يوماً وليلة أو أقل وهو يعقل فلا تسقط بل تقضى اتفاقاً وهذا اذا صح فلو مات ولم يقدر على الصلاة لم يلزمه القضاء حتى لايلزمه الايصاء...... (قوله في ظاهر الرواية) وقيل لايسقط القضاء بل تؤخر عنه اذا كان يعقل وصححه في الهداية وهو من اهل الترجيح لكن خالف نفسه في كتابه التجنيس.

(۳۰۶) معذور آدمی کا گھر پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک معذور آدمی ہوں اور مسجد کے پڑوس میں رہتا ہوں لیکن مسجد میں عذر کی وجہ سے نہیں جاسکتا، تو کیا میں اپنے بیٹوں کے ساتھ گھر پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شریعت مطہرہ نے عذر شرعی، مثلاً بیماری، شدید بارش، شیخ فانی وغیرہ کا اعتبار کیا ہے اور معذور آدمی کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ترک کرنے کی رعایت رکھی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ مسجد کے پڑوس میں رہتے ہوئے بھی گھر میں اپنے تیمار دار یا دیکھ بھال کرنے والے کسی فرد کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

لمافي الهندية (۱/ ۸۲): الجماعة سنة مؤكدة كذا في المتون والخلاصة والمحيط ومحيط السرخسي ...... (صـ۸۳) وتسقط الجماعة بالأعذار حتى لاتجب على المريض والمقعد و الزمن ومقطوع اليد والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذى لا يستطيع المشي والشيخ الكبير العاجز والاعمىٰ عند أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ.

وفي الدرالمختار (۱/ ۵۵۲): (والجماعة سنة مؤكدة للرجال...... (وأقلها اثنان)...... (وقيل واجبة وعليه العامة)...... (فتسنّ أو تجب)...... على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج)...... (فلا تجب على مريض ومقعد وزمن ومقطوع يد ورجل من خلاف) ...... (ومفلوج وشيخ كبير عاجز وأعمىٰ) وإن وجد قائداً...... وقيامه بمريض الخ. قال الشامي رحمه الله تحته: (۱/ ۵۵۵) (قوله ولو فاتته ندب طلبها)...... وذكر القدوري: يجمع بأهله ويصلي بهم، يعني وينال ثواب الجماعة كذا في الفتح.

(۳۰۷) دورانِ نماز اگر قیام سے عاجز ہوجائے تو باقی نماز بیٹھ کر ادا کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے دو ہفتوں سے میں شدید بخار میں مبتلا ہوں اب اللہ پاک کا فضل ہے صحت تھوڑی اچھی ہوگئی ہے لیکن چونکہ دو ہفتوں کے مسلسل بخار نے بہت کمزور کر دیا ہے اب میری حالت یہ ہے کہ جب

نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو تھوڑی دیر کے بعد سر پر چکرآ نا شروع ہوتا ہے تو گرنے لگتا ہوں تو کیا ایسی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں؟ یا کھڑے ہو کر نماز شروع کروں جب چکرآ جائے پھر بیٹھ جاؤں۔ لہٰذا جو بھی صورت شرعاً جائز ہو، تحریر فرما کر اللہ کے حضور اجر کے مستحق بنئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز کے اندر قیام فرض ہے اور اگر کوئی عذر کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ کر نماز ادا کرے۔ البتہ جتنی دیر قیام پر قادر ہے اتنی دیر کھڑا رہے پھر بیٹھ جائے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کھڑے ہو کر نماز شروع کرنے پر قادر ہیں اس لئے کھڑے ہو کر نماز شروع کریں جب چکرآ نا شروع ہو جائیں تو اس وقت بیٹھ جائیں۔

لمافی الفتاویٰ الهندية(١٣٦/١): ولو كان قادر اعلى بعض القيام دون تمامه يؤمر بان يقوم قدر ما يقدر حتى اذا كان قادر اعلى ان يكبر قائما ولا يقدر على القيام للقراءة او كان قادر اعلى القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرأ قدرما يقدر عليه قائما ثم يقعد اذا عجز قال شمس الائمة الحلواني رحمه الله تعالىٰ هو المذهب الصحيح ولو ترك هذا خفت ان لا تجوز صلاته كذا في الخلاصة.

وفي الشامية(٩٧/٢): وفي شرح الحلواني نقلا عن الهندواني: لو قدر على بعض القيام دون تمامه، أو كان يقدر على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بأن يكبر قائما ويقرأ ما قدر عليه ثم يقعد ان عجز وهو المذهب الصحيح لايروى خلافه عن اصحابنا.

(۳۰۸) بیمار آدمی کیلئے قبلہ رُخ کئے بغیر نماز ادا کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے وہ ہسپتال کی چارپائی پر پڑا ہوا ہے اور چارپائی مریضوں کے زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ادھر ادھر بھی نہیں ہو سکتی تو کیا مریض بغیر قبلہ رخ کئے نماز ادا کر سکتا ہے کیونکہ چہرہ قبلہ کی طرف نہیں بلکہ شمال کی جانب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورتِ مسئولہ میں مریض کے چہرے کو قبلہ کی طرف پھیرنے والا موجود ہے تو قبلہ کی طرف منہ پھیر کر نماز پڑھے اگر مریض کے پاس کوئی بھی موجود نہ ہو، اور وہ خود بھی نہیں پھیر سکتا تو جس طرف پھیرنے کی قدرت ہو اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے۔

لمافي الهندية(٦٣/١): مريض صاحب فراش لا يمكنه ان يحول وجهه وليس بحضرته احد يوجهه يجزيه صلوته الى حيث ماشاء كذا في الخلاصة وكذا اذا كان يجد من يحوله ولكن يضره التحويل هكذا في الظهيرية.

وفي الدر المختار (۱/۴۳۲): (وقبلة العاجز عنها) لمرض وان وجد موجها عند الامام اوخوف مال وكذا كل من سقط عنه الأركان

وفي الشامية تحته: (وكذا كل من سقط عنه الاركان) أي تكون قبلته جهة قدرته ايضا.

(۳۰۹) قیام، رکوع وسجدہ سے عاجز کا بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری والدہ جوڑوں (گٹھیا) کی مریض ہیں اور زیادہ اٹھنے بیٹھنے سے انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے، اب اگر وہ اس مجبوری کی بنا پر تخت یا چارپائی وغیرہ پر ہی بیٹھ کر نماز پڑھنا چاہیں تو کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ اور اگر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا چاہیں تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کی والدہ قیام، رکوع وسجدہ کرنے سے عاجز ہیں تو بیٹھ کر نماز پڑھ سکتی ہیں، چاہے چارپائی پر پڑھیں یا تخت پر۔ اگر بیٹھ کر رکوع وسجدہ سے بھی عاجز ہوں تو پھر اشارے سے نماز پڑھ لیں لیکن سجدہ کا اشارہ رکوع سے ذرا جھک کر کریں۔

لمافي الهندية (۱/۱۳۶): اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد كذا في الهداية وان عجز عن القيام والركوع والسجود وقدر على القعود يصلي قاعدا بايماء ويجعل السجود اخفض من الركوع.

وفي الدر المختار (۲/۹۷): (وان تعذرا)..... وفي (ص۹۸) (أوما) بالهمز قاعدا وهو افضل من الايماء قائما لقربه من الارض (ويجعل سجوده اخفض من ركوعه).

(۳۱۰) تختہ لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں ایسی کرسیاں استعمال ہوتی ہیں جن میں آگے ایک تختی لگی ہوتی ہے اور کرسی پر بیٹھنے والا اس پر سجدہ کرتا ہے کیا فرش کے علاوہ کسی اور چیز پر سجدہ کرنا جائز ہے؟ اگر اس میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہو تو ضرور بیان کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ہر ایسی چیز پر سجدہ کرنا درست ہے جو کہ حجم رکھتی ہو، اور ٹھوس ہو کہ پیشانی اس پر ٹھہر سکے تو ایسی چیز زمین ہی کے حکم میں ہوگی۔ صورتِ مسئولہ میں معذور شخص جو کہ رکوع اور سجدہ کرنے سے عاجز ہو، تو اس کیلئے اس مخصوص کرسی پر بیٹھ کر سامنے نصب شدہ تختی پر سجدہ کرنا اور نماز کا پڑھنا بلا کسی کراہت کے جائز ہے اور ائمہ اربعہ کا اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

لما في الشامية (۱/۴۵۴): (وشرط سجود) مبتدأو مضاف اليه (فالقرار) خبر بزيادة الفاء (لجبهة)

أی یفترض أن یسجد علی مایجد حجمه بحیث أن الساجد لوبالغ لایتسفل رأسه ابلغ مما کان علیه حال الوضع، فلا یصح علی نحو الأرز والذرة، الا ان یکون فی نحو جوالق، ولا علی نحو القطن والثلج والفرش الا ان وجد حجم الارض بکبسه۔

(۳۱۱) زمین یا کرسی وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر آج کل لوگ مساجد میں مخصوص کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ اور کتنے عذر کی بنا پر آدمی کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو لوگ مخصوص کرسیوں وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں ان لوگوں کا ان کرسیوں پر فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا اس شرط کے ساتھ جائز ہوگا کہ یہ لوگ بغیر ضرر کے کھڑے ہونے پر قادر نہ ہوں لیکن اگر بغیر ضرر کے تکبیر تحریمہ کہنے کے بقدر بھی قیام پر قادر ہوں اور رکوع وسجدہ بھی کر سکتے ہوں تو تکبیر تحریمہ کھڑے ہو کر کہیں اور پھر بیٹھ جائیں۔ یا جتنی مقدار بھی کھڑے ہونے پر بغیر ضرر کے قادر ہوں تو اس قدر کھڑے ہونا ان حضرات پر لازم ہے پھر جب عاجز ہو جائیں تو بیٹھ جائیں، اور اگر رکوع اور سجدہ پر قدرت نہ رکھتے ہوں تو اگرچہ قیام پر بغیر ضرر کے بھی قادر ہوں تو پھر ان حضرات کیلئے یہ جائز ہے بلکہ افضل ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھیں اور قیام ان لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔ اور جس شخص کیلئے کھڑا ہونا متعذر ہو یا کھڑا ہونے میں ان کو ضرر لاحق ہوتا ہو، تو اس شخص کو بیٹھ کر نماز پڑھنا درست ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۱۳۶): اذا عجز المریض عن القیام صلی قاعدا یرکع ویسجد کذا فی الهدایة واصح الاقاویل فی تفسیر العجز ان یلحقه بالقیام ضرر وعلیه الفتویٰ کذا فی معراج الدرایة۔ وکذلک اذا خاف زیادة المرض او ابطاء البرء بالقیام او دوران الرأس کذا فی التبیین او یجد وجعاً لذلک، فان لحقه نوع مشقة لم یجز ترک ذلک القیام کذا فی الکافی ولو کان قادراً علی بعض القیام دون تمامه یؤمر بان یقوم قدر مایقدر حتی اذا کان قادراً علی ان یکبر قائما ولا یقدر علی القیام للقراءة او کان قادراً علی القیام لبعض القرآة دون تمامها یؤمر بان یکبر قائما ویقرأ قدر ما یقدر علیه قائما ثم یقعد اذا عجز قال شمس الائمة الحلوانی رحمه الله تعالیٰ هو المذهب الصحیح ولو ترک هذا خفت ان لا تجوز صلاته کذا فی الخلاصة ولو قدر علی القیام متکئاً الصحیح انه یصلی قائما متکئاً ولا یجزیه غیر ذلک وکذلک لو قدر علی ان یعتمد علی عصا او علی خادم له فانه یقوم ویتکئ کذا فی التبیین ویکره للمؤمی ان یرفع الیه عوداً او وسادة لیسجد علیه ...... فان کانت الوسادة موضوعة علی الارض وکان یسجد علیها جازت صلوته۔

وفی الدر المختار (۲/۹۷): (وإن تعذرا) لیس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود کاف (لا القیام)

وفي الشامية تحته: وفي الذخيرة: رجل بحلقه خراج إن سجد سال وهو قادر على الركوع والقيام والقراءة يصلي قاعدا يومئ، ولو صلى قائما بركوع وقعد وأومأ بالسجود أجزاه والأول أفضل، لأن القيام والركوع لم يشرعا قربة بنفسها بل ليكونا وسيلتين الى السجود اهـ.

وفيه ايضاً (۹۵/۲): (من تعذر عليه القيام) اى كله (لمرض) حقيقي و حدّه ان يلحقه بالقيام ضرر به يفتى (قبلها أو فيها) أى الفريضة (أو) حكمي بأن (خاف زيادته أو بطء برئه بقيامه او دوران رأسه او وجد لقيامه الما شديداً) أو كان لو صلى قائما سلس بوله أو تعذر عليه الصوم كما مر (صلى قاعداً) ولو مستندا الى وسادة أو انسان فانه يلزمه ذلك على المختار (كيف شاء) على المذهب ...... (بركوع وسجود وان قدر على بعض القيام) ولو متكئاً على عصا أو حائط (قام) لزوماً بقدر مايقدر ولو قدر آية أوتكبيرة على المذهب.

و في الشامية : (۹٦/۲) واختلفوا في التعذر......فقيل ما يبيح الافطار وقيل التيمم وقيل بحيث لو قام سقط وقيل ما يعجزه والاصح ان يلحقه ضرر بالقيام ...... (قوله ولو مستنداً الخ) اى اذا لم يلحقه ضرر به بدليل مامر (وفي ص۹۷) وبه ظهر ان المراد بالانسان من يطيعه اعم من الخادم والاجنبى ...... (قوله كيف شاء) اى كيف تيسر له بغير ضرر من تربع او غيره (قوله على المذهب) جزم به في الغرر ونور الايضاح وصححه في البدائع وشرح المجمع واختاره في البحر والنهر.

(۳۱۴) نمازیوں کی مروجہ کرسیوں میں ۹/انچ اونچائی رکھنے کی علت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلّہ کی مسجد میں چند کرسیاں جو آجکل مساجد میں بزرگ حضرات نماز ادا کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں موجود تھیں۔ کچھ دن قبل یہ کرسیاں مذکورہ مسجد کے خطیب کے کہنے پر اٹھادی گئیں تھیں، اُن کا کہنا تھا کہ ان پر سجدہ ادا کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن چند دن بعد دوبارہ رکھ دی گئیں اور کہا گیا کہ ان کرسیوں میں سے جن کی اونچائی ۹/انچ تھی ان پر سجدہ ادا کرنا صحیح ہے اور جن کی اونچائی ۹/انچ نہیں ہے اُن کو ۹/انچ تک برابر کروا کر دوبارہ رکھ دیں گے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس ۹/انچ اونچائی کی کیا علت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سجدہ کے لغوی معنی ہے پیشانی زمین پر رکھنا یعنی آدمی جس جگہ بیٹھا ہوا ہو، اس جگہ سے جھک کر پیشانی زمین پر رکھے یا وہ جوز مین کے قائم مقام ہو، مثلاً تخت وغیرہ پس اگر سجدہ والی جگہ بیٹھنے والی جگہ کی بہ نسبت اونچی ہو تو اس صورت میں سجدہ ادا ہوگا یا نہیں تو اس کے لئے فقہاء کرام نے یہ حد مقرر کی ہے کہ اگر سجدہ والی جگہ نصف ذراع کے بقدر اونچی ہے تو سجدہ ادا ہو جائے گا اور اگر اس سے زیادہ اونچی ہے تو پھر سجدہ ادا نہ ہوگا اور نصف ذراع تقریباً ۹/انچ ہے کما صرّح به في اوزان الشرعية (صفحہ ٦۲) لہٰذا مذکورہ

امام صاحب کی بات درست ہے۔

لمافی المحیط البرهانی(۱۲۳/۲): واذا کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین (که زمین نشیب بود) قیل ذکر الشیخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانی فی شرح کتاب الصلوۃ انه ان کان التفاوت بمقدار لبنة او لبنتین یجوز وان کان اکثر من ذلک لایجوز واراد باللبنة اللبنة المنصوبة دون المفروشة.

وفی الدر المختار(۵۰۳/۱): ولو کان موضع سجوده ارفع من موضع القدمین بمقدار لبنتین منصوبتین (ای موضوعة احدهما فوق الاخری) جاز سجوده وان اکثر لا الالزحمة کمامر والمراد لبنة بخاری وهی ربع ذراع عرض ستة اصابع(ای مقدر بعرض ستة اصابع مضموم بعضها الی بعض لا بطولها) فمقدار ارتفاعهما نصف ذرائع ثنتا عشرة اصبعاً ذکره الحلبی

وفیه ایضاً(۴۰/۲): ولو صلی علی دابة فی شق محمل وهو یقدر علی النزول بنفسه لاتجوز الصلاة علیها اذا کانت واقفة الا ان تکون عیدان المحمل علی الارض بأن رکز تحته خشبة.

وفی الکبیری(ص۲۷۸): والخامسه من الفرائض السجدة وهی فریضة تتادی بوضع الجبهة علی الارض اوما یتصل بها بشرط الانخفاض الزائد علی نهایة الرّکوع مع الخروج عن حدّ القیام لانّه لا یعد ساجداً لغة وعرفاً بما دونه ویعدبه.

وفیه ایضاً(ص۲۸۱): ولو کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین ان کان ارتفاعه مقدار ارتفاع لبنتین منصوبتین جاز السجود علیه والا فلا یجوز السجود واراد باللبنة لبنة بخاری وهی ربع ذراع عرض ست اصابع فمقدار ارتفاع اللبنتین المنصوبتین نصف ذراع طول اثنتی عشرة اصبعاً...... وذکر الزاهدی لو سجد یعنی المریض علی دکان دون صدره یجوز کالصحیح انتهی والاقرب ماذکر المصنف لما قدمناه فی اوّل بحث السجدة من حدادنی السجود المجزی فانه صادق فیما اذا کان الارتفاع هذا المقدار لافی الأزید فلیتامل.

(۳۱۳) بیٹھ کرنماز پڑھنے والے کے رکوع کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیٹھ کرنماز پڑھنے والا سر کو کس قدر جھکائے تاکہ رکوع ادا ہو جائے؟

الجواب حامداًومصلیاً......اگرکوئی شخص بیٹھ کرنماز پڑھتا ہے، اس کیلئے مناسب یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے وہ اپنی پیشانی کو اپنے گھٹنے

کے سرے کے قریب کرے۔

وفی الشامیة(۱/۴۴۷): قال الشامی: وفی حاشیة الفتال عن البرجندی: ولو کان یصلی قاعداً ینبغی ان یحاذی جبهته قدام رکبتیه لیحصل الرکوع اھ قلت ولعله محمول علی تمام الرکوع والافقد لممت حصوله باصل طأطأة الراس ای مع انحناء الظهر تأمل۔

(۳۱۴) کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والا سجدہ کی حالت میں کہاں تک سر جھکائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں معذور حضرات کیلئے کرسیاں رکھی ہوئی ہوتی ہیں اور اس میں آگے تختہ لگا ہوا ہوتا ہے تاکہ اس پر سر رکھ کر سجدہ کیا جا سکے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس تختہ پہ سر رکھ کر سجدہ کرنا درست ہے؟ یا ویسے ہی تھوڑا سا جھک کر سجدہ کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سجدہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ زمین یا اس جیسی سخت چیز پر اپنی پیشانی کو اچھی طرح سے ٹکائے البتہ اگر کوئی شخص عذر کی بناء پر سجدہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اور اس کے لئے کسی سہارے پر مثلاً تکیہ، میز وغیرہ پر سر رکھ کر سجدہ کرنا آسان ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے، اور اگر اس پر بھی قدرت نہیں تو صرف اشارہ سے سجدہ کرنا کافی ہے۔ اور اگر زمین پر بھی نہیں بیٹھ سکتا بلکہ کسی اونچی چیز کرسی وغیرہ (جیسا کہ آج کل مساجد میں کرسیاں رکھی گئی ہیں سامنے تختہ لگا ہوا ہے) پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن تختہ پر پیشانی رکھ کر سجدہ کرنا ضروری ہے ہاں اگر عذر ہو تو حسبِ طاقت اشارہ کرے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ سجدہ میں رکوع سے زیادہ جھکنا پایا جائے۔

بیٹھ کر زمین پر سجدہ کر کے نماز پڑھنے کی قدرت کے باوجود معمولی عذر کی بنا پر کرسیوں پر نماز پڑھنا درست نہیں۔

لما فی سنن الکبریٰ للبیهقی(۲/۳۰۷): عن الحسن عن امه قالت رأیت ام سلمة زوج النبی ﷺ تسجد علی وسادة من ادم من رمدبها۔

وفی الدر المختار(۲/۹۶،۹۷،۹۸): (صلی قاعدا) ولو مستندا إلی وسادة ...... الی قوله...... (وان تعذرا لیس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود کاف (لا القیام أو ما) بالهمز (قاعدا)...... (ویجعل سجوده اخفض من رکوعه)

وفی الشامیة (۲/۹۷): (قوله فانه یکره تحریما) قال فی البحر: واستدل للکراهة فی المحیط بنهیه علیه الصلاة والسلام عنه، وهو یدل علی کراهة التحریم وتبعه فی النهر۔

اقول: هذا محمول علی ما اذا کان یحمل الی وجهه شیا یسجد علیه بخلاف ما اذا کان موضوعاً علی الارض یدل علیه ما فی الذخیرہ حیث نقل عن الاصل الکراهة فی الاول ثم قال فان کانت

الوسادة موضوعة على الارض وكان يسجد عليها جازت صلاته، فقد صح ان ام سلمة كانت تسجد على مرفقة موضوعة بين يديها لعلة كانت بها ولم يمنعها رسول الله ﷺ من ذلك هـ فان مفاد هذه المقابلة والاستدلال عدم الكراهة في الموضوع على الارض المرتفع ثم رأيت القهستاني صرح بذلك.

وفيه ايضاً (۲/۹۹): انه لو كان قادرا على وضع شئ على الارض مما يصح السجود عليه انه يلزمه ذلك لأنه قادر على الركوع والسجود حقيقة ولا يصح الايماء بهما مع القدرة عليهما بل شرطه تعذرهما كما هو موضوع المسألة.

(۳۱۵) خروج ریح کی صورت میں اشارہ سے رکوع وسجدہ کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصہ سے ایک بیماری ہے جو نماز کیلئے پریشانی کا باعث بنتی ہے وہ یہ ہے کہ جب میں نماز کے دوران رکوع یا سجدہ کرتا ہوں تو ریح خارج ہو جاتی ہے۔ایک صاحب نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ آپ نماز بیٹھ کر ادا کیا کریں اور رکوع اور سجدہ کرنے کی بجائے اشارہ کیا کریں۔ آیا ایسی صورت میں میرے لئے بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنا جائز ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں مذکورہ عذر (خروج ریح) کی وجہ سے آپ کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنا اور رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرنا جائز ہے۔

لمافي الهندية (۱/ ۱۳۸): كل من لا يقدر على اداء ركن الابحدث يسقط عنه ذالك الركن كذا في فتاوىٰ قاضيخان. حتى لو كان به جراحة لا يستطيع ان يسجد الا وتسيل جراحته وهو صحيح فيما سوى ذالك يقدر على الركوع والقيام والقراءة يصلي قاعداً ويؤمي ايماءً.

وفي الشامية (۲/۹۸): رجل بحلقه خراج ان سجد سال وهو قادر على الركوع والقيام والقراءة يصلي قاعداً ويومي.

وفيه ايضاً(۱/۳۰۷): (قوله ولو بصلاته مؤمئا) اى كما اذا سال عند السجود ولم يسل بدونه فيؤمي قائما او قاعدا وكذا لو سال عند القيام يصلي قاعدا.

(قوله وبرده لا يبقى ذاعذر) قال في البحر: ومتى قدر المعذور على رد السيلان برباط او حشو أو كان لو جلس لا يسيل ولو قام سال وجب رده، وخرج برده عن ان يكون صاحب عذر، ويجب ان يصلي جالسا بايماء ان سال بالميلان لان ترك السجود اهون من الصلاة مع الحدث.

(۳۱۶) کبڑے شخص کے رکوع کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبڑا شخص نماز کے اندر رکوع کس طرح کرے جبکہ وہ عام حالات میں بھی اتنا جھکا ہوتا ہے جیسے رکوع کی حالت میں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... کبڑا پن اگر حالت رکوع تک پہنچ جائے تو پھر کبڑا شخص سر کے اشارے سے رکوع کرے گا۔

لمافی الخلاصة (۱/۵۳): الاحدب اذا بلغت حدوبته الركوع يشير براسه للركوع.

وفی الهندية (۱/۷۰): والاحدب اذا بلغت حدوبته الركوع يشير براسه للركوع.

(۳۱۷) دو راستوں میں کم وزیادہ مسافت کے وقت سفر شرعی کیلئے ۴۸ میل کا اعتبار ہوگا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے اپنے سسرال جانے کیلئے دو راستے ہیں ایک ہموار اور دوسرا ناہموار۔ زید جب ہموار راستے سے اپنے سسرال جاتا ہے تو تین دن میں ۴۸ میل سفر طے کرتا ہے اور جب ناہموار راستے سے جاتا ہے تو تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ جب زید ناہموار راستے سے تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے تو اب وہ قصر نماز پڑھے گا یا مکمل نماز پڑھے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... فقہاء احناف کے یہاں سفر کی ادنیٰ مقدار مسافر شرعی بننے کیلئے وہ تین دن اور تین رات کا سفر ہے چاہے حقیقتاً تین دن پائے جائیں یا تین دن کی مسافت کے بقدر مسافت پائی جائے دونوں صورتوں میں انسان مسافر شرعی کہلاتا ہے اور اس پر سفر کے احکام جاری ہوتے ہیں، اصل مذہب کے اعتبار سے فرسخ کا اعتبار نہیں ہے بلکہ صرف تین دن کی مسافت کا اعتبار ہے اگرچہ بعد کے فقہاء نے فرسخ کا اعتبار کیا ہے جس کو موجودہ دور میں میل اور کلومیٹر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ان حضرات کا مقصد بھی فرسخ وغیرہ سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تین دن میں انسان درمیانی چال (اونٹ یا پیدل سفر کرنے) سے اتنی مسافت طے کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص تین دن کا سفر کر کے کسی جگہ پہنچتا ہے زمین کے دشوار گزار ہونے کی بناء پر تو وہ بھی مسافر شرعی ہے اگرچہ فرسخ کے اعتبار سے کم ہی فاصلہ ہو، اس صورت میں فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا بوجہ نص کے کیونکہ نص میں تین دن کے الفاظ موجود ہیں لہٰذا صورت مسئولہ میں جب زید ناہموار راستے سے تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے تو اس صورت میں وہ مسافر شرعی ہے اور وہ قصر نماز پڑھے گا کیونکہ تین دن کے سفر کی صورت میں میل اور فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے البتہ یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جو کہ معتاد تین دن اور تین رات کا سفر کرے اور اگر کوئی شخص گاڑی وغیرہ میں سفر کرتا ہے جیسا کہ موجودہ زمانے میں کیا جاتا ہے تو وہاں ۴۸ میل کا ہی اعتبار ہوگا چاہے ۴۸ میل تین دن سے کم میں ہی مکمل ہو جائیں اس صورت میں دنوں کا اعتبار نہیں ہوگا اگر ۴۸ میل کا سفر طے کر لیا ہے تو قصر پڑھے گا ورنہ نہیں۔

لمافی الهندية (۱/۱۳۸): فاذا قصد بلدة والى مقصده طريقان أحدهما مسيرة ثلاثة ايام ولياليها

والآخر دونها فسلک الطریق الابعد کان مسافرا عندنا هکذا فی فتاویٰ قاضی خان وان سلک الا قصریتم کذا فی البحر.

وفی فتح القدیر (۲/۳۰): (قوله هو الصحیح) احتراز عما قیل یقدربها فقیل بأحد وعشرین فرسخا وقیل بثمانیة عشر وقیل بخمسة عشر وکل من قدر بقدر منها اعتقد انه مسیرة ثلاثة ایام وانما کان الصحیح ان لا یقدر بها لانه لو کان الطریق وعراً بحیث یقطع فی ثلاثه ایام اقل من خمسة عشر فرسخا قصر بالنص وعلی التقدیر باحد هذه التقدیرات لایقصر فیعارض النص فلا یعتبر سوی سیر الثلاثة وعلی اعتبار سیرا لثلاثة بمشی الاقدام لوسارها مستعجل کالبرید فی یوم قصر فیه وافطر لتحقق سبب الرخصة وهو قطع مسافة ثلاثة بسیر الابل ومشی الأقدام.

وفی الدرالمختار (۲/۱۲۲،۱۲۳): (مسیرة ثلاثة أیام ولیالیها) من أقصر أیام السنة ولا یشترط سفر کل یوم إلی اللیل بل إلی الزوال ولا اعتبار بالفراسخ علی المذهب (بالسیر الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتی لواسرع فوصل فی یومین قصر، ولو لموضع طریقان أحدهما مدة السفر والاخر اقل قصر فی الاول لا الثانی. قال العلامة الشامی علیه الرحمة فی رد المحتار: قال فی النهایة: أی التقدیر بثلاث مراحل قریب من التقدیر بثلاثة ایام لان المعتاد من السیر فی کل یوم مرحلة واحدة خصوصا فی أقصر أیام السنة کذا فی المبسوط اهـ وکذا مافی الفتح من أنه قیل یقدر بأحد وعشرین فرسخا وقیل بثمانیة عشر وقیل بخمسة عشر وکل من قدر منها اعتقد أنه مسیرة ثلاثة ایام اهـ ای بناء علی اختلاف البلدان فکل قائل قدر ما فی بلده من أقصر الأیام أو بناء علی اعتبار أقصر الأیام او أطولها او المعتدل منها وعلی کل فهو صریح بأن المراد بالأیام ماتقطع فیها المراحل المعتادة فافهم ....(قوله علی المذهب) لأن المذکور فی ظاهر الروایة اعتبار ثلاثة ایام کمافی الحلیة وقال فی الهدایة: هو الصحیح احتراز عن قول عامة المشایخ من تقدیرها بالفراسخ.

وفی فتح الملهم (۳/۵۳۷): تنبیه: نبه ابن عابدین علی ان المراد بالایام ما تقطع فیه المراحل المعتادة، وفی الدر المختار وغیره لو اسرع فوصل فی یومین الی مکان مسافة ثلثة ایام بالسیر المعتاد: قصر. قال ابن عابدین وظاهره انه کذلک لو وصل الیه فی زمن یسیر بکرامة لکن استبعده (ابن الهمام) فی فتح القدیر بانتفاء مظنة المشقة وهی العلة فی القصر قلت: والظاهر ان هذا الاستبعاد من ابن الهمام یجری فی اسفار زماننا ایضا من سیر البابورة والمواتر وغیرهما والله اعلم.

(۳۱۸) مسافر شرعی کی تعریف

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسافر شرعی کسے کہتے ہیں؟ آج کل تبلیغی جماعت والے جب چلہ یعنی چالیس دن لگاتے ہیں تو ایک بستی میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن تشکیل ہو جانے کی صورت میں بعض جماعتیں سفری نماز ہی پڑھتی ہیں حالانکہ ہم نے سنا ہے کہ کسی شخص کا پندرہ دن یا اس سے زیادہ وقت اگر ایک جگہ پر رہنے کا ارادہ ہو تو وہ مسافر مقیم ہو جاتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو شخص ایسی جگہ جانے کا ارادہ کرے جس کی مسافت تین دن پیدل چلنے یا اونٹ کے چلنے کے برابر ہو جس کا اندازہ فقہاء کرام نے ۴۸ میل/ ۷۷،۲۴۸۵ کلومیٹر لگایا ہے اور وہاں پر پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ ہو تو ایسا شخص مسافر شرعی کہلائے گا اور یہ شخص قصر کرے گا۔ پس صورت مسئولہ میں جن جماعتوں کی تشکیل ایک ہی بستی یا شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ہو جائے اور وہاں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت بھی ہو، یہ لوگ پوری نماز پڑھیں گے ہاں اگر پندرہ دن سے کم ہو تو پھر یہ مسافر ہوں گے اور نماز قصر پڑھیں گے۔

وفی الهندية(۱۳۹/۱): ولایزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة أو قرية خمسة عشر یوما أو اكثر كذا فی الهداية.

وفی الدرالمختار(۱۲۵/۲): (اوینوی) ولو فی الصلوٰة اذا لم یخرج وقتها ولم یک لاحقا (اقامة نصف الشهر) حقیقة اوحکما لما فی البزازية وغیرها: لودخل الحاج الشام وعلم انه لایخرج الامع القافلة فی نصف شوال أتم لانه کناوی الاقامة.

(۳۱۹) مسافت شرعی کی ابتداء وانتہا کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سفر کی مسافت جو کہ ۴۸ میل ہے اس کا اعتبار وشمار کہاں سے ہوگا، شہر کی حدود کے باہر سے یا مسافر کے گھر سے؟ اسی طرح جس شہر کی طرف سفر کر رہا ہے، وہاں پر بھی اس شہر کی حدود تک مسافت کا اعتبار ہوگا یا اس خاص مقام تک کا اعتبار کیا جائے گا جہاں وہ قیام پذیر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سفر کی مسافت کا اعتبار اپنے شہر کی آبادی اور حدود کے ختم ہونے کے بعد سے کیا جاتا ہے۔

لمافی الهندية (۱۳۹/۱): قال محمد رحمه الله: یقصر حین یخرج من مصره ویخلف دور المصر كذا فی المحیط.

وفی الدر المختار(۱۲۱/۲): (من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم یجاوز

من الجانب الاخر.

وفي الشامية (۲/ ۱۲۱): (قوله من جانب خروجه الخ) قال في شرح المنية: فلا يصير مسافراً قبل ان يفارق عمران ماخرج منه من الجانب الذي خرج حتى لو كان ثمة محلة منفصلة عن المصر وقد كانت متصلة به لايصير مسافراً مالم يجاوزها، ولوجاوز العمران من جهة خروجه وكان بحذائه محلة من الجانب الاخر يصير مسافراً اذ المعتبر جانب خروجه.

(۳۲۰) مسافت سفر کی ابتداء وانتہاء کہاں سے ہوگی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مسافتِ سفر کے بارے میں ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص گوجرانوالہ سے لاہور شہر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی مسافت کی مقدار سفر شرعی کے برابر نہیں بنتی، لیکن وہ لاہور شہر ہی میں اتنی دور چلا جاتا ہے کہ اس کی مسافت کی مقدار سفرِ شرعی کی مقدار کے برابر ہو جاتی ہے تو آیا اس پر احکاماتِ سفر لازم ہوں گے یا نہیں، اور مقدار مسافت کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم ہوتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر گوجرانوالہ سے لاہور کے اس مقام تک جانے کی نیت کی ہے جہاں تک سفرِ شرعی نہیں بنتا تو مسافر نہیں ہوگا۔ البتہ اگر لاہور سے آگے جا رہا ہے اور گوجرانوالہ سے نکل کر وہاں تک مدتِ شرعی ہے۔ تو گوجرانوالہ سے نکلتے ہی مسافر شمار کیا جائے گا۔ باقی مقدار مسافت شہر یا بستی کی آبادی سے نکلنے سے شروع ہوتی ہے اور دوبارہ آبادی میں آنے سے ختم ہو جاتی ہے۔

لمافي الدر المختار (۲/ ۱۲۱، ۱۲۲): (من خرج من عمارة موضع اقامته)...... (قاصدا) (مسيرة ثلاثة أيام ولياليها)...... (حتى يدخل موضع مقامه) ان سار مدة السفر......

وفي بدائع الصنائع (۱/ ۴۷۷): وفعل السفر لا يتحقق الا بعد الخروج من المصر فمالم يخرج لا يتحقق قرآن النية بالفعل، فلا يصير مسافراً.

(۳۲۱) جب کسی شخص کا سفر شرعی پر جانے کا ارادہ ہو تو وہ کب قصر کرے گا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں سڑک سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اگر ہمیں سفر کرنا ہو تو ایک کلومیٹر پیدل سفر کر کے گاڑی پر جا کر سوار ہوتے ہیں اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم سے کسی کو مسافت شرعی سے زیادہ کہیں سفر پر جانا پڑے تو راستے میں قصر ہوگی۔ اب یہ قصر گاؤں سے نکلتے ہی شروع ہوگی یا اڈے سے سوار ہونے کے بعد قصر کے احکامات شروع ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب کسی شخص کا سفر شرعی پر جانے کا ارادہ ہو، تو جب وہ شہر کی آبادی اور فناء مصر سے نکل جائے گا تو اس پر سفر کے

احکام جاری ہوں گے، لہٰذا اگر صورت مسئولہ میں اڈہ فناء مصر میں داخل ہے تو اڈے سے نکلتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے اگر اڈہ فناء مصر میں داخل نہیں تو پھر آبادی سے نکلتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے۔

لمافی الهندية (۱/۱۳۹): قال محمد رحمة الله تعالىٰ يقصر حين يخرج من مصره ويخلف دور المصر كذا فى المحيط. وفى الغياثيه هو المختار وعليه الفتوى كذا فى التتارخانية، الصحيح ما ذكر انه يعتبر مجاوزة عمران المصر لا غير الا اذا كان ثمة قرية او قرى متصلة بربض المصر فحينئذ تعتبر مجاوزة القرى بخلاف القرية التى تكون متصلة بفناء المصر فانه يقصر الصلاة وان لم يجاوز تلك القرية كذا فى المحيط.

وفى الدر المختار (۲/۱۲۱): (من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم يجاوز من الجانب الاخر.

(۳۲۲) مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر نماز کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں عمرہ کرنے گیا۔ وہاں پر پہنچ کر عمرہ ادا کیا اس کے بعد آرام کرنے ہوٹل چلے گئے اور سو گئے آنکھ کھلی تو عصر کی نماز ہو رہی تھی۔ ہم نے جماعت سے نماز ادا کی۔ پھر اس کے بعد ظہر کی قضا نماز ادا کی۔ قصر نہیں پڑھی کسی نے ہمیں بتایا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر نماز نہیں پڑھنی چاہیے کیا یہ صحیح ہے۔ باقی سب جگہ پر قصر نماز صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... جب کوئی مقیم شخص گھر سے سفر شرعی کے ارادے سے نکلتا ہے جو آجکل کے حساب سے اڑتالیس میل (۷۷ء۹۸ کلومیٹر) بنتا ہے۔ اپنے شہر یا بستی سے نکلنے کے بعد اس پر مسافر کے احکام جاری ہو جاتے ہیں مثلاً یہ کہ نماز قصر پڑھے۔ اور یہ قصر نماز پڑھنا واجب ہے یعنی چار رکعت والی فرض نمازیں دو رکعت پڑھے گا۔ اور یہ حکم کسی خاص جگہ یا مقام کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن کسی جگہ ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔ یا اپنے شہر لوٹ نہ آئے۔ اس پر وہی مسافر کے احکام جاری ہوں گے البتہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن ٹھہرنے کی نیت کرنے کے بعد وہ شخص پوری نماز پڑھے گا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ عمرہ کیلئے پندرہ دن سے کم وقت کیلئے گئے تھے۔ تو آپ کا پوری نماز پڑھنا درست نہیں۔ بلکہ آپ کیلئے قصر نماز پڑھنا ضروری تھا۔ البتہ جو نمازیں آپ نے پوری پڑھی ہیں وہ ادا ہو گئی ہیں۔ بشرطیکہ ان نمازوں میں قعدہ اولیٰ کیا ہو۔ اور کسی کا یہ کہنا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر درست نہیں بلکہ پوری نماز پڑھی جائے گی۔ یہ بات درست نہیں۔ بلکہ قصر کا حکم مسافر کیلئے ہر جگہ ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی ہو، خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو مسجد حرام میں قصر نماز پڑھی ہے۔

لمافى الدر المختار (۲/۱۲۳، ۱۲۴): (صلّى الفرض الرباعى ركعتين) وجوبا لقول ابن عباسؓ: ان الله فرض على لسان نبيكم صلاة المقيم أربعا والمسافر ركعتين ولذا عدل المصنف عن قولهم قصر

لان الرکعتین لیستا قصرا حقیقة عندنا بل هما تمام فرضه والاکمال لیس رخصة فی حقه بل اساءة.

وفی الفتاوی الهندیة(۱/۱۳۹): والقصر واجب عندنا کذا فی الخلاصة، فان صلی أربعا وقعد فی الثانیة قدر التشهد أجزأته والأخریان نافلة ویصیر مسیئاً لتأخیر السلام وان لم یقعد فی الثانیة قدرها بطلت کذا فی الهدایة.

(۳۲۳) ۹۵ کلومیٹر مسافت پر پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک استفتاء کسی ساتھی کے توسط سے داخل کیا تھا (استفتاء نمبر ۲۲۱۳) جسکا جواب مل گیا لیکن اب مسئلہ یہ درپیش ہوا، ہمارا گھر اور کوئٹہ کے درمیان 95 کلومیٹر فاصلہ ہے پہلے والے میں (70 کلومیٹر) لکھا ہوا تھا جو کہ غلط تھا اب معلوم کرنے پر 95 کلومیٹر بنتا ہے۔

اب کیا میں مسافر ہوں یا نہیں؟ جبکہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور میں نے کوئٹہ میں ایک کرائے کا کمرہ لیا ہوا ہے، جب میں آتا ہوں تو ایک دو دن کیلئے ٹھہرتا ہوں پھر گھر جاتا ہوں پھر گھر سے واپس آکر تین چار دن رہ کر پھر واپس گھر جاتا ہوں یعنی پندرہ دن سے کم رہتا ہوں تو اندازاً پندرہ دن میں میں دو تین مرتبہ گھر جاتا ہوں اور کرایہ کا مکان اس لئے لیا ہے تاکہ میرا سامان اور آرام کرنے کی جگہ معین ہو۔ تو اب ان تمام صورتوں میں میرے لئے کیا حکم ہے کیا میں مسافر ہوں یا نہیں؟ اگر میں مسافر نہیں ہوں تو جو نمازیں میں نے مسافرانہ پڑھی ہیں ان کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے گھر اور کوئٹہ شہر کے درمیان 95 کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور آپ کوئٹہ شہر میں 15 روز یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت بھی نہیں کرتے (اگرچہ آپ نے سامان وغیرہ کی حفاظت کی غرض سے وہاں مکان کرائے پر لیا ہوا ہے) تو شرعاً آپ مسافر ہیں اس لئے آپ کی نماز بھی مسافرانہ ہوگی کیونکہ سفر کی مسافت شرعیہ تین دن کی مسافت ہے جو کہ 48 میل کے برابر ہوتی ہے 48 میل کے تقریباً 77 کلومیٹر بنتے ہیں اور جو نمازیں آپ نے قصر یعنی مسافرانہ پڑھی ہیں وہ ادا ہوگئیں ان کی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں۔

لمافی التاتارخانیه (۲/۱): فی بیان ادنی مدة السفر الذی یتعلق به قصر الصلوة قال علمائنا ادناها مسیرة ثلاثة ایام ولیالیها مع الاستراحات...... وعن ابی حنیفة انه اعتبر ثلاث مراحل.

وفی الشامیة (۲/۱۳۳) فاذا دخل المسافر بلدة ونوی ان یقیم بها یوما مثلا ثم خرج منها ثم رجع الیها قصر فیها کما کان یقصر قبل خروجه وعلیه یحمل کلام المحققین لقول البحر انهم قالوا لافائدة فیه لانه یبقی فیه مسافرا علی حاله. اه

(۳۲۴) کوئٹہ سے قلات اگر پندرہ دن سے کم کیلئے جانا ہوتو قصر کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغرضِ ملازمت میرا ضلع قلات آنا جانا رہتا ہے۔ ہمیشہ جب بھی جاتا ہوں ایک آدھ ہفتہ کی نیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد واپس اپنے وطن اصلی کوئٹہ آجاتا ہوں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ قلات میں نماز قصر کروں یا پوری پڑھوں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... چونکہ ضلع قلات اور آپ کے وطن اصلی کوئٹہ کے درمیان مسافت، شرعی مقدار مسافت سے زیادہ ہے اور وہاں پر آپ کی پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت بھی نہیں ہوتی اس لئے آپ پر قلات میں اور حالت سفر میں قصر نماز پڑھنا لازم ہے۔

لما في الهندية(۱/۱۳۹): ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة في بلدة او قرية خمسة عشر يوما أو اكثر كذا في الهداية هذا اذا سار ثلاثة ايام.

وفي الشامية(۲/۱۳۱): (قوله الوطن الاصلي) ويسمى بالاهلي ووطن الفطرة والقرار (قوله او تأهله) اى تزوجه قال في شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الاقامة به فقيل لايصير مقيما وقيل يصير مقيما وهو الاوجه ولو كان له اهل ببلدتين فأيتهما دخلها صار مقيما، فان ماتت زوجته في احداهما وبقى له فيها دور وعقار قيل لايبقى وطناله اذا المعتبر لاهل دون الدار كما لو تاهل ببلدة واستقرت سكناله وليس له دارفيها وقيل تبقى (قوله او توطنه) أى عزم على القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتأهل، فلو كان له ابوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتاهل به فليس ذلك وطناله الا اذا عزم على القرار فيه وترك الوطن الذى كان له قبله.

(۳۲۵) دوشہروں میں رہائش ہوتو وطن اصلی کونسا ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا آبائی شہر سکھر ہے لیکن اب اس نے لاہور میں شادی کرلی ہے کبھی سکھر میں رہتا ہے اور کبھی لاہور میں تو اس کا وطن اصلی لاہور ہوگا یا سکھر؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص اپنے اہل وعیال کے ساتھ سکھر میں رہتا ہو، اور یہاں پر ہمیشہ رہنے کا ارادہ ہو، اور کبھی لاہور میں اپنے اہل عیال کے ساتھ رہتا ہو، اور یہاں اپنا گھر بھی ہو، اور یہاں پر ہمیشہ رہنے کا ارادہ ہو، تو دونوں جگہیں ان کا وطن اصلی ہوگا۔ اور اگر سسر کے ہاں بچوں کو ملنے ملانے کیلئے آیا ہو تو اگر پندرہ دن یا زیادہ دن تک ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو مقیم ہوگا۔

لما في الهندية(۱/۱۴۲): ويبطل الوطن الاصلي بالوطن الاصلي اذا انتقل عن الاول بأهله واما اذا لم ينتقل بأهله ولكنه استحدث اهلا ببلدة اخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيهما.

وفی الخانیہ علی ھامش الھندیۃ(۱/۱۶۶): الکوفی اذا نوی الاقامۃ بمکۃ ومنی خمسۃ عشر یوما لم یکن مقیما وان لم یکن بینھما مسیرۃ سفر لانہ لم ینو الاقامۃ فی احدھما خمسۃ عشر یوما وان تأھل بھما کان کل واحد من الموضعین وطنا اصلیا لہ.

وفی الشامیۃ(۲/۱۳۱): ولو کان لہ أھل ببلدتین فایتھما دخلھا صار مقیما.

(۳۲۶) کسی دوسرے شہر کو وطن بنالیا تو کیا اب وطن اصلی میں پندرہ دن سے کم قیام پر قصر کریگا؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا تعلق صوبہ پنجاب سے ہے اور کراچی میں ملازمت کرتا ہوں، اب صورت حال یہ ہے کہ میں اہلیہ کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر ہوں اور کم از کم پچیس سال ملازمت کے ہیں جن میں یہیں رہنے کا ارادہ ہے اور اپنا ذاتی مکان بنانے کا ارادہ بھی ہے جس کیلئے پلاٹ خرید لیا ہے جبکہ اپنا اصلی گھر جو پنجاب میں ہے وہاں والدین اور بھائی رہتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے بسا اوقات میں پندرہ دن سے کم مدت کیلئے پنجاب جاتا ہوں تو آیا جب میں اپنے وطن اصلی میں جاؤں گا تو میں نماز مکمل پڑھوں گا یا قصر ہوگی؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں آپ نے اگر یہاں (کراچی میں) مستقلاً رہنے کا ارادہ کرلیا ہے اور یہاں سے مستقلاً پنجاب واپس جانے کا ارادہ نہیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھی کراچی منتقل کر دیا ہے تو اس صورت میں کراچی آپ کا وطن اصلی ہوگیا ہے پنجاب آپ کا وطن اصلی نہیں رہا، اگرچہ والدین وغیرہ وہاں ہیں۔ اب پنجاب جانے کی صورت میں اگر آپ کی وہاں ٹھہرنے کی نیت پندرہ دن سے کم کی ہو، تو اِس صورت میں آپ قصر کریں گے۔

وفی الشامیۃ (۲/۱۳۱): (قولہ الوطن الأصلی) ویسمٰی بالأھلی ووطن الفطرۃ والقرار ح عن القھستانی (قولہ أوتأھلہ) أی تزوجہ قال فی شرح المنیۃ: ولو تزوج المسافر ببلدولم ینوالأقامۃ بہ فقیل لایصیر مقیما وقیل یصیر مقیما، وھو الأوجہ ولو کان لہ أھل ببلدتین فایتھما دخلھا صارمقیما، فأن ماتت زوجتہ فی إحداھما وبقی لہ فیھا دور وعقار قیل لایبقی وطنالہ اذ المعتبر الأھل دون الدار کمالو تاھل ببلدۃ واستقرت سکنالہ ولیس لہ فیھا دار..... وقیل تبقی (قولہ أو توطنہ) أی عزم علی القرار فیہ و عدم الارتحال وإن لم یتأھل، فلو کان لہ أبوان ببلد غیر مولدہ وھو بالغ ولم یتأھل بہ فلیس ذلک وطنالہ الااذا عزم علی القرار فیہ وترک الوطن الذی کان لہ قبلہ.

(۳۲۷) رہائش کراچی میں ہو، اور سسرال سجاول میں، تو سسرال میں نمازوں کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں خود کراچی میں رہتا ہوں اور میرے سسرال والے سجاول میں رہتے ہیں اور میرا اکثر سجاول آنا جانا رہتا ہے۔ تو کیا میں جب سجاول جاؤں تو وہاں نماز قصر کرسکتا ہوں جبکہ کراچی سے سجاول

تک مسافت شرعی پائی جاتی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جب آپ کی رہائش بیوی بچوں کے ساتھ کراچی میں ہے اور پھر آپ سسرال ساوول پندرہ دن یا اس سے زیادہ رہنے کی نیت سے جاتے ہیں تو پھر آپ وہاں پوری نماز پڑھیں گے اور اگر آپ کی نیت سسرال پندرہ دن سے کم رہنے کی ہے تو وہاں آپ قصر کریں گے۔

لمافي الهندية (١/١٤٢): وطن أصلي وهو مولد الرجل أو البلد الذى تأهل به..... ويبطل الوطن الأصلي بالوطن الاصلي اذا انتقل عن الاول بأهله وأما اذا لم ينتقل بأهله ولكنه استحدث أهلا ببلدة أخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيهما.

وفي الهندية (١/١٣٩): ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة فى بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر كذا فى الهداية.

(۳۲۸) عورت کا شادی کے بعد وطن اصلی کون سا ہوگا؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والدین کراچی میں رہتے ہیں میں بھی ان ہی کے ساتھ رہتی تھی اب میرے والدین نے میری شادی کوئٹہ کے ایک لڑکے کے ساتھ کردی اب میری رہائش بھی کوئٹہ ہی میں ہے اب میرا وطن اصلی کون سا ہوگا؟ اور میرے لئے شرعاً کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً.....انسان کی جہاں پیدائش ہو وہ یا وہ شہر جہاں گھر بنالیا ہو اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ مستقل رہائش اختیار کرلی ہو وطن اصلی کہلاتا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ وطن اصلی باطل ہوتا ہے وطن اصلی سے۔ اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ بیوی سفروا قامت میں اپنے شوہر کے تابع ہوتی ہے جبکہ وہ مہر معجل ادا کرچکا ہو، اور عدم ادائیگی کی صورت میں حق زوجیت ادا کرنے سے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کوئٹہ آپ کے حق میں وطن اصلی ہے اپنے شوہر کے ہمراہ مستقل رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے۔ اور اب کراچی آپ کے حق میں وطن اصلی نہیں رہا۔

لمافي كبيرى (ص١٥٠): فالاصلي وهو مولد الانسان او موضع تأهل به ومن قصده التعيش به لا الارتحال عنه اما لو كان له ابوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتأهل به فليس ذلك وطنا له وفى المبسوط هو الذى نشأفيه او توطن فيه اوتأهل فقوله او توطن فيه يتناول ماعزم القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتاهل فعلى هذا لو عزم من له ابوان فى بلد على القرار فيه وترك الوطن الذى كان قبله له يكون وطناله ولو تزوج المسافر ببلدة ولم ينو الاقامة به فقيل لا يصير مقيما وقيل يصير مقيما وهوا لاوجه لمامر من حديث عثمانؓ.

لمافي الشامية(٢/١٣١): (قوله الوطن الاصلي) ويسمى بالأهلي ووطن الفطرة والقرارح عن

القهستاني (قوله أو تأهله) اى تزوجه قال في شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به فقيل لا يصير مقيما وقيل يصير مقيما، وهو الاوجه.

وفي الهندية(۱/۱۴۱): وكل من كان تبعا لغيره يلزمه طاعته يصير مقيما باقامته ومسافرا بنيته وخروجه الى السفر.

(۳۲۹) ۳۰ میل سفر کی نیت کے بعد ۲۵ میل آگے اور جانا پڑ جائے تو نماز کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے پر تین روز کیلئے جانا ہوا۔ وہاں جا کر کچھ مزید کام آ گیا اور اس مقام سے تقریباً ۲۵ میل دور اور سفر کرنا پڑا اور یہاں قیام تیرہ دن کا تھا اس کے بعد اپنے گھر جو کہ یہاں سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے آنا تھا۔ اب میں اس دوسرے مقام پر نمازیں قصر کروں یا نہیں؟ براہ کرم جواب سے جلد سرفراز فرمائیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....سفر شرعی کیلئے مسافت سفر کی نیت کرنا ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ اس دوسرے مقام پر بھی نماز پوری پڑھیں گے اس لئے کہ وہاں سے نکلتے وقت آپ کی نیت مسافت سفر شرعی سے کم مقدار طے کرنے کی تھی تو آپ شرعاً مسافر نہیں ہوں گے اور آپ پر احکام سفر لاگو نہ ہوں گے البتہ وہاں سے گھر لوٹتے وقت آپ قصر کریں گے کیونکہ واپسی کے وقت میں مسافت سفر پوری ہے۔

لما في فتح القدير(۲/۲۸):السفر الذى يتعلق به تغير هذه الاحكام واخذ فيه مع المقدار الذى ذكره القصد فافادانه لوطاف الدنيا من غير قصد إلى قطع مسيرة ثلاثة ايام لا يترخص وعلى هذا قالوا امير خرج مع جيشه في طلب العدو ولم يعلم اين يدركهم فانهم يصلون صلوة الاقامة في الذهاب وان طالت المدة وكذا المكث في ذلك الموضع اما في الرجوع فان كانت مدة سفر قصروا......

وعلى اعتبار القصد تفرع في صبى ونصراني خرجا قاصدين مسيرة ثلاثه أيام ففي اثنائها بلغ الصبى وأسلم الكافر يقصر الذى اسلم فيما بقي ويتم الذى بلغ لعدم صحة القصد والنية من الصبى حين أنشأ السفر بخلاف النصراني و الباقي بعد صحة النية أقل من ثلاثة أيام.

وفي الشامية(۲/۱۲۲): (قوله قاصداً) اشاربه مع قوله خرج الى أنه لو خرج ولم يقصد أو قصد ولم يخرج لا يكون مسافراً...... (قوله بلا قصد) بأن قصد بلدة بينه وبينها يومان للاقامة بها فلما بلغها بدا له ان يذهب إلى بلدة بينه وبينها يومان وهلم جرًا. قال في البحر وعلى هذا قالوا امير خرج مع جيشه في طلب العدو ولم يعلم اين يدركهم فانه يتم وان طالت المدة أو المكث، امّا في الرجوع فان كانت مدة سفر قصر.

﴿فصل فی الجمعة و العیدین﴾

(جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے بیان میں)

(۳۳۰) جمعہ کی نماز کی نیت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اور میرا دوست پابندی سے نماز پڑھتے ہیں آپ سے ایک بات یہ پوچھنی تھی کہ جمعہ کی نماز کی کیا نیت ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... جمعہ کی نماز کی نیت کیلئے آپ امام صاحب کے پیچھے ان الفاظ سے نیت کرلیا کریں "دو رکعت جمعہ کی ان امام صاحب کی اقتداء میں ادا کرتا ہوں۔"

وفی الدرالمختار (۱/۴۲۰،۴۲۱): وینوی المقتدی المتابعة لم یقل ایضاً لانه لونوی الاقتداء بالامام أو الشروع فی صلاة الامام ولم یعین الصلاة صح فی الاصح وان لم یعلم بها لجعله نفسه تبعاً لصلوٰة الامام.

(۳۳۱) نماز جمعہ کا مستحب وقت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی نماز اول وقت میں پڑھنا سنت ہے یا نہیں؟ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے اس میں جمعہ کی نماز بہت تاخیر سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات نمازیوں کو پریشانی ہوتی ہے خاص کر سردیوں کے موسم میں لہٰذا اس مسئلے کا شرعی حل بتلائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً..... سردی اور گرمی میں مطلقاً نماز جمعہ اوّل وقت ہی میں پڑھنا مستحب ہے، اس لئے ائمہ مساجد اور کمیٹی والوں کو چاہئے کہ وہ مستحب اوقات میں ہی نماز جمعہ کا وقت مقرر کریں، البتہ اگر کسی مصلحت کے تحت نماز جمعہ کا وقت تھوڑا بہت تاخیر سے رکھا جائے تو اس میں فقہاء نے گنجائش رکھی ہے۔ لیکن اتنی تاخیر میں نماز جمعہ کا وقت مقرر کرنا کہ اگلی نماز کا وقت قریب ہونے لگے یا امام کا "مقررہ وقت سے" بلاوجہ اتنی زیادہ تاخیر کرنا کہ جس سے مقتدیوں کو پریشانی ہو، یہ طریقہ خلاف سنت ہے اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

لمافی البخاری (۱/۱۲۳): عن أنس ابن مالک رضی الله عنه أن رسول الله ﷺ کان یصلی الجمعة حین تمیل الشمس.

وفی الدر المختار (۱/۳۶۶،۳۶۷): (وتاخیر ظهر الصیف) بحیث یمشی فی الظل (مطلقا)...... (وجمعة کظهر اصلا واستحبابا) فی الزمانین لأنها خلفه

وقال الشامی رحمه الله تحته: (قوله واستحبابا فی الزمانین) أی الشتاء والصیف ح ....وقال الجمهور: لیس بمشروع لأنها تقام بجمع عظیم فتأخیرها مفض إلی الحرج ولا کذلک الظهر وموافقة الخلف لأصله من کل وجه لیس بشرط اهـ.

(۳۳۲) سعی الی الجمعہ کونسی اذان پر واجب ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن اذان کے وقت سعی الی الجمعہ واجب ہے تو اذان سے کون سی اذان مراد ہے آیا خطبے کے وقت کی اذان مراد ہے یا اس سے پہلے والی اذان مراد ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ کے دن خطبۂ جمعہ سے قبل دو اذانیں دی جاتی ہیں ان دونوں میں جو پہلی اذان ہے اس وقت سعی الی الجمعہ واجب ہے۔

لما فی الهندیة (۱/۱۴۹): ویجب السعی وترک البیع بالاذان الاول وقال الطحاوی یجب السعی ویکره البیع عند أذان المنبر وقال الحسن ابن زیاد المعتبر هو الأذان علی المنارة والأصح ان کل أذان یکون قبل الزوال فهو غیر معتبر والمعتبر أوّل الاذان بعد الزوال سواء کان علی المنبر أو علی الزوراء.

وفی الشامیة (۲/۱۶۱): وحاصله أن السعی نفسه فرض والواجب کونه فی وقت الأذان الأول.

(۳۳۳) عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر پڑھنا کیسا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدگاہ سے واپسی پر راستے میں تکبیر پڑھنا مسنون ہے کہ نہیں؟ کوئی پڑھے تو نفس جواز کی وجہ سے جائز ہے کہ نہیں یا بدعت کہلائے گی؟ زید کہتا ہے کہ متون وشروح میں صرف جاتے ہوئے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، عیدگاہ پہنچنے پر ترک کا حکم ہے، اس کے علاوہ واپسی پر پڑھنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے، لہٰذا واپسی پر پڑھنا صحیح نہیں؟ جبکہ بکر کا کہنا ہے کہ مصنف میں ان من السنة التکبیر یوم العید، اور اعلاء السنن میں زینوا اعیادکم بالتکبیر اور انه ذکر مشروع سے استدلال کر کے جواز کا قول کیا جاسکتا ہے، ان دونوں میں کس کا قول صحیح ہے؟ اگر مع حوالہ جات عربی کتب جواب عنایت فرمادیں تو مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً......عیدالاضحیٰ میں عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے زور سے تکبیر کہنا سنت ہے یہاں تک کہ عیدگاہ پہنچ جائے اور عیدگاہ

سے واپسی پر تکبیر زور سے کہنا مسنون نہیں البتہ آہستہ کہنا جائز ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں زید کا یہ کہنا صحیح ہے کہ متون اور شروحات میں صرف جاتے ہوئے تکبیر کہنے کا حکم دیا گیا ہے البتہ عیدگاہ پہنچنے پر ترک کا حکم جو دیا گیا ہے وہ جہراً ترک کا حکم دیا گیا ہے اگر کوئی آدمی عیدگاہ سے واپسی پر آہستہ آواز سے تکبیر کہے تو جائز ہے اس لئے کہ یہ ذکر ہے اور ذکر میں اخفاء کا حکم دیا گیا ہے اور بکر نے جو کہا ہے کہ عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر کہنا جائز ہے تو اس کی بات صحیح ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تکبیر آہستہ آواز سے کہی جائے۔ لیکن اس نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے اس کا استدلال کمزور ہے اس لئے کہ مصنف میں جو حدیث ہے کہ ان من السنة ان يكبر يوم العيد اس سے کسی نے استدلال نہیں کیا ہے اور دوسری حدیث جو اعلاء السنن میں مذکور ہے زينوا اعيادكم بالتكبير۔ اس سے مراد جہری تکبیر ہے جو عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پڑھی جاتی ہے نہ کہ واپسی پر البتہ تکبیر کہنا فی نفسہٖ جائز ہے اس لئے کہ یہ تکبیرات ذکر ہیں اور ذکر کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ان النبی ﷺ كان يذكر الله تعالىٰ فى كل احيانه لہٰذا ان تکبیرات کو اگر کوئی آدمی آہستہ آواز سے کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ زور سے کہنا مسنون نہیں۔

لمافی المصنف لابن شيبة(۱۹۲/۴): حدثنا عبد الله بن ادريس عن يحيى بن عبدالله بن ابى قتادة قال: أراه عن محمد بن ابراهيم: ان ابا قتادة كان يكبر يوم العيد ويذكر الله.

وفى اعلاء السنن(۱۱۸/۸): ويكبر عقب الصلاة جهراً ولا يجهر فيما سوى ذالك اى لايسن والا فهو ذكر مشروع هذا محصل مافى (الشامية، ۸۷۵/۱)

وفى كتاب التجنيس والمزيد(۲۳۵/۲): واذا توجه الى المصلى يكبر فى عيد الاضحىٰ لانه عليه الصلاة والسلام كان يكبر فى الطريق ولا يكبر فى عيد الفطر جهراً عند ابى حنيفةؒ خلافا لهما وهو معروف. وفى الهامش قال المؤلف فى الهداية فى العنوان السابق(۶۴/۱) ويتوجه الى المصلى ولا يكبر عند ابى حنيفةؒ فى طريق المصلى وعندهما: يكبر اعتباراً بالاضحىٰ وله أن الاصل فى الثناء الاخفاء والشرع ورد به فى الاضحى لانه يوم تكبير ولا كذالك يوم الفطر وروى عن ابن عمر رضى الله عنهما انه كان اذا غدا الى المصلى كبر فرفع صوته بالتكبير وفى رواية اخرى: كان يغدو الى المصلى يوم الفطر اذا طلعت الشمس فيكبر حتى يأتى المصلى ثم يكبر بالمصلى حتى اذا جلس الامام ترك التكبير قال مجد الدين: رواهما الشافعى. المنتقىٰ: باب الخروج الى العيد ماشيأ والتكبير فيه وما جاء فى خروج النساء(ص۲۶۲) رقم الحديث(۱۶۵۲، ۱۶۵۳) ونيل الاوطار(ص۲۸۵، ۲۸۶) يستفاد من الحديثين واحاديث الباب على ان التكبير سنة حال المشى الى المصلى وفى المصلى الى ان يقيم الصلوٰة، اشار الى هذا ابن قدامه.

وفى الطحطاوى على الدر(۳۵۵/۱): ويكبر جهراً اتفاقاً فى الطريق قيل وفى المصلى وعليه عمل

الناس الیوم لافی البیت.

وفی الدرالمختار(۲/۱۸۰): ولا بأس به عقب العید لأن المسلمین توارثوه وفی الھامش: "قوله لا بأس .... کلمة لا بأس قد تستعمل فی المندوب کمافی البحر من الجنائز والجھاد ومنه ھذا الموضع لقوله فوجب اتباعھم(قوله فوجب) الظاھر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح علیه وفی البحر عن المجتبی والبلخیون یکبرون عقب صلاۃ العید لانھا تؤدی بجماعة فاشبھت الجمعة اھ وھو یفید الوجوب المصطلح علیه ط.

(۳۳۴) خطبۂ عید میں خطیب کے ساتھ تکبیرات پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عید کے خطبہ کے دوران خطیب صاحب تکبیر پڑھتے ہیں تو سننے والا بھی خطیب کیساتھ تکبیر پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی پڑھتا ہے تو اسکے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سامعین کا سماعِ خطبہ کے وجوب کی وجہ سے تکبیرات پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اگر کوئی پڑھتا ہے تو گنہگار ہوگا۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی المراقی (ص۵۳۵): قال عبداللہ بن مسعودؓ، ھو السنة ویکبر القوم معه ویصلون علی النبی ﷺ فی أنفسھم امتثالاً للامر وسنة الانصات.

وقال الطحطاوی تحته:(قوله فی انفسھم)المرادانھم یسرون به کماتقدم والظاھر انه متعلق بالتکبیر والصلاۃ لانه یجب الانصات لجمیعھا وقوله سنة الانصات الاولی ان یقول وواجب الانصات.

(۳۳۵) عید کے خطبوں میں تکبیرات کتنی مرتبہ اور کب کہی جائیں گی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدین کے پہلے خطبے میں نو بار اور دوسرے میں سات بار تکبیریں ہیں یہ تکبیریں مسلسل کہی جائیں یا پورے خطبے میں متفرق طور پر بھی کہی جاسکتی ہیں؟ اولیٰ وافضل کیا ہے؟ نیز تکبیر سے مراد صرف اللہ اکبر ہے یا پوری تکبیر تشریق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عیدین میں جو دوران خطبہ تکبیریں کہی جاتی ہیں ان کی کوئی تعداد متعین نہیں لیکن مناسب یہ ہے کہ تکبیر خطبہ سے زیادہ نہ ہو، اور عید الاضحیٰ کے خطبہ میں عید الفطر کے خطبے کے بنسبت زیادہ تکبیریں ہوں البتہ مستحب وافضل یہ ہے کہ پہلے خطبہ کے شروع میں مسلسل نو مرتبہ اور دوسرے خطبہ کے شروع میں مسلسل سات مرتبہ تکبیریں کہی جائیں نیز تکبیر سے پوری تکبیر تشریق (اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد) مراد ہے۔

لمافی الدرالمختار (۲/۱۷۵): (ویبدأ بالتکبیر فی) خمس (خطبة العیدین) ...... (ویستحب ان

یستفتح الاولی بتسع تکبیرات تتری) ای متتابعات (والثانیة بسبع) هو السنة الخ.

وفی الشامیة (۲/۱۷۵): (قوله ویستحب الخ) ذکر ذلک فی المعراج عن مجمع النوازل وقال فی الخانیة انه لیس للتکبیر عدد فی ظاهر الروایة لکن ینبغی ان لا یکون اکثر الخطبة التکبیر ویکبر فی الاضحی اکثر من الفطراهـ قلت: واطلاق العدد فی ظاهر الروایة لاینافی تقییده بماورد فی السنة وقال به الشافعی رحمه الله تعالیٰ.

وفی الام (۱/۲۷۳): التکبیر فی الخطبة فی العیدین...... عن عبیدالله بن عبدالله بن عتبة قال السنة فی التکبیر یوم الاضحیٰ والفطر علی المنبر قبل الخطبة ان یبتدیء الامام قبل ان یخطب وهو قائم علی المنبر بتسع تکبیرات تتری لا یفصل بینها بکلام ثم یخطب ثم یجلس جلسة ثم یقوم فی الخطبة الثانیة فیتفتحها بسبع تکبیرات تتری لا یفصل بینها بکلام ثم یخطب الخ.

وفی المغنی (۲/۲۴۴): فان صفة الخطبتین کصفة خطبتی الجمعة الا انه یستفتح الاولی بتسع تکبیرات متوالیات والثانیة بسبع متوالیات قال القاضی وان ادخل بینهما تهلیلا او ذکرا فحسن الخ.

(۳۳۶) جمعہ کے دوخطبوں سے پہلے خطیب صاحب کے عربی اردو ملا خطبہ کے دوران نفل نماز پڑھنے کی ممانعت سے متعلق ایک دارالافتاء کی تحقیق اوراس پر استدراک

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسئلہ کی تحقیق کی درخواست ہے براہ کرم فقہاء احناف کی معتبر کتب سے اس کا مدلل جواب چاہیے۔

مسئلہ یہ ہے کہ نماز جمعہ کیلئے جامع مسجد کی پہلی اذان کے بعد خطیب صاحب خطبہ اور نماز جمعہ پڑھانے کی ہی نیت سے آتے ہیں لوگ بھی خطبہ سننے کی غرض سے مسجد میں جمع ہوتے ہیں، خطیب صاحب منبر پر تشریف لاتے ہیں تو سب سے پہلے عربی کلمات میں حمد وثنا شہادۃ توحید ورسالت صلاۃ وسلام علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام ودیگر تمام مسلمانوں کے لئے دعا اور موضوعِ خطاب سے متعلق قرآن کریم سے چند آیات کی تلاوت فرماتے ہیں اس کے بعد انہیں آیات سے متعلق تفسیر اور احادیث کی روشنی میں اردو میں خطاب کرتے ہیں، جیسا کہ ہندوپاک میں عام معمول ہے، پھر عربی میں بھی دو مستقل خطبے اذانِ ثانی کے بعد دیتے ہیں پھر نماز پڑھاتے ہیں۔

خطبہ کی شرائط سنن ومستحبات کا مختلف عربی فتاویٰ مثلاً شامیہ، البحرالرائق، طحطاوی علی مراقی الفلاح، بدائع الصنائع، خلاصۃ الفتاویٰ ہندیہ، محیط البرھانی، اوران کے علاوہ بھی کئی فتاویٰ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دوخطبوں سے پہلے یہ عربی اردو ملا خطبے کا بھی وہی حکم ہے جو عربی خطبہ کا ہے اس پر بھی خطبہ کی تعریف صادق آتی ہے، چنانچہ کوئی شخص صرف اسی پر اکتفاء کرلے تو شرط

کے درجہ میں نماز جمعہ کی صحت کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان وفرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت وعدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب وسنن ہیں جو اس کے مکملات میں سے ہیں'' (جواہر الفقہ ،ص:۳۴۹)

اگر چہ ترک سنت کی وجہ سے مکروہ ہوگا اور اس کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن کم از کم شرط کے درجہ میں خطبہ کا مقام اس کو بھی حاصل ہے لہٰذا اس دوران بھی نوافل پڑھنا منع ہے اور اس کی اجازت دینے میں شرائط وارکان کے وجود پر مشتمل عمل کے وجود کو تسلیم نہ کرنا لازم آتا ہے جو کہ فقہاء کرام کی تعریفات وتشریحات کے انکار کو مستلزم ہے۔

اس لئے کہ فقہاء کرام کی عبارات میں اتفاقی قیودات نہیں ہوتے، ان کی تعریفات جامع اور مانع ہوتی ہیں چنانچہ ان کی عبارات کا مفہوم مخالف بھی معتبر مانا جاتا ہے۔ ایسے ہی مسئلہ کے متعلق علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ''والالزم الحکم ببطلان الاولیٰ بترک ما لیس برکن ولا شرط کمامر عن الفتح. (شامی، ص ۱۵ ج ۲)''

ذیل میں فقہی عبارات سے حوالے ملاحظہ ہوں استشہاد صحیح ہو تو براہ کرم تائید فرمائیں اور اگر ہم نے صحیح نہ سمجھا ہو تو اصلاح فرمائیں نوازش ہوگی۔

خطبہ کی تعریف وحقیقت واضح کرتے ہوئے ''مراقی الفلاح'' اور اس کی شرح ''حاشیۃ الطحطاوی'' میں لکھتے ہیں:

(والرابع الخطبة ولو بالفارسيا من قادر على العربية ويشترط لصحة الخطبة فعلها قبلها......

وفي الطحطاوي على مراقي الفلاح (والرابع الخطبه فعلة بمعنى مفعولة فهي اسم لما يخطب به غاية من الخطب وهو في الاصل كلام بين اثنين قهستاني عن الا زاهر وهي بالضم في الموعظة الجمع خطب وبالكسر طلب التزوج　　(ص ۵۰۹، قديمي كتب خانه)

كذا في جامع الرموز للقهستاني (ص۲۶۴ ج ۱) وكذا في قواعد الفقه (ص ۲۷۶)

وفي المحيط البرهاني : ولان ما يشبه الامر بالمعروف خطبة من حيث المعنى وان لم يكن خطبة من حيث النظم لان الخطبة في الحقيقة وعظ وامر بالمعروف (المحيط البرهاني، ص ۴۵۹، ج ۲)

خطبہ کی شرائط نہایت جامع انداز میں ''مراقی الفلاح'' اور اس کی شرح حاشیۃ الطحطاوی میں بیان فرماتے ہیں:

فهذه خمس شروط اوست لصحة الخطبة فليتنبه، قال الطحطاوي (۱) الاول ان تكون قبل الصلاة (۲) والثاني ان تكون بقصد الخطبة (۳) الثالث ان تكون في الوقت (۴) والرابع ان يحضرها واحد (۵) الخامس ان يكون ذالك الواحد ممن تنعقد بهم الجمعة (۶) السادس عدم الفصل بين الخطبة والصلاة بقاطع. (مراقي الفلاح، ص ۵۱۰)

حضرت اقدس مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان وفرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت وعدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب وسنن ہیں۔ جو اس کے مکملات میں سے ہیں'' (جواہر الفقہ، ص:۳۴۹)

دوسری جگہ فرماتے ہیں ''فرض صرف دو ہیں (۱) وقت جمعہ (۲) مطلق ذکر اللہ خواہ کسی لفظ سے ہو پھر امام صاحب کے مذہب پر طویل ہو یا مختصر اور صاحبین کے مذہب پر ذکر طویل جس کو عرفاً خطبہ کہا جا سکے شرط ہے۔ کذا فی الهدایہ والفتح والبحر'' (جواہر الفقہ ص:۳۵۰)

اسی طرح ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ''اسی کے ساتھ ایک سولہویں سنت اور ہے.......... کہ خطبہ صرف عربی زبان میں ہو غیر عربی میں نہ ہو۔ (جواہر الفقہ ص ۳۵۰)

اردو کے مذکورہ بیان پر فقہاء کرام کی وضاحت کے مطابق پوری طرح خطبہ کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے کہ یہ ذکر تو ہے ہی جو کہ خطبہ کے لئے رکن ہے، اس کے علاوہ خطبہ کی تمام شرائط پر بھی مشتمل ہے اور یہ بھی واضح فرمادیا ہے کہ خطبہ کا عربی میں ہونا کوئی شرط نہیں ہے ہاں سنت موکدہ ہے تو وجوب استماع کے لئے معلوم نہیں کونسی چیز مانع ہے؟ جبکہ احتیاط کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جب مبیح اور محرم دونوں دلائل متوجہ ہوں تو محرم کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اور خطبہ کی سنن کو تفصیلاً شمار فرمایا:

(وسنن الخطبة ثمانية عشر شيئا بل يزاد عليها...... منها الطهارة...... والجلوس على المنبر قبل الشروع في الخطبة والاذان بين يديه كالاقامة ثم قيامه والسيف بيساره وبدونه في بلدة فتحت صلحا واستقبال القوم بوجهه وبدائته بحمد الله والثناء عليه بما هو اهله والشهادتان وصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم والعظة والتذكير وقراءة آية من القرآن والجلوس بين الخطبتين الخ (مراقي الفلاح، ص ۵۱۴، ج ۱) وكذا في جامع الرموز للقهستاني (ص ۲۶۹، ج ۱)

وكذا الفقه الاسلامي وادلته (ص ۱۳۱۱، ج ۲) كذا في خلاصة الفتاوىٰ (ص ۲۰۵، ج ۱)

● خطبہ کا بڑا مقصد یعنی وعظ وتعلیم تو اس خطاب سے حاصل ہو رہا ہے۔ كما في الدر (۱۷۵/۳): لان الخطبة شرعت للتعليم.

اور رکن وشرائط کے علاوہ کئی سنتوں پر بھی مشتمل ہے لیکن تمام تر سنتوں کا امتثال چونکہ عربی خطبہ میں ہی ہوتا ہے اور اس کی اپنی اہمیت ہے جیسا کہ حضرت مفتی اعظم پاکستان نے اپنے رسالہ میں واضح فرمادیا ہے، اس لئے عربی خطبے مستقل دیئے جاتے ہیں تاہم شرط کے درجہ میں اس سے خطبہ کی ضرورت بلاشبہ پوری ہوتی ہے، تو اس دوران نماز وتلاوت وغیرہ کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟ چنانچہ علامہ شامی

رحمہ اللہ ایک مسئلہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں۔

قال و الطهارة سنة عندنا لاشرط حتى ان الامام اذا خطب جنبا او محدثا فانه يعتبر شرطا لجواز الجمعة.

قال المحشي تحت هذا القول: قوله (فانه يعتبر شرطا اى مافعله الامام من الخطبة جنبا او محدثا يعتبر ويعتدبه من حيث كونه شرطا لصحة الجمعة بمعنى انه يجزى ويكفي وان كان مرتكبا لمحرم لو كان بلا عذر. (شامی، ص ۱۵۰، ج ۲)

ان تمام دلائل سے ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ خطاب بھی خطبہ کے حکم میں ہے اور اس دوران استماع کے خلاف کوئی بھی عمل جائز نہیں اگر چہ عربی خطبہ کی طرح تمام صفات پر مشتمل نہ ہونے کی وجہ سے بدرجہ اتم نہیں ہے لیکن خطبہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ کسی عمل کو فقہاء کرام کی تعریفات اور توضیحات پر ہی پرکھا جائے گا۔

عربی اور اس خطبہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ اس کے شروع کا حصہ تو عربی ہے لیکن بعد کا حصہ زیادہ اردو پر مشتمل ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ عربی خطبوں کے لیے اذانِ ثانی دی جاتی ہے، تیسرا یہ کہ یہ خطبہ عموماً خطیب بیٹھ کر دیتا ہے اور عربی خطبے کھڑے ہو کر، چوتھا یہ کہ عربی خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے خطیب بیٹھ کر دونوں خطبوں کے درمیان فصل دیتا ہے لیکن یہ تمام صفات ایسی نہیں ہیں کہ جن کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے یہ خطبہ ہی نہ رہے، بلاشبہ شرط کے درجہ میں یہ بھی خطبہ ہے اگر چہ ناقص ہے اور عربی کے دونوں خطبے بدرجہ اتم و اکمل ہیں اور اس کے لئے شواہد اور نظائر بھی ہیں طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ذکر کر دیتے، اور اذان ثانی کو قاطع بھی نہیں قرار دے سکتے۔

چنانچہ عمل قاطع کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

(وعمل قاطع) كما اذا جامع ثم اغتسل واما اذا لم يكن قاطعا كما اذا تذكر فائتة وهو في الجمعة فاشتغل بالقضاء او افسد الجمعة فاحتاج الى اعادتها او افتتح التطوع بعد الخطبة لاتبطل الخطبة بذالك لانه ليس بعمل قاطع لكن الاولى اعادتها كمافي البحر. (مراقی الفلاح، ص ۵۱۰ م قديمی) كذافي خلاصة الفتاوى (ص ۲۰۵، ج ۱)

بالفرض فقہاء کرام کی عبارات میں کوئی جزئیہ ملے جس سے یہ واضح ہو کہ اس کو خطبہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا حالانکہ کافی تلاش کے باوجود ہماری نظروں سے اب تک ایسا کوئی جزئیہ نہیں گزرا لیکن اصل موقف ''کہ اس خطاب کے دوران حاضرین کے لئے نوافل پڑھنا منع ہے'' کے ثبوت کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

''عن ابن عمر رضي الله عنه قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم اذا دخل احدكم المسجد والامام على المنبر فلا صلاة ولا كلام حتى يفرغ الامام. رواه الطبراني بحواله اعلاء السنن

وعن ابی هريرة رضی الله عنه خروج الامام يوم الجمعة يقطع الصلاة و كلامه يقطع الكلام (رواه البيهقی بحواله اعلاء السنن، ج ۲/ص ۱۷) بھی کافی ہے۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام کے نکلنے کے ساتھ ہی نماز، ذکر تلاوت وغیرہ کو منع فرماتے ہیں۔ اگر چہ منبر تک پہنچے نہیں ہیں اور خطبہ شروع نہیں کیا۔

کمافی مراقی الفلاح (واذا خرج الامام فلا صلاة ولا كلام) وهو قول الامام رحمه الله تعالیٰ لانه نص النبی صلی الله عليه وسلم (ص ۵۱۸)

اور صاحبین بھی نماز کو امام صاحب کے نکلنے کے ساتھ ہی منع فرماتے ہیں البتہ ذکر وتلاوت منبر پر تشریف لانے کے بعد منع فرماتے ہیں۔

وقال ابو يوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ لا باس بالكلام اذا خرج قبل ان يخطب واذا نزل قبل ان يكبر. واختلفا في جلوسه اذا سكت فعند ابی يوسف يباح وعند محمد لا يباح" مراقی الفلاح (ص ۵۱۸)

نماز کی ممانعت میں فقہاء کرام نے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دی ہے اور اس کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔

فی الدر المختار: اذا خرج الامام) من الحجرة ان كان والافقيامه للصعود شرح المجمع (فلا صلاة ولا كلام الی تمامها) وان كان فيها ذكر الظلمة فی الاصح

قال الشامی: واخرج ابن ابی شيبه فی مصنفه عن علی وابن عباس وابن عمر رضی الله عنهم كانوا يكرهون الصلاة والكلام بعد خروج الامام والحاصل ان قول الصحابی حجة يجب تقليده عندنا اذا لم ينفه شئ آخر من السنة. (درمختار، ج ۲/ص ۱۵۸)

قال الطحطاوی اذا خرج من حجرته ان كانت والافقيامه للصعود قاطع كمافی شرح المجمع فيثبت المنع بمجرد ظهوره ولو قبل صعوده المنبر وقيل اذا صعد وعليه جری الكمال والزيلعی والعينی وقال بعد اسطر اختلف المشائخ علی قول الامام فی الكلام قبل الخطبة ...... (مراقی ص ۵۱۹)

اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ امام صاحب خطبہ ہی کی غرض سے حجرہ سے نکل آئے ہیں اور اب منبر پر بھی تشریف فرما ہیں۔ لہٰذا تمام دلائل اس تائید میں ہیں کہ دوران اردو خطبہ نماز ذکر وتلاوت وغیرہ کو اب موخر کریں اور خطبہ کی طرف متوجہ ہوں نوافل اور تلاوت کے لئے پھر بھی موقع مل سکتا ہے اور یہ موقع خطبہ کے لیے ہے۔ نیز تمام فتاویٰ میں یہ حکم واضح فرمادیا ہے کہ وجوب استماع کا یہ حکم جمعہ اور عیدین کے خطبوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام خطبے سننا واجب ہے۔

(۱) چنانچہ مفتی اعظمؒ نے بھی جواہر الفقہ میں واضح فرمادیا ہے۔

خطبہ جمعہ وعیدین ونکاح وغیرہ اس بات میں قول مختار کے موافق سب شریک ہیں کہ جب خطیب خطبہ پڑھے تو کلام وسلام یہاں تک کہ ذکر وتسبیح وغیرہ سب ناجائز ہوجاتے ہیں بلکہ چپ بیٹھنا اور خطبہ سننا ضروری ہوجاتا ہے۔ (جواہر الفقہ ،ص ۳۶۵)

وفی مراقی الفلاح: کذا استماع سائر الخطب کخطبة النکاح والختم (مراقی الفلاح ص ۵۱۹)

وفی قواعد الفقه: والخطب کثیرة کخطبة الجمعة والعیدین والاستسقاء والکسوف والنکاح وختم القرآن وغیر ذالک ویجب فی الجمیع الاستماع کذا فی الدرر.(ص ۲۷۸) کذا فی ردالمحتار (ص ۱۵۹، ج ۲)

(۲) خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا فتویٰ ہے کہ ہر وعظ کے دوران انصات ضروری ہے۔

وفی التفسیر المظهری: قال عمر بن عبدالعزیز الانصات لقول کل واعظ (مظهری، ص ۴۵۰، ج ۳)

(۳) امام بخاریؒ اور اسی طرح دیگر محدثین نے اس موضوع پر مستقل ابواب قائم کئے ہیں۔

باب اصغاء الجلیس لحدیث جلیسه الذی لیس بحرام واستنصات العالم والواعظ حاضری مجلسه (دلیل الفالحین، ۳/۱۴۷)

(۴) علماء کرام کے بیان کے لئے انصات کا حکم ہے۔''لمافی البخاری: باب الانصات للعلماء (بخاری، ۱/۲۳)''

علامہ بدرالدین عینیؒ عمدۃ القاری میں علماء کے بیان کے لئے وجوب استماع وانصات کا حکم دے رہے ہیں۔

هذا باب فی بیان الانصات لاجل العلماء واللام فیه للتعلیل والانصات بکسر الهمزة السکوت والاستماع للحدیث یقال نصت نصتا وانصت انصاتا اذا سکت واستمع للحدیث وجه المناسبة بین البابین من حیث ان العلم انما یحفظ من العلماء ولا بدفیه من الانصات لکلام العالم حتی لا یشذ عنه شئ

وفیه ایضا: بیان استنباط الاحکام. الاول قال ابن بطالؒ فیه ان الانصات للعلماء والتوقیر لهم لازم للمتعلمین قال الله تعالیٰ لا ترفعوا اصواتکم الخ.

ویجب الانصات عند قراة حدیث رسول الله (صلی الله علیه وسلم) مثل ما یجب له وکذالک یجب الانصات للعلماء لانهم الذین یحیون سنته ویقیمون بشریعته...... الخ

(عمدة القاری، ۳/۳۷۰)

(۵) کسی بھی بیان کرنے والے کے سامنے نماز پڑھنا اس کے لئے تشویش کا باعث ہے بلکہ قریب میں سننے والے بھی متاثر ہوتے ہیں ایسی صورت میں ایذاء مسلم میں بھی داخل ہے۔

(۶) ایک اصلاحی اجتماعی عمل سے بلاضرورت اعراض بلکہ ظاہری مخالفت ہے۔اور اجتماعیت کی اہمیت شاید کسی عالم پر مخفی ہو۔

چند شبہات اور ان کے جوابات:۔

شبہ(۱):۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن بسر رضی اللہ عنہ جمعہ کے روز منبر کے ساتھ کھڑے ہوکر احادیث بیان فرماتے تھے۔

لمافی المستدرک علی الصحیحین عن محمد عن ابیه قال رأیت اباهریرة رضی الله عنه یخرج یوم الجمعة فیقبض علی رمانتی المنبر قائما ویقول حدثنا ابو القاسم رسول الله صلی الله علیه وسلم الصادق المصدوق فلا یزال یحدث حتی اذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الامام لصلاة جلس (ص ۵۸۶، ج۳)

وفیه ایضا: عن ابی الزاهریة قال کنت جالسا مع عبدالله بن بسر یوم الجمعة فمازال یحدثنا حتی خرج الامام (ص ۴۲۵، ج ۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل خطبہ سے پہلے احادیث بیان کرنا کوئی خطبہ نہیں ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ ابن بسر رضی اللہ عنہ خطیب کے نکلنے سے پہلے تک احادیث بیان فرماتے تھے البتہ خطیب کے نکلنے کے ساتھ ہی درس ختم کرتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔

جواب:۔ مذکورہ دونوں حوالوں میں اس موقف کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ اس سے مزید تائید مل رہی ہے چنانچہ صراحت ہے کہ خطیب کے نکلتے ہی درس کو ختم فرمادیتے تھے،اس میں اصل موقف کے خلاف کونسی بات ہے کہ اس دوران نماز پڑھنا جائز ہے یا یہ کہ دو خطبوں سے پہلے خود خطیب صاحب اگر وعظ کریں تو وہ خطبہ نہیں کہلائے گا؟ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام صاحب سے پہلے بھی کوئی دوسرا شخص درس یا وعظ کرے تو یہ جائز ہے۔

شبہ(۲):۔عربی خطبہ کے لئے اذان دی جاتی ہے اور یہ عربی اردو ملا خطبہ اذان اوّل کے بعد شروع ہوتا ہے اگر اس کو خطبہ کا حکم دیں تو خطبوں کے درمیان اذان دینا لازم آتا ہے۔

جواب:۔اذان ثانی کوئی شرط نہیں ہے جس کے انتفاء سے حکم بھی منتفی ہو اور خطبہ کے بعد یا درمیان میں دینے سے یہ کوئی عمل قاطع بھی نہیں ہے جیسا کہ حوالوں سے واضح ہے۔

شبہ(۳):۔اس طرح تو تین خطبے ہوجائیں گے؟

جواب:۔ دو خطبے سنت ہیں ایک سے بھی شرط کے درجہ میں ضرورت پوری ہوجاتی ہے لیکن دو سے زیادہ خطبے دینے سے یہ تو

لازم نہیں آتا کہ خطبہ قرار نہ دیں۔ اور معذرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ علماء کرام صرف دو خطبوں پر ہی اکتفاء کرتے اگر پاک و ہند کے عوام کی ضرورت سامنے نہ ہوتی۔ تو یہ ضرورت کی وجہ سے رائج ہوا ہے۔

شبہ(۴):۔ درمختار میں ہے ''فی المسجد عظة وقرآن فاستماع العظة اولیٰ. ص ۶۶۳، ج ۱''
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعظ کا سننا اولیٰ ہے، جس کے خلاف کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

جواب شبہ:۔ حوالہ میں استماع قرآن کو بمقابلہ وعظ غیر اولیٰ قرار دیا ہے اور استماع وعظ کو اولیٰ قرار دیا ہے جبکہ استماع قرآن خارج نماز بھی مطلقاً واجب ہے۔

فی الدر (فروع) یجب الاستماع للقراءة مطلقا لان العبرة لعموم اللفظ.

وفی الشامية قوله يجب الاستماع للقراءة مطلقا ای فی الصلاة وخارجها لان الآية وان كانت واردة فی الصلاة علی مامر فالعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب وفی الفتح عن الخلاصة رجل يكتب الفقه وبجنبه رجل يقرء القرآن فلا يمكنه استماع القرآن فالاثم على القاری (ص ۵۴۶، ج ۱)

وکذا فی الطحطاوی علی الدر (ص ۲۴۷، ج ۱)

وفی روح المعانی: وفی كلام اصحابنا يدل على وجوب الاستماع فی الجهر بالقرآن مطلقا الخ (ص ۲۰۳، ج ۹)

تو اولیٰ یعنی وعظ کا استماع حاضرین مجلس پر بطریقہ اولیٰ واجب ہے۔ آسانی کے لئے ہم شکل اوّل جو کہ بدیہی النتیجہ ہے کو ترتیب دیتے ہیں۔

شکل اوّل:۔ استماع الوعظ اولیٰ من استماع التلاوة. واستماع التلاوة واجب فاستماع الوعظ واجب.

(۱) مقدمہ اولیٰ مسلمہ (جیسا کہ شبہ میں پیش کردہ حوالہ سے واضح ہے)

(۲) مقدمہ ثانیہ: شامی اور روح المعانی وغیرہ کے حوالہ سے واضح ہے۔

وجہ استدلال یا تلازم: مقدمہ مسلمہ عندالمعقولین: ما ثبت لادنی فهو ثابت لاعلیٰ طبعا بالضرورة.

بدقسمتی سے عام لوگ اپنی مذہبی زبان ''عربی'' کچھ نہیں جانتے اور خطبہ جس کا بڑا مقصد وعظ ونصیحت اور تعلیم ہے اگر صرف عربی خطبہ ہی رہے تو لوگ اس فائدہ سے محروم رہتے ہیں اسی ضرورت کے تحت تو یہ اردو بیان رائج ہوا ہے ورنہ عربی جیسے جامع خطبوں سے پورا استفادہ کرنے کی صورت میں اردو خطبوں کی کیا ضرورت تھی؟ تو عربی خطبے بدرجہ اتم خطبے ہیں اور اردو خطبہ کو بھی خطبہ کا مقام حاصل ہے ورنہ فقہاء کرام کی تصریحات وتشریحات سے انکار لازم آتا ہے۔

خلاصہ کلام

خطبہ جمعہ سے پہلے اردو وعظ کے دوران بھی نوافل پڑھنا منع ہے، بلکہ کوئی بھی مجلس وعظ ہو تو اس مجلس میں ہوتے ہوئے استماع کے خلاف کوئی عمل کرنا جائز نہیں ہے، ضرورت ہو تو اس مجلس سے نکلنا ضروری ہے۔

(۱) جمعہ کا یہ وعظ خطبہ کے حکم میں ہے اس لئے کہ یہ خطبہ کے تمام فرائض اور بعض سنتوں پر بھی مشتمل ہے۔

(۲) چونکہ امام صاحب منبر پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور خطبہ و نماز ہی کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں تو نفلی نماز و تلاوت وغیرہ کی اجازت دینے میں حدیث باب کے ظاہر کی مخالفت ہے۔

(۳) ہر خطبہ کے دوران نفل کا پڑھنا منع ہے جمعہ کے لئے یہ وعظ بھی ایک خطبہ ہے۔

(۴) اس وعظ کا شروع حصہ عربی میں مسنون کلمات کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

(۵) خطبہ جمعہ کے لئے وجوب استماع وانصات کا حکم معلول بالعلۃ ہے یہ علت ہر وعظ میں پائی جاتی ہے۔

(۶) درمختار میں ہے "فی المسجد عظة وقرآن فاستماع العظة اولیٰ. (ص ۶۶۳، ج ۱) "مفتی بہ قول کے مطابق وجوب استماع قرآن کا حکم مطلقاً واجب ہے، یعنی نماز کے علاوہ بھی واجب ہے خصوصاً کوئی قاری پہلے سے پڑھ رہا ہے تو اس کے پاس جا کر خلاف استماع کوئی کام کرنا جائز نہیں ہے ملاحظہ ہو (حوالہ مذکورہ) تو وعظ جو کہ اولیٰ ہے اس مجلس میں شریک افراد کے لئے خلاف استماع عمل کرنا بطریقہ اولیٰ ناجائز ہے۔

(۷) شرح بخاری عمدۃ القاری میں ایک حدیث سے استنباط فرماتے ہوئے فیصلہ فرمادیا ہے کہ ہر عالم کی مجلس میں انصات کا حکم ہے۔

(۸) ریاض الصالحین میں ہے "باب اصغاء الجليس لحديث جليسه الذي ليس بحرام واستنصات العالم والواعظ حاضري مجلسه (دليل الفالحين، ص ۱۴۷، ج ۳)"

تو ایک عام آدمی کی ایک عام بات کی طرف توجہ کرنے کا حکم ہے بالفرض اگر استحباب کے درجہ میں ہے تو دین کی بات (خصوصاً جب اجتماعی ہو) کو عام دنیوی بات پر بلاشبہ فوقیت عظمت اور اہمیت حاصل ہے تو اس کیلئے حکم بھی استحباب سے بڑھ کر ہی ہوگا جس کے خلاف کرنے میں کم از کم کراہت ضروری ہوگی۔

(۹) مجلس میں ہوتے ہوئے خلاف استماع کام کرنے میں واعظ کو اور دیگر مجلس والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اس لئے اذیت مسلم میں بھی داخل ہے۔

(۱۰) اجتماعی بات سے اعراض بلکہ مخالفت ظاہر ہے اور اجتماعیت کے خلاف کرنا "من شذ شذ" کے مصداق بننے کا اندیشہ ہے۔

تلک عشرۃ کاملۃ

علماء کرام سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت سامنے رکھتے ہوئے اپنی تحقیق سے فیض یاب فرمائیں۔

مذکورہ استفتاء پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا جواب

الجواب حامداً ومصلیاً......

مکرمی ومحترمی جناب حضرت مولانا مفتی......صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دوسرا تفصیلی مراسلہ نظر نواز ہوا مراسلہ کے بابت ہم نے اپنے مؤقف کی وضاحت اجمالاً کردی تھی اب قدرے تفصیل سے خدمت عالیہ میں عرض کرتے ہیں۔ ابتداء میں چند گزارشات بطور تمہید زیب قرطاس ہیں۔

تمہید(۱):......صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت شرط ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(صــ ۵۱۰): والثانی ان تکون بقصد الخطبة.

وفی البناية(۲/۸۰۶): ثم اشترط عند ابی حنیفة ان یکون قوله الحمد للّٰه علی قصد الخطبة حتی لو قال یرید الحمدللّٰه علی اعطاء لا ینوب عن الخطبة وقیل ینوب، والاوّل اصح.

وفی فتاویٰ الهندية (۱/۱۴۶): ومنها الخطبة...... وکفت تحمیدة او تهلیلة هذا اذا کان علی قصد الخطبة.

وفی فتاویٰ الشامية (۲/۱۴۸): (بنیتها) ای نیة الخطب.

تمہید(۲):......عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینے سے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک خطبہ ادا ہی نہیں ہوتا امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اگرچہ جواز کے قائل ہیں لیکن بعض حضرات نے امام صاحب کا صاحبین کی طرف اس مسئلہ میں رجوع ثابت کیا ہے اگر رجوع ثابت نہ بھی ہو تب بھی عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینا مکروہ تحریمی اور بدعت ہے۔

لمافی عمدة الرعاية (صــ ۲۰۰): فانه لا شک فی ان الخطبة بغیر العربية خلاف السنة المتوارثة من النبی ﷺ والصحابة فیکون مکروها تحریماً.

وفی البناية (۱/۱۹۵): ویروی رجوعه فی اصل المسئلة (یعنی القراءة الفارسية) إلی قولهما وعلیه الاعتماد لتنزله منزلة الاجماع .... والخطبة یوم الجمعة والتشهد علی هذا الاختلاف.

وفی جواهر الفقه (۱/۳۵۵): وعلی هذا الخلاف الخطبة وجمیع الاذکار

یعنی خطبہ اور تمام اذکار واوراد میں بھی یہی اختلاف ہے کہ امام صاحب غیر عربی میں جائز فرماتے ہیں اور صاحبین ناجائز، (لیکن امام صاحب سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع منقول ہے۔)

تمہید(۳):......خروج امام مانع صلوٰۃ وکلام اس وقت ہے کہ جب یہ خروج بنیت خطبہ ہو۔

لمافی العناية بهامش فتح القدير(۲/۶۷): واذا خرج الامام يوم الجمعة يعنى لأجل الخطبة.

وفي البحر الرائق(۲/۱۷۱): وفي شرح المجمع عبارة الخروج واردة على عادة العرب من انهم يتخذون لامام مكانا خالياً تعظيماً لشانه فيخرج منه حين اراد الصعود.هكذا شاهدناه في ديارهم والقاطع في ديارنا يكون قيام الامام للصعود فالحاصل ان الامام ان كان في خلوة فالقاطع انفصاله عنها وظهوره للناس والافقيامه للصعود.

وفي البناية (۱/۸۵۳): ولا اذا خرج الامام من بيت الخطابة يوم الجمعة لأجل الخطبة.

وفي نهر الفائق(۱/۳۶۳): و(اذا خرج الامام) اى صعد على المنبر كذا في معراج......... والقاطع في ديارنا هو قيام الامام للصعود.

مذکورہ بالاتمہیدات کی روشنی میں اردو ملے خطبہ پر عربی خطبہ کے احکام لاگونہیں ہوں گے کیونکہ صحت خطبہ کیلئے قصداورنیت شرط ہے جیسا کہ تمہید(۱) کےحوالوں سے واضح ہے جبکہ وعظ ونصیحت سے قبل تحمید وتسبیح بنیت خطبہ نہیں ہوتی بلکہ اتباع حدیث کل امر ذی بال الخ اور تعامل وتوارث کی بناء پر پڑھی جاتی ہے۔نیز سابقہ تحریر کے شبہ اوّل کے جواب میں درج عبارت ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ جمعہ کی نیت سے یہ خطبہ نہیں دیتے تھے جوکہ خطبہ کیلئے شرط ہے'' بھی صحت خطبہ کیلئے قصداورنیت پر دال ہے۔نیز اشتراط نیت للخطبہ میں خطیب اورغیرخطیب کاحکم یکساں ہے۔دونوں میں اس بابت فرق کرنامحتاج دلیل ہے۔جس پر ہم مطلع نہ ہوئے۔

نیزخروج امام مانع صلوٰۃ واذکاراس وقت ہوگا جب یہ خروج بنیت خطبہ منبرومحراب کی آغوش میں امام کی عظمت الشان ومرتبت کیلئے واقع مقصورۃ (حجرہ) سے ہوجیسا کہ عرب میں دستورتھا۔

لمافي سير اعلام النبلاء(۲۰۰/۴): عاصم بن محمد عن ابيه: رأيت ابا هريرة يخرج يوم الجمعة، فيقبض على رُمّانتي المنبر قائماً، ويقول: حدثنا ابو القاسم ﷺ الصادق المصدوق: فلا يزال يحدث حتى يسمع فتح باب المقصورة لخروج الإمامة فيجلس.

جبکہ ہمارے دیارمیں خروج امام مانع صلوٰۃ واذکاراس وقت ہوگا جب امام صاحب خطبہ کیلئے منبر پر جلوہ افروز ہوجائے۔کیونکہ ہماری مساجد میں مقصورہ ندارد۔

لمافي البحر الرائق(۱۵۵/۲): وفي شرح المجمع عبارة الخروج واردةً على عادة العرب من انهم يتخذون لإمام مكاناً خالياً تعظيماً لشانه فيخرج منه حين اراد الصعود هكذا شاهدناه في ديارهم والقاطع في ديارنا يكون قيام الإمام للصعود فالحاصل ان الامام ان كان في خلوة فالقاطع انفصاله عنها وظهوره للناس والا فقيامه للصعود.

وفیه ایضاً(۲/۲۷۰): فان لم یکن فی المسجد مقصورة یخرج منها لم یترکوا القراء ة والذکر الا اذا قام الامام إلی الخطبة.

وفی البنایة علی شرح الهدایة (۱/۸۵۳): ولا اذا خرج الامام من بیت الخطابة یوم الجمعة لاجل الخطبة.

وفی النهر الفائق(۱/۳۶۳): واذا خرج الامام: ای صعد علی المنبر.......... والقاطع فی دیارنا هو قیام الامام للصعود.

بالفرض اگر کہیں خروج امام مقصورہ (حجرہ) سے ہو تب بھی زیر بحث مسئلہ میں یہ خروج مانع صلوٰۃ واذکار نہیں ہوگا کیونکہ خروج امام من المقصورۃ پر ''فلا صلوٰۃ ولا کلام'' کا حکم اس وقت لاگو ہوگا جب یہ خروج بنیت خطبہ ہو کمافی البنایة(۱/۸۵۳) جبکہ زیر نظر مسئلہ میں خروج للوعظ ہوتا ہے۔

ولا اذا خرج الامام من بیت الخطابة یوم الجمعة لاجل الخطبة.

نیز اس خروج کو تشریک نیت پر محمول کرنا بایں معنی کہ یہ خروج للوعظ والخطبۃ دونوں ہو درست نہیں کیونکہ قصد اوّل کا اعتبار ہوتا ہے جبکہ خطیب صاحب کا قصد اوّل بالخروج وعظ کرنا ہوتا ہے۔

کتاب الفتاویٰ (۳/۴۷): یوں تو منبر پر اردو میں بیان وتقریر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے...... تاہم جمعہ میں چونکہ منبر پر کھڑے ہو کر اردو بیان میں اس کے خطبہ ہونے کا وہم ہو سکتا ہے حالانکہ خطیب کا مقصد اس سے خطبہ دینا نہیں ہے۔ انتھی

نیز اگر مطلقاً خروج مانع گفت وشنید اذکار وصلوٰۃ ہو تو سوال ہوگا کہ اردو تقریر کے بعد عربی خطبہ سے قبل چار رکعت سنتیں پڑھنا جبکہ امام تشریف لا چکا ہو جائز ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ اکابرین واسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے عمل سے متصادم ہے اگر جواب اثبات میں ہے تو کس دلیل کی بنیاد پر جبکہ امام مصلّی پر براجمان ہے۔

معلوم ہوا مطلقاً خروج امام مانع صلوٰۃ واذکار نہیں۔

یہ مسئلہ چونکہ اچھنبا اور نیا نہیں بلکہ ہمارے اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی حیات مبارکہ میں بھی پیش آیا تھا الحمدللہ اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی نوک قلم سے نکلی ہوئی تحقیقات وتدقیقات بھی اس مسئلہ میں موجود ہیں۔ ذیل میں چند ایک ملاحظہ ہو۔

اردو ملے خطبہ کے وعظ ہونے پر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا تفصیلی اور تحقیقی فتویٰ۔

سوال:...... ایک مسجد کا خطیب بعد اذان اوّل جبکہ کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں مسجد سے ملے ہوئے مکان سے مسجد میں آتا ہے سلام کر کے لکڑی کے منبر کے پاس کھڑے ہو کر خطبہ ووعظ یعنی ''الحمدللہ نحمدہ الخ'' کے بعد کوئی ایک یا چند آیات تلاوت کر کے اردو میں وعظ کرتا ہے یوں پون گھنٹہ یا کم بیش وعظ کے بعد چار سنت ادا کرتا ہے اور دیگر مردم کچھ تو اذان اوّل کے بعد وعظ سے پہلے فارغ ہو لیتے ہیں کوئی درمیان وعظ ہی میں پڑھ لیتا ہے باقی وعظ کے بعد پڑھ لیتے ہیں۔ خطیب سنت ادا کرنے کے بعد منبر پر بیٹھتا ہے اس کے سامنے اذان

ثانی ہوتی ہے پھر خطبہ مسنونہ پڑھ کرنماز پڑھاتا ہے اس صورت مذکورہ کوایک مولوی صاحب خلاف سنت بتاتے ہیں اور تین خطبوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

الجواب:...... یہ صورت جائز ہے اور تین خطبے نہیں ہوئے بلکہ اذانِ ثانی کے بعد جو خطبے وہ پڑھتا ہے وہی مسنون خطبے جمعہ کے ہو جاتے ہیں اور پہلا وعظ وعظ ہی ہوگا خطبہ میں شامل نہیں ہوگا۔

حضرت کا مذکورہ فتویٰ اردو والے خطبے کے وعظ ہونے میں بے غبار ہے۔

حضرت کا اس کو وعظ فرمانا جبکہ مرسلہ تحریر کے مطابق ''خطبہ کے ہمہ شرائط وارکان موجود ہیں'' سوائے اس کے کہ اس میں شرط خطبہ ''خطبہ بنیت خطبہ'' نہیں پائی جاتی اور کیا تبصرہ ہو سکتا ہے۔

اردو والے خطبے کے دوران سنتیں پڑھنے کے جواز پر کتاب الفتاویٰ (۳/۴۶) ملاحظہ ہو۔

اصل وہ دونوں خطبے ہیں جو عربی زبان میں دیئے جاتے ہیں اس سے پہلے اگر خطیب اردو زبان میں اپنے اس خطبہ کا خلاصہ لوگوں کو سنائے اور بتائے تو یہ خطبہ کے حکم میں نہیں اس دوران سنت ادا کی جاسکتی ہے۔

البتہ مرسلہ تحریر میں درج جواہر الفقہ کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ فقط ذکر سے عبارت ہے قصد اور نیت شرط نہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ نے جواہر الفقہ میں صرف خطبہ کے ارکان وفرائض وآداب کا تذکرہ فرمایا ہے شرائط خطبہ سے تعرض نہیں فرمایا۔

جواہر الفقہ کی عبارت ملاحظہ ہو (۳/۳۴۹):

فرض صرف دو ہیں: (۱) وقت جمعہ، (۲) مطلق ذکر اللہ خواہ کسی لفظ سے ہو انتھی، جبکہ تمام متداول ومعتمد کتب میں خطبہ کیلئے قصد کو ضروری قرار دیا ہے۔

كمافي مراقي الفلاح (صـ ۵۱۰): والثاني ان تكون بقصد الخطبة.

وفي فتاویٰ الشامية (۲/۱۴۸): وكفت تحميدة او تهليلة...... بنيتها.

قوله كفت تحميدة. شروع في ركن الخطبة بعد بيان شروطها قوله بنيتها اي نيّة الخطب.

مندرجہ بالا عبارت میں رکن خطبہ کے ساتھ اشتراط نیت کی صراحت بھی ہے۔

وفي كتاب الفقه على المذاهب الاربعة (۱/۳۹۱): ثانيها: نية الخطبة فلو خطب بغير النية لم يعتد بخطبة عند الحنفية.

البتہ خانیہ میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے اگر چہ ایک روایت عدم قصد کی ہے۔

لمافي فتاویٰ خانية (۴/۳۴۳): ولو عطس فقال الحمد لله يريد به التحميد على العطاس فذبح لا يحل بخلاف الخطبة اذا عطس على المنبر فقال الحمدلله فانه يجوز به الجمعة في

احد الروايتين. عن ابي حنيفة لان المامور به في الجمعة ذكر الله مطلقاً وههنا الشرط ذكر الله على الذبح.

لیکن بنایة میں اشتراط نیت کواصح قرار دیا ہے۔

لمافي البناية(۱/۸۰۶): ثم اشترط عند ابي حنيفة ان يكون قوله الحمدلله على قصد الخطبة حتى لو قال يريد الحمدلله على اعطاء لا ينوب عن الخطبة وقيل ينوب، والاوّل اصح.

نیز حموی علی الاشباہ والنظائر (۱/۵۷) پر اشتراط قصد کو مذہب ثابت کیا ہے۔

اما النية في الخطبة للجمعة فشرط لصحتها. لم تصح قيل هذا هو المذهب...... وفي رواية يجزئه ذالک لكن المذهب ماتقدم.

لمافي فتاویٰ الهندية (۱/۱۴۶): ومنها الخطبة...... وكفت تحميدة او تهليلة. هذا اذا كان على قصد الخطبة.

البتہ یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ کیلئے شرط ہے۔ جبکہ شرائط میں قطع نظر اشتراط نیت وغیرہ سے محض وجود کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

كمافي الحموی علی الاشباه والنظائر (۱/۶۸): امّا اذا كان شرطا لحكم لا تشترط النية في هذا الشرط لان الشرط يراعى وجوده مطلقاً لا وجوده قصداً.

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطبہ محض شرط ہی نہیں بلکہ اس میں رکنیت کا بھی ادنیٰ شائبہ موجود ہے۔

لمافي البناية(۱/۸۰۰): وعن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال قصرت الصلوة لأجل الخطبة وعن عائشة مثله وعن سعيد بن جبير قال كانت الجمعة اربعاً فجعلت الخطبة، فكان ركعتين.

نیز خطبہ نری شرط ہی نہیں بلکہ مشروط بھی ہے کیونکہ سعی کا حکم خطبہ کیلئے ہے۔

بالفرض اگر تسلیم کرلیا جائے کہ خطیب ابتداء وعظ میں تحمید وتسبیح بنیت خطبہ پڑھتا ہے تب بھی اس اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ بدعت ہے اور ترک بدعت واجب ہے چہ جائیکہ اس کا استماع لازم ہو اور اس دوران صلوٰة، نوافل واذکار حرام ہوں۔

لمافي امداد المفتين(۱/۳۸۵): فالحاصل ان اختصاص اللغة العربيّة في الخطبة وان كان في الاصل من السنن إلا انه لحق بتركه امور آخر من ابتداع بدعة واثم الادمان على ترك السنة وترک البدعة واجب: فجاء الوجوب من هذا القبيل لا بمحض المواظبة عليه وبالجملة فالحكم بوجوب العربيّة واثم تاركها في خطبة الجمعة. وان ترجمتها بغير العربيّة بدعة حق لاريب فيه.

وفیہ (۱/۳۸۴): والحاصل ان اللغة العربيّة في الخطبة سنة مؤكدة عندنا ولكن ترك العربيّة وجعلها بالعجميّة مكروه تحريماً وتاركها آثم ولا سيما المدمن عليه.

یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ خالص اردو خطبہ کو بدعت فرمار ہے ہیں جبکہ ہمارا کلام اردو ملے خطبہ کے بارے میں ہے۔ کیونکہ حضرت کے نزدیک خالص اردو خطبہ اور اردو ملا خطبہ بدعت ہونے میں یکساں ہے۔

لمافی امداد المفتین (۱/۳۸۵):

سوال نمبر (۶۴):...... جمعہ کے خطبہ کے ساتھ اردو نظم یا نثر میں اس کا مطلب بیان کیا جاتا ہے۔ آیا اس طرح پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:...... جمعہ کے خطبہ کے ساتھ اردو میں ترجمہ خواہ نثر سے ہو یا نظم سے بدعت ہے اور ناجائز ہے۔ قرون مشہود لها بالخیر میں باوجود ضرورت اور قدرت اس کی کوئی نظیر نہیں۔ نیز مرسلہ تحریر میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ خطبہ کا عربی میں ہونا کوئی شرط نہیں جبکہ یہ موقف فتاویٰ اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ سے میل نہیں کھا رہا۔ کیونکہ حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواہر الفقہ میں خطبہ کیلئے عربی کو شرط گردانا ہے۔

جواهر الفقه (۱/۳۵۵): وقال النووي: في كتاب الاذكار حمد الله تعالىٰ ويشترط كونها خطبة الجمعة وغيرها بالعربيّة.

نیز جواہر الفقہ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینا کالعدم قرار دیا ہے۔ کیونکہ امام صاحب اگرچہ جواز کے قائل تھے لیکن ان کا صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع منقول ہے۔

جواهر الفقه (۱/۳۵۵): وعلى هذا الخلاف الخطبة وجميع الاذكار......

یعنی خطبہ اور تمام اذکار واوراد میں بھی یہی اختلاف ہے کہ امام صاحب غیر عربی میں جائز فرماتے ہیں اور صاحبین ناجائز (لیکن امام صاحب سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع منقول ہے)۔ انتهی کلامہ

اب نہ معلوم غیر خطبہ (جب خالص اردو میں) ہو یا خطبہ مبتدعہ (اردو ملا خطبہ) بنیت خطبہ کا استماع کیوں لازم ہے اور اس دوران نوافل کی ممانعت کس بناء پر ہے جبکہ اردو ملا خطبہ بنیت خطبہ بدعت ہے اور ترک بدعت واجب ہے۔

مرسلہ تحریر میں خطبہ کا بڑا مقصد وعظ وتعلیم مرقوم ہے جبکہ اکابرین کی تصریحات اس کے خلاف ہیں۔

لمافی جواہر الفقہ (۱/۳۵۵): یہاں تک کل تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ خطبہ جمعہ کا اصلی رکن اور مقصد صرف ذکر اللہ ہے۔ تبلیغ یا وعظ وتذکیر اس کے فرائض میں داخل نہیں حضرت چند سطر بعد رقم طراز ہیں۔ اگر خطبہ کا مقصد ذکر محض نہ تھا بلکہ وعظ وتبلیغ مقصود تھی تو وقت ظہر کی کیا تخصیص ہے۔

نیز فرماتے ہیں: اگر خطبہ پڑھنے کے بعد امام کسی کام میں مشغول ہو گیا اور نماز میں کوئی معتد بہ فصل ہو گیا تو قول مختار کے موافق خطبہ کا اعادہ ضروری ہے۔ اگرچہ سننے والے دوبارہ بھی وہی لوگ ہوں گے جو پہلے سن چکے ہیں......

اگر وعظ و پند ہی خطبہ کا مقصد ہوتا تو اس اعادہ سے کیا فائدہ متصور ہے انتھی کلامہ۔

نیز اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کرنے کی صورت میں دو بدعتوں میں سے ایک کا ارتکاب لازم آئے گا کیونکہ اگر اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کیا جائے تو باقی دو خطبے نفل ہوں گے جبکہ جمعہ میں خطبہ نفلا مشروع نہیں۔

لمافی الاشباہ مع الحموی (۱/۱۳۵): وکذا الخطبة.......... ان شرطنا لها النيّة لانها لا يتنفل بها.

اگر باقی دو خطبے نہ پڑھے جائیں تو اس صورت میں بھی ارتکاب بدعت سے خالی نہیں کیونکہ اردو ملا خطبہ بتصریحات اکابرین خطبہ مبتدعہ ہے۔ جبکہ ترک بدعت واجب ہے۔

علاوہ ازیں تینوں خطبوں کو ماننے کی صورت میں ایک تیسرا خلاف سنت امر ''تطویل خطبہ'' کا ارتکاب لازم آئے گا جو کہ بنص حدیث ممنوع ہے۔ چنانچہ جواہر الفقہ (۱/۳۵۹) میں مذکور ہے کہ مؤطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرن صحابہ کے خصوصی فضائل میں اختصار خطبہ کو اور آخر امت کے فتن و مفاسد میں تطویل خطبہ کو شمار فرماتے ہیں۔

چونکہ مرسلہ تحریر کا نچوڑ اور لب لباب امرین کا اثبات ہے۔

(۱)۔ اردو ملا خطبہ بھی عربی خطبہ کے حکم میں ہے۔

(۲)۔ ہر وعظ کا سننا واجب ہے۔

لہٰذا مرسلہ تحقیق کی ہر شق اور عبارت پر کلام کرنا مفید نہیں انہی دو دعووں کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

اب تک پہلے دعویٰ پر کلام تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ اردو ملے خطبہ پر عربی خطبہ کے احکام لاگو نہیں ہوں گے۔

اوّلاً تو اس میں خطبہ کی اہم شرط خطبہ بنیت خطبہ نہیں پائی جاتی۔

ثانیاً اگر خطبہ مان بھی لیا جائے تو بتصریحات اکابرین یہ بدعت ہے۔ جس کا ترک واجب ہے۔

اب ہم دوسرے دعوے (ہر وعظ کا سننا واجب ہے) کے بابت اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہیں...... ہمارے نزدیک ہر وعظ کا سننا واجب نہیں اگرچہ سننا اولیٰ اور بہتر ہے جیسا کہ تمہید نمبر (۵) میں تفصیل مذکور ہے۔ لیکن خطبہ کی طرح اس خطاب کے دوران صلوٰۃ واذکار حرام نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اس کیلئے محرم نص درکار ہے جو ہماری دانست میں دریں باب ندارد۔ درمختار کی عبارت فی المسجد عظة الخ سے اپنے مدعیٰ کے اثبات کیلئے ترتیب شدہ شکل اوّل میں ہمیں کبریٰ تسلیم نہیں۔ کیونکہ عالمگیری میں اس عبارت سے قبل یہ جزئیہ مذکور ہے۔

لمافی فتاویٰ الهندية (۵/۳۱۸): يكرر من الفقه و غيره يقرأ القرآن لا يلزمه الاستماع.

اس سے معلوم ہوا کہ استماع التلاوۃ واجب علی الاطلاق نہیں۔

نیز شامی میں استماع العظۃ اولیٰ کا حکم قاری کے علاوہ دوسرے سامع کیلئے ہے جبکہ خود قاری کیلئے کیا حکم ہے؟

فتاویٰ شامی ملاحظہ ہو۔(۱/۶۶۳)

قوله: فاستماع العظة اولیٰ، الظاهر ان هذا خاص بمن لا قدرة له علی فهم الآيات القرآنية والتدبر فی معانيها الشرعية والاتعاظ بمواعظها الحكمية اذ لا شک ان من له قدرة علی ذالک يكون استماعه اولیٰ بل اوجب. بخلاف الجاهل فانه يفهم من المعلم والواعظ مالا يفهمه من القاری فكان ذالک انفع له.

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سامع عالم ذی فہم معانی قرآن سے واقف ہوتو اس کیلئے استماع قرآن اولیٰ بلکہ واجب ہے اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب تلاوت جاری ہو جبکہ مرسلہ تحریر میں پیش کردہ دعویٰ دوران وعظ مطلقاً نوافل، تلاوت وغیرہ کی ممانعت کا ہے۔

نیز بحرالرائق (۲/۵۵) پر ہے:

ولهذا نقل الشارح عن الصحابة رضی الله تعالیٰ عنهم ان بعضهم كانوا يقرؤون القرآن وبعضهم يتذاكرون العلم والمواعظ وبعضهم يصلون ولم ينههم النبی ﷺ عن ذالک ولو كان مكروهاً لنهاهم.

مذکورہ بالا عبارت سے صاحب بحر نے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی نمازی سامنے بیٹھے شخص کی پشت کی طرف نماز پڑھ رہا ہو جبکہ وہ شخص محو کلام ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مختلف حلقے لگتے تھے اس میں نماز پڑھنے والے، باہمی وعظ وپند کرنے والے اور ایک حلقہ تلاوت کرنے والوں کا تھا جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرز عبادت وتلاوت سے منع نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ تلاوت اور وعظ کا علی الاطلاق سننا واجب نہیں ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب کو حلقہ تعلیم میں بیٹھنے یا استماع تلاوت کا حکم صادر فرماتے۔

نیز خارج نماز عدم استماع تلاوت کے وجوب پر ابن کثیر ملاحظہ ہو۔

تفسیر ابن کثیر (۲/۲۵۹): سورة الاعراف (آية: ۲۰۴)

حدثنا الجريری عن طلحة بن عبيد الله بن كريز قال رأيت عبيد بن عمير وعطاء بن ابی رباح يتحدثان والقاص يقص فقلت الا تستمعان الی الذكر، وتستوجبان الموعود؟ قال فنظرا إلیّ ثم اقبلا علی حديثهما، قال فاعدت فنظرا إلیّ واقبلا علی حديثهما، قال فاعدت الثالثة قال فنظرا الی فقالا انما ذالک فی الصلوة.

مذکورہ بالا حوالہ میں جہاں خارج نماز عدم وجوب استماع التلاوۃ کی صراحت ہے وہاں وعظ وپند کے عدم وجوب استماع پر بھی القاص یقص '' کی بناء پر بین دلیل ہے۔

نیز ابن کثیر (۲/۲۵۹) ملاحظہ ہو۔

قال عبدالرزاق عن الثوری عن لیث عن مجاهد قال لا بأس اذا قرأ الرجل فی غیر الصلوٰة ان یتکلم وکذا قال سعید بن جبیر والضحاک وابراهیم النخعی وقتادة ان المراد بذالک فی الصلوٰة.

کذا فی تفسیر القرآن لصنعانی (۲/۲۴۷)

اس حوالہ بالا کی روشنی میں علی الاطلاق وجوب استماع تلاوت کا حکم دشوار ہے۔

تفسیر الدر المنثور میں (۹/۲۳۵) پر بھی اس کی تائید موجود ہے:

عن عبدالله بن مغفل انه سئل اکل من سمع القرآن یقرأ وجب علیه الاستماع والانصات؟ قال لا قال انما نزلت هذه الاية.......... فی قراءة الامام اذا قرأ الامام فاستمع له وانصت.

نیز تفسیر مظہری میں خلاصۃ الفتاویٰ کے جزئیہ "رجل یکتب الفقه وبجنبه یقرأ القرآن فلا یمکنه الاستماع فالاثم علی القاری الخ" پر محدثانہ تبصرہ ملاحظہ ہو۔

تفسیر مظهری (۳/۴۵۱): اختلف العلماء فی وجوب الاستماع والانصات علی من هو خارج الصلوٰة یبلغه صوت من یقرأ القرآن فی الصلوٰة او خارجها. قال البیضاوی عامة العلماء علی استحبابها خارج الصلوٰة..... قال فی الخلاصة رجل یکتب الفقه الخ.

قلت: وقد ثبت عنه ﷺ انه کان یقرأ القرآن باللیل جهراً بحیث یسمع من وراء حجرته وربما یسمعه الجیران.

وفی الصحیحین عنه قال قال رسول الله ﷺ انی لاعرف اصوات رفقة الاشعریین حین یرحلون واعرف منازلهم من اصواتهم بالقرآن باللیل..... ولا شک ان بعض الناس فی العسکر کانوا نیاما وقت قراءة الاشعریین.

فهذا الاحادیث تدل علی فساد ما افتی به صاحب الخلاصة.

حضرت کا یہ تبصرہ اگرچہ بظاہر "وعلی هذا لو قرأ علی السطح الخ" کے متعلق ہے لیکن حضرت کا رجحان خارج نماز عدم وجوب استماع التلاوت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تفسیر ابن مردویہ کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

اخرج ابن مردویه فی تفسیره قال .... قال عبدالله بن مغفل اکل من سمع القرآن وجب علیه الاستماع والانصات قال انما نزلت هذه الاية اذا قرأ القرآن الخ فی القراءة خلف الامام.

بلکہ حضرت مندرجہ ذیل الفاظ سے صاف صاف اپنی رائے کا اظہار فرما رہے ہیں۔

قلت واللام فی قوله تعالیٰ اذا قرئ القرآن للعهد دون الجنس والمراد به القرآن المقرؤ لاستماعکم کالامام یقرأ حتی یسمع من خلفه والخطیب یقرأ للتخاطب والمقری یقرأ علی التلمیذ.

معلوم ہوا مطلقاً استماع تلاوت واجب نہیں۔

نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ خارج نماز استماع تلاوت کے بابت ملاحظہ ہو۔

امدادی الفتاویٰ (۵۹/۴): الجواب...... سماع قرآن میں دونوں قول ہیں آسانی کیلئے میں اسی کا اختیار کرتا ہوں کہ خارج صلوٰۃ مستحب ہے۔

حضرت کے نزدیک جب وجوب استماع تلاوت علی الاطلاق نہیں تو اس پر مبنی مسئلہ وجوب استماع وعظ بھی یقیناً واجب نہیں ہوگا۔

نیز استماع تلاوت مطلقاً میں اتنا عموم اور توسیع کہ مجلس تلاوت میں بیٹھے ہمہ حاضرین وسامعین پر استماع واجب ہو پھر اس پر بناء کر کے مجلس وعظ میں موجود تمام سامعین پر وجوب وعظ کا حکم لاگو کرنا خود علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت سے متضاد ہے۔ کیونکہ علامہ شامی رحمہ اللہ جہاں استماع تلاوت علی الاطلاق کے قائل ہیں وہاں استماع تلاوت خارج نماز فرض (واجب) کفائی کی تصریح فرما رہے ہیں۔ جبکہ مرسلہ تحریر میں مثبت دعویٰ اس کے خلاف ہے۔

فتاویٰ شامیة (۵۴۶/۱): وفی شرح المنیة: والاصل ان الاستماع للقرآن فرض کفایة لانه لاقامة حقه بأن یکون ملتفتا إلیه غیر مضیع وذالک یحصل بانصات البعض، کمافی رد السلام حین کان لرعایة حق المسلم کفی فیه البعض عن الکل.

نیز بیان القرآن میں خارج نماز استماع تلاوت کے بابت مفصل اور فیصلہ کن کلام ملاحظہ ہو۔

بیان القرآن (۳۶۳/۱):...... اور اسی سے خارج عن الصلوٰۃ بھی قرأت کے وقت دوسرے کام میں مشغول ہونے کو ہمارے فقہاء حنفیہ نے ممنوع فرمایا ہے۔ اور اسی پر مشغول کے پاس بیٹھ کر پکار کر پڑھنے کو منع کیا ہے نقلہ فی الروح عن الخلاصۃ۔

اور مبنیٰ اس کا مسئلہ مشہورہ اصولیہ کے اعتبار سے عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا لیکن احقر کو اس میں شفاء نہیں۔ نہ اس مسئلہ اصولیہ میں اور نہ اس فرع فقہی میں کیونکہ ایسا عموم جو مراد متکلم سے بھی متجاوز ہو مراد لینا صحیح نہیں جیسا کہ حدیث "لیس من البر الصیام فی السفر" میں صیام کو کسی نے عام نہیں لیا اور یہاں مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تلاوت خارج صلوٰۃ اپنے ثواب یا یاد کیلئے ہو کسی کو تذکیر و تبلیغ کیلئے نہ ہو وہ آیت میں مراد نہیں۔

وایضاً فی السراج المنیر للخطیب الشربینی عن البیضاوی وظاهر اللفظ یقتضی وجوبهما حیث یقرأ القرآن مطلقاً وعامة العلماء علی استحبابهما خارج الصلوٰة.

پس ظاہراً عامۃ العلماء میں حنفیہ بھی داخل ہیں اور یہ لفظ قریب اجماع ہے۔ پس اس قول کو حنفیہ کا قول محقق اور قول اوّل کو ان کا قول مشہور کہیں گے۔

ضمیمہ:...... بعد تحریر تحقیق بالطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص:۱۰۸) میں یہ روایت نظر پڑی جس میں فرع مذکور میں بھی حنفیہ کے نزدیک گنجائش کی تصریح ہے۔

وفي الدر المنيفة عن القنية يكره للقوم ان يقرؤا القرآن جملةً لتضمنها ترك الإستماع والانصات وقيل لا باس؟، انتهى كلام

حکیم الامت:...... نیز بزازیہ کی عبارت میں واشگاف الفاظ میں خارج نماز میں استماع قرآن کے بابت قول آخر (عدم استماع) کی طرف اشارہ موجود ہے۔

لمافي البزازية(۱/۴۱): يكتب الفقه وبحنبه رجل يقرأ القرآن......فالا ثم على القارى..........

وهذا على قول من قال استماع القرآن واجب خارج الصلوٰة.

معلوم ہوا مذہب میں دوسرے قول کی بھی گنجائش ہے۔

نیز فتاویٰ حقانیہ (۲/۱۷۰) پر خارج نماز استماع تلاوت کے بابت فتویٰ ملاحظہ ہو۔

الجواب:......اس بارے میں دو طرح کے اقوال موجود ہیں، ایک وجوب کا اور دوسرا عدم وجوب کا، متاخرین فقہاء کرام نے آسانی اور سہولت کیلئے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ لہٰذا خارج نماز قرآن کریم کی تلاوت سننا واجب نہیں تاہم مستحب ضرور ہے۔

وحكى ابن المنذر: الاجماع على عدم وجوب الاستماع والانصات في غير الصلوٰة والخطبة وذالك ان يجابهما على كل من يسمع احداً يقرأ فيه حرج عظيم لانه يقتضي ان يترك له المشتغل بالعلم علمه والمشتغل بالحكم حكمه الخ. (تفسير المنار، ۵۵۲/۹، ۵۵۳)

نیز احکام القرآن للجصاص رحمہ اللہ تعالیٰ کا خارج نماز استماع تلاوت کے متعلق مفسر قرآن حضرت ابن عباسؓ سے فیصلہ کن اور محتاط کلام ملاحظہ ہو (احکام القرآن للجصاص، ۳۹/۳)۔

عن ابن عباس في قوله تعالىٰ (واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا. قال المؤمن في سعة من الاستماع إليه الافي صلاة مفروضة او يوم جمعة او فطر او اضحىٰ.

مذکورہ بالا ہمہ حوالہ جات شکل اوّل کے کبریٰ اور اس سے اخذ شدہ نتیجہ سے ہماری نظر میں میل نہیں کھا رہے ہیں۔

البتہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے باب ''الانصات للعلماء'' کے تحت علامہ عینی اور علامہ ابن بطال رحمہما اللہ تعالیٰ کے کلام سے بظاہر ہر وعظ کے استماع کا وجوب معلوم ہوتا ہے لیکن خارج نماز سماع تلاوت کے بابت ذکر کردہ روایات اور تصریحات اکابر کے

تناظر میں علامہ ابن بطال رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تاویل کی جائے گی کیونکہ جب کلام خالق جل جلالہ کا استماع علی الاطلاق واجب نہیں تو وجوب استماع کلام عالم وکلام الناس بدون نص صریح غیر معارض چہ معنی دارد۔

نیز اگر علماء کرام کے ہر کلام خواہ از قبیل خطبہ ہو یا وعظ و پند سننا واجب ہو تو پھر ''یجب الاستماع لسائر الخطب'' کا محمل کیا ہوگا جبکہ مرسلہ تحریر کے مطابق ''فقہاء کرام کی عبارات میں اتفاقی قیودات نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان کی عبارات کا مفہوم مخالف بھی معتبر مانا جاتا ہے الخ''۔

لہٰذا ابن بطال رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سوائے تاویل کے کوئی چارہ کار نہیں۔

وباب التاویل متسع

اوّلاً...... وجوب انصات العالم اس وقت ہوگا جب وہ خطبہ دے رہا ہو جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب الانصات للعلماء کے تحت جو حدیث نکالی ہے اسی حدیث کیلئے (اگر چہ سند مختلف ہے) (۴۳۳/۱) پر باب باندھا ہے باب ''الخطبة بایام منی'' ورنہ انصات مستحب ہوگا۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے مطلقاً عالم کیلئے انصات معلوم ہو رہا ہے کیونکہ ''جب کسی اسم مشتق پر حکم لگتا ہے تو مادہ اشتقاق اس کی علت بنتا ہے جیسا کہ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں ''الانصات لاجل العلماء واللام فيه للتعليل''

جواباً ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر عالم کا ہر کلام خطبہ وغیر خطبہ سننا واجب ہو تو پھر یجب الاستماع لسائر الخطب کے مابین تعارض آئے گا اس تعارض کے دفعیہ کیلئے مذکورہ بالا تاویل کے علاوہ کوئی مخلص نہیں۔

ثانیاً...... وجوب بمعنی ثبوت ہے کما ھو شائع ذائع۔

ثالثاً...... محقق العصر محدث وقت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''الدر'' کی عبارت ''یجب الاستماع لسائر الخطب'' کے عموم پر گہری تشویش کا اظہار فرمایا۔ چہ جائیکہ ہر عالم کے کلام اور ہر وعظ کا سننا واجب ہو۔

لما فی فیض الباری (۳۴۷/۲): قوله (تركوك قائماً) فان قلت كيف وهم اتقى الناس فى الارضين وازهدهم بعد الانبياء والمرسلين قلت والجواب كما فى التوشيح للسيوطى. ان الخطبة فى الجمعة كانت على شاكلة العيدين بعد الصلوٰة ثم قدمت عليها فلعلهم حملوا استماعها على الاستحباب وظنوه كسائر الخطب ولم يروه عزيمةً عليهم سيما اذا كان عند النسائى ان النبى ﷺ كان ينادى بعد العيدين ان من شاء منكم ان يمكث فليمكث ومن شاء ان يذهب فليذهب وتردد فيه الحفاظ. فدل على التوسيع فى خطبة العيدين.

وفى الدر المختار ان استماع جميع الخطب واجب'' قلت ولا يناسب هذا التوسيع بل ينبغى ان يفصل فى الامر.

وفیہ تحت باب کلام الامام والناس فی خطبۃ العید الخ.

(۲/۳۶۳) کلام الامام الناس)......... لعل المصنف رحمہ اللہ تعالیٰ یشیر الی ان فی خطبۃ العیدین سعۃ بالنسبۃ إلی خطبۃ الجمعۃ وھو المختار عندی وان کان فی کتبنا انھما سواء.

وفی النسائی (۱/۱۷۸) مع حاشیۃ للسیوطی

ان النبی ﷺ صلی العید قال من احب ان ینصرف فلینصرف ومن احب ان یقیم للخطبۃ فلیقم.

قولہ من احب ان یقیم. وعلم منہ ان استماع خطبۃ العید غیر واجب.

شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تحقیق کے تناظر میں ہر وعظ کے وجوب استماع کا حکم لگانا یقیناً دشوار ہے۔

نیز قاعدہ مسلّمہ "المشقۃ تجلب التیسیر" بھی عدم وجوب کا متقاضی ہے۔ علاوہ ازیں بعض صحابہ کے طرز عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

لمافی موضوعات الکبریٰ لملا علی القاری (ص۴۴): واخرج المروزی عن سالم ان ابن عمر کان یلفی خارجاً من المسجد فیقول ما اخرجنی الا صوت قاصّکم ھذا.

یہ تو اس مسئلہ کا علمی اور فقہی پہلو تھا جس کے بابت ہم نے اپنے موقف کی وضاحت کردی البتہ عملی نقطۂ نظر سے علماء کرام کی توقیر، عزت واحترام اوران کے کلام، وعظ اور پند کو ہمہ تن، دلجمعی اور یکسوئی سے سننے سے کسی کو انکار کی مجال نہیں بلکہ اس پہلو کو عوام الناس میں ترغیبی انداز میں اجاگر کرنے کی اشد ضرورت اور عصر حاضر کا اہم تقاضا ہے۔ کیونکہ افادہ اور استفادہ کا دارومدار اعتقاد اور باہمی الفت ومحبت پر ہے۔ عوام الناس کے قلوب میں علماء کرام کا اعتقاد، تعظیمی اور توقیری شعور بیدار کرنے کیلئے اس مسئلہ کو منصۂ شہود پر لانا انتہائی قابل ستائش اور مستحسن اقدام ہے۔ اس مسئلہ کو عملی جامہ پہنانے سے میڈیا، مغرب زدہ طبقہ اور سازشی عناصر کے ہاتھوں عوام اور علماء کرام کے مابین پھیلائی انارکی، فساد، نفرت اور قائم خلیج کے فاصلے رفو ہوکر علماء کرام عوام الناس کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں بہتر انداز میں صحیح دینی اور اخلاقی رہنمائی کرسکیں گے اور کافی حد تک عریانی اور فحاشی سے آلودہ معاشرہ کا مداوا ہو سکے گا۔

(۳۳۷) خطبہ اور جماعت کے درمیان خطیب صاحب کا مخصوص اعلان کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے خطیب صاحب جمعہ کے خطبہ کے بعد اقامت سے پہلے دو چار باتوں کا اعلان کرتے ہیں، وہ یہ ہیں "صفیں درست فرمالیں، چھوٹے بچوں کو پچھلی صفوں میں، یا صفوں کے دائیں بائیں کردیں، اپنے سروں کو ڈھانپ لیں اپنے پائنچوں کو ہمیشہ کھلا رکھا کیجئے اور اپنے موبائل فونز بند کرلیں" اس اعلان کے بعد اقامت ہوتی ہے اور پھر نماز۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ آیا اس طرح کے اعلان سے خطبہ جمعہ اور نماز میں فصل واقع نہیں ہوتا؟ آیا اس طرح کا اعلان کرنا خطیب صاحب کیلئے درست ہے؟ میں نے کئی بڑے بڑے بزرگوں کے پیچھے نماز جمعہ پڑھی ہے انہیں اس طرح کے اعلانات

کرتے کبھی نہیں سنا، ازراہ کرم اگر بزرگوں میں سے کسی سے متعلق بھی معلوم ہو جائے کہ ان کی یہ عادت تھی تو بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... امر بتسویۃ الصفوف یعنی نماز کے لئے جب صفیں بنائی جائیں تو صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم کرنا نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے، خدا کے بعد سب سے بڑے بزرگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھانے کے لئے تشریف لاتے تو تکبیر کہنے سے پہلے صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم فرماتے۔ کتب احادیث اس قسم کی احادیث سے بھری ہوئی ہیں۔ اس تمہید کی روشنی میں جواباً عرض ہے کہ خطیب صاحب کا یہ اعلان کرنا جائز ومستحسن اور سنن صلوۃ میں سے ایک سنت کو پورا کرنا ہے، جہاں تک خطبہ اور اقامت کے درمیان فصل کا تعلق ہے جس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ دنیاوی باتوں کے ذریعہ ہو، اگر دینی باتوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا کسی عذر شرعی کی بنا پر فصل آجائے تو یہ مکروہ نہیں ہے۔ خطیب صاحب مذکور فی السوال کا یہ اعلان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قبیل سے ہے لہٰذا یہ فصل مضر نہیں۔ آپ کا کسی سے نہ سننا ان کے خلاف حجت نہیں۔

لما فی سنن النسائی(۱/۹۳): مایقول الامام اذا تقدم فی تسویۃ الصفوف، اخبرنا بشر بن خالد...... عن أبی مسعود رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ ﷺ یمسح عواتقنا ویقول استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم ولیلینی منکم اولو الاحلام والنھی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم...... عن انس قال اقبل علینا رسول اللہ ﷺ بوجھہ حین قام الی الصلوۃ قبل ان یکبر فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظھری.

وفی صحیح البخاری(۱/۱۰۰): قال انس بن مالک رضی اللہ عنہ اقیمت الصلوۃ فاقبل علینا رسول اللہ ﷺ بوجھہ فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظھری.

وفی عمدۃ القاری(۵/۲۵۴): ذکر ما یستفاد منہ فیہ الامر بتسویۃ الصفوف وھی من سنۃ الصلوۃ عند ابی حنیفۃ والشافعی ومالک رحمھم اللہ تعالیٰ، وزعم ابن حزم انہ فرض لان اقامۃ الصلوۃ فرض وما کان من الفرض فھو فرض.

وفی الدر المختار مع الشامیۃ (۲/۱۶۱): فاذا اتم اقیمت ویکرہ الفصل بامر الدنیا ذکرہ العینی، قولہ اقیمت، بحیث یتصل اول الاقامۃ باٰخر الخطبۃ وتنتھی الاقامۃ بقیام الخطیب مقام الصلوۃ...... قولہ بامر الدنیا اما بنھی عن منکر او امر بمعروف فلا وکذا بوضوء او غسل لو ظھر انہ محدث او جنب کما مر بخلاف اکل أو شرب.

(۳۴۸) خطبہ اور جمعہ میں فصل کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر خطبہ اور نمازِ جمعہ میں فصل ہو جائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....خطبہ اور نماز جمعہ میں وصل سنت ہے۔ پھر اگر فصل اخروی امور کی وجہ سے ہو۔ جیسے وضو کرنا وغیرہ تو دوبارہ خطبہ دینا مستحب ہے۔ اگر خطبہ نہ دے، پھر بھی جائز ہے۔ لیکن اگر فصل دنیاوی امور کی وجہ سے ہو، جیسے کھانا پینا وغیرہ تو مکروہ ہے اور اگر فصل لمبا ہو جائے تو دوبارہ خطبہ دینا ضروری ہوگا۔

لمافي الدر المختار على هامش الطحطاوی(۳۴۳/۱): ولو خطب جنبا ثم اغتسل وصلى جاز ولو فصل باجنبي فان طال بان رجع لبيته فتغدى أو جامع واغتسل استقبل خلاصة اى لزوما لبطلان الخطبة.

وقال الطحطاوى تحته : (قوله جاز) أى ولا يعد الغسل فاصلا لانه من اعمال الصلاة (فان طال) الظاهر انه يرجع في الطول الى نظر المبتلى .

وفيه ايضاً(صـ ۳۴۸): (فاذا اتم) الامام الخطبة (أقيمت ويكره الفصل بامر الدنيا) يفهم منه انه لايكره الفصل بامر الآخرة كذكروهو كذلک لان الخلاف على الاصح انما هو فى كلام الدنيا كما قدمناه ولكن مالم يلزم منه تاخر .

وفى الشامية (۱۵۱/۲):(قوله جاز)أى ولا يعد الغسل فاصلا لانه من اعمال الصلاة و لكن الاولى اعادتها كما لو تطوع بعدها اوافسد الجمعة او فسدت بتذكرفائتة فيها. وفى (صـ ۱۶۱): (قوله فاذا أتم) اى الامام الخطبة (قوله أقيمت) بحيث يتصل اول الاقامة بآخر الخطبة ....

وفى (صـ ۱۶۲):(قوله بامر الدنيا) اما بنهى عن منكر او امر بمعروف فلا وكذا بوضوء او غسل لوظهر انه محدث او جنب كما مر بخلاف اكل وشرب حتى لوطال الفصل استأنف الخطبة.

(۳۳۹) عربی میں خطبہ پڑھنے کی شرعی حیثیت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے وقت عربی زبان میں جو خطبہ پڑھا جاتا ہے اس کا عربی زبان میں پڑھنا فرض ہے واجب یا سنت؟ اگر کوئی عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں پڑھتا ہے یا عربی کے ساتھ ساتھ کسی دوسری زبان میں ترجمہ بھی ہوتا ہے تو اس خطبے کا کیا حکم ہوگا؟ اور اس صورت میں نماز جمعہ کا کیا حکم ہوگا؟ نیز اس مسئلے میں جواز اور عدم جواز کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں ان کو مفصلاً ومدللاً بیان فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....جمہور ائمہ کے نزدیک نماز جمعہ کیلئے خطبہ پڑھنا فرض اور عربی زبان میں پڑھنا واجب ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کا پہلے یہ قول تھا کہ قراءت بالفارسیہ جائز ہے اس شخص کیلئے جو عربی زبان پر قدرت رکھتا ہو، پھر انہوں نے صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع کرلیا اور اب احنافؒ کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ قرأت بالفارسیہ جائز نہیں، اور شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ میں بھی یہی اختلاف ہے۔

صاحبینؒ کے نزدیک عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں جائز نہیں اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، اور فقہاء کرام شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ کے اس اختلاف کو مدار بنا کر نماز کے تمام اذکار، دعاء قنوت اور خطبے وغیرہ کو قیاس کرتے ہیں۔

صاحبین کے نزدیک عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں جائز نہیں ہے، اور حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک جائز ہے، اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کا رجوع شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ میں صاحبینؒ کے قول کی طرف ثابت ہے۔

لہٰذا احنافؒ کا اب قول یہ ہے کہ عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ، نماز کے تمام اذکار اور دعاء قنوت، اور خطبہ وغیرہ سب جائز نہیں ہیں۔

صورت مسئولہ میں خطبہ غیر عربی میں پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی نے عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں خطبہ پڑھا تو اس خطبے کا اعادہ ضروری ہوگا۔

وفی الهندية (۱/۱۴۶): (ومنها الخطبه قبلها) حتی لو صلوا بلا خطبة أو خطب قبل الوقت لم یجز كذا فی الكافی.

وفی الشامية (۱/۳۸۳): (قوله ايضاً الخ) أی كما صح شروعه بالتكبير السابق صح ايضاً بالتسبيح ونحوه، لكن مع كراهة التحريم، لأن الشروع بالتكبير واجب، وقدمنا ان الواجب لفظ الله اكبر من بين الفاظ التكبير الأتية، وقال فی الخزائن هنا، وهل يكره الشروع بغير الله اكبر؟ تصحيحان، والراجح انه مكروه تحريما، وان وجوبه عام لاخاص بالعبد كماحرره فی البحر للمواظبة التی لم تقترن بترک اهـ...... ...... وفيه أيضاً (صـ۳۸۴) (قوله وجميع اذكار الصلاة) فی التتارخانية عن المحيط: وعلى هذا الخلاف لوسبح بالفارسية فی الصلاة او دعا أو أثنى على الله تعالیٰ او تعوذ اوهلل او تشهد او صلى على النبی ﷺ بالفارسية فی الصلاة ای يصح عنده لكن سيأتی كراهة الدعاء بالاعجمية.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۸۴۰): وقد اجمع الفقهاء على انه لا تجزی القراء ة بغير العربية، ولا الإبدال بلفظها لفظاً عربياً آخر، سواء احسن قراء تها بالعربية أو لم يحسن، لقوله تعالیٰ: (قرآناً عربياً) (يوسف، ۱۲/۲). وقوله سبحانه: "بلسان عربی مبين" (الشعراء: ۲۶/۱۹۵) ولا القرآن معجزة بلفظه ومعناه، فإذا غيرّ خرج عن نظمه، فلم يكن قرآناً ولا مثله، وإنما يكون تفسيراً له، والتفسير غير المفسر الخ.

وفی الدرالمختار (۱/۵۲۱): (ودعا) بالعربية، وحرم بغيرها نهر، لنفسه وابويه واستاذه المؤمنين.

وفی الشامية تحته: (قوله وحرم بغيرها) الی قول لكن المنقول عندنا الكراهة، فقد قال فی غرر

الافکار شرح دررالبحار فی هذا المحل: وکره الدعاء بالعجمیة، لأن عمرؓ نهی عن رطانة الأعاجم اھ .. والرطانة کمافی القاموس: والکلام باالاعجمیة، ورأیت فی الولوالجیة فی بحث التکبیر بالفارسیة ان التکبیر عبادة لله تعالیٰ، والله تعالیٰ لایحب غیر العربیة، ولهذا کان الدعاء بالعربیة اقرب الی الاجابة، فلایقع غیرها من الألسن فی الرضاء والمحبة لها موقع کلام العرب اھ. وظاهر التعلیل أن الدعاء بغیر العربیة خلاف الاولیٰ، وان الکراهة فیه تنزیهیة، الی قول ولا یبعد ان یکون الدعاء بالفارسیة مکروها تحریما فی الصلوة وتنزیها خارجها، فلیتامل ولیراجع.

وفی مجموعة الفتاویٰ هامش خلاصة الفتاویٰ(۱/۱۵۰): سوال: چه میفرمایند علماء دین متین اندرین مسئله که خطبه جمعه بر زبان اردو یا فارسی یا باشعار اردو یا فارسی خواندن جائز ودرست است یا نه؟ واگر جائز است پس درکدام کتاب مذکور است بینوا توجروا، هو العلیم الخبیر خطبه جمعه بر زبان اردو نثر باشد یا نظم وهمچنان برزبان فارسی نثر باشد یا فارسی وعلی هذا القیاس خطبه که قدری عبارتش بلغت عربی باشد وقدری بزبان اردو یا فارسی نثر یا نظم باشد مکروه بکراهت تحریمی است چرا که مخالف سنت هدیٰ است زیراچه پیغمبر خدا علیه التحیة والثناء وصحابه کرامؓ علی الدوام خطبه بزبان عربی خوانده است ودرآن وقت از کسی خواندن خطبه بغیر زبان عربی منقول نیست چنانکه درکتاب آکام النفائس فی اداء الاذکار بلسان الفارس مسطورست وهذه عبارته "الکراهة انما هی لمخالفة السنة لان النبی ﷺ واصحابه قد خطبوا دائما بالعربیة ولم ینقل عن احد منهم أنهم خطبوا ولو خطبة غیر الجمعة بغیر العربیة انتهیٰ، وپوشیده نماندکه باعث احداث خطبه غیر عربیه نیست مگر نفهمیدن عجم عبارات عربیه راحالانکه این امردر قرون ثلاثه هم موجود بود چرا که هر گاه بلاد وامصار در اطراف مختلفه مفتوح شدند واکثر مردمان فارس وحبش وروم وغیره مشرف باسلام شدند وایشان درمجالس شعائر الاسلام مثل جمعه وعید وغیرها حاضر میشدند وظاهر است که آن مردمان رابوجه عدم وقوف از لغت عربی شعور فهم عبارات عربیه نبود با این همه کسے شخصے بنا بر رعایت فهم اشخاص عجمیه خطبه در غیر زبان عربی نخوانده باوجودیکه تعلیم وتفهیم که از شان خطبا وعلماست مقتضی این بود هر گاه در آن وقت چنین نه شده پس درکراهت خطبه غیر عربیه که ادنیٰ مرتبه ضلالت ست، هیچ شکے نماند، چنانکه درکتاب آکام النفائس فی اداء الأذکار بلسان الفارس مذکور ست، الخطبة بالفارسیة التی احدثوها واعتقدوا حسنها لیس الباعث الیها الاعدم

فهم العجم اللغة العربية وهذا الباعث قد كان موجود فی عصر خير البرية وان كان فی اشتباه فلا اشتباه فی عصر الصحابة والتابعين ومن تبعهم من الائمة المجتهدين حيث فتحت الامصار الشاسعة والديار الواسعة واسلم اكثر الحبش والروم والعجم وغيرهم من الاعجام وحضروا مجالس الجمع والاعياد وغيرها من شعائر الاسلام وقد كان اكثرهم لايعرفون اللغة العربية ومع ذلک لم يخطب احد منهم بغير العربية ولما ثبت وجود الباعث فی تلک الازمنة وفقدان المانع والتكاسل ونحوه معلوم بالقواعد المبرهنة لم يبق الا الكراهة التی هی ادنیٰ درجات الضلالة انتهی، الی قول (صـ ۱۵۱) چنانچه هم در آن کتاب مرقوم است، وقدوردان النبی ﷺ لما فرغ من الخطبة فی بعض الاعياد وظن انها لم تصل الی اذان النساء لبعدهن حضرهن ووعظهن وخطبهن ولم يرووا لومن رواية الافراد أنه عقدين ألم يكن يفهم العربی مجلساً عليحدة ووعظهم وخطبهم بلغة غير عربية ولا يتوهم انه لم يكن النبی ﷺ يعلم اللغة العجمية وغيرها من اللغات الغير العربية ولو كان علمها لخطب بها لأنا نقول بعد تسليم ذلک ان بعض الصحابة كزيد بن ثابت قد كان يعلم اللسان العجمی والرومی والحبشی وغيرها من الا لسنة كماصرح به فی الاعلام بسيرة النبی ﷺ وغيره من كتب الاعلام فلم يامره النبی ﷺ بان يخطبهم ويعظهم بالسنتهم وبالجملة فالاحتياج الی الخطبة بغير العربية لتفهيم اصحاب العجمية كان موجودا فی القرون الثلثة ومع ذلک فلم يرو واحد من احد فی تلک الأزمنه وهذا اول دليل علی الكراهة انتهی.

وفی اعلاء السنن(۱/۱۱۳): هذا هو قول أبی حنيفةؒ أولا ثم رجع عنه إلی قولهما، وقال بأن القرآن اسم للفظ والمعنی جميعا لا للمعنی فقط. وقال: لا تجوز الصلوة بالعجمية للقادر علی العربية، وتجوز للعاجز عنها، قال فی البحر: وهو الحق لأن المفهوم من القرآن باللام انما هو العربی فی عرف الشرع وهو المطلوب من قوله تعالیٰ: "فَاقْرَؤُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ".

وفی كتاب الفقه علی مذاهب الاربعة(۱/ ۳۹۱،۳۹۲): يشترط لخطبتی الجمعة امور: احدها: أن تتقدما علی الصلاة، فلا يعتديهما إن تاخرتا عنها...... ثالثها أن تكون بالعربية علی تفصيل فی المذاهب.

(حاشية نمبر۲): الحنابلة: قالو الا تصح الخطبة بغير العربية إن كان قادراً عليها، فإن عجز عن الاتيان بها أتی بغيرها ممايحسنه، سواء كان القوم عرباً أو غيرهم، لكن الآية التی هی ركن من اركان الخطبتين لا يجوز له ان ينطق بها بغير العربية. فيأتی بدلها بأی ذكر شاء بالعربية، فان عجز

سکت بقدر قراء ۃ الآیة.

الشافعیة: قالوا: یشترط ان تکون ارکان الخطبتین باللغة العربیة: فلا یکفی غیر العربیة متی امکن تعلمها، فإن لم یمکن خطب بغیرها، هذا إذا کان القوم عرباً، أما إن کانوا عجماً فإنه لایشترط اداء أرکانهما بالعربیة مطلقاً، ولو أمکنه تعلمها ماعد الآیة، فإنه لابدأن ینطق بها بالعربیة، الا اذا عجز عن ذلک، فإنه یأتی بدلها بذکر أو دعاء عربی، فان عجز عن هذا ایضاً فعلیه ان یقف بقدر قراء ۃ الآیة، ولا یترجم، وأما غیر ارکان الخطبة فلا یشترط لها العربیة بل ذلک سنة.

المالکیة: قالوا: یشترط فی الخطبة ان تکون باللغة العربیة، ولو کان القوم عجماً لایعرفونها، فإن لم یوجد فیهم من یحسن اللغة العربیة بحیث یودی الخطبة بها سقطت عنهم الجمعة.

(۳۴۰) خطبہ میں طہارت شرط نہیں

سوال...... ہمارے امام صاحب کچھ عرصے سے سلسل البول کے مرض میں مبتلا ہیں، اس سال عید کے روز لوگ دور دراز سے انکی تقریر سننے آگئے تو امام صاحب نے کہا کہ میں معذور ہوں لہٰذا نماز انکے بیٹے نے پڑھائی اور انہوں نے صرف خطبہ دیا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ معذور شخص خطبہ دے سکتا ہے؟ کیا خطبہ کیلئے طہارت ضروری ہے؟ نیز جو شخص خطبہ دیگا وہی نماز پڑھائیگا یا نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... خطبہ کیلئے طہارت شرط نہیں بلکہ سنت ہے، اگر کوئی شخص بغیر طہارت کے خطبہ دیدے تو خطبہ تو ہو جائیگا لیکن مکروہ ہوگا، لہٰذا معذور شخص بوجہ کراہت کے صرف تقریر کر لے خطبہ نہ دے بلکہ خطبہ اور نماز کوئی اور پڑھا لے نیز خطبہ ایک شخص دے اور نماز دوسرا شخص پڑھا دے تو یہ بھی جائز ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ایک ہی شخص خطبہ بھی دے اور نماز بھی پڑھائے۔

لمافی الهندیة(۱/۱۴۶)واماسننهافخمسةعشر احدهاالطهارةحتی کرهت للمحدث والجنب.

وفیهاایضاً(۱/۱۴۷):ولاینبغی ان یصلی غیرالخطیب.والله اعلم بالصواب.

(۳۴۱) خطبہ میں ''السلطان المسلم الخ'' کے الفاظ پڑھنے کی ابتداء اور شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر خطیب خطبہ میں السلطان المسلم ظل الله فی الارض من اهان سلطان الله فی الارض اهانه الله کے الفاظ پڑھتے ہیں تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ یہ الفاظ کہیں سے ثابت نہیں، خلفاء راشدین کے بعد کے بادشاہوں کے من گھڑت ہیں، انہوں نے اپنی عزت کرانے کیلئے خطبہ میں ان الفاظ کو شامل کیا ہے، تو اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ ان الفاظ کا ثبوت کہاں سے ہے اور کب یہ خطبہ میں شامل کئے گئے نیز آج کل کے دور میں ان کا خطبہ میں پڑھنا کیسا ہے؟ جبکہ موجودہ دور کے حکمران ان کو اپنے حق میں لیتے ہیں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ..... صورتِ مسئولہ میں مذکورہ الفاظ بادشاہوں کے من گھڑت نہیں بلکہ دو مختلف احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں۔ ہمیں تتبع بسیار کے بعد یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ یہ الفاظ خطبہ میں کب شامل کئے گئے البتہ موجودہ دور میں بھی ان الفاظ حدیث کو خطیب خطبہ میں پڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ ظالم اور جابر بادشاہ جس سے دین اسلام کو نقصان اور کفر کو فائدہ ہورہا ہو تو وہ اس حدیث کا مصداق ہی نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ اس حدیث کو اپنے حق میں مراد لے۔ کیونکہ اہانت سے مراد جائز امور میں سلاطین کی نافرمانی کرنا ہے۔ لہٰذا ناجائز امور میں ان کی فرمانبرداری جائز ہی نہیں ہے۔

لما فی الصحیح لمسلم (۱۲۵/۲): عن ابن عمر عن النبی ﷺ انه قال علی المرأ المسلم السمع والطاعة فیما أحب وکره الاأن یؤمر بمعصیة فاذا أمر بمعصیة فلا سمع ولاطاعة.

وفی الجامع للإمام الترمذی (۴۲/۲): عن زیاد بن کسب العددی قال کنت مع أبی بکرة تحت منبر ابن عامر وهو یخطب وعلیه ثیاب رقاق فقال ابو بلال انظروا الی امیرنا یلبس ثیاب الفساق فقال ابوبکرة اسکت فسمعت رسول الله ﷺ یقول من أهان سلطان الله فی الارض اهانه الله.

(۳۴۴) دورانِ خطبہ چندے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خطبہ کے دوران چندہ مانگنا کیسا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے، مسئلے کو وضاحت سے تحریر فرمائیں۔ آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً ..... جب امام خطبہ شروع کردے تو تمام نمازیوں کو چاہئے کہ خاموشی کے ساتھ خطبہ سنیں کیونکہ خطبہ سننا واجب ہے اور خطبہ سننے میں خلل ڈالنے والے تمام کاموں سے اجتناب کریں کیونکہ دوران خطبہ ایسے کاموں کا کرنا مکروہ ہے۔ لہٰذا دورانِ خطبہ چندہ نہ کیا جائے کیونکہ اس سے خطبہ سننے میں خلل ہوگا۔ مصالح مسجد کیلئے چندہ کرنا ہو تو خطبہ سے پہلے یا نماز کے بعد کیا جائے البتہ اگر لوگوں کا مسجد میں جمع ہونا وقت خطبہ کے علاوہ دوسرے اوقات میں ممکن نہ ہو، اور مسجد کیلئے چندہ کی بھی اشد ضرورت ہو تو ایسی صورت میں دوران خطبہ چندہ کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ خطبہ سننے میں مخل نہ ہو۔

لما فی الترمذی (۱۱۴/۱): عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال من قال یوم الجمعة والامام یخطب انصت فقد لغا.

وفی سنن ابی داؤد (۱۵۹/۱): عن ابی الزاهریة قال کنا مع عبد الله بن بسر صاحب النبی ﷺ یوم الجمعة فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبدالله بن بسر جاء رجل یتخطی رقاب الناس یوم الجمعة والنبی ﷺ یخطب فقال له النبی ﷺ إجلس فقد اذیت.

وفی سنن النسائی (۱۵۸/۱): (باب حث الامام علی الصدقة یوم الجمعة فی خطبته) عن عیاض بن

عبدالله قال سمعت ابا سعيد الخدری (رضی الله عنه) يقول جاء رجل يوم الجمعة والنبی ﷺ يخطب بهيأة بذة فقال له رسول الله ﷺ اصليت قال لا قال صل ركعتين وحث الناس على الصدقة فالقوا ثياباً فاعطاه منها ثوبين فلما كانت الجمعة الثانية جاء ورسول الله ﷺ يخطب فحث الناس على الصدقة فالقى احدثوبيه فقال رسول الله ﷺ جاء هذا يوم الجمعة بهيأة بذة فامرت الناس بالصدقة فالقوا ثياباً فامرت له منها بثوبين ثم جاء الآن فامرت الناس بالصدقة فالقى احدهما فانتهره وقال خذثوبك.

وفی حاشيته (قوله صل ركعتين) قيل امره ليری الناس هيئته فيترحمون عليه لكن مقتضى السوال بقوله اصليت الخ انه ماقصد بالامر ذلك ثم كلامه ﷺ وكذا كلام المجيب ليس من باب الكلام حالة الخطبة فلا يشمله النهی لان الامام اذا شرع فی الكلام فما بقيت الخطبة تلك الساعة كذا قال السندی قلت والظاهر انه ﷺ امره ليری الناس هيئته يدل عليه حثه ﷺ بالصدقة.

(۳۴۳) خطبہ جمعہ کے علاوہ اس سے پہلے کی جانے والی تقریر کی شرعی حیثیت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن بہت سے ملکوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ پہلے ایک شخص منبر کے علاوہ دوسری جگہ کھڑا ہو کر خطبہ دیتا ہے یہ خطبہ اسلامی احکام کے بجائے عام طور پر وہاں کے مسلمانوں کے مسئلے مسائل پر زیادہ توجہ دیتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ میں دنیاوی باتیں کی جائیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمیشہ دنیاوی باتیں بھی مسجدوں میں زیر بحث آتی رہی ہیں جب پہلا شخص تقریر ختم کرتا ہے تو دوسرا شخص جو امام ہوتا ہے وہ بھی خطبہ دیتا ہے اور نماز پڑھاتا ہے یہ عام طور پر امریکہ، کینیڈا اور یورپ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی کسی حد تک یہ طریقہ رائج ہے مگر یہاں عام طور پر امام نہیں بدلتا ہے، شرعی حکم بتا کر ممنون فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً

الجواب حامداً ومصلیاً..... جمعہ کا خطبہ واجبہ اصلاً تو وہی عربی خطبہ ہے جو کہ دوسری اذان کے متصل بعد دیا جاتا ہے اور اسی خطبہ کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس میں دنیاوی باتیں اور نماز جائز نہیں ہے البتہ عرب ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک میں چونکہ لوگ عربی کو نہیں سمجھتے اور خطبہ کا ایک مقصد وعظ ونصیحت بھی ہے لہٰذا اگر پہلی اذان کے بعد مقامی زبان میں بیان کیا جائے اور وعظ ونصیحت کیا جائے تو یہ جائز ہے جیسا کہ بعض صحابہ سے ثابت ہے۔

لمافی المستدرک علی الصحيحين (۱/۱۹۰): أخبرنا أحمد بن سلمان الفقيه..... كان ابوهريرةؓ يقوم يوم الجمعة الى جانب المنبر فيطرح اعقاب نعليه فی ذراعيه ثم يقبض على رمانة المنبر يقول قال ابو القاسم ﷺ قال محمد ﷺ قال رسول الله قال الصادق المصدوق ﷺ ثم يقول فی بعض

ذلک، ویل للعرب من شرٍ قد اقترب فاذا سمع حرکة باب المقصورة بخروج الامام جلس. وفي المصنف لعبدالرزاق (۳/۲۱۹): عبدالرزاق عن معمر عن الزهري قال اوّل من قصّ تميم الداري على عهد عمر استأذ نه في كل جمعة مقاماً فاذن له فكان يقوم قال: ثم استزاده مقاما آخر فزاده، فلما كان عثمان استزاده مقاما آخر فكان يقص في الجمعة ثلاث مرات قال معمر وسمعت غير الزهري يقول كان عمر اذا مرّبه وهو يقصّ امر على حلقه السيف.

(۳۴۴) جمعہ کی تقریر اگر جمعہ کی سنتوں میں مخل ہو تو سنتوں کو کب ادا کیا جائیگا؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے اور نماز جمعہ فیکٹری میں واقع جامع مسجد میں ادا کرتا ہے۔نماز جمعہ اور کھانے کیلئے ایک بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ جبکہ نماز جمعہ کی جماعت ایک بج کر پینتالیس منٹ پر کھڑی ہوتی ہے۔ زید پہلے کھانا کھاتا ہے اور پھر مسجد میں نماز پڑھنے آجاتا ہے۔ اس وقت سوا ایک بج رہا ہوتا ہے یا ایک بج کر بیس منٹ ہو رہے ہوتے ہیں۔ مسجد میں امام صاحب تقریر جمعہ سوا ایک بجے شروع کر چکے ہوتے ہیں۔ اب زید سنتِ جمعہ جب ادا کرتا ہے تو جمعہ کی تقریر سنت میں مخل ہوتی ہے اور سنت پڑھنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ تو کیا زید سنتِ جمعہ دورانِ تقریر ادا کرے یا بعد جمعہ ادا کرے؟ واضح رہے کہ زید کی ڈیوٹی ٹائم دو بجے پھر شروع ہو جاتی ہے اور بعد جمعہ وقت کی تنگی کی وجہ سے سنت ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر تقریر کے بعد سنت پڑھنے کا وقت دیا جاتا ہو، تو تقریر کے بعد سنت ادا کرے، اور یہی طریقہ بہتر ہے۔ اس لئے امام کو چاہئے کہ تقریر کے بعد سنت ادا کرنے کا وقت دیا کریں ورنہ سنت میں خلل واقع ہونے یا سنت میں تاخیر کی وجہ سے امام گنہگار ہوگا۔ اور مقتدیوں کو چاہئے کہ اس بات کی اصلاح کریں۔ اور اگر تقریر کے بعد سنت پڑھنے کا وقت نہ ہو۔ تو پھر مسجد سے باہر کسی جگہ میں سنت ادا کرلے تاکہ سنت میں خلل واقع نہ ہو۔ اور اگر ایسی جگہ بھی نہ ہو کہ وہاں آرام سے سنتیں ادا کی جائیں تو پھر سنتیں تقریر کے دوران مسجد ہی میں پڑھی جائیں۔

لمافي الشامية (۱/۴۷۴): وتاركها يستوجب اساءة: اى التضليل واللوم: وفي التلويح ترک السنة المؤكدة قريب من الحرام، وقد يوفق بأن مرادهم بالكراهه التحريمية ...... قلت: لكن كونه سنة مؤكدة لايستلزم الاثم بتركه مرة واحدة بلاعذر، فيتعين تقييد الترک بالاعتياد والاصرار تو فيقا بين كلامهم. كما قد مناه.

(۳۴۵) آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے دورِ حاضر میں جمعہ کی شرائط

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا بسا اوقات جماعت تبلیغ کا سفر ہوتا ہے اور بعض

اوقات سندھ، بلوچستان تشکیل ہوتی ہے۔ وہاں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے۔ جماعت جب وہاں پہنچتی ہے تو اگر کوئی عالم صاحب جماعت میں ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ جمعہ پڑھاؤ۔ ہم کہتے ہیں کہ یہاں تو شرائط ہی پوری نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ

(۱)۔ ہم نے پوچھا ہے مفتیوں سے کہ جہاں پہلے سے (پاک وہند کی تقسیم سے پہلے سے، یا بعد میں بھی) جمعہ شروع ہو چکا ہے وہاں جمعہ بند نہ کیا جائے اور نئی جگہ جہاں شرائط نہ ہوں وہاں شروع نہ کیا جائے۔ گاؤں کے لوگ پورا ہفتہ نمازوں کیلئے نہیں آتے۔ صرف ایک دن جمعہ کے عنوان سے آتے ہیں اگر جمعہ بند ہو گیا تو یہ اس دن بھی نہ آئیں گے۔ اس بہانے چلو مسجد میں آتو جاتے ہیں اور خطبہ سے پہلے بیان بھی سن لیتے ہیں شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے۔ چلو نمازِ جمعہ نہ ہوتی ہو۔ اگر ظہر پڑھیں تو بھی وہ نہ آئیں گے۔ جمعہ میں فائدہ ہی ہے نا۔ گاؤں والے یہ دلائل بیان کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں کہ وہاں جماعت والے کیا کریں ان کو سمجھائیں تو مقامی علماء جن کا فتویٰ ان کے پاس ہے اس سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور اگر پڑھائیں تو کیسے؟ آپ سے راہنمائی طلب کی جاتی ہے۔

(۲)۔ اس دور میں جمعہ کی شرائط آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے کیا ہیں؟

(۳)۔ کیا جمعہ کی شرائط میں موجودہ دور میں بھی سلطان اور قاضی کی شرط ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟ موجودہ دور میں تو ناظم، نائب ناظم وغیرہ ہوتے ہیں۔

(۴)۔ جمعہ سلطان قائم کرتا ہے جبکہ آجکل تو امام مسجد ہی پڑھاتے ہیں۔ آپ پورے مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ کے درست ہونے کیلئے شہر یا قصبہ ہونا ضروری ہے جس میں تمام حوائج اصلیہ پورے ہوں وہاں گلی کوچے ہوں محلے ہوں، ضروریات ہمیشہ میسر ہوں۔ حکیم یا ڈاکٹر ہو، ڈاکخانہ ہو، حاکم یا پنچایت کا انتظام ہو، ضروری پیشہ ور موجود ہوں۔ مذکورہ سہولیات جتنی تعداد کی آبادی میں میسر ہوں وہاں جمعہ درست ہے تعداد کی متعین مقدار منقول نہیں ہے۔

(۱)۔ لہٰذا جہاں ان شرائط کے فقدان کے باوجود جمعہ شروع کیا گیا وہاں نماز جمعہ ادا نہیں ہوگی بلکہ ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے اور صرف انتشار کے خوف سے یا یہ کہ لوگ پھر مسجد آنا چھوڑ دیں گے خروج عن المذہب درست نہیں بلکہ لوگوں کو حکمت ومصلحت سے سمجھائیں اور ظہر کی نماز پڑھنے کیلئے تیار کریں۔

(۲)۔ اس دور میں جمعہ کی شرائط آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے وہی ہیں جو کہ اوپر مذکور ہیں۔

(۳)۔ جمعہ کی شرائط میں سلطان اور قاضی کی جو شرط رکھی گئی تھی وہ رفع منازعت کیلئے تھی لیکن اگر سلطان اور قاضی ان امور میں سستی سے کام لیتے ہیں جیسا کہ آجکل ہے تو پھر لوگ جس امام پر متفق ہو جائیں وہی نماز جمعہ پڑھائے اور سلطان یا قاضی کی اجازت ضروری نہیں۔

(۴)۔ آجکل کے حکمران چونکہ دینی امور میں سستی سے کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ان میں امامت کی شرائط نہیں پائی جاتیں لہٰذا امام مسجد ہی نماز جمعہ پڑھائے۔

لما فی احکام القرآن للجصاص (۳/۴۴۵): إتفق فقهاء الأمصار على أن الجمعة مخصوصة بموضع لايجوز فعلها فی غيره لأنهم مجمعون على أن الجمعة لاتجوز فی البوادی ومناهل الأعراب فقال

أصحابنا هی مخصوصة بالامصار ولاتصح فی السواد...... قال أبو بكر روى عن النبی ﷺ أنه قال لا جمعة ولا تشريق إلا فی مصر جامع وروى عن علی مثله وايضاً لو كانت الجمعة جائزة فی القرى لورد النقل به متواترا كوروده فی الأمصار لعموم الحاجة إليه وايضاً لما اتفقوا على امتناع جوازها فی البوادی لأنها ليست بمصر وجب مثله فی السواد وروى أنه قيل للحسن أن الحجاج أقام الجمعة بالأهواز فقال لعن الله الحجاج يترک الجمعة فی الأمصار ويقيمها فی حلاقيم البلاد.

وفی الفقه النافع(۱/۲۷۴):لاتصح الجمعة إلافی مصر جامع للحديث لاجمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا فی مصر جامع ويجوز فی مصلى المصر لإتصاله به ولا يجوز فی القرى ولا تجوز إقامتها إلا للسلطان أو من أمره السلطان لأن كل واحد يتقدم أو يقدم رجلا فيؤدى إلى المنازعة المبطلة للجمعة.

وفی الشامية(۲/۱۳۸): وعبارة القهستانی تقع فرضاً فی القصبات والقرى الكبيرة التی فيها أسواق ...... وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز فی الصغيرة التی ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كما فی المضمرات والظاهر أنه اريدبه الكراهة لكراهة النفل بالجماعة الا ترى أن فی الجواهر لوصلوا فی القرى لزمهم أداء الظهر.

وفی الدر المختار مع الشامية(۲/۱۴۳): (ونصب العامة) الخطيب (غير معتبر مع وجود من ذكر) أمامع عدمهم فيجوز للضرورة. وفی الشامی تحت (قوله فيجوز للضرورة) ومثله مالومنع السلطان أهل مصر أن يجمعوا إضراراً وتعنتاً فلهم أن يجمعوا على رجل يصلی بهم الجمعة.

وفی الشامية تحته: (قوله مالو منع السلطان الخ) ونقل شيخنا عن عقد اللآلی أنه لو تعذر الا ستئذان من السلطان كما فی هذا الزمان من عدم إلتفات السلاطين لمثل تلک الأمور فاجتمعت الناس على شخص ليصلی بهم جاز.

(۳۴۶) گاؤں میں ۴۰، ۵۰ سال سے جاری جمعہ موقوف کرنے پر فتنہ کا اندیشہ ہوتو کیا کرے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں صوبہ سرحد ضلع کوہاٹ کے نواح میں پنڈی روڈ پر واقع ہے جس کی آبادی تقریباً 1500 کے لگ بھگ ہے جس میں ضروریاتِ زندگی کیلئے چھ دوکانیں، ایک میڈیکل کلینک، ایک موچی کی اور ساتھ ہی ایک ٹیلرز کی دوکان بھی ہے۔ تین مسجدیں جن میں سے دو میں نمازیں ہوتی ہیں اور ایک بالکل ویران ہے۔ اور گاؤں میں گاڑیوں کی سہولت کے ساتھ فون کی سہولت بھی میسر ہے اور اس کے علاوہ آٹے کی مشینیں بھی موجود ہیں۔ ان تمام سہولتوں کے

باوجود اکثر ضروریات زندگی کیلئے شہر جانا پڑتا ہے اور بڑے مریضوں کو شہر لے جایا جاتا ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ اس گاؤں میں تقریباً ۴۰۔۵۰ سال سے جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں: آیا اس گاؤں میں جمعہ کی نماز کے بارے میں کیا حکم ہے ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض مفتیان صاحبان نے عدم جواز کا حکم دیا ہے جبکہ اس کے روکنے میں فتنہ اور فساد کا قوی اندیشہ ہے اس لئے کہ اس گاؤں میں فرقۂ مخالف کے لوگ (یعنی بریلوی حضرات) موجود ہیں اگر اس کو روکا جائے اگرچہ روکنا ممکن نہیں لیکن بالفرض پھر بھی اگر روکا جائے تو فرقۂ مخالف والے اپنی مسجد میں جمعہ شروع کردیں گے جس سے مزید فتنہ اور فساد پھیلنے کا سخت اندیشہ ہے، اس کا خیال رکھتے ہوئے اس مذکورہ مسئلے کا تفصیلی جواب ارسال کر کے احسان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....(۱)۔نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ جگہ جہاں نمازِ جمعہ ادا کی جارہی ہے شہر ہو، اور شہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہزاروں کے لگ بھگ لوگ بستے ہوں، مختلف محلے اور بازار ہوں، ضروریات زندگی کو پورا کرنے کیلئے سہولیات میسر ہوں، لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ اس جگہ پر جہاں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے شہر کی تعریف صادق نہیں آتی جیسا کہ سوال سے واضح ہے۔اس لئے وہاں جمعہ کی نماز ازروئے فقہ حنفی جائز نہیں ہے۔

(۲).....اگر نماز جمعہ کی ادائیگی سے روکنے میں فتنہ وفساد کا قوی اندیشہ ہو تو اس صورت میں حکومتِ وقت یا اُس کے نائب سے اجازت لے کر نمازِ جمعہ کی ادائیگی جائز ہوجائے گی۔

لما فی المصنف لعبد الرزاق(۱۶۷/۳): عن الحارث عن علی قال: لاجمعة ولاتشریق الا فی مصر جامع.

وفی الدر المختار(۱۳۸/۲):وفی القهستانی: اذن الحاکم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعة اتفاقاً علی ماقاله السرخسی واذا اتصل به الحکم صار مجمعاً علیه فلیحفظ.

(۳۴۷) چھوٹی بستی میں قائم نماز جمعہ کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں تقریباً پندرہ بیس سال سے جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ جبکہ ہمارے گاؤں کی آبادی تقریباً بالغ افراد ۳۵۰ ہوں گے اور ۱۱۰ گھر ہیں۔اور دو دکانیں ایک پی سی او، ایک میڈیکل اسٹور اور بن چکی ہیں، نیز لڑکوں کا ہائی اسکول اور لڑکیوں کا مڈل اسکول بھی ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ

(۱)۔کیا مذکورہ گاؤں میں نماز جمعہ ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۲)۔بصورت عدم جواز کیا اس نماز جمعہ کے ادا کرنے سے منع کرنا درست ہے یا منع نہ کیا جائے۔جبکہ اس ممانعت میں لوگوں کے انتشار کا خوف اور اندیشہ ہو۔تو کیا ایسی صورت میں شوافع کے مذہب کے مطابق جواز کا فتویٰ دینا درست ہے یا نہیں؟

(۳)۔بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کفایت المفتی وغیرہ میں توسع سے کام لیا ہے۔تو کیا اس توسع کو بطور دلیل پیش کرنا درست

ہے؟ جبکہ اس صورت میں چند خرابیاں لازم آتی ہیں جیسے کہ احسن الفتاویٰ میں مذکور ہیں۔
۱) نفل کی جماعت کا التزام لازم آتا ہے۔ ۲) نفل نہار میں جہر۔ ۳)۔غیر لازم کا التزام۔ ۴) ترک جماعت نماز ظہر جبکہ جمعہ درست نہ ہو۔ ۵)۔اگر کوئی ظہر نہ پڑھے تو ترک فریضہ لازم آتا ہے جو کہ فسق ہے۔
نیز احتیاط الظہر ادا کرنا کیسا ہوگا جائز یا ناجائز؟ قرآن وسنت اور فقہ حنفی سے مدلل جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ کے واجب ہونے کیلئے شہر کا ہونا شرط ہے۔قصبات اور بڑی بستیاں بھی شہر کے حکم میں ہیں۔قصبہ اور بڑی بستی کی فقہاء کرام نے مختلف علامات بیان کی ہیں۔جیسا کہ بدائع میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

(۱)۔ صورت مسئولہ میں، چونکہ آپ کے گاؤں میں ان علامات میں سے کوئی علامت موجود نہیں ہے لہٰذا یہ بڑی بستی میں داخل نہیں ہے بلکہ قریہ صغیرہ (چھوٹی بستی) ہے اور چھوٹی بستی میں باتفاق فقہاءِ احناف جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔لہٰذا مذکورہ گاؤں میں جمعہ ادا کرنا درست نہیں۔البتہ اگر حاکم اجازت دے دے تو پھر جمعہ درست ہوسکتا ہے۔

(۲)۔ بحالت موجودہ، جب جمعہ درست نہیں ہے تو لوگوں کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ نماز جمعہ کے ادا کرنے سے منع کیا جائے۔اس لئے کہ جمعہ کے ادا کرنے سے ظہر کی نماز ذمہ سے ساقط نہ ہوگی بلکہ ظہر کا ادا کرنا لازم ہوگا۔ایسی صورت میں شوافع کے مذہب کے مطابق جواز کا فتویٰ دینا درست نہیں ہے اس لئے کہ مذہب غیر پر فتویٰ ضرورت شدیدہ کی وجہ سے دیا جاتا ہے اور اس مسئلہ میں حنفیہ کو بمذہب دیگر ائمہ عمل کرنے کی فقہاء نے اجازت نہیں دی۔

(۳)۔ اور کفایت المفتی میں جواز کے بارے میں توسع سے کام لینا حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی ذاتی رائے اور تفرد ہے۔حضرت کے علاوہ کسی نے بھی جواز کا قول نہیں کیا ہے بلکہ سب عدم جواز کے قائل ہیں۔لہٰذا اس توسع کو بطور دلیل پیش کرنا درست نہیں ہے۔

رہا احتیاط الظہر کا مسئلہ! تو اس کا پڑھنا وہاں ہوتا ہے جہاں جمعہ کے جواز میں شہر وغیرہ ہونے یا نہ ہونے میں شک واقع ہو جائے اور وہاں کے لوگوں نے جمعہ قائم کرنا شروع کر دیا ہو، جبکہ یہاں پر یہ بات یقینی ہے کہ آپ کا گاؤں شہر یا بڑی بستی نہیں ہے بلکہ چھوٹی بستی ہے لہٰذا ظہر کی نماز ہی پڑھی جائے گی۔

لما فی الفقه النافع (۱/۲۷۴): لاتصح الجمعة الافی مصر جامع للحدیث: ((لا جمعة ولا تشریق (ولا فطر ولا اضحی) الافی مصر جامع)) ویجوز فی مصلی المصر لاتصاله به ولا یجوز فی القری.

وفی بدائع الصنائع(۲/۱۸۸،۱۸۹،۱۹۰): اما المصر الجامع: فشرط وجوب الجمعة، وشرط صحة ادائها عند اصحابنا...... فلا تجب علی اهل القری التی لیست من توابع المصر، ولا یصح اداء الجمعة فیها ......(صـ۱۸۹) اما المصر الجامع: فقد اختلفت الاقاویل فی تحدیده. ذکر الکرخی ان المصر الجامع ما اقیمت فیه الحدود، ونفذت فیه الاحکام. وعن ابی یوسف روایات، ذکر فی

"الاملاء": كل مصر فيه منبر وقاض ينفذ الاحكام ويقيم الحدود، فهو مصر جامع، تجب على اهله الجمعة. وفي رواية: قال: اذا اجتمع في قرية من لايسعهم مسجد واحد. بنى لهم الامام جامعا، ونصب لهم من يصلي بهم الجمعة. وفي رواية: ((لو كان في القرية عشرة آلاف اواكثر. امرتهم باقامة الجمعة فيها)) وقال بعض اصحابنا: المصر الجامع مايتعيش فيه كل محترف بحرفته من سنة الى سنة، من غير ان يحتاج الى الانتقال الى حرفة اخرى. وعن ابى عبدالله البلخي، انه قال: احسن ما قيل فيه: اذا كانوا بحال لو اجتمعوا في اكبر مساجد هم لم يسعهم ذلك، حتى احتاجوا الى بناء مسجد الجمعة، فهذا مصر تقام فيه الجمعة، وقال سفيان الثورى: المصر الجامع مايعده الناس مصرا عند ذكر الامصار المطلقة. وسئل ابو القاسم الصفار عن حد المصر الذى تجوز فيه الجمعة، فقال: ان تكون لهم منعة لو جاء هم عدو قدروا على دفعه، فحينئذ جاز ان يمصر، وتمصره ان ينصب فيه حاكم عدل يجرى فيه حكما من الاحكام، وهو ان يتقدم اليه خصمان فيحكم بينهما و روى عن ابى حنيفة رحمه الله : انه بلدة كبيرة، فيها سكك واسواق، ولهارساتيق، وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره، والناس يرجعون اليه فى الحوادث، وهو الاصح.

وفي الدر المختار(۲/۱۳۷): (ويشترط لصحتها) سبعة اشياء: الاول: (المصر وهو مالايسع اكبر مساجده اهله المكلفين بها) وعليه فتوى اكثر الفقهاء مجتبى لظهور التوانى فى الاحكام، وظاهر المذهب انه كل موضع له امير وقاض يقدر على اقامة الحدود كما حررناه فيما علقناه على الملتقى. وفي القهستاني: اذن الحاكم ببناء الجامع في الرستاق اذن بالجمعة اتفاقا على ماقاله السرخسي واذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه فليحفظ. وقال العلامة ابن عابدين الشامى رحمه الله تحته (قوله وفى القهستانى الخ) تأييد للمتن. وعبارة القهستانى تقع فرضافى القصبات والقرى الكبيرة التى فيها اسواق قال ابو القاسم: هذا بلا خلاف اذا اذن الوالى او القاضى ببناء المسجد الجامع واداء الجمعة لان هذا مجتهد فيه فاذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه، وفيما ذكرنا اشارة الى انه لا تجوز فى الصغيرة التى ليس فيها قاض وممبر وخطيب كمافى المضمرات والظاهر انه اريدبه الكراهة لكراهة النفل بالجماعة، الاترى ان فى الجواهر لوصلوافى القرى لزمهم اداء الظهر الخ.

وفي الصفحة ۱۴۵ من باب الجمعة: فيصلي بعدها اخر ظهر وكل ذلك خلاف المذهب، فلا يعول عليه كما حرره في البحر. وقال العلامة الشامى تحته (قوله فيصلى بعدها اخرظهر)...... وقال في البحر: انه لا احتياط فى فعلها لانه العمل باقوى الدليلين اهـ اقول : وفيه نظر بل هو الاحتياط

بمعنى الخروج عن العهدة بيقين لان جواز التعدد وان كان ارجح واقوى دليلا، لكن فيه شبهة قوية لان خلافه مروى عن ابى حنيفة ايضا.....(ص ۱۴۶) نعم ان ادى الى مفسدة لاتفعل جهارا والكلام عند عدمها ولذا قال المقدسى نحن لانامر بذلك امثال هذه العوام بل ندل عليه الخواص ولو بالنسبة اليهم اهـ والله تعالىٰ اعلم۔

(۳۴۸) گاؤں میں نمازِ جمعہ درست نہیں

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جواز صلوٰۃ الجمعہ کے بارے میں درج ذیل صفات سے موصوف بستی کان مہترزئی جو کہ پہاڑ کے دامن میں کوئٹہ، ژوب شاہراہ پر واقع ہے بلوچستان کے سردترین علاقوں میں سے ہے اور سردیوں میں کافی برف باری ہوتی ہے۔قریہ ہذا تقریباً ایک مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل ہے۔جن میں کل ۳۹۳ گھر جن میں ۱۶ مساجد ہیں۔اور گاؤں کے وسط میں ایک بڑی پکی مسجد جس کی لمبائی ۹۱ فٹ اور چوڑائی ۴۵ فٹ ہے تعمیر کی گئی ہے۔اوران میں بالغ مرد کی تعداد ۱۴۵۴، بالغ عورتیں ۱۳۷۷، اور نابالغ بچوں کی تعداد ۲۲۸۵ ہے۔کہیں کہیں گھروں میں اتصال اور گلیاں موجود ہیں۔لیکن اکثر جگہوں پر گلیاں اور کوچے نہیں باغات اور زرعی زیرکاشت رقبہ گھروں کے درمیان فاصل بن رہی ہے۔دوتین گھروں کے علاوہ تمام مکانات کچی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔پندرہ سے بیس گھروں کے مکانوں کی چھت سٹیل کی چادر اور باقی مکانوں کی چھت جڑی بوٹیوں کی بنی ہوئی ہے۔اراضی کے سیرابی باغات کیلئے ایک قدرتی چشمہ بہتا ہے۔جس کے پانی کے لئے نالیاں بستی کے وسط تک پکی بنائی گئی ہیں۔اوراس کے علاوہ دو سو سے زائد ٹیوب ویل سیرابی باغات کیلئے مصروف عمل ہیں۔بستی میں تین دینی مدارس ہیں جن میں مقامی اور باہر کے طلبہ زیر تعلیم ہیں۔لڑکوں کی عصری تعلیم کیلئے ایک ہائی اسکول اور پانچ پرائمری اسکول ہیں۔جبکہ لڑکیوں کیلئے ایک ہائی اسکول اور تین پرائمری گرلز اسکول ہیں۔اور عوام کی سہولت کیلئے ایک ہزار لائن کا ڈیجیٹل سسٹم ایکسچینج ہے جس سے تین سو کے قریب ٹیلیفون کنکشن لگے ہوئے ہیں۔صحت کیلئے ایک ڈسپنسری بنائی گئی ہے۔جس میں ایک مستند ایم بی بی ایس ڈاکٹر ایک LHV اور ڈسپنسر کام پر مامور ہیں۔یہاں ڈاکٹر کی رہائش کا انتظام نہیں اس لئے وہ ۲۵ کلومیٹر مسلم باغ سے آتا جاتا ہے۔اور ایمبولینس بھی ساتھ رکھتا ہے لیکن ادویات کے فقدان کی وجہ سے کم لوگ اس سے استفادہ کررہے ہیں۔بستی کے باشندوں کی ضروریات کیلئے آب نوشی سکیم کے تحت تین ٹیوب ویل حکومت کی طرف سے لگے ہوئے ہیں جو کہ اب معطل ہیں۔بستی کے وسط میں پانچ سے زائد میڈیکل اسٹور ہیں جن میں ڈسپنسر لوگوں کے معمولی علاج معالجے کیلئے کوشش کرتے ہیں۔اور ادویات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔پانچ دوکانیں گوشت کی اور تقریباً دس سے زائد سبزی فروش موجود ہیں ایک کشیدہ کاری اور پانچ درزی ٹیلرز دس پرچون اسٹورز ہیں جبکہ پانچ سے زائد گیس سلنڈر میں لاکر فروخت کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔کل تقریباً ۲۵ سے زائد دکان جن میں اتصال نہیں علاوہ ازیں بستی میں متفرق جگہوں پر عوام کی ضروریات کیلئے ۱۵ دکانیں اور ایک میڈیکل اسٹوران میں تین آٹا فروش کی دکان موجود ہے۔جن میں دوسابق راشن ڈیلررہ چکے ہیں۔لیکن مکمل ضروریات پورا کرنے کیلئے

وہ اور بازاروں کا رخ کرتے ہیں۔ نیز آہنگر، دو حمام، موٹر سائیکل مرمت، ویلڈنگ، گاڑی مرمت کی دکانیں بھی موجود ہیں۔ اور کپڑے کی دو دکانیں بھی موجود ہیں۔ اور پیٹرول، ڈیزل کے تقریباً پانچ پمپ موجود ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک بیکری اور دو چائے کے ہوٹل مستقل موجود ہیں۔ اور تین پی سی او موجود ہیں۔ جنوباً آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر قومی شاہراہ گزرتی ہے۔ جس پر موسم گرما میں عوام کی ضروریات کیلئے عارضی طور پر کریٹ گودام اور فروٹ کی ترسیلی کمپنیاں کھل جاتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ چند ہوٹل اور تندور بھی کھل جاتے ہیں۔ اور یہ چھ مہینے تک تقریباً کھلے رہتے ہیں۔ بستی سے ضرورت آمد و رفت قومی شاہراہ سے بستی کی طرف مختلف فاصلوں پر کچی اور پکی سڑکیں جاتی ہیں۔ جن میں دو مستقل اور تین سیلاب نہ ہونے کی صورت میں سیلابی ندیاں بطور سڑک استعمال کی جاتی ہیں۔ نیشنل ہائی وے پر گاؤں کے زرعی آبادی کے متصل ایک لیویز تھانہ جو مذکورہ گاؤں کے نام سے موسوم ہے (اور پولیس تھانہ نہیں ہے) جو روڈ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ لڑائی جھگڑے کی صورت میں گاؤں میں مداخلت کرتے ہیں۔ اور روڈ کے حفاظت کیلئے ایک اور لیویز چوکی موجود ہے اور یہ حکومت کو مطلع کرتی ہیں اور مذکورہ بستی سے روزانہ ایک بس اور دو ویگن کوئٹہ جاتی ہیں اور متعدد کار اور موٹر قریبی بازاروں میں جاتے ہیں۔ البتہ حکومت کی طرف سے عوام کے درمیان کوئی انصاف دار شخصیت نہیں اور اسی گاؤں کے علماء اور ملک و سردار یہ معاملے حل کرتے ہیں۔ یا پچیس کلومیٹر دور بازار جاتے ہیں۔ اور مذکورہ بستی میں ڈاکخانہ نہیں۔ دھوبی نہیں بزاز نہیں اور کسی نام سے موسوم گلی کوچے نہیں البتہ عرف میں کان مہترزئی ایک بڑے گاؤں کے نام سے مشہور ہے۔ اور آس پاس کے لوگ بھی ضروریات کیلئے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن حکومت کی طرف سے اس کو شہر یا قصبہ نہیں کہا جاتا اور بعض پیشے والے لوگ جیسے موچی، لوہار، ترکھان وغیرہ سال بھر کا گزارہ اپنے پیشے پر نہیں کر سکتے اس لئے وہ اور طرح کی محنت میں بھی مشغول ہوتے ہیں۔ اور صنعت و حرفت کیلئے بھی کام شروع ہے۔ اور مسافر خانہ نہیں، مستقل ہوٹل کھانے کا نہیں، پولیس تھانہ نہیں۔ لہٰذا مذکورہ تفصیل کے مطابق بستی مذکورہ کان مہترزئی میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ بستی کا شمار شرعی قریہ کبریٰ ہے یا صغریٰ؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... جمعہ قائم کرنے کی شرائط میں سے شہر یا بڑی بستی (جس میں گلیاں، عدالت، حکومت کی طرف سے قاضی، مستقل پولیس تھانہ، بازار، محلے، ڈاکخانہ، حکیم یا ڈاکٹر، اور لوگوں کی تمام ضروریات زندگی سہولت کے ساتھ میسر ہوں) کا ہونا ضروری ہے۔ وگرنہ جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بستی کان مہترزئی کا شمار بڑی بستی میں مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر نہیں ہوسکتا اور وہ یہ ہیں کہ (۱) اکثر جگہوں میں گلیاں نہیں ہیں۔ (۲) عدالت نہیں ہے۔ (۳) حکومت کی طرف سے کوئی قاضی مقرر نہیں ہے۔ (۴) مستقل پولیس تھانہ نہیں ہے۔ (۵) بازار، محلے، ڈاکخانہ، اور حکیم یا ڈاکٹر اس طور پر نہیں ہیں کہ ان سے لوگوں کی ضروریات سہولت کے ساتھ پوری ہو جائیں نیز ادویات کی فراہمی اور ایمرجنسی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔ اور یہ ساری وجوہات ضرورت اصلیہ میں شامل ہیں۔ اسی بناء پر یہاں جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔

لمافي مصنف عبدالرزاق (۱۶۷/۳): عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: لاجمعة ولاتشریق الافی مصر جامع.

وفی الفتاویٰ التاتارخانية(۲/ ۴۹): ظاهر المذهب ان المصر الجامع ان يكون فيه جماعات الناس وجامع واسواق التجارات وسلطان وقاض يقيم الحدود وينفذ الاحكام...... وروی عن ابی حنيفة رحمه الله تعالیٰ وهو بلدة كبيرة فيها سكک واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غيره ويرجع الناس اليه فيما وقع لهم من الحوادث وهذا هو الاصح.

وفی الشامية (۲/ ۱۳۷): "قوله وظاهر المذهب" قال فی شرح المنية والحد الصحيح ما اختاره صاحب الهداية انه الذی له امير وقاض ينفذ الاحكام ويقيم الحدود .... عن ابی حنيفة رحمه الله تعالیٰ انه بلدة كبيرة فيها سكک واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الاصح.

وفيه ايضاً(۲/ ۱۳۸): قوله وفی القهستانی الخ تأييد للمتن وعبارة القهستانی تقع فرضا فی القصبات والقرى الكبيرة التی فيها اسواق قال ابو القاسم: هذا بلا خلاف اذا اذن الوالی او القاضی ببناء المسجد الجامع واداء الجمعة لان هذا مجتهد فيه فاذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه وفيما ذكرنا اشارة الی انه لا تجوز فی الصغيرة التی ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كمافی المضمرات والظاهر انه اريد به الكراهة ...... الا ترى ان فی الجواهر لو صلوا فی القرى لزمهم اداء الظهر وهذا اذا لم يتصل به حكم. وفی (صـ ۱۳۹) فقد نص الائمة على ان الفناء ما اعد لدفن الموتی وحوائج المصر كركض فيه نظر والدواب وجمع العساكر والخروج للرمی وغير ذلک وای موضع يحد بمسافة يسع عساكر مصر ويصلح ميدانا للخيل والفرسان ورمی النبل و البندق البارود واختيار المدافع......فظهر ان التحديدبحسب الامصار......وقد جزم فيها بصحة الجمعة فی مسجدسبيل علان الذی بناه بعض امراء زمانه وهو فی فناء مصر بينه وبينها نحو ثلاثة اربا ع فرسخ وشیئ.

وفی الموسوعة الفقهية(۳۳/ ۱۶۱): المصر فی اللغة: اسم لكل بلد محصور ای محدود تقام فيها الدور والاسواق والمدارس وغيرها من المرافق العامة ويقسم فيها الفئ والصدقات. واختلفوا فی معناها الاصطلاحی، فعن ابی حنيفة رحمه الله تعالیٰ: ان المصر بلدة كبيرة فيها سكک واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره والناس يرجعون فی الحوادث اليه...... وقال القليوبی: المصر العمارة المجتمعة الذی فيه حاكم شرعی

وشرطی واسواق للمعاملات والمصر اعظم من القریة.

(۳۴۹) جس عذر کی وجہ سے نمازِ جمعہ ترک کرنا جائز نہیں

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر بجلی وغیرہ کے بل کی آخری تاریخ آجائے اور دن جمعہ کا ہو، اور بل بھرنے کی قطار بھی کافی طویل ہو، اور جمعہ کی نماز پڑھنے جانے کی صورت میں نمبر نکل جانے اور پھر کافی مشقت کا سامنا کرنے کا اندیشہ ہو تو اس عذر کی بنا پر جمعہ کی نماز چھوڑنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز جمعہ ہر اس مسلمان مرد پر فرض ہے جس میں چند شرائط موجود ہوں، آزاد ہونا مقیم ہونا، تندرست ہونا، خوف کا نہ ہونا۔ اس لئے صورت مسئولہ میں نمازِ جمعہ مذکورہ عذر کی وجہ سے چھوڑنا جائز نہیں۔

لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۳۴۵): (قوله فلا یکره) أی صلوة الظهر واما تفویت الجمعة فحرام، بحر:

وفی رد المحتار (۲/۱۵۵): (قوله وحرم الخ) عدل عن قول القدوری والکنز وکره لقول ابن الهمام لابد من کون المراد حرم لانه ترک الفرض القطعی باتفاقهم الذی هو آکد من الظهر غیر أن الظهر تقع صحیحة وان کان مأمورا بالإعراض عنها. وأجاب فی البحر بان الحرام هو ترک السعی المفوت لها..... (قوله فلا یکره) بل هو فرض علیه لفوات الجمعة قال فی البحر فنفس الصلوة غیر مکروهة وتفویت الجمعة حرام و هو مؤید لما قلنا، یعنی ان الکراهة لیست لذات الصلوة بل لخارج عنها وهو کونها سببا، لتفویت الجمعة بدلیل انه لو صلاها بعد فوت الجمعة لم یکره فعلها بعدها بل یجب.

(۳۵۰) عذر کی وجہ سے ایک مسجد میں دو مرتبہ نمازِ جمعہ قائم کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک عزیز جو امریکہ میں ہیں ان سے بات ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے میری وساطت سے ایک مسئلہ آپ حضرات سے معلوم کرایا ہے کہ امریکہ، کینیڈا اور دیگر ممالک میں مسجدیں جہاں بہت کم ہیں یا چھوٹی ہیں تو عام طور ان مسجدوں میں نماز دو بار ہوتی ہے جو لگ بھگ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے وقفے سے ہوتی ہے ایک مسجد میں دوبارہ نماز جمعہ وخطبہ کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ براہ کرم مسئلہ کا جواب بحوالہ جلد مرحمت فرما کر ممنون ہوں، تاکہ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں یا غلط کرتے ہیں وہ صحیح مسئلہ سے واقف ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... جمہور حضرات فقہاء کے نزدیک مسجد کے اندر ایک نماز خواہ وہ جمعہ کی ہو یا کوئی اور اس کی جماعت ثانیہ مکروہ ہے۔ البتہ اگر کوئی مسجد جو کسی راستے وغیرہ پر واقع ہو یا وہ مسجد ایسی ہو، جس میں امام اور مؤذن مقرر نہ ہوں تو ایسی مساجد میں تکرار جماعت جائز

ہے۔

ہاں اگر کوئی ایسا علاقہ ہے جہاں مساجد بہت کم ہیں یا بہت چھوٹی ہیں ان میں ایک ہی مرتبہ جماعت کرنا ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ دوسری جماعت کی صورت پہلی جماعت سے کچھ مختلف ہو۔ اس کی صورت یہ ہوگی پہلی جماعت جہاں ہوئی ہے دوسری جماعت اس سے ذرا ہٹ کر ادا کی جائے۔

لمافی البدائع الصنائع(۱/۱۵۳): ولو صلی فی مسجد باذان واقامة هل يكره أن يؤذن ويقام فيه ثانياً هذا لا يخلو من احد وجهين، اما ان كان مسجداً له اهل معلوم او لم يكن فان كان له أهل معلوم فان صلّى فيه غير أهله باذان واقامة لا يكره لاهله ان يعيد والاذان والاقامة وان صلى فيه أهله باذان واقامة أو بعض اهله يكره لغير أهله وللباقين من اهله ان يعيد والاذان والاقامة. وان كان مسجداً ليس له اهله معلوم بان كان على شوارع الطريق لا يكره تكرار الاذان واقامة.

ولنا ماروى عبدالرحمن ابن ابى بكرة رضى الله تعالىٰ عنه عن ابيه ان رسول الله ﷺ خرج من بيته ليصلح بين الانصار لتشاجر بينهم فرجع وقد صلى فى المسجد بجماعة فدخل رسول الله ﷺ فى منزل بعض أهله فجمع أهله فصلى بهم جماعة ولو لم يكره تكرار الجماعة فى المسجد لماتركها رسول الله ﷺ مع علمه لفضل الجماعة فى المسجد.

وروى انس بن مالك رضى الله تعالىٰ عنه ان اصحاب رسول الله ﷺ كانوا اذا فاتتهم الجماعة صلوا فى المسجد فرادى ولان التكرار يؤدى الى تقليل الجماعة لان الناس اذا علموا انهم تفوتهم الجماعة فيستعجلون فتكثر الجماعة واذا علموا أنها لاتفوتهم يتأخرون فتقل الجماعة وتقليل الجماعة مكروه الخ.

وفى الشامية(۱/۳۹۵): (وتكرار الجماعة) لما روى عبدالرحمن بن ابى بكرة عن ابيه رضى الله تعالىٰ عنهما "أن رسول الله ﷺ خرج من بيته ليصلح بين الانصار فرجع وقد صلى فى المسجد بجماعة فدخل رسول الله ﷺ فى منزل بعض أهله فجمع أهله فصلى بهم جماعة، ولو لم يكره تكرار الجماعة فى المسجد لصلى فيه وروى عن أنس رضى الله عنه ان اصحاب رسول الله ﷺ كانوا اذا فاتتهم الجماعة فى المسجد صلوا فى المسجد فرادى، ولان التكرار يؤدى إلى تقليل الجماعة لان الناس اذا علموا أنهم تفوتهم الجماعة يتعجلون فتكثر والا تأخروا. وحينئذ فلو دخل جماعة المسجد بعد ماصلى فيه أهله فانهم يصلون واحداناً وهو ظاهر الرواية الخ وعن ابى يوسف رحمه الله تعالىٰ اذا لم تكن على الهيئة الاولىٰ لاتكره والاتكره وهو الصحيح وبالعدول عن

المحراب تختلف الهيئة كذا في البزازية اهـ وفي التاتارخانية عن الولوالجية، وبه ناخذ فقط.

وفيه ايضاً (۱/۵۵۲): (قوله ويكره) اى تحريما لقول الكافي لايجوز، والمجمع لايباح، وشرح الجامع الصغير إنه بدعة كما في رسالة السندى(قوله بأذان وإقامة الخ) عبارته في الخزائن: أجمع مماهنا ونصبها: يكره تكرار الجماعة في مسجد محلة بأذان وإقامة، إلا اذا صلى بهما فيه أولا غير أهله او أهله لكن بمخافتة الاذان، ولو كرر أهله بدونهما اوكان مسجد طريق جاز اجماعا، كما في مسجد ليس له امام ولامؤذن ويصلي الناس فيه فوجا فوجا، فان الافضل ان يصلي كل فريق باذان واقامة على حدة كما في أمالي قاضيخان اهـ.

(۳۵۱) عیدین میں سجدہ سہو کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عالم صاحب فرما رہے تھے کہ اگر عیدین کی زائد تکبیرات چھوٹ جائیں تو سجدۂ سہو کرنا لازمی نہیں ہے حالانکہ میں نے سنا ہے کہ تکبیرات واجب ہیں اور واجب کے چھوٹ جانے کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے تو کیا ان عالم کی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... تکبیرات عیدین چونکہ واجب ہیں اس لئے ان کے چھوٹ جانے کی صورت میں سجدہ سہو واجب ہوتا ہے لیکن جمعہ وعیدین میں مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کرنے میں انتشار اور فتنہ کا خدشہ ہوتا ہے اس لئے متاخرین فقہاء کرام کے نزدیک سجدہ سہو کرنا لازم نہیں، اور بظاہر عالم صاحب کی مراد بھی یہی معلوم ہوتی ہے تاہم اگر فتنہ اور انتشار کا خدشہ نہ ہو یا مجمع چھوٹا ہو تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنا لازم ہوگا۔

لمافي الهندية(۱/۱۲۸): ويستوى في الزيادة والنقصان القليل والكثير فقد روى عن الحسن عن ابي حنيفة رحمه الله اذا سها الإمام عن تكبيرة واحدة في صلاة العيد يسجد للسهو كذا في الذخيرة السهو في الجمعة والعيدين والمكتوبة والتطوع واحد إلا أن مشايخنا قالوا لايسجد للسهو في العيدين والجمعة لئلايقع الناس في فتنة.

وفي الدر المختار(۲/۹۲): (والسهو في صلاة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء) والمختار عند المتأخرين عدمه في الأوليين لدفع الفتنة.

وفي الشامية(۲/۹۲): (قوله عدمه في الأوليين) الظاهر ان الجمع الكثير فيما سواهما كذلك كما بحثه بعضهم وكذا بحثه الرحمتي وقال خصوصاً في زماننا وفي جمعة حاشية ابي السعود عن العزمية انه ليس المراد عدم جوازه بل الاولىٰ تركه لئلا يقع الناس في فتنة (قوله وبه جزم في الدرر)

لکنه قیده محشیها الوانی بما اذا حضر جمع کثیر وإلا فلا داعی الی الترک.

(۳۵۲) شافعی امام کے پیچھے نمازِ عید کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ عید میں حنفی مذہب کے لوگ شافعی مذہب کے امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....حنفی مذہب کے لوگ شافعی مذہب کے امام کے پیچھے نمازِ عید پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ امام مواضع اختلاف میں حنفی مقتدی کے مذہب کی رعایت کرتا ہو۔

لمافی الهندية(۸۴/۱): والاقتداء بشافعی المذهب انما یصح اذا کان الامام یتحا می مواضع الخلاف بان یتوضأ من الخارج النجس من غیر السبیلین کالفصد وان لا ینحرف عن القبلة انحرافاً فاحشاً..... قال الفضلی یصح اقتداء الحنفی فی الوتر بمن یری مذهب أبی یوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ.

وفی الشامية(۷/۲): (قوله ان لم یتحقق الخ) فلو راه احتجم ثم غاب فالاصح انه یصح الاقتداء به لانه یجوز ان یتوضأ احتیاطا وحسن الظن به اولی بحر عن الزاهدی (قوله کما بسطه فی البحر) حیث ذکر ان الحاصل انه ان علم الاحتیاط منه فی مذهبنا فلا کراهة فی الاقتداء به وان علم عدمه فلا صحة وان لم یعلم شیئاً کره.

(۳۵۳) خواتین کیلئے جمعہ کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خواتین جمعے کے دن مسجد میں آ کر جمعہ کی نماز پڑھتی ہیں حالانکہ ان پر ظہر واجب ہے تو انکا جمعہ پڑھنا شرعاً کیسا ہے اور ان کی ظہر اس سے ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....عورتوں کا نماز جمعہ کے لئے باہر جانا خوف فتنہ کی وجہ سے ناجائز ہے البتہ اگر انہوں نے نماز جمعہ باجماعت ادا کی تو ظہر ان سے ساقط ہو جائیگی۔

وفی خلاصة الفتاویٰ (۲۱۴/۱): ولا یخرج الشاب من النساء فی جمیع الصلوات واما العجوز فتخرج فی العیدین والفجر والعشاء.....وقد ذکرنا الجواب المختار فی زماننا انهن لا یخرجن.

وفی الهندية (۱۴۴/۱، ۱۴۵): لاتجب الجمعة علی العبید والنسوان والمسافرین والمرض کذا فی محیط السرخسی.......... ومن لا جمعة علیه ان أدّاها جاز عن فرض الوقت کذا فی الکنز.

(۳۵۴) عورتوں کیلئے عیدگاہ جانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں چند سالوں سے غیر مقلدین آئے ہوئے ہیں پورے گاؤں کو خراب کرر ہے ہیں کافی لوگ ان کے چکر میں پھنس گئے ہیں اس مرتبہ انہوں نے عید نماز کیلئے اپنی عورتوں کو بھی عید نماز پڑھنے کا حکم دیا کہ جس طرح مردوں پر نماز عید واجب ہے اسی طرح عورتوں پر بھی واجب ہے اگر عورتیں نماز عید نہیں پڑھیں گی تو گناہگار ہوں گی کیا واقعی عورتوں پر نمازِ عید واجب ہے؟ اور عورتوں کے نماز عید کیلئے عیدگاہ جانے کا ثبوت کسی روایت سے ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... عید کی نماز مردوں پر واجب ہے عورتوں پر عید کی نماز واجب نہیں۔ رہی یہ بات کہ عورتوں کا عیدگاہ میں جانا، تو اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ امن تھا اور کوئی فتنے کا خوف نہ تھا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مساجد اور عیدگاہ میں جانے کی اجازت دی تھی۔ بخاری وترمذی کی روایت ہے کہ حضرت امّ عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہمیں عیدگاہ جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن جب فتنوں کا دور بڑھا تو عورتوں کو مساجد جانے سے روک دیا گیا اور گھر میں نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب عورتوں کو مساجد جانے سے روکا تو عورتوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی تو حضرت عائشہ نے فرمایا اگر حضور علیہ الصلاۃ والسلام یہ جان لیتے جو عمر کو معلوم ہے تو وہ تمہیں نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان حالات کو پالیتے جو آج عورتوں کے ساتھ پیش آرہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ضرور مسجد جانے سے منع فرمادیتے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں نہ عورتوں پر عید کی نماز واجب ہے اور نہ ہی ان کا عیدگاہ جانا درست ہے۔

لمافی اعلاء السنن(۴/۱۶۲): عن امّ سلمة رضی الله عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: صلاة المرأة فی بیتها خیر من صلاتها فی حجرتها، وصلاتها فی حجرتها خیر من صلاتها فی دارها وصلاتها فی دارها خیر من صلاتها فی مسجد قومها.

وفی المحیط البرهانی(۲/۴۸۵): ولیس علی النّساء خروج فی العیدین، وکان یرخّص لهنّ فی ذالک. قال: وقال أبو حنیفة رحمه الله تعالیٰ: وامّا الیوم فانّی أکره لهنّ ذلک، وأکره لهنّ شهود الجمعة الخ.

وفیه ایضاً قال..... واعلم بانّ النساء امرن بالقرار فی البیوت، قال الله تعالیٰ "وقرن فی بیوتکن" ونهین عن الخروج، قال الله تعالیٰ: "ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الأولیٰ" الا انه ابیح لهن الخروج فی الابتداء الی الجماعات، لقوله علیه السلام "لاتمنعوا إماء الله مساجد الله ولتخرجن اذا خرجن تفلات" أی غیر متطیبّات، ثم منعن بعد ذلک لمافی خروجهن من الفتنة: قال الله تعالیٰ"ولقد علمنا

المستقدمين منكم ولقد علمنا المستأخرين" قيل في تفسير الآية: نزلت في شان النسوة كان المنافقون يتأخرون حتى يطلعوا على عورات النساء، فمنعن بعد ذالك. وقال النبي عليه الصلاة والسلام "صلاة المرأة في دارها أفضل من صلاتها في مسجد وصلاتها في بيتها افضل من صلاتها في دارها)) وعن عمر رضي الله عنه انه نهى النساء عن الخروج إلى المساجد فشكون إلى عائشة رضي الله عنها، فقالت عائشة رضي الله تعالىٰ عنها: ((لو علم النبي عليه الصلاة والسلام ما علمه عمر ما أذن لكنّ في الخروج.

وفي الدر المختار (۱/۵۶۶): (ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيد ووعظ (مطلقا) ولو عجوز اليلا(على المذهب) المفتي به لفساد الزمان.

وفي الشامي - (قوله على المذهب المفتىٰ به) أي مذهب المتأخرين. قال في البحر: وقد يقال هذه الفتوىٰ التي اعتمدها المتأخرون مخالفة لمذهب الامام وصاحبيه، فانهم نقلوا أن الشّابة تمنع مطلقاً اتفاقاً.

(۳۵۵) تکبیراتِ تشریق مرد اور عورت دونوں پر واجب ہیں

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے حج کے مسائل کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ تکبیراتِ تشریق مرد وعورتوں دونوں کو پڑھنا چاہئے۔ اپنے امام صاحب سے جب میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ دراصل اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک صرف مردوں پر ہی ہے۔ البتہ آپ کسی مفتی صاحب سے اس اختلاف کو سمجھ لیں اور فتویٰ کس کے قول پر ہے یہ بھی معلوم کرلیں۔ آنجناب سے پہلے بھی کئی مسائل کے سلسلے میں رجوع کر چکا ہوں، مہربانی فرما کر اس مسئلے کو بھی واضح اور تفصیل سے لکھ کر دیدیں، نیز فتویٰ کس کے قول پر ہے یہ بھی بتادیں بندہ آپ کا بہت ممنون ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً……تکبیراتِ تشریق کس پر واجب ہے؟ اس میں امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کا اختلاف ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ) کی صبح سے عید (دسویں ذی الحجہ) کے عصر تک ایک دفعہ تکبیر تشریق کہنا ہر مرد، عاقل، مقیم، آزاد اور شہر میں رہنے والے پر جبکہ اس نے نماز، جماعت کے ساتھ پڑھی ہو، پر واجب ہے۔ تو اس قول کے مطابق عورت، بچے، مجنون، مسافر اور دیہات میں رہنے والے پر اور اس شخص پر جس نے نفل نماز یا فرض نماز اکیلے پڑھی ہو، تکبیر تشریق پڑھنا واجب نہیں ہے۔ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک ۹/ ذی الحجہ کی صبح سے ۱۳/ ذی الحجہ کی عصر تک ہر فرض نماز پڑھنے والے پر چاہے جو بھی ہو اور جس جگہ بھی نماز پڑھی ہو، ایک دفعہ تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے۔ تو اس قول کے مطابق مرد اور عورت دونوں پر تکبیر تشریق کہنا واجب ہے۔ اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

لماقی الدرالمختار(۱۷۹/۲): ووجوبه (علی امام مقیم) بمصر (و) علی مقتد (مسافر او قروی او امرأة) بالتبعية لكن المرأة تخافت ويجب علي مقيم اقتدى بمسافر (وقالا بوجوبه فوركل فرض مطلقا) ولو منفردا او مسافرا او امرأة لانه تبع للمكتوبة (الى) عصر اليوم الخامس (آخر ايام التشريق وعليه الاعتماد) والعمل والفتوى في عامة الامصار وكافة الاعصار. الدر المختار وقال ابن عابدين الشامي رحمه الله تحته (قوله تخافت) لان صوتها عورة كمافي الكافي والتبيين...... (قوله فوركل فرض) بان ياتي به بلا فصل يمنع البناء كمامرط (قوله لانه تبع للمكتوبة) فيجب على كل من تجب عليه الصلوة المكتوبة بحر (قوله وعليه الاعتماد الخ) هذا بناء على انه اذا اختلف الامام وصاحباه فالعبرة لقوة الدليل وهو الاصح كمافي اخر الحاوى القدسي اوعلى ان قولهما في كل مسألة مروى عنه ايضا والافكيف يفتى بقول غير صاحب المذهب. وبه اندفع مافي الفتح من ترجيح قوله هنا ورد فتوى المشائخ بقولهما بحر.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۱۴۰۸/۲): فقال الحنفية: يجب على الرجال والنساء تكبير التشريق في الاصح مرة، وان زاد عليها يكون فضلا، عقب كل فرض عيني بلا فصل يمنع البناء على الصلاة (كالخروج من المسجد او الكلام او الحدث عامدا) ويؤدى بجماعة او منفردا، ولو قضاء، ويكون التكبير للرجال جهرا، وتخافت المرأة بالتكبير، ولا يكبر عقب الوتر وصلاة العيد.

ومدته: من فجر يوم عرفة الى عصر يوم العيد عند ابى حنيفة، والى صلاة العصر من اخر ايام التشريق عند الصاحبين، وبقولهما يفتى، فهي ثلاث وعشرون صلاة.

﴿باب فی تقدیر الاوزان الشرعیة بالمساحة الجدیدة﴾

(شرعی اوزان کی مقدار کا از سرِ نو تحقیق کے ساتھ بیان)

(۳۵۶) الاصبع کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہ کی کتب میں پیمائش کے پیمانوں میں سے ایک الاصبع ذکر کیا ہوا ہے آجکل چونکہ جدید پیمانے آچکے ہیں ان قدیم کو کوئی بھی نہیں جانتا حالانکہ اصل مدار ان جدید پیمانوں کا قدیم پیمانوں ہی کے اوپر ہے تو الاصبع کس پیمانے کا نام ہے اور اس میں کتنے سینٹی میٹر وغیرہ آئیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایک ذراع میں چھ قبضہ ہوتا ہے اور ایک قبضہ چار اصبع (انگشت) کا ہوتا ہے۔ اور چار اصبع ۳ انچ کے برابر ہوتے ہیں۔ اور ۳ انچ ۷٫۶۲ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے ایک انچ ۲٫۵۴ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک اصبع (انگشت)، ۰٫۷۵ انچ یا ۱٫۹۰۵ سینٹی میٹر کے برابر ہے۔ اور ایک سینٹی میٹر میں ۱۰ ملی میٹر ہوتے ہیں تو اس اعتبار سے ایک اصبع (انگشت) تقریباً ۱۹٫۰۵ ملی میٹر ہے۔

لمافی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق (۲۴۳/۱): قال صاحبنا ابو العباس احمد شهاب الدین ابن الهائم رحمه الله وإلیه یرجع فی هذا الباب البرید اربعة فراسخ والفرسخ ثلثة امیال والمیل الف باع والباع أربعة أذرع والذراع أربعة وعشرون إصبعا والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض والشعیر ست شعرات بشعر البرذون.

وفی الفتاویٰ الهندیة (۱۸/۱): والمعتبر ذراع الکرباس کذا فی الظهیریة وعلیه الفتوی کذا فی الهدایة. وهو ذراع العامة ست قبضات اربع وعشرون إصبعا کذا فی التبیین.

وفی الشامیة (۱۹۶/۱): قال فی البحر: وفی الخانیة وغیرها ذراع المساحة وهو سبع قبضات فوق کل قبضة اصبع قائمة (الی قوله) وفی البحر أن فی کثیر من الکتب انه ست قبضات لیس فوق کل قبضة اصبع قائمة فهو اربع وعشرون اصبعا بعدد حروف "لا اله الا الله محمد رسول الله" والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابهام کمافی غایة البیان والمراد بالقبضة اربع أصابع مضمومة.

(۳۵۷) الشبر کی تحقیق

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لمبائی کے پیمانوں کے اندر ایک الشبر نامی پیمانہ ہے تو یہ پیمانہ جدید پیمانوں کے لحاظ سے کتنا ہوگا اس میں کتنے سینٹی میٹر وغیرہ آئیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....ایک ذراع ۱۸/انچ کا ہوتا ہے اور دو "۲" شبر ایک ذراع ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر "۹" انچ کا ہوا، اور ایک انچ ڈھائی سینٹی میٹر کا ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر تقریباً ۲۳ سینٹی میٹر ہوا، اور ایک سینٹی میٹر دس ملی میٹر ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر ۲۳۰ ملی میٹر ہوا۔

لمافی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق(۱/۲۴۳،۲۴۵): والمیل ألف باع، والباع اربعة اذرع، والذراع أربعة وعشرون أصبعاً، والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض، والشعیر ست شعرات بشعر البرزون..... (الی قوله) .....قلت یمکن ان یقال لا خلاف لحمل کلام ابن شجاع علی ان مراده بالذراع ما فیه اصبع قائمة عند کل قبضة فیبلغ ذراعاً ونصفاً بذراع العامة.

وفی الشامیة(۱/۱۹۶): (قوله وهو سبع قبضات فقط) ای بلااصبع قائمة، وهذا مافی الولوالجیة، وفی البحران فی کثیر من الکتب انه ست قبضات لیس فوق کل قبضة أصبع قائمة، فهو اربع وعشرون أصبعاً بعدد حروف (لا اله الا الله محمد رسول الله) والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابهام کمافی (غایة البیان) اهـ والمراد بالقبضة أربع أصابع مضمومة نوح، أقول وهو قریب من ذراع الید، لانه ست قبضات وشئی، وذالک شبران.

(۳۵۸) فرسخ کی تحقیق

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اگر کوئی سولہ فرسخ سفر پر جانے کا ارادہ کریگا تو وہ قصر کرے گا مسئلہ یہ ہے آجکل میل اور فرسخ نہیں بلکہ کلومیٹر اور میٹر ہیں۔ تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک فرسخ میں کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....ایک فرسخ=۳ شرعی میل، ایک میل=۴۰۰۰ ذراع

ایک ذراع ڈیڑھ (۱٫۵) فٹ=۱۸ انچ، ۴۰۰۰x۱۸=۷۲۰۰۰ انچ

ایک میٹر=۳۹ انچ، ۷۲۰۰۰÷۳۹=۱۸۴۶٫۱۵۳۸ شرعی میل میں میٹر ۱۸۴۶٫۱۵۳۸÷۱۰۰۰=۱٫۸۴۶۱۵۳۸ = شرعی میل میں کلومیٹر

ایک فرسخ میں کلومیٹر= ۱٫۸۴۶۱۵۳۸x۳=۵٫۵۳۸۴۶۱۴ کلومیٹر

لہٰذا اس حساب سے معلوم ہوا کہ ایک فرسخ میں ۵٫۵۳۸۴۶۱۴ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۵۵۳۸٫۴۶۱۴ میٹر ہوتے ہیں۔

ایک فرسخ میں انگریزی میل

ایک انگریزی میل میں فٹ = ۱۷۶۰×۳=۵۲۸۰ فٹ

ایک انگریزی میل میں انچ = ۵۲۸۰×۱۲=۶۳۳۶۰ انچ

ایک انگریزی میل میں میٹر = ۶۳۳۶۰÷۳۹= ۱۶۲۴٫۶۱۵۴ میٹر

ایک انگریزی میل میں کلومیٹر = ۱۶۲۴٫۶۱۵۴÷۱۰۰۰= ۱٫۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر

ایک فرسخ میں انگریزی کلومیٹر = ۱٫۶۲۴۶۱۵۴×۳=۴٫۸۷۳۸۴۶۲ کلومیٹر

لہٰذا اس حساب سے معلوم ہوا کہ ایک انگریزی میل کے ایک فرسخ میں ۴٫۸۷۳۸۴۶۲ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۴۸۷۳٫۸۴۶۲ میٹر ہوتے ہیں۔ البتہ آجکل مفتی بہ قول کے مطابق ۴۸ میل انگریزی ۷۷٫۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر مقدار سفر شرعی بنتی ہے لہٰذا جو شخص ۴۸ میل انگریزی کی مسافت کے بقدر سفر کرے تو وہ شخص قصر کرے گا۔

لمافی البحر الرائق(۱/۲۴۳): کذا فی الصحاح والمغرب والمراد ھنا ثلث الفرسخ والفرسخ اثنا عشر ألف خطوة، کل خطوة ذراع ونصف بزراع العامة وھو اربع وعشرون اصبعاً.

وفی منحة الخالق علی ھامش البحر(۱/۲۴۳): والفراسخ ثلثة امیال والمیل الف باع والباع اربعة اذرع والذراع اربعة وعشرون اصبعاً والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض والشعیر ست شعرات بشعر البرزون.

(۳۵۹) میل کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتب میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص اڑتالیس میل سفر پر جانے کا ارادہ کرے تو وہ نماز قصر کرے گا آجکل تو میل نہیں کلومیٹر اور میٹر ہیں تو یہ وضاحت فرمادیں کہ ایک میل میں کتنے میٹر اور کلومیٹر ہوں گے اور اڑتالیس میل کے کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سفر شرعی کی مسافت کی تعیین میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے مذاہب مختلف ہیں۔ جن کی تفصیل عمدة القاری شرح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی بھی اس بارے میں روایات مختلف ہیں مگر راجح اور صحیح مذہب امام اعظم کا یہ ہے کہ کسی خاص مقدار کی تحدید میلوں وغیرہ سے نہ کی جاوے بلکہ تین دن تین رات میں جس قدر مسافت انسان پیدل چل کر بآسانی طے کرسکے یا اونٹ کی سواری پر بآسانی طے کرے وہ مقدار مسافت سفر شرعی ہے۔ فتح القدیر، عمدة القاری، البحر الرائق، درمختار اور شامی وغیرہ سب کا اسی پر اتفاق ہے۔

اس کے برخلاف بعض فقہاء نے فراسخ یا میلوں کی تعیین بھی فرمائی ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ۴۸ میل سے کم میں قصر نہ کرے۔ اور یہی امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی ہے، جبکہ مشائخ حنفیہ میں سے بعض نے اکیس فرسخ جس کے تریسٹھ میل شرعی بنتے ہیں، بعض نے اٹھارہ فرسخ جس کے چون میل بنتے ہیں اور بعض نے پندرہ فرسخ جس کے پینتالیس میل بنتے ہیں مسافت قصر قرار دی ہے، شامی اور بحر نے بحوالہ مجتبیٰ اکثر ائمہ خوارزم کا فتویٰ پندرہ فرسخ کی روایت پر ذکر کیا ہے، اس لئے محققین علماء ہند نے (۴۸) اڑتالیس میل انگریزی کو مسافت قصر قرار دیا ہے اور فقہائے حنفیہ کے اقوال میں سے جو قول ائمہ خوارزم کا پندرہ فرسخ کا نقل کیا گیا ہے وہ تقریباً اس کے برابر ہے، کیونکہ پندرہ فرسخ کے پینتالیس میل شرعی بنتے ہیں، اور شرعی میل انگریزی میل سے دوسو چالیس گز بڑا ہوتا ہے، اس وجہ سے پینتالیس میل شرعی اڑتالیس میل انگریزی سے کچھ زیادہ متفاوت نہیں، بہ نسبت دیگر اقوال کے کہ ان میں اور پینتالیس میل شرعی میں فرق بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

پینتالیس میل شرعی کے اعتبار سے مسافت قصر کی تفصیل یہ ہے کہ شرعی میل دو ہزار گز انگریزی کا ہوتا ہے اور انگریزی میل سترہ سو ساٹھ گز کا تو گویا کہ شرعی میل انگریزی میل سے دوسو چالیس گز بڑا ہوتا ہے، اس فرق کی وجہ سے اصل مسافت قصر جو کہ پینتالیس میل ہے اور مقرر کردہ مسافت جو کہ اڑتالیس میل ہے، میں فرق کا ہونا ظاہر ہے کہ پینتالیس میل شرعی کے......۵۱٫۱۳۶۳۶۴ میل انگریزی بنتے ہیں یعنی اصل مسافت جو شرعاً پینتالیس میل ہے اور مقرر کردہ مسافت میں تقریباً ۳٫۱۳۶۳۶۴ میل کا فرق آتا ہے۔ لیکن اس فرق کے ہوتے ہوئے حالات زمانہ اور چند دیگر ضرورتوں کی بناء پر محققین متاخرین نے اڑتالیس میل انگریزی کو پینتالیس میل شرعی کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ اور یہی قول مفتی بہ ہے۔ پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ سفر شرعی اڑتالیس میل انگریزی کے حساب سے بنتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس کے میٹر اور کلومیٹر کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔

ایک ذراع شرعی = ۱۸ انچ، ایک فٹ = ۱۲ انچ

ذراع انگریزی = ۳۶ انچ، ایک میٹر = ۳۹ انچ

ایک کلومیٹر = ۱۰۰۰ میٹر

۱۷۶۰ گز شرعی × ۲ = ۳۵۲۰ گز انگریزی

۳۵۲۰ × ۱٫۵ = ۵۲۸۰ فٹ

۵۲۸۰ فٹ × ۱۲ = ۶۳۳۶۰ انچ

۶۳۳۶۰ ÷ ۳۹ = ۱۶۲۴٫۶۱۵۴ میٹر

۱۶۲۴٫۶۱۵۴ ÷ ۱۰۰۰ = ۱٫۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر

۱٫۶۲۴۶۱۵۴ × ۴۸ = ۷۷٫۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر

اس تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ ایک میل میں ۱۶۲۴٫۶۱۵۴ میٹر اور ۱٫۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۴۸ میل میں ۷۷٫۹۸۱۵۳۹

میٹراور۹ ۷۷،۹۸۱۵۳ کلومیٹر ہوتے ہیں۔

لمافی البحر الرائق(۱/۲۴۳): المیل فی کلام العرب منتھی مدالبصر، وقیل للاعلام المبنیة فی طریق مکة امیال، لانھا بنیت علی مقادیر منتھی البصر کذا فی الصحاح والمغرب، والمرادھنا ثلث الفرسخ والفرسخ اثنا عشر الف خطوة کل خطوة ذراع ونصف بذراع العامة وھو اربع وعشرون اصبعاً.

وفی الھندیة(۱/۲۷): وأقرب الاقوال أن المیل وھو ثلث الفرسخ اربعة آلاف ذراع طول کل ذراع اربع وعشرون اصبعاً، وعرض کل اصبع ست حبات شعیر ملصقة ظھر البطن.

وفی الشامیة مع الدر (۱/۲۳۳): فی الدر من عجز عن استعمال الماء لبعده میلاً اربعة آلاف ذراع.

وقال الشامیؒ قوله اربعة آلاف ذراع الخ کذا فی الزیلعی والنھر والجوھرة، وقال فی الحلیة انه المشھور کما نقله غیر واحد منھم السروجی فی غایته، وفی شرح العینی ومسکین و البحر عن الینابیع انه اربعة آلاف خطوة، قال الرملی والاول ھو المعول علیه.

(۳۶۰) برید کی تحقیق

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مصنف عبدالرزاق (۲/۵۲۵) میں ذکر ہے کہ چار برید سفر کرنے سے قصر کے احکام لاگو ہوں گے اور ایک برید چار فرسخ کا ہوتا ہے اب الجھن یہ ہے کہ آجکل نہ برید ہیں نہ فرسخ بلکہ کلومیٹر یا میٹر ہیں، تو اب یہ بتایئے گا کہ ایک برید کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر کا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ایک برید میں ۴ فرسخ ہوتے ہیں ایک فرسخ ۳ میل کا ہوتا ہے تو ایک برید میں ۱۲ میل ہوں گے پھر ایک میل میں ۴۰۰۰ ذراع ہوتے ہیں، ایک ذراع میں ۱۸/ انچ ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ایک میل میں ۷۲۰۰۰/ انچ ہوں گے اور ایک میٹر میں ۳۹/ انچ ہوتے ہیں اس اعتبار سے ایک میل میں ۱۸۴۶،۱۵۳۸ میٹر جو ۱،۸۴۶۱۵۳۸ کلومیٹر کے برابر ہوگا اور جب ایک برید میں ۱۲ میل ہوتے ہیں تو ایک برید ۲۲۱۵۳،۸۴۶۱۵ میٹر کا اور ۲۲،۱۵۳۸۴۶۱۵ کلومیٹر کا ہوگا۔

لمافی البخاری (۱/۱۴۷): وسمی النبی ﷺ السفر یوما ولیلة وکان ابن عمروابن عباس یقصر ان ویفطر ان فی اربعة برد وھو ستة عشر فرسخاً.

وفی الھندیة(۱/۲۷): واقرب الاقوال ان المیل وھو ثلث الفرسخ اربعة الاف ذراع طول کل ذراع اربع وعشرون اصبعا وعرض کل اصبع ست حبات شعیر ملصقة ظھر البطن.

وفی منحة الخالق بھامش البحر الرائق(۱/۲۴۳-۲۴۴): البرید اربعة فراسخ والفراسخ ثلثة امیال

والمیل الف باع والباع اربعة اذرع والذراع اربعة وعشرون اصبعا والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض والشعیر ست شعرات بشعر البرزون

ان البرید من الفراسخ اربع ولفرسخ فثلاث امیال ضعوا
والمیل الف ای من الباعات قل والباع اربع اذرع تتتبع
ثم الذراع من الاصابع اربع فی بعدها العشرون ثم الاصبع
ست شعیرات فظهر شعیرة منها الی بطن لاخری توضع
ثم الشعیرة ست شعیرات فقل من شعر بغل لیس فیها مدفع

(۳۶۱) مرحلہ کی تحقیق

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں سفر کے مسائل میں مراحل کا لفظ آتا رہتا ہے تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک مرحلہ کتنا ہوتا ہے اور آجکل کے لحاظ سے میٹر اور کلومیٹر کے لحاظ سے کتنا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... مرحلہ کہتے ہیں ایک دن میں طے کردہ فاصلے کو اور عموماً ایک دن میں آدمی درمیانی رفتار میں پانچ فرسخ طے کر سکتا ہے۔ اور ایک فرسخ تین (۳) میل شرعی بنتا ہے۔ اور پانچ فرسخ پندرہ (۱۵) میل شرعی بنتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے ایک مرحلہ پندرہ (۱۵) میل شرعی بنتا ہے اور آجکل کے لحاظ سے ایک مرحلہ ۲۷٫۶۹۲ کلومیٹر یا ۲۷۶۹۲ میٹر۔ لہٰذا اس اعتبار سے تین مراحل میں ۴۵ میل شرعی۔ ۸۳۰۷۶ میٹر اور ۸۳٫۰۷۶ کلومیٹر بنتے ہیں۔ البتہ آجکل مفتی بہ قول کے مطابق ۴۸ میل انگریزی ۷۷٫۲۴۹۸۱۵ کلومیٹر مقدار سفر شرعی بنتی ہے۔

مرحلہ کی تحقیق.....

ایک مرحلہ = ۵ فرسخ

ایک فرسخ = ۳ میل شرعی

ایک میل شرعی = ۴۰۰۰ گز اور ایک گز = ڈیڑھ فٹ یا ۱۸/ انچ۔

ایک میل شرعی میں فٹ = (۴۰۰۰×۱۸ = ۷۲۰۰۰ (انچ) ÷ ۱۲ = ۶۰۰۰ فٹ)

ایک میل شرعی میں ۶۰۰۰ فٹ ہوتے ہیں

ایک میل شرعی میں میٹر (۶۰۰۰ ÷ ۳٫۲۵ = ۱۸۴۶٫۱۵۳۸ میٹر

ایک میل شرعی میں کلومیٹر (۱۸۴۶٫۱۵۳۸ ÷ ۱۰۰۰) = ۱٫۸۴۶ کلومیٹر

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں فٹ = ۶۰۰۰×۳ = ۱۸۰۰۰ فٹ

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں میٹر (۳x۱۸۴۶٫۱۵۳۸)=۵۵۳۸٫۴۶۱۴ میٹر

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں کلومیٹر (۵۵۳۸٫۴۶۱۴÷۱۰۰۰)=۵٫۵۳۸ کلومیٹر

تین مراحل = ۱۵ فرسخ = ۴۵ میل شرعی

تین مراحل میں میٹر (۴۵x۱۸۴۶٫۱۵۳۸)=۸۳۰۷۶٫۹۲۱ میٹر

تین مراحل میں کلومیٹر (۸۳۰۷۶٫۹۲۱÷۱۰۰۰)=۸۳٫۰۷۶ کلومیٹر

میل انگریزی کے حساب سے ایک مرحلہ میں ۱۶ میل انگریزی = ۲۵٫۷۴۸ کلومیٹر اور ۲۵۷۴۸ میٹر بنتے ہیں۔

تین مراحل میں ۴۸ میل انگریزی ۷۷٫۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر ۷۷۹۸۱٫۵۳۹ میٹر بنتے ہیں۔

میل انگریزی اور میل شرعی میں فرق

میل انگریزی میل شرعی سے ۷۲۰ فٹ، ۲۴۰ گز چھوٹا ہوتا ہے۔

وجہ فرق = اسلئے کہ میل شرعی ۴۰۰۰ گز شرعی = ۶۰۰۰ فٹ کا ہوتا ہے۔ جبکہ میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی = ۵۲۸۰ فٹ کا ہوتا ہے۔

میل شرعی اور میل انگریزی میں اس طور پر فرق اس لئے آ رہا ہے کہ میل شرعی ۴۰۰۰ گز شرعی کا ہوتا ہے اور ایک گز ۱۸/انچ کا ہوتا ہے۔

اور میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی کا ہوتا ہے اور ایک گز انگریزی ۳۶/انچ کا ہوتا ہے فرق معلوم کرنے کے لئے میل شرعی کے گز کو انگریزی گز میں تبدیل کر دیا تو میل شرعی انگریزی گز کے اعتبار سے ۲۰۰۰/انگریزی گز کا ہوگا، اور میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی کا ہوتا ہے لہٰذا ۲۰۰۰ میں سے ۱۷۶۰ نفی کیا تو ۲۴۰ گز کا فرق آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ میل انگریزی میل شرعی سے ۲۴۰ گز چھوٹا ہوتا ہے۔

لمافی معجم لغة الفقهاء (ص ۴۲۱): المرحلة: بفتح الميم، مسيرة نهار بسيرا لابل المحملة وقدرها أربعة وعشرون ميلا هاشميا، او ثمانية فراسخ او ۴۴۳۵۲ متراً. وفيه ايضاً (ص ۴۷۰) الميل بالكسر جمع اميال: مقدار مد البصر الميل الشرعى الهاشمى الف باع والباع قدر مد اليدين ۴۰۰۰ زراعاً = ۱۸۴۸ مترا......

وفى الهندية (۱/۱۳۸): أقل مسافة تتغير فيها الاحكام مسيرة ثلاثة ايام...... وهل يشترط سير كل يوم الى الليل اختلفوا فيه الصحيح انه لا يشترط حتى لو بكر فى اليوم الاول ومشى الى الزوال وبلغ المرحلة ونزل وبات فيها ثم بكر فى اليوم الثانى كذلك ثم فى اليوم الثالث كذلك يصير مسافرا كذا فى السراج الوهاج ولا معتبر بالفراسخ هو الصحيح كذا فى الهداية.

وفى الشامية (۲/۱۲۲): (قوله ولا يشترط السخ) إذلا بد للمسافر من النزول للأكل والشرب والصلاة ولأكثر النهار حكم كله فإن المسافر إذا بكر فى اليوم الاول وسار الى وقت الزوال حتى بلغ المرحلة فنزل بها للاستراحة وبات بها ثم بكر فى اليوم الثانى وسار الى ما بعد الزوال ونزل ثم

بكر في اليوم الثالث ومشى الى الزوال فبلغ المقصد قال شمس الأئمة السرخسي الصحيح أنه يصير مسافراً عند النية كما في الجوهرة.

وفيه ايضاً(صـ١٢٣): قال في النهاية. اى التقدير بثلاث مراحل قريب من التقدير بثلاثة أيام لأن المعتاد من السير في كل يوم مرحلة واحدة خصوصاً في أقصر ايام السنة كذا في المبسوط وكذا مافي الفتح من أنه قيل يقدر بأحد وعشرين فرسخا وقيل بثمانية عشر وقيل بخمسة عشر وكل من قدر منها اعتقدانه مسيرة ثلاثة ايام. اى بناء على اختلاف البلدان فكل قائل قدر مافي بلده من أقصر الأيام او بناء على اعتبار أقصر الأيام أو أطولها أو المعتدل منها وعلى كل فهو صريح بأن المراد بالأيام ما تقطع فيها المراحل المعتادة فافهم..... (قوله ولا اعتبار بالفراسخ) الفرسخ ثلاثة أميال، والميل أربعة الأف ذراع..... (قوله على المذهب) لأن المذكور في ظاهر الرواية اعتبار ثلاثة أيام كما في الحلية وقال في الهداية هو الصحيح احترازا عن قول عامة المشايخ من تقديرها بالفراسخ. ثم اختلفوا فقيل: أحد وعشرون، وقيل ثمانية عشر وقيل خمسة عشر، والفتوى على الثاني لأنه الأوسط وفي المجتبى فتوى أئمة خوارزم على الثالث وجه الصحيح أن الفراسخ تختلف باختلاف الطريق في السهل والجبل والبر والبحر بخلاف المراحل معراج.

﴿فصل فی المسائل المتفرقة المتعلقة بالصلاة﴾

(نماز کے متفرق مسائل کا بیان)

(۳۶۲) فریضۂ صلوٰۃ قرض ہے یا فرض؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کا قرض ہے یا فرض؟ میرے ایک دوست فرماتے ہیں کہ قرض ہے؟ آپ صحیح بات کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... پانچوں نمازیں ہر ''عاقل، بالغ، مسلمان مرد وعورت'' پر ان کے اوقات مقررہ میں ادا کرنا قرآن وحدیث اور اجماع امت کی رو سے فرض عین ہے قرض نہیں۔

اس لئے کہ قرض کہا جاتا ہے کسی دوسرے کو مال دینا اس شرط پر کہ قرض دار وہ مال قرض خواہ کو واپس لوٹائے گا جہاں تک آپ کے دوست کا کہنا ہے کہ فریضہ صلوٰۃ ''قرض'' ہے، تو یہ اس صورت پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ مقصود لزوم ادائیگی ہو۔ اور عام طور پر مراد بھی یہی ہوتی ہے کہ جس طرح ادائیگی قرض بہر صورت ضروری ہے، ایسے ہی ادائیگی فرض بھی ضروری ہے۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز فرض نہیں۔

لمافی الهندية (۱/ ۵۰): الصلاة فريضة محكمة لايسع تركها ويكفر جاحدها كذا في الخلاصة.

وفي المعجم الوسيط (ص ۷۲۷): "القرض" "ماتعطيه غيرك من مال على ان يرده اليك...... "ج" قروض.

(۳۶۳) فقہاء نے ''نماز کے ارکان وشرائط'' کے اعتبار سے جو تقسیم فرمائی ہے اس کا مقصد

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہاء نے جو تقسیم فرمائی ہے نماز کے ارکان وشرائط کے اعتبار سے اس کا کیا مقصد ہے، آیا نماز کی صحت کیلئے ضروری ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ مراقی الفلاح والے کی اس عبارت کا کیا مطلب ہوگا: ویشترط التحريمة وليست ركناً وعليه عامة المشايخ المحققين على الصحيح...... (ص ۱۷۴ باب شروط الصلوٰة)

الجواب حامداً ومصلیاً...... فقہاء نے جو تقسیم کی ہے اس کا مقصد نماز کے ''ارکان اور شرائط'' کے درمیان فرق کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''شرط'' وہ عمل ہے کہ خارج نماز اس کو پورا کرنا صحت نماز کیلئے ضروری ہے اور ''رکن'' وہ عمل ہے کہ نماز کے اندر اس کو انجام دینا صحت نماز کیلئے

ضروری ہے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ شرط، نماز کا جز اور حصہ نہیں ہوتی بلکہ نماز سے الگ اور باہر جداگانہ عمل ہے جیسے نماز کیلئے وضو شرط ہے۔ ''نماز'' اور ''وضو'' دونوں الگ الگ عمل ہیں۔ جبکہ نماز کا ''رکن'' خود نماز کا ایک جزء ہوتا ہے جیسے ''رکوع'' ''سجود'' نماز کے ''ارکان'' ہیں البتہ حکماً دونوں فرض ہیں چنانچہ اگر کوئی آدمی ان میں سے ایک کو بھی انجام نہ دے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ اور مراقی الفلاح کی عبارت کا مقصد یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ عندالاحناف شروط میں سے ہے کیونکہ خارج نماز ادا ہو جاتی ہے۔

لمافی الحلبی (ص۱۲): ثم اعلم بان للصلوة شرائط جمع شريطة بمعنى الشرط وهو فی اللغة العلامة اللازمة وفی الشرع مايتعلق به الوجود دون الوجوب والثبوت قبلها صفة موضحة وبيان للواقع اذ شرط الشی لا يكون فيه ولا بعده وانما يكون قبله...... واعلم ان للصلوة اركانا جمع ركن وهو فی اللغة الجانب الاقوی و فی الاصطلاح الجزء الذاتی الذی تتركب الماهية منه ومن غيره.

وفی المراقی(۱/۱۶۶): شروط جمع شرط...... وفی الشريعة هو مايتوقف علی وجوده الشیء، وهو خارج عن ماهيته، والاركان جمع ركن: وهو فی اللغة.....الجانب الاقوی وفی الاصطلاح الجزء الذاتی الذی تتركب الماهية منه ومن غيره.

وفی الهندية(۱/۶۸): الفصل الاول فی فرائض الصلوة وهی ست منها التحريمة، وهی شرط عندنا حتی ان من يحرم للفرائض كان له ان يودی بها التطوع.

وفی الدر المختار مع الشامية (۱/۴۴۲): (من فرائضها) التی لا تصح بدونها (التحريمة) قائماً (وهی شرط)

وفی الشامية تحته: (قوله من فرائضها) جمع فريضة اعم من الركن الداخل الماهية والشرط الخارج عنها ...... (قوله وهی شرط) وانما لم يذكرها مع الشروط المارة لاتصالها بها بمنزلة الباب للدار ...... (قوله به يفتی)، الضمير راجع الی الحكم عليها بالشرطية.

(۳۶۴) حرم سے باہر سمتِ قبلہ کا تعین

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل مسجد حرام کے باہر سمت قبلہ کا تعین کیسے کیا جائے جبکہ اونچی اونچی عمارتیں حائل ہیں برائے مہربانی مسئلہ کی پوری وضاحت فرمادیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبلہ اگر نمازی کے سامنے ہو تو عینِ قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے البتہ اگر نمازی ایسی جگہ پر ہو جہاں قبلہ نظروں کے سامنے نہ ہو تو جہت قبلہ کا رخ کر لینا کافی ہے لیکن اگر قبلہ نمازی کی نظروں کے سامنے نہ ہو اور سمت قبلہ کے بارے میں بھی شبہ ہو جائے تو وہ مقامی لوگوں سے دریافت کریگا، اگر کوئی شخص ایسا نہ ملے جو اسے سمت قبلہ بتا سکے تو غور وفکر کر کے جس طرف بھی غالب گمان

ہو جائے اسی طرف رخ کر کے نماز ادا کریگا۔

لمافی محیط البرهانی (۲/۲۱): وكل من كان بحضرة الكعبة يجب عليه اصابة عينها ومن كان غائبا عنها ففرضه جهة الكعبة لاعينها وهذا قول الشيخ الامام ابی الحسن الكرخی والشيخ الامام ابوبكر الرازی لانه ليس فی وسعه سوی ذالک والتكليف بحسب الوسع.

وفی الهندية (۱/۶۴): وان اشتبهت عليه القبلة وليس بحضرته من يسئله عنها اجتهد وصلی كذافی الهداية ...... واذا كان بحضرته من يسئله عنها وهو من اهل المكان عالم بالقبلة فلا يجوز له التحری.

(۳۶۵) مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ثواب سب سے زیادہ ہے

سوال......ایک شخص اللہ کے راستہ میں (مراد اس سے دعوت وتبلیغ ہے) نماز پڑھتا ہے جبکہ دوسرا دہ شخص ہے جو مسجد حرام میں نماز پڑھتا ہے، ان دونوں میں کس کو زیادہ ثواب ملے گا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......جواب کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھئے کہ حضرات مفسرین نے، فی سبیل اللہ، میں تبلیغ کے علاوہ اور بھی بہت سے امور داخل کئے ہیں جیسا کہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب قدس اللہ سرہ نے تفسیر مظہری (۲/۲۱۱) میں لکھا ہے کہ، طلب علم، جہاد، اطاعت، تقوی کیلئے نکلنا اور اسی طرح رزق حلال کے حصول کیلئے نکلنا یہ سب، فی سبیل اللہ میں داخل ہیں جبکہ بعض حضرات اسکے استعمال میں غلطی کر جاتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں نکلنے کو صرف تبلیغ کیساتھ خاص کرتے ہیں حالانکہ اسکے علاوہ اور نیک کاموں میں نکلنے والے بھی اللہ کے راستہ میں نکلنے والے ہیں۔ اب جواب کو سمجھ لیجئے کہ اللہ کے راستہ میں عبادت کرنا تو بہت ہی سعادتمندی کی بات ہے احادیث میں اسکے متعلق بہت فضائل مروی ہیں لیکن جو شخص مسجدِ حرام میں نماز پڑھتا ہو تو ظاہر ہے کہ اسکا ثواب سب سے بڑھ کر ہے بلکہ مسجدِ نبوی علی صاحبہا الصلاۃ و السلام میں نماز پڑھنے سے بھی افضل ہے۔

لمافی الشامية (۱/۶۵۸): وفی تسهيل المقاصد للعلامة احمد بن العماد: ان افضل المساجد الارض الكعبة لان اول بيت وضع للناس ثم المسجد المحيط بها لانه اقدم مسجد بمكة ثم مسجد المدينة لقوله ﷺ صلاة فی مسجدی هذا تعدل الف صلاة فيما سواه الا المسجد الحرام.

(۳۶۶) نماز کا پڑھنا ہی اخلاق کی درستگی کا سبب ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مفتی صاحب میں ابھی جماعت کے ساتھ چلہ لگا کر آیا ہوں اللہ کے فضل سے تمام اعمال میں جڑتا ہوں ہماری مسجد میں بدھ کے دن گشت ہوتا ہے ہم باہر گئے تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو بظاہر نیک دیندار معلوم ہوتے تھے ہم نے ان سے بات کی تو فرمانے لگے پہلے اخلاق کی درستی ہونی چاہیے پھر نماز پڑھنی چاہیے،

سارے ساتھی ان کی بات سن کر حیران ہو گئے کہ یہ بات ہم نے پہلی مرتبہ سنی ہے کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز چونکہ اہم ترین عبادت ہے قرآن اور احادیث نے جابجا اس کی تاکید فرمائی ہے لہٰذا اس کو کسی حال میں ترک نہیں کیا جائے گا اخلاق کی درستی بھی شریعت میں مطلوب ہے لیکن اس کی وجہ سے نماز کو نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ نماز ہی کی برکت سے رفتہ رفتہ اخلاق کی درستگی بھی ہو جائے گی جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ نماز فحاشی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اسی طرح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صاحب کے بارے میں پوچھا گیا کہ نماز بھی پڑھتا ہے اور چوری بھی کرتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ نماز اس کو اس کام سے روک دے گی لہٰذا ان صاحب کا یہ کہنا کہ پہلے صرف اخلاق کی درستگی ہو پھر نماز ہو تو یہ بات از روئے شریعت درست نہیں۔

لمافی احکام القرآن للجصاصؒ(۳/۳۵۰): روی عن ابن مسعود وابن عباس تأمر بالمعروف وتنهی عن المنکر...... وقیل أن النبی ﷺ قیل له إن فلانا یصلی باللیل ویسرق بالنهار فقال لعل صلاته تنهاه الخ. وقوله تعالیٰ وأقیموا وجوهکم عند کل مسجد. (آلایة، سورة الاعراف)

وفی الفقه علی المذاهب الأربعة(۱/۱۷۳): فهذه هی الصلوة فی نظر الدین وهی بهذا المعنی لها احسن الأثر فی تهذیب النفوس وتقویم الأخلاق فإن فی کل جزء من اجزائها تمریناً علی فضیلة من الفضائل الخلقیة وتعویدا علی صفة من الصفات الحمیدة ....

(۳۶۷) موبائل میں گانے والی ٹونز لگوانے اور دوران نماز موبائل کی گھنٹی بند کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موبائل فون میں گانے کی ٹونز لگوانا کیسا ہے؟ نیز نماز پڑھنے کے دوران اگر موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہو جائے تو کیا نمار کے اندر اس کو بند کیا جا سکتا ہے تاکہ دوسروں کی نماز میں خلل نہ آئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... دین اسلام میں موسیقی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا موبائل پر گانا یا کسی بھی ایسی گھنٹی کا لگانا جس میں موسیقی کی آمیزش پائی جاتی ہو، ناجائز ہے۔ تاہم موبائل میں عام اور سادہ گھنٹی لگانی چاہیے جس میں موسیقیت کا پہلو ظاہر نہ ہو۔ اور مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ہی موبائل بند کر دیا جائے البتہ اگر کسی وقت بند کرنا بھول جائیں اور نماز میں گھنٹی بجنے لگے تو اولا کوشش کریں کہ بغیر عمل کثیر کے اسے ایک ہاتھ سے بند کریں البتہ اگر بغیر عمل کثیر کے اسے بند کرنا مشکل ہو یا گھنٹی کے بار بار بجنے کی وجہ سے دوسرے نمازیوں کی نماز بھی خراب ہوتی ہو تو بار بار بند کرنے کے بجائے نماز توڑ کر گھنٹی بند کر دیں، تاکہ اس سے پیدا ہونے والے مفاسد سے بچا جا سکے مثلاً۔

۱)...... گھنٹی کا بجتے رہنا نمازیوں کی نماز میں خلل عظیم کا باعث ہے۔

۲)...... گھنٹی کا بجتے رہنا تقدس مسجد کے پامال ہونے کا باعث ہے۔

۳)...... گھنٹی کا بجتے رہنا نماز کی کامل ادائیگی میں نقصان کا باعث ہے۔

۴)...... گھنٹی کا بجتے رہنا مسلمانوں کی ایذا رسانی کا باعث ہے۔

۵)...... گھنٹی کے بجتے رہنے سے کسی حد تک مشرکین کے افعال قبیحہ سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بیت اللہ میں دورانِ طواف اور مسلمانوں کی نماز میں خلل پیدا کرنے کیلئے سیٹیاں اور تالیاں بجایا کرتے تھے۔

۶)...... حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال وافعال سے گھنٹی کی مذمت فرمائی ہے، اور اس کو شیطان کا آلہ فرمایا ہے۔

۷)...... گھنٹی کے بجتے رہنے سے جہری نمازوں میں امام صاحب کی تلاوت اور مقتدیوں کی سماعت میں حرج پیدا ہوتا ہے۔

۸)...... گھنٹی کے بجتے رہنے سے گرجا گھروں میں کی جانے والی عبادت کے ساتھ مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ آج بھی نصاریٰ گرجا گھروں میں عبادت بجتی گھنٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

۹)...... گھنٹی کا بجتے رہنا لغویات میں شامل ہے اور نماز میں لغویات سے پرہیز از حد ضروری ہے۔

۱۰)...... گھنٹی کا بجتے رہنا فرشتوں کیلئے منافرت کا باعث ہے۔ تلک عشرۃ کاملۃ

نیز نماز توڑنے کے بعد نئی تکبیر تحریمہ باندھ کر نماز میں شریک ہو جائے۔ اور امام صاحب کی ادائیگی سلام کے بعد فوت شدہ نماز کو مکمل کرے، اور ادائیگی نماز کے بعد خوب توبہ واستغفار کرے۔ اور آئندہ اس طرح کی غفلت سے اجتناب کرے۔

لمافی مجمع الانہر (۱/۲۰۸): والاصل فیہ ان نقض العبادۃ قصداً وبلا عذر حرام واما اذا کان لامر شرعی مثل الاکمال فیجوز وان کان نقضا صورۃ فھو اکمال معنی کھدم المسجد لتجدیدہ.

وفی خلاصۃ الفتاویٰ (۱/۲۰): ویکرہ ان یدخل فی الصلاۃ وبہ غائط اوبول فلوشرع فی الصلاۃ مع ھذا وشغلہ عن الصلوٰۃ قطعھا جاز فان مضی جاز وأساء وسواء کان بہ وقت الافتتاح اوحصل فی الصلوٰۃ.

(۳۶۸) فرض نمازوں کی رکعات کا احادیث مبارکہ سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نمازوں کی رکعتیں قرآن کریم سے ثابت ہیں یا نہیں اگر نہیں ہیں تو وہ کونسی احادیث مبارکہ ہیں جو ان رکعتوں کی تعیین پر دلالت کرتی ہیں، برائے مہربانی مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... قرآن پاک سورۃ الروم آیت نمبر ۱۷، ۱۸ سے پانچ نمازوں کے نفس ثبوت کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم بالتفصیل: فرض نماز اور ان کی رکعات کا ذکر کتب احادیث میں موجود ہے۔ چنانچہ فجر کی دو رکعت فرض کا ذکر: بخاری (۱/۱۰۶، ۱۰۷) ومسلم (۱/۱۸۶) وابوداؤد (۱/۱۱۸) "باب الرجل یعید سورۃ واحدۃ فی الرکعتین" پر موجود ہے۔

ظہر وعصر، مغرب اور عشاء کی فرض رکعات کا اکٹھا ذکر: بخاری (۱/۷۷) وابوداؤد (۱/۱۷۱) پر موجود ہے۔ اور اسی طرح ظہر، عصر اور مغرب کی فرض رکعات کا الگ الگ ذکر بھی موجود ہے۔ چنانچہ ظہر کی چار رکعات فرض کا ذکر: بخاری (۱/۱۰۷) ومسلم (۱/۱۸۵) وابوداؤد (۱/۱۴۵) ترمذی (۱/۹۱) پر موجود ہے۔

عصر کی چار رکعات فرض کا ذکر: مسلم (۱/۲۲۵) پر موجود ہے۔ مغرب کی تین رکعات فرض کا ذکر بخاری (۱/۱۴۸) پر موجود ہے۔ اور پانچوں نمازوں کی تمام فرض رکعات کا ایک ساتھ ذکر السنن الکبریٰ للبیہقی (۱/۳۶۱) اور اعلاء السنن (۲/الجزء ۴، صفحہ ۷) پر موجود ہے۔

لما فی القرآن الکریم (سورة الروم: ۱۸، ۱۷): (قال اللّٰہ تعالیٰ) "فسبحن اللّٰہ حین تمسون وحین تصبحون ٥ وله الحمد فی السموات والارض وعشیا وحین تظهرون ٥

وفی التفسیر الکبیر (۱۳/۱۰۴) الجزء ۲۵: وأما المعنیٰ فقال بعض المفسرین: المراد منه الصلوة، أی صلوا، وذکروا انه أشار الی الصلوات الخمس.

وفی التفسیر روح المعانی (۷/۲۸): وقیل: المراد بالتسبیح الصلاة. واخرج عبدالرزاق اخرج عبد الرزاق، والفریابی وابن جرید وابن النذر .... الی ان قال جاء نافع ابن الازرق الی ابن عباس فقال هل تجد الصلوات الخمس فی القرآن؟ فقال: نعم فقرأ (فسبحان اللّٰہ حین تمسون) صلاة المغرب (وحین تصبحون) صلاة الصبح (وعشیا) صلاة العصر (وحین تظهرون) صلاة الظهر وقرء (ومن بعد صلاة العشاء) واخرج ابن ابی شیبة، وابن جریر، وابن المنذر عنه قال: جمعت هذه الآیة مواقیت الصلاة (فسبحان اللّٰہ حین تمسون) المغرب والعشاء (وحین تصبحون) الفجر (وعشیا) العصر (وحین تظهرون) الظهر...... الخ.

(۳۶۹) کسی مسجد کو مسجد ضرار کہنا درست نہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں منافقین نے مسجد قبا کے مقابلے میں ایک مسجد تعمیر کی تھی تو قرآن پاک میں اس مسجد کو مسجد ضرار کہا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گرانے کا حکم دیا تھا اب سوال یہ ہے کہ آجکل اگر کوئی شخص ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد تعمیر کر لیتا ہے تو یہ مسجد ضرار کے زمرے میں آئے گی یا نہیں؟ نیز اس میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قرآن کریم میں جس مسجد کو مسجد ضرار کہا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جسے منہدم کر کے جلا دیا گیا، درحقیقت وہ مسجد نہ تھی، بلکہ منافقین نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے اور انکے خلاف سازشیں کرنے کیلئے مسجد کا نام رکھ کر ایک عمارت بنائی تھی، جس کے چار مذموم ومکروہ مقاصد قرآن کریم نے بیان کیے ہیں اور وہ یہ ہیں:

اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کرنا، مسلمانوں کے اتحاد اور جماعت میں تفریق پیدا کرنا، اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باغی (ابو عامر) کو پناہ گاہ فراہم کرنا۔ اس سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے۔

(۱)...... اگر کچھ مسلمان کسی مسجد کے مقابلے میں اس کے قریب دوسری مسجد ریاء ونمود یا ضد وعناد کی وجہ سے بنالیں اور بنانے کا مقصد یہی

باہم تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں تو اگر چہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المؤمنین کی وجہ سے گنہگار ہوگا، لیکن اس کے باوجود اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا اور مسجد کے تمام آداب اور احکام اس پر جاری ہوں گے۔

(۲)......اس طرح کی مسجد کو اصطلاح میں قرآن والی مسجد ضرار کہنا درست نہیں۔

(۳)......ایسی مسجد میں نماز نہ پڑھنا بہتر ہے اگر پڑھ لی گئی تو ہو جائے گی۔

لما فی الدر المنثور فی التفسیر المأثور(۲۸۴/۴): اخرج ابن الجریر وابن المنذر و ابن ابی حاتم وابن مردویة والبیھقی فی الدلائل عن ابن عباس فی قوله(والذین اتخذوا مسجدا ضرارا) قال: هم اناس من انصار ابتنوا مسجدا، فقال لهم ابوعامر، ابنوا مسجدکم واستمدوا ما استطعتم من قوة و سلاح فانی ذاهب الی قیصر ملک الروم فآتی بجنده من الروم فاخرج محمدا واصحابه. فلما فرغوا من مسجدهم اتوا النبی ﷺ فقالوا: قد فرغنا من بناء مسجدنا، فنحب ان تصلی فیه وتدعو بالبرکة، فانزل الله: (لاتقم فیه ابدا)

وفی التفسیر المظھری(۲۹۵/۴): والذین اتخذوا مسجدا ضرارا ای مضارة للمومنین......

وفی (صـ۲۹۶): وکفرا بالله ورسوله ﷺ وتفریقا بین المومنین لانهم کانوا یصلون فی مسجد قبا فبنوا مسجد الضرار لیصلی فیه بعضهم فیودی ذالک الی الاختلاف وافتراق الکلمة الخ، وارصادا ای انتظارا واعدادا لمن حارب الله ورسوله. الخ

(۳۷۰) ایک طرف سے آکر نمازی کے آگے بیٹھ جانے کے بعد پھر اٹھ کر دوسری طرف جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عمرو نماز پڑھ رہا تھا کہ زید دائیں طرف سے آیا عمرو کے سامنے قبلہ رو بیٹھ گیا، دو تین منٹ بیٹھا تھا دو تین منٹ کے بعد بائیں طرف گیا، تو آیا زید کا اس طرح کرنا اعراض میں شمار ہے یا کہ مرور میں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں زید کا یہ فعل مرور میں شمار ہوگا۔

لمافی صحیح البخاری(۷۲/۱):باب الصلوۃ الی السریر: عن عائشة (رضی الله عنها) قالت: اعدلتمونا بالکلب والحمار لقد رأیتنی مضطجعة علی السریر فیجیئ النبی ﷺ فیتوسط السریر فیصلی فأکره ان اسنحه فانسل من قبل رجلی السریر حتی انسلّ من لحافی.

وفیه ایضاً(۷۳/۱): قال رسول الله ﷺ لو یعلم المار بین یدی المصلی ماذا علیه لکان ان یقف

اربعين خير اله من ان يمر بين يديه الخ.

وفي فيض الباري(۲/۸۳): قوله ((فأكره أن أسنحه)) (يعني آرى آجاؤل) وعلم ان مسألة المرور في الفقه فيما اذا مر امامه من جانب الى جانب ولا تفصيل فيه فيما اذا كان قاعدا فصلى خلفه رجل هل ينسل ام لا قلت: فليعمل بهذا لحديث ولا شك ان الانسلال أفيد وهو الخروج من التحت خفية والسنوح اقرب من المرور فلذا كانت تكرهه.

وفي الشامية(۱/۶۳۶): ولو مر إثنان يقوم أحدهما أمامه ويمر الاخر ويفعل الاخر هكذا يمران.

(۳۷۱) سترہ کی مقدار اور اس کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی صحرا میں ایک امام ہے اور اس کے پیچھے مقتدی بھی ہیں، اب جماعت پڑھنے کے دوران صرف امام کے سامنے کا سترہ کافی ہے یا مقتدی بھی سترہ لگائیں گے، اور سترے کی مقدار کتنی ہونی چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......امام کا سترہ مقتدیوں کیلئے کافی ہے اور سترہ کی مقدار کم از کم ایک ذراع لمبی اور ایک انگلی کے بقدر موٹی ہونی چاہیے۔

لمافي معارف السنن(۳/۳۴۹): واتفق الثلاثة على ان سترة الإمام سترة لمن خلفه.

معارف السنن(۳/۳۵۰): ونقح فقهاؤنا الحنيفة قدر السترة بالذراع طولا وبالمسبحة ثخنا وغلظا كما هو في عامة كتبنا. وفي (۳/۳۵۳) أنه اذا صلى خاشعا راميا بصره الى موضع سجوده لا يقع بصره عليه واختار ابن الهمام في الفتح (۱/۲۸۸) في الخلاصة وهو الصحيح وفي البدائع: وهو الأصح، وفي النهاية وهو الأشبة، وراجع "الفتح" للتفصيل اهـ.

وفي البحر الرائق (۲/۱۰): واختار فخر الاسلام فانه قال اذا صلى راميابصره إلى موضع سجوده فلم يقع عليه بصره له يكره وهذا حسن وفي البدائع وقال بعضهم قدر ما يقع بصره على المار لو صلى بخشوع وفيما وراء ذلك لايكره وهو الأصح ورجحه في النهاية بأنه اشبه الصواب.

(۳۷۲) حضور ﷺ کیسے درود پڑھتے تھے؟ کیا آپ پر درود پڑھنا واجب تھا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کس طرح درود پڑھا کرتے تھے اور آپ کیلئے درود کا کیا حکم تھا؟ براہ کرم بحوالہ جواب جلد از جلد مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں درج ذیل درود پڑھا کرتے تھے۔

اللھم صل علی محمد وال محمد کما صلیت علی ابراھیم وال ابراھیم وبارک علی محمد وال محمد کما بارکت علی ابراھیم وال ابراھیم انک حمید مجید. (السنن الکبری للبیھقی ۲/۱۴۷، مطبع ادارہ تالیفات اشرفیہ)

نیز اس کے علاوہ بھی الفاظ کی کمی زیادتی کے ساتھ مختلف روایات میں درود پڑھنے کا حکم ہے۔ جیسے اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید اللھم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید. (ابن ماجہ ص۶۵، مستدرک حاکم علی الصحیحین ۱/۱۶۰۳) جہاں تک ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے درود کے حکم'' کی بات ہے تو آپ کے لئے اپنے اوپر درود بھیجنا واجب نہیں تھا۔

لمافی السنن الکبری للبیھقی(۲/۱۴۷): عن کعب بن عجرۃ عن النبی ﷺ انه کان یقول فی الصلوۃ اللھم صل علی محمد وال محمد کما صلیت علی ابراھیم وال ابراھیم وبارک علی محمد وال محمد کما بارکت علی ابراھیم وال ابراھیم انک حمید مجید.

وفی الدر المختار(۱/۵۱۵): وفی المجتبی: لا یجب علی النبی ﷺ ان یصلی علی نفسه.

وفی الشامیة تحته: (قوله لا یجب علی النبی ﷺ ان یصلی علی نفسه) لانه غیر مراد بخطاب صلوا ولا داخل تحت ضمیرہ کما ھو المبتادر من ترکیب. صلواعلیه. وقال فی النھر: لا یجب علیه بناء علی ان. یایھا الذین امنوا. لا یتناول الرسول ﷺ بخلاف. یایھا الناس. یا عبادی کما عرف فی الاصول اھ.

وفی البحر الرائق(۱/۵۷۳): وفی المجتبی معزیا الی خزانة الاکمل: انه لا یجب علی النبی ﷺ ان یصلی علی نفسه.

وفی النھر الفائق(۱/۲۲۳): قال فی ((المجتبی)) معزیا الی ((خزانة الاکمل)): ھذا فی حق الامة اما ھو فلا یجب علیه ان یصلی علی نفسه انتھی بناء علی ان (یایھا الذین امنوا) لاتتناول الرسول بخلاف (یایھاالناس) (یاعبادی) کما عرف فی الاصول.

(۳۷۳) ''ہر وہ نماز جو کراہت تحریمیہ کے ساتھ ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ واجب ہے''

کیا یہ قاعدہ کلی ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ یہ جو قاعدہ ذکر کیا گیا ہے کل صلاۃ ادیت مع

کراهة التحريم تجب ان عادتها کیا یہ قاعدہ کلی ہے؟اور جو بھی نماز مکروہ تحریمی ہو جائے اور جس طرح بھی کراہت تحریمی آئی ہو، اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب ہے یا اس میں تخصیص ہے اور کیا یہ جب وقت کے اندر ہے یا وقت کے بعد بھی اس کا اعادہ واجب ہے؟

(۲)۔ نیز اگر تصویر سامنے ہو، اور نماز ادا کر لی تو جو علامہ شامیؒ نے فرمایا کہ جو کراہت ماہیت صلاۃ میں آئی ہو، اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب ہے ورنہ نہیں اور کیا تصویر اگر سامنے ہو، اور نماز پڑھ لی تو جو کراہت نماز میں آئی ہے یہ کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل ہے یا نہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ قاعدہ کلی ہے بشرطیکہ کراہت ماہیت صلوٰۃ میں داخل ہو، حاصل اس کا یہ ہے فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے لیکن کراہت تحریمی کے ارتکاب کی وجہ سے نماز کا اعادہ واجب ہے یہ وقت کے اندر نہیں کیا تو بعد میں کرے، تصویر سامنے ہونے کی صورت میں جو کراہت نماز میں آئی ہے یہ ماہیت صلاۃ میں داخل ہے کیونکہ علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے تصویر والے کپڑوں میں نماز کی کراہت کو ''حامل صنم پر قیاس کر کے'' ماہیت صلاۃ میں داخل کیا، تصویر سامنے ہونے کی صورت میں بھی کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل ہوگی کیونکہ اس میں کراہت اُس سے زیادہ ہے لہٰذا اس نماز کا اعادہ واجب ہے۔

بخلاف اس صورت کے کہ اگر کسی نے تنہا ظہر کی فرض نماز کی تین رکعت پڑھ لیں اور اسی اثناء میں جماعت کھڑی ہوگئی یہ اپنی نماز اکیلے پوری کرے اگر چہ جماعت کے ساتھ نہ پڑھنے کی وجہ سے کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہوئی لیکن کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل نہ ہونے کی وجہ سے اعادہ واجب نہیں کیونکہ جماعت نماز کی ایک صفت ہے جو ماہیت صلاۃ سے خارج ہے اسی لئے اس کو واجبات الصلوٰۃ میں ذکر نہیں کرتے ہیں۔

لمافي الدر المختار (۱/۴۵۷): وكذا كل صلوٰة اديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها والمختار انه جابر للاول ......وفي الشامية: وان النقص اذا دخل في صلاة الامام ولم يجبر وجبت الاعادة على المقتدى ايضا: وانه يستثنى منه الجمعة والعيد اذا اديت مع كراهة التحريم الا اذا اعادها الامام والقوم جميعا..........

بقي هنا شي وهو ان صلاة الجماعة واجبة على الراجح في المذهب او سنة موكدة في حكم الواجب كمافي البحر وصرحوا بفسق تاركها وتعزيره وانه يأثم ومقتضى هذا انه لو صلى مفردا يومر باعادتها بالجماعة وهو مخالف لما صرحوا به في باب ادراک الفريضة من انه لو صلى ثلاث ركعات من الظهر ثم اقيمت الجماعة يتم ويقتدى متطوعا فانه كالصريح في انه ليس له اعادة الظهر بالجماعة مع ان صلاته منفردا مكروهة تحريماً او قريبة من التحريم. فيخالف تلک القاعدة، الا ان يدعى تخصيصها بان مرادهم بالواجب والسنة التي تعاد بتركه ما كان من ماهية الصلاة واجزائها فلا يشمل الجماعة

لانها وصف لها خارج عن ماهيتها او يدعى تقييد قولهم يتم ويقتدى متطوعا بما اذا كانت صلاته منفردا لعذر كعدم وجود الجماعة عند شروعه فلا تكون صلاته منفردا مكروهة والاقرب الاول ولذا لم يذكروا الجماعة من جملة واجبات الصلاة لانها واجب مستقل بنفسه خارج عن ماهية الصلاة ويزيده ايضاً انهم قالوا يجب الترتيب في سور القرآن، فلو قرأ منكوساً اثم لكن لا يلزمه سجود السهو لان ذالک من واجبات القراء ة لامن واجبات الصلاة! كماذكر في البحر في باب السهو لكن قولهم كل صلوة اديت مع كراهة التحريم يشمل ترک الواجب وغيره ويؤيده ما صرحوا به من وجوب الاعادة بالصلاة في ثوب فيه صورة بمنزلة من يصلي وهو حامل الصنم.

(۳۷۴) دونمازوں کوایک وقت میں جمع کر کے ادا کرنے کا حکم اور اس کی شرائط

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں مجھے بتارہے تھے کہ حج کے موقع پر ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ ظہر وعصر کی نماز ظہر کے وقت جماعت سے پڑھی جاتی ہے، اگر کسی کی جماعت نکل گئی تو پھر ظہر کی ظہر کے وقت اور عصر کی عصر کے وقت ہی پڑھی جاتی ہے، اور مزدلفہ میں مغرب وعشاء، عشاء کے وقت میں ایک ساتھ پڑھی جاتی ہے خواہ جماعت سے پڑھو یا اکیلے اکیلے۔ ہم نے تو آج تک کبھی ایسے نہیں پڑھی، کیا یہ صرف حج کے موقع پر سب جگہ پڑھی جاسکتی ہے یا صرف حاجیوں کو اس کی اجازت ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ اور اس کی شرائط کیا ہیں؟ براہِ کرم تفصیل سے اس مسئلہ کو ذکر کردیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز صحیح ہونے کیلئے وقت شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں نماز کو اس کے مقررہ وقت میں پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَاباً مَّوْقُوْتاً۔ (بے شک نماز مومنوں پر اوقات مقررہ میں ادا کرنا فرض ہے) (سورۂ نساء: ۱۰۳)۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونمازوں کو ایک وقت میں جمع کر کے ادا کرنے سے لوگوں کو منع کیا اور فرمایا کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ عرفات میں ظہر اور عصر کو اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کرنے کے علاوہ ہم دونمازوں کو ایک وقت میں جمع نہیں کرتے لہٰذا معلوم ہوا کہ عرفات اور مزدلفہ کے علاوہ باقی کہیں بھی دونمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا جائز نہیں۔ اور جوازِ جمع بھی صرف حاجیوں کیلئے ہے۔ وہ بھی چند شرائط کے ساتھ جیسا کہ کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ اس کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے جو کہ احادیث سے ثابت ہے اور دوسری وجہ جماعت کی حفاظت ہے۔ عصر کو ظہر کے وقت میں ظہر کے ساتھ جمع کرنے کیلئے حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ (۱) امام اعظم یا اس کے نائب کا نماز پڑھانا۔ (۲) ظہر کی ادائیگی سے قبل ہی احرام حج میں ہونا۔ (۳) ظہر کو عصر سے پہلے ادا کرنا۔ (۴) عرفات کا دن ہونا۔ (۵) عرفات کا میدان ہونا۔ (۶) امام اعظم کی اقتداء میں دونوں نمازوں کو باجماعت ادا کرنا۔ مغرب کو عشاء کے وقت میں عشاء کے ساتھ جمع کرنے کیلئے حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ (۱) احرام حج۔ (۲) وقوف عرفہ کو مقدم کرنا۔ (۳) عیدالاضحیٰ کی رات

ہونا۔(۴) مزدلفہ کا میدان ہونا۔(۵) عشاء کا وقت ہونا۔

لمافی الهندية(۱/۲۲۸، ۲۲۹): ثم لجواز الجمع أعنى تقديم العصر على وقتها وادائها فى وقت الظهر شرائط ((منها)) ان تكون مرتبة على ظهر جائز استحسانا.......... ((ومنها الوقت)) وهو ان يكون يوم عرفة ((والمكان)) وهو عرفات كذا فى الكفاية((ومنها احرام الحج)) قالوا ينبغى ان يكون محرما بالحج عند اداء الصلاتين...... ثم لابد من الاحرام بالحج قبل الزوال فى رواية تقديما للاحرام على وقت الجمع وفى اخرى يكتفى بالتقديم على الصلاة لان المقصود هو الصلاة هو الصحيح كذا فى الهداية ......((ومنها الجماعة)) عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ وعندهما ليست بشرط. فمن صلى الظهر وحده فى رحله صلى العصر فى وقته عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ وقالا يجمع بينهما المنفرد كذا فى الهداية والصحيح قول ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ. كذا فى الزاد ولو فاتتا مع الامام او فاتته واحدة منهما صلى العصر لوقته ولا يجوز له تقديم العصر على قول ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ. ولا يشترط الامام لجميع اداء الظهر...... فاذا ادرک مع الامام ركعة واحدة من الصلاتين او شيئا من الصلاتين جاز الجمع اجماعاً كذا فى الجوهرة النيرة. ولو نفرالناس عن الامام فصلى وحده الصلاتين جاز...... ((ومنها)) ان يكون الامام هو الامام الاعظم او نائبه وهو شرط عند ابى حنيفة رحمه الله. فلو صلى الظهر بجماعة لامع الامام والعصر مع الامام لم يجز العصر عند ابى حنيفة رحمه الله والصحيح قوله هكذا فى البدائع. ولو مات الامام وهو الخليفة جمع نائبه او صاحب شرطته ولو لم يكن نائب ولا صاحب شرطته صلوا كل واحدة منهما فى وقتها كذا فى التبيين.

وفيه ايضاً(صـ۲۳۰): والافضل ان يصلى مع الامام بالجماعة كذا فى الايضاح. ذكر الامام المحبوبى ولا يشترط فى جمع المزدلفة الخطبة و السلطان والجماعة والاحرام كذا فى الكفاية

وفى الشامية(۲/۵۰۴): (تنبيه) اقتصر من الشروط على الإمام والإحرام وزاد فى اللباب تقديم الظهر على العصر حتى لو تبين للإمام وقوع الظهر قبل الزوال أو بغير وضوء والعصر بعده او بوضوء اعادهما جميعا والزمان وهو يوم عرفة والمكان وهو عرفة وما قرب منها والجماعة فالشروط ستة.

(۳۷۵) داڑھی منڈوانے والے شخص کو صف اول سے پیچھے کردینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص شیو کرتا ہو تو کیا اس کو صف اوّل میں نماز

پڑھنے سے روکا جائے گا یا نہیں؟ آیا شیو کی وجہ سے اس کو صف اوّل سے محروم کیا جائے گا یا نہیں؟ کراچی کے ایک بہت بڑے عالم ہیں، وہ اپنی مسجد میں شیو کرنے والوں کو صف اول سے نکال دیتے ہیں آیا ان کا یہ فعل درست ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل فرمائیں عین نوازش ہوگی۔شکریہ

الجواب حامداًومصلیاً......داڑھی رکھنا واجب ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور داڑھی کو منڈوانا حرام ہے۔ جو لوگ اس حرام کام میں مبتلا ہوں ان کو چاہیے کہ اس سے اجتناب کریں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کریں۔ اور جماعت سے نماز پڑھتے وقت ایسے لوگوں کو چاہیے کہ علماء وصلحاء سے بڑھ کر پہلی صف میں کھڑے نہ ہو جائیں بلکہ پہلی صف میں ایسے لوگ کھڑے ہو جائیں جو علماء وصلحاء ہوں جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اس حدیث کی تشریح میں (لیلینی منکم اولو الاحلام والنهى) علامہ شعرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ صف اول میں وہ لوگ کھڑے ہو جائیں جن کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو۔ ورنہ ان کیلئے آخری صفوں میں کھڑا ہونا بہتر ہے (اعلاء السنن ۴/۳٦٦)۔ البتہ ایسے لوگوں کے کھڑے ہو جانے کے بعد بھی اگر پہلی صف میں کوئی خلاء باقی رہ جائے تو پھر اس صورت میں ان پر لازم ہے کہ پہلی صف کو مکمل کریں اور اگر کوئی عالم ایسا ہو کہ جس کو اپنے علاقے میں لوگ اپنا مقتداء مانتے ہوں اور اس کی بات کی وجہ سے لوگ دین سے متنفر نہ ہوتے ہوں تو ایسا عالم اگر اصلاح کیلئے زجراً ان لوگوں کو جو داڑھی منڈاتے ہوں پہلی صف سے ہٹا دے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لما في الصحيح البخاري(۲/۸۷۵): عن ابن عمر رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ خالفوا المشركين او فروا اللحىٰ واحفوا الشوارب.

وفي البداية والنهاية (۴/۲٦۹): ودخلا على رسول الله ﷺ وقد حلقا لحاهما وأعفيا شواربهما فكره النظر اليهما وقال، ويلكما من أمر كما بهذا؟ قالا امرنا ربنا يعنيان كسرى، فقال رسول الله ﷺ ولكن ربي أمرني بإعفاء لحيتي وقص شاربي.

وفي الصحيح لمسلم (۱/۱۸۱): عن ابن مسعود قال كان رسول الله ﷺ يمسح مناكبنا في الصلاة ويقول استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبكم وليلني منكم اولو الاحلام والنُهىٰ ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم.

وفي اعلاء السنن (۴/۳٦۵،۳٦٦): قلت وعلى هذا، فيجوز إيثار العالم وكبير السن بالصف الأول بل يجب نظرا إلى الأمر، فإن الجاهل والصغير مأمور بالتأخر عن اهل الحلم والنهى، ويؤيده مارواه الحاكم في مستدركه عن أبي بن كعب مرفوعا "لا يقوم في الصف الاول الا المهاجرون والانصار" ذكره في كنز العمال بلا تعقب (۴:۱۳۵) فهو صحيح على قاعدته، وهو صريح في النهي لغير هؤلاء عن التقدم الى الصف الأول، وتخصيص الانصار والمهاجرين بالذكر لكونهم أولى الأحلام

والنهي اذ ذاک في الأغلب، وكونهم افضل من غيرهم. وأفاد هذا الحديث أن أمر المسارعة الى الصف الاول ليس على إطلاقه بل هو مختص بأولي الفضل و الصلاح، وكذا الوعيد الوارد على التأخر عنه مختص بهم أيضا نعم ايشمل الوعيد غيرهم اذا بقي في الصف الأول فرجة فلم يسدوها فافهم، فلو تأخر أحد عن الصف الاول لخلوه عن الصلاح والفضل والتقوى بشرط أن يرجوا كمال الصف بغيره ممن هو اهله فله ذلك ولا لوم عليه، بل ذلك متعين في حقه.

قال العلامة الشعراني في العهود المحمدية، أخذ علينا العهد إذا صفت سرائرنا من جميع ما يسخط الله عزوجل بحيث لم يبق في سرائرنا وظواهرنا الا ما يرضى ربنا أن نواظب على الصلوة في الصف الأول عملا بقوله ﷺ ليلني منكم اولو الاحلام و النهى اى العقل ولا يكون العبد عاقلا الا اذا كان بهذا الوصف الذى ذكرناه فإن من كان في ظاهره أو باطنه صفة يكرهها الله تعالىٰ فليس بعاقل كامل ولا يتقدم للصف الأول بين يدى الله في المواكب الإلهية الا الأنبياء والملائكة ومن كان على اخلاقهم وأما من تخلف عن اخلاقهم فيقف في آخريات الناس.

وفي الشامية(۴۱۸/۲): وأما الأخذ منها وهي دون ذلک كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد.

(۳۷۶) فرض نماز اور تراویح کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نمازوں اور تراویح اور اسی طرح جب وتر نماز جماعت کے ساتھ رمضان میں ادا کی جاتی ہے، اس کے بعد دعا انفرادی طور پر تو کرنے میں کوئی مزائقہ نہیں ہے۔لیکن اس دعا کو ایک ہیئت اور جمعیت کے ساتھ لازم سمجھنا کہ امام کے ساتھ دعا کے بغیر کوئی بھی نہ اٹھے تو یہ کام کیسا ہے؟ شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق ہے یا نہیں تو دونوں کو ادلۂ شریعہ سے واضح کریں۔شکریہ

الجواب حامداً ومصلیاً...... دعا ایک عبادت ہے، کثرت سے احادیث مبارکہ دعا کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں۔جن سے دعا کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔تاہم بعض حضرات نماز کے بعد دعا کے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہیں۔جس کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔فرض نمازوں اور تراویح کے بعد امام کے ساتھ تمام مقتدیوں کا مل کر دعا مانگنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔البتہ اس طور پر التزام کہ امام کے ساتھ دعا کے شروع کرنے اور ختم کرنے کو لازم سمجھنا یا بغیر دعا مانگے اٹھنے والے کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا اور اسی طرح اس بے جا التزام کی آڑ میں نفس دعا ہی کا انکار کر دینا دونوں امر حد سے متجاوز اور غلو فی الدین کے مترادف ہیں۔ان سے اجتناب انتہائی ضروری ہے خاص طور پر ہمارے زمانے میں جبکہ امت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔اور فقط چند عبادات میں امت کی اجتماعیت کی اک کرن

باقی ہے۔اس میں بھی اختلاف وانتشار کا دروازہ کھول لینا قطعاً مناسب نہیں ہے۔

لمافي البخاری(۲/۹۳۷). باب الدعاء بعد الصلوة: ......عن ورّاد مولی المغيرة بن شعبة قال كتب المغيرة الى معاوية ابن ابى سفيان ان رسول الله ﷺ كان يقول فى دبر صلوته اذا سلّم لا اله الا الله وحده لا شريک له له الملک وله الحمد وهو على كل شئ قدير، اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطى لما منعت ولا ينفع ذالجد منک الجد.

وفى فتح البارى(۱۱/۱۱۱): (قوله باب الدعاء بعد الصلوة) اى المكتوبة وفى هذه الترجمة رد على من زعم أن الدعاء بعد الصلوة لا يشرع متمسكا بالحديث الذى اخرجه مسلم والجواب ان المراد بالنفى المذكور نفى استمراره جالسا على هيئته قبل السلام الا بقدر ان يقول ما ذكر. فقد ثبت انه كان اذا صلى أقبل على أصحابه فيحمل ماورد من الدعاء بعد الصلوة على انه كان يقول بعد ان يقبل بوجهه على اصحابه.

وفى فيض البارى على صحيح البخارى(۴/۴۱۷): باب "الدعاء بعد الصلاة" لا ريب ان الادعية دبر الصلوات قد تواترت تواترا لا ينكر، اما رفع الأيدى فثبت بعد النافلة مرة او مرتين، فالحق بها الفقهاء المكتوبة ايضا، وذهب ابن تيمية وابن القيم إلى كونه بدعة بقى ان المواظبة على امر لم يثبت عن النبى ﷺ الامرة او مرتين، كيف هى فتلک هى الشاكلة فى جميع المستحبات فانها تثبت طورا فطورا، ثم الامة تواظب عليها، نعم نحكم بكونها بدعة اذا افضى الامر إلى النكير على من تركها.

وفى اعلاء السنن(۳/۱۸۳): قال الحافظ فى الفتح: قال ابن المنير: ان المندوبات قد تنقلب مكروهات اذا رفعت عن رتبتها، لان التيامن مستحب فى كل شئ من أمرر العبادة لكن لما خشى ابن مسعود ان يعتقدولوجوبه اشار الى كراهته. والله اعلم اهـ.

وليتنبه لهذا من يصر على القيام عند ذكر الولادة الشريفة ويطعن فى من لايقوم وكذا كل من رفع المباح او المندوب عن رتبتهما وطعن فى تاركهما فافهم.

وفى مجموعة الفتاوى على خلاصة الفتاوى(۱/۱۰۰):الجواب صحيح والراى نجيح ويؤيد ما رواه ابو بكر بن ابى شيبة فى المصنف عن الأسود العامرى عن ابيه قال صليت مع رسول الله ﷺ الفجر فلما سلم انصرف ورفع يديه ودعا الحديث. فثبت بعد الصلوة المفروضة رفع اليدين فى الدعا عن سيد الانبياء و اسوة الاتقياء صلعم كمالا يخفى على العلماء الاذكياء.

﴿احکام المساجد﴾

(۳۷۷) مسجد میں کسی جگہ رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں دو چار آدمی ایسے ہیں جو کہ پہلی صف میں رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرتے ہیں اور خود وضو وغیرہ کیلئے چلے جاتے ہیں تو کیا اس طرح صف میں رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... جو شخص پہلے آکر مسجد میں نہ بیٹھا ہو وہ اپنا رومال کسی جگہ مسجد میں قبضہ کرنے کی غرض سے رکھ دے یہ شرعاً جائز نہیں ہے اور اس سے اس کا حق بھی قائم نہیں ہوتا، خواہ وضو کیلئے جائے یا اور کسی غرض سے جائے۔ ہاں وہ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا، لیکن کسی عذر کی وجہ سے چلا جائے تو پھر گنجائش ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۰۸): ويكره للانسان ان يخص لنفسه مكانا في المسجد يصلي فيه.

وفي الشامية(۱/۶۶۲): قوله وتخصيص مكان لنفسه: لانه يخل بالخشوع كذا في القنية اى لانه اذا اعتاده ثم صلى في غيره يبقى باله مشغولا بالاوّل بخلاف ما اذا لم يالف مكانا معينا (قوله وليس له) قال في القنية له في المسجد موضع معين يواظب عليه وقد شغله غيره قال الاوزاعي له ان يزعجه وليس له ذلك عندنا اى لان المسجد ليس ملكا لاحد. بحر عن النهاية قلت: وينبغي تقييده بما إذا لم يقم عنه على نية العود بلا مهلة، كمالو قام للوضوء مثلا ولا سيما إذا وضع فيه ثوبه لتحقق سبق يده تأمل.

(۳۷۸) سرکاری زمین میں حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کی توسیع اور اس میں نماز پڑھنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سرکاری زمین پر حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کی توسیع کرنا اور اس میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مساجد بنائے اور ان کی توسیع کرے اگر حکومت اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتی تو وہ گناہگار ہوگی۔ جاننا چاہیے کہ سرکاری زمینیں دو قسم کی ہیں پہلی قسم وہ زمینیں جو صرف حکومت کی ملکیت میں ہوں اور عوام کا اس میں کوئی حق نہ ہو، مثلاً حکومت نے اس کو ہسپتال یا اسکول کیلئے خاص کیا ہو، تو ایسی زمینوں میں حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا یا اس کی توسیع کرنا

جائز نہیں اور اگر بنائی گئی تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

دوسری قسم وہ زمینیں جو رفاہی ہوں جیسے مویشیوں کی چراگاہ، بچوں کے کھیل کے میدان وغیرہ تو اس میں ضرورت کے وقت حکومت کی اجازت کے بغیر بھی مسجد کی توسیع کرنا جائز ہے، اور اس میں نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہوگا۔

لما في الهندية(۲/۳۵۳): ومنها الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه اوصالح على مال دفعه اليه لاتكون وقفا كذا في البحر الرائق.

وفيه ايضاً(۲/۴۵۶): ارض وقف على مسجد والارض بجنب ذلك المسجد وارادوا ان يزيدوا في المسجد شيئا من الارض جاز لكن يرفعون الامر الى القاضي ليأذن لهم.

وفي الفقه الاسلامي(۶/۴۶۰۷): الأراضي نوعان ارض مملوكة وارض مباحة والمملوكة نوعان عامرة وخراب والمباحة نوعان ايضا نوع هو من مرافق البلد للاحتطاب ورعى المواشي ونوع ليس من مرافقها وهو الارض الموات اوما يسمى الآن املاك الدولة العامة.

وفيه ايضاً(۶/۴۶۰۸): ما كان من مرافق أهل بلدة تستعمل مرعى للمواشي ومحتطبا لهم أو مقبرة لموتاهم أو ملعباً لصغارهم، سواء كانت داخل البلدة أم خارجها فيكون حقالهم لامواتا فلا يجوز للإمام أن يقطعه لأحد.

(۳۷۹) مساجد میں ایکو ساؤنڈ کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد (جیسا کہ ہماری مسجد) میں ایکو ساؤنڈ لگا ہوتا ہے جس کی وجہ سے جب مؤذن یا امام ایک مرتبہ اللہ اکبر کہتا ہے تو ایک مرتبہ کہنے کی وجہ سے تین چار مرتبہ آواز سنائی دیتی ہے کیا اس سے نماز میں کراہت نہیں آتی؟ نیز یہ آواز جتنی مرتبہ سنائی دیتی ہے اتنی مرتبہ ہی شمار ہوگی یا ایک مرتبہ شمار ہوگی؟ بخاری (۱/۸۵) پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اثر ہے کہ ''اذن اذانا سمحا والافاعتزلنا'' اور سمحا کا مطلب یہ ہے کہ سہل و بلا نغمہ ہو، آواز میں طرب (یعنی درجہ بدرجہ) نہ ہو، کیا ایکو (Echo) والی آواز میں طرب نہیں ہے اگر ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی رُو سے تحقیقی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... عبادات کی ادائیگی کا جو طریقہ عہد نبوی سے تا حال چلا آرہا ہے وہ شریعت میں آج بھی ممدوح ومطلوب ہے جیسا کہ باجماعت نماز کی ادائیگی میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مکبّرین کا تقرر جو کہ قدیم سنت ہے، اس پر عمل پیرا ہونا افضل ہے۔ جبکہ سائنس کی نئی نئی ایجادات جن میں آلۂ مکبر الصوت ''لاؤڈ اسپیکر'' بھی داخل ہے جس کے ہوتے ہوئے مکبّرین کے تقرر کی طرف احتیاج باقی نہیں رہتی، تو حضرات مفتیانِ کرام نے نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو سہولت اور عموم بلوی کے پیشِ نظر جائز قرار دیا ہے۔

جہاں تک مساجد میں ایکوساؤنڈ کا استعمال ہے تو اس سے مقصود تحسین صوت ہے کہ اذان وقرأت کی ادائیگی قلوب پر اثر انداز ہو کے خشوع کی زیادتی کا باعث بنے جو کہ غرض صحیح ہے۔ ایکوساؤنڈ کے ذریعہ کلمات کا تکرار جو سننے میں آتا ہے تو وہ بمنزلہ صدائے بازگشت کے ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک ہی تکبیر شمار ہوگی البتہ اگر یہ گونج اس قدر زیادہ ہو کہ جس سے نمازی کے خشوع میں خلل واقع ہو، اور قرأت ہی سمجھ میں نہ آئے تو ایسی صورت میں ایکوساؤنڈ کے استعمال سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا مؤذن کو''اذن اذانا سمحا والافاعتزلنا''ارشاد فرمانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ اذان کے کلمات میں زائد تکرار کررہے تھے بلکہ وہ تصنع اور گاگا کر اذان دیا کرتے تھے اس تفسیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس مقولہ کو (جو کہ صحیح بخاری شریف میں تعلیقا ذکر ہے) ابن ابی شیبہ نے موصولا روایت کیا ہے جس میں لفظ تطریب کی صراحت ہے۔(۱/۲۰۷)

وفي الدر المختار(۲/۱۰۸): (لا) تجب (بسماعه من الصدى والطير)

وفي اللجنة الدائمة(۶/۶۵): س: هل صح قول من قال: بعدم استحباب الأذان بمكبرات الأصوات باعتبارها المولدة لمضاعفات الأصوات عن الحجم الصغير يلقيه المؤذن في الأصل، ذلك لالحاقه بالأذان بالراديو أو التلفاز،

ج: ألأذان بمكبرات الصوت لتبليغ من بعد وغيره لاحرج فيه، لما في ذلك من المصلحة العامة.

(۳۸۰) مسجد میں نمازیوں کے سامنے کی طرف ہیٹر لگانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں ہیٹر لگانا کیسا ہے؟ نیز اگر ہیٹر نمازیوں کے سامنے صف میں یا اکیلے آدمی کے سامنے پڑا ہو تو نماز میں کوئی حرج آئے گا؟ یا اگر دیوار پر اوپر سامنے لگا ہوا ہو تو نماز میں کوئی حرج آئے گا یا نہیں؟ کیا اس میں تشبہ بالمجوس ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... مسجد میں ضرورت کی وجہ سے ہیٹر لگانے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے سامنے ہونے سے تشبہ بالمجوس بھی لازم نہیں آتا۔

لمافي الشامية (۱/۶۵۲): وفي شرح المنية: وجه عدم الكراهة أن كراهة استقبال بعض الأشياء باعتبار التشبه بعبادها...... (قوله أوشمع)...... وعدم الكراهة هو المختار كما في غاية البيان وينبغي الاتفاق عليه فيما لو كان على جانبيه كما هو المعتاد في ليالي رمضان بحر:........(قولهٗ قنية) ذكر ذلك في القنية في كتاب الكراهية ونصه: الصحيح أنه لايكره أن يصلّي وبين يديه شمع أو سراج لأنّه لم يعبدهما أحد والمجوس يعبدون الجمر لاالنّار الموقدة، حتّى قيل لايكره إلى النّار الموقدة

وظاھرہ أنّ المراد بالموقدۃ التی لھا لھب، لکن قال فی العنایۃ: أن بعضھم قال: تکرہ إلی شمع أو سراج کما لو کان بین یدیہ کانون فیہ جمرأو نار موقدۃ اھ وظاھرہ انّ الکراھۃ فی الموقدۃ متفق علیھا کما فی الجمر تأمّل.

وفی اللجنۃ الدائمۃ(۸۸/۷):س۵: ھل یجوز تولیع الدفایات الکھربائیۃ أمام المصلّین أولا.

ج۵: یجوز ذلک لمسیس الحاجۃ إلی ذلک.

(۳۸۱) مسجد کے پودوں کے مالی کو مسجد کی آمدنی سے تنخواہ دینے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک متولی مسجد نے مسجد کی رقم سے مسجد کی دیواروں کے ساتھ ساتھ سبزہ وپودے لگوائے ہیں۔ کچھ عرصہ تک ایک مالی کو رکھ کر اس کو بھی مسجد سے تنخواہ ادا کرتا رہا ہے اب مالی کی چھٹی کردی گئی ہے جس سے وہ سبزہ وغیرہ خشک ہورہے ہیں۔ اب حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کی رقم سے سبزہ پودے وغیرہ لگانا اور مالی کو تنخواہ دینا جائز ہے؟ اور وہ متولی مسجد اللہ کے ہاں مجرم ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....مسجد میں سبزہ وپودے لگانے سے مسجد کا ماحول پررونق وخوشگوار بنتا ہے۔ اس لئے یہ مصالح مسجد میں داخل ہے اور اس کیلئے مالی رکھنا اور اس کو مسجد کی رقم سے تنخواہ دینا درست ہے، مسجد کے مصارف میں تعاون کرنے والوں کی طرف سے دلالۃً اس کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہئے، اسراف ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

لمافی الولوالجیۃ(۸۸/۳): رجل غرس فی المسجد ھھنا اربع مسائل احداھا ھذہ: (بعد ثلاثۃ اسطر) ففی المسئلۃ الاولی: الشجر یکون للمسجد، لانہ بمنزلۃ بناء المسجد.

وفی الخانیۃ علی الھندیۃ (۳۱۰/۳): ولوغرس فی المسجد یکون للمسجد لانہ لایغرس لنفسہ فی المسجد...... مسجد فیہ شجرۃ التفاح قال بعضھم یباح للقوم ان یفطروا بھذا التفاح والصحیح انہ لایباح لان ذالک صار للمسجد،یصرف الی عمارۃ المسجد.

(۳۸۲) جوتے پہن کر مسجد میں آنا اور انہی میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی آدمی جوتے پہن کر مسجد میں آکر نماز پڑھتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۲)۔گھر وغیرہ میں ان جوتوں میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....جوتے اگر ایسے ہوں کہ سجدے میں وہ پیروں کی انگلیاں زمین پر لگنے سے مانع نہ ہوں، اور ناپاک نہ ہوں تو ایسے

جوتوں میں اگر نماز پڑھ لی جائے اگر چہ مسجد میں ہی کیوں نہ ہو، درست ہو جائے گی البتہ آجکل عرفاً یہی مناسب ہے کہ جوتوں کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ آجکل مساجد میں فرش اور قالین ہوتا ہے جوتوں میں نماز پڑھنے کی وجہ سے عام طور پر مسجد کی تلویث کا خطرہ رہتا ہے۔

(۲)۔اسی طرح گھر وغیرہ میں بھی جوتوں میں نماز پڑھنا درست ہے مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ۔

لمافی فتح الملهم(۴/۹-۱۲): قوله قال نعم،الخ فيه جواز الصلوة فی النعال والخفاف، ای اذا تحقق طهارتها، ویتمكن معها من تمام السجود، بأن يسجد على جميع اصابع رجليه كما قاله الخطابی.

وفی الدر المختارمع رد المحتار(۱/۶۵۷): وينبغی لداخله تعاهد نعله وخفه وصلوته فيهما افضل (لا) يكره. (قوله وصلاته فيهما) ای فی النعل والخف الطاهرين افضل مخالفة لليهود...... قلت لكن اذا خشی تلويث فرش المسجد بها ينبغی عدمه وان كانت طاهرة واما المسجد النبوی فقد كان مفروشا بالحصی فی زمنه ﷺ بخلافه فی زماننا الخ.

وفی الشامية(۱/۴۴۷): (قوله وقدميه) يجب اسقاطه لان وضع اصبع واحد منهما يكفی كما ذكره بعدح وأفاد انه لو لم يضع شيئاً من القدمين لم يصح السجود.

وفی الفقه الاسلامی(۱/۵۵۳): السنة لمن اراد دخول المسجد أن يتفقد نعليهويمسح ما فيهما من اذی قبل دخوله لحديث،((اذا جاء احدكم المسجد فلينظر فان رأی فی نعليه قذرا اواذی فليمسحه وليصل فيهما.

﴿کتاب الجنائز والشهيد﴾

(نماز جنازہ، تجہیز و تکفین اور شہید سے متعلق مسائل کا بیان)

(۳۸۳) میت کو غسل دیتے وقت کان وناک کے سوراخوں میں روئی رکھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جس وقت میت کو غسل کیلئے تختے پر لٹایا جائے تو پہلے میت کے ناک وکان کے سوراخوں میں روئی کی پھریری رکھنے کا جو دستور ہے اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....ظاہر الروایات سے تو اس کا ثبوت نہیں ملتا لیکن غیر ظاہر الروایت میں امام ابوحنیفہؒ سے ایک قول مروی ہے کہ عند الغسل روئی کی پھریری میت کے اعضائے مذکورہ میں رکھ دے۔

لمافي الدر المختار(۱۹۸/۲): ولابأس بجعل القطن على وجهه وفي مخارقه كدبر وقبل واذن وفم.

وفي الشامية(۱۹۸/۲): (قوله ولا باس الخ) كذا في الزيلعي واشار الى ان تركه اولىٰ قال في الفتح وليس في الغسل استعمال القطن في روايات الظاهرة وعن ابي حنيفة انه يجعل في منخريه وفمه وقال بعضهم في صماخه ايضاً وقال بعضهم في دبره ايضاً قال في الظهيرية واستقبحه عامة العلماء لكن في الحلية انه منقول عن الشافعي وابي حنيفة فاطلاق انه قبيح ليس بصحيح الخ.

(۳۸۴) میت کو غسل دیتے وقت سر کے مسح کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو غسل دیتے وقت سر کا مسح کرنا بھی سنت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صحیح قول کے مطابق میت کو غسل سے پہلے وضو کراتے وقت اس کے سر پر مسح کیا جائے گا۔

لمافي الدر المختار(۱۹۶/۲): ويبدأ بوجهه ويمسح رأسه. وقال الشامي تحت قوله يمسح رأسه اى في الوضوء وهو ظاهر الرواية كالجنب بحر.

وفي الهندية(۱۵۸/۱): الفصل الثاني في الغسل..... واختلفوا في مسح رأسه والصحيح انه يمسح رأسه .....

(۳۸۵) میت کو غسل دینے کے بعد اگر نجاست خارج ہو جائے تو غسل کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر میت کو کفن دینے کے بعد کوئی نجاست خارج ہو تو کیا اسے دوبارہ غسل دیا جائے گا یا یہی غسل کافی ہے اور صرف نجاست کو دھو دیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں دوبارہ غسل دینے کی ضرورت نہیں پہلے والا غسل کافی ہے صرف محل نجاست کو دھولیا جائے جہاں پر نجاست لگی ہے اس مقام کو دھولیا جائے۔

لمافي الهندية (۱/۱۵۸): ويمسح بطنه مسحاً رفيقاً تحرزاً عن تلويث الكفن فان خرج منه شئ غسله ولا يعيد غسله ولا وضوءه ثم ينشفه بثوب كيلا تبتل اكفانه الخ.

وفي ملتقى الابحر (۱/۱۵۶): فان خرج منه شئ غسله ولا يعيد غسله ولا وضوءه وينشفه بثوب الخ.

وفي الدر المختار مع الشامية (۲/۱۹۷): ولا يعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه لان غسله ماوجب لرفع الحدث لبقائه بالموت بل لتنجسه بالموت كسائر الحيوانات الدموية الا ان المسلم يطهر بالغسل كرامة له وقد حصل بحر.

وفي الشامية تحته: (قوله وقد حصل) اى الغسل وبطروالنجاسة بعده لايعاد بل يغسل موضعها.

(۳۸۶) کوئی شخص کسی حادثہ میں مر جائے اور اعضاء متفرق ہو جائیں تو غسل کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص آگ میں جھلس کر مر گیا اس کے بعض اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے اور بعض راکھ بن گئے۔ اسی طرح سے ایک شخص گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں جان بحق ہو گیا اور اس کے بھی اعضاء اس حادثے میں بکھر گئے کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ اس کا سر کہاں ہے؟ ایسے اشخاص کے بارے میں غسل اور ان کی نمازِ جنازہ کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اگر میت کے جسم کے اکثر اعضاء یا آدھا جسم سر کے ساتھ موجود ہو تو اس صورت میں اس کو غسل بھی دیا جائے گا اور اس پر نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی لیکن اگر میت کا آدھا جسم بغیر سر کے یا آدھے سے بھی کم جسم (اگر چہ سر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو) پایا گیا تو اس کو نہ ہی غسل دیا جائے گا اور نہ ہی اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ بلکہ اس کو یونہی دفن کر دیا جائے گا۔

لمافي الهندية (۱/۱۵۹): ولو وجد اكثر البدن او نصفه مع الراس يغسل ويكفن ويصلى عليه كذا في المضمرات......... وان وجد نصفه من غير الرأس او وجد نصفه مشقوقاً طولاً فانه لايغسل ولا

يصلي عليه ويلف في خرقة ويدفن فيها كذا في المضمرات.

وفي الدر المختار و رد المحتار (۱۹۹/۲): (وجد رأس آدمي) او احد شقيه (لايغسل ولا يصلى عليه) بل يدفن الاان يوجد اكثر من نصفه ولو بلا رأس الخ.

وفي الشامية تحته: (قوله ولو بلا رأس) وكذا يغسل لو وجد النصف مع الرأس بحر.

(۳۸۷) عورت کی میت کو نہلاتے وقت اس کے ستر کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مُردہ عورت کو نہلاتے وقت پورے بدن پر کپڑا ڈالنا ضروری ہے یا مرد کی طرح صرف گھٹنوں اور ناف تک چھپانا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں عورت کو عورت سے اس قدر پردہ ہے جتنا مرد کو مرد سے اس لئے عورت کو نہلاتے وقت صرف ناف سے زانو تک کپڑا ڈالنا کافی ہے۔

لما في الدر المختار (۱۹۵/۲): عبارة الزيلعي حتى يغسل وعبارة النهر قبل غسله (وتستر عورته الغليظة فقط على الظاهر) من الرواية (وقيل مطلقا) الغليظة والخفيفة (وصحح) صححه الزيلعي وغيره (ويغسلها تحت خرقة) السترة (بعد لف) خرقة (مثلها على يديه)

وفي الشامية تحته: (قوله صححه الزيلعي وغيره) والاوّل صححه في الهداية وغيرها لكن قال في شرح المنية ان الثاني هو المأخوذ به لقوله عليه الصلوة والسلام لعلي "لاتنظر الى فخذ حي ولا ميت" لان ما كان عورة لا يسقط بالموت..... وهذا شامل للمرأة والرجل لان عورة المرأة للمرأة كالرجل للرجل.

(۳۸۸) عورت کو کفن دیتے وقت بالوں کو کس طرح رکھا جائے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کفن کے وقت عورت کے سر کے بالوں کو کیسے رکھا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں عورت کے سر کے بالوں کو دو حصے کر کے سینہ کے اوپر دائیں بائیں رکھا جائے۔

وفي الهندية (۱۶۱/۱): ويجعل شعرها ضفيرتين على صدرها فوق الدرع.

وفي الدر المختار (۲۰۴/۲): ويجعل شعرها ضفيرتين على صدرها فوقه اى الدرع.

(۳۸۹) آبِ زمزم سے احرام کی چادریں دھوکر کفن کے لئے رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے میری خالہ جو کہ میری ساس بھی ہیں نے ایک نصیحت کی ہے کہ بیٹا اس سال آپ حج پر جارہے ہو، اپنے احرام کو مائے زمزم میں ضرور دھولینا، اور پھر آکر اس کو محفوظ کر کے کفن کی نیت سے رکھ لینا، کیا اس طرح کرنا بدعت تو نہیں ہوگا؟ اور اس میں کوئی شرعی مانع تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اپنے لئے مرنے سے پہلے کفن تیار کرنا اور اسی طرح مقدس چیزوں سے تبرک حاصل کرنا شرعاً جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ احرام کی چادروں کو آبِ زمزم سے دھوکر اپنے کفن کے لیے رکھ سکتے ہیں، نہ یہ بدعت میں شامل ہے اور نہ اس میں کوئی شرعی مانع ہے۔

لـمافی مرقاة المفاتيح(۴/۱۰۶): وعن عبدالله بن عباس قال ان رجلا كان مع النبی ﷺ فوقصته ناقته وهو محرم فمات فقال رسول الله ﷺ((اغسلوه بماء سدر وكفنوه فی ثوبيه ولا تمسوه بطيب ولا تخمّروا راسه فانه يبعث يوم القيامة ملبّيا)) متفق عليه. وقد قال عليه الصلوة والسلام فی ذلک المحرم كفنوه فی ثوبيه وهما ثوبا احرامه ازاره ورداؤه ومعلوم ان ازاره من الحقو وكذا حديث ام عطية.

وفی عمدة القاری(۸/۶۳ـ۶۱): (باب من استعد الكفن فی زمن النبی ﷺ فلم ينكر عليه) واستفيد من ذلک جواز تحصيل مالا بد للميت منه من كفن ونحوه فی حال حياته لان افضل ماينظر فيه الرجل فی الوقت المهمل وفسحة الاجل الاعتداد للمعاد. وفيه التبرک بآثار الصالحين وفيه جواز اعداد الشئ قبل وقت الحاجة اليه.

وفی فتح الباری(۳/۱۱۰۸ـ۱۰۷): (قوله باب الكفن فی القميص الذی يكف اولايكف) ......وكذا رايته فی اصل ابی القاسم بن الورد قال والذی يظهر لی ان البخاری لحظ قوله تعالیٰ استغفر لهم اولا تستغفر لهم ای ان النبی ﷺ البس عبدالله بن ابی قميصه سواء كان يكف عنه العذاب اولا يكف استصلاحا للقلوب المولفة فكأنه يقول يوخذ من هذا التبرک بآثار الصالحين سواء علمنا انه مؤثر فی حال الميت اولا.

واستنبط منه الاسماعيلی جواز طلب آثار اهل الخير منهم للتبرک بها وان كان السائل غنيا فيستفاد منه جواز تحصيل مالا بدللميت منه من كفن ونحوه فی حال حياته.

(۳۹۰) نمازِ جنازہ کی ترتیب اور تکبیرات کا حدیث سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی ترتیب کیا ہوگی؟ نیز بتائیں تکبیریں چار ہیں یا پانچ؟ حدیث سے چار کا ثبوت ملتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نمازِ جنازہ میں چار تکبیرات ہوتی ہیں، پہلی تکبیر کہہ کر سبحانک اللّٰھم الخ پڑھا جائے پھر دوسری تکبیر کہہ کر درود شریف پڑھا جائے، پھر تیسری تکبیر کہہ کر میت کیلئے دعا پڑھی جائے اور تمام مسلمانوں کیلئے دعا کی جائے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اللھم اغفر لحینا ومیتنا الخ ثابت ہے۔ اور اگر میت چھوٹا بچہ ہے تو دعا میں اللھم اجعله لنا فرطاً وجعله لنا اجراً و ذخراً واجعله لنا شافعاً ومشفعاً پڑھے، اور اگر چھوٹی بچی ہو تو اللھم اجعلها لنا فرطاً الخ پڑھے پھر چوتھی تکبیر کہہ کر دونوں طرف سلام پھیر دے، اور جنازے میں چار تکبیروں کا ثبوت حضرت ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن ابی اوفیٰ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ اور یزید بن ثابتؓ کی احادیث سے ہوتا ہے، نیز حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

لمافي الترمذي (۱/۱۹۸): لما جآء عن ابي هريرةؓ: أن النبي ﷺ صلى على النجاشي فكبر اربعاً، وفي الباب عن ابن عباسؓ وابن ابي اوفيٰ وجابرؓ وانسؓ ويزيد بن ثابت...... قال ابو عيسىٰ حديث ابي هريرةؓ هذا حديث حسن صحيح"

وفي الهندية(۱/۱۶۴): وصلاة الجنازة اربع تكبيرات ولو ترك واحده منها لم تجز صلاته هكذا في الكافي فيكبر للافتتاح ويقول سبحانك اللهم الخ ثم يكبر اخرىٰ ويصلّي على النبي ﷺ ثم يكبر أخرىٰ ويدعو للميت وجميع المسلمين وليس فيها دعآء موقت وعن رسول الله ﷺ انه كان يقول، اللهم اغفر لحينا وميتنا الخ فان كان الميت صغيراً عن ابي حنيفةؒ انه يقول اللهم اجعله لنافرطاً الخ...... ثم يكبر الرابعة ثم يسلم تسليمتين.

وفي الدر المختار مع التنوير (۲/۲۱۲): وهي اربع تكبيرات كل تكبيرة قائمة مقام ركعة يرفع يديه في الأولىٰ فقط...... ويثني بعدها وهو سبحانك اللهم وبحمدك" ويصلي على النبي ﷺ كما في التشهد بعد الثانية...... ويدعو بعد الثالثة...... ويسلّم بلا دعاء بعد الرابعة".

(۳۹۱) نمازِ جنازہ کی ثناء میں اور درود شریف میں زیادتی کا حدیث سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ میں جو ثناء پڑھی جاتی ہے جس میں وجل ثناؤک کی زیادتی ہے اسی طرح درود شریف میں زیادتی ہے، آیا یہ حدیث سے ثابت ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....ثناء کے متعلق جومشہورروایات ہیں ان میں وجل ثناؤک کے الفاظ نہیں ہیں، اسی طرح درود شریف میں بھی کوئی زیادتی نہیں ہیں لیکن بعض شاذ روایات میں یہ زیادتی موجود ہے، لہٰذا اگر کہہ دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی فتح القدیر (۱/۲۹۰): وان کان روی فی الجملة عن ابن عباس فی حدیث طویل من قوله وذکره ابن ابی شیبة وابن مردویة فی کتاب الدعا له ورواه الحافظ ابو شجاع فی کتاب فردوس عن ابن مسعودؓ ان من أحب الکلام الی الله عزوجل ان یقول العبد سبحانک اللهم وبحمدک و تبارک اسمک وتعالی جدک وجل ثناؤک ولا اله غیرک وابغض الکلام الی الله ان یقول الرجل للرجل اتق الله فیقول علیک نفسک.

وفی فتح القدیر (۱/۳۱۷): وروی البیهقی عن یحیی بن السباق عن رجل من بنی الحارث عن ابن مسعود عنه ﷺ اذا تشهد أحدکم فی الصلاة فلیقل اللهم صل علی محمد وعلی آل محمد وبارک علی محمد وعلی آل محمد وارحم محمدا وآل محمد کما صلیت وبارکت وترحمت علی ابراهم وعلی آل ابراهم إنک حمید مجید.

(۳۹۲) نمازِ جنازہ مکروہ اوقات میں پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کن کن اوقات میں مکروہ ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....نمازِ جنازہ کا پڑھنا سورج کے طلوع وغروب کے وقت اور عین دوپہر کے وقت مکروہ ہے البتہ جنازہ اُسی وقت تیار ہوجائے تو صحیح ہے۔

لمافی نور الایضاح (ص۵۷): ثلاثة أوقات لایصح فیها شیئ من الفرائض والواجبات التی لزمت فی الذمة قبل دخولها عند طلوع الشمس الی ان ترتفع وعند استوائها إلی ان تزول وعند اصفرارها إلی أن تغرب ویصح أداء ماوجب فیها مع الکراهة. کجنازة حضرت وسجدة آیة تلیت فیها کما صح عصر الیوم عند الغروب مع الکراهة.

وفی الهندیة (۱/۵۲): ثلاث ساعات لا تجوز فیها المکتوبة ولا صلاة الجنازة ولا سجدة تلاوة...... أما لو وجبتا فی هذا الوقت وادیتا فیه جاز لأنها أدیت ناقصة کما وجبت. کذا فی السراج الوهاج.

وفی الشامیة (۱/۳۷۴): (قوله وصلاة جنازة) فیه أنها تصح مع الکراهة کمافی البحر...... (قوله فلو وجبتا فیها)، أی بأن تلیت الآیة فی تلک الأوقات أو حضرت فیها الجنازة، قوله أو تحریما) افاد ثبوت الکراهة التنزیهیة اهـ.

(۳۹۳) نماز جنازہ میں تکبیرات چھوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ مکروہ وقت میں پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اگر نماز جنازہ میں کسی کی کچھ تکبیرات چھوٹ جائیں تو اب وہ انہیں کیسے ادا کرے گا؟

الجواب حامداًومصلیاً......(۱)۔نمازِ جنازہ اگر مکروہ وقت میں حاضر ہوجائے اس کو مکروہ وقت میں پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں اور اگر جنازہ مکروہ وقت سے پہلے حاضر کردیا جائے پھر اس کو مکروہ وقت میں ادا کرنا جائز نہیں۔

(۲)۔اگر نمازِ جنازہ میں کسی کی کچھ تکبیریں چھوٹ جائیں تو وہ ان کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرے گا پھر اگر جنازہ اٹھائے جانے کا خوف نہ ہو تو تکبیرات کے ساتھ ساتھ دعا ماثورہ وغیرہ بھی پڑھنی چاہئے اور اگر جنازہ اٹھائے جانے کا خوف ہو تو پھر صرف تکبیرات کہہ لے دعا وغیرہ نہ پڑھے۔

لـمـافـي الشـامية(۱/۳۷۳): واعـلـم أن الاوقـات الـمكروهة نوعـان: الأول الشروق والاستواء والغروب ، والثاني مابين الفجر والشمس وما بين صلاة العصر الى الاصفرار. فالنوع الأول لاينعقد فيه شئ من الصلوات التي ذكرناها اذا شرع بها فيه وتبطل ان طرأعليها الاصلاة جنازة حضرت فيها و سجدة تـليـت آيتهـا فيهـا وعـصـر يومه و النفل والنذر المقيدبها وقضاء ماشرع به فيها ثم افسده فتنـعقد هذه الستة بلا كراهة أصلا في الأولىٰ منها، ومع الكراهة التنزيهية في الثانية والتحريمية في الثالثة وكذا في البواقي.

وفـي الـدر الـمـخـتـار(۲/۲۱۷): (فلوجاء) المسبوق (بعد تكبيرة الامام لرابعة فاتته الصلاة) لتعذر الدخول في تكبيرة الامام وعـنـد ابي يوسف يدخل لبقاء التحريمة فاذا سلم الامام كبر ثلاثا كمافي الحاضر وعليه الفتوى.

(۳۹۴) نماز جنازہ میں امامت کا زیادہ مستحق کون ہے؟ اور عصبہ کا شرعی معنی

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کی نماز میں امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ عصبہ کا شرعی معنی کیا ہے ان کی ترتیب کیا ہے وہ کتنے افراد پر مشتمل ہے نیز اگر کسی شخص کا دوسرے شہر میں انتقال ہوجائے تو اس میت کو اپنے وطن اصلی میں لاکر دفن کرنا، نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......نماز جنازہ کی امامت میں سب سے مستحق بادشاہ یا اس کا نائب ہے بشرطیکہ یہ موجود ہوں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو قاضی اس کے بعد شہر کا امیر ہے اگر امیر شہر نہ ہو تو اس کا نائب یعنی قائم مقام اور اگر یہ نہ ہو تو پھر قاضی کا خلیفہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر امامت کا

زیادہ استحقاق میت کے محلے کی مسجد کے امام کو حاصل ہے اور اس کے بعد میت کا ولی قریب نکاح میں ولایت کی ترتیب کی طرح یعنی اولاً میت کے سب سے زیادہ قریب کو درجہ بدرجہ آخر تک جس کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

(2)......شریعت میں عصبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کیلئے کوئی متعین حصہ مالِ وراثت میں مقرر نہ کیا گیا ہو بلکہ ذوی الفروض (جن کے متعین حصے بیان کیے گئے ہیں) کے حصے سے جو مال بچ جائے ان کو ملتا ہو، البتہ جب ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا مال ان کو ملتا ہو پھر عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱)۔عصبہ بالنسب، (۲)۔عصبہ بالسبب اور عصبہ بالنسب کی تین قسمیں ہیں۔ (۱)۔عصبہ بنفسہ، (۲)۔عصبہ بغیرہ، (۳)۔عصبہ مع غیرہ۔ اب مذکورہ بالا اقسام میں جنازہ کی امامت میں عصبہ بنفسہ کا اعتبار ہوتا ہے جس کی چار قسمیں ہیں۔

(۱)۔میت کا جزء جیسے بیٹا، (۲)۔میت کا اصل جیسے باپ، (۳)۔میت کے باپ کا جزء جیسے میت کا بھائی

(۴)۔میت کے باپ کے باپ کا جز جیسے میت کا چچا۔

(3)......اگر کسی شخص کا انتقال دوسرے شہر میں ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ اسی شہر میں دفن کر دیا جائے البتہ اگر میت کو اپنے وطن میں واپس لاکر اپنے وطن میں دفن کیا جائے تب بھی شرعاً جائز ہے البتہ ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔

لما فی اعلاء السنن(۸/ ۲۵۱): عن الحسين بن على(مرفوعا) "اذا حضرت الجنازة فالامام احق بالصلاة عليها عن غيره، رواه ابن منيع.

وفی القدوری(ص۔۳۹):واولى الناس بالامامة عليه السلطان ان حضر فان لم يحضر فيستحب تقديم امام الحى ثم الولى.

وفی الشامية(۲/ ۲۳۹): (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقا، وقيل الىٰ مادون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل اوميلين لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيمازاد قال فى النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر واما نقله بعد دفنه فلا مطلقا.

وفی الدر المختار (۳/ ۷۶): (الولى فى النكاح العصبة بنفسه) وهو من يتصل بالميت حتى المعتقة وفى الشامية تحته: (قوله العصبة بنفسه) خرج به العصبة بالغير كالبنت تصير عصبة بالا بن ولا ولاية لها على امها المجنونة وكذا العصبة مع الغير كالاخوات مع البنات ولا ولاية للاخت على اختها المجنونة.

وفی مراقی الفلاح مع الطحطاوی (ص۔۶۰۵): (فان نقل قبل الدفن قدر ميل اوميلين) ونحوذلك (لابأس به) لان المسافة الى المقابر قد تبلغ هذا المقدار (وكره نقله لأكثرمنه) اى اكثر من الميلين كذا فى الظهيرية وقال شمس الائمة السرخسى: وقول محمد فى الكتاب لابأس ان ينقل الميت قدر ميل اوميلين بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه قاله قاضيخان وقد قال قبله لومات فى غير

بلدة يستحب تركه فان نقل الى مصر آخر لابأس به لما روى ان يعقوب صلوات الله عليه مات بمصر ونقل الى الشام وسعد بن ابى وقاص مات فى ضيعة على اربعة فراسخ من المدينة ونقل على اعناق الرجال الى المدينة قلت: يمكن الجمع بان الزيادة مكروهة فى تغير الرائحة او خشيتها وتنتفى بانتفائها لمن هو مثل يعقوب عليه السلام او سعدؓ لانهما من احياء الدارين (قوله أى اكثر من الميلين) كثرة فاحشة اما الزيادة عليهما بقدر يسير فلا تضرفلا ينافى قوله قبل ونحوذلك (قوله بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه) اى تحريما لان قدر الميلين فيه ضرورة ولا ضرورة فى النقل الى بلد آخر وقيل: يجوز ذلك الى مادون مدة السفر وقيل فى مدة السفر ايضاً كذا فى حلبى وفيه ان كلام محمد مطلق عن قيد لضرورة وايضا لاتظهر الكراهة فى نقله من بلد الى بلد الا اذا كانت المسافة اكثر من ميلين ...... قوله(فان نقل الى مصر آخر لابأس به) وظاهره عدم كراهة النقل من بلد الى بلد مطلقا، قوله (لما روى ان يعقوب الخ) وموسىٰ عليه السلام نقل تابوت يوسف عليه السلام من مصر الى الشام بعد زمان قوله (قلت الخ) اصله للكمال فانه قال فى رده كلام صاحب الهداية فى التجنيس انه لا اثم فى النقل من بلد الى بلد لما نقل ان يعقوب الخ مانصه ان ذلك شرع من قبلنا ولم تتوفر فيه شروط كونه من شرعنا ولان اجساد الانبياء عليهم السلام اطيب مايكون حال الموت كالحياة والشهداء كسعد رضى الله عنه ليسوا كغيرهم ممن جيفتهم اشد نتنامن جيفة البهائم فلا يلحق بهم.

(۳۹۵) نومولود جورویانہیں اور تین گھنٹے بعد مر گیا اس کی نماز جنازہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بچہ پیدا ہوا اور رویا بھی نہیں تین گھنٹے کے بعد فوت ہوگیا کیا اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں بچہ جب زندہ پیدا ہوا یعنی اس میں ایسے اثرات تھے، جو اس کی زندگی پر دلالت کرتے ہوں، مثلاً کھانسے، جمائی لے، روئے یا کسی اندام کو حرکت دے (صرف نفس اندام کے سمیٹنے اور پھیلانے کا اعتبار نہیں ہے) پھر فوت ہوا تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

لمافى الشامية مع الدر المختار (۲/۲۲۷): ومن ولد فمات يغسل ويصلى عليه، قوله أى وجد منه مايدل على حياته أى من بكاء أو تحريك عضو أو طرف ونحوذلك بدائع، وهذا معناه فى الشرع كمافى البحر: وقال فى الشرنبلالية: يعنى الحياة المستقرة، ولا عبرة لانقباض وبسط اليد وقبضها.

لأن هذه الاشياء حركة المذبوح ولا عبرة بها الخ.

(۳۹۶) مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا اوراس کی جائز صورتیں کون کون سی ہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر یہاں دیکھا جاتا ہے کہ جنازہ محراب کے اندر رکھ کر محراب کے سرے پر امام کھڑے ہوجاتے ہیں اور مقتدی حضرات مسجد میں صف آرا ہوتے ہیں بعد میں نماز جنازہ پڑھادی جاتی ہے، کیا یہ طریقہ صحیح ہے اور عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھنے کی تین صورتیں ہیں احناف کے نزدیک تینوں مکروہ ہیں، البتہ ایک صورت کو احناف نے مستثنیٰ کیا وہ یہ ہے کہ جنازہ باہر ہو، اور امام اور بعض افراد بھی باہر ہوں، تو جائز ہے کیونکہ علت عدم جواز نہیں پائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ باقی صورتیں ناجائز ہیں۔

لما في الهندية (۱/۱۶۵): وصلاة الجنازة في المسجد الذى تقام فيه الجماعة مكروهة. سواء كان الميت والقوم في المسجد او كان الميت خارج المسجد والقوم في المسجد او كان الامام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقي في المسجد او الميت في المسجد والامام والقوم خارج المسجد، هو المختار كذا في الخلاصة ولاتكره بعذر المطر ونحوه الخ.

وفي شرح العناية على هامش فتح القدير (۱۲۸/۲): وان كانت الجنازة والامام وبعض القوم خارج المسجد. والباقي فيه لم تكره بالاتفاق الخ.

(۳۹۷) جوشخص جل گیا صرف ہڈیاں رہ گئیں تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص جل گیا گوشت پوست وغیرہ سب کچھ ختم ہوگیا صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں ڈھانچہ بالکل ختم ہوگیا اس پر جنازہ وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صرف ہڈیوں پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں اس لئے کہ نمازِ جنازہ پورے جسم یا جسم کے اکثر حصہ پر مشروع ہے اور پورا جسم گوشت پوست ہڈیوں کے مجموعہ کا نام ہے صرف ہڈیوں کو جسم اور بدن نہیں کہا جاتا۔ جیسا کہ صاحب بحر علامہ ابن نجیم کی عبارت سے سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بدن پھولا پھٹا نہ ہو بدن سلامت ہو تو پھر قبر کے سامنے میت پر نمازِ جنازہ پڑھا جائے گا اگر پھول پھٹ جائے تو پھر اس پر جنازہ نہیں پڑھا جائے گا اس لئے کہ وہ پھر پورے بدن کے حکم میں نہیں ہوتا بلکہ اعضاء کے حکم میں ہوتا ہے۔

وفي البحر الرائق (۱۸۲/۲): لأنه لا يصلى عليه بعد التفسخ لان الصلوة شرعت على بدن الميت فاذا تفسخ لم يبق بدنه قائماً.

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ امداد الاحکام (۸۳۰/۱) میں اس قسم کے سوال کے بارے میں لکھتے ہیں:

قلت والظاهر ان البدن يطلق على مجموع اللحم والعظام لا على العظام وحدها.

خیر الفتاویٰ (۲۷۸/۳) پر ہے: "ہڈیوں کے ڈھانچے پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں......الخ"

(۳۹۸) خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک عورت اپنے آشنا کے ساتھ شہر فرار ہوگئی، اب اس کے بھائی وغیرہ کو لوگ عار دلاتے ہیں اور مختلف طعنے دیتے ہیں۔ گزشتہ روز اس عورت کے بھائی نے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کرلی ہے۔ کیا اس شخص کی نماز جنازہ میں شرکت کرنا شرعاً درست ہے؟ اور گاؤں والوں کا اس عورت کے گھر والوں کو اس طرح طعنہ وغیرہ دینا ازروئے شریعت کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں ایسے شخص کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی مگر اس نمازِ جنازہ میں اہلِ علم وفضل کا شریک ہونا مناسب نہیں ہے خواہ مقتدی کی حیثیت سے ہو، یا امام کی حیثیت سے، گاؤں والوں کا اس طرح طعن وتشنیع کرنا ازروئے شرع ناجائز ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ایسے طعنہ دینے والوں کیلئے دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔

لمافي القرآن الكريم(النور: ۱۹): ان الذين يحبون ان تشيع الفاحشة في الذين امنوا لهم عذاب اليم في الدنيا والاخرة والله يعلم وانتم لاتعلمون.

وفي الشامية (۲۱۱/۲، ۲۱۲): قد يقال لادلالة في الحديث على ذلك لأنه ليس فيه سوى أنه عليه الصلاة والسلام لم يصل عليه، فالظاهر أنه امتنع زجرا لغيره عن مثل هذا الفعل كما امتنع عن الصلاة على المديون ولا يلزم من ذلك عدم صلاة أحد عليه من الصحابة، اذ لا مساواة بين صلاته وصلاة غيره.

وفي الفقه الاسلامي(۱۵۰۹/۲): ومن قتل نفسه عمداً يغسل ويصلى عليه، على المفتى به عند الحنفية وعند الشافعية وان كان اعظم وزراً من قاتل غيره لأنه فاسق غير ساع في الأرض بالفساد وان كان باغياً على نفسه كسائر فساق المسلمين. ورأى قوم كابي يوسف وابن الهمام انه لا يصلى عليه لما في صحيح مسلم انه عليه السلام اتى برجل قتل نفسه فلم يصل عليه......

وقال المالكية ايضاً وينبغي لاهل الفضل ان يجتنبوا الصلاة على المبتدعة ومظهري الكبائر ردعاً لامثالهم.

(۳۹۹) نومولود بچی کو جان بوجھ کر مار دینے کے بعد بغیر جنازہ پڑھے دفنا دیا اس پر جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے دوست کے گھر لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی تو زندہ پیدا ہوئی لیکن اس کو جان بوجھ کر مارا گیا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی، اب اس کا کیا حکم ہے؟ مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں مع حوالہ جات۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ واقعہ کو پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ ایک مسلمان نے ایسی حرکت کی، جس کے سبب وہ حیوانیت کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ بچیوں کو مارنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں، مشرکین عرب زمانۂ جاہلیت میں بچیوں کو زندہ درگور کرتے تھے اور بچی کی پیدائش کو عار سمجھتے تھے بلکہ اُس وقت بھی شرفاءِ عرب یہ حرکت نہیں کرتے تھے، رذیل اور جاہل اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ یہ حرکت عملاً کفر اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے جو کہ حکیم ذات ہے ناراضگی کا اظہار ہے اس پر توبہ واستغفار کیا جائے اور دل سے ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑایا اور رویا جائے ورنہ سخت پکڑ کا اندیشہ ہے اگر باپ نے قتل کیا ہے تو دیت بھی لازم ہوگی، اسی طرح نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ سے جو گناہ لازم آیا اس کیلئے بھی کثرت سے توبہ واستغفار کیا جائے۔

تنبیہ...... اگر باپ کے علاوہ کسی اور نے قتل کیا ہے تو قتل کی کیفیت اور وضاحت لکھ کر حکم دریافت کرلیا جائے۔

لما فی القرآن الکریم (بنی اسرائیل: ۳۱): ولاتقتلوا اولادکم خشية املاق نحن نرزقهم واياكم ان قتلهم كان خطأً كبيراًO

وفی الدر المختار (۵۳۵،۵۳۴/۶): أی لایقتص الأصول وإن علوا مطلقا ولو إناثا من قبل الأم فی نفس أو أطراف بفروعهم وإن سفلوا لقوله علیه الصلوٰة والسلام ((لایقاد الوالد بولده)) وهو وصفٌ معلل بالجزئية فيتعدى لمن علا لأنهم أسباب فی إحيائه فلا يكون سببا لإفنائهم وحينئذ فتجب الدية فی مال الاب فی ثلاث سنين لأن هذا عمد والعاقلة لاتعقل العمد.

(۴۰۰) نمازِ جنازہ جوتوں کے ساتھ پڑھنا نیز سلام پھیرتے وقت امام کس کی نیت کریگا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کی نماز جوتوں کے ساتھ پڑھنا کیسا ہے؟ نیز امام کو سلام پھیرتے وقت کس کی نیت کرنی چاہئے میت کی یا دیگر لوگوں کی یعنی مقتدیوں کی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱)۔ جنازے کی نماز جوتے پہن کر پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے اور وہ جگہ جہاں کھڑا ہے پاک ہو، اور اگر

جوتے پاؤں سے نکال کر اس کے اوپر کھڑا ہوا جائے تو پھر صرف جوتوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔

(۲)۔ جنازے کی نماز میں سلام پھیرتے وقت امام مقتدیوں کی نیت کرے گا، میت کی نیت نہیں کرے گا کیونکہ میت خطاب کا اہل نہیں ہے۔

لمافی البحر(۲/۱۷۹): لو قام علی النجاسة وفی رجلیه نعلان لم یجز ولو افترش نعلیه وقام علیهما جازت وبهذا یعلم مایفعل فی زماننا من القیام علی النعلین فی صلاة الجنازة لکن لابد من طهارة النعلین.

وفی الهندیة(۱/۱۶۴): ولاینوی المیت فی التسلیمتین بل ینوی بالاولیٰ من عن یمینه وبالثانیة من عن شماله کذا فی سراج الوهاج.

وفی الدر المختار مع الشامیة(۱/۶۵۷): وصلاته فیهما افضل. (قوله وصلاته فیهما) ای فی النعل والخف الطاهرین افضل مخالفة للیهود تاتارخانیة، وفی الحدیث صلوا فی نعالکم ولا تشبهوا بالیهود.

وفیه ایضاً(۲/۲۱۳): قوله ناویا المیت مع القوم) کذا فی الفتح..... وظاهره أنه ینوی الملئکة الحفظة أیضا ثم رأیته صریحاً فی شرح درر البحار وذکر فی الخانیة والظهیریة والجوهرة انه لا ینوی المیت قال فی البحر وهو الظاهر لأن المیت لا یخاطب بالسلام حتی ینوی به اذ لیس اهلا له وأقره فی النهر.

(۴۰۱) نمازِ جنازہ میں سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ میں سلام ہاتھ چھوڑ کر پھیرنا چاہیے یا پہلے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تکبیرات کے ختم ہونے پر سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۵۵): والاعتماد سنة وانما یعتمد کما فرغ من التکبیر بالیمنی علی الیسری ......وعند محمد رحمه الله الاعتماد سنة القراءة حتی اذا فرغ من التکبیر یرسل فاذا شرع فی القراءة یعتمد وفی القنوت فی الوتر اختلف المشائخ فیه والاصح هو الاعتماد وفی القومة بین الرکوع والسجود یرسل ولایعتمد وکذا فی کل قیام لا ذکر فیه ولا یطول کتکبیرات العیدین وفی صلوة الجنازة یعتمد.

وفی الهندیة (۱/۷۳): کل قیام فیه ذکر مسنون فالسنة فیه الاعتماد کما فی حالة الثناء والقنوت وصلاة الجنازة وکل قیام لیس فیه ذکر مسنون کمافی تکبیرات العیدین فالسنة فیه الارسال کذا فی

النهاية وهو الصحيح كذا فى الهداية فيه كان يفتى شمس الائمة السرخسى.

(۴۰۲) مسبوق اپنی بقیہ رکعات پڑھنے کیلئے کب کھڑا ہو؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(ا)۔چھوٹی ہوئی رکعتوں والا شخص اپنی نماز پوری کرنے کیلئے کس وقت اٹھے، امام کے ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد یا دونوں طرف کے بعد؟

(۲)۔اور نماز جنازہ میں ہاتھ کس وقت چھوڑے جائیں امام کے سلام کہنے سے پہلے یا بعد؟ جوابات دیکر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً.....(ا)۔مسبوق اپنی بقیہ رکعتوں کو ادا کرنے کیلئے اس وقت اٹھے جب امام دوسری جانب سلام پھیر لے۔

(۲)۔نماز جنازہ میں چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں۔

وفى الشامية (۱/۵۹۷): (قوله وينبغى أن يصبر الخ) أى لا يقوم بعد التسلمية أو التسلمتين بل ينتظر فراغ الامام بعدهما كمافى الفيض والفتح والبحر...... قال فى الحلية: وليس هذا بلازم بل المقصود مايفهم أن لا سهو على الإمام أو يوجد له ما يقطع حرمة الصلاة اهـ وقيده فى الفتح بحثاً بما إذا اقتدى بمن يرى سجود السهو بعد السلام أما اذا اقتدى بمن يراه قبل السلام فلا.

وفى خلاصة الفتاوىٰ (۱/۲۲۵): ولا يجوز الاستخلاف ولا يعقد بعد تكبير الرابع لانه لا يبقى ذكر مسنون حتى يعقد فالصحيح أنه يحل اليدين ثم يسلم تسليمتين هكذا فى الذخيرة.

(۴۰۳) امام کا محراب میں کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھانا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے باہر جنازہ رکھا گیا اور امام صاحب محراب کے اندر کھڑے تھے؟ کیا امام صاحب کا محراب میں کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھانا صحیح ہے؟ اور کیا محراب کا حکم مسجد کا حکم ہے یا مسجد سے خارج ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....نماز جنازہ کیلئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر کوئی جگہ الگ مقرر کی جائے اور نماز جنازہ مسجد کی حدود (اگرچہ محراب ہی کیوں نہ ہو) میں پڑھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ محراب مسجد کے حکم میں ہے البتہ اگر کوئی عذر مثلاً جگہ کی تنگی وغیرہ ہو تو اُس صورت میں بہتر یہ ہے کہ امام کچھ مقتدیوں کے ساتھ محراب کے باہر کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھا سکتا ہے۔

لمافى الدر المختار (۲/۲۲۵): (واختلف فى الخارجة) عن المسجد وحده أو مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقا خلاصة بناء على أن المسجد انما بنى للمكتوبة الخ.

(صـ۲۲۶) وقال الشامي رحمه الله تعالىٰ تحته: إنما تكره في المسجد بلا عذر، فإن كان فلا

(۴۰۴) دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب یہاں پر کوئی میت ہوتی ہے تو بسا اوقات اس کو گاؤں لے جاتے ہیں۔ کبھی میت کے ''ولی'' بیٹا وغیرہ یہاں بھی ہوتے ہیں اور گاؤں میں بھی ہوتے ہیں تو آیا شریعت کی روشنی میں میت کا دوبارہ جنازہ پڑھانا کیسا ہے؟ جبکہ یہاں پر بھی بیٹے نے نمازِ جنازہ پڑھائی ہو، اور وہاں پر بھی بیٹا ہے جس نے جنازہ نہیں پڑھا ہے۔ مفصل بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداًومصلیاً..... مسلمان میت پر اس کے ولی بیٹے وغیرہ کے ہوتے ہوئے ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے تو دوبارہ (چاہے ولی موجود ہو یا نہ ہو) نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے، اس لئے کہ ایک مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھنے سے فرض ساقط ہوجاتا ہے۔

لما في فتاوىٰ الهندية (۱۶۴/۱): وإن صلى عليه الولي لم يجز لأحد أن يصلي بعده ولو أراد السلطان أن يصلي عليه فله ذلك لانه مقدم عليه ولو صلى عليه الولي وللميت اولياء أخر بمنزلته ليس لهم أن يعيدوا كذا في الجوهرة النيرة.

وفي رد المحتار (۲/۲۲۳): فإن صلى غير الولي او السلطان أعاد الولي لأن الحق للأولياء وان صلى الولي لم يجز لأحد أن يصلي بعده ونحوه في الكنز وغيره فقوله لم يجز لأحد يشمل السلطان ثم رأيت في غاية البيان قال مانصه هذا على سبيل العموم حتى لا تجوز الإعادة لا للسلطان ولا لغيره.

(۴۰۵) قبر کے اندر صحیح سلامت نعش نکل آئے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر کھودتے وقت قبر کے اندر سے صحیح سلامت نعش نکل آئے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں اسی طرح اس کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً..... میت کو دفن کرنے کے بعد نہ نکالا جائے ہاں اگر کسی عذر کی بنا پر میت کو قبر سے صحیح سلامت نکالا جائے تو ان پر دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، اسی طرح اس کو غسل بھی نہیں دیا جائے گا۔

لما في الدر المختار (۲/۲۰۵): (و) آدمي (منبوش طري) لم يتفسخ (يكفن كالذي لم يدفن) مرة بعد اخرى (وان تفسخ كفن في ثوب واحد)

وفي الشامية (۲/۲۰۵): (قوله كالذي لم يدفن) ان يكفن في ثلاثة اثواب...... اى لو نبش ثانيا وثالثا

واکثر کفن کذلک مادام طریا من اصل ماله عندنا.

(۴۰۶) نمازِ جنازہ کے بعد دس دس قدم چلنے کا طریقہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کے بعد دس دس قدم چلنے کا کیا طریقہ ہے؟ امام نمازِ جنازہ کے بعد جنازہ گاہ میں چارپائی کا ایک پایا پکڑ کر چلتا ہے پھر دوسرا پایا پکڑ کر چلتا ہے پھر تیسرا پھر چوتھا کیا ایسا کرنا صحیح ہے۔ نیز اس کو لازم سمجھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں دس دس قدم چلنا صحیح ہے لیکن امام کا چارپائی کا پایا پکڑ کر وہیں جنازہ گاہ میں گھمانا ثابت نہیں ہے صحیح طریقہ یہ ہے کہ میت کا دائیں طرف والا پایا اپنے دائیں کندھے پر رکھ کر دس قدم چلیں پھر اس کے پیچھے والا پایا پکڑ کر دس قدم چلیں پھر میت کے بائیں طرف والا پایا اپنے بائیں کندھے پر آگے کی طرف سے دس قدم چلیں اسی طرح پیچھے والا پایا دس قدم چلیں اسطرح چالیس قدم ہوجائیں گے اور یہ چلنا قبرستان کی طرف ہے نہ کہ وہیں جنازہ گاہ میں گھمانا۔ اور اس کو لازم بھی نہ سمجھا جائے اگر اس طریقے سے چلا جائے تو صحیح ہے صرف امام کا چارپائی کا پایا پکڑنے والا طریقہ خلاف سنت ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۶۲): ثم ان فی حمل الجنازة شيئين نفس السنة وكمالها اما نفس السنة فهی ان تاخذ بقوائمها الاربع علی طريق التعاقب بان تحمل من كل جانب عشر خطوات وهذا يتحقق فی حق الجمع واما كمال السنة فلا يتحقق الافی واحد وهو ان يبدأ الحامل بحمل يمين مقدم الجنازة كذا فی التاتارخانية فيحمله علی عاتقه الايمن ثم الموخر الايمن علی عاتقه الايمن ثم المقدم الايسر علی عاتقه الايسر ثم المؤخر الايسر علی عاتقه الايسر هكذا فی التبيين.

وفی الشامية (۲/۲۳۱): وفی شرح المنية ويستحب ان يحملها من كل جانب اربعين خطوة للحديث المذكور رواه ابوبكر النجار الخ......... (قوله كذلک)ای عشر خطوات وهی معنی كذلک الثانية ويمين الحامل يمين الميت ويسار الجنازة ويساره يساره ويمين الجنازة قهستانی ط.

(۴۰۷) عورت کیلئے جنازہ میں شرکت کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت نمازِ جنازہ میں شرکت کرسکتی ہے؟ یعنی جماعت کے پیچھے عورتیں کھڑی ہوسکتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....عورتیں نمازِ جنازہ میں فتنے کی وجہ سے شرکت نہیں کرسکتیں البتہ اگر ساتھ کھڑی ہوگئیں تو نماز درست ہوجائے گی۔

لمافی البحر الرائق(۲/۱۸۰): وأما مايفسدها فما أفسد الصلاة أفسدها الاالمحاذة.....

وفی جوهر النيرة(۱/۱۳۰): وان قامت امرأة الی جانب رجل لم تفسد عليه صلاته.

وفی حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص۲۴۶): (ولا يحضرن الجماعات لمافيه من الفتنة والمخالفة) (قوله ولا يحضرن الجماعات) لقوله ﷺ "صلاة المرأة فی بيتها أفضل من صلاتها فی حجرتها وصلاتها فی مخدعها أفضل من صلاتها فی بيتها". قال الطحطاوی تحته: فالأفضل لها ما كان استرلها لافرق بين الفرائض وغيرها كالتراويح الاصلاة الجنازة فلا تكره جماعتهن فيما لأنها لم تشرع مكررة فلو انفردت تفوتهن.

(قوله والمخالفة) أی مخالفة الأمر لان الله تعالیٰ امرهن بالقرار فی البيوت فقال تعالیٰ وقرن فی بيوتكن وقال ﷺ "بيوتهن خير لهن لو كن يعلمن"

وفی الدرالمختار(۱/۵۶۶): (ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيدووعظ (مطلقا) ولو عجوزا ليلا (علی المذهب المفتی به لفساد الزمان واستثنیٰ الكمال بحثا العجائز المتفانية.

وفی الشامية (۱/۵۶۶): (قوله علی المذهب المفتی به) أی مذهب المتاخرين قال فی البحر: وقد يقال هذه الفتوی التی اعتمدها المتأخرون ...... وفيه نظر بل هو مأخوذ من قول الإمام وذلک أنه انما منعها لقيام الحامل وهو فرط الشهوة بناء علی أن الفسقة لا ينتشرون فی المغرب...... الخ.

(قوله واستثنیٰ الكمال الخ) أی مما افتی به المتأخرون لعدم العلة السابقة فيبقی الحكم فيه علی قول الإمام فافهم.

(۴۰۸) عورتیں جنازے کی نماز پڑھا سکتی ہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورتیں جنازے کی نماز پڑھا سکتی ہیں کیونکہ الدرالمختار(۱/۵۶۵) پرایک عبارت ہے جس سے جواز کی صورت معلوم ہوتی ہے عبارت ملاحظہ ہو "ويكره تحريما (جماعة النساء) ولو فی التراويح فی غير صلاة جنازة" اب آپ سے معلوم کرنا ہے کہ کیا یہ بات درست ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس عبارت کو کہاں منطبق کریں گے اور اس کا محمل کیا ہوگا؟ کیا کسی خاص صورت میں فقہاء کہتے ہیں یا یہ بات مطلقاً ہے اگر اس جنازے میں مرد بھی شریک ہوں تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ اگر اکیلی عورتیں ہیں تو اس صورت میں جواز معلوم ہورہا ہے تو باقی فرائض اور تراویح میں اس کی کیوں ممانعت ہے؟ پھر تو کچھ سال پہلے جو امریکہ میں واقعہ پیش آیا تھا کہ عورت نے امامت کرائی تھی کیا وہ درست ہے اس عبارت کے نتیجے میں، براہ کرم تمام پہلوؤں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں کہ کوئی جز میرے سوال کا باقی نہ رہے۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطاء کرے، آمین۔

الجواب حامداًومصلیاً.....نماز جنازہ میں عورت صرف خواتین کی امامت کرسکتی ہے جبکہ دیگر نمازوں میں مکروہ ہے چاہے خواتین کی امامت ہی کیوں نہ ہو۔سوال میں درج ''الدر'' کی عبارت کا مطلب اور محمل یہی ہے۔ نیز نمازِ جنازہ میں اگر مرد حضرات عورت کی اقتداء میں شریک ہوجائیں تو مردوں کی نماز باطل ہوجائے گی کیونکہ مرد کیلئے کسی بھی نماز میں عورت کی اقتداء درست نہیں، البتہ اس صورت میں نماز جنازہ ادا ہوجائے گی اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ عورت کی نماز درست ہونے کی بناء پر سب کی طرف سے فریضہ ادا ہوگیا۔

نیز سوال میں مذکور''امریکہ میں پیش آمدہ واقعہ'' کا جواز سوال میں درج ''الدر'' کی عبارت سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس عبارت سے فقط نماز جنازہ میں عورت کی امامت کا جواز صرف خواتین کیلئے ثابت ہوتا ہے۔ نماز جنازہ میں صرف خواتین کیلئے عورت کی امامت کا جواز اور دیگر نمازوں میں ممانعت کی وجہ فرق یہ ہے کہ اگر کسی نمازِ جنازہ میں صرف خواتین ہوں تو نماز جنازہ پڑھنے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱)۔بغیر جماعت کے علیحدہ علیحدہ نماز ادا کرلیں۔　　(۲)۔کسی خاتون کی اقتداء میں جماعت کرالیں۔

اول الذکر صورت میں اگر کوئی خاتون دیگر خواتین سے پہلے نماز جنازہ پوری کرتی ہے تو اس کی نماز سے فریضہ ادا ہوجائے گا کیونکہ نماز جنازہ فرض علی الکفایہ ہے کسی ایک فرد کے پڑھنے سے فریضہ ادا ہوجاتا ہے لہٰذا دیگر خواتین کی نمازیں نفل بن جائیں گی جبکہ نماز جنازہ نفلاً مشروع نہیں ہے۔لہٰذا نماز جنازہ میں جبکہ صرف خواتین موجود ہوں مؤخر الذکر صورت متعین ہے۔نماز جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں یہ علت نہیں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک پر الگ الگ فرض یا سنت ہوتی ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ پڑھنے کی صورت میں اگر کوئی خاتون دیگر خواتین سے پہلے نماز سے فارغ ہوتی ہے تو دیگر خواتین کی نمازیں نہ تو نفل بن جاتی ہیں اور نہ ہی ان سے فریضہ ساقط ہوتا ہے۔لہٰذا نمازِ جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں عورت کی امامت مطلقاً مکروہ ہے۔

لمافی المدونة الکبری(۱/۱۷۸): عن ابن ابی ذئب عن مولی لبنی هاشم اخبره عن علی بن ابی طالب انه قال: لا تؤم المرأة.

وفی الدرالمختار (۱/۵۶۵): ویکره تحریماً (جماعة النساء) ولو فی التراویح فی غیر صلاة جنازة. لانها لم تشرع مکررة فلو انفردن تفوتهن بفراغ احداهن ولو امت فیها رجالاً لا تعاد لسقوط الفرض بصلاتها

وفی الشامیة تحته: قال فی الفتح، واعلم ان جماعتهن لا تکره فی صلاة الجنازة لا نها فریضة وترک التقدم مکروه فدار الامر بین فعل المکروه لفعل الفرض او ترک الفرض لترکه فوجب الاوّل. بخلاف جماعتهن فی غیرها، ولو صلین فرادی فقد تسبق احداهن فتکون صلاة الباقیات نفلاً والتنفل بها مکروه، فیکون فراغ تلک موجباً لفساد الفرضیة لصلاة الباقیات کتقیید الخامسة بالسجدة لمن ترک القعدة الاخیرة ......ومفاده ان جماعتهن فی صلاة الجنازة واجبة، حیث لم یکن غیرهن ولعل وجهه الاحتراز عن فساد فرضیة صلاة الباقیات اذا سبقت احداهن، وفیه ان الرجال لو

صلوا منفردين يلزم فيها مثل ذلك فيلزم عليه وجوب جماعتهم فيها مع ان المصرح به ان الجماعة فيها غير واجبة فتأمل.

وفي تقريرات الرافعي على حاشية ابن عابدين(۱/۷۲): انما يتم بارجاع ضمير "لانها" فريضة للجماعة كما فعل في حاشية البحر وهو خلاف الظاهر بل هو راجع لصلاة الجنازة فانها فرض كفاية على كل منهن قال السندي نقلاً عن شرح المنية و يستحب ان يصلين منفردات وتجوز جماعتهن. فمراد الفتح وغيره من الوجوب معناه اللغوي اى ثبت الاوّل ويكون مقدما على الترك لا على الانفراد المستحب.

(۴۰۹) متوفیہ عورت کے کفن ودفن کا خرچ کس کے ذمہ ہے باپ یا خاوند؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زن متوفیہ کے کفن ودفن کا خرچ کس کے ذمہ ہے باپ کے ذمہ ہے یا خاوند کے ذمہ؟ محقق جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... زوجہ متوفیہ کے کفن ودفن کا خرچہ خاوند کے ذمہ لازم ہے۔

لمافي حلبي كبير(۱/۵۸۲): وكفن الزوجة على الزوج عند ابي يوسف وفي شرح السراجية لمصنفها اماالمرأة اذا لم يكن لها مال فكفنها و مؤنتها على الزوج عند ابي حنيفة وابي يوسف الخ.

وفي الهندية (۱/۱۶۱): وعلى قول ابي يوسفؒ يجب الكفن على الزوج وان تركت مالا وعليه الفتوى الخ.

(۴۱۰) میت کو اپنے آبائی گاؤں میں منتقل کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک شہر کے اندر وفات پائی اس کو اس کے آبائی گاؤں لے جاتے ہیں کیا میت کو منتقل کرنا جائز ہے جبکہ اس نے اس شہر کی وصیت بھی کی ہو، کہ مجھ کو یہاں ہی دفن کرنا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر میت کا آبائی گاؤں ایک دو میل سے زیادہ دور ہے تو پھر منتقل کرنا مکروہ ہے۔

لمافي الشامية(۲/۲۳۹): (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقا وقيل إلى مادون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال في النهر عن عقد الفرائد: وهو الظاهر.

وفي الفقه الاسلامي(۲/۱۵۳۷): وقال الحنفية والمالكية: لا بأس بنقل الميت من بلد إلى اخر إن

كان لم يدفن، والنقل عند الحنيفة جائز قدر ميل أو ميلين لكن يندب دفنه في جهة موته أي في مقابر أهل المكان الذي مات فيه أو قتل ،انتهى.

(۴۱۱) قبر کتنی گہری کھودی جائے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر کھودتے وقت قبر کتنی گہری کھودی جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبر کی گہرائی کم از کم نصف قدِ آدم ہونی چاہئے اور اگر آدمی کے قد کے برابر کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

لما في حلبي كبير (صـ۵۹٦): مقدار عمق القبر قدر نصف قامة ذكره في الروضة وفي الذخيرة الى صدر الرجل او وسط القامة فان زادوا فهو افضل وان عمقوا مقدار قامة فهو احسن فعلم بهذا ان الادنى نصف القامة والاعلى القامة وما بينهما بينهما.

وفي بحر الرائق(۲/۱۹۳): واختلفوا في عمق القبر فقيل قدر نصف القامة وقيل الى الصدر وان زادوا فحسن.

وفي النتف في الفتاوىٰ(صـ۸۴): واما القبر فالمستحب فيه خمس خصال والمكروه فيه عشر خصال امّا المستحب فيه فاولها ان يحفر القبر الى مبلغ السرة.

وفي طحطاوى (۱/۳۸۱): ويحفر القبر...... طوله على قدر طول الميت وعرضه على قدر نصف طوله قوله فان زاد فحسن فلو كان على قدر قامته فهو احسن.

وفي الدر المختار(۲/۲۳۳،۲۳۴): (وحفر قبره) في غير داره (مقدار نصف قامة) فان زاد فحسن وفي الشامية تحته: (قوله مقدار نصف قامة الخ) او الى حد الصدر وان زاد الى مقدار قامة فهو احسن كما في الذخيرة فعلم انّ الادنى نصف القامة والاعلى القامة وما بينهما شرح المنية وهذا حدالعمق والمقصود منه المبالغة في منع الرائحة ونبش السباع.

(۴۱۲) قبر کی گہرائی کتنی ہو؟ میت کو گھر میں رکھا جائے یا مسجد میں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر جب شق کی صورت میں ہو تو میت کو دفن کرنے کے بعد، جو اوپر بانس یا پتھر وغیرہ رکھ کر مٹی ڈالی جاتی ہے، اس میں یعنی پتھروں/ بانس اور میت کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں میت اور ان پتھروں یا بانس کے درمیان بہت فاصلہ رکھا جاتا ہے، تقریباً یہ پتھر اور بانس زمین کے برابر ہوتے ہیں اور میت بہت نیچے، شریعت میں اس کا کیا حکم ہے کیا اس کی کوئی حد متعین ہے، از روئے شریعت اس کا کیا حکم ہے، جبکہ اس مٹی کے کم ڈالنے کی وجہ سے قبر کی

چھت گرنے کی صورت میں بعض اوقات میت نظر بھی آتی ہے۔

(۲)......نماز جنازہ مسجد کے کمپاؤنڈ یا صحن میں پڑھنا افضل ہے یا قبرستان میں جبکہ قبرستان میں جنازہ پڑھنے کی جگہ بھی ہوتی ہے لیکن مسجد میں جنازہ پڑھنے سے کثیر تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں جبکہ قبرستان میں لوگ کم شرکت کرتے ہیں؟

(۳)......بعض مقامات پر میت کو گھر میں جگہ تنگ ہونے یا کسی اور مصلحت کی بناپر، لاکر مسجد کے احاطہ میں رکھ دیا جاتا ہے، میت کو اپنے عزیز واقارب کے گھروں میں رکھنا اچھا ہے یا مسجد کے احاطہ میں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔صورت مسئولہ میں جب قبر شق کی صورت میں ہوتو اس کی گہرائی قامت الرجل (آدمی کے قد کے برابر) کے برابر مستحب ہے، البتہ بانس پتھر یا سلیپ وغیرہ رکھنے کی جگہ کی صراحت نہیں ہے لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب گہرائی متعین ہے تو یہ چیزیں اوپر ہی رکھی جائیں گی البتہ بانس، پتھر یا سلیپ وغیرہ رکھنے میں احتیاط سے کام لیا جائے تاکہ کھلنے کا اندیشہ نہ ہو، اگر پھر بھی کسی وجہ سے کھل جائیں تو دوبارہ اچھی طرح بند کر لی جائیں۔

(۲)۔اگر شدید عذر ہو مثلاً بارش ہورہی ہو یا باہر جنازہ پڑھنا ممکن نہ ہوتو پھر تو مسجد کے اندر بھی جنازہ پڑھنا درست ہے البتہ اگر کوئی عذر نہ ہوتو پھر اگر میت اور امام سمیت کچھ مقتدی مسجد سے باہر ہوں تو بھی جنازہ پڑھنا بلا کراہت کے درست ہوگا واضح رہے کہ لوگوں کا کثیر تعداد میں شرکت نہ کرنا کوئی عذر نہیں ہے۔

(۳)۔میت کو نہ گھر میں رکھنا درست ہے اور نہ ہی مسجد میں بلکہ فوراً کفن دفن کے انتظامات کرنے چاہئیں۔

لما فی البخاری(۱/۱۷۶): عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال اسرعوا بالجنازة فان تک صالحة فخير تقدمونها وان تک سوی ذلک فشر تضعونه عن رقابكم.

وفی أبی داؤد(۲/۹۸): عن ابی هريرة قال قال رسول اللهﷺ من صلی علی جنازة فی المسجد فلاشئی له.

وفی مسلم(۱/۳۱۳): عن عائشة انها لما توفی سعد بن ابی وقاص ارسل ازواج النبی ﷺ أن يمروا بجنازته فی المسجد فيصلين عليه ففعلوا فوقف به علی حجرهن يصلين عليه...... فبلغهن ان الناس عابوا ذلک وقالوا ماكانت الجنائز يدخل بها المسجد. (الحديث)

عن ابی سلمة بن عبدالرحمن ان عائشة لما تو فی سعد بن ابی وقاص قالت ادخلوا به المسجد حتی اصلی عليه فأنكر ذلک عليها. (الحديث)

وفی المبسوط للسرخسی(۲/۶۸): وعندنا اذا كانت الجنازه خارج المسجد لم يكره ان يصلی الناس عليها فی المسجد انما الكراهة فی ادخال الجنازة.

وفی شامية (۲/۲۳۴): (قوله مقدار نصف قامة الخ) او الی حد الصدر وان زاد الی مقدار قامة فهواحسن.

(۴۱۳) قبر کھودنے کی گہرائی میں مرد وعورت کی قبر میں فرق ہے یا نہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کے لئے قبر کتنی گہری کھودنی چاہئے اس کی حد کیا ہے اور مرد وعورت کی قبر کا ایک ہی حکم ہے یا ان کی قبروں میں فرق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......قبر کی گہرائی انسان کے نصف قد تک ہونی چاہئے اگر زیادہ ہو تو اور بہتر ہے، مرد وعورت کا کوئی خاص فرق گہرائی میں ضروری نہیں۔

وفی التاتارخانیة(۲/۱۷۲): وفی بعض النوادر عن محمدؒ انه قال ینبغی ان یکون مقدار العمق الی صدر رجل وسط القامة قال وکلما ازداد فهو أفضل.

وفی الشامیة (۲/۲۳۴): قوله نصف قامة او الیٰ حد الصدر، وان زاد الی مقدار قامة فهو أحسن کمافی الذخیرة.

(۴۱۴) میت کو بوقت ضرورت صندوق میں بند کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک میت کے اعضاء کو انتشار کے خوف سے اگر صندوق میں بند کر کے قبر میں رکھیں، آیا شرعاً مذکورہ عذر کی وجہ سے میت کو اس طرح قبر میں دفنانا جائز ہے، فقہاء کرام کی عبارات سے جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......میت کو بوقت ضرورت صندوق میں بند کر کے دفنانا جائز ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۱۶۶): وحکی عن الشیخ الامام ابی بکر محمد بن الفضل رحمه الله انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذ تابوت من حدید لا بأس به لکن ینبغی أن یفرش فیه التراب ویطین الطبقة العلیاء الخ.

وفی الشامیة(۲/۲۳۴): التنویر مع الدر: (ولا بأس باتخاذ التابوت) ولو من حجر او حدید (له عند الحاجة کرخاوة الارض.

(۴۱۵) بلاضرورت میت کو تابوت میں دفن کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو تابوت کے اندر رکھ کر نماز جنازہ پڑھنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... بلاضرورت میت کوتابوت کے اندر رکھنا اور جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، اگر ضرورت ہوتو جائز ہے مثلاً زمین گیلی ہو یا کوئی اور ضرورت ہوتو بلا کراہت جائز ہوگا۔

لمافی الھندیة(۱/۱۶۶): وحکی عن الشیخ الامام ابی بکر محمد بن الفضل رحمه الله انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذ التابوت من حدید لا بأس به لکن ینبغی ان یفرش فیه التراب ویطین الطبقة العلیا مما یلی المیت ویجعل اللبن الخفیف علی یمین المیت وعلی یساره لیصیر بمنزلة اللحد

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۲۶): وعن الامام ابی بکر محمد بن الفضل، انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذوا تابوتاً من حدید فلا باس به.

(۴۱۶) میت کیلئے قبر میں چٹائی بچھانے کا حکم اور نبی ﷺ کیلئے چٹائی بچھانے کی وجہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سننے میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال جس چٹائی پر ہوا تھا وہی چٹائی آپ کیلئے لحد میں بچھائی گئی تھی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ میت کیلئے قبر میں چٹائی بچھانا جائز ہے یا نہیں اگر جائز نہیں تو پھر آپ ﷺ کیلئے کیوں بچھائی گئی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... میت کے لئے قبر میں چٹائی بچھانا درست نہیں، آپ نے جو سنا ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کیلئے لحد میں چٹائی بچھائی گئی یہ آپ نے غلط سنا ہے اصل میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک سرخ رنگ کی چادر تھی جس کو آپ علیہ السلام کبھی نیچے بچھایا کرتے تھے اور کبھی اس کو اوپر لیا کرتے تھے جب آپ علیہ السلام کا وصال ہوا تو حضرت شقرانؓ صالح (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) نے یہ سوچ کر کہ اب آپ کے بعد اس چادر کو پہننے کا کوئی اہل نہیں رہا اس لئے یہ فرما کر اسے قبر میں ڈال دیا۔ واللہ لا یلبسھا احد بعدہ ابدا یعنی آپ کے بعد کوئی دوسرا اس چادر کو نہیں اوڑھ سکتا۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا کہ اس چادر کو مٹی ڈالنے سے پہلے ہی نکال لیا تھا اور بعض حضرات کہتے ہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔

لمافی المرقاة(۴/۶۷): عن ابن عباسؓ قال جعل فی قبر رسول الله ﷺ قطیفة حمراء فی النهایة القطیفة هی کساء له خمل وهو المهدب ومنه الحدیث تعس عبدالقطیفة ای الذی یعمل لها ویهتم بتحصیلها قال النووی وهذه القطیفة ألقاها شقران مولی من موالی رسول الله ﷺ وقال کرهت ان یلبسها احد بعده علیه الصلوة السلام وقدنص الشافعی وغیره من الفقهاء علی کراهة وضع القطیفة والمخدة ونحوهما تحت المیت فی القبر فقیل ان ذلک من خواصه علیه الصلوة السلام فلا یحسن فی غیره قال الدار قطنی نقلا عن وکیع ان ذلک من خصائصه علیه الصلوة السلام قال التوربشتی

وذلک انہ علیہ الصلوۃ السلام کما فارق اھل الدنیا فی بعض أحکام حیاتہ فارقھم فی بعض احکام مماتہ فان اللہ تعالیٰ حرم علی الارض لحوم الانبیاء وحق لجسد عصمہ اللہ عن البلی والاستحالۃ ان یفرش لہ فی قبرہ لان المعنی الذی یفرش للحی لہ لم یزل عنہ ﷺ بحکم الموت ولیس الامر فی غیرہ علی ھذا النمط وقال بعضھم تنازع علیؓ وعباسؓ فقصد شقران بوضعھا دفع ذلک ذکرہ ابن حجر وھو بعید جدا......... قال ابن عبد البر فی الاستیعاب انھا أخرجت قبل اھالۃ التراب.

وفی البحر الرائق(۲/۱۹۳): وذکر فی الظھیریۃ معزیا الی السرخسی فی الجامع الصغیر انہ لایجوز ان تطرح المضربۃ فی القبر وماروی عن عائشۃؓ فغیر مشھور.

وفی الدر المختار(۲/۲۳۴): (ولا) یجوز ان (یوضع فیہ مضربۃ) وما روی عن علیؓ فغیر مشھور لا یوخذبہ. وفی الشامی (قولہ ولا یجوز الخ) ای یکرہ ذلک قال فی الحلیۃ ویکرہ ان یوضع تحت المیت فی القبر مضربۃ او مخدۃ او حصیرا ونحو ذلک ولعل وجھہ انہ اتلاف مال بلا ضرورۃ فالکراھۃ تحریمیۃ ولذا عبر بلا یجوز. (قولہ وماروی عن علیؓ) یعنی من فعل ذلک نھر ثم ان الشارح تبع فی ذلک المنصف فی منحہ والذی وجدتہ فی الظھیریۃ عن عائشۃؓ وکذا عزاہ الی الظھیریۃ فی البحر والنھر، قال فی شرح المنیۃ وما روی انہ جعل فی قبرہ علیہ الصلوۃ والسلام قطیفۃ. قیل لان المدینۃ سبخۃ وقیل ان العباس وعلیا تنازعاھا فبسطھا شقران تحتہ لقطع التنازع وقیل کان الصلاۃ والسلام یلبسھا ویفترشھا فقال شقرانؓ واللہ لایلبسک احد بعدہ أبداً فالقاھا فی القبر.

(قولہ فغیر مشھور) ای غیر ثابت عنہ او المراد انہ لم یشتھر عنہ فعلہ بین الصحابۃ لیکون اجماعا منھم بل ثبت عن غیرہ خلافہ ففی شرح المنیۃ وکرہ ابن عباسؓ ان یلقیٰ تحت المیت شئ رواہ الترمذی وعن أبی موسیٰ لا تجعلوا بینی وبین الارض شیئاً.

(۴۱۷) عورت کو قبر میں اتارتے وقت پردہ ڈالنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورتوں کو دفن کرتے وقت ان کی قبر پر پردہ ڈالنا کیسا ہے؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں پردہ ڈالنا سنت ہے۔

وفی اعلاء السنن(۸/۳۱۳): عن الثوری عن ابی اسحاقؓ قال شھدت جنازۃ الحارث فمد واقبرہ ثوباً فجبذہ عبداللہ بن یزید وقال انما ھو رجل رواہ ابن ابی شیبۃ فھذا ھو الصحیح.

وفي البدائع(۱/۳۱۹): ويسجى قبر المرأة بثوب لماروى انّ فاطمةؓ سجى قبرها بثوب ونعش على جنازتهالان مبنى حالها على السترفلو لم يسج ربما انكشفت عورة المرأة فيقع بصر الرجال عليها.

وفي رد المحتار(۲/۲۳۶): ويسجى قبرها اى بثوب ونحوه استحباباً حال ادخالها القبر حتىٰ يسوى اللبن على اللحد كذا في شرح المنية والامداد.

(۴۱۸) قبروں کے اردگرد چاردیواری بنانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل قبروں کے اردگرد دلکڑیوں سے چاردیواری بنائی جاتی ہیں جس کا مقصود قبر کو مزین کرنا بھی ہوتا ہے اور قبر کی حفاظت بھی، اور اگر صرف حفاظت کیلئے ہوتو کیسا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......قبروں کے اردگرد چاردیواری بنانا جائز ہے بشرطیکہ قبر کی حفاظت مقصود ہو۔ اور اگر چاردیواری بنانے سے مقصود زیب وزینت ہوتو اس صورت میں مکروہ ہے۔

لمافي مراقي الفلاح(ص۵۰۳): انما يكره الا جر اذا اريد به الزينة اما اذا اريد به دفع اذى السباع او شي آخر لايكره.

وفي حاشية الطحطاوي(ص۵۰۴): وقد اعتاد اهل مصروضع الاحجار حفظا للقبور عن الاندراس والنبش ولا باس به وفي الدرر ولا يجصص، ولا يطين ولا يرفع عليه بناء وقيل لا بأس به هو المختار.

وفي حاشية الطحطاوي على الدر(۱/۳۸۲):قوله وقيل لا بأس به) ينبغي تقييد الجواز على هذا القول بما اذا......

(۴۱۹) حفاظت کی غرض سے قبر پر بغیر چھت کے چاردیواری بنانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر پر چار پانچ فٹ بلند صرف چاردیواری بغیر چھت کے بغرضِ حفاظت بنانا جائز ہے یا نہیں، نیز چبوترہ بنا کر اس کے اوپر قبر بنانا تاکہ بارش کے سیلاب سے حفاظت رہے اور زائرین کے بیٹھنے کیلئے صفائی رہے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں بغرضِ حفاظت چاردیواری بنانا جائز ہے بشرطیکہ فخر ونمود، ریاکاری، زینت مقصود نہ ہو، نیز سیلاب وغیرہ سے جو خطرہ قبر کو لاحق ہے وہی خطرہ چبوترے کو بھی لاحق ہوسکتا ہے جو مناسب معلوم نہیں ہوتا البتہ اگر واقعی اس میں قبر کی حفاظت ہے اور زیب وزینت، اسی طرح زائرین کے لئے بیٹھنے کا اہتمام مقصود نہ ہوتو ضرورۃً جائز ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(صـ۵۰۳،۵۰۴):انمایکره الآجر اذااريد به الزينة امااذا اريد به دفع أذى السباع اوشئ آخر لايكره ...... (ويكره) البناء عليه (للإحكام بعد الدفن) لأنه للبقاء والقبر للفناء...... اهـ.

وفى الدرالمختار(۲/۲۳۷): (ولا يجصص) للنهى عنه، (ولا يطين) ولا يرفع عليه بناء وقيل لابأس به وهو المختار) ،وفى الشامية:(قوله لا يرفع عليه بناء) اى يحرم لوللزينة ......اهـ.

وفى الدرالمختار(۲/۲۳۶): (ويسوى اللبن عليه والقصب لا الآجر) المطبوخ والخشب لوحوله ......

وفى الشامية تحته: وقال مشايخ بخارى لايكره الآجر فى بلدتنا للحاجة اليه لضعف الأراضى.

(۴۲۰) قبر کے اوپر میت کے نام کا کتبہ لگانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبروں کے اوپر اہل قبور کے ناموں کے کتبے لگانا جائز ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر ضرورت اس کی ہو کہ قبر کا نشان رہ جائے قبر کا اثر مٹ نہ جائے تو جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

لمافى رد المحتار(۲/۲۳۷): (قوله لا بأس بالكتابة الخ) لان النهى عنها وان صح فقد وجد الاجماع العملى بها فقد اخرج الحاكم النهى عنها من طرق ثم قال هذه الاسانيد صحيحة وليس العمل عليها فان ائمة المسلمين من المشرق الى المغرب مكتوب على قبورهم وهو عمل اخذ به الخلف عن السلف...... نعم يظهر ان محل هذا الاجماع العملى على الرخصة فيها ما اذا كانت الحاجة داعية اليه فى الجملة كما اشار اليه فى المحيط بقوله وان احتيج الى الكتابة حتى لا يذهب الاثر ولا يمتهن فلا بأس به فاما الكتابة بغير عذر فلا حتى انه يكره كتابة شئ عليه من القران او الشعر او اطراء مدح له ونحو ذلك حلية ملخصا.

وفى الهندية (۱/۱۶۶): ويكره ان يبنى على القبر او يقعد اوينام عليه او يوطأ عليه او يقضى حاجة الانسان من بول او غائط او يعلم بعلامة من كتابة ونحو كذا فى التبيين.

(۴۲۱) قبروں پر نام، تاریخ وغیرہ لکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کی قبر کو بطور نشان باقی رکھنے اور اس خیال سے کہ قبر کی بے حرمتی اور توہین نہ ہو، لوگ اس کو پامال نہ کریں، تو اس پر نام اور تاریخ وفات لکھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......قبر پر بوقت ضرورت نام، تاریخ وغیرہ لکھی جاسکتی ہے۔

لما فی مراقی الفلاح(ص۵۰۵): (ولا بأس) ایضاً (بالکتابة فی حجر صین به القبر ووضع (علیه لئلا یذهب الاثر) فیحترم للعلم بصاحبه.

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷): لابأس بالکتابة ان احتیج الیها حتی لا یذهب الاثر ولا یمتهن.

(۴۲۲) پکی اور خوبصورت قبر بنانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لوگ قبریں عموماً شوق میں سیمنٹ کی خوبصورت بناتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پکی قبر منع ہے آپ بتائیں کہ کیا پکی اور خوبصورت قبر بنانا جائز نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......قبر کو پکا کرنا اور خوبصورت کرنا مکروہ ہے۔

لما فی الهندیة(۱/۱۶۶): ویسنم القبر قدر الشبر ولایربع ولا یجصص ولا بأس برش الماء علیه ویکره أن یبنی علی القبر.

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷): (ولا یجصص) للنهی عنه (ولا یطین ولا یرفع علیه بناء) (قال ابن عابدین رحمه الله تحت قوله ولا یجصص) ای لا یطلی بالجص بالفتح ویکسر قاموس (قوله ولا یرفع علیه بناء) ای یحرم لو للزینة، ویکره لو للاحکام بعدالدفن.

(۴۲۳) پرانی یا نئی قبر گر جائے اس کو دوبارہ بنانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر قبرستان میں ایک پرانی قبر یا نئی قبر گر جائے تو دوبارہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......قبر گرنے کی صورت میں دوبارہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی التاتارخانیة(۲/۱۷۰،۱۷۱): وفی النوازل سئل ابو نصر عن تطیین القبر: قال: لا بأس به وفی الغیاثیة وعلیه الفتوی:...... الحجة واذا خربت القبور فلا بأس بتطیینها لماروی ان النبی علیه السلام مرّ بقبر ابنه ابراهیم فرأی فیه حجرا سقط منه فسده واصلحه ثم قال: من عمل عملا فلیتقنه:...... وفی کفایة الشعبی: کان عصام بن یوسف یطوف حول المدینة یعمر القبور الخربة.

وفی الهندیة(۱/۱۶۶): واذا خربت القبور فلا باس بتطیینها کذا فی التاتارخانیة: وهو الاصح وعلیه الفتویٰ کذا فی جواهر الاخلاطی.

وفی الشامیة(۲/۲۳۷): وفی شرح المنیة عن منیة المفتی: المختار انه لا یکره التطیین.

(۴۲۴) قبر پر سبز پتی پھول اور خوشبو رکھنے کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ قبروں پر سبز پتی یا پھول اور خوشبو وغیرہ رکھتے ہیں، یہ فعل سنت ہے، مستحب ہے یا مباح ہے یا بالکل بے فائدہ ہے؟ شرعی دلیل سے جو ثابت ہو مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبروں پر سبز پتی، پھول اور خوشبو وغیرہ رکھنا یہ نہ سنت ہے اور نہ مستحب، بلکہ یہ ایک بے فائدہ چیز ہے اور شریعت میں اس کی کوئی اصل اور ثبوت نہیں ہے اور آج کل لوگ اس کام کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں لہٰذا اس کا ترک کرنا واجب ہے۔

لمافی شرح مسلم(۱/۱۴۱): قال النووی، ففیه انه رضی الله عنه تبرک بفعل مثل فعل النبی ﷺ وقد انکر الخطابی مایفعله الناس علی القبور من الاخواص ونحوها متعلقین بهذا الحدیث وقال لا اصل له ولا وجه له، والله اعلم.

وفی عمدة القاری (۳/۱۲۱): وکذلک مایفعله اکثر الناس من وضع مافیه رطوبة من الریا حین والبقول ونحوهما علی القبور لیس بشی وانما السنة الغرز،

وفی معارف السنن(۱/۳۲۶): قال الشیخ المحدث الاکبر العلامة محمد یوسف بنوری نور الله مرقده: اتفق الخطابی والطرطوشی والقاضی عیاض علی المنع وقولهم اولی بالاتباع حیث اصبح مثل تلک المسامحات والتعللات مثاراً للبدع المنکرة والفتن السائرة فتری العامة یلقون الزهور علی القبور وبالأخصّ علی قبور الصلحاء والاولیاء والجهلة منهم از دادوا اصراراً علی ذلک وتغالوا فیه واوضحت ذلک منشاء فی الجهة لعقائد فاسده تأباها الشریعة النقیة وظنوا ذلک سببا للثواب والاجر الجزیل فالمصلحة العامة فی الشریعة تقتضی منع ذلک بتاتا استئصالاً لشأفة البدع وحسماً لمادة المنکرات المحدثة وبالجملة هذه بدعة مشرقیة منکرة وبجنبها بدعة اخری مغربیة قدراجت فی کثیر من البلاد المشرقیة التی تدعی بلاد اسلامیة الخ وکل هذه بدع ومنکرات لااصل لها فی الدین ولا مستندلها من الکتاب والسنة ویجب علی اهل العلم ان ینکروها وان یبطلوا هذه العادات ما استطاعوا انتهی.

(۴۲۵) پوسٹ مارٹم وغیرہ کی غرض سے میت کو قبر سے نکالنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل بعض اوقات پوسٹ مارٹم کرنے کیلئے میت کو قبر سے نکالا جاتا ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اور وہ کونسا عذر ہے جس کی وجہ سے میت کو دفن کرنے کے بعد قبر سے نکالا جاسکتا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد بلا عذر شرعی نکالنا جائز نہیں۔اور پوسٹ مارٹم میں چونکہ میت کی توہین ہے نیز یہ کوئی عذر شرعی بھی نہیں اس لئے پوسٹ مارٹم کیلئے میت کو قبر سے نکالنا درست نہیں اور وہ عذر جس کی بنا پر میت کو دفن کے بعد نکالنا جائز ہے یہ ہے کہ مثلاً وہ زمین مغصوبہ ہو یا شفیع نے شفعہ کر کے لی ہو،اور وہ اس کا مطالبہ کر رہا ہو تو پھر میت کو قبر سے نکالنا جائز ہے۔

لمافی الھندیة (۲/۴۷۰): المیت بعدما دفن بمدة طویلة اوقلیلة لایسع اخراجه من غیر عذر ویجوز اخراجه بالعذر والعذر أن یظهر ان الأرض مغصوبة او اخذها الشفیع بالشفعة کذا فی الواقعات الحسامیة ...... الخ.

(۴۲۶) میت گھر میں موجود ہو تو اس جگہ تلاوت کلام پاک کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی میت جب تک گھر میں موجود ہوتی ہے تو اس جگہ تلاوت قرآن شریف کرنی چاہئے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......غسل سے پہلے میت کے پاس قرآن پاک کی تلاوت مکروہ ہے البتہ جب میت کو غسل دیدیا جائے تو پھر اس کے پاس تلاوت کرنا درست ہے۔

لما فی الھندیة (۱/۱۵۷): ویکره قراءة القران عنده حتی یغسل کذا فی التبیین الخ.

وفی حاشیة الطحطاوی علی الدر (۱/۳۶۵): قوله تکره القراءة) ای تحریما اخذا من التعلیل الآتی (قوله عنده) ای بعد موته (قوله تنزیها) ای تبعیدا والا ولیٰ فی التعبیر زیادة بقوله.

(۴۲۷) نمازِ ظہر،نمازِ جنازہ اور کسوف میں کون سی نماز مقدم ہوگی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ،کسوف اور صلاۃ ظہر جمع ہوگئیں تو ان میں سے کس کو مقدم کیا جائے گا؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں سب سے پہلے فرض پڑھ لے،اس کے بعد نمازِ جنازہ پڑھ لے،اس کے بعد صلاۃ کسوف پڑھے۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ (۱/۲۲۳): اما بعد غروب الشمس بدؤا بالمغرب ثم بصلوة الجنازة ثم بسنة المغرب کذا افتی شمس الائمة الحلوانی.

وفی الھندیة (۱/۱۵۳): وأن غربت کاسفة أمسک عن الدعآء واشتغل بصلاة المغرب وان اجتمع الکسوف والجنازة بدأ بالجنازة.

(۴۲۸) نمازِ جنازہ سے پہلے قرآن لے جانا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔جنازہ سے پہلے قرآن لے جانا جائز ہے یا ناجائز؟

(۲)۔جنازہ کے بعد مولوی صاحب کے ساتھ لوگ بیٹھ جاتے ہیں اور قرآن مجید کے نیچے روپے باندھ لیتے ہیں اور یہ روپے ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو جمع ہوتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۳)۔پھر چالیس دن تک یہ لوگ قبرستان میں جاکر مردے کی قبر پر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۴)۔پھر یہ لوگ چار جمعے یا سات جمعے کرتے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن مجید ختم بھی کرتے ہیں اور ساتھ میں خیرات بھی کرتے ہیں اس کے علاوہ قرآن مجید کے ایک یا دو پارے پڑھنے پر ان کو دس یا بیس روپے دیتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۵)۔اور یہ لوگ اپنے مُردے کے سال پورا ہونے کے بعد خیرات کرتے ہیں اس میں غریب بھی ہوتے ہیں جس کی وصیت نہیں ہوتی لیکن رواج کے مارے یہ لوگ پھر بھی اس کو کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۶)۔ایک آدمی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اولاد دے اور پھر آٹھ نو سال اس کی کوئی اولاد نہ ہو، اور وہاں کا رواج اس طرح کا ہے کہ ایک بابا وہاں گھوڑے پر آتا ہے اور جس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو کہتا ہے کہ پانچ سو یا ہزار روپے دیدو اسی طرح میرے ماں باپ نے مجھے مجبور کیا کہ آپ بابا کے پاس جاؤ یا دوسری شادی کردو مگر میرا یہ یقین تھا کہ جس اللہ نے پہلے بچے دیئے ہیں وہ اللہ پاک اب بھی دے سکتے ہیں۔مگر گھر میں اگر ماں باپ اور بھائی کہیں تو ان کا کہنا ماننا کیا گناہ ہوگا؟ اس بارے میں مطلع فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....استفتاء میں مذکور سوالات کے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں:

(۱)۔یہ بات تو حقیقت اور مسلّم ہے کہ قرآن مقدس ایک مبارک اور برکت والی کتاب ہے۔اس کا اپنے پاس رکھنا موجب برکت وثواب ہے، لیکن شریعت اسلامی میں مسلمان اپنے ہر معاملے میں قرآن وسنت کا پابند ہے کسی بھی دینی معاملے میں اپنی طرف سے بنایا ہوا بے اصل فعل شریعت میں قابل قبول نہیں ہے اور نہ ہی شریعت ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے بلکہ شریعت نے ایسے کاموں کو ضلالت اور گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔لہٰذا مذکورہ مروجہ طریقہ یعنی قرآن مجید کو جنازے سے پہلے لے کر جانا چونکہ نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے باوجود یکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، خیر اور دین کے معاملے میں بہت حریص تھے، کسی بھی کام میں اگر ذرا سی خیر اور نیکی ہوتی تو صحابہ کرامؓ وہ کام ضرور سرانجام دیتے۔لیکن مذکورہ مروجہ طریقہ نہ تو صحابہ کرامؓ سے اور نہ ہی سلف صالحین سے ثابت ہے لہٰذا یہ طریقہ من گھڑت اور بدعت ہے اور اس کو ترک کرنا لازمی ہے۔

لـمافی تفسیر ابن کثیر (۴/۱۴۱): کل فعل وقول لم یثبت عن الصحابة رضی الله عنهم هو بدعة، لأنه لو کان خیراً لسبقونا الیه لأنهم لم یترکو خصلةً من خصال الخیر إلا وقد بادروا الیها.

وفی مشکوٰۃ(صـ۲۷): ولما جاء فی الحدیث النبوی، عن عائشة رضی الله عنها، قالت ، قال رسول الله ﷺ ، من أحدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو ردّ.

وفی المرقاۃ(۱/۲۱۶):قال النووی،البدعة کل شئ عمل علیٰ غیر مثال سبق، وفی الشرع، إحداث مالم یکن فی عهد رسول الله ﷺ.

(۲)۔ مذکورہ مروجہ طریقہ کہ قرآن مقدس کے نیچے کچھ روپے باندھے جاتے ہیں، یہ طریقہ نہ تو صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے اور نہ سلف صالحین سے ثابت ہے اور نہ ہی کسی امام مجتہد سے نقل ہے لہٰذا یہ طریقہ خالص بدعت ہے اور قابل ترک ہے۔

لمافی مشکوٰۃ(صـ۲۷):لماجاء فی الحدیث،عن عائشة رضی الله عنها، قالت، قال، رسول الله ﷺ من أحدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو ردّ.

(۳)۔میت کے ایصال ثواب کیلئے قرآن مجید کی تلاوت گھر میں اور قبر پر دونوں جگہ جائز ہے اور موجب ثواب ہے، لیکن اس میں اپنی طرف سے دنوں کی تخصیص اور تعین کرنا کہ چالیس دن تک ہی پڑھیں گے یہ درست نہیں ہے، کسی بھی عبادت میں اپنی طرف سے دن اور وقت کا تعین اور تخصیص کرنا بدعت ہے، ورنہ فی نفسہٖ قبر پر تلاوت کرنا جائز بھی ہے اور میت کو اس کا ثواب بھی پہنچتا ہے اور اس سے عذاب میں کمی بھی واقع ہوتی ہے۔

لمافی فتح القدیر(۲/۱۴۲):واختلف فی اجلاس القارئین لیقرؤا عند القبر والمختار عدم الکراهة.

وفی البحر (۲/۱۹۵): ولا بأس بقراءۃ القرآن عند القبور ور ما تکون افضل من غیره، ویجوز ان یخفف الله عن اهل القبور شیأ من عذاب القبر او یقطعه عند دعآء القارئ وتلاوته.

وفی البزازیة علی هامش الهندیة (۴/۸۱): مات فأجلس وارثه من یقرأ القرآن لابأس به أخذ بعض المشایخ.

وفی الهندیة(۱/۱۶۶): قراءۃ القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله تعالیٰ لاتکره، ومشائخنا أخذوا بقوله وهل ینتفع والمختار انه ینتفع.

وفی الشامیة(۶/۵۷): ولو زار قبر صدیق او قریب له وقرأ عنده شیأ من القرآن فهو حسن.

(۴،۵)۔صدقہ، خیرات، تلاوتِ قرآن مقدس، ذکر اور کوئی بھی نیک عمل کر کے اس کا ثواب میت کو پہنچانا جائز اور مستحسن امر ہے اور ان اعمال کا ثواب میت کو پہنچتا بھی ہے، لیکن سوال میں مذکورہ مروجہ طریقے میں تین خرابیاں پائی جاتی ہیں جن خرابیوں نے ان امور کو ناجائز بنا دیا ہے۔اول...... یہ کہ لوگ چار جمعے، سات جمعے اور سال کے بعد خیرات کرتے ہیں، اور ان چار جمعوں، سات جمعوں یا سال کے بعد خیرات کرنے کی تخصیص اور تعین قرون اولیٰ سے ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ بدعت ہے۔دوم......لوگ ختم قرآن پر کھانا کھلاتے ہیں، اور یہ صورت بھی درست نہیں ہے۔سوم......ایک یا دو پارے پڑھنے پر پڑھنے والے کو دس، یا بیس روپے دیے جاتے ہیں، یہ صورت بھی ناجائز ہے، اور اس صورت میں نہ میت کو ثواب ملتا ہے اور نہ تلاوت کرنے والے کو، بلکہ پڑھنے والا اور پیسے دینے والا دونوں گنہگار ہوجاتے

ہیں، اور علاوہ ازیں ان چار جمعوں، سات جمعوں کے بعد خیرات کرنا، ان میں عموماً، نام ونمود، ریا اور دکھلاوا اور رسم ورواج کا کرشمہ کارفرما ہوتا ہے، جیسا کہ سائل کے سوال سے بھی معلوم ہوتا ہے، ان امور میں رضاء الٰہی مقصود نہیں ہوا کرتی، اور لوگ یہ امور اس لئے سرانجام دیتے ہیں کہ نہ کرنے کی صورت میں برادری اور خاندان میں عزت نہ رہے گی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ان امور سے احتراز کرنا چاہئے اور دنوں کی تعیین کیے بغیر میت کے ایصال ثواب کیلئے صدقہ، خیرات کرنا چاہئے۔

لمافی الشامیة(۲/۲۴۳): وفی البحر، من صام او صلّی او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند اهل السنة و جماعة.

وفی البحر(۲/۱۹۲): ان اتخذ ولی المیت طعاماً للفقراء كان حسناً اذا كانوا بالغين، وان كان فی الورثة صغير لم يتخذ ذلک من التركة.

وفی الطحطاوی علی المراقی(صـ۵۱۰): قال فی البزازية ويكره اتخاذ الطعام فی اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع...... واتخاذ الدعوة بقراء ة القرآن.

وفی الشامية(۶/۵۷): ونقل العلامة الخلوتی...... عن شيخ الاسلام تقی الدين ما نصه ولا يصح الاستئجار على القرا ءة واهدائها الى الميت...... وقد قال العلماء ان القاری إذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فایّ شئ يهديه الى الميت.

وفی الشامية(۶/۵۶): ان القرآن بالاجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ وقال العينی فی شرح الهداية ويمنع القاری للدنيا، والآخذ والمعطی آثمان، فالحاصل ان ماشاع فی زماننا من قرآءة الاجزآء بالاجرة لايجوز.

وفی الشامية(۲/۲۴۰): ويكره اتخاذ الطعام فی اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی مواسم واتخاذ الدعوة لقراء ة القران......وقال (صـ۲۴۱) وهذه الافعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لانهم لا يريدون به وجه الله تعالىٰ.

(۲) ۔اولاد کا دینا یا نہ دینا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے تصرف اور قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کو اولاد نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہیں نرینہ اولاد دے دیں اور جسے چاہیں لڑکی دے دیں اور جسے چاہیں بالکل ہی اولاد سے محروم کردیں۔ اس سلسلے میں نیک اور اللہ والے لوگوں سے دعا تو کرائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس طرح سے کہ عقیدہ میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو، اس مسئلہ میں لوگوں کو اپنا عقیدہ درست کرنا چاہئے، آپ اپنے والدین کو سمجھائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے والدین کی ہدایت کی دعا کیا کریں اس معاملے میں آپ کیلئے ان کی اطاعت ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر عقیدہ میں کچھ فرق ہے تو اُن کا کہنا ماننا اس معاملے میں بالکل جائز نہیں ہے۔

لمافی القرآن الكريم(الشورى: ۴۹، ۵۰): لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ، يَهَبُ لِمَنْ

يَشَآءُ اِنَاثاً وَيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ، اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَاناً وَ اِنَاثاً، وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيماً، اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ.

وفی تفسیر لابن کثیر(۴/۱۰۸): فجعل الناس اربعة اقسام: منهم من یعطیه البنات، ومنهم من یعطیه البنین ومنهم من یعطیه من النوعین ذکورا و اناثا ومنهم من یمنعه هذا وهذا فیجعله عقیماً لانسل له ولا ولدله.

وفی کنز العمال(۶/۶۷):الحدیث: لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

(۴۲۹) نماز جنازہ میں تین سے زائد صفوں میں طاق عدد کی رعایت نیز جنازہ کی آخری صف کا اجر

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں اگر صفیں تین سے زائد ہوں تو کیا اس وقت بھی طاق عدد کی رعایت ضروری ہے؟ پانچ یا سات ہوں نیز کیا نماز جنازہ کی آخری صف میں اجر زیادہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرض نماز میں پہلی صف کا اجر ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... بلاشبہ نماز جنازہ میں طاق صفوں کی فضیلت روایات سے ثابت ہے لیکن فقہی کتابوں کی عام عبارتیں تین صفوں تک نشاندہی کرتی ہیں اس لئے اس کی رعایت بہتر ہے۔ اوراسی طرح نماز جنازہ کی آخری صف میں اجر بھی زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ فرض نماز میں پہلی صف کا اجر زیادہ ہوتا ہے۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۲۰۰):عن مرثد بن عبدالله الیزنی قال کان مالک بن هبیرة اذا صلی علی جنازة فتقال الناس علیها جزاهم ثلثة اجزاء ثم قال قال رسول الله ﷺ من صلی علیه ثلثة صفوف فقد اوجب.

وفی تحفة الاحوذی(۲/۱۴۳): واقل الصف ان یکون اثنین علی الاصح قاله القاری قلت ولاحد لاکثره.

وفی المشکوٰة(ص۱۴۷):عن مالک بن هبیرة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ما من مسلم یموت فیصلی علیه ثلثة صفوف من المسلمین الا اوجب.

وفی المرقاة (۴/۱۴۹):قال ابن الملک فی شرح الوقایة: ذکر الکرمانی ان افضل الصفوف فی صلاة الجنازة آخرها وفی غیرها اولها اظهاراً للتواضع.

وفی الدر المختار(۲/۲۱۴):وافضل صفوفها آخرها اظهاراً للتواضع.

وفی الشامیة(۲/۲۱۴): فلو کان الصف الاول افضل فی الجنازة ایضاً لکان الافضل جعلهم صفاً واحداً ولکرہ قیام الواحد وحدہ.

(۴۳۰) نمازِ جنازہ کی آخری صف میں کھڑے ہونے کی فضیلت کی کیا وجہ ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنازہ میں سب سے پچھلی صف میں کھڑے ہونے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جتنا میت سے دور ہوگا اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ آیا اس بات میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی علت کیا ہے؟ دلائل سے مسئلے کو مزین فرمادیں تو نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... نمازِ جنازہ میں آخری صف افضل ہے کیونکہ اقرب للتواضع ہے۔

لمافی حلبی کبیر(۱/۵۸۸): افضل صفوف الرجال فی الجنازة آخرها وفی غیرها أولها اظهارا للتواضع لتکون شفاعته أدعی للقبول.

وفی الشامیة(۲/۲۱۴): وقوله: وافضل صفوفها آخرها الخ کذا فی القنیة وبحث فیه فی الحلیة باطلاق مافی صحیح مسلم عنه ﷺ خیر صفوف الرجال اولها وشرها آخرها وبأن اظهار التواضع لایتوقف علی التاخر: اقول قد یقال ان الحدیث مخصوص بالصلاة المطلقة لأنها المتبادرة ولقوله ﷺ من صلی علیه ثلاثة صفوف غفرله رواه ابو داؤد وقال حدیث حسن والحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم ولهذا قال فی المحیط یستحب أن یصف ثلاثة صفوف حتی لو کانوا سبعة یتقدم أحدهم للامامة ویقف وراء ہ ثلاثة ثم اثنان ثم واحد فلو کان الصف الاول افضل فی الجنازة ایضا: لکان الأفضل جعلهم صفا واحدا ولکرہ قیام الواحد وحدہ کما کرہ فی غیرها هذا ما ظهرلی.

(۴۳۱) کیا حاضرینِ جنازہ کیلئے نمازِ جنازہ فرضِ عین ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ جب مسجد یا جنازہ گاہ میں آجائے تو اس وقت وہاں موجود سب افراد پر اس کا پڑھنا فرض عین ہوجاتا ہے یا پھر صرف بعض لوگوں کا پڑھنا کافی ہے۔ اگر کوئی نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو تو کیا وہ گناہگار ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں جن میں سے ایک اس کی وفات پر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہونا ہے اور نماز جنازہ فرض کفایہ ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں اگرچہ بعض افراد کا نماز جنازہ ادا کرنے سے باقی لوگوں سے فرض ساقط ہوجاتا ہے لیکن حاضرین کیلئے ایک مسلمان کا حق ہونے کی وجہ سے جنازہ میں شریک نہ ہونا مناسب نہیں نیز بعض حضرات نے حاضرینِ جنازہ پر

نماز جنازہ کوفرض عین کہا ہے لیکن یہ قول شاذ ہے۔

لما فی صحیح مسلم(۲/۲۱۳): عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ خمس تجب للمسلم على اخيه رد السلام وتشميت العاطس واجابة الدعوة وعيادة المريض واتباع الجنائز.

وفى الهندية(۱/۱۶۵): لا ينبغى ان يرجع من جنازة حتى يصلى عليه.

وفى حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح (ص۴۷۷،۴۷۸): (فرض كفاية) بالاجماع..... والاصل فيه قوله تعالىٰ "وصل عليهم" (التوبة:۱۰۳) وقوله عليه الصلوة والسلام صلوا على كل بر وفاجر وانما كانت فرض كفاية لقوله عليه السلام "صلوا على صاحبكم ولو كانت فرض عين ماتركها ولان فى الايجاب اى العينى على الجميع استحالة وحرجاً فاكتفى بالبعض.

وفى الدر المختار(۲/۲۰۷): والصلاة عليه..... فرض كفاية بالاجماع: الشامية (۱/۵۳۸): وفرض الكفاية معناه فرض ذو كفاية اى يكتفى بحصوله من اى فاعل كان.

وفى تقريرات الرافعى على رد المحتار(۲/۱۱۹): (قول المصنف فرض كفاية) فى السندى ثم انه قيل كون صلاة الجنازة فرض كفاية مقيد بما اذا لم يكن الناس حاضرين فى مجلس الجنازة لانه ذكر فى فتاوىٰ قاضيخان وظهير الدين والمستصفى قال السيد الامام ناصر الدين واذا لم يكن الناس حاضرين فى مجلس الجنازة و لم يعاينوها فالصلاة عليها فرض كفاية واما عند حضورهم ومشاهدتهم فالصلاة واجبة على كل واحد من الناس باداء نفسه لانها حينئذ فرض عين ولا خلاف فيه اصلاً كذا رأيته بخط بعض الفضلاء ونقله الملا على قارى عن فتوى ابى المعالى وهكذا وجدته بها مش المنح وقد طالعت فى مختار الفتاوىٰ ومتانة الروايات وغيرهما من المعتبرات المتعددة فلم اجد احداً ذكر انها تصير فرض عين على الحاضرين فلتراجع المسئلة وقوله ﷺ "صلّوا على صاحبكم" مع حضوره دليل على عدم افترا ضها على كل حاضر اهـ. لكن الاولىٰ مراجعة الكتب التى نسب لها القول بالافتراض عند الحضور وقد راجعت فتاوىٰ قاضيخان فلم اجد هذه المسئلة فيها.

(۴۳۴) امام پر نمازِ جنازہ کے بعد تدفین تک شریک رہنے اور تقریر کرنے کی شرط لگانا کیسا ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض علاقوں میں خطباء جب نمازِ جنازہ پڑھا لیتے ہیں تو پھر اُن کے مقتدیوں کی طرف سے اس کو اجازت نہیں ہوتی، یہاں تک کہ میت دفن ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد قبر کے ایک طرف پر سورۃ

بقرہ کا پہلا رکوع اور دوسری طرف آخری رکوع پڑھ لیتے ہیں پھر اس کے بعد تقریر کرتے ہیں اور پھر رخصتی ہوتی ہے اگر کوئی اس طرح نہیں کرتے تو وہ اُن کو امام نہیں رکھتے یہاں تک کہ یہ شرائط مان لے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کا امام پر یہ الزام صحیح ہے یا نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ یہ مذکورہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اس طرح کی شرائط لگانا صحیح نہیں ہے، البتہ مذکورہ طریقہ کہ سورۃ بقرۃ کا پہلا رکوع اور آخری رکوع پڑھنا صحیح ہے۔

لمافی الشامیة (۲/۲۳۷): (قوله وجلوس الخ) لمافي سنن ابي داؤد كان النبي ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف على قبره وقال: استغفروا لأخيكم واسألو الله له التثبيت فانه الآن يسأل وكان ابن عمر يستحب ان يقرا على القبر بعد الدفن اوّل سورة البقرة وخاتمتها اه.

(۴۳۴) جنازہ کے بعد صفیں بکھر جانے پر دعا و وعظ وغیرہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنازہ کے بعد اگر صفوں کو توڑا جائے تو دعا کرنا جائز ہے۔ کیا یہ مسئلہ ان لوگوں کا صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو اس کی دلیل بیان فرمائیں، بڑی مہربانی ہوگی۔

(نوٹ)۔ ہمارے علاقوں میں رواج ہے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۲)۔ میت کو دفن کرنے کے بعد بعض لوگ قبر پر وعظ اور دعا کرتے ہیں۔ اگر ان کا ثبوت ہو، تو مع دلائل ارشاد فرمائیں بڑی نوازش ہوگی۔

(۳)۔ قبر پر سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر کو سراً پڑھنا چاہئے یا جہراً؟ اور اس وقت باقی لوگ بیٹھے ہوں گے یا کھڑے ہوں گے؟ نیز یہ بتائیں کہ اگر سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر کا التزام کسی جگہ شروع ہو جائے تو بدعت تو نہ بنے گی۔ جبکہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

ان تمام صورتوں کو مضبوط دلائل کے ساتھ ارشاد فرمائیں، بڑے مشکور ہوں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱)۔ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا جائز نہیں، بلکہ بدعت ہے۔ خواہ صفوں میں کھڑے کی جائے یا صفیں توڑ کر کی جائے۔ اور جو لوگ نمازِ جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر دعا کرنے کو جائز کہتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ فقہاء کرام ومحدثین عظام نے نمازِ جنازہ کے بعد مطلقاً دعا کرنے کو منع فرمایا ہے۔

(۲)۔ میت کو دفن کرنے کے بعد تھوڑی دیر قبر کے پاس بیٹھنا مستحب ہے اور اس وقت قرآن پاک کی تلاوت کرنا اور میت کیلئے دعا کرنا جائز ہے۔ اور اسی طرح اس وقت میں ایسا وعظ کرنے کی بھی گنجائش ہے جو موت اور آخرت کی یاد دلانے کیلئے ہو، اور اس میں دوسرے منکرات اور بدعات کا ارتکاب نہ کیا جاتا ہو۔

(۳)۔ سب سے بہتر اور اچھا طریقہ یہ ہے کہ دفن کرنے کے بعد کوئی میت کے سرہانے سورۃ البقرۃ کے اوائل پڑھے اور دوسرا میت کی

پائنتی (پاؤں کی طرف) سورۃ البقرۃ کے اواخر پڑھے اور باقی لوگوں کو بھی اگر یہ یاد ہوں تو یہی پڑھیں ورنہ جو بھی سورۃ یا آیات ان کو یاد ہوں وہ پڑھیں۔ نیز دفن کرنے کے بعد اگر چہ قبر کے پاس بیٹھنا، دعا کرنا، سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر پڑھنا مستحب ہے لیکن ان امور کا التزام کرنا (یعنی ان کو ضروری سمجھنا) درست نہیں ہے۔ دفن کرنے کے بعد اگر کوئی ان امور کے بغیر جانا چاہے تو اس کیلئے بغیر کراہت کے جانا درست ہے۔

لما مشكوة المصابيح مع مرقاة المفاتيح(۴/۸۰): وعن عمرو ابن العاص قال لابنه وهو في سياق الموت اذا أنامت فلا تصحبني نائحة ولا نار فاذا دفنتموني فشنوا على التراب شنا ثم اقيموا حول قبري قدر ما ينحر جذور ويقسم لحمها حتى استأنس بكم واعلم ماذا أراجع به رسل ربي رواه مسلم.

وفي المرقاة تحت قوله (ثم اقيموا حول قبري) لعله للدعاء بالتثبيت وغيره وتحت قوله (حتى استأنس بكم) اى بدعائكم واذكاركم وقراتكم واستغفاركم وقدورد في خبر أبي داؤد انه عليه الصلاة والسلام كان اذا فرغ من دفن الرجل يقف عليه ويقول استغفروا الله لأخيكم واسألوا له التثبيت وفي رواية التثبت فانه الآن يسئل.

وفيه ايضاً(ص۸۱): وعن عبدالله بن عمر (رضي الله عنهما) قال سمعت النبي ﷺ يقول اذا مات احدكم فلا تحبسوه واسرعوا به الى قبره وليقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجليه بخاتمة البقرة رواه البيهقي في شعب الايمان وقال والصحيح انه موقوف عليه.

وفي الهندية (۱/۱٦٦): ويستحب اذا دفن الميت ان يجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها يتلون القرآن ويدعون للميت كذا في الجوهرة النيرة. قراءة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله تعالىٰ لا تكره، ومشايخنا رحمهم الله اخذوا بقوله وهل ينتفع والمختار انه ينتفع هكذا في المضمرات.

وفي الدر المختار(۲/۲۳۷،۲۳٦): ويستحب حثيه من قبل رأسه ثلاثا، وجلوس ساعة بعد دفنه لدعاء وقراءة بقدر ما ينحر الجزور ويفرق لحمه وفي الشامي تحت(قوله وجلوس الخ) لمافي سنن أبي داؤد ((كان النبي ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف على قبره وقال: استغفروا الأخيكم واسألوا الله له التثبيت فانه الآن يسأل)) وكان ابن عمر(رضي الله عنهما) يستحب ان يقرأ على القبر بعد الدفن اول سورة البقرة وخاتمتها ..... وفي الشامية (۲/۳۸۱):وكذا قالوا بسنية قراءة السور الثلاثة في الوتر مع الترك احيانا لئلا يعتقد وجوبها.

(۴۳۴) نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض ائمہ مساجد کو دیکھا گیا ہے کہ صلوٰۃ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں، کیا شریعت میں اس کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جنازہ کی نماز میت کیلئے دعا بھی ہے اس لئے نماز جنازہ کے بعد جنازہ کو روک کر سب کا مل کر دعا مانگنے کا التزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے اور نہ یہ طریقہ سلف صالحین سے ثابت ہے اور ہر وہ کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہ ہو، وہ مردود ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ: من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد. (مسلم شریف ۲/۷۷)

لمافي خلاصة الفتاوىٰ (۱/۲۲۵): لايقوم بالدعاء بعد صلوة الجنازة...... الى و لا يقوم بالدعاء في قراءة القرآن لاجل الميت بعد صلوة الجنازة وقبلها الخ.

وفي فتاوىٰ سراجيه(صـ۲۳):ليس في صلوة الجنازة دعاء موقت اذافرغ من الصلوة لايقوم بالدعاء.

(۴۳۵) میت کو دفن کرنے کے بعد کی دعا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد کونسی دعا پڑھنی چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... میت کو دفن کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مندرجہ ذیل دعا ثابت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرْدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نُقِّيَتِ الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِنْ دَارِهٖ وَأَهْلاً خَيْراً مِنْ أَهْلِهٖ وَزَوْجاً خَيْراً مِنْ زَوْجِهٖ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ.

لمافي المسلم (۱/۳۱۱): عن عوف بن مالك رضي الله عنه صلى رسول الله ﷺ على جنازة فحفظت من دعائه "اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الأبيض من الدنس وابدله داراً خيراً من داره وأهلاً خيراً من أهله وزوجا خيرا من زوجه وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار".

(۴۳۶) تلقین جہراً کرنا چاہیئے یا سراً؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تلقین علی القبر جہراً کرنا چاہئے یا سراً؟ جواب دیکر ثواب۔

دارین حاصل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... یہ صراحت تو کہیں نہیں ملی، البتہ فقہاء کے کلام اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تلقین میں میت کو مخاطب کیا جاتا ہے لہٰذا اتنی اونچی آواز سے تلقین ہو کہ وہ سن سکے۔

لمافی الفقه الاسلامی(۱۵۶۵/۲): ويقعد الملقن عند رأس القبر فيقال له: ياعبدالله ابن أمة الله اذكر ماخرجت عليه من دار الدنيا: شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله وان الجنة حق والنار حق وان البعث حق و ان الساعة اتية لاريب فيها وان الله يبعث من في القبور وانك رضيت بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد نبيا وبالقرآن إماما وبالكعبة قبلة وبالمؤمنين اخوانا.انتهى.رواه الطبراني في الكبير.

(۴۳۷) جنازہ میں شرکت سے تعزیت کی ادائیگی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تعزیت کیلئے نماز جنازہ کے بعد میت کے اہل خانہ کے پاس جانا ضروری ہے یا صرف نماز جنازہ میں شرکت کر لینے سے تعزیت ادا ہو جاتی ہے۔ دوبارہ اہل میت کے پاس جانا ضروری نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز جنازہ اور تعزیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ نماز جنازہ میت کا حق ہے جبکہ تعزیت میت کے اہل وعیال و عزیز و اقارب سے کی جاتی ہے تعزیت کرنا مسنون ہے، تعزیت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل میت کو تسلی دے اور ان کو صبر کی ترغیب اور رضا بالقدر کی تلقین کرے، میت کے لئے مغفرت کی دعا کرے۔ تین دن تک تعزیت کر سکتا ہے اس کے بعد تعزیت نہ کرے ہاں اگر وہ غائب ہے یا اہل میت میں سے کوئی غائب ہے تو پھر تین دن کے بعد بھی تعزیت کر سکتا ہے۔ البتہ جنازہ سے قبل بھی تعزیت کر سکتا ہے مگر جنازہ کے بعد تعزیت کرنا زیادہ بہتر ہے لہٰذا صرف جنازہ میں شرکت سے تعزیت نہیں ہوگی بلکہ اہل میت کے پاس جا کر ان کو تسلی وغیرہ دینے سے تعزیت ہوگی۔

لمافی المشكوة المصابيح(صـ۱۵۱): عن عبدالله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ من عزّى مصابا فله مثل اجره.

وفي مصنف عبدالرزاق(۳۹۶/۳): ان الحسن مرّ بأهل الميت فوقف عليهم فقال اعظم الله اجركم وغفرالله لصاحبكم ثم مضى ولم يقعد.

وفي الشامية (۲۳۹/۲): (قوله: وبتعزية أهله) اى تصبيرهم والدعاء لهم به قال في القاموس: العزاء الصبر أو حسنه وتعزى.

(صـ۲۴۰) وتستحب التعزية للرجال والنساء اللاتي لايفتن (صـ۲۴۱) (قوله: واولها افضل) وهي

بعد الدفن افضل منها قبله، لأن اهل الميت مشغولون قبل الدفن بتجهيزه ولأن وحشتهم بعد الدفن لفراقه أكثر، وهذا اذا لم يرمنهم جزع شديد والاقدمت لتسكينهم.

(۴۳۸) میت کی تعزیت کیلئے مسجد میں بیٹھنے کے مروجہ طریقے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کی تعزیت کے سلسلہ میں آج کل عموماً لوگ مسجدوں میں بیٹھتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ اس طرح تعزیت کے لئے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......تعزیت کیلئے مسجد میں بیٹھنا بعض علماء کے نزدیک مکروہ ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۶۷): ولا بأس لاهل المصيبة ان يجلسوا في البيت او في مسجد ثلاثة ايام والناس يأتو نهم ويعزونهم......

وفي الدر المختار(۲/۲۴۱): وبالجلوس لهافي غير مسجد ثلاثة ايام......

وفي الشامية: قوله في غير مسجد، امّا فيه فيكره كمافي البحر عن المجتبى، وجزم به في شرح المنية والفتح لكن في الظهيرية لا بأس به لاهل الميت في البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم......

وفي الفقه الاسلامي(۲/۵۴۳،۵۴۴): لا بأس بالجلوس للتعزية في غير المسجد ثلاثة ايام وقال في الفتاوى الظهيرية لا بأس بها لاهل الميت في البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم......

(۴۳۹) معمر عورت کا اپنے اقارب کی قبر پر جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت قبرستان میں اپنے شوہر، بھائی، باپ یا بیٹے کی قبر پر جائے اور اس کی عمر تقریباً پچاس (۵۰) سال ہو تو اس عورت کا قبرستان جانا جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اس عورت کا قبرستان میں جانا جائز ہے بشرطیکہ مروجہ بدعات وغیرہ سے بچی رہے۔

لمافي الشامية(۲/۲۴۲): (قوله ولو للنساء) وقيل تحرم عليهن: والأصح أن الرخصة ثابتة لهن بحر وجزم في شرح المنية بالكراهة لما مرفي اتباعهن الجنازة. وقال الخير الرملي: إن كان ذلك لتجديد الحزن والبكاء والندب على ماجرت به عادتهن فلاتجوز، وعليه حمل حديث "لعن الله زائرات القبور" وإن كان للاعتبار والترحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصالحين فلا بأس

اذا کن عجائز ویکرہ اذا کن شواب کحضور الجماعۃ فی المساجد اھ وھو توفیق حسن۔

(۴۴۰) میت کے ایصال ثواب کیلئے دن مقرر کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقوں میں پہلے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ میت کے تیسرے دن خیرات وغیرہ کھانا تیار کرتے تھے اور پورے علاقے والوں کی ضیافت کرتے تھے ایصال ثواب کی نیت سے۔ علماء کی بھرپور محنت کی وجہ سے لوگ اس سے باز آگئے۔ لیکن ابھی تیسرے دن کی جگہ پانچویں دن خیرات کرتے ہیں۔ تو پانچویں دن خیرات کرنا کیسا ہے؟ اور کیا اس کا کھانا درست ہے یا نہیں؟ اگر کوئی امام کھالے تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور ان کا امام رہنا کیسا ہے؟ اور کیا اس کو امامت سے دور کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شریعت مطہرہ نے صدقہ وخیرات کرنے کی بہت رغبت دلائی ہے اور اس میں بہت ثواب بتلایا ہے، اور اعمال صالحہ کا ایصال ثواب کرنے سے میت کے حقوق کی ادائیگی بھی ہوتی ہے۔ لیکن شریعت مطہرہ میں اس کیلئے نہ ہی کوئی خاص دن متعین ہے اور نہ ہی اجتماع وغیرہ کو متعین کیا ہے ہر شخص انفرادی طور پر بھی ایصال ثواب کرسکتا ہے۔ اپنی طرف سے خاص دن متعین کرنا اور اسی دن صدقہ کرنے کو ثواب سمجھنا بدعت ہے پس صورت مسئولہ میں خاص دن متعین کیا گیا ہے اور اسی دن صدقہ کرنے کو ثواب سمجھا جاتا ہے علاوہ ازیں اس میں دوسرے مفاسد بھی ہیں مثلاً اہل بدعت سے مشابہت، بے جا اسراف، ریا ونمود وغیرہ اس لئے یہ بدعت ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔ جو رسومات أفعال غیر مشروعہ وبدعات پر مشتمل ہوں ان میں شریک ہونا جائز نہیں، لہٰذا جو امام ان رسومات میں ثواب سمجھ کر شریک ہوتا ہے وہ بدعتی ہے اس کو امام بنانا مکروہ ہے۔ متبع سنت شخص کو امام بنایا جائے۔ البتہ جو شخص کبھی کسی عذر یا لاعلمی کی وجہ سے شریک ہوا ہو، اس کو معذور سمجھا جائے۔

لما فی مشکوۃ المصابیح(صـ ۳۱): عن ابراھیم بن میسرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من وقّر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ھدم الاسلام. رواہ البیھقی فی شعب الایمان مرسلا.

وفی ابن ماجہ(صـ ۱۱۶): باب ماجاء فی النھی عن الاجتماع الی اھل المیت وصنعۃ الطعام...... عن جریر بن عبداللہ قال کنانری الاجتماع الی اھل المیت وصنعۃ الطعام من النیاحۃ.

وفی الدر المختار(۱/۵۵۹، ۵۶۰): (ویکرہ)...... (إمامۃ عبد)...... (ومبتدع) أی صاحب بدعۃ وھی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لابمعاندۃ بل بنوع شبھۃ.

وفی الشامیہ(۲/۲۴۰): مطلب فی کراھۃ الضیافۃ من أھل المیت: وقال ایضاً، ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من أھل المیت لأنہ شرع فی السرور لا فی الشرور، وھی بدعۃ مستقبحۃ. وروی الامام أحمد و ابن ماجہ باسناد صحیح عن جریر بن عبداللہ قال ((کنا نعدّ الاجتماع الی أھل

المیت وصنعهم الطعام من النیاحة)) اھ وفی البزازیة ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الأوّل والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلی القبر فی المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الاخلاص. والحاصل أن اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لأجل الأکل یکره. وفیها من کتاب الاستحسان: وإن اتخذ طعاما للفقراء کان حسنا اھ وأطال فی ذلک فی المعراج. وقال: وهذه الأفعال کلها للسمعة والریاء فیحترز عنها لأنهم لایریدون بها وجه الله تعالیٰ اھ

(۴۴۱) اگر کسی کی زمین میں بنی قبر کے اوپر بدعات اور رسومات ہونے لگیں تو کیا کریں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گاؤں سے تھوڑی دور ایک بڑا درخت ہے جس کے نیچے عرصہ دراز سے ایک قبر نما ڈھیری بنی ہوئی ہے جس کو سب لوگ ''شہید'' کہتے ہیں اس ''شہید'' کے بارے میں پورے گاؤں میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو اس کی تاریخ جانتا ہو بس ''شہید'' کے نام سے جانی جاتی ہے اور مشہور ہے۔ اب اس کے اردگرد مٹی گارے کی چھوٹی سی چار دیواری بنی ہوئی ہے اس موجود درخت پر رنگ برنگے بالخصوص سبز رنگ کے کپڑوں کے ٹکڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ خشک سالی کے موسم میں لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس شہید پر مٹی کا لیپ کرو، چاول پکاؤ وغیرہ تو پھر بارش ہوگی۔ اب کچھ عرصہ سے اس شہید کے متصل ایک آدمی نے جگہ خریدی ہے اور رہائش رکھی ہے جو کہ بڑے اہتمام سے اس شہید کو سنبھال رہے ہیں۔

یہ جگہ میری نہیں ہے بلکہ ایک حاجی صاحب کی ہے جو کہ بفضل خدا صحیح العقیدہ ہیں تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں اور کافی سارا وقت لگا چکے ہیں۔ ذاتی طور پر وہ اس شہید کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میں ان حاجی صاحب کی اجازت سے اس درخت کو مزدوری پر جڑ سے اکھیڑ دوں، یا کسی پر جڑ سے اکھیڑنے کی شرط پر بیچ دوں اور وہ رقم کسی مسجد یا مدرسہ میں دے دوں تو کیسا ہے یہ کوئی گناہ تو نہیں ہوگا؟ یا کوئی اور طریقہ آپ کے ذہن میں ہو تو مہربانی کر کے بتا دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اس طرح قبر کی تزئین وآرائش کا بندوبست کرنا اور قبر کے پاس جا کر صاحب قبر سے مانگنا، سب ناجائز وحرام ہیں۔ جس شخص کی یہ جگہ ہے اس پر یہ لازم ہے کہ وہ ایسی تمام شرکیہ رسومات کو اس جگہ سے ختم کرے ورنہ اس برائی کا گناہ اس شخص پر ہے جس کی یہ جگہ ہے۔ اور درخت کی مالیت کے متعلق درخت کے مالک کو اختیار ہے چاہے تو وہ اپنے تصرف میں لے آئے یا اس کو کسی مسجد ومدرسہ وغیرہ میں دے دے۔

لمافی عمدة القاری(۱۸۳/۸): ورأی ابن عمر رضی الله عنهما فسطاطاً علی قبر عبدالرحمٰن فقال انزعه یا غلام فإنما یظله عمله. قوله فإنما یظله ای لا یظله الفسطاط بل یظله العمل الصالح فدلّ هذا علی أن نصب الخیام علی القبر مکروه ولا ینفع المیت ذلک ولا ینفعه الا عمله الصالح الذی

قدمه.

وفی مشکوٰة المصابیح(ص-۴۳۶): عن أبی سعید الخدری عن رسول اللہ ﷺ قال من رأی منکم منکراً فلیغیره بیده فإن لم یستطع فبلسانه فإن لم یستطع فبقلبه و ذلک أضعف الایمان.

وفی الشامیة(۲/۲۳۷): أما البناء علیه فلم أر من اختار جوازه...... وعن أبی حنیفة یکره أن یبنی علیه بناء من بیت أو قبة :و نحو ذلک لماروی جابرؓ نهی رسول اللہ ﷺ عن تجصیص القبور و ان یکتب علیها و ان یبنی علیها.

(۴۴۲) مجالس تعزیت، اوران میں رُلا دینے والے مضامین کا پڑھنا، نیز شخصیات کی تاریخ وفات پر اجتماع کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)......کسی کی وفات کے بعد تین دن تک مجلس تعزیت تو صراحۃً روایات میں ہے۔ تین دن کے بعد مجالس تعزیت کا انعقاد جائز ہے؟ اور کس کی دلیل سے ۱۴سو سال بعد بھی اگر کسی بزرگ کیلئے مجالس عزاء قائم کی جائیں تو کیا شرعاً کوئی ممانعت کی وجہ ہے؟

(۲)......تعزیتی جلسوں میں میراثی اور مدحی قصائد اور اطراء مادح پر مشتمل بیانات سے رُلانا کیا یہ جاہلیت کی مجالس نوحہ کی نشاۃ ثانیہ تو نہیں ہے؟

(۳)......وفات کی تاریخ پر سوانحی مضامین کا تکرار ہر سال کیا یہ برسی منانے کے حکم میں نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......شریعت مقدسہ میں کسی آدمی کے مرنے پر اس کے ورثاء کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ تین دن تک اپنے دکھ اور غم کا اظہار کریں اور تعزیت کیلئے آنے والے لوگوں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے گھر میں بیٹھے رہیں تاکہ آنے والے لوگ بسہولت تعزیت کر کے لوٹ جائیں اور ان تین دنوں کے اندر بھی شریعت نے اعتدال کا حکم دیا ہے اور شامیانے لگانے اور دعوت وغیرہ کے اہتمام کو فقہاء نے اقبح القبائح میں شمار کیا ہے اور تین دن کے بعد تعزیت کو نے مکروہ لکھا ہے الا یہ کہ تعزیت کرنے والا یا جس کی تعزیت کی جارہی ہے وہ غائب ہو تو پھر اس کی اجازت ہے لہٰذا تین دن کے بعد تعزیتی مجالس قائم کرنا شریعت سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے درست نہیں۔

(۲)......جب اوپر یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ تعزیتی جلسوں کا انعقاد شریعت محمدی سے ثابت نہیں تو ان جلسوں میں مدحی قصائد پڑھنا یا بیانات کر کے لوگوں کو رُلانا ان کی شناعت وقباحت میں اور اضافہ کر دیتا ہے اور اس کے ذریعے سے رسومات جاہلیت کی یاد تازہ ہوتی ہے لہٰذا ایسے جلسوں کا انعقاد شریعت محمدی کی رُو سے جائز نہیں۔

(۳)......اگر کسی شخصیت کی وفات کی تاریخ پر سوانحی مضامین اور بیانات میں التزام اور کارِثواب سمجھے بغیر اس کی دینی خدمات کا ذکر کر دیا جائے اور مروجہ خرافات (مثلاً کھانے کا التزام، لوگوں کو اعلان کر کے جمع کرنا، اس کو دین کا حصہ اور کارِثواب سمجھنا، اور بعض مقامات پر

مردوزن کا اختلاط وغیرہ) نہ پائی جاتی ہوں تو یہ برسی کے حکم میں نہیں، تاہم اگر اس کو بھی کارِثواب سمجھا جائے اور ایام کا التزام کیا جائے تو یہ بدعت میں داخل ہوگا۔

لما فی تبیین الحقائق (۱/۵۸۹): (فصل) ولا بأس بتعزية اهل الميت وترغيبهم فى الصبر لقوله عليه الصلوة و السلام من عزا مصاباً فله مثل أجره ويقول له اعظم الله أجرک وأحسن عزاءک وغفرلميتک ولابأس بالجلوس لها الى ثلاثة ايام من غير ارتكاب محظور من فرش البسط والاطعمة من أهل الميت لأنها تتخذ عند السرور وعن أنس أنه عليه الصلوة والسلام قال لاعقر فى الاسلام وهو الذى كان يعقر عند القبر بقرة أوشاة.

وفى الفقه الاسلامى (۲/۱۵۷۲): هى ان يسلى أهل الميت ويحملهم على الصبر بوعد الأجر ويرغبهم فى الرضا بالقضاء والقدر ويدعوللميت المسلم وتكون الى ثلاثة ليال بايامها وتكره بعدها الا لغائب حتى لايجدد له الحزن ولإذن الشارع فى الاحداد فى الثلاث بقوله ﷺ لايحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الاخر ان تحد على ميت فوق ثلاثة ايام الاعلى زوجها أربعة أشهر وعشراً...... وقال الحنفية لابأس بالجلوس للتعزية فى غير المسجد ثلاثة أيام، واولها افضلها وقال فى الفتاوىٰ الظهيرية لابأس بها لأهل الميت فى البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم ويكره المبيت عند أهل الميت وتكون التعزية فى بيت المصاب...... (وبعد صفحة قال) ولابأس كما ذكر الحنفية برثاء الميت بشعراوغيره لكن يكره الافراط فى مدحه لاسيما عند جنازته لحديث من تعزى بعزاء الجاهلية فأعضُوه بِهَن أبيه ولا تكنوا وهذا أمرتأديب ومبالغة فى الزجر عن دعوى الجاهلية.

(۴۴۳) خودکشی کرنے والے کی قیامت میں سزا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ نیز بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو خودکشی کرے تو وہ جس طرح اپنے آپ کو مارتا ہے قیامت تک اسی طرح وہ اپنے آپ کو مارتا رہے گا۔ کیا لوگوں کا یہ کہنا شرعاً درست ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... خودکشی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور ایسے شخص کے متعلق احادیث مبارکہ کے اندر سخت وعیدیں آئی ہیں چنانچہ احادیث مبارکہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جس طریقے سے خودکشی کرتا ہے جب تک وہ جہنم میں رہے گا اسی حالت میں رہے گا، البتہ خودکشی کرنے والے شخص کو مفتی بہ قول کے مطابق غسل بھی دیا جائے گا اور نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، لیکن علماء، صلحاء اور مقتدا حضرات اس میں شرکت نہیں کریں گے تاکہ دوسرے لوگوں کو تنبیہ ہو، اور اس سے عبرت حاصل کریں۔

لمافی البخاری(۱/۱۸۲):عن ثابت بن الضحاک عن النبی ﷺ قال من حلف بملة غير الاسلام كاذباً متعمداً فهو كما قال ومن قتل نفسه بحديدة عذب بها فى نار جهنم قال وقال حجاج بن منهال حدثنا جرير بن حازم عن الحسن قال حدثنا جندب فى هذا المسجد فما نسيناه وما نخاف ان يكذب جندبٌ على النبى ﷺ قال كان برجل جراح فقتل نفسه فقال الله بدرنى عبدى بنفسه حرمت عليه الجنة.

عن ابى هريرةؓ قال قال النبى ﷺ الذى يخنق نفسه يخنقها فى النار والذى يطعنها يطعنها فى النار.

وفى الدر المختار (۲/۲۱۱): (من قتل نفسه) ولو (عمداً يغسل ويصلى عليه) به يفتى وان كان اعظم وزراً من قاتل غيره، ورجح الكمال قول الثانى بما فى مسلم ((أنه عليه الصلوة والسلام أتى برجل قتل نفسه فلم يصل عليه))

وفى الشامية تحته: (قوله به يفتى) لأنه فاسق غير ساع فى الارض بالفساد وان كان باغياً على نفسه كسائر فساق المسلمين زيلعى.........................

أقول قد يقال لا دلالة فى الحديث على ذلک لأنه ليس فيه سوى انه عليه الصلوة والسلام لم يصل عليه فالظاهر أنه امتنع زجراً لغيره عن مثل هذا الفعل كما امتنع عن الصلوة على المديون ولا يلزم من ذلک عدم صلاة احد عليه من الصحابة اذلا مساواة بين صلاته وصلاة غيره قال تعالىٰ ان صلاتک سكن لهم ثم رأيت فى شرح المنية بحثاً كذلک.

(۴۴۴) جانتے بوجھتے مرزائی کا جنازہ پڑھانے والے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معلوم ہونے کے باوجود ''مرزائی'' کا جنازہ پڑھانے والا امام شرعاً فاسق اور قابل معزول ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اس بات کے معلوم ہونے کے باوجود کہ ''مرزائی'' کا جنازہ ہے، پھر بھی اس کی نماز جنازہ پڑھاتا ہے تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔

لما فی الشامی(۱/۵۲۳): وقد علمت أن الصحيح خلافه، فالدعاء به كفر لعدم جوازه عقلا ولا شرعا ولتكذيبه النصوص القطعية بخلاف الدعاء للمؤمنين كما علمت، فالحق مافى الحلية على الوجه الذى نقلناه عنها لاعلى مانقله ح فافهم.

(۴۴۵) قبرستان پر چھت اور عمارت بنانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاندان کا ایک قبرستان ہے جس پر چھت بنا رہے ہیں تو قبرستان میں عمارت بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مذکورہ میں اگر میت کے دفن کرنے کے بعد قبر کی مضبوطی کیلئے چھت بنائی جائے ہو تو یہ مکروہ ہے، اور اگر تزیین کیلئے بنائے جاتی ہو تو یہ حرام ہے اور قبرستان میں عمارت چونکہ قبروں ہی کے اوپر بنائی جاتی ہے اس لئے وہ بھی اس حکم میں داخل ہے۔

وفي الهندية(١/١٦٦): ويكره ان يبنى على القبر.

وفي الشامية(٢/٢٣٧): (قوله ولا يرفع عليه بناء) اى يحرم لو للزينة ويكره لو للاحكام بعد الدفن.

(۴۴۶) جنازہ گاہ میں وقتیہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبرستان میں ایک جگہ نمازِ جنازہ پڑھنے کیلئے تعمیر کی گئی ہے اس میں نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں پھر اسی قبرستان میں دفن کرتے ہیں اگر اس وقت نماز کا وقت داخل ہو جائے تو اسی جگہ فرض نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... وہ جگہ جو قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنے کیلئے مخصوص کی گئی ہو، یا وہ جگہ جو عید کی نماز کیلئے مخصوص کی گئی ہو، نماز پڑھنے کے واسطے مسجد ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اور اس میں ضرورتاً وقتیہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔

لما في طحطاوى على المراقى(ص٢٠٩): وفي زاد الفقير و تكره الصلاة في المقبرة الا ان يكون فيها موضع اعد للصلاة لانجاسة فيه ولا قذر فيه الخ.

وفي الدر المختار(١/٦٥٧): (و)اما (المتخذ لصلاة جنازة او عيد) فهو (مسجد في حق جواز الاقتداء) وان انفصل الصفوف رفقا بالناس (لافي حق غيره) به يفتي الخ.

وفي الشامية (قوله به يفتي نهاية) عبارة النهاية والمختار للفتوىٰ انه مسجد في حق جواز الاقتداء.

(۴۴۷) نمازِ جنازہ کی فرضیت کب ہوئی؟ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی یا نہیں؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کب فرض ہوئی قبل ہجرت یا بعد ہجرت، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نمازِ جنازہ ہجرت کے پہلے سال میں شروع ہوئی اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات ہجرت سے پہلے ہوئی تھی تو اس وجہ سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی گئی تھی۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی المراقی (ص۴۷۸): قال الواقدی: لم تكن شرعت يوم موت خديجة، وموتا رضی الله عنها بعد النبوة بعشر سنين على الأصح.

وفی أوجز المسالك (۱۹۱/۴): وفی الانوار الساطعة شرعت صلاة الجنازة بالمدينة المنورة فی السنة الاولیٰ من الهجرة فمن مات مكة المشرفة لم يصل عليه اهـ.

وفی البداية والنهاية (جزء۲، ۱۲۵/۳): قال عروة بن الزبير وقد كانت خديجةؓ توفيت قبل ان تفرض الصلاة ثم روى من وجه آخر عن الزهری انه قال توفيت خديجةؓ بمكة قبل خروج رسول الله ﷺ الى المدينة وقبل ان تفرض الصلوٰة. اهـ.

(۴۴۸) خلفاءِ راشدین کی نمازِ جنازہ کن کن حضرات نے پڑھائی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضرات خلفاءِ راشدینؓ کی نمازِ جنازہ کن کن حضرات نے پڑھائی تھی؟ بحوالہ نقل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضرات خلفاءِ راشدینؓ کی نمازِ جنازہ جن حضرات نے پڑھائی تھی ان کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:

(۱)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

(۲)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے

(۳)۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے

(۴)۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی۔

وفی تاريخ الخلفاء: وأخرج ابن سعد عن سعيد بن المسيب أن عمر رضی الله عنه صلى على أبی بكر بين القبر والمنبر وكبّر عليه أربعا. (ص۶۵)

أصيب عمر يوم الأربعاء لأربع بقين من ذی الحجة ودفن يوم الأحد مستهل المحرم الحرام، وله ثلاث وستون سنة ...... وصلى عليه صهيب فی المسجد. (ص۱۰۸)

قال قتادة: صلى عليه الزبير ودفنه، وكان أوصى بذلك إليه. (ص۱۲۹)

وأقام علیّ الجمعة والسبت، وتوفی ليلة الأحد، وغسله الحسن والحسين، وعبدالله بن جعفر وصلى عليه الحسن. (ص۱۳۹)

(۴۴۹) ڈاکوؤں وغیرہ کے ہاتھوں مارے جانے والے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کو مثلاً ڈاکو یا قطاع الطریق شہید کردے یا دو فریقین کی لڑائی میں یہ شخص غلطی سے مارا گیا ہو تو کیا اس پر شہید کے دنیاوی احکام جاری ہوں گے یعنی اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر زید کو ڈاکو یا قطاع الطریق وغیرہ قتل کردیں۔ پھر وہ دنیاوی نفع حاصل نہ کرسکے یعنی کھانا پینا علاج کرنا وغیرہ تو زید پر شہید کے دنیاوی احکام جاری ہوں گے اگر یہ فریقین کی لڑائی میں غلطی سے مارا گیا تو وہ شہید اخروی ہوگا۔

لمافي البخاری (۱/۹۰): عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال بينما رجل يمشي بطريق وجد غصن شوك على الطريق فاخره فشكر الله له فغفر له. ثم قال الشهداء خمسة المطعون والمبطون والغريق وصاحب الهدم والشهيد في سبيل الله.

وفي الفقه الاسلامیه وادلته(۲/۱۵۸۳): فقال الحنفية: الشهيد من قتله اهل الحرب او اهل البغي او قطاع الطريق او اللصوص في منزله ليلا او نهاراً باى آلة: مثقل او محدد او وجد في المعركة وبه اثر كجرح وكسر وحرق وخروج دم من اذن او عين او قتله مسلم ظلما عمدا بمحدد وكان مسلما مكلفاً (بالغا عاقلا) طاهرا (خالياً من حيض او نفاس او جنابة) ولم يرتث بعد انقضاء الحرب اى لايموت عقب الاصابة.

وفي الشامية(۲/۲۴۸): (قوله حتى لو وجب الخ) تفريع على مفهوم قوله بنفس القتل، فان المال لم يجب بنفس القتل العمد لان الواجب به القصاص، وانما سقط بعارض وهو الصلح او شبهة الابوة، فلا يغسل في الزواية المختارة. كمافي الفتح والحاصل انه اذا وجب بقتله القصاص وان سقط لعارض اولم يجب بقتله شئ اصلا فهو شهيد كما علمته اما اذا وجب به المال ابتداء فلا، وذلك بان كان قتله شبه العمد كضرب بعصا او خطا كرمي غرض فاصابه او ماجرى مجراه كسقوط نائم عليه.

وفي ابي داود (۲/۴۴۳): جابر بن عتيك اخبره ان رسول الله ﷺ، جاء يعود عبدالله بن ثابت فوجده قد غلب فصاح به رسول الله ﷺ فلم يجبه فاسترجع رسول الله ﷺ وقال غلبنا عليك يا ابا الربيع فصاح النسوة وبكين فجعل ابن عتيك يسكتهن فقال رسول الله ﷺ دعهن فاذا وجب فلا تبكين باكية قالو او ما الوجوب يا رسول الله قال الموت قالت ابنته والله ان كنت لارجوان تكون شهيد افانك قد كنت قضيت جهازك قال رسول الله ﷺ ان الله عزوجل قد اوقع اجره على قدر

نیته وما تعدون الشهادة قالوا القتل فی سبیل الله قال رسول الله ﷺ الشهادة سبع سوی القتل فی سبیل الله، المطعون شهید والغرق شهید وصاحب ذات الجنب شهید والمبطون شهید وصاحب الحریق شهید والذی یموت تحت الهدم شهید والمرأة تموت بجمع شهید.

(۴۵۰) سیاسی قائدین وکارکنان اور رافضی، بدعتی وغیرہ کا مارا جانا شہادت ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سیاسی جماعتوں کے کارکنان وقائدین جو کہ باہم سیاسی چپقلشوں کی بنیاد پر لڑتے ہیں اور بعض اوقات ان میں سے کچھ مارے جاتے ہیں۔ یا اسی طرح کسی کو نامعلوم افراد مار دیتے ہیں۔ تو دریافت طلب بات یہ ہے کہ (۱)...... ایسے مارے جانے والے کیا شہید ہوں گے؟ (۲)...... ان میں جو بے گناہ مارا جائے کیا اس کو بغیر غسل دیئے دفنانا (شہادتِ دنیاوی کے اعتبار سے) جائز ہے؟۔ (۳)...... ان میں جو (رافضی یا بدعتی یا کوئی اور فاسق یا قاتل) مارا جائے۔ کیا وہ بھی شہید ہوگا؟۔ (۴)...... رافضی امامیہ کے جنازے میں یا قبر پر حاضر ہونا جائز ہے؟۔ (۵)...... کیا ایسا شخص کہ جو سراسر (مسلمان مجاہدین کا مخالف اور کفار کا مسلمانوں کے مقابلے میں) ساتھی ہو۔ اس کو کوئی قتل کر دے تو کیا وہ شہید ہوگا؟ اور اس کو قتل کرنے والا کیا گنہگار رہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱،۲)...... شریعت اسلامیہ میں شہید کامل (دنیاوی واخروی) اس شخص کو کہا جاتا ہے جس میں چھ شرائط پائی جاتی ہوں، (۱) مکلف ہونا، (۲) مسلمان ہونا، (۳) ظلماً قتل ہونا، (۴) نفسِ قتل سے عوض مالی کا واجب نہ ہونا، (۵) طاہر ہونا، (۶) زخمی ہونے کے بعد کوئی دنیاوی فائدہ نہ اٹھانا۔ لہٰذا جس شخص میں مذکورہ بالا چھ شرائط بیک وقت موجود ہوں وہ شخص شہید کامل کہلائے گا اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا جائے۔

البتہ شہید کی ایک دوسری قسم ہے شہید اخروی، جس کی فقہاء کرام نے ایک طویل فہرست ذکر کی ہے مثلاً مبطون یعنی پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والا، مطعون یعنی طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والا، غریق پانی میں ڈوب کر مرنے والا، غریب حالتِ سفر میں مرنے والا طالبعلم، حالت جنابت میں مارا جانے والا وغیرہ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ غسل بھی دیا جائے گا اور نماز بھی پڑھی جائے گی البتہ آخرت میں یہ لوگ شہادت کا مرتبہ پائیں گے۔

(۳)...... چونکہ شہید کیلئے ایک شرط مسلمان ہونا ہے، لہٰذا جس شخص کے عقائد کفریہ ہوں تو وہ اگر مارا جائے تو وہ شہید نہیں کہلائے گا البتہ مقتول کے بدعتی یا فاسق یا قاتل ہونے سے اس کی شہادت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اگرچہ اس معصیت کا الگ سے اس کو گناہ ہوگا۔

(۴)...... جس شخص کے عقائد کفریہ ہوں اس کی نماز جنازہ اور قبر پر حاضر ہونا ناجائز ہے۔

(۵)...... مسلمانوں میں سے جو شخص مسلمانوں اور مجاہدین کا مخالف ہو اور دلی طور پر کفار کا ساتھی ہو، اگرچہ وہ مجرم تو ضرور ہے، امام وقت اگر مناسب سمجھے تو اس کو تعزیر کا حق ہے لیکن عام شہری کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کو قتل کر دے اگر قتل کر دیا تو اس پر دنیا میں شہید کے احکام جاری ہوں گے اور قاتل گناہگار ہوگا۔

لما فی الدرالمختار (۲/۲۴۷): (ھو کل مکلف مسلم طاھر)...... (ص۲۴۸) (قتل ظلماً) بغیر حق (بجارحة) ای بما یوجب القصاص (ولم یجب بنفس القتل مال) بل قصاص ...... (ص۲۴۹) (ولم یرتث) فلو ارتث غسل کما سیجئ(وکذا) یکون شهیداً (لوقتله باغ اوحربی اوقاطع طریق ولو تسببا او (بغیر آلة جارحة) فان مقتولهم شهید بای الة قتلوه...... (او وجد جریحاً میتاً فی معرکتهم) المراد بالجراحة علامة القتل ...... (ص۲۵۰) (ویصلی علیه بلاغسل ویدفن بدمه وثیابه) ...... (ویغسل من وجد قتیلاً فی مصر) او قریة (فیما) ای فی موضع(یجب فیه الدیة)...... (ولم یعلم قاتله) اوعلم ولم یجب القصاص فان وجب کان شهیداً کمن قتله اللصوص لیلاً فی المصرفانه لاقسامة ولادیة فیه للعلم بان قاتله اللصوص غایة الامران عینه لم تعلم فیلحفظ فان الناس عنه غافلون (اوقتل بحد او قصاص) (ص۲۵۱) ای یغسل وکذا بتعزیر او افتراس سبع (اوجرح وارتث) ...... (ص۲۵۲) وهذا کله اذا کان (بعد انقضاء الحرب ولوفیها) ای فی الحرب (لا) یصیر مرتثا بشئ مما ذکر وکل ذلک فی الشهید الکامل والا فالمرتث شهید الاخرة وکذا الجنب ونحوه.

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۲/۱۵۸۸):فالشهداء ثلاثة، شهید فی حکم الدنیا والآخرة: وهو شهید المعرکة اما حکم الدنیا فلا یغسل ولا یصلی علیه عند الجمهور کما ابنت واما حکم الاخرة فله ثواب خاص وهو الشهید الکامل الشهادة.

وشهید فی حکم الدنیا فقط وهو عند الشافعیة من قتل فی قتال الکفار بسببه وقدغل من الغنیمة اوقتل مذبراً او قاتل ریاءً اونحوه ای لایغسل ولا یصلی علیه ولا ثواب له فی الاخرة.

شهید فی حکم الاخره فقط کا لمقتول ظلماً من غیر قتال والمبطون اذا مات بالبطن والمطعون...... والغریق، والغریب، وطالب العلم ...... وحکم هؤلاء الشهداء فی الدنیا ای شهداء الاخرة ان الواحد منهم یغسل ویکفن ویصلی علیه اتفاقاً کغیره من الموتی اما فی الاخرة فله ثواب الاخرة فقط وله اجر الشهداء یوم القیامة.

المعصیة و الشهادة: المعصیة لاتمنع الاتصاف بالشهادة فیکون المیت شهیدا عاصیاً لان الطاعة لاتلغی المعصیة الا فی الصغائر قال تعالیٰ ان الحسنات یذهبن السیئات سورة هود (۱۱/۱۱۴).

(۴۵۱) دہشتگردوں کی فائرنگ سے چوکی پر موجود پولیس ملازم قتل ہوگیا، کیاوہ شہید ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو پولیس یا حکومتی ملازم کسی حادثہ میں قتل ہوجا تا ہے

جیسے عام طور پر دہشت گرد آ کر چوکی پر فائر کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے عام طور پر پولیس والے مرجاتے ہیں تو کیا وہ شہید کے حکم میں داخل ہوں گے یا نہیں، اگر ہوں گے تو کیا حقیقی ہوں گے یا حکمی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... یہ حقیقی شہید کے حکم میں ہوں گے۔

لمافی الهندية(۱/۱۶۸): ومن قتل مدافعا عن نفسه أو ماله أو عن المسلمين أو أهل الذمة بأى آلة قتل بحديد أو حجر أوخشب فهو شهيد.

وفي الدر المختار مع رد المحتار(۲/۲۴۹): (كذا) يكون شهيدا (لوقتله با غ أو حربى أو قاطع طريق ولو) تسببا الخ ...... قال العلامة ابن العابدين تحت (قوله أو قاطع طريق) والمكابرون فى المصر ليلا بمنزلة قطاع الطريق كما فى البحر عن شرح المجمع، فمن قتلوه ولو بغير محدد فهو شهيد كمالو قتله القطاع، وكذا من قتله اللصوص ليلا كما سيأتي وذكر فى البحر أنه زاد فى المحيط سببا رابعا وهو من قتل مدافعا ولو عن ذمى فانه شهيد بأى آلة قتل وان لم يكن واحداً من الثلاثة أى ممن قتله با غ أو حربى أو قاطع طريق وقال فى النهر: كونه شهيدا وان قتل بغير محدد مشكل جدًا لوجوب الدية بقتله. فتدبره ممعنا النظر فيه اهـ.قلت يمكن حمله على ما اذا لم يعلم قاتله عينا، كمالو خرج عليه قطاع طريق أو لصوص أونحوهم.

(۴۵۴) ہندوؤں کے میلوں وغیرہ میں کسی حادثہ کا شکار ہونے والے کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی آدمی اپنے کو قتل کر دے یعنی زہر کھا کر مرجائے یا پھانسی پر چڑھ جائے یا کافروں کی طرف سے منعقدہ کسی فنکشن میلہ اور ہندو تہوار وغیرہ میں شرکت کر کے ان کی تماشاؤں میں مشغول ہو کر کسی حادثہ کا شکار ہو گیا اور ان کے رسم ورواج کے مطابق کسی تقریب تہوار وغیرہ میں شامل ہو کر مر گیا اس شخص کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ اگر جمعیت علماء پہلے سے ان لوگوں کے متعلق یہ فیصلہ دے چکا ہے کہ ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائیگی تاکہ دوسرے لوگ اس سے پرہیز کریں یعنی عبرت حاصل کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟ اگر محلے کے امام مسجد نے اس شخص کا جنازہ پڑھا دیا تو اس امام کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر امام کے علاوہ کسی اور نے اس کا جنازہ پڑھا دیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہندوؤں اور غیر مسلموں کے تہواروں اور میلوں میں شرکت کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص ان میلوں میں شرکت کرتے ہوئے کسی حادثے کا شکار ہو کر مرجائے، اسی طرح اگر خودکشی کرے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ البتہ ان کی نماز جنازہ میں اگر جید علماء زجراً شرکت نہ کریں تو یہ درست ہوگا۔ جیسا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔ لیکن جمعیت علماء کا یہ فیصلہ کہ نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، درست نہیں۔ اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ہر

نیک و بد پر نماز جنازہ پڑھا کرو، اور نماز جنازہ پڑھانے والے امام پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور اس کو جنازہ پڑھانے کا ثواب ملے گا۔

وفي النسائي(۱/۲۱۵):عن جابر بن سمرةؓ أن رجلا قتل نفسه بمشاقص فقال رسول الله ﷺ أما أنا فلا أصلّي عليه.

وفي كنز العمال(۶/۵۴)(حديث:۱۴۸۱۵): صلوا خلف كل بر وفاجر وصلوا على كل برّ وفاجر ...... الخ.

وفي اعلاء السنن (۸/۲۷۳): قال النوويؒ: أخذ بظاهره من قال: "لا يصلي على قاتل نفسه لعصيانه" "وهو مذهب الاوزاعي وأجاب الجمهور: بأنه ﷺ لم يصلّ عليه بنفسه زجراً للناس عن مثل فعله وصلت عليه الصحابة وهذا كما ترك ﷺ في أوّل الامر الصلاة على من عليه دين زجراً لهم عن التساهل في الاستدانة وعن اهمال وفاء ها وأمر أصحابه بالصلاة عليه فقال" صلّوا على صاحبكم.

وفي الدر المختار(۲/۲۱۱):(من قتل نفسه) ولو (عمداً يغسل ويصلي عليه) به يفتى وإن كان اعظم وزرا من قاتل غيره (وتحته في الشامية) أقول: قد يقال: لا دلالة في الحديث على ذلك لأنه ليس فيه سوى أنه عليه الصلوة والسلام لم يصلّ عليه، فالظاهر أنه امتنع زجراً لغيره عن مثل هذا الفعل. كما امتنع عن الصلوة على المديون ولا يلزم من ذلك عدم صلوة أحد عليه من الصحابةؓ إذلا مساواة بين صلاته وصلاة غيره.

(۴۵۳) جہاد میں اگر کوئی اپنے فعل کی وجہ سے قتل ہو جائے تو اس کے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی جہاد میں اپنے ہی اسلحہ وغیرہ سے مارا جائے تو اسے عام میت کی طرح غسل وغیرہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اسے غسل دیا جائے گا۔

لما في التاتارخانية(۲/۱۶۲): ومن قتل نفسه خطأ بان ناول رجلا من العدو ليضربه فاخطأ واصاب نفسه ومات فانه يغسل ويكفن ويصلى عليه.

وفي الهندية (۱/۱۶۳): ومن قتل نفسه خطأ بان ناول رجلا من العدو ليضربه بالسيف فاخطأ واصاب نفسه، ومات غسل وصلى عليه.

(۴۵۴) میت کے سینے پر انگلی سے کلمہ وغیرہ لکھنے اور قبر میں آیات قرآنیہ رکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کے چہرے یا سینے پر انگلی سے کلمہ وآیات وغیرہ لکھنا

یا کاغذ پر لکھی ہوئی آیتوں کا قبر میں رکھنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اسی طرح جنازہ دفن کرنے کے بعد میت کے گھر پر کوئی پڑوسی یا اس کا رشتہ دار (کڑوی روٹی) کھانا کھلائے جسے کڑوی روٹی کہتے ہیں۔ کیا یہ لوگوں کو کھلانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......(۱)۔میت کے چہرے یا سینے پر بغیر سیاہی کے انگلی کے ساتھ کوئی آیت یا کلمہ وغیرہ لکھنا جائز ہے لیکن اسے ضروری نہ سمجھا جائے۔

(۲)۔کاغذ پر لکھی ہوئی آیات کا میت کے ساتھ قبر میں رکھنا درست نہیں اس میں قرآن کریم کی بے حرمتی ہے۔

(۳)۔جب کسی گھر میں فوتگی ہو جائے تو میت کے پڑوسیوں کیلئے مستحب ہے کہ وہ اہل میت کے کھانے کا انتظام کریں اور خود اہل میت کے ساتھ بیٹھ کر انہیں کھلائیں، لیکن آجکل جو عام رواج بن گیا ہے کہ کسی شخص کے انتقال پر اس کا پڑوسی یا کوئی رشتہ دار تمام شرکاء جنازہ کیلئے کھانے کا انتظام کرتا ہے اور اسے لازمی سمجھا جاتا ہے۔اور سب شرکاء انتظام نہ ہونے کی صورت میں اسے برا سمجھتے ہیں اس کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں۔۔اور جہاں تک کڑوی روٹی کھلانے کا تعلق ہے تو یہ بدعت قبیحہ ہے اس سے اجتناب کیا جائے۔البتہ میت کے وہ رشتہ دار جو دور سے آئے ہوں یا ایسے رشتہ دار جن کا اہل میت کے پاس رہنا ضروری ہو، ان کا اہل میت کے ہاں کھانا کھانا درست ہے۔

لمافی فتح القدیر(۱۴۲/۲): ویستحب لجیران اهل المیت والاقرباء الاباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم ولیلتهم لقوله ﷺ "اصنعوا لآل جعفر طعاماً فقد جاء هم ما یشغلهم...... ولانه بر ومعروف ویلح علیهم فی الاکل لان الحزن یمنعهم من ذلک فیضعفون.

وفی الشامیة (۲۴۶/۲):تکره کتابة القرآن وأسماء الله تعالیٰ علی الدراهم والمحاریب والجدران وما یفرش، وما ذاک الا لاحترامه وخشیة وطئه ونحوه مما فیه اهانة فالمنع هنا با لاولیٰ مالم یثبت عن المجتهد أو ینقل فیه حدیث ثابت. نعم نقل بعض المحشین عن فوائد الشرجی أن مما یکتب علی جبهة المیت بغیر مداد با لاصبع المسبحة. بسم الله الرحمٰن الرحیم. وعلی الصدر لا اله الا الله محمد رسول الله وذلک بعد الغسل قبل التکفین.

وفی الشامیة(۲۴۰/۲): ویکره اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لافی الشرور وهی بدعة مستقبحة.

(۴۵۵) میت کو غسل دیتے وقت ذکر و دعا کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی مُردوں کو غسل دیتا ہے۔وہ دورانِ غسل کبھی ذکر واذکار اور وضوء کی دعاؤں کا ورد کرتا ہے۔اور کبھی چھوڑ دیتا ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت غاسل اور اس کے معاونین ذکر واذکار اور دعائیں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز اگر میت غسل خانے میں ہو تو کیا حکم ہے؟ اور اگر غسل خانے کے علاوہ دوسری

صاف جگہ میں غسل کا بندوبست ہوا ہو تو پھر وہاں کیا حکم ہوگا مذکورہ ذکر واذکار و دعاؤں کا؟ نیز اگر جائز ہو تو پھر غاسل دوسروں کو اس کے پڑھنے کی ترغیب دے سکتا ہے یا نہیں؟ جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... شرعاً انسان نجاست کی جگہ میں اور ستر کھلا ہونے کی حالت میں بلند آواز سے ذکر واذکار نہیں پڑھ سکتا ہے مگر دل میں پڑھ سکتا ہے البتہ اگر موضع نجاست نہ ہو، اور کشف عورت بھی نہ ہو تو پھر بلند آواز سے ذکر واذکار پڑھ سکتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں میت کو جس جگہ غسل دیا جارہا ہے اگر وہ موضع نجاست نہیں ہے اور نہ میت کو نجاست لگی ہوئی ہے اور نہ ستر کھلا ہوا ہے تو اس صورت میں غاسل اور اس کے معاونین ذکر واذکار و دعاءِ وضو بلند آواز سے پڑھ سکتے ہیں ہاں اگر وہ موضع نجاست ہے یا کشف عورت پایا جارہا ہے تو اس صورت میں دل میں ذکر واذکار و دعاءِ وضو پڑھیں گے اور اگر میت کو غسل خانہ میں غسل دیا جارہا ہے تو پھر بھی یہی حکم ہے کہ نجاست ہونے اور کشف عورت کی صورت میں دل میں ذکر وغیرہ پڑھیں گے نہ ہونے کی صورت میں بلند آواز سے ذکر وغیرہ پڑھیں گے البتہ قرآن شریف کی تلاوت کرنا میت کے پاس بیٹھ کر غسل دینے سے پہلے مکروہ ہے۔

لمافي مراقي الفلاح(صـ۵۶۴): وتكره قراءة القرآن عنده حتى يغسل تنزيها للقرآن عن نجاسة الحدث بالموت والخبث فانه يزول عن المسلم بالغسل تكريماً له بخلاف الكافر قوله: (عن نجاسة الحدث) ...... والحاصل انهم اختلفوا في نجاسة الميت فقيل نجاسة خبث وقيل حدث ويشهد للثاني مارويناه من تقبيله ﷺ عثمان بن مظعون وهو ميت قبل الغسل اذلو كان نجسا وضع فاه الشريف على جسده ولا ينافي ذلك ماذكروه من انه لو حمله انسان قبل الغسل فصلى به لا تصح صلاته وكذا كراهة القراءة عنده قبل الغسل لجواز ان يكون ذلك لعدم خلوه عن نجاسة غالبا والغالب كالمحقق.

وفي الهندية(۱/۵۰): ويستحب له عند الدخول في الخلاء ان يقول اللهم اني اعوذبك من الخبث والخبائث ...... كذا في التبيين ولا يتكلم ولا يذكر الله تعالىٰ ولا يشمت عاطسا ولا يرد السلام ولا يجيب المؤذن فان عطس يحمد الله بقلبه ولا يحرك لسانه...... كذا في السراج الوهاج.

وفي الدر المختار(۱/۱۰۸،۱۰۹): والبداءة بالتسمية قولا وتحصيل بكل ذكر...... قبل الاستنجاء وبعده الاحال انكشاف وفي محل نجاسة فيسمي بقلبه.

وفي الشامية(۲/۱۹۴): وذكر . ط. ان محل الكراهة اذا كان قريبا منه اما اذا بعد عنه بالقراءة فلا كراهة اهـ ...... وتكره قراءة القرآن في موضع النجاسة كالمغتسل والمخرج والمسلخ وما اشبه ذلك واما في الحمام فان لم يكن فيه احد مكشوف العورة وكان الحمام طاهرا لا باس بان يرفع صوته بالقراءة وان لم يكن كذلك فان قرأ في نفسه ولا يرفع صوته فلا باس به ولا باس بالتسبيح

والتهليل وان رفع صوته ...... فتحصيل من هذا ان الموضع ان كان معدا للنجاسة كالمخرج والمسلخ كرهت القراءة مطلقا والا فان لم يكن هناك نجاسة ولا احد مكشوف العورة فلا كراهة مطلقا وان كان فانه يكره رفع الصوت فقط ان كانت النجاسة قريبة فتامل.

(۴۵۶) عورت کے کفن میں تہبند کو شلوار کی طرح سینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت کے کفن میں ستر کے اہتمام کیلئے شلوار کی صورت میں ہلکی سی سلا کر کے کفن میں شامل کر سکتے ہیں جبکہ معروف شلوار نہیں بنائے بالکل معمولی سی سلائی کرتے ہیں جو دو تین منٹ میں پوری ہو جاتی ہے کسی بداعتقادی یا رسم کی وجہ سے بھی نہیں ہے صرف ستر کی بنا پر سلائی کرتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... مرد کا مسنون کفن تین کپڑے ہوتے ہیں، اور عورت کا مسنون کفن پانچ کپڑے ہوتے ہیں، ضرورت کے وقت اس میں کمی وبیشی ہو سکتی ہے، اور اسی طرح کفن میں سنت یہ بھی ہے کہ کفن کا عدد ''وتر'' طاق ہو، نہ کہ ''شفعاً'' جفت ہو، اور کفن میں یہ بات بھی مستحب اور افضل ہے کہ کفن زیادہ قیمتی نہ ہو، اور نہ اس میں اسراف ہو، بلکہ ضرورت کے مطابق ہو، اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ میت کا کفن زندوں کے لباس کی طرح سلا ہوا نہ ہو، کیونکہ اس سے زینت لازم آتی ہے، البتہ اگر ضرورت ہو تو ضرورت کی وجہ سے سلانا جائز ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر یہ ''شلوار جیسا سلا ہوا کپڑا'' ان پانچ کپڑوں میں سے ہو، اور تستر کی خاطر ہو، اور ضرورت بھی ہو تو اس کپڑے کو کفن میں شامل کرنا جائز ہے، اور اگر ان پانچ کپڑوں کے علاوہ ہو، اور ضرورت بھی نہ ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ بلکہ اسراف ہوگا۔

لمافي الشامية(۲/۲۰۲): (قوله ولا بأس بالزيادة على الثلاثة) كذا في النهر عن غاية البيان ونقله قبله عن المجتبىٰ الكراهة لكن قال في الحلية عن الذخيرة معزيا إلى عصام: إنه إلى خمسة ليس بمكروه ولا بأس به اهـ. ثم قال: ووجه بأن ابن عمر كفن ابنه واقدا في خمسة اثواب قميص وعمامة وثلاثِ لفائف وأدار العمامة إلى تحت حنكه رواه سعيد بن منصور اهـ.

قال في البحر بعد نقل الكراهة عن المجتبىٰ واستثنىٰ في روضة الزندوستي ما إذا وصى بأن يكفن في أربعة أو خمسة فإنه يجوز بخلاف ما اذا اوصى ان يكفن في ثوبين فإنه يكفن في ثلاثة ولو أوصى أن يكفن بألف درهم كفن كفنا وسطا اهـ. قلت: الظاهر ان الإستثناء الذي في الروضة منقطع إذ لو كره لم تنفذ وصيته كما لم تنفذ بالأقل تأمل...... (قوله لحديث الخ) وفي صحيح مسلم عنه ﷺ "إذا كفن أحدكم اخاه فليحسن كفنه" وروى ابو داؤد عنه ﷺ "لا تغالوا في الكفن فإنه يسلب سلبا سريعاً'' الخ.

وفي الشامية(۲/۱۹۸): (قوله اى يكره تحريما) لمافي القنية من أن التزيين بعد موتها والامتشاط

وقطع الشعر لا يجوز نهر، فلو قطع ظفره أو شعره أدرج معه في الكفن قهستاني عن العتابي...... وايضاً (صـ۲۰۲) (قوله إزار الخ) هو من القرن إلى القدم والقميص من أصل العنق إلى القدمين بلاد خريص وكمين الى قول والدخريص: الشق الذى يفعل في قميص الحي ليتسع للمشي(قوله وتكره العمامة الخ) هي بالكسر مايلف على الرأس قاموس قال ط: وهي محل الخلاف واما ما يفعل على الخشبة من العمامة والزينة ببعض حلى فهو من المكروه بلاخلاف لما تقدم انه يكره فيه كل ما كان للزينة اهـ.

وفي المحيط البرهاني(۶۴/۳): وقيل معناه يزاد على ما عليه من الثياب ثوب جديد تكريماً له، وإن كان عليه يبلغ السنة، وينقصون ماشاؤوا، وإن كان ما عليه يبلغ السنة، ويخيطونه ان شاؤ واكمايفعل ذلک لغيره من الموتى، انما لا يزال عنه اثر الشهادة فأما فيما سوى ذلک فهو كغيره من الموتى...... وايضاً (صـ۶۶) ولنا: حديث ابن عباسؓ، أن النبي ﷺ كفن في حلة وقميص، والحلة اسم الثوبين عند العرب، ازار ورداء، ولأن اشرف لباس الأحياء القميص، فوجب تقديمه، إلا انه لا يجعل قميصه على هيئة قميص الاحياء فلا يجعل له دخريص، لأن ذلک انما يجعل في حق الحي ليتسع أسفله، فيتيسر له المشي، والميت لا يحتاج إلى ذلک، ولا يكف اطرافه، لأنه ذلک يفعل للحي، ولا حاجة للميت إليه، والأخذ بحديث ابن عباسؓ اولىٰ من الأخذ بحديث عائشةؓ، لان الرجال هم الذين حضروا رسول الله ﷺ.

(۴۵۷) حرم میں جنازہ اندر ہونے کی وجہ اور حرم میں خواتین کا نماز پڑھنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دینی باتیں جو ہمارے یہاں منع ہوتی ہیں لیکن حرم شریف میں لوگ کرر ہے ہوتے ہیں، اور علماء بھی اس کی اجازت دیتے ہیں یا منع نہیں کرتے، ایسی ہی ایک دو باتیں ہیں جو آپ سے معلوم کرنی تھیں۔ براہ کرم اگر آسانی اور سہولت ہو تو کرم نوازی فرمادیں۔

(۱)۔ ہمارے یہاں مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ نہیں پڑھائی جاتی جبکہ حرم میں جنازہ اندر ہی ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲)۔ ہمارے یہاں خواتین کو مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے آنے سے روکا جاتا ہے جبکہ حرم میں خواتین نماز مسجد حرام میں ہی پڑھتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱)۔ مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے جیسا کہ ابوداؤد (۴۵۴/۲) میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مسجد میں جنازے پر نماز ادا کی تو اس کیلئے کوئی ثواب نہیں''۔ اور چونکہ اس میں مسجد کی ناپاکی کا بھی خطرہ رہتا ہے اس وجہ سے احناف نے مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ پڑھنے کو مکروہ کہا ہے۔ البتہ اگر جنازہ اور کچھ نمازی مسجد

سے باہر ہوں اور باقی نمازی مسجد میں ہوں تو اس صورت میں جائز ہے اور حرم میں جنازہ اندر ہی ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ باہر رکھنے میں حرج عظیم لازم آئے گا اور اس حرج کو دفع کرنے کیلئے جنازہ کو اندر رکھ کر نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔

(۲)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے ممانعت نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اپنی عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرو لیکن ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ عورتوں کیلئے گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے اور گھر میں بھی بالکل پوشیدہ جگہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے عورتوں کے مسجد میں جانے سے متعلق شدت اختیار کی اور فتنے کے خوف سے عورتوں کو منع کیا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے کی عورتوں کا حال دیکھ لیتے تو ان کو مسجد میں آنے سے منع فرمادیتے۔ اسی وجہ سے متاخرین نے فتنہ کے خوف سے مطلقاً عورتوں کا مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ لکھا ہے البتہ مسجد حرام کے متعلق علماء نے ضرورت کی وجہ سے گنجائش نکالی ہے کہ اگر مسجد حرام یا مسجد نبوی میں عورتیں نماز ادا کریں تو اس میں کراہت نہ ہوگی اور عام طور پر وہاں عورتوں کیلئے نماز پڑھنے کی الگ جگہ متعین ہوتی ہے جہاں عورتیں نماز ادا کرتی ہیں لہٰذا فتنہ کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

لمافی سنن ابی داؤد(۲/۴۵۴)(کتاب الجنائز): ..... عن أبی هريرة (رضی الله عنه) قال قال رسول الله ﷺ من صلی علی جنازة فی المسجد فلا شی له.

وفيه ايضاً(۱/۸۴): باب ماجاء فی خروج النساء الی المسجد) عن ابن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ لا تمنعوا نساء كم المساجد وبيوتهن خير لهن.

وفيه ايضاً(۱/۸۴): عن عبدالله عن النبی ﷺ قال صلوة المرأة فی بيتها افضل من صلاتها فی حجرتها، وصلاتها فی مخدعها افضل من صلاتها فی بيتها.

وفی اعلاء السنن(۴/۲۶۲): .....فيه دلالة علی جواز خروج النساء مطلقاً سواء كن شواب أو عجائز للصلاة فی مسجد الحرام أو مسجد النبی ﷺ وعليه عمل اهل الحرمين اليوم، ولكن ينبغی تقييده بوقت الضرورة كما اذا حضرت المسجد للطواف فی الحج والعمرة فلا بأس لها بأن تصلی فيه وحدها أو جماعة أو حضرت المسجد النبی للتسليم والصلوة علی النبی ﷺ فلا بأس لصلاتها فی المسجد تحية أو مكتوبة واما ان تاتی المسجد الحرام أو المسجد النبوی لاجل الصلوة فحسب فينا فيه قوله ﷺ "صلاتک فی بيتک خير من صلاتک فی حجرتک" الی ان قال: "ومن صلاتک فی مسجدی" والله تعالیٰ اعلم.

وفی الهداية(۱/۸۶): (ويكره لهن حضور الجماعات) يعنی الشواب منهن لمافيه من خوف الفتنة (ولا بأس للعجوز ان تخرج فی الفجر والمغرب والعشاء) وهذا عند ابی حنيفةؒ (وقالا يخرجن فی

الصلوات كلها) لانه لا فتنه لقلة الرغبة فلا يكره كما في العيد وله ان فرط الشبق حامل فتقع الفتنة غير ان الفساق انتشارهم في الظهر والعصر والجمعة اما في الفجر والعشاء هم نائمون وفي المغرب بالطعام مشغولون.

وفي الدر المختار(۲/۲۲۴،۲۲۵،۲۲۶): (وكرهت تحريماً) وقيل (تنزيها في مسجد جماعة هو) أي الميت (فيه) وحده أو مع القوم.

(واختلف في الخارجة) عن المسجد وحده او مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً خلاصة، بناءً على أن المسجد انما بني للمكتوبة وتوابعها كنافلة وذكر وتدريس علم وهو الموافق لا طلاق حديث أبي داؤد "من صلى على ميت في المسجد فلاصلاة له".

وفي الشامية(۲/۲۲۵): (قوله مطلقاً) اى في جميع الصور المتقدمة كمافي الفتح عن الخلاصة وفي مختارات النوازل سواء كان الميت فيه او خارجه هو ظاهر الرواية وفي رواية لايكره اذا كان الميت خارج المسجد(قوله بناء على أن المسجد الخ) أما اذا عللنا بخوف تلويث المسجد فلا يكره اذا كان الميت خارج المسجد وحده او مع بعض القوم قال في شرح المنية: واليه مال في المبسوط والمحيط" وعليه العمل وهو المختار اهـ قلت: بل ذكر غاية البيان والعناية انه لا كراهة فيها بالاتفاق.

(۴۵۸) بم دھماکے میں مرنے والے اہل تشیع کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ میں شیعہ، سنی مختلف مکاتب فکر کے لوگ رہتے ہیں گزشتہ رات شیعوں کے امام بارگاہ میں دھماکہ ہوا جس کی وجہ سے وہاں موجود لوگوں میں دس پندرہ آدمی مرگئے اور اس طرح دو راہ گیر سنی مسلمان بھی مرگئے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ شیعہ شہید ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ اور اسی طرح جو دو مسلمان راہ گیر مرگئے ہیں وہ شہید ہیں یا نہیں؟ ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عربی حوالوں کے ساتھ تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کے ساتھ خصوصی فضل وکرم کا معاملہ ہے۔ کوئی مسلمان بیماری، ایکسیڈنٹ یا کسی حادثہ میں مرجائے تو شہید ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی شہادت اخروی ہے دنیا میں شہید کے احکام اس کے نہیں ہیں۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں دھماکہ میں مرنے والے دو سنی مسلمان شہید ہیں۔ البتہ ان کی شہادت اخروی ہے۔ اس لئے شہید کے دنیاوی احکام ان کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ عام اموات کی طرح غسل، کفن وغیرہ دیا جائے گا۔

باقی شیعہ کے متعلق اگر یہ ضروریات دین اور صریح نصوص کے منکر ہیں مثلاً قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں۔ یا جبریل امین (علیہ

السلام) سے وحی لانے میں غلطی کرنے کا قول کرتے ہیں، یا قذف عائشہ رضی اللہ عنہا کو برحق سمجھتے ہیں، وغیرہ ذلک تو بتصریح فقہاء یہ کافر ہیں۔ جبکہ مرتبہ شہادت مسلمانوں کیلئے ہے کوئی کافر کسی حال میں بھی مرجائے وہ شہید نہیں ہوتا۔

لما فی عمدة القاری (۱۲۷/۱۴): (باب الشهادة سبع سوى القتل) اى هذ باب يذكر فيه الشهادة سبع اى سبعة انواع وكونها سبعا باعتبار الشهداء ولهذا جاء فى حديث جابر بن عتيك عن رسول الله ﷺ الشهداء سبعة انواع سوى القتل فى سبيل الله تعالىٰ المطعون شهيد والغريق شهيد وصاحب ذات الجنب والمبطون شهيد والحريق شهيد والذى يموت تحت الهدم شهيد والمراة بجمع شهيد الحديث فى الموطا.

وفى الهندية(۲۶۴/۲): الرافضى اذا كان يسب الشيخين ويلعنهما والعياذ بالله فهو كافر وان كان يفضل عليا كرم الله تعالىٰ وجهه على أبى بكر رضى الله عنه لا يكون كافرا الا انه مبتدع...... إلى قوله ولو قذف عائشة رضى الله عنها بالزنى كفر بالله...... الى قوله من أنكر امامة ابى بكر الصديق رضى الله عنه فهو كافر وعلى قول بعضهم هو مبتدع وليس بكافر والصحيح انه كافر وكذلك من انكر خلافة عمر رضى الله عنه فى اصح الاقوال كذا فى الظهيرية.

وفى الشامية على الدر(۲۳۷/۴): نعم لاشك فى تكفير من قذف السيدة عائشة رضى الله تعالىٰ عنها او انكر صحبة الصديق او اعتقد الالوهية فى على أو ان جبريل غلط فى الوحى، او نحو ذلك من الكفر الصريح المخالف للقران، ويكن لو تاب تقبل توبته.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۱۵۸۳/۲): فقال الحنفية: الشهيد من قتله اهل الحرب او اهل البغى او قطاع الطريق او اللصوص فى منزله ليلا او نهارا باى آلة: مثقل اومحدد او وجد فى المعركة وبه أثر كجرح وكسر وحرق وخروج دم من أذن اوعين أو قتله مسلم ظلما عمدا بمحدد وكان مسلما مكلفا (بالغا عاقلاً) طاهرا (خاليا من حيض او نفاس او جنابة) ولم يرتث بعدما انقضاء الحرب اى لا يموت عقب الاصابة...... إلى قوله وبه تبين ان شروط تحقيق الشهادة عندهم: هى الاسلام والعقل والبلوغ والطهارة من الحدث الاكبر، وان يموت عقب الاصابة.

(۴۵۹) سیلاب، زلزلہ وغیرہ میں مرنے والوں کی شہادت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ابھی چند دن پہلے بلوچستان میں ضلع زیارت پر جو خوفناک زلزلہ آیا اور اس میں کئی گاؤں تباہ ہوگئے اور بہت سے افراد مرگئے، زید کہتا ہے کہ یہ لوگ چونکہ زیادہ گنہگار تھے اس لئے ان پر یہ

زلزلے آتے ہیں اور یہ ان کی سزا ہے جبکہ عمر کہتا ہے کہ ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس امت پر خاص فضل وکرم ہے کہ ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے اگر عام عذاب آجائے جیسے زلزلہ، سیلاب وغیرہ تو اس سے ان کے گناہ ڈھل جائیں گے اور اس میں مرنے والوں کی موت شہادت کی موت ہوگی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ سیلاب، زلزلہ یا دوسری ناگہانی آفات سے جو اموات واقع ہوتی ہیں ان کو شہادت کہنا درست ہے، نیز اس میں مرنے والوں کے غسل اور کفن دفن عام اموات کی طرح ہوگا یا کوئی فرق ہے؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... شہید کی دو قسمیں ہیں:

شہید کی پہلی قسم یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں شہید ہو، اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو کفار کے ساتھ لڑائی میں شہید ہو جائے یا اس کو ظلماً قتل کیا جائے اور وہ کچھ دنیاوی نفع بھی حاصل نہ کر سکے، اس شہید کا حکم دنیا میں یہ ہے کہ اس کو غسل نہیں دیا جائے گا اور اس کو اپنے خون آلود کپڑوں میں دفن کیا جائے گا البتہ اس سے زائد کپڑے، کوٹ، واسکٹ، اور اسلحہ وغیرہ نکال دیا جائے گا اور آخرت میں اس کو شہید کا درجہ ملے گا۔

شہید کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف آخرت میں شہید کہلائے گا اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو دین کی فکر میں مرجائے یا کسی ناگہانی موت مرجائے ایسے شہید کا حکم دنیا میں یہ ہے کہ اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا اور آخرت میں اس کو انشاء اللہ شہید کا ثواب ملے گا، لہٰذا صورت مسئولہ میں زلزلہ سیلاب، اور ناگہانی آفات میں مرنے والوں کو عام مردوں کی طرح غسل اور کفن دیا جائے گا اور ان کو شہداء کہنا درست ہے۔ البتہ رہی زید کی بات کہ یہ لوگ گنہگار تھے اس لئے ان پر زلزلے آئے ہیں تو گناہ شہادت کے منافی نہیں اگر کسی آدمی پر گناہ کی حالت میں شہادت کے اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے موت واقع ہو جائے تو اس کو شہید کا ثواب ملے گا البتہ اس پر اپنے ناجائز عمل کا گناہ ہوگا۔

لمافی تکملة فتح الملهم(۳/۴۶۲): قوله والشهيد في سبيل الله يعني من قتل مجاهداً في سبيل الله تعالىٰ، وهذا الأخير هو الشهيد في احكام الدنيا والاخرة فلا يغسل، ويدفن في ثيابه بشرط ان لا يكون مرتثا ويلحق به عند الحنفية من قتل ظلماً بجارحة ولم يجب بنفس القتل مال، ومن قتله باغ أو حربي أو قاطع طريق ولو بغير آلة جارحة أو وجد جريحاً ميتاً في معركتهم كما في الدر المختار، فهؤلاء كلهم شهداء في حكم الدنيا والاخرة، وأما الاربعة الاولى فهم شهداء في أحكام الاخرة دون الدنيا، فيغسلون ويكفنون، ولهم في الآخرة أجر شهيد، وقد وردت روايات اخرى الحقت كثيرا من الانواع بهؤلاء الاربعة في احكام الاخرة وكونهم ماجورين أجر الشهداء وعدهم الحافظ ابن حجر عشرين كما مرّ وعدهم السيوطي نحو الثلاثين، وهي "من مات بالبطن أو الغرق أو الهدم، أو بالجنب...... الخ.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۵۹۰): والخلاصة، إن کل من مات بسبب مرض أو حادث أو دفاع عن النفس أو نقل من قلب المعرکة حیاً أو مات فی اثناء الغربة أو طلب العلم أو لیلة الجمعة، فهو شهید الاخرة وحکم هولاء الشهداء فی الدنیا، أی شهداء الاخرة، أن الواحد منهم یغسل، ویکفن ویصلی علیه اتفاقاً کغیره من الموتی، أما فی الاخرة فله ثواب الاخرة فقط، وله أجرا الشهداء یوم القیامة.

وفی الشامیة(۲/۲۵۳): (خاتمة) ذکر الأجهوری قال فی العارضة: من غرق فی قطع طریق فهو شهید وعلیه إثم معصیته وکل من مات بسبب معصیة فلیس بشهید، وان مات فی معصیة بسبب من اسباب الشهادة فله أجر شهادته وعلیه إثم معصیته، وکذالک لو قاتل علی فرس مغصوب أو کان قوم فی معصیة فوقع علیهم البیت فلهم الشهادة وعلیهم إثم المعصیة

(۴۶۰) گرمی کی شدت سے مرجانے والے کی شہادت کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہید اخروی کی بہت سی اقسام احادیث میں ذکر ہیں کیا وہ شخص جو گرمی کی شدت سے مرجائے وہ شہید اخروی ہے یا نہیں؟ آئے دن یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں شہر میں اتنے افراد گرمی کی شدت سے جاں بحق ہو گئے اور فلاں شہر میں اتنے۔ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب سے جلد سرفراز فرمایئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... تتبع اور تلاش کے بعد تقریباً پچاس ایسے افراد ملے ہیں جن کو مختلف کتب میں شہداء اخروی کہا گیا ہے اور ان میں اکثر وہ شہداء ہیں جن کا ذکر احادیث میں موجود ہے اور ان تمام شہداء کے مجموعے سے دو اصول سمجھ میں آتے ہیں، ایک اصول یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی دینی فکر میں مرجائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ وہ طالب علم جو کہ علم شرعی کی طلب میں مرجائے یا وہ شخص جو اللہ کے راستہ میں بستر پر مرجائے یا وہ شخص جو کہ امت کے فساد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے تھام لے وغیرہ وغیرہ اور دوسرا اصول یہ ہے کہ جو شخص ناگہانی موت مرجائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ پانی میں غرق ہو کر مر گیا یا جس کو درندوں نے مار کر قتل کر دیا ہو یا وہ شخص کہ جس نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور اس کی موت واقع ہو گئی ہو وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ شخص جو کہ گرمی کی شدت سے مرجائے وہ بھی ناگہانی موت میں داخل ہے اور ان شاء اللہ شہید اخروی ہے۔

لمافی فتح الباری(۶/۳۳،۳۴):.....ویحتمل أن یکون أراد التنبیه علی ان الشهادة لا تنحصر فی القتل بل لها أسباب أخر وتلک الاسباب اختلفت الاحادیث فی عددها ففی بعضها خمسة وفی بعضها سبعة والذی وافق شرط البخاری الخمسة فنبه بالترجمة علی أن العدد الوارد لیس علی معنی التحدید انتهی..... والذی یظهر انه ﷺ أعلم بالاقل ثم اعلم زیادة علی ذالک فذکرها فی وقت آخر ولم یقصد الحصر فی شئ من ذالک وقد اجتمع لنا من الطرق الجیدة اکثر من عشرین

خصلة فان مجموع ماقدمته مما اشتملت عليه الاحاديث التى ذكرتها أربع عشرة خصلة وتقدم فى باب من ينكب فى سبيل الله حديث أبى مالك الأشعرى مرفوعا من وقصه فرسه أو بعيره أو لدغته هامة أو مات على فراشه على اى حتف شاء الله تعالىٰ فهو شهيد وصحح الدار قطنى من حديث ابن عمر موت الغريب شهادة ولا بن حبان من حديث أبى هريرةؓ من مات مرابطا مات شهيداً الحديث وللطبرانى من حديث ابن عباس مرفوعاً المرء يموت على فراشه فى سبيل الله شهيد وقال ذالك ايضاً فى المبطون واللديغ والغريق والشريق والذى يفترسه السبع والخار عن دابته وصاحب الهدم وذات الجنب ولابى داؤد من حديث ام حرام المائد فى البحر الذى يصيبه القئ له أجر شهيد وقد تقدمت احاديث فيمن طلب الشهادة بنية صادقة انه يكتب شهيداً فى باب تمنى الشهادة ويأتى فى كتاب الطب حديث فيمن صبر فى الطاعون انه شهيد وتقدم حديث عقبة بن عامر فيمن صرعته دابته وانه عند الطبرانى وعنده من حديث ابن مسعود باسناد صحيح ان من يتردى من رؤس الجبال وتأكله السباع ويغرق فى البحار لشهيد عند الله ووردت احاديث اخرى فى أمور اخرى لم أعرج عليها لضعفها قال ابن التين هذه كلها ميتات فيها شدة تفضل الله على أمة محمد ﷺ بان جعلها تمحيصا لذنوبهم وزيادة فى أجورهم يبلغهم بها مراتب الشهداء (قلت) والذى يظهر أن المذكورين ليسو فى المرتبة سواء...... ويتحصل مما ذكر فى هذه الاحاديث ان الشهداء قسمان شهيد الدنيا وشهيد الآخرة وهو من يقتل فى حرب الكفار مقبلاً غير مدبر مخلصاً وشهيد الاخرة وهو من ذكر بمعنى انهم يعطون من جنس أجر الشهداء ولا تجرى عليهم احكامهم فى الدنيا.

وكمافى تكملة فتح الملهم (۳/۲۶۲،۲۶۳)

وكمافى الشامية(۲/۲۵۲)

(۴۶۱) ایکسیڈنٹ میں مرنے والے کی شہادت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دینی مدرسہ میں حفظ کررہاہوں اور چندون پہلے چھٹی کے موقع پر ہم گھر جارہے تھے کہ رات کو ایک جگہ پر ہماری بس دوسری گاڑی سے ٹکراگئی اور ایکسیڈنٹ ہوا جس کے نتیجہ میں کافی سارے لوگ زخمی ہوئے اور چند حضرات موقع ہی پر مرگئے اور دوتین آدمی چنددن زخم کے حالت میں رہ کر آخر کار زخموں کی تاب نہ لا سکے اور رخصت ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آیا یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ نیز ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں ایکسیڈنٹ میں فوت ہونے والے افراد صرف آخرت کے اعتبار سے شہید ہیں لہٰذا ان کو غسل

دیا جائے گا اسی طرح عام مُردوں کی طرح کفن اور دفن کا انتظام کیا جائے گا۔

لمافي تكملة فتح الملهم(٣/٤٦٢): قوله والشهيد في سبيل الله! يعني من قتل مجاهداً في سبيل الله تعالىٰ، وهذا الأخير هو الشهيد في احكام الدنيا والاخرة فلا يغسل، ويدفن في ثيابه بشرط ان لا يكون مرتثا ويلحق به عند الحنفية من قتل ظلماً بجارحة ولم يجب بنفس القتل مال، ومن قتله باغ أو حربي أو قاطع طريق ولو بغير آلة جارحة أو وجد جريحاً ميتاً في معركتهم كما في الدر المختار، فهؤلاء كلهم شهداء في حكم الدنيا والاخرة، وأما الاربعة الاولى فهم شهداء في أحكام الاخرة دون الدنيا، فيغسلون ويكفنون، ولهم في الآخرة أجر شهيد، وقد وردت روايات اخرى الحقت كثيرا من الانواع بهؤلاء الاربعة في احكام الاخرة وكونهم ماجورين أجر الشهداء وعدّهم الحافظ ابن حجر عشرين كمامرّ وعدّهم السيوطي نحو الثلاثين، وهي "من مات بالبطن أو الغرق أو الهدم، أو بالجنب...... الخ.

وفي الفقه الاسلامي (٢/٥٩٠): والخلاصة، إن كل من مات بسبب مرض أو حادث أو دفاع عن النفس أو نقل من قلب المعركة حيّاً أو مات في اثناء الغربة أو طلب العلم أو ليلة الجمعة، فهو شهيد الاخرة وحكم هولاء الشهداء في الدنيا، أى شهداء الاخرة، أن الواحد منهم يغسل، ويكفن ويصلى عليه اتفاقاً كغيره من الموتى، أما في الاخرة فله ثواب الاخرة فقط، وله أجرا الشهداء يوم القيامة.

وفي الشامية(٢/٢٥٣): (خاتمة) ذكر الأجهوري قال في العارضة: من غرق في قطع طريق فهو شهيد وعليه إثم معصيته وكل من مات بسبب معصية فليس بشهيد، وان مات في معصية بسبب من اسباب الشهادة فله أجر شهادته وعليه إثم معصيته، وكذالک لو قاتل على فرس مغصوب أو كان قوم في معصية فوقع عليهم البيت فلهم الشهادة وعليهم إثم المعصية.

(٤٦٢) جوشخص اپنی یا مسلمانوں کی جان ومال کا دفاع کرتے ہوئے مر جائے وہ شہید ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں دو مسلمان جماعتوں کے درمیان لڑائی ہوئی زمین کے سلسلے میں، جن میں ایک جماعت برحق اور مظلوم تھی اور دوسری جماعت بالکل ظالم تھی مظلوم جماعت سے دو آدمیوں کو پتھروں سے قتل کیا گیا اور دونوں جنگ کے موقع پر ہی وفات پاگئے اور نہ کوئی بات کی اور نہ کچھ کیا اور ان میں ایک کا قاتل بھی معلوم ہوا، اور دوسرے کا قاتل معلوم نہیں ہوا بلکہ جماعت کے ہر فرد پر شبہ قتل کیا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان ہلاک شدگان میں سے کس کو غسل دیا جائے اور کس کو غسل نہ دیا جائے، تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... جو آدمی اپنی جان، مال، اہل یا مسلمانوں کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے، چاہے کسی بھی آلہ سے ہو، شرعاً شہید ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ ایسے شہید کو بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا جائے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی غسل نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا جائے۔

لمافي الهندية(۱/۱۶۸): ومن قتل مدافعا عن نفسه أو ماله أو عن المسلمين أو أهل الذمة باى آلة قتل بحديد أو حجر أو خشب فهو شهيد كذا في محيط السرخسي.

وفيه ايضاً(۱/۱۶۸): وحكمه ان لا يغسل ويصلي عليه كذا في محيط السرخسي ويدفن بدمه وثيابه كذا في الكافي.

وفي الشامية(۲/۲۴۹): ومفاده أنه لو كانت إحدى الفرقتين ظالمة للأخرى بأن علموا حالهم لايغسل من قتل من الأخرى وإن جهل قاتله عينا لكونه مدافعا عن نفسه وجماعته تأمل.

(۴۶۳) عدالت کی طرف سے کسی کو ظلماً قتل کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ محمد اکرم ایک دیندار آدمی ہے پچھلے سال انہوں نے چار مہینے بھی لگائے لیکن اس کا بھائی محمد انور ایک شریر آدمی ہے اور اس نے ایک آدمی کو قتل کیا اور فرار ہوگیا جس کی وجہ سے محمد اکرم کو پولیس نے گرفتار کیا اور جھوٹے گواہوں کی گواہی کی وجہ سے عدالت نے ان کو سزائے موت سنائی جو کہ دو تین دن میں ہونے والی ہے۔ حالانکہ وہ اس قتل میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ عدالت اگر کسی شخص کو ناحق سزا دے جس کی وجہ سے وہ مر جائے تو وہ شہید ہوگا یا نہیں؟ اور اس کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ برائے مہربانی جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... شہید کی تعریف میں وہ شخص داخل ہے جس کو بغیر گناہ اور ناحق قتل کیا گیا ہو، اور جس کا بدلہ اصلاً قصاص ہو نہ کہ دیت۔ صورت مسئولہ میں اگر گواہوں کے ذریعہ ثابت ہو جائے کہ یہ گواہ جھوٹے تھے تو قصاص نہ قاضی پر لازم ہوتا ہے اور نہ ورثاء پر، بلکہ اس صورت میں ورثاء پر دیت لازم ہوگی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی کو حاکم اور یا قاضی ظلماً قتل کروالے تو اس مظلوم مقتول کو شرعاً شہید اخروی قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اس شخص محمد اکرم کو غسل اور کفن دے کر دفن کیا جائے۔

لمافي الهندية(۱/۱۶۷): وهو في الشرع من قتله أهل الحرب والبغي وقطاع الطريق او وجد في معركة وبه جرح او يخرج الدم من عينه أو اذنه او جوفه...... او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دية وكذا ان قتله أهل الذمة او المستأمنون.

ولو وجبت الدية بصلح او بقتل الاب ابنه لا تسقط الشهادة لأن الواجب القصاص لكنه سقط بالصلح او الشبهة

ومن قتل مدافعاً عن نفسه او ماله او عن المسلمين او أهل الذمة بأى آلة قتل بحديد او حجر او خشب فهو شهيد.

وفی الشامية(٦/): وفی المعراج عن المجتبى: يشترط عند ابى حنيفة اى فی شبه العمد أن يقصد التأديب دون الاتلاف.

(۴۶۴) میت کو ایصال ثواب کا مسنون طریقہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کی وفات کے بعد ایصال ثواب کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

(۲)۔میت کی وفات کے بعد برائے ایصال ثواب جانور وغیرہ ذبح کرنا کیسا ہے؟

(۳)۔بعض جگہوں میں میت کی وفات کے بعد تیجہ، ساتواں، چالیسواں وغیرہ مناتے ہیں، اس کی کیا حیثیت ہے؟

(۴)۔بعض جگہوں میں نماز جنازہ کے بعد پیسے وغیرہ تقسیم کیے جاتے ہیں اس کی کیا حیثیت ہے؟ واضح رہے کہ یہ پیسے وغیرہ رشتہ دار اپنے مال سے ایصال ثواب کے طور پر تقسیم کرتے ہیں، اور اس کو لازم بھی نہیں سمجھتے۔

(۵)۔اور نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....(۱)۔ ہر قسم کی بدنی ومالی عبادت کا ثواب میت کو پہنچانا جائز اور صحیح ہے بلکہ ایک مستحسن امر ہے جس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ کوئی بدنی عبادت یا مالی عبادت کر کے اللہ سے دعا مانگے کہ اے اللہ! میری اس عبادت کا ثواب فلاں کو پہنچا دے۔ اس طرح دعا مانگنا زبان سے ضروری نہیں۔ اگر دل میں نیت کرے تو بھی کافی ہے۔

لیکن واضح رہے کہ امر مباح یا مندوب کو واجب کا درجہ دے کر اس کو لازم سمجھنا یا اس کو کسی خاص وقت یا خاص مکان کے ساتھ مقید کرنا اور اسی کو دین سمجھنا اور نہ کرنے والے پر طعن وتشنیع کرنا، درست نہیں۔ اس میں بدعت کی صورت پیدا ہوتی ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔

(۲)۔ برائے ایصال ثواب جانور ذبح کرنا بھی درست ہے جبکہ ذبح کرنے والا اپنے مال سے کرے۔ اور اگر یہ میت کے ترکہ سے ہو جس میں غائب اور یتیم ورثاء کا حق ہوتا ہے تو پھر جائز نہیں۔ البتہ اگر تمام ورثاء بالغ ہوں اور ان میں کوئی غائب نہ ہو، اور وہ خوشی سے ذبح کریں تو پھر درست ہے تاہم کسی مروجہ خاص وقت یا خاص جگہ میں ذبح کرنا بوجہ التزام وغیرہ کے درست نہ ہوگا اس سے احتراز کیا جائے۔

(۳)۔ میت کی وفات کے بعد تیجہ، ساتواں، چالیسواں وغیرہ کرنا بدعت ہے جس کا ترک کرنا لازم ہے البتہ بلا قید کسی دن اور تاریخ کے جب چاہے برائے ایصال ثواب فقراء کو پیسے دینا یا کھانا کھلانا درست ہے۔

(۴)۔ نماز جنازہ کے بعد میت کے رشتہ دار کا اپنے مال سے بطور ایصال ثواب کے پیسے یا چھوارے وغیرہ تقسیم کرنا اور بقول مستفتی اس کو

لازم نہ سمجھنا، اگر چہ درست ہے لیکن ''نماز جنازہ کے بعد'' کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے جا کر یہ بدعت کی صورت اختیار کر سکتا ہے جس کو لازم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ تخصیص ختم کرنا چاہیے بلکہ اس کے علاوہ جب چاہے بطور ایصال ثواب کے پیسے وغیرہ دے سکتا ہے۔

(۵)۔ نماز جنازہ خود دعا ہے اور نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا نماز جنازہ میں زیادتی کا شبہ پیدا کرتا ہے اس لئے فقہاء کرام نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا ممنوع لکھا ہے۔ لہٰذا نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا بدعت ہے۔ جس کا خیر القرون میں کوئی ثبوت نہیں۔

لما فی صحیح مسلم(۲/۴۱): عن ابی هريرة ان رجلا قال للنبی ﷺ ان ابی مات وترک مالا ولم يوص فهل يكفر عنه أتصدق عنه قال نعم.

وفی شرح المسلم للنواویؒ(۱/۱۲، ۱۳): فان الصدقة تصل الى الميت وينتفع بها بلا خلاف بين المسلمين وهذا هو الصواب...... وذهب جماعة من العلماء الى انه يصل الى الميت ثواب جميع العبادات من الصلاة والصوم والقراء ة و غير ذلک وفی صحيح البخاری فی باب من مات وعليه نذر ان ابن عمر امر من ماتت امها وعليها صلوة ان تصلی عنها الخ.

وفی شرح العقائد(صـ۱۷۲): وفی دعاء الاحياء للاموات وصدقتهم ای صدقة الاحياء عنهم ای عن الاموات نفع لهم ای للاموات ......ولنا ما ورد فی الاحاديث الصحاح من الدعا للاموات خصوصا فی صلاة الجنازة وقد توارثه السلف فلو لم يكن للاموات نفع فيه لما كان له معنى وقال عليه السلام مامن ميت تصلی عليه امة من المسلمين يبلغون مائة كلهم يشفعون الا شفعوا فيه وعن سعد بن عبادة انه قال يا رسول الله ان ام سعد ماتت فای الصدقة افضل قال الماء فحفر بيرا وقال هذا لام سعد.

وفی الشامية(۲/۲۴۳): مطلب فی القراء ة للميت واهداء ثوابها له. (تنبيه) صرح علماء نا فی باب الحج عن الغير بان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلاة او صوما او صدقة او غيرها كذا فی الهداية، بل فی زكاة التتارخانية عن المحيط: الافضل لمن يتصدق نفلا ان ينوی لجميع المؤمنين والمؤمنات لانها تصل اليهم ولا ينقص من اجره شئ اهـ هو مذهب اهل السنة والجماعة.... ولهذا اختاروا فی الدعاء: اللهم اوصل مثل ثواب ما قرأته الى فلان، واما عندنا فالواصل اليه نفس الثواب وفی البحر: من صام اوصلی او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والاحياء جاز، ويصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة كذا فی البدائع.

وفی الشامية(۲/۲۴۰، ۲۴۱): ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من اهل الميت لانه شرع فی السرور

لافی الشرور، وهی بدعة مستقبحة، وروی الامام احمد وابن ماجة باسناد صحیح عن جریر بن عبدالله قال ((کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت وصنعهم الطعام من النیاحة)) اهـ. وفی البزازیة: ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبرفی المواسم، و اتخاذ الدعوة لقرائة القران وجمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءة سورة الانعام او الاخلاص. والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القران لاجل الاکل یکره...... واطال ذلک فی المعراج. وقال: وهذه الافعال کلها للسمعة والریاء فیحترز عنها لانهم لا یریدون بها وجه الله تعالیٰ اهـ.

وفی المرقاة شرح المشکوٰة(۴/۱۴۹): ولا یدعوا للمیت بعد صلاة الجنازة لانه یشبه الزیادة فی صلاة الجنازة.

وفی البزازیة علی هامش الهندیة(۴/۸۰): لایقوم بالدعاء بعد صلاة الجنائز لانه دعا مرة لان اکثرها دعاء.

وفی الدر المختار (۲/۱۲۰): ......لان الجهلة یعتقدونها سنة او واجبة وکل مباح یؤدی الیه فمکروه.

(۴۶۵) مظاہروں اور ہڑتالوں وغیرہ کے موقع پر مرنے والے پولیس اہلکاروں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے یہاں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے زمیندار ایکشن کمیٹی کی کال پر مظاہرہ ہوا۔ شروع میں مظاہرہ پُرامن طریقہ سے جاری رہا۔ تھوڑی دیر بعد مظاہرہ والوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا اور فائرنگ شروع ہوئی اور پولیس نے حالات کنٹرول کرنے کیلئے ہوائی فائرنگ کی جس میں چار، پانچ آدمی مرگئے جن میں دو پولیس والے بھی شامل تھے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ اور ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ نیز اس طرح مظاہروں ہڑتالوں، انتخابات کے موقع پر یا ڈاکوؤں وغیرہ سے مقابلہ کے دوران جو پولیس والے مرتے ہیں ان کو شہادت نصیب ہوگی یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں اور عندالناس مشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......شہادت کی دو قسمیں ہیں دنیوی اور اخروی، شہادتِ اخروی ایسی شہادت کو کہتے ہیں جس میں آخرت میں تو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اور انہیں دنیاوی شہید جیسا اعزاز واکرام کیا جاتا ہے لیکن ان پر شہیدوں کے دنیوی احکام جاری نہیں ہوتے ایسی شہادت پانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، آگ میں جل کر مرنے والا، مکان کے نیچے دب کر مرنے والا اور اتفاقی حادثے میں مرنے والا انہیں میں داخل ہے۔ شہادت دنیوی جس میں دنیا میں بھی شہیدوں کے احکام جاری ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اس سے مراد ہر وہ مکلف مسلمان ہے جس کو ظلماً آلہ جارحہ سے قتل کیا گیا ہو، اور وہ قتل موجب قصاص ہو، اور وہ مقتول حدث اکبر سے پاک ہو، اور زخمی ہونے سے لے کر وفات تک زندگی کا کوئی فائدہ مثلاً کھانا پینا دوا کرنا وغیرہ نہ پایا جائے اور جو باغیوں، ڈاکوؤں اور میدان جنگ میں کافروں سے لڑتے ہوئے مارا جائے وہ بھی اسی شہادت دنیوی میں داخل ہے خواہ وہ کسی طرح بھی قتل کریں، اسی طرح وہ

شخص بھی اسی شہید کے حکم میں ہے جو کہ اپنی جان مال یا مسلمانوں کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے، ایسے شہید کا حکم یہ ہے کہ اسے غسل نہ دیا جائے بلکہ ان ہی کپڑوں سمیت نماز پڑھ کر دفن کر دیا جائے، لہٰذا صورت مسئولہ میں جو پولیس والے ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے جاتے ہیں وہ تو دنیاوی احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہیں۔ باقی ہڑتال ومظاہرے وغیرہ اگر جائز حق کیلئے اور ظالم حکومت کو ظلم سے روکنے کیلئے ہوں اور پرُ امن مظاہرہ ہو، اس میں کسی کی جان ومال کو نقصان نہ پہنچایا جائے تو چونکہ یہ جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہوتا ہے اس صورت میں اگر پولیس ان کو روکے تو وہ ظلم کرنے والے ہوں گے اب جو عوام مرجائیں وہ شہید دنیوی ہوں گے اور پولیس والے چونکہ ظالم ہیں اس لئے وہ شہید نہ ہوں گے۔ اور اگر ہڑتال والے شر وفساد کریں لوگوں کی جان ومال کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ چونکہ جائز نہیں اگر چہ ہڑتال کسی جائز حق کیلئے ہو، اس صورت میں اگر پولیس ان کو روکنے کیلئے لڑائی کرے اور دوران لڑائی پولیس والے مرجائیں تو وہ شہید ہوں گے کیونکہ یہ ظلماً قتل کیے گئے اور مدافع عن نفسہ وعن المسلمین بھی ہیں۔

لمافی تکملة فتح الملهم (٣/٣٢٤،٣٢٥): وهذا هو الطريق المشروع للضغط على الحكومات في سبيل إقامة شرع الله وتطبيق احكامه واما ما تعلمه الناس من الغرب من الوسائل الضغط على الحكومات كالاضطرابات والمظاهرات وسد الشوارع وسفك الدماء وتخريب العمران فليس من الاسلام في شئ.

وفي الهندية (١/١٦٧): وهو في الشرع من قتله اهل الحرب والبغي وقطاع الطريق اووجد في معركةٍ وبه جرح او يخرج الدم من عينه او اذنه اوجوفه او به اثر الحرق او وطئته دابة العدو وهو راكبها او سائقها او كدمته او صدمته بيدها او برجلها او نفروا دابته بضرب او زجر فقتلته او طعنوه فالقوه في ماء اونار او رموه من سور او اسقطوا عليه حائطاً او رموا ناراً فينا او هبت بها ريح الينا او جعلوها في طرف خشب راسها عندنا او ارسلوا الينا ماء فاحترق او غرق مسلم، او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دية.

وفي الدر المختار (٢/٢٤٧): باب الشهيد (هو كل مكلف مسلم طاهر)...... (قتل ظلماً) بغير حق (بجارحة) اى بما يوجب القصاص (ولم يجب بنفس القتل مال) بل قصاص، وكذا يكون شهيدا لو قتله باغ اوحربي اوقاطع طريق ولوتسببا اوبغير اله جارحة فان مقتولهم شهيد بأي آلة قتلوه ....

(٤٦٦) شہید دنیوی میں عدم ارتثاث کی قید کا حدیث سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہید دنیوی کی تعریف میں جو عدم ارتثاث کی قید لگائی جاتی ہے کہ اس شخص نے زخمی ہونے کے بعد موت تک دنیا کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، آیا یہ کسی حدیث سے ثابت ہے اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زخمی ہونے کے بعد ارتثاث پایا گیا جیسا کہ حضرت عمرؓ وہ شہید دنیوی نہ ہوں گے؟ نیز کسی روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ ان

کوغسل دیا گیا تھا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....شہید دنیوی کی تعریف میں فقہاء کرام جو عدم ارتثاث کی قید لگاتے ہیں یعنی اس نے زخمی ہونے کے بعد موت تک دنیا کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، یہ احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو صحابہ کرام شہید ہوئے اور انہوں نے دنیا کا کوئی نفع نہیں اٹھایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بغیر غسل کے دفن کرنے کا حکم فرمایا جیسے شہدائے احد (صحیح البخاری ۲/۵۸۴)۔ اور جن صحابہ کرام نے شہادت کے بعد دنیا کا کوئی نفع اٹھایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غسل دینے کا حکم فرمایا جیسے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (کتاب المغازی للواقدی ۲/۵۲۵) اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں جو شہداء دنیا کا کوئی نفع حاصل کرتے ان کو غسل دیا جاتا جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ۔

پس یہ احادیث اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ غسل دینے اور نہ دینے میں ارتثاث اور عدم ارتثاث کی قید ملحوظ ہے۔ یعنی شہید مرتث کو غسل دیا جائے گا اور شہید غیر مرتث کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ لہٰذا جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زخمی ہونے کے بعد ارتثاث پایا گیا ہے وہ شہید دنیوی نہ تھے بلکہ ان کو غسل دیا گیا تھا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ۔ اور روایات سے ان کو غسل دینا ثابت ہے۔ (جیسے مؤطا للإمام مالک رحمه الله (ص ۴۷۸) مطبع نور محمد، الطبقات الکبری لابن سعد ۲/۶۷ مکتبه دار الفکر، کتاب المغازی للواقدی ۲/۵۲۵ مؤسسة الاعلمی)

لمافي صحيح البخاری (۲/۵۸۴): عن ابن شهاب عن عبدالرحمن بن کعب بن مالک ان جابر بن عبدالله اخبره ان رسول الله ﷺ کان يجمع بين الرجلين في قتلى احد في ثوب واحد ثم يقول ايهم اکثر اخذا للقرآن فاذا اشير له الى احد قدمه في اللحد وقال انا شهيد على هؤلاء يوم القيامة وامر بدفنهم بدمائهم ولم يصل عليهم ولم يغسلوا.

وفي سنن ابی داؤد (۲/۴۴۷): عن ابن عباس قال امر رسول الله ﷺ بقتلى احد ان ينزع عنهم الحديد والجلود وان يدفنوا بدمائهم وثيابهم.

وفي المؤطا للامام مالک رحمه الله (ص۴۷۸): مالک عن نافع عن عبدالله بن عمر ان عمر بن الخطاب غسل وكفن وصلى عليه وكان شهيدا يرحمه الله.

وفي الطبقات الکبرى لابن سعد (۲/۶۷): وبعث الاشعث بن قيس ابنه قيس بن الاشعث صبيحة ضرب عليّ عليه السلام فقال: اى بنيّ انظر كيف اصبح امير المؤمنين. فذهب فنظر اليه ثم رجع فقال: رايت عينيه داخلتين في راسه، فقال الاشعث: عيني دميغ ورب الكعبة، قال ومكث عليّ يوم الجمعة وليلة السبت وتوفي، رحمة الله عليه وبركاته، ليلة الاحد لاحدى عشرة ليلة بقيت من شهر رمضان سنة اربعين، وغسله الحسن والحسين وعبدالله بن جعفر، وكفن في ثلثة اثواب ليس فيها قميص.

وفی کتاب المغازی للواقدی (۲/۵۴۷): قالوا: ثم امر رسول اللہ ﷺ ان یغسل، فغسلہ الحارث بن اوس بن معاذ، واسید بن حضیر، وسلمۃ بن سلامۃ بن وقش یصب الماء، ورسول اللہ ﷺ حاضر، فغسل بالماء الاولیٰ، والثانیۃ بالماء والسدر، والثالثۃ بالماء والکافور، ثم کفن فی ثلاثۃ اثواب صحاریۃ وادرج فیھا ادراجا، واتی بسریر کان عند ال سبط، یحمل علیہ الموتی، فوضع علی السریر.

(۴۶۷) بیٹھی ہوئی قبر کی مرمت کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں کراچی میں میت کو قبر میں دفنانے کیلئے شق کا طریقہ رائج ہے، قبر کو بند کرنے کیلئے ٹائلیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس صورت میں اگر کوئی قبر عرصہ تقریباً ایک سال کے بعد بوجہ بارش کے مکمل طور پر بیٹھ جائے۔ یہاں تک کہ قبر کے اوپر جو ٹائلیں رکھی گئی تھیں وہ بھی قبر کے اندرونی شق میں چلی جائیں، اب اس صورت میں قبر کی مرمت کی کیفیت کیا ہوگی؟ آیا جو مٹی قبر کے اندر چلی گئی اور قبر کا گڑھا تقریباً مٹی سے بھر چکا ہے اس مٹی کو نکال کر قبر کی مرمت کی جائے گی یا مزید مٹی ڈال کر اسے قبر کی صورت دے دی جائے؟ جبکہ یہ ساری مٹی میت کے اوپر ہی گری ہوئی ہے۔ شرعاً جو بھی صحیح طریقہ اور کیفیت ہو بیان فرما کر ممنون ومشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... میت کو دفنانے کے بعد دوبارہ اس کو نکالنا حرام ہے۔ لہٰذا مزید مٹی ڈال کر قبر کی مرمت کی جائے۔

لما فی الفتاویٰ الولوالجیۃ (۱/۱۶۸): واذا دفن المیت لغیر القبلۃ ورأسہ فی أسفلہ ونصب اللبن ولم یہل التراب علیہ نزع اللبن وسوی، وإن ھالوا علیہ التراب لم ینبش لان النبش حرام لمکان ھذہ الأفعال. والنبش إنما یکون بعد تمام الدفن وتمام الدفن إنما یکون بعد إھالۃ التراب علیہ.

وفی کتاب التجنیس والمزید (۲/۲۷۹): المیت بعد ما دفن مدۃ طویلۃ أو قلیلۃ لایسع إخراجہ من غیر عذر، ویجوز إخراجہ بالعذر، والعذر أن یظھر أن الأرض مغصوبۃ أو أخذھا الشفیع بالشفعۃ.

وفی الدر المختار (۲/۲۳۷،۲۳۸): (ولایخرج منہ) بعد إھالۃ التراب (إلا) لحق آدمی

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ الا لحق آدمی) احتراز عن حق اللہ تعالیٰ کما إذا دفن بلا غسل أو صلاۃ أو وضع علی غیر یمینہ أو إلی غیر القبلۃ لاینبش علیہ بعد اھالۃ التراب.

وفی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص۶۱۵): وأما الثالث إذا غلب الماء علی القبر فقیل یجوز تحویلہ لما، روی أن صالح بن عبید اللہ رؤی فی المنام وھو یقول: حولونی عن قبری فقد آذانی الماء ثلاثا، فنظروا فإذا شقہ الذی یلی الماء قد اصابہ الماء فأفتی ابن عباس رضی اللہ عنھما بتحویلہ، وقال الفقیہ أبو جعفر یجوز ذلک أیضاً ثم رجع ومنع.

یاداشت

یادداشت

یاداشت

یادداشت

یادداشت